اسلام ــــــ صراطِ مستقیم

تالیف : کینتھ ڈبلیو مورگن
ترجمہ : مولانا غلام رسول مہر

مقالہ نگار

ڈاکٹر محمد عبداللہ دراز (مصر)
پروفیسر محمود شہابی .... (ایران)
ڈاکٹر شفیق غربال (مصر)
ڈاکٹر اسحاق موسیٰ الحسینی ...... (مصر)
پروفیسر محمود شلتوت (مصر)
استاذ حسن بصری قسطائی ...... (ترکیہ)
استاذ اے۔ ای عفیفی (مصر)
مولانا مظہر الدّین صدّیقی ...... (پاکستان)
استاذ داؤد سی۔ ایم ٹنگ (چین)
حسین جاما دیننگ ...... (انڈونیشیا)
محمد راشدی (انڈونیشیا)

ناشرین

شیخ غلام علی اینڈ سنز پرنٹرز، پبلشرز اینڈ بک سیلرز

لاہور ــــــ کراچی ــــــ پشاور ــــــ حیدر آباد

سلسلہ مطبوعات نمبر ۲۷۸

This is an authorized translation of ISLAM-THE STRAIGHT PATH by Kenneth W. Morgan. Copyright, 1958 by The Ronald Press Company. Published by the Ronald Press Company, New York.

طابع .... شیخ نیاز احمد

مطبع .... علمی پرنٹنگ پریس، لاہور

اشاعت اول ۱۹۶۲ء

تعداد ۲۱۰۰

قیمت .... بارہ روپے

ناشرین

شیخ غلام علی اینڈ سنز۔ کشمیری بازار، لاہور

بہ اشتراک

فرینکلن پبلیکیشنز لاہور ...... نیویارک

فہرست ابواب

بسم اللہ الرحمٰن الرّحیم

مقدّمہ

ظہورِ اسلام پر قریباً چودہ سَو سال گزر چکے ہیں۔ اس اثنا میں اہلِ یورپ نے، جو اہلِ مغرب کہلاتے ہیں (اور اب اس اصطلاح میں امریکہ بھی شامل ہو گیا ہے) اسلام کے صحیح مطالعے کی کوشش کبھی نہ کی۔ وہ ہمیشہ لغو افسانہ بافیوں، لایعنی دروغ سازیوں اور بے سروپا داستان سرائیوں سے مسحور رہے۔ اِس کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ ابتدائی دَور ہی میں مسلمانوں کے ساتھ سیاسی رزم و پیکار کا سلسلہ جاری ہو گیا تھا۔ ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ تعصّب و تنگ نظری کے باعث یہ صلاحیت ہی باقی نہیں رہی تھی کہ غیر جانب دار ہو کر دینِ حق کا مطالعہ کیا جائے۔ پادریوں اور خود غرض سیاست دانوں نے صلیبی جنگوں کا جو ہنگامہ بپا کر دیا تھا، اس کی وجہ سے تعصّبات اور بھی بڑھ گئے۔ ظاہر ہے کہ ایسی دماغی اور ذہنی فضا کو صحیح موازنے کے لیے قطعاً سازگار نہیں سمجھا جا سکتا تھا۔ آہستہ آہستہ بعض افراد بروئے کار آئے، جو بڑی حد تک تعصّبات سے پاک تھے، لیکن اُن کے لیے پورے جائزے کے اسباب موجود نہ تھے اور اُن کی معلومات بہت محدود تھیں۔ اس وجہ سے نہ اہلِ مغرب نے اسلامی حقائق کا صحیح اندازہ کیا اور نہ مُسلمانوں نے اُن حقائق کو موزوں انداز میں سمجھانے اور پیش کرنے کی کوشش کی۔ درمیانی مدت میں مناظروں کے ہنگامے بھی خوب بپا ہوئے، لیکن مناظرے جس انداز میں ہوتے تھے، ان سے احقاقِ حق کو بظاہر کوئی فائدہ پہنچنے کا کون سا امکان تھا؟ ان سے دلوں اور دماغوں پر اور مُہریں لگ گئیں۔ یہ فائدہ البتہ ہُوا کہ اپنوں کے لیے گوناگوں شکوک کے جو دروازے کُھل رہے تھے، وہ بند ہو گئے، لیکن یہ ایجابی کام نہ تھا محض سلبی کام تھا اور سلبی کام دینِ حق کی تبلیغ کو کیا تقویت پہنچا سکتا تھا؟

یورپ میں عقلیت اور تشکک کی جو لہریں دوڑ رہی تھیں، وہ مذہبی احساس کی رہی سہی متاع بھی بہالے گئیں، لیکن اُن سے ایک فائدہ بھی ہُوا اور وہ یہ کہ تعصبات بڑی حد تک ختم ہو گئے۔ دِلوں اور دِماغوں میں یہ صلاحیت پیدا ہو گئی کہ ہر چیز کا جائزہ ٹھنڈے دل سے لیں اور مناسب فیصلہ کر سکیں۔ چنانچہ آج مغرب کی فضاء صدائے حق کے لیے سازگار ہے۔ اِسی حقیقت کو پیشِ نظر رکھتے ہُوئے نیویارک کی رونالڈ کمپنی کو خیال آیا کہ مختلف بڑے مذاہب کے متعلق خود اہلِ مذہب کے اکابر سے مقالے لکھوا کر ایسے مُرقّع تیار کر دے، جن سے اہلِ مغرب کو صحیح معلومات حاصل ہو سکیں اور وہ بطورِ خود غور و فکر کر کے صحیح نتیجے پر پہنچ سکیں۔ اِس طرح اور کوئی فائدہ نہ ہوگا تو کم از کم وہ تعصبات تو کم ہو جائیں گے، جو صدیوں سے آتشیں خلیج کی طرح حائل چلے آتے ہیں۔ چنانچہ اِس سلسلے میں پہلے ہندو دھرم کے متعلق مقالوں کا ایک مجموعہ شائع کیا گیا۔ پھر بُدھ مت کے متعلق اِسی نوع کے ایک مجموعے کی اشاعت عمل میں آئی۔ ۱۹۵۸ء میں اسلام کے متعلق مقالوں کا ایک مجموعہ چھپا۔ اِسی مجموعے کے مختلف مقالوں کو اُردو کا لباس پہنا کر موجودہ کتاب کی شکل میں پیش کیا جا رہا ہے۔

اِس مجموعے کی ترتیب کا ذکر بھی اختصاراً کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ سب سے پہلے مجموعہ مرتب کرنے والوں نے مقالات کے عنوانوں کا ایک خاکہ خود تیار کیا۔ پھر ترکی، مصر، عرب، شام، عراق، لبنان، ایران، پاکستان، انڈونیشیا وغیرہ کے اکابر اہلِ علم سے مشورے کے بعد اُس خاکے میں وسیع ترمیمات کی گئیں۔ نئے خاکے کے مطابق مقالے لکھنے کے لیے مختلف اصحاب سے مشورے لیے گئے۔ جن اہلِ علم و فضل کو زیادہ سے زیادہ افراد نے مستند قرار دیا، اُن سے مقالے لکھوائے گئے۔ اس حقیقت میں کوئی شبہ نہیں کہ مقالہ نگار حضرات اپنے اپنے موضوع کے متعلق زیادہ سے زیادہ مستند مانے جاتے ہیں اور اُن کے تیار کردہ مقالوں کے بعض پہلوؤں سے کسی کو کم یا زیادہ اختلاف بھی ہو تو اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ دورِ حاضرہ میں اسلام کو بہتر سے بہتر شکل میں پیش کرنے کی جو زیادہ سے زیادہ

کوشش ہو سکتی تھی، یہی تھی اور یہ کوشش اس جماعت نے کی، جسے اسلام سے براہِ راست کوئی علاقہ نہ تھا۔ وہ خدمتِ انسانیت کے سلسلے میں اسلام کا ایک جامع مُرقّع خود مسلمانوں کے ذریعے سے تیار کرانا چاہتی تھی۔ امید رکھنی چاہیے کہ اِس سے بہتر نتیجے برآمد ہوں گے۔

مَیں نے اس کتاب کو ترجمے کے لیے منتخب کیا تو میرے پیشِ نظر مندرجہ ذیل مقاصد تھے۔

(۱) میرا احساس یہ تھا کہ اس کتاب میں اسلام کے بنیادی حقائق کو جس انداز میں پیش کیا گیا ہے، وہ دورِ حاضر کی ذہنی فضا کے لحاظ سے بہت موزوں معلوم ہوتا ہے اور اگرچہ یہ کتاب اوّلاً اہلِ مغرب کے لیے لکھی گئی ہے، لیکن اگر اسے اُردو میں منتقل کر دیا گیا تو یہ دو وجہ سے مفید ہو گی۔ اوّل: ہمارے نوجوان طبقے کو اس کے مطالعے سے اطمینان ہو گا، زیادہ تر اس لیے کہ مقالہ نگاروں کا اسلوبِ نگارش پُرانا نہیں، نیا ہے۔ دوسرے: ہمارے علماء اندازہ فرما سکیں گے کہ جن اہلِ علم کو مغرب سے ذہنی قرب حاصل ہے اور وہ راسخ العقیدہ مسلمان ہیں، وہ اسلام کے بنیادی حقائق کس رنگ میں پیش کرتے ہیں۔

(۲) اس کتاب میں عرب و افریقہ نیز ترک خطوں اور چین و انڈونیشیا کے متعلق جو معلومات فراہم ہو گئی ہیں، وہ میرے محدود علم کے مطابق کسی دوسری جگہ یک جا نہیں مل سکتی تھیں، بلکہ متفرق بھی بہت کم نظر آئیں۔ یہ سب کے لیے بصیرت افروز ہوں گی۔ ہم یہ تو جانتے تھے کہ بزرگانِ دین کے مختلف حلقوں نے بطور خود ہند و پاکستان میں تبلیغِ اسلام کے لیے کیا کیا طریقے اختیار کیے اور کہاں کہاں مرکز بنائے، لیکن یہ شاید بہت کم اصحاب کو علم ہو کہ شمالی افریقہ کے بزرگانِ دین نے افریقہ میں کس طرح تبلیغ کا بندوبست کیا اور عرب تاجروں نے کسی بیرونی امداد کے بغیر کس طرح اندرونِ افریقہ میں تبلیغ و تعلیم کے ادارے جا بجا قائم کر دیے۔ چین، انڈونیشیا اور ترک خطوں کے متعلق بھی تمام معلومات ایسی ہیں جو میرے علم کے مطابق اس جامعیت و اختصار سے شاید ہی کسی دوسری جگہ مل سکیں۔

مَیں سمجھتا ہوں کہ یہ دونوں باتیں اِس کتاب کے اُردو ترجمے کے لیے معقول وجہ جواز تھیں۔ بعض امور و معاملات کے متعلق میرے نزدیک مزید توضیحات ضروری تھیں اور مَیں نے حواشی میں اپنے علم کی حد تک اُن کا بندوبست کر دیا ہے، تاکہ کتاب کی افادی حیثیت میں اضافہ ہو۔ کتاب انگریزی میں تھی اور اس میں قرآنی آیات کا محض ترجمہ دے دیا گیا تھا۔ ساتھ سورتوں اور آیتوں کے نمبر درج کر دیے گئے تھے۔ مَیں نے تمام آیات کے متن درج کر کے بالمقابل ترجمہ لکھا اور سورتوں کے نمبروں کے بجائے اُن کے نام درج کیے تاکہ یہاں کے اصحاب کو ان سے فائدہ اُٹھانے یا اصل کی طرف رجوع کرنے میں سہولت رہے۔

گیارہ مقالوں میں سے چار مقالے انگریزی زبان میں لکھے گئے تھے۔ دو عربی میں، ایک فرانسیسی میں، ایک ترکی میں، ایک فارسی میں، ایک چینی میں اور ایک ولندیزی میں ——— انگریزی کے مقالے بجنسہٖ چھاپ دیے گئے، باقی مقالوں کا ترجمہ انگریزی میں کرایا گیا۔ میرے سامنے صرف انگریزی ترجمہ تھا۔ اصل مقالوں میں سے جو عربی یا فارسی میں تھے، اُن سے تو مَیں استفادہ کر سکتا تھا، لیکن باقی میری دسترس سے بالکل باہر تھے۔ مقالوں کے عام اسلوب اور نظم و ترتیب کو پیشِ نظر رکھتے ہُوئے اندازہ ہوتا ہے کہ ترجمے میں اہتمامِ صحت کا کوئی پہلو اُٹھا نہ رکھا ہو گا، لیکن ظاہر ہے کہ مترجم اِس بارے میں کوئی ذمّہ داری قبول نہیں کر سکتا۔

آخر میں مقالہ نگاروں کی سرسری کیفیت بھی بیان کر دینا مناسب ہے:

۱۔ پہلا مقالہ شیخ محمد عبداللہ دراز نے فرانسیسی زبان میں مرتب کیا تھا۔ شیخ موصوف مصر کے مشہور عالم اور جامعہ ازہر میں تفسیر کے استاذ تھے۔ آپ اس اسلامی کلوکیم میں بھی شریک ہُوئے تھے، جو دو سال ہُوئے لاہور میں منعقد ہُوا تھا۔ یہیں اچانک حرکتِ قلب بند ہو جانے سے انھوں نے وفات پائی اور اُن کی میّت ہوائی جہاز میں قاہرہ پہنچائی گئی۔

۲۔ دوسرا مقالہ ڈاکٹر شفیق غربال نے لکھا جو انگریزی میں تھا۔ ڈاکٹر صاحب موصوف

بھی مصر کے بہت بڑے عالم ہیں۔ عرب لیگ نے عربی کے مطالعے کے لیے جو ادارہ عالیہ قائم کر رکھا ہے، یہ اُس کے رئیس ہیں۔ گویا آج عربی دنیا کے ممتاز ترین اہلِ علم میں سے ہیں۔

۳۔ شیخ محمد شلتوت بھی مصر کے مشہور عالم اور جامعہ ازہر میں تقابلی قانون کے استاذ ہیں۔ قاہرہ کے ریڈیو سے آپ وقتاً فوقتاً تقریریں نشر فرماتے رہتے ہیں اور عربی دُنیا میں آپ کو خاص شہرت حاصل ہے۔ آپ کا مقالہ تیسرا ہے اور یہ عربی میں مرتب ہُوا تھا۔

۴۔ چوتھا مقالہ استاذ اے۔ ای عفیفی کا ہے۔ موصوف جامعہ سکندریہ میں اسلامی فلسفے کے استاذ ہیں اور مصر کے ممتاز علماء میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کا مقالہ انگریزی میں تھا۔

۵۔ ڈاکٹر اسحاق موسیٰ الحسینی مصر کے مشہور عالم ہیں اور دو اداروں میں بہ یک وقت استاذ عربیہ کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ اوّل: عرب لیگ کے ادارہ عالیہ میں، دوم: قاہرہ کی امریکی یونیورسٹی میں ــــ آپ اصلاً فلسطین کے ہیں اور ماضی قریب تک بیروت کی امریکی یونیورسٹی میں پروفیسر تھے۔ آپ کا مقالہ پانچواں ہے اور یہ عربی میں تھا۔

۶۔ استاذ حسن بصری قنطائے کا تعلق استنبول سے ہے۔ آپ کو علم و فضل میں ترکوں کے درمیان درجۂ امتیاز حاصل ہے۔ آج کل تمام خدمات سے سبک دوش ہو چکے ہیں۔ حال ہی میں قرآن مجید کا ترجمہ ترکی زبان میں کیا ہے۔ اکثر اہلِ علم علمی مشوروں کے لیے آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے رہتے ہیں۔ آپ کا مقالہ چھٹا ہے اور یہ ترکی زبان میں تھا۔

۷۔ مولوی مظہرالدین صاحب صدیقی پاکستان میں کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ آج کل صاحب موصوف سندھ یونیورسٹی میں شعبہ تاریخ اسلامی کے رئیس ہیں۔ آپ کا مقالہ

انگریزی میں تھا۔

۸ - جناب داؤد سی۔ایم ٹنگ چین کے فاضل ہیں۔ یہ جمہوریہ چین کی طرف سے بیروت میں بہ طور قونصل مقرر تھے۔ ان کا مقالہ چینی میں تھا۔

۹ - جناب حسین یحییٰ الدین انکرات، جکارتا (انڈونیشیا) کی یونیورسٹی میں اسلام اور شعبۂ ادب کے استاذ ہیں۔ ان کا مقالہ ولندیزی یعنی ہالینڈ کی زبان میں تھا۔

۱۰ - ہز ایکسیلنسی محمد راشدی انڈونیشیا کی طرف سے پاکستان میں سفیر تھے۔ ان کا مقالہ بھی انگریزی میں تھا۔

۱۱ - محمود شہابی صاحب ایرانی ہیں جنھوں نے مقالہ بہ عنوان "شیعہ" تحریر فرمایا ہے۔

ظاہر ہے کہ مقالے مرتب کرنے والوں نے اپنی سعی و کوشش کے مطابق زیادہ سے زیادہ موزوں آدمی منتخب کیے اور جو کچھ ان حضرات نے لکھا، بڑے غور و توجہ سے لکھا اور دینی جذبے سے لکھا، اگرچہ اس میں کہیں کہیں کسی کو جزوی اختلاف ہو۔ مجھے یقین ہے کہ اس کتاب کی اشاعت بہ حیثیت مجموعی اسلام و اسلامیت کے مطالعے کے لیے مفید اور تقویت بخش ثابت ہوگی۔ یہ مقصد جس حد تک بھی پورا ہو، مترجم کے نزدیک بہرحال موجبِ سعادت ہوگا اور وہ سمجھے گا کہ اس کتاب کا ترجمہ کرنے میں اس کا جو وقت صرف ہوا، وہ بڑا با برکت تھا۔

مسلم ٹاؤن، لاہور
۱۵ جنوری ۱۹۶۰ء

غلام رسول مہر

اسلام کا مبدا

(شیخ محمد عبداللہ دراز)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ۝ اَلرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۝ مٰلِکِ یَوۡمِ الدِّیۡنِ ۝ اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ ۝ اِہۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِیۡمَ ۝ صِرَاطَ الَّذِیۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَیۡہِمۡ ۝ غَیۡرِ الۡمَغۡضُوۡبِ عَلَیۡہِمۡ وَ لَا الضَّآلِّیۡنَ ۝ (سورہ فاتحہ)

شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے
سب تعریفیں اللہ کے لیے ہیں۔ جو پالنے والا سارے جہان کا ہے، بے حد مہربان، نہایت رحم والا، مالک روز جزا کا تیری ہی ہم بندگی کرتے ہیں اور تجھی سے مدد چاہتے ہیں۔ بتلا ہم کو راہ سیدھی، راہ ان لوگوں کی جن پر تُو نے فضل فرمایا جن پر نہ تیرا غصہ ہُوا اور نہ وہ گمراہ ہُوئے۔

اسلام کے صراطِ مستقیم (سیدھی راہ) کا تقاضا یہ ہے کہ انسان خدا کی رضا کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دے جو قرآن مجید کے اوامر و نواہی کی شکل میں چہرہ کشا ہوئی اور حضرت محمد صلّی اللہ علیہ وسلّم کو اللہ کا رسُول مانے، جنھوں نے اپنی روزانہ زندگی میں آسمانی الہامات کا علمی نمونہ پیش فرمایا، جو صاحبِ ایمان اس صراطِ مستقیم پر چلتا ہے وہ مُسلمان ہے۔

اسلام کے لغوی معنی ہیں، خدا کی رضا کے روبرو بے چون و چرا جُھک جانا اور ہر قسم کی مزاحمت سے کنارہ کش رہنا۔ یہ کامل تسلیم و سپردگی خدا کی طرف سے انسانوں کے لیے نازل شدہ ہدایت کی حقّانیت و درستی پر پختہ و محکم اعتقاد کی واضح اور بدیہی شرط ہے۔ قرآن مجید نے یہ حقیقت واضح فرما دی ہے کہ خُدا کے رسُول اور ان کے پیرو قدیم ترین زمانے سے اپنے مذہب کے لیے اس وقت تک "اسلام" ہی کا لفظ استعمال کرتے رہے، جب تک لوگوں نے خود اس مذہب کو بدل کر کچھ کا کچھ نہ بنا دیا۔ قرآن مجید نے خود اپنے ملہمات اور سابقہ ملہمات میں گہرا تعلق بتا دیا ہے۔ مثلاً :

شَرَعَ لَكُم مِّنَ الدِّينِ مَا وَصَّىٰ بِهِ نُوحًا وَالَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهِ إِبْرَاهِيمَ وَمُوسَىٰ وَعِيسَىٰ (الشوریٰ ۱۳)

راہ ڈال دی تمھارے لیے دین میں وہی۔ جس کا حکم کیا تھا نوح ؑ کو اور جس کا حکم بھیجا ہم نے تیری طرف اور جس کا حکم کیا ہم نے ابراہیم ؑ کو اور موسےٰ ؑ کو اور عیسےٰ ؑ کو۔

اسی طرح حضرت نوح علیہ السلام نے اعلان کیا :

وَأُمِرْتُ أَنْ أَكُونَ مِنَ الْمُسْلِمِينَ ۝ (یونس ۷۲)

اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ اس کے فرمانبردار بندوں کے گروہ میں شامل رہوں۔

جب حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسمٰعیل علیہ السلام مکہ معظمہ میں عبادت کی غرض سے خانۂ کعبہ تعمیر کر رہے تھے تو انھوں نے خدائے پاک سے ان الفاظ میں دعا کی تھی :

رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِن ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ ۝ (البقرہ ۱۲۸)

اے ہمارے پروردگار! ہمیں توفیق دے کہ سچے مسلم یعنی تیرے فرمانبردار ہو جائیں اور ہماری نسل میں سے ایک ایسی اُمّت پیدا کر دے جو تیرے حکموں کی پابند ہو۔

حضرت یعقوب علیہ السلام نے بھی اپنے فرزندوں کو یہی وصیّت کی تھی۔

يَا بَنِيَّ إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَىٰ لَكُمُ الدِّينَ فَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنتُم مُّسْلِمُونَ (البقرہ ۱۳۲)

اے میرے بیٹو! خدا نے تمھارے لیے اس دین کی راہ پسند فرمائی ہے۔ دیکھو دنیا سے نہ جانا مگر اس حالت میں کہ تم مسلمان، یعنی فرمانبردار ہو۔

فرزندوں سے جب پوچھا گیا، تم کس کی عبادت کرو گے تو انھوں نے یقین دلایا :

قَالُوا نَعْبُدُ إِلَٰهَكَ وَإِلَٰهَ آبَائِكَ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ إِلَٰهًا وَاحِدًا وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ (البقرہ ۱۳۳)

اسی خدائے واحد کی جس کی تو نے عبادت کی ہے اور تیرے بزرگوں ابراہیم، اسمٰعیل اور اسحاق نے کی ہے اور ہم اس کے فرمانبردار (مسلم) ہوئے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کو ہدایتیں دے رہے تھے تو یہ بھی فرمایا :

يٰقَوْمِ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ فَعَلَيْهِ تَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّسْلِمِيْنَ (یونس ۸۴) لوگو اگر تم اللہ پر فی الحقیقت ایمان لاتے ہو تو اس پر بھروسا کرو اگر تم ہو فرمانبردار (مسلم)

جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں پر الہام ہوا کہ اللہ پر اُس کے رسول پر ایمان لاؤ تو انھوں نے کہا :

اٰمَنَّا وَاشْهَدْ بِاَنَّنَا مُسْلِمُوْنَ ○ (مائدہ ۱۱۱) ہم ایمان لائے اور خدایا تو گواہ رہو کہ ہم مسلمان (فرمانبردار) ہوئے۔

قرآن مجید نے جب یہ کہا کہ :

اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ (آل عمران ۱۹) بلاشبہ "الدین" یعنی اصل دین اللہ کے نزدیک "الاسلام" ہی ہے۔

تو ساتھ ہی واضح کر دیا کہ محض اسلام ہی ہے جو دین کی حیثیت میں اللہ کے نزدیک قابل قبول ہے۔ یہی دین ہے جس میں انسان اپنے آپ کو اللہ کی رضا اور ہدایت کے حوالے کر دیتا ہے۔ قرآن مجید کا ارشاد ہے :

وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ (آل عمران ۸۸) اور دیکھو جو کوئی اسلام کے سوا کسی دوسرے دین کا خواہش مند ہو گا تو وہ کبھی قبول نہیں کیا جائے گا۔

غرض، اس طرح واضح ہو گیا کہ روئے زمین پر سچا اور حقیقی دین صرف ایک ہی رہا ہے اور وہ اللہ کا دین ہے۔ مختلف خطوں، مختلف مقاموں اور مختلف زمانوں کے تمام مومن اسی دین کے پیرو تھے۔ خدا نے جتنے مقدس نبی اس دنیا کی ہدایت کے لیے بھیجے اور انھوں نے دین اللہ کی حقیقت خلقِ خدا پر واضح کی۔ ان میں سے ہر ایک کو اس عظیم الشان عمارت میں ایک پتھر کی حیثیت حاصل تھی۔ قرآن پاک کے نزدیک مومنوں کی یہ وحدت محض ایک حقیقت ہی نہیں، بلکہ عقائدِ دین کا ایک اہم جزو بھی ہے۔

پیغمبروں نے ایک دوسرے کی حقانیت کا اعتراف و اعلان کیا۔ ایمان والے لوگوں

کا فرض ہے کہ وہ خدا کی تمام نازل کی ہوئی کتابوں اور تمام بھیجے ہوئے پیغمبروں کو مانیں اور اُن کا احترام کریں۔ اِس سلسلے میں ان کے درمیان فرق اور امتیاز قطعاً نہیں ہونا چاہیے۔ اِن میں سے کسی ایک کے لیے ترجیحی مسلک اختیار کرنا اتنا بڑا گناہ ہے جو ایمان کی بنیادیں ڈھا دیتا ہے[۱]۔ قرآن مجید کا ارشاد ہے :

اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْفُرُوْنَ بِاللّٰہِ وَرُسُلِہٖ	جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں سے برگشتہ ہیں اور چاہتے
وَیُرِیْدُوْنَ اَنْ یُّفَرِّقُوْا بَیْنَ اللّٰہِ وَ	ہیں کہ اللہ میں اور اس کے رسُول میں (تصدیق کے لحاظ سے)
رُسُلِہٖ وَیَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّ	تفرقہ کریں اور کہتے ہیں ہم ان میں سے بعض کو مانتے ہیں
نَکْفُرُ بِبَعْضٍ وَّیُرِیْدُوْنَ	بعض کو نہیں مانتے اور اس طرح چاہتے ہیں ایمان اور کفر
اَنْ یَّتَّخِذُوْا بَیْنَ ذٰلِکَ سَبِیْلًا ہ اُولٰٓئِکَ	کے درمیان کوئی (تیسری) راہ اختیار کریں تو ایسے لوگ
ھُمُ الْکٰفِرُوْنَ حَقًّا وَاَعْتَدْنَا لِلْکٰفِرِیْنَ	یقیناً کافر ہیں اور کافروں کے لیے ہم نے ذلّت دینے
عَذَابًا مُّھِیْنًا ہ (نساء ۱۵۰-۱۵۱)	والا عذاب تیار کر رکھا ہے۔

خدا کی طرف سے جو وحی نازل ہوئیں، ان میں سے کسی کو ترجیح دینا راہِ حق سے انحراف کے مترادف ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم نے اپنی خواہش اپنے جذبے اور اپنے تعصب کو ایمان کا اصول و معیار بنا لیا ہے اور یہ رضائے باری تعالیٰ کے بھی خلاف ہے جس کی تصدیق اِن آیات کے ذریعے سے ہوتی رہی جو خُدا کے ہر پیغمبر کو عطا ہوئیں؛

انبیائے کرام کی بعثت کا بنیادی مقصد یہ رہا کہ مخلوق کو خدائے واحد پر ایمان لانے کی تلقین کریں اور انسانوں کے درمیان عدل قائم کر دیں۔ یہ عقیدہ توحید سے ناشی ہوتا ہے۔

[۱] تفصیل کا موقع نہیں، لیکن دو باتوں کی طرف اشارہ کر دینا ضروری ہے۔ اوّل جو نبی جس قوم یا گروہ کے لیے مبعوث ہُوا، اُس نے توحید کے علاوہ دعوت میں انہی چیزوں پر خاص زور دیا جو اس قوم یا گروہ کی اصلاح کے لیے ضروری تھیں اور معلوم ہے کہ طبیب کے نسخے بیماریوں کی حیثیت ہی کے مطابق ہوتے ہیں لہٰذا نفس ہدایت کے لحاظ سے تمام پیغمبروں کی حیثیت ایک تھی۔ دوم نفس ارسالی میں کوئی فرق نہیں اگرچہ کاروبار کے دائروں میں کم یا زیادہ فرق ہو۔

انبیائے کرام اور اُن کے پیروؤں کو ایک سلک میں منسلک کر دیتا ہے۔ وہ مل کر روحانی اعتبار سے ایک یگانہ قوم بنتے ہیں یہی "اسلام" ہے۔ قرآن مجید حضرت نوح علیہ السلام سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک انبیاء کا ذکر کرنے کے بعد کہتا ہے:

إِنَّ هَٰذِهِ أُمَّتُكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً — یہ تم سب کی امت فی الحقیقت ایک ہی امت ہے اور
وَأَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُونِ (انبیاء ۹۲) — میں تم سب کا پروردگار ہوں۔

ہم اپنی زندگی میں روزانہ خدا کے حکموں پر عمل کرتے ہیں۔ جن باتوں سے اس نے منع فرمایا، ان سے دور رہتے ہیں۔ یہ خدا کی نازل کردہ ہدایت، اور روحانی امن و سکون، پر جو خدا کی رضا کے آگے جھک جانے سے پیدا ہوتا ہے، ہمارے ایمان کی عملی دستاویز ہے آسمانی احکام کی بجا آوری اسلام کا دوسرا بنیادی جزو ہے۔ اسی طرح ایمان کامل ہوتا ہے، یعنی خدا کی ہدایت پر ایمان اور عملی زندگی میں اس کے حکموں کی بجا آوری مثلاً قرآن نے انفرادی زندگی کے سلسلے میں ہمیں حکم دیا ہے کہ راست بازی پر کاربند رہیں، سچ بولیں، اپنے جذبات کو قابو میں رکھیں اپنے دلوں کا تزکیہ کریں۔ خانگی زندگی میں ہمارے لیے ضروری قرار دیا گیا ہے کہ عورتوں کے ساتھ حسنِ سلوک سے پیش آئیں، ان کے حقوق کا خاص خیال رکھیں اور ان کے ساتھ برتاؤ میں کشادہ دلی سے کام لیں۔ مجلسی و اجتماعی زندگی میں ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ تمام مقدمات کا فیصلہ حق و انصاف کی بنا پر کریں۔ عدل اور لطف و رحم پر کاربند ہوں۔ کسی آدمی سے نفرت بھی ہو تو اس کے تعلق میں بے انصافی کو راہ نہ دیں۔ روحانی زندگی میں مسلمان کو چاہیے کہ ہمیشہ خدا کو حاضر و ناظر سمجھے۔ عفو و رحمت سے کبھی مایوس نہ ہو اور ایمان والے لوگ ہمیشہ اللہ تعالیٰ پر بھروسا رکھتے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مسلمان وہ ہے جو اپنی بدزبانی اور بدعملی سے دوسروں کو محفوظ رکھے۔ گویا اسلام امن و سلامتی کا دین ہے، باہر بھی امن و سلامتی، اندر بھی امن و سلامتی۔ اللہ تعالےٰ کے تعلق میں بھی امن و سلامتی اور اس کی مخلوقات کے

تعلق میں بھی امن و سلامتی۔ یہ امن و سلامتی اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی رضا کے حوالے کر دینے سے حاصل ہوتی ہے۔

یہ حقیقت پیشِ نظر رکھنی چاہیے کہ خدا کی طرف سے ہدایت کا جو سلسلہ یکے بعد دیگرے جاری رہا، اس کے ضمن میں تاریخی نقطۂ نگاہ سے "اسلام" کے مفہوم و معنی میں مسلسل اور تدریجی ارتقاء ہوا۔ ہر نئی آسمانی کتاب اور ہر نئے الٰہی رسول نے ہمارے عقیدے میں کوئی نہ کوئی نیا عنصر شامل کر دیا۔ مکمل ترین ہدایت طبعاً وہی ہو سکتی تھی جو سب سے آخر میں آئی اور جو تمام سابقہ ہدایتوں کا نچوڑ اور ان کی مصدق تھی لہٰذا اگر اس آخری ہدایت کو قبول کرنے والے لوگ حقیقی مسلم کہلائیں تو یہ بالکل بجا ہوگا۔ اسی نقطۂ نگاہ سے قرآن انھیں محض "مسلم" نہیں بلکہ "المسلم" قرار دیتا ہے۔

چونکہ خدا کی طرف سے آخری ہدایت پر قرآنِ مجید مشتمل ہے۔ اس لیے لازم ہے کہ ہم اسلام کے صراطِ مستقیم پر چلنے کے لیے قرآن مجید کا علم حاصل کریں۔ قرآن مجید کے پیغام کو وہی لوگ بہتر طریق پر سمجھ سکتے ہیں جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے آگاہ ہوں۔

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم عرب کے اس ممتاز و معزز گھرانے کے فرد تھے، جسے مذہبی کارناموں اور سیاسی سرگرمیوں کی بدولت بڑی شہرت حاصل تھی۔ آپ اسلامی سنہ (سنہ ہجری) سے ترپن[۵۳] سال پیشتر مکہ معظمہ میں دوشنبہ کے دن ۹۔ ربیع الاول کو پیدا ہوئے (۲۰ اپریل ۵۷۱ء[۱])

آپ کے والد کا انتقال آپ کی پیدائش سے پہلے ہو چکا تھا، والدہ کی وفات اس وقت

[۱] مصر کے مشہور عالم ہیئت محمود فلکی نے قطعی دلائل سے ثابت کیا ہے کہ ۹۔ ربیع الاوّل ہی درست ہے۔ قاضی سلیمان مرحوم صاحب "رحمۃ اللعلمین" نے تاریخ ولادت کے سلسلے میں لکھا: ہمارے نبی صلعم موسم بہار میں دوشنبہ کے دن ۹۔ ربیع الاول سنہ عام الفیل مطابق ۲۲۔ اپریل ۵۷۱ء مطابق یکم جیٹھ سمت ۶۲۸ بکرمی کو مکہ معظمہ میں بعد از صبح صادق و قبل از طلوع نیّرِ عالمتاب پیدا ہوئے۔" سائنس ہی فرمایا ۲۲۔ اپریل گریگورین قاعدے کے مطابق ہے تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو رحمۃ اللعلمین حصہ اول ص ۴۲-۴۳

ہوئی جب آپ چھٹے برس میں تھے۔ پھر دادا نے آپ کو اپنی نگرانی میں لے لیا۔ دو سال بعد دادا نے وفات پائی تو تعلیم و تربیت آپ کے چچا ابو طالب کے سپرد ہوئی[1]۔

چچا اور بھتیجے کے درمیان محبت کا یہ عالم تھا کہ آپ تجارتی سفروں میں بھی ساتھ رہتے۔ روایت مظہر ہے کہ جب آپ کی عمر بارہ سال کی تھی تو چچا کے ساتھ شام کے تجارتی سفر پر روانہ ہوئے۔ وہاں ایک شامی راہب ملا جس کا نام بحیرا تھا۔ اس نے دیکھتے ہی پہچان لیا کہ آپ نبی موعود ہیں۔ راہب نے چچا کو تاکید کی کہ آپ کی حفاظت کا خاص خیال رکھا جائے خصوصاً یہودیوں پر کبھی اعتماد نہ کیا جائے۔ آپ منصبِ نبوت پر پہنچ کر جو کام سرانجام دیں گے اگر یہودیوں کو اس کا علم ہو گیا تو آپ کو گزند پہنچائیں گے[2]۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا عنفوانِ شباب معمولی حالات میں بسر ہوا۔ زیادہ تر آپ ریوڑ چراتے رہے۔ جیسا کہ آپ نے بعد میں ایک مرتبہ فرمایا بھیڑیں چرانا اکثر پیغمبروں کا پیشہ رہا ہے۔ اس سلسلے میں آپ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت داؤد علیہ السلام کا ذکر خاص طور پر کیا۔

جوانی کے عالم میں آپ نے اپنے شائستہ اوضاع و اطوار، کمال و حیا اور پاکیزہ اخلاق و پاک دامنی کی وجہ سے خاص امتیازی درجہ حاصل کر لیا۔ قوم کے دوسرے نوجوان جن رحست جوئیوں میں مشغول رہتے تھے، ان سے ہمیشہ کنارہ کش رہے جو لوگ آپ

---

[1] ابو طالب آنحضرت صلعم کے والد عبد اللہ کے ماں جائے بھائی تھے

[2] یہ روایت ناقابلِ اعتبار بتائی گئی ہے۔ اس کے جس قدر طریقے ہیں، سب مرسل ہیں اس لیے کہ راوی اول واقعہ کے وقت خود موجود نہ تھا۔ اخیر راوی حضرت ابو موسیٰ اشعری ہیں۔ وہ شریک واقعہ نہ تھے۔ اور نہ شریک واقعہ کا نام بتاتے ہیں۔ ترمذی کی روایت میں یہ بھی ہے کہ چچا نے آپ کو بحیری سے کہ منظر بھیجا تو بلال کو ساتھ کیا۔ حافظ ابن قیم کہتے ہیں کہ بلال اس وقت غالباً موجود بھی نہ تھے۔ پھر قرآن مجید سے ثابت ہوتا ہے کہ یہود رسول موعود کا انتظار کر رہے تھے اور سمجھتے تھے کہ کافروں پر فتح اس کے لیے سے ہوگی۔ پھر جس شخص کو وہ اپنی آرزوؤں کی تکمیل کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ اسے گزند کیونکر پہنچا سکتے تھے۔

سے واقف تھے، انھیں آپ پر پورا اعتماد تھا۔ اسی وجہ سے آپ بجا طور پر "الامین" کے لقب سے ملقّب ہوئے، یعنی وہ شخص جو راست باز اور معتمد علیہ ہو۔ جب آپؐ کی عمر بیس سال کی ہوئی تو ضعیفوں اور کمزوروں کی دست گیری اور قبائل کے درمیان قیام امن کی غرض سے ایک جمعیت بن گئی تھی، جس کے ارکان نے آپس میں معاہدہ کر لیا تھا۔ یہ معاہدہ "حلف الفضول"[1] کے نام سے مشہور ہوا۔ اس میں مختلف گھرانوں کے اکابر شریک تھے۔ آنحضرت صلعم بھی اس معاہدے میں شامل تھے۔

پچیس سال کی عمر میں آپ نے مکہ معظمہ کی ایک دولت مند اور پاک دامن خاتون حضرت خدیجہؓ سے شادی کی۔ متاہل زندگی میں آپ نے اہل خانہ اور قوم کے سامنے نہایت اعلیٰ انسانی اوصاف و محاسن کے عملی نمونے پیش فرمائے۔ اپنی اہلیہ کے سرمایے سے تجارت کا سلسلہ آپ نے قائم رکھا۔ اس سے راحت و اطمینان کی زندگی بسر کرنے کے سامان فراہم ہوتے رہے۔ آپ اپنے وسائل خلقِ خدا کے لیے راحت کے اسباب مہیا کرنے میں صرف فرماتے رہے۔ مثلاً چچا کے فرزند حضرت علیؓ کی تعلیم و تربیت اپنے ذمے لے لی تاکہ اس احسان کا بدلہ اتار سکیں، جو چچا نے ابتدائی دور میں آپ کی تربیت و نگرانی کا ذمہ اٹھا کر کیا تھا۔

آنحضرت صلعم کے ساتھ شادی کے بعد حضرت خدیجہؓ پچیس برس زندہ رہیں۔ اس اثنا میں آنحضرت صلعم حد درجہ وفاشعار اور محبت پرور شوہر رہے۔ حضرت خدیجہؓ کی وفات کے بعد بھی ان کا ذکر آپ ایسی محبت سے فرماتے تھے کہ دوسری بیویوں کے دل میں رشک پیدا ہوتا تھا۔ آپ مثالی باپ اور مثالی نانا تھے۔ اپنے بچوں اور نواسوں کے ساتھ جیسی

---

[1] حلف الفضول اسے اس لیے کہتے ہیں کہ شروع میں اس معاہدے کا خیال جن لوگوں کو آیا تھا، ان کے ناموں میں فضیلت کا مادہ داخل تھا۔ مثلاً فضیل، فضل۔ اس کا مقصد مظلوموں کی حمایت، ظالموں کی مخالفت اور امن کی خدمت کے سوا کچھ نہ تھا۔

دلی محبت آپ نے فرمائی، اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ بچے نماز کے اوقات میں بھی آپ کی گردن مبارک پر چڑھ بیٹھتے، پشت مبارک پر سوار ہو جاتے۔ خطبہ دیتے وقت بیٹیوں کی اولاد سامنے آجاتی تو آپ خطبہ روک کر انھیں بلاتے اور منبر پر پاس بٹھا لیتے۔ بعض بدوؤں نے دیکھا کہ آپ ان بچوں کو بوسہ دے رہے ہیں۔ انھوں نے تعجب سے کہا: آپ بچوں کو بوسہ دے رہے ہیں؟ ہم نے تو کبھی ایسا نہیں کیا۔ آپ نے فرمایا: کیا میرا اس میں کوئی اختیار ہے کہ اللہ نے تیرے دل سے رحم نکال دیا؟ خدا اس پر رحم نہیں کرتا جو خود رحم دل نہیں[1]۔

آنحضرت صلعم کی شادی اور بعثت کے درمیان حد درجہ اہم کام اس وقت پیش آیا، جب آپ کی عمر پینتیس ۳۵ سال کی تھی۔ کعبہ مکرمہ کی تعمیر از سرِ نو ہو رہی تھی۔ جب حجرِ اسود کو اس کے مقام پر رکھنے کا موقع آیا تو اس کے لیے قبائل کے درمیان سخت و شدید کش مکش شروع ہو گئی۔ کش مکش جنگ کی صورت اختیار کرنے والی تھی اور لوگ تلواریں کھینچنے کے درپے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم مسجد الحرام میں داخل ہوئے۔ سب پکار اُٹھے کہ "الامین آگیے" "الامین آگیے"۔ ہم "الصادق والامین کی ثالثی قبول کرنے کے لیے تیار ہیں"۔ آپ نے کامل دل جمعی اور ناطر نداری سے کام لیتے ہوئے اپنی چادر مبارک بچھا دی، حجرِ اسود کو اس میں رکھا اور بڑے بڑے قبیلوں کے سرداروں سے فرمایا کہ چادر کے کنارے پکڑ کر اوپر اُٹھائیں۔ جب حجرِ اسود اپنی جگہ کے برابر پہنچ گیا تو آپ نے اسے اٹھا کر دیوار میں لگا دیا۔ اس طرح کش مکش ختم ہو گئی اور قبائل کے درمیان اتحاد و یگانگی بحال ہو گئی۔

---

[1] یہ روایت بخاری کتاب الادب باب ۱۸ میں ہے۔ جس حد تک میں اندازہ کر سکا ہوں فاضل مصنف نے یا تو دو روایتوں کو ملا دیا ہے یا پورے باب میں سے مفہوم اخذ کر لیا ہے۔ ایک روایت یہ ہے کہ ایک اعرابی آیا اور کہا ہم تو بچوں کو بوسہ نہیں دیتے اس وقت رسول اللہ صلعم نے یہ الفاظ فرمائے جو ابتدا میں منقول ہیں دوسری روایت ہے کہ اقرع نے کہا میرے دس بیٹے ہیں ان میں سے کبھی کسی کو نہیں چوما رسول اللہ صلعم نے فرمایا۔ لَا یَرْحَمُ لَا یُرْحَمُ جو رحم نہیں کرتا۔ اس پر رحم نہیں کیا جاتا۔

اب آپ جسمانی، دماغی اور اخلاقی اعتبار سے درجۂ کمال پر پہنچ چکے تھے اور ان تمام اوصاف وخصائص سے بوجہ اتم بہرہ مند ہو چکے تھے، جن کی بنا پر حیات مبارک کے بقیہ اوقات میں انسانوں کے قائد بنے رہے۔ حلیہ اقدس یہ تھا: میانہ قامت لیکن محول سے ذرا کشیدہ۔ اندام مبارک موزوں اور بھرا ہوا، سینہ کشادہ اور فراخ، مونڈھوں کی ہڈیاں بڑی تھیں، چہرہ مبارک حد درجہ پاکیزہ، متین اور مطمئن، دہانہ کشادہ، دندان مبارک باہم پیوستہ نہ تھے۔ آنکھیں سیاہ سرمگیں، جلد مبارک سرخ وسپید۔ سر مبارک کے بال سیاہ اور کانوں کے نیچے تک لٹکے رہتے تھے، رفتار میں مستعدی کے ساتھ خاص وقار نمایاں تھا، ہمیشہ سادہ لباس پہنتے مگر بہت صاف اور ستھرا ہوتا۔

طبع مبارک قدرتی طور پر بہت سنجیدہ و متین تھی۔ بہت کم گفتگو فرماتے، لیکن جب بولتے تو لفظ لفظ سے شیرینی اور لطافت ٹپکتی طبیعت کی شیرینی اور دوسروں کے احساسات کی حد درجہ پاس داری ہی کا تقاضا تھا کہ اپنی بات زبردستی منوانے کی کوشش کبھی نہ کی، بحث بھی کبھی نہ فرماتے۔ مصافحہ میں جب تک دوسرا ہاتھ نہ چھوڑتا، آپ اس کا ہاتھ نہ چھوڑتے۔ دوسروں کے ساتھ انصاف کے معاملے میں حد درجہ استوار اور مستحکم تھے، مگر ذاتی معاملات میں دوسروں کے ساتھ زیادہ سے زیادہ نرمی، درگزر اور ایثار سے کام لیتے تھے۔

۱۰۵۱۱

جب آپ ایک سلطنت کے واحد مالک بن گیے تو اس وقت بھی دنیوی دولت کی ترغیبات آپ پر ذرا اثر انداز نہ ہو سکیں۔ آپ ہمیشہ کی طرح سادہ اور کفایت شعار رہے اپنے آپ کو اور اپنے متعلقین کو ہر قسم کے عیش و راحت اور شکوہ و نمائش سے محفوظ رکھا۔ وفات کے وقت آپ کے پاس جو تھوڑی سی چیزیں تھیں وہ بھی رشتہ وار دل کو ورثے میں نہ ملیں۔ بلکہ مساکین میں تقسیم کر دی گئیں۔

عمر مبارک کے چالیسویں سال وہ فیصلہ کن ساعت آگئی جس نے آپ کی حیاتِ طیبہ

میں اور عالم انسانیت کی تاریخ میں کامل انقلاب برپا کر دیا۔ خود آپ کے ارشاد مبارک کے مطابق منصبِ نبوت کا پہلا نشان یہ تھا کہ جو کچھ آپ خواب میں دیکھتے، دن کے وقت اسی طرح ظہور میں آتا۔ کچھ مدت کے بعد خلوت و انزوا کا ذوق بہت غالب آگیا۔[1] آپ کوہِ حرا یا جبلِ نور[2] پر چلے جاتے جو مکہ مکرمہ کے شمال میں ہے۔ یہ روحانی غلبہ تھا۔ کھانے پینے کا جو سامان ساتھ لے جاتے، جب ختم ہو چکتا تو گھر تشریف لاتے۔

پہلی وحی اسلامی سنہ سے پیشتر تیرھویں سال، ۱۷ رمضان کو ہوئی (فروری ۶۱۰ء)[3] اس وحی نے معلّم اور شاگرد یعنی حضرت جبریل علیہ السلام اور حضرت رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کے درمیان سوال و جواب کی صورت اختیار کر لی۔ جبریلؑ نے کہا "پڑھ" آپ نے جواب دیا۔ "میں پڑھنا نہیں جانتا" جبریلؑ نے پھر کہا "پڑھ" آپ بولے "میں کیا پڑھوں؟" جبریل نے پھر کہا "پڑھ" آپ نے جواب دیا میں کیوں کر پڑھوں؟ پھر فرشتے نے سورۂ علق کی یہ پانچ آیتیں تلاوت کیں۔[4]

---

[1] بخاری کی روایت کے متعلقہ حصے کا ترجمہ یوں ہے: پہلے جو وحی آنحضرت صلعم پر ہوئی وہ خواب میں ہوئی تھی، پس آپ جو خواب دیکھتے صبح کی روشنی کی طرح اس کی سچائی ظاہر ہو جاتی۔ پھر آپ کو تنہائی پسند آئی آپ حرا کے غار میں تنہا رہتے اور وہاں عبادت کرتے۔ (باب کیف کان بدء الوحی)

[2] یہ مکہ معظمہ سے تین میل باہر پہاڑ کا ایک الگ تھلگ ٹیلا ہے۔ اس کا عام نام حرا ہے چونکہ خدا کی رحمت کا نور وحی کی شکل میں سب سے پہلے وہیں جلوہ گر ہوا اس لیے پہاڑ کا نام جبلِ نور مشہور ہو گیا۔ اس ٹیلے کے اوپر خاص بلندی پر مگر چوٹی سے ذرا نیچے دو بڑے پتھروں کے مل جانے کے باعث ایک سائبان سا بن گیا ہے جو چار فٹ لمبا اور پونے دو فٹ چوڑا ہو گا اس میں آپ عبادت کیا کرتے تھے۔

[3] قاضی سلیمان مرحوم منصور پوری نے لکھا ہے: جب آنحضرت صلعم کی عمر کے چالیس سال قمری پر ایک دن اوپر ہوا تو ۹ ربیع الاول ۴۱ میلادی مطابق تیرہ فروری ۶۱۰ء کو بروز دوشنبہ روح الامین خدا کا حکم نبوت لے کر آنحضرت کے پاس آیا (رحمۃ للعالمین جلد اول صفحہ ۵۲)

[4] بخاری کی روایت کے مطابق خود آنحضرت صلعم نے واقعہ جس طرح بیان فرمایا اس کا ترجمہ یوں ہے فرشتہ آیا اور کہا: "پڑھ" میں نے کہا "میں پڑھنا نہیں جانتا۔" اس نے مجھے پکڑا اور بھینچا یہاں تک کہ پورا زور مجھ پر لگایا، پھر چھوڑ دیا، اور کہا: پڑھ۔ میں نے کہا کہ میں پڑھنا نہیں جانتا۔ اس نے مجھے دوبارہ پکڑا اور بھینچا یہاں تک کہ پورا زور مجھ پر لگایا۔ پھر چھوڑا

باقی صفحہ ۲۴ پر

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ ۚ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۚ اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ ۙ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۙ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ ۗ (العلق ۱: ۵)

پڑھو اپنے رب کے نام سے جس نے آدمی کو گوشت کے لوتھڑے سے پیدا کیا۔ پڑھو تیرا پروردگار بڑا کریم ہے وہ جس نے انسان کو قلم سکھایا۔ انسان کو وہ باتیں سکھائیں جو اسے معلوم نہ تھیں۔

یہ قرآنِ مجید کی پہلی وحی تھی۔ فرشتہ غائب ہو گیا اور رسول اللہ صلعم وہاں سے گھر کی جانب روانہ ہوئے۔ پھر ایک آواز سنائی دی فرشتے نے کہا "محمد! آپ یقیناً اللہ کے رسول ہیں اور میں جبریل ہوں"۔ پھر کچھ دکھائی نہ دیا۔

گھر پہنچے تو حضرت خدیجہؓ کو پورا واقعہ سنایا، ساتھ ہی اپنے خطرات بیان فرمائے[1] فداکار اہلیہ نے دانشمندانہ اور تسلی آمیز کلمات سے آپ کو اطمینان دلایا اور کہا: تشویش کی کوئی وجہ نہیں، خدا آپ کو کبھی کوئی گزند نہ پہنچنے دے گا اس لیے کہ آپ نے کبھی کسی کو گزند نہیں پہنچایا۔ آپ ہمیشہ سچ بولتے ہیں، کمزوروں اور ناتوانوں کی دستگیری فرماتے ہیں اور جن لوگوں کو حق و انصاف کی راہ میں تکلیف پہنچی ہے، اُن کی مدد فرماتے ہیں[2]، پھر مزید تسکین کی خاطر حضرت خدیجہؓ آپ کو اپنے چچیرے بھائی ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں۔ اس نے سن کر کہا: یہ تو بڑی مبارک خبر ہے۔ اس پر خوش ہونا چاہیے۔ میں تصدیق

بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۳:۔ اور کہا "پڑھ" میں نے کہا کہ میں پڑھنا نہیں جانتا۔ اس نے مجھے پکڑا اور تیسری بار بھینچا۔ پھر چھوڑ دیا (اس کے بعد پانچ آیات تلاوت کیں) مطلب یہ کہ پڑھ کے جواب میں آنحضرت صلعم نے تینوں مرتبہ ایک ہی جواب دیا یعنی یہ کہ میں پڑھنا نہیں جانتا۔

حاشیہ صفحہ ہذا: [1] اس فقرے کا مطلب یہ ہے کہ آنحضرت صلعم کو جو منصب ہدایت سونپا گیا تھا اس کی مشکلات اور گرانباریوں کے بارے میں آپ نے خطرات ظاہر فرمائے۔

[2] بخاری کی روایت کے مطابق حضرت خدیجہؓ نے آپ کی جو خصوصیات بیان فرمائیں یہ تھیں۔ آپ اقربا پر شفقت فرماتے ہیں ناتوانوں کا بوجھ اٹھاتے ہیں جن کے پاس کچھ نہیں انھیں کما کر دیتے ہیں اور مہمان نوازی کرتے ہیں حادثوں میں حق کی اعانت فرماتے ہیں۔

کرتا ہوں کہ آپ وہی پیغمبر ہیں جس کی بشارت حضرت عیسٰی علیہ السلام نے دی۔ کاش میں اس وقت تک زندہ رہتا جب قوم آپ کو وطن سے نکال دے گی۔" رسول اللہ صلعم نے دریافت کیا، مجھے یہاں سے کیوں نکالا جائے گا؟ ورقہ نے کہا: کوئی شخص کبھی اس کی مثل نہیں لایا جو آپ لائے ہیں، اور لوگوں نے اس سے دشمنی نہ کی اور اسے تکلیفوں اور اذیتوں کا مرجع نہ بنایا۔

رسول اللہ صلعم اکثر غار حرا میں چلے جاتے جہاں پہلی وحی آپ پر نازل ہوئی تھی، اس امید پر کہ مزید وحی نازل ہوگی۔ وہی وضع و ہیئت اختیار کر لیتے جو پہلی وحی کے وقت تھی پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ جاتے، ہر طرف نظر دوڑاتے۔ دن اور ہفتے گزر گیے۔ مہینوں پر مہینے بیت گیے۔ یہاں تک کہ ایک سال پورا ہو کر دوسرا شروع ہوگیا۔ الشعبی کے بیان کے مطابق تیسرا سال بھی آگیا اور کوئی وحی نہ ہوئی، جب بالکل مایوسی کی حالت طاری ہو جاتی تو آواز سنتے: "محمد آپ واقعی اللہ کے رسول ہیں اور میں جبریل ہوں"۔ اور کوئی پیغام نہ ملتا جسے سننے کے لیے آپ مضطرب تھے[1]۔

---

[1] قاضی سلیمان مرحوم لکھتے ہیں کہ علما کا اتفاق ہے کہ ولادت باسعادت ربیع الاول میں ہوئی۔ نیز اتفاق ہے کہ ابتدائے وحی اکتالیسویں سال کے شروع میں ہوئی۔ اس سے نتیجہ نکلتا ہے کہ ابتدائے وحی ربیع الاول میں ہو مگر قرآن مجید سے ثابت ہے کہ قرآن مجید کا نزول رمضان المبارک میں ہوا۔ ان حالات کے پیش نظر پہلی وحی کے بعد جو انقطاع ہوا وہ زیادہ سے زیادہ چھ ماہ کا ہے جس میں رویائے صادقہ آتے رہے۔ امام طبری نے نزول قرآن کی تاریخ ۱۷ یا ۱۸ رمضان روایت کی ہے۔ چونکہ ۱۸ رمضان سنہ ۱ نبوت کو جمعہ تھا (مطابق ۱۷ اگست سنہ ۶۱۰ء) اس لیے نزول قرآن شب جمعہ ۱۸ رمضان کو تھا (رحمۃ للعالمین جلد اول ص ۴۷) اس بنا پر مذکورہ بالا بیان نظر ثانی کا محتاج ہے نیز یا ایہا المدثر کا خطاب غار حرا کا خطاب نہیں ہو سکتا جہاں لحاف میں لیٹنے کا کوئی امکان نہ تھا۔ متن میں بیان کیا گیا ہے کہ آپ صرف جبریل کی آواز سنتے تھے۔ مولانا شبلی فرماتے ہیں دفعۃً جبریل نظر آتے تھے اور کہتے تھے۔ (سیرۃ النبی جلد اول ص ۱۸۹) وحی میں انقطاع اس لیے ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طبیعت اس بار گراں کے تحمل کے لیے تیار ہو جائے۔

اس طرح عمر مبارک تینتالیس سال کی ہو گئی۔ آپ قریباً ہر رات بیداری میں گزار دیتے کہ شاید اس اہم اور گراں بار ذمہ داری کے متعلق کچھ سنیں۔ ہر سال ماہ رمضان المبارک میں آپ کوہ حرا پر چلے جاتے۔ آخر ایک روز آپ قیام کا وقت پورا کر کے پہاڑ سے اتر کر شہر کی طرف آرہے تھے کہ کسی کو پکارتے سنا۔ آپ نے دائیں بائیں، آگے پیچھے دیکھا مگر کوئی نظر نہ آیا جب آسمان کی طرف نظر اُٹھائی تو جبریل علیہ السلام کو پہچان لیا جنھیں ایک مرتبہ کوہ حرا پر دیکھ چکے تھے۔ یہ معاملہ اس طرح اچانک پیش آگیا اور قدوسی مخلوق کی ہیبت نے ایسی کیفیت طاری کر دی کہ آپ کھڑے نہ رہ سکے۔ اس وقت آپ کو دوسری ذمہ داری سونپی گئی:۔

يَا أَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۙ قُمْ فَأَنذِرْ ۙ — اے لحاف میں لپٹنے والے، کھڑا ہو، پھر ڈر سنا دے

وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۙ (مدثر) — اور اپنے رب کی بڑائی بول۔

اس طرح رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرمان مل گیا کہ جو ہدایت آپ کے لیے بارگاہِ الٰہی سے جاری ہو، اسے آپ دوسرے لوگوں تک پہنچائیں گویا نبی کے وظیفے کے ساتھ رسول کا وظیفہ بھی شامل کر دیا گیا۔ اس وحی کے بعد پھر وحی کی آمد میں ویسا انقطاع کبھی نہ ہوا جیسا پہلی اور دوسری وحی کے درمیان ہوا تھا بلکہ برابر سلسلہ جاری رہا۔ خدا کے مرسل کی حیثیت میں آپ نے بیس سال گزارے، دس سال مکہ مکرمہ میں ہجرت سے پیشتر جو ۶۲۲ء کا واقعہ ہے۔ اسی سے سنہ اسلامی کا آغاز ہوا اور دس سال مدینہ منورہ میں۔

آپ نے مکہ مکرمہ میں تبلیغ ابتداءً بڑی احتیاط سے شروع کی۔ یہ پیغام حق سب سے پہلے انھیں لوگوں کو پہنچایا جو آپ کے خاص اعزہ واحباب میں شمار ہوتے تھے۔ حضرت ابوبکرؓ سب سے پہلے مرد تھے جو اسلام لائے اور حضرت خدیجہؓ سب سے پہلی عورت تھیں جنھیں اسلام قبول کرنے کا شرف حاصل ہوا۔ اسی طرح نوجوانوں

میں حضرت علیؓ نے سبقت کی اور اجنبیوں میں سے جن لوگوں نے سب سے پہلے اسلام قبول کیا، زید بن حارثہ یمنی، بلال بن رباح حبشی اور صہیب بن سنان رومی تھے۔

مکہ میں اسلام تدریجاً پھیلا، پہلے رازداری سے تبلیغ کی جاتی تھی ہجرت سے دس سال پیشتر نبوت کے تیسرے سال اعلی الاعلان تبلیغ کی ابتدا ہوئی۔ شروع میں بڑی نرمی اور ملائمت برتی جاتی تھی اور جو لوگ ایمان نہیں لاتے تھے، ان کے دل میں کوئی رنجش یا کدورت پیدا نہ ہوتی تھی۔ لیکن جب کفر و شرک کی مذمت شروع ہوئی تو عرب مخالفت میں اٹھ کھڑے ہوئے اور انھوں نے نفرت کا اظہار شروع کر دیا۔

پہلے عربوں کی مخالفت کا ہدف صرف رسول اللہ صلعم تھے۔ ان مومنوں کے خلاف زیادہ سختی نہ برتی جاتی تھی جو ممتاز گھرانوں یا قبیلوں سے تعلق رکھتے تھے۔ البتہ مسکینوں اور ناتوانوں کے ساتھ بڑی بے رحمی کا سلوک کیا جاتا تھا۔ اس وجہ سے رسول اللہ صلعم نے ہجرت سے پیشتر نویں سال کے وسط میں گیارہ مردوں اور چار عورتوں کو شاہِ حبشہ کے پاس پناہ لینے کی اجازت دے دی۔ شاہ حبشہ نے بڑی خوش دلی سے انہیں پناہ دی اور خود بھی حلقہ بگوش اسلام بن گیا۔ ہجرت سے پیشتر آٹھویں سال میں مکہ معظمہ کے اندر زیادہ سے زیادہ چالیس مرد مسلمان تھے اور دس عورتیں اور وہ خفیہ مقام پر جمع ہوتے تھے۔ اسی سال حضرت حمزہؓ اور حضرت عمرؓ جیسے ممتاز لوگوں نے اسلام قبول کیا۔ اس سے مسلمانوں کے حوصلے اتنے بڑھ گیے کہ انھوں نے علی الاعلان کعبہ کے قریب نماز ادا کی اور اسلام تیزی سے پھیلنے لگا۔

قبولِ اسلام کی رفتار تیز ہوئی تو منکروں نے بھی تشدد اور اذیت رسانی دو چند کر دی۔ چنانچہ ہجرت سے پیش تر ساتویں سال میں تراسی مردوں اور اٹھارہ عورتوں کا دوسرا قافلہ پناہ گیری کے لیے حبشہ روانہ ہوا۔ اب رسول اللہ صلعم کی ذات پاک سازشوں کا ہدف بن گئی۔ خاندان کی دو شاخوں نے اس زمانے میں آپ کی بڑی حفاظت

کی، اول بنی ہاشم، دوم بنی مطلب[1] باقی قبیلوں اور شاخوں نے مخالفت کا حلف اٹھایا اور ایک تحریری معاہدہ کر لیا کہ جب تک محمد (صلی اللہ علیہ وسلّم) قتل کے لیے حوالے نہ کر دیے جائیں گے بنی ہاشم اور بنی مطلب سے کوئی تعلق نہ رکھا جائے گا۔ قطع تعلق کا یہ سلسلہ تین سال تک جاری رہا اور ہجرت سے پیش تر چوتھے سال میں ترک کیا گیا۔

اس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے لیے بڑے اطمینان کی صورت پیدا ہو گئی تھی، لیکن یکایک دو نہایت غم انگیز حادثے یکے بعد دیگرے پیش آئے:
اوّل آپ کے چچا ابو طالب کی وفات۔ اس سے تھوڑی دیر بعد حضرت خدیجہؓ کی وفات۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے اسے عام الحزن (غم کا سال) قرار دیا۔ آپ اہلیہ کی تسکین افروز محبت سے محروم ہو گیے تو حضرت سودہؓ سے شادی کر لی۔ یہ ایمان کی سخت آزمائش سے کامیاب و سرخرو ہو چکی تھیں۔ انھوں نے منکروں کی سختیاں سہیں، اپنے پہلے شوہر کے ساتھ ہجرتِ حبشہ کی تکلیفیں صابرانہ برداشت کیں۔ واپس آئیں تو شوہر کا انتقال ہو گیا، بہر حال اس شادی میں حضرت سودہؓ کی دل داری کا پہلو غالب تھا۔

جب رسول اللہ صلعم کے لیے چچا کی امداد باقی نہ رہی تو آپ نے حلیفوں اور حامیوں کی تلاش میں دوسرے شہر کی طرف توجہ فرمائی[2]۔ چنانچہ آپ نے دس دن طائف کے

---

[1] ہاشم رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کے جدِّ اعلیٰ تھے یعنی حضرت محمد صلعم بن عبد اللہ بن عبد المطلب بن ہاشم اور مطلّب، ہاشم کے بھائی تھے۔ مصنف کی مراد یہ ہے کہ ہاشم کی اولاد کے علاوہ مطلب کی اولاد بھی حمایت میں سرگرم تھی۔

[2] مصنف کی تعبیر اگرچہ بظاہر کتنی ہی محصرانہ ہو تاہم اس سے غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے۔ رسول اللہ صلعم کی ہر کوشش اور ہر سرگرمی صرف ایک مقصد کے لیے تھی، اور وہ یہ کہ تمام لوگ پیغام حق کو قبول کر لیں یا کم از کم ان تک یہ پیغام پہنچ جائے۔ جو لوگ قبول کرتے وہ یقیناً آپ کے حامی ہی نہیں حد درجہ فدا کار بن جاتے تاہم اصل مدعا لوگوں کی حمایت حاصل کرنا نہیں تھا۔ صرف پیغام حق پہنچانا تھا۔ افسوس کہ ثقیف بھی پہلی تبلیغ کے وقت اسلام میں سبقت کا درجہ نہ پا سکے۔

قبیلہ ثقیف میں بسر کیے مگر کچھ کامیابی نہ ہوئی آپ کے ساتھ بہت برا سلوک کیا گیا اور مقصد حاصل کیے بغیر آپ کو مکہ معظمہ لوٹنا پڑا، تاکہ حاجیوں کے ان گروہوں میں تبلیغ اسلام فرمائیں جو کعبہ کے آس پاس خیمہ لگائے بیٹھے تھے ہجرت سے پیشتر تیسرا سال تھا، جب آپ کو مدینہ[1] کے چھ آدمیوں میں قبولِ اسلام کی جھلک دکھائی دی۔ ان نیک اور سعید آدمیوں نے منیٰ میں رسول اللہ صلعم کی زبان مبارک سے پیغام حق سنا تھا۔ اسے دلی خلوص سے قبول کیا اور اس مقدس پیغام کو مدینہ لے گیے جہاں انھوں نے خاصی بڑی تعداد کو ہم نوا بنالیا۔

آئندہ سال کے اختتام کے قریب ا ہجرت سے پیشتر دوسرے سال، مذکورہ آدمیوں میں سے پانچ آدمی آئے تو سات نئے مسلمانوں کو ساتھ لائے۔ انھوں نے واپس جانے وقت بیعت کی کہ ہم مشرکانہ طور طریقوں سے پرہیز کریں گے کسی گناہ کے مرتکب نہ ہوں گے، اور نظم کے پابند رہیں گے[2]۔ مزید ایک سال گزر جانے پر بہتر آدمی مدینہ سے آئے۔ انھوں نے اطاعت کا حلف اٹھایا اور یہ وعدہ بھی کیا کہ اگر رسول اللہ صلعم اور دوسرے مسلمان بھائی مدینہ آئیں تو ان کی حفاظت کریں گے۔ اسلامی تاریخ میں یہ پہلا دفاعی معاہدہ ہے۔

---

[1] یہاں یہ بتا دینا مناسب ہے کہ اس مقام کا پرانا نام مدینہ نہیں بلکہ یثرب تھا جب رسول اکرم صلعم ہجرت کر کے یثرب پہنچے تو آپ کے قیام کے لیے جو مقام تجویز ہوا اس کی آبادی کو مدینۃ النبی یا مدینۃ الرسول کہنے لگے۔ عام زبانوں پر صرف مدینہ رہ گیا۔ بہرحال بیعت عقبہ کے وقت مدینہ کا وجود بھی نہ تھا۔

[2] پہلی بیعت میں عام اقرار یہ تھے :۔ ہم خدائے واحد کی عبادت کریں گے۔ کسی کو اس کا شریک نہیں بنائیں گے چوری اور زنا کاری نہیں کریں گے۔ اپنی لڑکیوں کو قتل نہیں کریں گے۔ کسی پر جھوٹی تہمت نہیں لگائیں گے کسی کی چغلی نہیں کھائیں گے۔ ہر اچھی بات میں نبیؐ کی اطاعت کریں گے۔ علاوہ بریں یہ بھی واضح رہے کہ یثرب میں اسلام کی ہمہ گیر اشاعت حضرت مصعبؓ بن عمیرؓ کی تھی جنھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل یثرب کی خواہش پر مبلغ بنا کر ساتھ کر دیا تھا۔

اہل مدینہ کی طرف سے یہ وعدہ ہو جانے کے بعد رسول اللہ صلعم نے مسلمانوں کو مدینہ چلے جانے کی اجازت دے دی بلکہ جن کے پاس ہجرت کر جانے کے مناسب وسائل موجود تھے، انھیں بہ تاکید فرمایا کہ مدینہ میں توطن اختیار کر لیں جن لوگوں نے کسی معقول وجہ کے بغیر مکہ معظمہ میں رہنے پر اصرار کیا، انھیں منافق سمجھا گیا[1] لیکن خود رسول اللہ صلعم نے ہجرت کر جانے اور اپنے فداکار ساتھیوں میں جانے کے لیے عجلت نہ کی آپ اس امر کے منتظر تھے کہ خدا کی طرف سے واضح ایما ہو جائے۔ تو نکلیں، یہ ایما تین مہینے کے بعد اس روز ہوا جس دن مخالفوں اور دشمنوں نے اپنی سازش بروے کار لانے کا فیصلہ کر رکھا تھا۔

ہجرت سے پیش تر مسلمان ایک قوم بلکہ ایک جماعت بھی نہ تھے۔ مکہ مکرمہ میں انھیں اکثریت بھی حاصل نہ تھی اور نہ اختیار و اقتدار کا کوئی منصب اُن کے قبضے میں تھا۔ وہ نماز کے لیے ندائے عام نہیں دے سکتے تھے۔ بسر عام جمع نہیں ہو سکتے تھے، لیکن مدینہ میں حالت اس سے بالکل مختلف تھی، وہاں اسلام علی الاعلان نشو و ارتقا پا سکتا تھا چنانچہ رسول اللہ صلعم کی تشریف آوری سے پیش تر ہی مدینہ میں نماز باجماعت کا آغاز ہو گیا جب رسول اللہ صلعم مدینہ پہنچے اور اختیارات سنبھالے تو حکومت کی بنیاد رکھ دی گئی اور مسجد النبی کی تعمیر شروع ہوئی۔

مدینہ میں رسول اللہ صلعم کا انداز حکومت بالکل نیا تھا اور اس کی کوئی مثال پہلے موجود

---

[1] میں سمجھتا ہوں یہ بیان مزید توجہ کا محتاج ہے۔ مکہ میں مسلمان ہجرت کے بعد بھی رہ گئے تھے اور سب کے لیے قیام کی محکم وجوہ موجود نہ تھیں۔ نیز جب تک اذن قتال نہیں ہوا کوئی ایسی بات نہیں کی گئی اذنِ قتال کے بعد سورہ انفال کی ایک آیت توجہ کی محتاج ہے۔ یعنی جو لوگ ایمان لائے اور ہجرت نہ کی، تمھارے لیے اس وقت تک ان کی اعانت نہیں جب تک وہ ہجرت نہ کریں۔ البتہ وہ امن کے بارے میں تم سے مدد چاہیں تو دے سکتے ہو لیکن یہ شرط لگا دی کہ مدد صرف اس گروہ کے مقابلے میں دے سکتے ہو جن کے ساتھ تمھارا معاہدہ نہیں۔ معاہدے والے گروہ کے مقابلے میں مدد نہیں دی جا سکتی۔ یہاں بھی منافقت کا اعلان نہ کیا صرف مدد اور اعانت کے اصول واضح کر دیے ذرا غور کیا جائے تو اس سے بھی مقصود حقیقی یہی ہے کہ امن کو تقویت پہنچے اور جنگ کا دائرہ زیادہ سے زیادہ محدود رہ جائے۔

نہ تھی یہ حکومت ایک ہی وقت میں مطلق العنان بھی تھی اور شورائی بھی۔ اسے حکومت الٰہیہ بھی کہا جا سکتا تھا۔ اور حکومت اشتراکی بھی۔ یہ ان معنوں میں دینی اور مطلق العنان تھی کہ اس کا پورا ڈھانچا خدا کی طرف سے نازل شدہ احکام اور قواعد و ضوابط پر مبنی تھا جن میں ردّ و بدل نہیں ہو سکتا تھا۔ البتہ قواعد و ضوابط کے اطلاق اور تفصیلات میں یہ اشتراکی اور شورائی تھی۔

رسول اللہ صلعم نے مدینہ میں جو نظام حکومت قائم کیا تھا۔ وہ ہمیشہ کے واسطے ہر قابلِ ذکر اسلامی حکومت کے لیے بہترین نمونہ ہے۔ اس نظام حکومت کو تاریخ انسانیت میں یگانہ حیثیت حاصل ہے اگرچہ یہ حکومت اصولاً اور اساساً مذہبی تھی تاہم اس نے دو اصول ایسے قائم کر دیے تھے جو غیر مذہبی حکومت کے سوا کہیں نہیں ملتے یا وہ اس مذہب میں مل سکتے ہیں جس کے ساتھ نظام حکومت وابستہ نہ ہو۔ ان میں سے پہلا اصول "مذہبی آزادی" کا ہے۔ اسلامی حکومت محض مذہبی آزادی کی اجازت ہی نہیں دیتی بلکہ اس کے واجبات میں شامل ہے کہ آزادی کی ضمانت دے اور اس کی حفاظت کرے۔ دوسرا اصول وہ ہے جس میں ملک یا قوم کے نظریے کی توضیح حد درجہ روادارانہ اور محبانہ حیثیت میں کی گئی ہے۔ اس اصول کے مطابق ملک کی تمام نسلوں تمام رنگوں، تمام زبانوں اور تمام نظریوں کے قومی حقوق و فرائض کو ایک سطح پر رکھا گیا ہے۔

ہجرت کے بعد ڈیڑھ سال کی مدت کا ملاً امن پرور اور تعمیری سرگرمیوں کے لیے وقف رہی۔ اسی زمانے میں مجلسی اور مذہبی ادارے قائم ہوئے مثلاً روزہ، صدقات، مہاجروں اور مقامی باشندوں یعنی انصار کے درمیان مواخات یا بھائی چارے کا رشتہ، آس پاس کے قبائل کے ساتھ معاہدے وغیرہ۔ ان معاملات کے سلسلے میں قوت کے استعمال کا سوال ہی سامنے نہ آسکتا تھا۔ البتہ اس میں شبہ نہیں کہ مدینہ کے پاس سے اہل مکہ کے جو قافلے گزرے ان پر چند مرتبہ چھاپے مارنے کی ناکام کوششیں مسلمانوں نے کیں۔ اس کی

دو وجہیں تھیں، اول یہ کہ مکہ میں مسلمانوں کے گھر بار اور مال و اسباب پر دشمنوں نے قبضہ کر لیا تھا مسلمان چاہتے تھے کہ اپنا نقصان پورا کر لیں۔ دوسرے جو مسلمان مکہ مکرمہ میں رہتے تھے ان پر برابر ظلم و جور ہو رہا تھا مسلمانوں کی خواہش یہ تھی کہ وہ جلد از جلد رک جائے[1]۔

[1] مسلمانوں کی طرف سے قافلوں پر چھاپے مارنے کا معاملہ خاص غور و فکر کا محتاج ہے۔ چھاپے مارنے سے جو مفہوم متبادر ہوتا ہے، اسے پیشِ نظر رکھتے ہوئے یہ واقعہ بالکل غلط ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہجرت کے وقت سے بلکہ اس سے بھی پیشتر مسلمانوں اور اہلِ مکہ خصوصاً قریش کے درمیان ایک گونہ حالتِ جنگ قائم تھی۔ مسلمان ابھی اطمینان سے بیٹھنے بھی نہ پائے تھے کہ قریش نے پہلے عبداللہ بن ابی سے، پھر یہود سے ساز باز کا سلسلہ شروع کر دیا۔ مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کو نکال دیا جائے۔ عبداللہ بن ابی ہجرت سے پیشتر حاکمی کے لئے منتخب ہو چکا تھا، بلکہ اس کے لیے ایک تاج بھی بن گیا تھا۔ اہلِ یثرب کے پاس اسلام اور مسلمانوں کے پہنچ جانے کے باعث ابن ابی کے لیے حکمران تسلیم کیے جانے کی کوئی گنجائش باقی نہ رہی اور اسے مسلمانوں سے سخت کاوش تھی۔ وہ سمجھتا تھا کہ اگر مسلمان نکل جائیں گے تو پھر اس کے لیے حکمرانی حاصل کرنے کی فضا پیدا ہو جائے گی۔ یہود اپنی فطرت و طبیعت کے لحاظ سے بھی بدعہد تھے نیز یثرب کے عربوں پر انھیں جو غیر معمولی اقتدار حاصل تھا، وہ مسلمانوں کی آمد کے بعد بالکل ختم ہو گیا تھا، اس وجہ سے وہ بہت پیچ و تاب کھا رہے تھے۔ غرض ابن ابی اور یہود دونوں قریش کے لیے مسلمانوں کے خلاف سازش کے مرکز تھے۔ پھر یہ مسلم ہے کہ اوائل ہجرت میں ہر لحظہ قریش یا ان کے ابھارے ہوئے عناصر کی طرف سے حملے کا خطرہ لگا رہتا تھا اور راتیں پہرے دے دے کر گزاری جاتی تھیں۔ یہ واقعہ سب کے نزدیک ثابت شدہ ہے کہ کرز بن جابر انصاری نے ربیع الاول ۲ھ میں یعنی جنگِ بدر سے کم و بیش چھ ماہ پیشتر مدینہ پر چھاپا مارا تھا۔ گویا اہلِ مدینہ پر یہ ثابت کرنا چاہا تھا کہ ہم تین سو میل کا فاصلہ طے کر کے جانور لے جا سکتے ہیں جو لوگ دل میں مسلمانوں کے دشمن تھے ان کے لیے یہ خاص حوصلہ افزائی کا محرک تھا۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ پہنچنے کے بعد اس کے سوا کچھ نہ کیا کہ گرد و پیش کے قبائل سے معاہدے کیے۔ اہلِ مدینہ کو متحدہ دفاع کے لیے، نہ کہ ہجوم کے لیے تیار کیا۔ قریش کی سرگرمیوں کے متعلق ہر ممکن کوشش سے اطلاعات حاصل کرتے رہے لیکن نہ کوئی حملہ کیا نہ کوئی چھاپا مارا حالانکہ حالتِ جنگ قائم تھی اور چھاپا مارتے تو اس پر اعتراض کی کوئی وجہ نہ تھی جب دشمنی کا سلسلہ جاری ہو تو دشمن کی کسی چیز کو نقصان پہنچانا فریق ثانی کا طبعی حق ہے جس سے کوئی اختلاف نہیں کر سکتا البتہ اس سلسلے کا ایک واقعہ قابلِ ذکر ہے مگر وہ بعد کا ہے۔ یعنی صلح حدیبیہ میں ایک شرط یہ بھی تھی کہ مکہ سے جو مسلمان مدینہ جائے گا، اسے واپس کر دیا جائے گا۔ عتبہ بن اسید جو ابو بصیر کر کے مشہور ہیں مدینہ پہنچے تو قریش نے ان کی واپسی کا مطالبہ کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے واپسی کا حکم دیا۔ انہوں نے راستے میں قریش کے ایک آدمی کو قتل کر دیا اور خود بھاگ گئے

ہجرت کے دوسرے سال رمضان شریف میں کافروں نے قافلوں کو روکنے کی ناکام کوششوں کے ردِّ عمل میں مدینہ کے خلاف جارحانہ اقدامات کا اعلان کر دیا۔ لہٰذا مسلمانوں کو اچانک دفاع کے لیے قدم اٹھانا پڑا۔ اگرچہ ان کی تعداد بھی کم تھی اور ساز و سامانِ جنگ بھی گھٹیا درجے کا تھا تاہم انھیں فتح حاصل ہوئی۔ ہجرت کے تیسرے سال شوال کے مہینے میں اہل مکہ نے بدلہ لیا[1]۔ بعد کے چند سالوں میں حملوں اور جوابی حملوں کا سلسلہ جاری رہا اور ہجرت کے چھٹے سال دس برس کے لیے متارکہ کا عہد ہو گیا متارکہ یا التوائے جنگ اسلام کے نشو و ارتقا کے لیے بے حد سازگار ثابت ہوا۔ اس دور میں اسلام نہ صرف حجاز کے عربوں میں پھیلا جو جزیرۃ العرب کا صرف مغربی حصہ ہے اور جس حصے کے لوگوں کو مسلمانوں سے میل جول کا موقع ملتا ہی رہتا تھا بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رومی شہنشاہ ہرقل نیز ایران و مصر، بحرین اور یمن کے تاجداروں، حاکموں اور رئیسوں کے پاس بھی دعوت نامے اور قاصد بھیجے۔

بقیہ صفحہ ۳۲:۔ ایک محفوظ مقام پر رہا ہے۔ پھر مکہ سے اور مسلمان بھی اکا دکا ان کے پاس پہنچ گئے یہ البتہ قافلوں کو روکتے تھے اور کچھ لے بھی لیتے تھے لیکن اس لیے کہ حدودِ حرم سے باہر ہوتے تھے اور نہ مسلمانوں کے تابع نہ تھے چنانچہ قریش نے خود مسلمانوں کی واپسی کی شرط منسوخ کر دی۔

صفحہ ہذا:۔ [1] یہ غالباً صحیح اسلوب بیان نہیں کہ اہل مکہ نے جنگ احد میں جنگ بدر کا بدلہ لیا۔ کہنا چاہیے کہ وہ بدلہ لینے کی نیت سے آئے تھے مگر دوسرا کوئی مقصد ان کے سامنے نہ تھا۔ مسلمانوں نے قلت تعداد کے باوجود مردانہ وار مقابلہ کیا۔ وہ مدینہ سے نکل کر احد پہنچے تھے تو ایک ہزار تھے پھر عبد اللہ بن ابی اپنے تین سو آدمیوں کے ساتھ الگ ہو کر لوٹ گیا اور میدانِ احد میں مسلمان صرف سات سو رہ گئے۔ قریش کا لشکر باختلاف روایات ساڑھے تین ہزار سے پانچ ہزار تک تھا۔ رسول اللہ صلعم نے میدان کی ایک پہاڑی پر پچاس تیر انداز بٹھا کر انھیں تاکید کر دی تھی کہ کوئی بھی صورت پیش آجائے یہ جگہ نہ چھوڑنا ان کے ذریعے سے مسلمانوں کے عقب کی پوری حفاظت ہوتی تھی لیکن قریش پیچھے ہٹے تو مال نظر آنے لگا کہ لڑائی میں مسلمان فتح یاب ہو رہے ہیں تیر انداز جگہ چھوڑ کر عام فوج میں شامل ہو گئے اور اس موقع پر قریش کے رسالے نے کوہ احد کے اوپر سے ہو کر مسلمانوں کے عقب میں حملہ کر دیا جس میں مسلمانوں کو سخت نقصان پہنچا تاہم وہ پھر جمع ہو گئے اور قریش میدان چھوڑ کر چلے گئے یہاں تک کہ مسلمانوں نے حمراء الاسد تک تعاقب کیا جو مدینہ سے آٹھ میل ہے۔

غرض احد میں مسلمانوں کا نقصان بہت ہوا مگر یہ صحیح نہیں کہ انھیں شکست ہوئی شکست قریش کو ہوئی جو میدان چھوڑ کر چلے گئے۔

ہجرت کے آٹھویں سال اہل مکہ نے متارکہ توڑا اور رسول اللہ صلعم نے فاتحانہ اقدام کر کے شہر پر قبضہ کر لیا۔ اس موقع پر رسول اللہ صلعم کی رحم دلی اور مروت و شفقت تمام اہل مکہ پر روز روشن کی طرح آشکارا ہوئی۔ آپ نے کسی پر تشدد نہ کیا، کسی کی جان نہ لی جو لوگ بیس اکیس سال آپ کو اذیتیں دیتے رہے تھے۔ ان سب کو معاف فرما دیا۔ فتح مکہ کے بعد پورے عرب نے اسلام کی حلقہ بگوشی اختیار کر لی۔ اس اثنا میں شمالی جانب رومیوں (بزنطینیوں) نے نئے مذہب پر حملے کی تیاریاں کر لیں ہجرت کے نویں سال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود ایک مہم لے کر تبوک پہنچے جو مکہ مکرمہ اور دمشق کے درمیان واقع ہے۔ یہ صورت حال دیکھ کر رومیوں کے حوصلے پست ہو گیے اور انھوں نے یورش کا ارادہ ترک کر دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شمالی سمت کے ہمسایہ خطوں سے معاہدہ کر کے مدینہ واپس تشریف لائے۔

اسی سال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے گھر سے دوست اور پیرو حضرت ابو بکرؓ کو حجاج کا رئیس بنا کر مکہ مکرمہ بھیجا اور حکم دیا کہ اعلان کر دیا جائے اس سال کے بعد مشرکوں اور کافروں کے لیے کعبہ کے پاس آنا ممنوع ہے۔ ہجرت کے دسویں سال خود رسول اللہ صلی اللہ وسلم نے فریضہ حج ادا کیا اسے عام طور پر "حجۃ الوداع" کہا جاتا ہے اسی حج میں وحی ہوئی کہ آپ جس وظیفے پر مامور ہوئے تھے وہ پورا ہو گیا گویا حیات طیبہ کی آخری منزل قریب آ گئی تھی، قرآن مجید میں ہے:

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ
اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ
لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا (مائدہ ۵: ۳)

حج کے دن تمھارے لیے تمھارا دین کامل کر دیا اور اپنی
نعمت تم پر پوری کر دی اور تمھارے لیے پسند کر لیا
کہ دین "الاسلام" ہو

جن لوگوں نے عرفہ میں آپ کا خطبہ سنا بعد میں انہیں یہ احساس ہوا کہ آپ کی آخری وصیت سن رہے تھے۔ اس خطبے میں آپ نے تمام انسانوں کو باہم برادرانہ محبت کی تلقین

فرمائی۔ انھیں بتایا کہ سب کی اصل ایک ہے۔ انسان ہونے کے اعتبار سے سب برابر ہیں۔ درجوں کا فرق و امتیاز حسنِ عمل یا تقویٰ پر موقوف ہے۔ آپ نے شخص، خاندان اور املاک کے احترام کا واضح حکم دیا[1]۔ آپ نے انتہائی لطف و محبت سے عورتوں کے ساتھ نرمی اور ملائمت کے ساتھ پیش آنے کی سفارش فرمائی[2]۔ یہ بھی فرمایا کہ میرا پیغام جن لوگوں نے نہیں سنا، سننے والے ان تک پہنچائیں۔ ممکن ہے اس سال کے بعد میں تم سے نہ مل سکوں[3]۔ آخر میں آپ نے آس پاس کے خطوں سے آنے والے حاجیوں پر نظر دوڑائی، جو حدِ نگاہ تک پھیلے ہوئے تھے اور پورا میدان ان سے بھرا ہوا تھا پھر فرمایا: خدا میرے بارے میں تم سے پوچھے گا کیا میں نے اس کا پیغام ٹھیک پہنچا دیا؟ سب نے اثبات میں جواب دیا۔ آپ نے انگشتِ شہادت آسمان کی طرف اٹھا کر فرمایا: "اے خدا گواہ رہنا" "اے خدا گواہ رہنا" "اے خدا گواہ رہنا"۔

اس خطبے کے بعد تین مہینے بھی پورے نہیں ہوئے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روح پاک ۱۲ ربیع الاول ۱۱ھ / ۷ جون ۶۳۲ء کو اپنے ابدی میں جا پہنچی[4]۔

---

[1] ارشاد یہ تھا: لوگو! تمھارے خون، تمھارے مال اور تمھاری عزتیں ایک دوسرے پر اسی طرح حرام ہیں، جیسا کہ تم لوگ آج کے دن (یوم حج) کی اس شہر کی (مکہ مکرمہ) اس مہینے کی (ماہ حج) کی حرمت کرتے ہو۔ [2] عورتوں کے متعلق فرمایا: ان کے بارے میں اللہ سے ڈرتے رہو۔ خدا کے نام کی ذمہ داری سے تم نے ان کو بیویاں بنایا اور خدا کے کلام سے تم نے ان کے جسم اپنے لیے حلال ٹھہرائے۔ تمھارا حق عورتوں پر اتنا ہے کہ وہ تمھارے بستر پر کسی اور کو نہ آنے دیں، عورتوں کا حق تم پر یہ ہے کہ انھیں اچھی طرح کھلاؤ، اچھی طرح پہناؤ۔ [3] میری معلومات کے مطابق الفاظ یہ تھے "لوگو! میں خیال کرتا ہوں میں اور تم پھر کبھی اس مجلس میں اکٹھے نہ ہوں گے" اس وقت اکثر نے یہ سمجھا کہ غالباً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پھر حج کے لیے نہ آئیں اور آئیں تو وہ لوگ موجود نہ ہوں جو حجۃ الوداع کے موقع پر موجود تھے۔ [4] صحیح اور متحقق تاریخ وفات یکم ربیع الاول ۱۱ھ ہے (۲۷ یا ۲۸ مئی ۶۳۲ء) اس سلسلے پر مفصل بحث سیرۃ النبی جلد دوم کے حاشیے میں ملاحظہ فرمایئے (صـ۱۶۰ - صـ۱۶۲)۔

رسول اللہ صلعم کے تعلق میں معجزات کا مسئلہ اکثر زیرِ بحث آیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا آپ نے قرآن مجید کے سوا بھی معجزے دکھائے؟ بلاشبہ قرآنِ مجید آپ کی وساطت سے دنیا تک پہنچا۔ یہ یقیناً معجزہ ہے بلکہ اصل معجزہ اسی کو سمجھنا چاہیے۔ یہ ہر پہلو سے معجزہ ہے، اس کا اسلوب بیان، اس کے مطالب، وہ غیر معمولی واقعات جن میں یہ نازل ہوا، سکھایا گیا اور مرتب ہوا، گزشتہ موجودہ اور آئندہ حقائق سے اس کا کامل توافق اس کی ہمہ گیر حیثیت بیہ ظاہر ہے کہ اس میں کسی خاص فرد یا معاشرے یا تاریخ کے خاص دور یا کرہ ارض کے کسی خاص خطے سے تعلقِ خصوصی کا کوئی نشان نہیں مل سکتا۔ نیز یہ کوئی ایسا عام تاریخی واقعہ نہیں جو آج نمودار ہوا ہو اور کل غائب ہو گیا بعد ازاں محض سنی سنائی روئدادوں کی بناپر اسے مرتب کر دیا گیا جنھیں کم و بیش درست مانا جا سکتا ہے۔ یہ ایک محکم و پابند حقیقت ہے، جو ہر تبدیلی و تغیّر سے کاملاً پاک رہی اور انسانوں کے احترام افروز غور و فکر کا ایک دائمی سرچشمہ ہے۔

یہ کوئی عارضی عجوبہ نہیں جو تھوڑی دیر کے لیے دلوں کو متاثر کر دے اور جس نئے علم کو متاثر کرنے کے لیے یہ آیا۔ اس سے اسے اجنبیت ہو، یہ حق ہے، ایسا حق جو اپنے اثبات کے لیے کسی دوسری شے کا محتاج نہیں۔ یہ عقل و فہم کو اپیل کرتا ہے، بہ ایں ہمہ عقل و فہم سے بالاتر ہے۔ یہی اس کے آسمانی ہونے کی شہادت ہے تاہم واضح رہنا چاہیے کہ قرآن مجید کو "المعجزہ" مان لینے کا مطلب یہ نہیں کہ دوسرے مادی اور مشہور معجزوں کی قدر و قیمت کم تسلیم کر لی جائے۔ جن کا علم ہمیں خود اس کے ذریعے سے ہوا۔ یہ معجزات بھی ہمارے دل میں یقین و ایمان پیدا کر سکتے ہیں۔ کم از کم ان کے ذریعے سے ہمارے ایمان کو تقویت ضرور پہنچتی ہے، یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلعم سے پیشتر جو پیغمبر آئے انھوں نے بھی معجزے دکھائے۔

سوال یہ ہے کہ کیا پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی کیفیت بھی یہی تھی؟ کیا آپ نے

قرآن مجید کے علاوہ بھی معجزے پیش کیے ؟ رجحان یہی ہے کہ اس سوال کا جواب نفی میں ہے بلکہ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ قرآن مجید سے اس نقطۂ نگاہ کا ثبوت ملتا ہے ۔ بیان کیا جاتا ہے کہ جو لوگ معجزے کا مطالبہ کر رہے تھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا مطالبہ پورا کرنے سے مسلسل انکار کا سلسلہ جاری رکھا ۔ مثلاً :

وَقَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْۢبُوْعًا ۙ اَوْ تَكُوْنَ لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّعِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْاَنْهٰرَ خِلٰلَهَا تَفْجِيْرًا ۙ .... اَوْ يَكُوْنَ لَكَ بَيْتٌ مِّنْ زُخْرُفٍ اَوْ تَرْقٰى فِي السَّمَآءِ ؕ وَلَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتّٰى تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتٰبًا نَّقْرَؤُهٗ ؕ

(بنی اسرائیل ۹۰: ۹۳)

اور انھوں نے کہا ہم تو اس وقت تجھے ماننے والے نہیں جب تک تو ہمیں ایسی باتیں کر کے نہ دکھا دے (مثلاً) ایسا ہو کہ حکم کرے اور زمین سے ایک چشمہ پھوٹ نکلے یا تیرے پاس کھجوروں اور انگوروں کا ایک باغ ہو اور اس کے درمیان بہت سی نہریں رواں کر کے دکھا دے ...... یا ہم دیکھیں کہ سونے کا ایک محل تیرے لیے مہیا ہو گیا ہے یا ایسا ہو کہ تو بلند ہو کر آسمان پر چلا جائے اور اگر تو آسمان پر چلا بھی گیا تو ہم تیری بات ماننے والے نہیں جب تک ایک کتاب ہم پر نہ اتار لائے اور ہم خود اسے پڑھ کر جانچ لیں ۔

پھر ارشاد ہوتا ہے :

وَقَالُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيٰتٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَاِنَّمَآ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۝ اَوَلَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَرَحْمَةً وَّذِكْرٰى لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۝

(عنکبوت ۵۰: ۵۱)

اور کہتے ہیں کیوں نہ اتریں ان پر کچھ نشانیاں اس کے پروردگار کی طرف سے ، تو کہہ نشانیاں تو ہیں اللہ کے اختیار میں اور میں تو بس کھول کر سنا دینے والا ہوں ۔ کیا ان کو یہ کافی نہیں کہ ہم نے تجھ پر کتاب اتاری کہ ان پر پڑھی جاتی ہے ۔ بے شک اس میں رحمت ہے اور سمجھانا ان لوگوں کو جو مانتے ہیں ۔

معجزے دکھانے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے انکار کا یہ نظریہ اصولاً شدید غلط

فہمی کا نتیجہ ہے، اول مذکورہ بالا آیات کا مطلب سمجھنے میں سخت غلطی سرزد ہوئی اور دوسرے معجزوں کے صدور و ظہور کا جو اصل سرچشمہ ہے، اس کے متعلق اسلامی تصور سے انحراف کیا گیا۔ مذکورہ بالا آیات میں معجزے کے امکان سے انکار نہیں کیا گیا۔ صرف یہ بتایا گیا ہے کہ معجزہ خدا کی طرف سے ہوتا ہے، وہی مخلوق کو جو شکل چاہے دے سکتا ہے۔ اسی سے ایسے افعال کا ظہور ممکن ہے جو طبعی حدود سے ماوراء ہوں۔ یہاں انسانی اور خدائی اختیار و قدرت میں حد بندی کر لینا ضروری ہے جو شخص ان دونوں چیزوں کو خلط ملط کر دے یا یہ اعتقاد رکھے کہ پیغمبر خود معجزوں کا بندوبست کر لیتے تھے تو سمجھ لینا چاہیے کہ وہ ابھی تک صحیح اسلامی عقیدے سے آشنا نہیں ہوا پیغمبر بھی انسان ہوتے ہیں۔ وہ مادی قوانین کے دائرے سے باہر نہیں جا سکتے۔ یہ قدرت صرف باری تعالےٰ کو حاصل ہے، وہ جب چاہے معجزے کا بندوبست کر سکتا ہے اور اس طرح پیغمبر کے سنائے ہوئے احکام کی آسمانی حقانیت کا ثبوت دنیا کے سامنے آ سکتا ہے۔

خوب سمجھ لینا چاہیے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے عصا کو سانپ نہیں بنایا تھا۔ اس خدائی تبدیلیِ ہیئت سے تو وہ خود حد درجہ متحیر ہو گئے تھے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے مردوں میں زندگی کی تازہ روح نہیں پھونکی تھی، یہ تو سب کچھ خدا کے حکم سے ہوتا تھا۔ اور جب ان سے مطالبہ کیا گیا کہ کوئی آسمانی نشانی پیش کرو اور انھوں نے انکار کیا تو کیا اس کا یہ مطلب تھا کہ آئندہ کے لیے انھوں نے معجزے دکھانے کا سلسلہ ختم کر دیا تھا؟ یہ تصور بدیہی طور پر غلط ہے۔

پس اگر رسول اللہ صلعم نے بعض کفار کی درخواست منظور نہ کی تو اس معاملے کی حیثیت بھی یہی ہے۔ بلاشبہ آپ نے فرمایا کہ معجزے دکھانا میرا کام نہیں، لیکن اس جواب کی حیثیت وہی ہے جو قرآن مجید کے تعلق میں دیا گیا۔ یعنی قرآن مجید محمد صلعم نے نہیں بنایا، یہ تو روح الامین (جبریل علیہ السلام) نے خدا کے حکم سے محمد صلعم کے

قلب پر اتارا[1] اور ودیعت کر دیا تاکہ یہ مومنوں کے لیے ہدایت و فرحت کا باعث بنے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس میں ایک شوشہ بھی بدل نہیں سکتے تھے، بلکہ انھیں پہلے سے یہ علم بھی نہ تھا کہ وہ اس پیغام حق کے حامل بنیں گے:

غرض معجزے مادی ہوں یا روحانی، ان میں سے کوئی بھی انسان کے اختیار میں نہیں ان کا تعلق کاملاً خدا کے دائرہ قدرت و اختیار سے ہے۔ تمام پیغمبر اس حقیقت کا اعتراف کرتے رہے کہ وہ بھی عام انسانی تحدیدات کے تابع ہیں نہ وہ خود کوئی معجزہ دکھا سکتے تھے نہ اس قوم کی طلب پر معجزہ رونما ہو سکتا تھا جس کی طرف کوئی پیغمبر بھیجا گیا اور نہ کوئی پیغمبر اپنی خواہش کے مطابق معجزوں میں رد و بدل کر سکتا تھا۔ اللہ تعالےٰ اپنی مشیت کے مطابق فرمان کسی کے نام صادر کر دیتا ہے۔ اور وہ تاریخ کے کسی دور یا انسانیت کے کسی گروہ کی ہدایت پر مامور ہو جاتا ہے۔ ہر دور کے لیے کتاب اور ہر قوم کے لیے ہادی ہے:

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ	اور یہ واقعہ ہے کہ ہم نے تجھ سے پہلے بھی قوموں کی طرف پیغمبر
وَجَعَلْنَا لَهُمْ اَزْوَاجًا وَّذُرِّيَّةً ؕ	بھیجے اور وہ تیری ہی طرح انسان تھے (ہم نے انھیں بیوی بچے بھی دیے تھے)
وَمَا كَانَ لِرَسُوْلٍ اَنْ يَّاْتِيَ بِاٰيَةٍ	اور ان میں سے کسی پیغمبر کے لیے یہ بات نہ ہوئی کہ وہ (خود) کوئی نشانی لا دکھاتا مگر
اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ لِكُلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ ۝	اس وقت کہ اللہ کا حکم ہوا ہو۔ ہر وقت کے لیے ایک کتاب ہے۔

(رعد - ۳۸)

اسلامی اصطلاحات میں معجزے کی تعریف عموماً یہ کی جاتی ہے۔ ایک واقعہ جو عام قواعد کے خلاف ہو جو واقعات کی عادی رفتار سے متفاوت ہو اور اس کے اسباب انسانی تصوّر کی گرفت میں نہ آسکیں۔ نیز یہ واقعہ ہر اس شخص کے لیے ایک چیلنج ہوتا ہے۔ جو اس کی تشبیہ کرے۔ جو حقیقت ان تمام شرطوں کو بدیہی طور پر پورا کرتی ہے، وہ صرف قرآن مجید ہے۔

[1] سورہ شعراء میں ہے: وانہ لتنزیل رب العالمین۔ نزل بہ الروح الامین علی قلبک لتکون من المنذرین (اور یہ قرآن پروردگار عالم کا اتارا ہوا ہے۔ اسے معتبر فرشتے نے کر اترا تیرے دل پر تاکہ تو ڈر سنانے والا ہو۔)

جس نے بار بار اور مختلف ذریعوں سے تحدی کے ساتھ جن و انس کو پکارا اور پیش گوئی کر دی کہ وہ کبھی ثابت نہ کر سکیں گے کہ یہ کتاب خدا کا معجز نما پیغام نہیں۔ پہلے یہ فرمایا گیا کہ اس جیسی کوئی کتاب لے آؤ۔ پھر دعوت دی گئی کہ اچھا پوری کتاب نہیں تو ایسی دس سورتیں ہی لے آؤ۔ پھر اس جیسی ایک سورت پر اکتفا کر لیا گیا۔ آخر میں کہا گیا کہ اچھا ایک سورت ایسی لے آؤ جو قرآن مجید سے ایک حد تک بھی ملتی جلتی ہو۔

باقی رہا یہ مسئلہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن مجید کے علاوہ بھی معجزے دکھائے یا نہ دکھائے تو اس کا جواب معجزے کی تعریف پر موقوف ہے۔ اگر مقصود یہ ہو کہ اس کے باب میں تحدی کا صاف صاف اعلان ہوا تو کہہ دینا چاہیے کہ قرآن مجید کے سوا ایسے معجزے کا وجود نہیں لیکن اگر ہم تحدی کے واضح ہونے کی خود ساختہ شرط حذف کر دیں تو بہت سے معجزے ملتے ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات سے ظہور میں آئے۔ ان میں سے بعض کا ذکر خود قرآن مجید میں آیا ہے۔ مثلاً:

(۱) مکہ مکرمہ (مسجد الحرام) سے یروشلم (مسجد اقصیٰ) تک راتوں رات رسول اللہ صلعم کی سیر جو یقیناً ایسے ذرائع سے ہوئی جنھیں عادی و طبعی نہیں قرار دیا جا سکتا۔ اس سیر میں بہت سی الٰہی نشانیاں دکھائی گئیں۔ آپ کو تمام مقامی تفصیلات سے آگاہی حاصل ہوئی۔ بعد میں آپ نے یہ تفصیلات بیان فرمائیں تو سننے والے حیران رہ گئے۔ (سورہ بنی اسرائیل: ۱)

(۲) سطح قمر میں انشقاق، یہ معاملہ ایک مجمع کے سامنے پیش آیا جنھیں آپ خطاب فرما رہے تھے۔ سیاحوں نے بھی اسے دیکھا اور اس کی تصدیق کی (سورہ قمر: ۱)

(۳) دشمنوں کی فوج پر معجز نما فتح۔ یہ فتح مومنوں کی ایک چھوٹی سی جماعت کے ہاتھوں انجام پائی جن کے پاس اسلحہ بھی بہت معمولی اور کم تھا۔ تاہم انھیں آسمانی امداد حاصل تھی (سورۂ انفال: ۱۷)

(۴) مدینہ کے اندر جو معاشرہ ٹکڑوں میں بٹا ہوا تھا۔ بارہ سال کی خانہ جنگی اور نفرت نے

اسے غشتگی کی آخری منزل پر پہنچا دیا تھا، وہ ایک رات میں گھرے دوستوں کی متحدہ جماعت بن گیا فکر و نظر کا یہ فوری انقلاب کسی ارضی قوت کے ذریعے سے بپا نہیں ہو سکتا تھا سورۂ آل عمران ۳: ۱۰۳، نیز سورہ انفال: ۶۳)

(۵) رسول اللہ صلعم نے الہام کے ذریعے سے وہ باتیں بیان فرمائیں جو آپ سے مخفی رکھی گئی تھیں (سورۂ نساء ۴: ۱۱۳، نیز سورہ تحریم: ۳)

(۶) بہت سی پیش گوئیاں کی گئیں مثلاً ایرانیوں پر رومیوں کی فتح حاصل کرنے کی صحیح تاریخ (سورہ روم: ۲ تا ۶)

(۷) بہت سے تاریخی حقائق کا صحیح صحیح بیان جن سے آپ آگاہ نہ تھے (سورہ ہود آیہ ۴۹، سورہ یوسف: ۱۰۲، سورۂ قصص: ۴۴ تا ۴۶)

جن معجزوں کا ذکر قرآن مجید میں نہیں، ان میں سے صرف چند ایک کا ذکر یہاں کیا جاتا ہے۔ یہ معجزے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بر سرِ عام صادر ہوئے اور ان کی کیفیت راوی نسلاً بعد نسلاً کرتے رہے۔ ان راویوں کے نام اور نسب محفوظ ہیں مسلّم ہے کہ وہ ہر لحاظ سے قابلِ اعتماد تھے۔ یہ مثالیں صحیح بخاری کے باب علامات النبوۃ سے لی گئی ہیں:

(۱) آپ کی پیش گوئی کہ روم اور ایران کی سلطنتیں ان بادشاہوں کی وفات کے بعد درہم برہم ہو جائیں گی۔ جو آپ کے ہم عصر تھے۔

(۲) شاہ حبشہ کی جس روز وفات ہوئی تھی اسی روز اس کی وفات کا اعلان ہو گیا حالانکہ حبشہ سے خبر مدینہ پہنچنے میں خاصے دن لگتے تھے)

(۳) ہجرت کے پانچویں سال کفار مکہ کے خلاف جنگ کے بعد (جنگ احزاب) یہ یقین دلا دیا کہ اب اہل مکہ کبھی مدینہ پر چڑھائی نہ کر یں گے اور مسلمان مکہ مکرمہ کو فتح کر لیں گے۔

(۴) یہ پیش گوئی کہ آپ کا نواسا حسن رضؓ مسلمانوں کے دو بڑے فریقوں کے درمیان کش مکش کو ختم کر کے اتحاد و یک جہتی پیدا کر دے گا۔ یہ پیش گوئی حضرت حسن رضؓ نے پوری

کر دی اور اسی بنا پر حضرت معاویہ رضؓ خلیفہ بنے۔

(۵) خشک سالی یا پانی کی نایابی کے اوقات پانی مہیا ہو جانا یہ معجزہ ایک سے زیادہ مرتبہ صادر ہوا مثلاً فوج پیاسی تھی۔ رسول اللہ صلعم نے اپنی انگشتہائے مبارک ایک چھوٹے سے برتن میں ڈال دیں اور اتنا پانی مہیا ہو گیا کہ پندرہ سو مجاہدین نے پیاس بجھائی، وضو کیا اور جانوروں کو بھی پانی پلایا (حدیبیہ کا واقعہ ہے)

(۶) جمعہ کے دن آپ وعظ فرما رہے تھے ایک بدو نے شکایت کی کہ موسم برابر خشک چلا آرہا ہے۔ ظاہر ہے کہ قحط رونما ہوگا۔ رسول اللہ صلعم نے بارش کے لیے دعا فرمائی۔ ہر طرف سے بادل گھر آئے اور آئندہ جمعہ تک برابر بارش ہوتی رہی۔

(۷) دوسرے جمعہ کو اسی بدو نے یہ شکایت پیش کر دی کہ بارش نے ہمیں تباہ کر دیا آپ نے بارش تھم جانے کی دعا کی اور مطلع صاف ہو گیا۔

(۸) ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک درخت کے ٹھنہ پر بیٹھے ہوئے خطبہ ارشاد فرما رہے تھے، پھر آپ وہاں سے اٹھ کر اونچی جگہ جا بیٹھے اس لیے کہ سامعین کی تعداد زیادہ ہوگئی تھی اور ان سب کو بہ آسانی خطاب کرنے کے لیے اونچی جگہ بیٹھنا ضروری تھا۔ تمام حاضرین نے سنا کہ ٹھنہ رو رہا ہے۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ٹھنہ کو آغوش میں لے کر اسی طرح تسلی دی جس طرح بچے کو تسلی دی جاتی ہے۔

یہ صرف چند مستند مثالیں ہیں اور یہ وہ معجزے ہیں جو قرآن مجید کے معجزے کے علاوہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے صادر ہوئے۔

قرآنِ مجید۔

سب سے بڑا معجزہ ہدایت قرآن مجید تھا، جو چھوٹی بڑی سورتوں کی شکل میں تیئیس سال کے اندر بہ اوقات مختلف نازل ہوتا رہا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جیسے ہی وحی نازل ہوتی آپ حاضرین کو سنا دیتے اور وہ تدریجاً عام لوگوں تک پہنچ جاتی عرب کے تمام باشندے

ادبیات کا ذوق رکھتے تھے اور موافق و مخالف سب نئے پیغام اور نئی وحی کے منتظر رہتے تھے۔

قرآن مجید کا جو نیا ٹکڑا نازل ہوتا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم اپنے کاتبانِ وحی کو لکھوا دیتے۔ اور ان لوگوں کو لکھنے کی جو بھی چیز میسر ہوتی، اس پر لکھ لیتے۔ چنانچہ بعض ٹکڑے پتلے سفید پتھر پر۔ بعض چرمی کاغذ یا جھلّی پر اور بعض لکڑی یا چمڑے پر لکھے گیے۔ روایات سے واضح ہوتا ہے کہ مدینہ منورہ میں کم و بیش انتیس افراد تھے جنھیں کتابتِ وحی کا کام سپرد تھا۔ مکہ معظمہ میں جو لوگ کتابت پر مامور تھے، ان کی تعداد کم تھی بغرض ابتدا ہی سے کتابت کا سلسلہ جاری رہا اور یہ سلسلہ اس دور میں بھی نہ رکا جب مسلمانوں پر بے پناہ سختیاں ہو رہی تھیں۔ ان کاتبوں میں حضرت ابوبکرؓ حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت علی حضرت معاویہؓ بھی شامل تھے۔

اس طرح اسلام کی کتاب مقدس یعنی قرآن مجید لکھا بھی گیا اور یاد بھی کر لیا گیا۔ زبانی پڑھنے کی حالت میں اسے "قرآن" کہا جاتا تھا اور کتابت شدہ حالت میں "کتاب"۔

شروع میں مختلف کتابت شدہ ٹکڑے نہ مرتّب تھے اور نہ یک جا رکھے گیے تھے اس لیے کہ مزید وحی کا انتظار تھا۔ آہستہ آہستہ بہت سے مجموعے فراہم ہو گیے۔ نئی آیتیں نازل ہوتیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق انھیں مناسب مقامات پر لکھ لیا جاتا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کو ترتیب کا علم تھا۔ اگرچہ متن قرآن کے مجموعے جا بجا پڑے تھے لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مومنوں کو ہر آیت اور سورت کا موقع اور محل معلوم تھا۔ صحابہ اکرامؓ میں سینکڑوں تھے جنھیں حفاظِ قرآن کہتے تھے۔ وہ ہر سورت زبانی سنا دیتے تھے اور انھیں یہ بھی معلوم تھا کہ اس سورت کا تعلّق متعلقہ پارے کے کس حصے سے ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی وفات پر قرآن مومنوں کے حافظوں میں بھی محفوظ تھا۔

اور کتابت شدہ بھی موجود تھا۔ حفظ کی شکل میں تو ہر سورت کی ترتیب وہی تھی، جیسی اب ہے البتہ کتابت کی شکل میں مختلف اجزا الگ الگ تھے۔ ابتدا میں کسی کو کتابت شدہ اجزا کا خیال بھی نہ تھا، اس لیے کہ سینکڑوں حافظ موجود تھے جو قرآن مجید کے زندہ نسخوں کی حیثیت رکھتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات پر ایک سال گزر گیا اور ستر حافظ مسیلمہ کذاب کے خلاف ایک جنگ میں شہید ہو گیے تو ضرورت واضح ہو گئی کہ حافظوں کے سینوں میں جو کچھ موجود ہے اسے کتاب کی شکل میں مرتب کر لینا چاہیے۔ کتاب مرتب کر لینے کی تجویز حضرت عمرؓ نے پیش کی تھی اور اس تجویز کو زیدؓ بن ثابت نے لباس عمل پہنایا۔ وہ بھی حافظ قرآن میں تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جو آخری وحی ہوئی تھی اسے بھی سن چکے تھے۔ علاوہ بریں وہ علم، دیانت اور صلاحیت میں معروف تھے۔

زیدؓ بن ثابت کے زیر اہتمام قرآن کی صحیح کتابت کا انتظام ہوا۔ صرف وہی سورتیں یا ٹکڑے اس میں شامل کیے گیے جن کی تصدیق کم از کم دو کاتبانِ وحی سے ہوئی نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آخری قرأت قرآن کی بھی شہادت میسر آ گئی۔ اس طرح جو نسخہ مرتب و مدون ہوا سو وہ اصل قرآن قرار پایا۔ اس کے سوا مختلف اصحاب نے جو مجموعے فراہم کر رکھے تھے اور ان میں تشریحی نوٹ بھی شامل کر لیے تھے۔ وہ سب کالعدم قرار دیے گیے۔ یہ مکمل نسخہ مکتوب خلیفۃ الرسولؐ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے حوالے کر دیا گیا۔ انھوں نے جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اپنا جانشین نامزد کیا تو یہ نسخہ ان کے حوالے کر دیا۔ چونکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی وفات کے وقت تک حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا انتخاب نہیں ہوا تھا اس لیے حضرت عمرؓ نے یہ نسخہ اپنی صاحبزادی ام المومنین حضرت حفصہؓ کو سونپ دیا۔

مکتوب قرآن مجید کی اشاعت تیسرے خلیفہ حضرت عثمانؓ سے ہوئی۔ انھوں نے اصل قرآن ام المومنین حضرت حفصہؓ سے لیا۔ چار کاتبوں کو حکم دیا کہ اس کی نقلیں کریں اور

اسلامی خلافت کے دائرے میں جتنے بڑے شہر تھے، اتنے نسخے تیار کر کے بھجوا دیے اس وقت سے حضرت عثمانؓ ہی کا شائع کردہ نسخہ دنیائے اسلام میں قرآن مجید کا واحد نسخہ رہا ہے۔

ابتدا ہی سے یہ سوال کیا جاتا رہا ہے کہ قرآن مجید بہ اعتبار اصل، الہی کتاب ہے یا انسانی کتاب ہے۔ قرآن مجید کی واضح اور مضمر شہادت یہی ہے کہ یہ اللہ تعالٰی کی طرف سے نازل ہوا اور اس میں متکلم پیغمبر نہیں بلکہ خود خدائے دوجہان ہے۔ کتاب میں رسول اللہ صلعم سے خطاب کبھی بہ صیغہ غائب اور کبھی بہ صیغہ حاضر ——— اے ہمارے نبی، اے ہمارے رسول، ہم نے یہ کتاب تم پر اتاری، ہم نے تجھے رسول بنا کر بھیجا، یہ کر، یہ لوگوں کو سنا ——— یہ قرآن مجید کا طریق بیان اور اسلوب خطاب ہے۔ ۳۰

قرآن مجید کے آسمانی کتاب ہونے کا ثبوت ہر حصے سے نمایاں ہے صحیح اور مستند روایات کی شہادت سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ قرآن مجید کے کسی ٹکڑے کے نزول کے وقت خاص کیا کیفیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم پر طاری ہوتی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے معاصر خاص کیفیت کے مرئی محسوس اور مسموع نشانات کے عینی شاہد تھے۔ ان سے قرآن کا حقیقی سرچشمہ واضح ہوا اور حق و صداقت کی جستجو کرنے والوں کی آنکھیں کھلیں۔ وحی الہی کے نزول کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کا چہرہ مبارک آئینے کی طرح دمک اٹھتا تھا۔ آپ خاموش ہو جاتے جسم اطہر ڈھیلا پڑ جاتا۔ جیسے کہ آپ حالتِ خواب میں ہوتے، اور اردگرد ایک پُراسرار آواز سنائی دیتی ——— بلا تشبیہ کہہ سکتے ہیں، جیسے ٹیلی فون پر گفتگو ہو رہی ہو یعنی پوری گفتگو وہی سمجھتا ہے جو براہ راست سنتا ہے، پھر یہ کیفیت اختیاری نہ تھی۔ جب یہ طاری ہو جاتی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسے روک نہ سکتے تھے، اور یہ بھی واقعہ ہے کہ یہ کیفیت

طاری نہ ہوتی حالانکہ آپ وحی کے منتظر ہوتے تھے۔

آپ نے کئی مرتبہ وحی کی خواہش کی، مگر نہ ہوئی۔ گاہے گاہے ایک ایک ماہ تک وقفہ ہو جاتا، اس کے بعد یہ پُراسرار حالت پیش آتی۔ آتی بھی تو اچانک اور یکایک، اسی طرح اچانک اور یکایک رخصت ہو جاتی۔ اسی وقت آپ حاضرین کو تازہ وحی سنا دیتے۔

پھر اسلوب بیان اور مطالب، قرآن مجید کے آسمانی کتاب ہونے کی بیّن اور قطعی شہادت پیش کر رہے ہیں جس کے بعد کسی دوسری شہادت کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ لیکن اس شہادت کو زیر غور لانے سے پیشتر ہمیں ان دلائل کا جائزہ لے لینا چاہیے، جن کی بنا پر یہ ثابت کرنے کی کوششیں کی گئیں کہ قرآن مجید کا سرچشمہ آسمانی نہیں، بلکہ انسانی تھا۔ قرآنِ مجید کا ایک کمال یہ ہے کہ اس نے وہ تمام معقول وغیر معقول دعاوی محفوظ کر دیے۔ جو معاصرین اس کے انسانی ہونے کے لیے پیش کرتے رہے تھے۔ اب یہ سوال سامنے آتا ہے کہ اگر قرآنِ مجید انسانی کلام تھا تو یا تو اس کی ذمہ دار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات تھی۔ یا اس زمانے کے مروجہ مذاہب میں سے اس کے مطالب اخذ کیے گیے یا یہ سب کچھ انسانی غور و فکر اور دلیل و نظر کا کرشمہ تھا۔ آئیے ہم رسالت سے پیشتر اور رسالت کے بعد رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی سرگرمیوں پر ایک نظر ڈال لیں اور دیکھیں کہ آپ گرد و پیش سے کیا کچھ سیکھ سکتے تھے یا غور و فکر سے کیا کچھ حاصل کر سکتے تھے۔

یہ حقیقت محتاجِ تصریح نہیں کہ اسلام کے آغاز پر اہل مکہ کے جو افکار و اعمال تھے، انھیں قرآنِ مجید کی تعلیماتِ مقدسہ سے کوئی بھی مناسبت نہ تھی۔ کتاب مقدس اسلام کے خالص وغیر ممزوج نظام توحید اور اس کے کامل و اکمل ضابطہ اخلاق کو ایک طرف رکھیے، اس کے مقابلے میں اس عہد کے شہر مکہ کی حالت پر غور کیجیے۔ وہاں کیا نظر آتا ہے؟ جہالت کفر و جحود، اوہام طرازی، اصنام پرستی، نہایت پُرغرور مادیت، فحش کاری، ہوس رانی، جہیز کے نام سے جبراً رقمیں وصول کرنا یتیموں پر ظلم و جبر، غربا و مساکین سے بے پروائی۔

کمزوروں اور ناتوانوں سے نفرت۔ ان دونوں صورتوں کے درمیان کیا تعلق اور کیا نسبت تلاش کی جا سکتی ہے۔؟

یہ بھی کہا جا چکا ہے کہ قرآن مجید کی تعلیم صابیوں کے مذہب سے ملتی جلتی تھی۔ صابی اس زمانے میں مکہ معظمہ کا ایک معروف فرقہ تھے لیکن وہ بتوں کو پوجتے تھے، شرک کے مرتکب تھے۔ ستاروں اور فرشتوں کی پرستش کرتے تھے اور انھوں نے مشرکوں، مسیحیوں اور دوسرے فرقوں کی مختلف رسموں سے اپنے لیے ایک ملغوبہ تیار کر لیا تھا۔ پھر ان کا دینی مرکز کعبہ نہ تھا، بلکہ حران تھا، جو عراق میں واقع ہے اور وہ طلوع و غروب نیز نصف النہار کے وقت ستاروں کی پوجا کرتے تھے —— یہ تین وقت ایسے ہیں جن میں اسلام کے مطابق نماز ممنوع ہے۔

یہ بھی کہا گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان مسافروں اور مہاجروں سے کچھ خیالات لے لیے، جو مکہ میں آ بسے تھے اور آتے رہتے تھے۔ مثلاً حبشی یا رومی یا مزدور یا شراب کے سوداگر۔ ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلعم باہر سے آئے ہوئے ان لوگوں کے ساتھ میل جول پیدا نہیں کر سکتے تھے، آپ یا تو کامل تنہائی اور خلوت میں رہتے یا ریوڑ چراتے یا قافلوں کے ساتھ تاجر کی حیثیت میں چلے جاتے تھے یا قوم کے سرداروں کے ساتھ بات چیت کرتے تھے۔ اگر مذکورہ بالا لوگوں کے ساتھ کسی قسم کا تعلق پیدا بھی ہوتا تو ظاہر ہے کہ وہ کیا مذہبی معلومات فراہم کر کے دے سکتے تھے، جب کہ خود ان معلومات سے ناآشنا تھے۔ قرآن نے خود یہ حقیقت واضح کر دی ہے کہ اُن کی زبان اجنبی ہونے کے باعث مذاکرہ[1] ممکن نہ تھا۔

---

[1] اشارہ سورہ نحل کی آیت ۱۰۳ کی طرف ہے، یعنی:

ولقد نعلم انہم یقولون انما یعلمہ بشر لسان الذی یلحدون الیہ اعجمی وھذا لسان عربی مبین ۝ — اور بلا شبہ ہم جانتے ہیں کہ یہ لوگ (قرآن کے بارے میں کیا کہتے ہیں، یہ) کہتے ہیں کہ اس شخص کو تو ایک آدمی (یہ باتیں) سکھا دیتا ہے، حالانکہ اس آدمی کی زبان جس کی طرف اسے منسوب کرتے ہیں عجمی ہے اور یہ صاف اور آشکارا عربی زبان ہے۔

جن آدمی کی طرف اشارہ ہے، اس کے متعلق متعدد ناموں کا ذکر آیا ہے لیکن یہ سب فضول، بے معنی اور بے بنیاد باتیں ہیں۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ رسول اللہ صلعم اپنے تجارتی سفروں میں اُن عرب قبیلوں سے روشناس ہوئے جنھوں نے مسیحیت قبول کر لی تھی اور یہ تمام خیالات اُن ہی سے لیے۔ دورِ قدیم اور دورِ جدید کے بہت سے علمائ نے توضیح کر دی ہے کہ مسیحیت کے ساتھ ایسا ربط و ضبط پیدا کرنا ممکن نہ تھا۔ تاہم اگر ایسا ہوتا بھی تو مسیحیت نے اس حصۂ ارض میں اس درجہ خراب عملی حالت اختیار کر رکھی تھی کہ اس میں اور لا مذہبیت میں کوئی فرق نہیں رہا تھا۔ چوتھے خلیفہ حضرت علیؓ نے فرمایا کہ قبیلہ تغلب نے مسیحی بن کر اور تو کچھ حاصل نہ کیا البتہ اُسے شراب نوشی کی لت پڑ گئی۔ رسول اللہ صلعم جہاں کہیں تشریف لے گیے یہی دیکھا کہ عقیدے بگڑے ہوے ہیں اور عملی گمراہی پھیلی ہوئی ہے ——— سیدھے راستے اور صحیح عقیدے پر کوئی قائم نہیں رہا۔ آپ نے کہیں بھی کوئی ایسا اخلاقی یا مذہبی نمونہ نہ دیکھا جسے اصلاحی کام میں مدِّ نظر رکھا جا سکتا۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ رسول اللہ صلعم نے اپنی تعلیمات پہلے کی نازل شدہ الہامی کتابوں سے حاصل کیں، لیکن قرآن مجید نے تو صاف کہہ دیا ہے کہ رسول اللہ صلعم پڑھنا یا لکھنا جانتے ہی نہ تھے[1] نیز بائیبل اُس وقت تک عربی زبان میں منتقل ہی نہ ہوئی تھی۔ یہ کام رسول اللہ صلعم سے کئی صدیوں بعد انجام پایا۔ بائیبل کے جو نسخے دوسری زبانوں میں ملتے تھے وہ عام لوگوں کے فہم کی دسترس سے باہر تھے۔ بائیبل کے چند افکار جو عام لوگوں میں رائج سمجھے جا سکتے تھے اتنے مبہم اور متضاد تھے کہ اُن کی بنا پر قرآن مجید جیسی کتاب تیار کرنا غیر ممکن تھا جو صحت، وسعت، مضامین کے تسلسل اور زور و قوت کے اعتبار سے یگانہ ہے۔

---

[1] وما کنت تتلوا من قبلہ من کتاب ولا تخطہ بیمینک اذًا لارتاب المبطلون ٥ (عنکبوت: ۴۸)
وہ تو پڑھتا نہ تھا اس سے پہلے کوئی کتاب اور نہ لکھتا تھا اپنے داہنے ہاتھ سے۔ تب تو البتہ شبہ میں پڑتے یہ جھوٹے۔

اگرچہ یہ حقیقت روز روشن کی طرح آشکارا ہے کہ دنیا بھر کے پڑھے لکھے انسان مل کر بھی قرآن مجید جیسی بے مثال کتاب تیار نہیں کر سکتے لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کے تو چالیس سال اہل مکہ کے سامنے تھے اور وہ جانتے تھے کہ آپ نے کبھی لکھنا پڑھنا نہ سیکھا

ممکن ہے کہا جائے کہ رسول اللہ صلعم مدینہ پہنچنے کے بعد یہودیوں کی تعلیمات سے متاثر ہوئے اور مدینہ میں آپ کو یہودی عالموں سے میل جول کا موقع حاصل تھا لیکن یہ قول اس وجہ سے باطل ہو جاتا ہے کہ ہجرت سے پیشتر بھی مکی سورتوں میں مذہب کے تمام حقائق تفصیلاً وحی کے ذریعے سے بیان ہو چکے تھے اور قرآن مجید نے تورات پر اعتقاد کے دعویداروں کے متعلق کہا تھا کہ یہ شیطانی القا کے پیرو ہیں اور اس قابل نہیں کہ انھیں معلّم مانا جائے یا عملی نمونے تسلیم کیا جائے[1]۔ قرآن مجید نے مدنی سورتوں میں تورات کے پیرووں کی مزید مذمت کی ہے[2]۔ فریقین کی نفسیاتی کیفیت ایسی تھی کہ اسلامی فکر پر یہودیوں کا اثر پڑنا عملاً غیر ممکن ہو

[1] تاللہ لقد ارسلنا الی امم من قبلک فزین لہم الشیطٰن اعمالہم فہو ولیہم الیوم ولہم عذاب الیم (سورۂ نحل: ۶۳)
اے پیغمبر! اس بات کی سچائی پر ہم خود شاہد ہیں کہ ہم نے تجھ سے پہلے کتنی ہی امتوں کی طرف رسول بھیجے۔ پھر ایسا ہوا کہ شیطان نے ان کی بدعملیاں اچھی کر دکھائیں (اور وہ سچائی کی دعوت پر کاربند نہ ہوئے) سو وہی حال آج بھی ہو رہا ہے وہی شیطان ان منکروں کا رفیق ہے اور رہا آخرت ان کے لیے عذاب دردناک ہے۔

مطلب یہ ہے کہ محض یہودی اور عیسائی ہی نہیں بلکہ تمام سابقہ مذاہب کی پیروی کے دعوے دار اصل تعلیم اور راہ حق کو چھوڑ کر کہیں سے کہیں چلے گئے تھے۔ ان سے کیا حاصل کیا جا سکتا تھا اور کون سی ہدایت یا روشنی اخذ کر لینے کا امکان تھا؟

[2] اس سلسلے میں مصنف نے تین مقامات کا حوالہ دیا ہے جو ذیل میں درج ہیں:

(ا) ومنہم امیون لا یعلمون الکتٰب الا امانی وان ہم الا یظنون۔ فویل للذین یکتبون الکتٰب بایدیہم ثم یقولون ہٰذا من عند اللہ لیشتروا بہ ثمناً قلیلاً۔ فویل لہم مما کتبت ایدیہم وویل لہم مما یکسبون۔ (سورۂ بقرہ: ۷۸، ۷۹)
پھر انہی میں وہ لوگ بھی ہیں جو ان پڑھ ہیں اور جہاں تک کتاب الٰہی کا تعلق ہے (خوش اعتقادی کی) آرزوؤں اور ولولوں کے سوا کچھ نہیں جانتے اور محض وہموں گمانوں میں مگن ہیں۔ پس افسوس ان پر جن کا شیوہ یہ ہے کہ خود اپنے ہاتھ سے کتاب لکھتے ہیں (اپنی خواہش کے مطابق احکام شرع کی کتابیں بناتے ہیں) پھر لوگوں سے کہتے ہیں۔ یہ اللہ کی طرف سے ہے تاکہ اس کے بدلے میں ایک حقیر سی قیمت دنیوی فائدے کی حاصل کر لیں پس افسوس اس پر جو کچھ ان کے ہاتھ لکھتے ہیں اور افسوس اس پر جو کچھ وہ اس ذریعے سے کماتے ہیں۔

(ب) ومنہم من ان تامنہ بدینار
اور انہی میں ایک گروہ ایسا ہے کہ اگر ایک روپے کے لیے بھی ان پر بھروسا کرو

(ملاحظہ ہو صفحہ ۵۰)

گیا تھا۔ یہودی عالموں کی اکثریت نے معاندانہ حیثیت اختیار کر لی تھی۔ اس کے برعکس معلموں کی روش شفیقانہ ہوتی ہے۔ جو اسرائیلی عالم حق و انصاف کے پیرو تھے انھوں نے مدینہ شریف میں رسول اللہ صلعم کی تشریف آوری کا پُرجوش خیر مقدم کیا اور اسلام قبول کر لیا۔ بعد ازاں رسول اللہ صلعم کو وہ اپنا آقا و مولا سمجھتے رہے۔ معاندوں اور قبول کر لینے کے درمیان کوئی تیسرا گروہ نہ تھا جس سے دوستانہ تعلیم و تعلم کی اُمید ہو سکتی۔

یوں یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ قرآن مجید کی تعلیمات کو ماحول کے اثرات سے منسوب نہیں کیا جا سکتا۔ صرف ایک مسئلہ باقی رہ گیا کہ آیا خود رسول اللہ صلعم غور و فکر سے کام لے کر قرآن مجید تیار کر سکتے تھے یا نہیں کر سکتے تھے۔ بلاشبہ عقلِ سلیم بت پرستی کی بے بنیادی اور اوہام کی حماقت واضح کر سکتی تھی، لیکن اس پر یہ کیونکر منکشف ہو سکتا تھا کہ ان چیزوں کو ختم کر کے اُن کی جگہ کیا لانا چاہیے؟ حقائق محض غور و فکر سے آشکارا نہیں ہو سکتے اور محض غور و فکر کی بنا پر پیشتر کے واقعات بیان نہیں کیے جا سکتے۔ بہ ایں ہمہ قرآن مجید کے بیانات بنیادی لحاظ سے بائیبل کے عین مطابق ہیں، یہاں تک کہ وہ چیزیں بھی آشکارا ہو گئیں جنھیں یہودی عالموں نے رسول اللہ صلعم سے چھپا لیا تھا۔ محض عقل و استدلال سے تفصیلات واضح نہیں کی جا سکتی تھیں۔ قرآن مجید نے اس امر کی تصدیق کر دی ہے کہ وحی و الہام سے پیشتر رسول اللہ صلعم نہ

بقیہ ص۴۹: لا یؤدّہٖ الیک الا ما دمت علیہ قائماً ذالک بانہم قالوا لیس علینا فی الامیین سبیل ویقولون علی اللہ الکذب وہم یعلمون ○ (آل عمران: ۷۵)

تو کبھی تمہیں واپس نہ دیں جب تک تقاضے کے لیے ہمیشہ ان کے سر پر کھڑے نہ ہو۔ اس لیے کہ وہ کہتے ہیں اُمیّوں سے معاملہ کرتے ہوئے ہمارے لیے کوئی مواخذہ نہیں (مشرکین عرب سے دیانتداری برتنا ضروری نہیں) لیکن دراصل وہ اللہ پر تہمت باندھتے ہیں اور اچھی طرح جانتے ہیں کہ حقیقت حال کیا ہے۔

۷: واخذہم الربٰوا وقد نہوا عنہ واکلہم اموال الناس بالباطل واعتدنا للکٰفرین منہم عذاباً الیماً ○ (سورۃ النسآء: ۱۶۱)

نیز یہودیوں کی یہ بات کہ سود لینے لگے حالانکہ اس سے روک دیے گئے تھے۔ اور یہ بات کہ ناجائز طریقے پر لوگوں کا مال کھانے لگے اور ان میں جو لوگ منکر ہو گئے، ہم نے ان کے لیے دردناک عذاب تیار رکھا ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ یہودیوں کے غلط اور ناواجب کردار کی صریح مذمت ہے۔

تو یہ جانتے تھے کہ کتاب کیا ہے اور نہ یہ علم تھا کہ ایمان کسے کہتے ہیں۔ جب آپؐ مذہبی معاملات میں خود ہی صراطِ مستقیم سے واقف نہ تھے تو دوسروں کی رہنمائی کیوں کر فرما سکتے تھے؟ آپؐ اُن تمام قانونی، اخلاقی، مجلسی اور عباداتی تفصیلات سے ناواقف تھے جن پر قرآن مجید مشتمل ہے رسول اللہ صلعم صرف وحی و الہام ہی سے خالقِ کائنات اور اُس کی صفات کا علم حاصل کر سکتے تھے۔ یہ علم عقل یا مطالعۂ کتب سے حاصل نہ ہو سکتا تھا۔ جب آپؐ پر وحی ہوئی تو پتا چلا کہ خدا اور مشہود و غیر مشہود دنیاؤں کے درمیان کیا تعلق ہے اور اُسی وقت آپ نے بتایا کہ موت کے بعد انسان کو کیا کچھ پیش آنے والا ہے۔

ہم اس امر کا جائزہ لے چکے ہیں کہ قرآن مجید انسان کا تیار کردہ نہیں، نہ رسول اللہ صلعم کے عہدِ مبارک کا ماحول ایسا تھا جس سے قرآن مجید کے لیے کوئی مواد مل سکتا، نہ عقل و فکر کے استعمال سے ایسی کتاب تیار ہو سکتی تھی۔ ہم یہ بھی بتا چکے ہیں کہ قرآن مجید کے الہامی اور آسمانی ہونے کا ایک ثبوت وہ غیر معمولی کیفیت بھی ہے جو وحی سے پیشتر آپؐ پر طاری ہو جاتی تھی۔ اب ہمیں چاہیے کہ ایک قدم آگے بڑھائیں اور قرآنِ مجید کے اسلوبِ بیان نیز مطالب میں اس کے آسمانی ہونے کی داخلی شہادتیں زیرِ غور لائیں۔

قرآن کا اولین اسلوب تمام دوسرے اسالیب سے بالکل مختلف ہے، خواہ اُن کا تعلق شعر سے ہو یا مقفیٰ یا غیر مقفیٰ نثر سے یا عام لوگوں کے اسلوب سے، بلکہ وہ خود رسول اللہ صلعم کے اپنے اسلوب سے بھی بالکل مختلف ہے۔ رسول اللہ صلعم کو اللہ تعالیٰ نے غیر معمولی فصاحت عطا کی تھی اور اس فصاحت کا ثبوت ہمیں آپ کی بے شمار ہدایات میں ملتا ہے جسے سب لوگ تسلیم کرتے ہیں۔ یہ ہدایتیں کبھی قرآن مجید کے علاوہ لکھ لی گئیں تھیں، لیکن دیکھیے

لہ وکذٰلک اوحینا الیک روحاً من امرنا ماکنت تدری ما الکتٰب ولا الایمان ولکن جعلنٰہ نوراً نھدی بہٖ من نشاء من عبادنا (شوریٰ : ۵۲)

اور اسی طرح بھیجا ہم نے تیری طرف ایک فرشتہ اپنے حکم سے تو نہ جانتا تھا کہ کیا ہے کتاب اور نہ ایمان لیکن ہم نے رکھی ہے روشنی اس سے راہ سمجھا دیتے ہیں جس کو چاہیں اپنے بندوں میں۔

کہ ان ارشادات اور قرآنِ مجید کے الہامی پیغامات میں خفیف سی مشابہت بھی نہیں پائی جاتی۔ الہامی متن میں ایک ایسی غیر معمولی قوت وتاثیر ہے جو روح کے اندر اُتر جاتی ہے بخود رسول اللہ صلعم کے عہدِ مبارک میں منکر لوگ اِن الہامی بیانات کو سنتے تھے تو اس درجہ غیر معمولی پاتے تھے کہ انھیں سحر اور جادو قرار دیتے تھے ہمارے زمانے میں بھی جو لوگ عربیت کا ذوق رکھتے ہیں، قرآن کے اس معجز نما پہلو کا تہ دل سے اقرار کرتے ہیں لیکن اس کی کوئی توجیہ نہیں کر سکتے۔

جامعہ الازہر (قاہرہ) دنیا کی قدیم ترین یونیورسٹی ہے۔ اس میں تفسیر پر بھی خطبات دیے جاتے ہیں۔ ان خطبات میں قرآن مجید کے اسلوب کا مندرجہ ذیل تجزیہ پیش کیا جاتا ہے تاکہ ثابت ہو جائے کہ قرآن کا اسلوب انسانی صلاحیت سے بہت بالا ہے اور اس کی پیروی ممکن نہیں:

۱۔ قرآن مجید کے اسلوب میں نہ تو حضری کی پر تکلف ملائمت کا عکس ہے اور نہ بدو کی خانہ بدوشانہ درشتی کا۔ اس اسلوب میں حضری کی حلاوت و شیرینی نیز بدوی کی قوت و توانائی کا امتزاج بہترین طریق پر ہوا ہے،

۲۔ الفاظ و حروف کا ترنّم ایسا ہے جس کی کوئی مثال نثر میں نہیں ملتی۔ ساتھ ہی یہ ترنّم نظم کے تکلفات سے بالکل پاک ہے۔ جہاں اوقاف آتے ہیں اُن کا نمونہ بھی نہ نثر میں ملتا ہے، نہ نظم میں، اُن میں ہم آہنگ اور مترنم حسنِ تناسب پایا جاتا ہے۔

۳۔ ادائے مطالب کے لیے جو الفاظ چُنے گیے وہ نہ تو پیش پا افتادگی میں جائز حد سے متجاوز ہیں، نہ اُن میں غیر معمولی ندرت پائی جاتی ہے۔ سب کے نزدیک مسلّم ہے کہ اُن میں اصل مطلب بہت ہی عمدہ اور اعلیٰ طریق پر ادا ہوا ہے۔

۴۔ فقروں کی ساخت میں ایک خاص شان پائی جاتی ہے۔ کم سے کم الفاظ

استعمال کرکے زیادہ سے زیادہ بیش قیمت اور سیر حاصل مطلب پیش کیے گیے ہیں۔

۵۔ طریقِ بیان کے ایجاز اور اس کے ساتھ بلاغت نے اعلیٰ پیمانے پر پہنچ جانے کے باوجود ایسی حیرت انگیز وضاحت اختیار کرلی ہے کہ معمولی پڑھا لکھا آدمی بھی قرآنِ مجید کو کسی مشکل کے بغیر ذہن نشین کرسکتا ہے۔

۶۔ ساتھ ہی قرآن کے مطالب کی گہرائی، اس کا لوچ اور لچک، اس کی معنی خیزی نیز درخشانی و تابانی کی یہ کیفیت ہے کہ یہ پاک کتاب اسلامی علوم و فنون، دینیات اور فقہ و قانون کے دبستانوں کے لیے اصول و ضوابط کا سرچشمہ بن گئی ہے۔ عربی یا کسی دوسری زبان میں انتہائی احتیاط کے باوجود کوئی ایسا متن پیش کرنا غیر ممکن ہے، جس کے مطالب کی تعبیر ہر حال میں صرف ایک ہوسکتی ہے۔

۷۔ نفسیات کا قانون یہ ہے کہ ادراک و احساس ہمیشہ تناسب مقلوب میں پائے جاتے ہیں، لیکن قرآن مجید کا طریقِ خطاب اس قانون سے بہت بالا اور برتر ہے اور اس لحاظ سے وہ مافوقِ انسانیت معلوم ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں ہم عقل اور جذبے کی دو مزاحم قوتوں کو مسلسل تعاون کرتے ہوئے پاتے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ واقعات کے بیان، استدلال، وضعِ اصول، وضعِ قوانین اور اخلاقی مبانی کے لیے جو الفاظ استعمال کیے گیے ہیں، وہ دل کو لگنے والی تعلیم بھی پیش کرتے ہیں اور ان میں انجذابی قوت بھی ہے۔ قرآن نے اپنے خطاب میں حیرت انگیز متانت اور زبردست تمکنت برابر قائم رکھی ہے جس میں کہیں فرق نہیں آتا۔

۸۔ سب سے آخر میں ہم فقرے یا ایک ہی مضمون کے فقروں کی ساخت

سورتوں کی وضع و ہیئت اور پورے قرآن پر غور کرتے ہیں تو مجموعی کیفیت ایسی نظر آتی ہے کہ یہ انسانی دماغ کا کارنامہ نہیں ہو سکتا۔

ہم جانتے ہیں کہ قرآن مجید تیئیس سال کی مدت کے اندر چھوٹے یا بڑے ٹکڑوں کی شکل میں نازل ہوتا رہا ہے اور انھیں نہ تو ترتیبِ نزول کے اعتبار سے رکھا گیا اور نہ موضوع کے اُسے ایک خاص مقام دے دیا جاتا۔ بتا دیا جاتا کہ اس ٹکڑے کو فلاں مقام پر رکھ لو اور اس میں کبھی تبدیلی نہ ہوئی۔ یوں وحی کے ذریعے سے جو کچھ نازل ہوا اُس کے دو مختلف سلسلے ہیں، ایک سلسلۂ ترتیب نزول جس سے وحی کی تاریخ معلوم ہو سکتی ہے دوسری وہ ترتیب جس میں ہر وحی نے کتاب مقدس کے اندر اپنی خاص جگہ حاصل کی، نزولِ قرآن کی طویل مدت کے دوران میں یہ دونوں سلسلے ہر آیت ہر سورت اور پوری کتاب کے ضمن میں قائم رہے۔

اگر ترتیب نزول پیشِ نظر رکھی جائے تو صاف معلوم ہو جائے گا کہ ہر وحی وقت کی ضرورت کے مطابق اترتی رہی، نیز اسے سابقہ ولاحقہ سے پورا تعلق تھا اور اس طرح تعلیم و آئین کے تدریجی ارتقا کا پتا چلتا ہے۔ مثلاً ان تدریجی مراحل کے عام خاکے پر غور فرمائیے:

۱۔ پہلے ایک سادہ سا حکم ملتا ہے: "اقرأ"[1] (پڑھ)

۲۔ پھر رسالت کی ذمہ داری سونپتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے: قُمْ فَأَنذِرْ[2] (کھڑا ہو پھر ڈر سنا دے)

۳۔ شروع انذار و ابلاغ صرف اقربا تک محدود رکھا گیا: وانذر عشیرتک الاقربین[3] (اور ڈر سنا دے اپنے قریب کے رشتہ داروں کو)

۴۔ پھر پورے قصبے کو دعوت میں شامل کر لیا گیا: وما کان ربک مہلک القریٰ حتیٰ یبعث

---

[1] سورہ علق آیت: ۱

[2] سورہ مدثر آیت: ۲

[3] سورہ شعراء آیت: ۲۱۴

فی امہا رسولاً (اور تیرا رب نہیں غارت کرنے والا بستیوں کو جب تک نہ بھیج دے ان کی بڑی بستیوں میں کسی کو پیغام دے کر)[1]

۵۔ بعد میں اردگرد کے قصبوں تک بھی دعوت کی توسیع کر دی گئی: لتنذر ام القریٰ ومن حولہا[2] (تاکہ تم ام القریٰ یعنی شہر مکہ کے باشندوں کو اور ان کو جو اس کے چاروں طرف بستے ہیں خبردار کرو)

۶۔ آخر میں پوری کائنات انسانیت پر یہ دائرہ حاوی ہو گیا: وما ارسلناک الا رحمۃ للعالمین[3] (اور ہم نے تجھے نہیں بھیجا ہے مگر اس لیے کہ تمام دنیا کے لیے رحمت کا ظہور ہو)

پھر تعلیم کے ارتقا کا عملی خاکہ سورتوں کے دو حصوں میں بھی ملاحظہ کیجیے۔ مکی سورتوں میں بنیادی اصول بیان ہوئے ہیں اور مدنی سورتوں میں ان اصولوں کو ضابطہ و آئین کی شکل میں پیش کیا گیا ہے۔ واقعات کے اس طویل سلسلے کا آغاز غارِ حرا کے معاملہ سے ہوا، جب رسول اللہ صلعم کو محض یہ بتایا گیا تھا کہ آپ کو وحیِ آسمانی کا نورِ ہدایت ملے گا اور حجۃ الوداع پر اس سلسلے کا اختتام ہوا جب آپ کو بتا دیا گیا کہ دین کامل ہو چکا اور اب زمین پر کوئی کام باقی نہیں رہا تیئیس سال تک وحی سے مشرف ہوتے رہنے کے بعد آپ کو واپس بلا لیا گیا۔

ظاہر ہے کہ قرآن مجید میں کوئی چیز فوری اور ناگہانی نہیں آ گئی جسے وقت گزاری کے لیے استعمال کیا گیا ہو۔ ہر شئے کا پہلے سے صحیح اندازہ تھا۔ ہر تفصیل آغاز ہی میں مرتب ہو چکی تھی۔ ابتدا سے آخر تک سب کچھ طے کر لیا گیا تھا بلکہ رسول اللہ صلعم کی وفات بھی نظر انداز نہیں ہوئی تھی یہ مکمل نقشہ کون تیار کر کے اس پر عمل کر سکتا تھا؟ خدا کے سوا کون تھا جس سے یہ آسمانی دعوت جاری ہوئی!

---

[1] سورہ قصص آیت: ۵۹
[2] سورہ انعام آیت: ۹۲
[3] سورہ انبیا آیت: ۱۰۷۔ اس آخری مضمون کی ایک واضح آیت سورہ اعراف میں بھی ہے:
قل یایہا الناس انی رسول اللہ علیکم جمیعاً (یعنی اے پیغمبرا کہو اے افرادِ نسل انسانی! میں تم سب کی طرف خدا کا بھیجا ہوا آیا ہوں۔

ترتیب نزول کے علاوہ قرآن مجید کا ایک تعمیری نظم اور تعمیری ترتیب ہے۔ وحی کے جو ٹکڑے ترتیب نزول میں حد درجہ حکیمانہ تعلیمی نقشہ پیش کر رہے تھے۔ انھیں تاریخی ترتیب سے ہٹا کر تعمیری ترتیب میں رکھ دیا گیا۔ ہر ٹکڑا اپنے ڈھانچے میں ٹھیک جگہ پہنچ گیا۔ یہی جداگانہ ڈھانچے یا اکائیاں ہیں جنھیں سورتیں کہا جاتا ہے۔ حد درجہ توجہ طلب امر یہ ہے کہ جب مختلف بکھرے ہوئے ٹکڑوں سے ایک سورت مرتب و منظم ہوتی ہے تو وہ ایک ایسی وحدت بن جاتی ہے جو فنی انسانی اور منطقی نقطہ نگاہ سے بالکل بے عیب ہو۔ اس تقریر و خطاب کے ہر حصے میں ایک خاص ترنم پایا جاتا ہے۔ اس کا اسلوب مشترک و ہم و آہنگ نظر آئے گا اور مطالب ایک منطقی نقشے کے مطابق ارتقا پذیر ہوں گے۔

ظاہر ہے کہ اس قسم کا منصوبہ پیشتر ہی سے تیار کرتے وقت مصنّف کے لیے ضروری تھا کہ آئندہ تیئیس سال میں جو واقعات پیش آنے والے تھے، ان سے پیدا ہونے والے مسائل کا صحیح اندازہ فرمالیتا۔ نیز ان کے حل دریافت کر لیتا۔ ساتھ ہی اس کے ادبی اسلوب، مترنم اور غنائی انداز بیان کا خیال رکھتا۔ ہر آنے والی وحی کی موزوں ترتیب اور پورے ڈھانچے میں ہر وحی کا صحیح اور حقیقی مقام و محل بھی مقرر کر دیتا۔

اس حقیقت کا اعتراف کر لینا چاہیے کہ کوئی انسان یا کوئی دوسری مخلوق مستقبل کے متعلق تمام تفصیلات جاننے، یا ایسی کتاب ترتیب دے لینے کی اہل نہ تھی۔ صرف خدائے علیم خبیر ہی قرآن نازل کر سکتا تھا۔ قرآن کی تعلیمات عام و ہمہ گیر ہیں۔ دنیا بھر کے انسان ان کے مخاطب ہیں، خواہ ان کی اصل کچھ ہو۔ یہ کتاب اس لیے نازل ہوئی کہ نسل انسانی کی ارواح کو نور سے معمور کر دے۔ ان کے اخلاق کا تزکیہ کر کے، انھیں ایک معاشرے میں متحد کر دے اور طاقت و قوت کی برتری کے بجائے انصاف و اخوت کا دور دورہ ہو جائے۔ سورہ نحل کی آیت ۸۹ میں بتا دیا گیا ہے کہ قرآن مجید باواسطہ یا بلاواسطہ تمام انسانی مسائل کا حل پیش کرتا ہے:

وَ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا   اور ہم نے تجھ پر الکتاب (قرآن) نازل کی تمام باتیں بیان

بِكُلِّ شَيْءٍ ۝ کرنے کے لیے۔

قرآنِ مجید سب سے زیادہ زور حقیقت الحقائق اور خیر و حسنات پر دیتا ہے باقی امور ــــــ علم روح ارض و سماوات کی حقیقت، تاریخ، پیشگوئی، انتباہ و انذار وغیرہ ــــــ کو قرآن کے اصل پیغام کی تقویت کا ذریعہ سمجھ لینا چاہیے۔ مشہور عالمِ دین امام غزالی (وفات ۵۰۵ھ) نے اپنی کتاب "جواہر القرآن" میں بتایا ہے کہ قرآن مجید کی سات سو تریسٹھ آیتیں علم سے متعلق ہیں، سات سو اکتالیس آیتوں میں نیکی اور خیر کی طرف رہنمائی کی گئی ہے۔ ایک ہزار پانسو چار آیتیں اس پاک کتاب کے نہایت بیش قیمت جواہر پارے ہیں۔ باقی پانچ ہزار ایک سو بارہ آیتوں کو متعلقات سمجھ لینا چاہیئے[1]۔

قرآن مجید کے مطابق ایمان میں یہ تین عناصر ضرور شامل رہنے چاہئیں:

۱۔ خدا پر ایمان۔

۲۔ خدا کے ان پیغامات پر ایمان جن میں عالمِ انسانیت کو ہدایت و رہنمائی کے لیے مخاطب کیا گیا۔

۳۔ یومِ آخرت پر ایمان۔

اسلام کی ابتدا خدائے قادر و رحیم پر ایمان سے ہوتی ہے، جس نے ہر چیز پیدا کی اور وہی عبادت کا حقیقی مرجع ہے۔ مشرکوں کو اس خالص توحید کے قبول پر رضامند کرنے کے لیے جو کوششیں کی تھیں، ان میں بنیادی مسئلہ عبادت کے صحیح مرجع ہی کا تھا۔ قرآن مجید نے ایک سے زیادہ مقامات پر بتایا ہے کہ منکر لوگ اعتراف کرتے تھے۔ کائنات کا خالق اور کارفرما ایک ہے۔ مثلاً سورہ زخرف کی آیت ۹[2] میں۔ تاہم ان کی شدید غلطی یہ تھی کہ وہ

[1] مطلب یہ ہے کہ قرآن مجید میں کل چھ ہزار چھ سو سولہ آیات ہیں۔ ایک ہزار پانسو چار کو جوہروں کی حیثیت حاصل ہے باقی ان کے متعلقات ہیں۔

[2] وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ لَيَقُولُنَّ خَلَقَهُنَّ الْعَزِيزُ الْعَلِيمُ ۝ (زخرف: ۹)۔ اور اگر تو ان سے پوچھے کس نے بنائے آسمان اور زمین تو کہیں بنائے اس زبردست خبردار (خدا) نے۔

عبادت کے وقت اپنے دیوتاؤں کو بھی خدائے پاک کے ساتھ شامل کر لیتے تھے۔ اور کہتے تھے کہ یہ دیوتا سفارشی بن کر خدائے پاک کو راضی کر لیں گے۔ قرآن مجید محکم دلائل و روایات کی بنا پر انھیں شرک سے ہٹا کر توحید پر لانے کی کوشش کرتا ہے۔

جن دلائل کی بنا پر قرآن مجید نے مشرکوں کو قائل کرنا چاہا، ان میں ایک یہ بھی ہے کہ وہ اعتراف کرتے ہیں کائنات کا خالق اور پروردگار صرف خدائے پاک ہے۔ قرآن مجید کہتا ہے کہ پھر اسی کی عبادت کرو۔ بھلا سوچو خالق و مخلوق ایک جیسے کیوں کر ہو سکتے ہیں؛ کیا یہ بات عقل میں آ سکتی ہے کہ جس نے کوئی شے بھی پیدا نہیں کی، وہ اس پاک ہستی کے برابر ہو جائے جو ہر شے کی خالق ہے[1]؟ کیا یہ انتہائی حماقت و نادانی نہیں کہ اسے پکارا جائے جو جواب نہیں دے سکتا اور اس کے پاس التجائیں لے جائی جائیں جو انھیں سن لینے کی صلاحیت سے بھی عاری ہے[2]؟ کیا یہ ناشکراپن نہیں کہ ہم اس شفیق پروردگار کو بھلا دیں جو ہمیں راحت عطا کرتا ہے؛ اس محسن مطلق سے روگردانی اختیار کر لیں جس سے ہم تباہی اور بربادی کے اوقات میں دعائیں کرتے ہیں؟ کیا یہ انتہائی ناشکرگزاری نہیں کہ ہم اس کی عبادت میں ایسی چیزوں کو شریک کر لیں جو نہ کسی کو نفع پہنچا سکتی ہیں اور نہ نقصان[3]؟ سب سے آخر میں قرآن کہتا ہے جو مشرک

---

[1] افمن یخلق کمن لا یخلق افلا تذکرون (سورۂ نحل: ۱۷) — بتلاؤ کیا دونوں ہستیاں برابر ہو گئیں، وہ جو پیدا کرتی ہے اور وہ جو کچھ پیدا نہیں کرتی؟ پھر کیا تم سمجھتے بوجھتے نہیں؟

[2] ومن اضل ممن یدعوا من دون اللہ من لا یستجیب لہ الی یوم القیامۃ وھم عن دعائھم غافلون ٥ (سورۂ احقاف: ۵) — اور اس سے زیادہ گمراہ کون ہے جو پکارے اللہ کے سوا ایسے کو کہ نہ پہنچے اس کی پکار کو یوم قیامت تک اور ان کو خبر نہیں ان کے پکارنے کی۔

[3] وما بکم من نعمۃ فمن اللہ ثم اذا مسکم الضر فالیہ تجئرون ٥ ثم اذا کشف الضر عنکم اذا فریق منکم بربھم یشرکون ٥ لیکفروا بما اتینٰھم (سورۂ نحل ۵۳ : ۵۵) — اور نعمتوں میں سے جو کچھ تمھارے پاس ہے، سب اللہ ہی کی طرف سے ہے پھر جب تمھیں کوئی دکھ پہنچتا ہے تو اسی کے آگے آہ و زاری کرتے ہو پھر جب ایسا ہوتا ہے کہ وہ تم سے دکھ دور کر دیتا ہے تو دیکھو تم میں سے ایک گروہ اپنے پروردگار کے ساتھ دوسری ہستیوں کو شریک بنانے لگتا ہے، تاکہ جو نعمت ہم نے اسے دی تھی اس کی ناشکری کرے۔

اس وہم میں مبتلا ہیں کہ کوئی آدمی یا کوئی مقدس بزرگ یا کوئی وجود خدا سے بزرگ کی اس سفارش و شفاعت یا مداخلت کی جسارت کرسکتا ہے تو اس کا ثبوت بہم پہنچائیں۔[1]

مشرکانہ عبادت کے خلاف عقلی دلیلوں کے علاوہ قرآن مجید، روایات، نبوت و رسالت کی متفقہ شہادت بھی پیش کرتا ہے۔ مثلاً :۔

---

[1] اس سلسلے میں مصنف نے تین مقامات کے حوالے دیے ہیں جو بالترتیب ذیل میں درج ہیں:

(۱) اَللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ۚ لَا تَاْخُذُہٗ سِنَۃٌ وَّلَا نَوْمٌ ؕ لَہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ؕ مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَہٗۤ اِلَّا بِاِذْنِہٖ ؕ یَعْلَمُ مَا بَیْنَ اَیْدِیْھِمْ وَمَا خَلْفَھُمْ ۚ وَلَا یُحِیْطُوْنَ بِشَیْءٍ مِّنْ عِلْمِہٖۤ اِلَّا بِمَا شَآءَ ۚ وَسِعَ کُرْسِیُّہُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ۚ وَلَا یَئُوْدُہٗ حِفْظُھُمَا ۚ وَھُوَ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ ○ (سورۂ بقرہ: ۲۵۵)

اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ الحی زندہ ہے اور اس کی زندگی کے لیے فنا و زوال نہیں۔ القیوم ہے یعنی ہر چیز اس کے حکم سے قائم ہے وہ اپنے قیام کے لیے کسی کا محتاج نہیں نہ اس کی آنکھ کے لیے اونگھ ہے اور نہ سونے کے لیے نیند۔ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے سب اسی کا ہے (اور اسی کے حکم سے ہے) کون ہے جو اس کے سامنے اس کی اجازت کے بغیر کسی کی شفاعت کے لیے زبان کھولے؟ جو کچھ انسان کے سامنے ہے اسے بھی جانتا ہے جو کچھ پیچھے ہے (اسے بھی) سب کچھ اس کے علم سے باہر نہیں۔ انسان اس کے علم سے کسی بات کا احاطہ نہیں کر سکتا مگر یہ کہ جتنی بات کا علم وہ انسان کو دینا چاہے اور دے دے اس کی تخت آسمانوں اور زمین کے پھیلاؤ پر چھایا ہوا ہے اور ان کی نگرانی و حفاظت میں اس کے لیے کوئی تھکاوٹ نہیں اس کی ذات بڑی ہی بلند و برتر ہے۔

(۲) افمن ھو قائم علی کل نفس بما کسبت ۚ وجعلوا للّٰہ شرکاء ؕ قل سموھم ...... بل زین للذین کفروا مکرھم وصدوا عن السبیل ؕ (سورہ رعد: ۳۳)

پھر جس ہستی کے علم و احاطہ کا یہ حال ہے کہ ہر جان پر نگاہ رکھتی ہے وہ کیا ان ہستیوں کی طرح سمجھ لی جا سکتی ہے جنھیں ان لوگوں نے معبود بنا رکھا ہے؟ اور انھوں نے اللہ کے لیے شریک ٹھہرا رکھے ہیں۔ اے پیغمبر ان سے پوچھو وہ کون ہیں، ان کے اوصاف بیان کرو۔ اصل یہ ہے کہ منکروں کی نگاہ میں ان کی مکاریاں خوشنما بن گئیں اور راہِ حق میں قدم اٹھانے سے رک گیے۔

(۳) والذین اتخذوا من دونہ اولیاء ما نعبدھم الا لیقربونا الی اللہ زلفی (سورہ زمر: ۳)

جنھوں نے پکڑ رکھے ہیں اللہ سے ورے حمایتی کہ ہم تو ان کو پوجتے ہیں اس واسطے کہ ہم کو پہنچا دیں اللہ کی طرف قریب کے درجے میں۔

۱۔ وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِیْٓ اِلَیْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ ۝ (سورۂ انبیاء: ۲۵)

اور (اے پیغمبر!) ہم نے تجھ سے پہلے کوئی پیغمبر ایسا نہیں بھیجا جس پر اس بات کی وحی نہ کی ہو کہ کوئی معبود نہیں مگر صرف میری ذات۔ پس چاہیے کہ میری ہی بندگی کرو۔

۲۔ وَسْئَلْ مَنْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رُّسُلِنَآ اَجَعَلْنَا مِنْ دُوْنِ الرَّحْمٰنِ اٰلِهَةً یُّعْبَدُوْنَ ۝ (زخرف: ۴۵)

اور پوچھ دیکھ جو رسول بھیجے ہم نے تجھ سے پہلے، کبھی ہم نے مقرر کیے ہیں اور حاکم جو پوجے جائیں سوائے اس ذات پاک کے جو ہے بے حد مہربان (رحمٰن)

ایمان کی ابتدا یہاں سے ہوئی ہے کہ خدا کو خالق اور پروردگار مانا جائے اور صرف اسی کی عبادت کی جائے۔ ساتھ ہی یہ بھی مان لینا چاہیے کہ وہی احکام تجویز فرمانے اور جاری کرنے کا مجاز ہے۔ وہی ہمارے اعمال اور جذبات و احساسات پر حکمرانی کا حقدار ہے۔ اسی پر ہمیں پورا بھروسہ کرنا چاہیے اور اسی کے ہر حکم کے سامنے بے چون وچرا سر جھکا دینا چاہیے۔ یہ حقیقت ہمیں فطری بصیرت سے بھی معلوم ہو سکتی ہے۔ عقلِ سلیم بھی اسی جانب ہماری رہنمائی کرتی ہے۔ ضمیر کی گہرائیوں سے بھی یہی صدا بلند ہوتی ہے اور قرآنِ مجید بھی اس کی تصدیق کرتا ہے۔ خدا نے انسان کو یہ فطری صلاحیت عطا کی ہے کہ نیکی، اور بدی، انصاف اور بے انصافی میں تمیز کر سکتا ہے[1]۔ تجربے سے ثابت ہوتا ہے کہ ہوا و ہوس انسان پر غلبہ پا لیتے ہیں۔ مادی اور دنیوی مشغلے بعض اوقات انسانی قلوب کو بہترین مقاصد سے ہٹا کر دوسری جانب لے جاتے ہیں، انسانوں سے فیصلے بھی غلط ہو جاتے ہیں اور

[1] اشارہ ہے سورہ شمس کی آیت کی طرف:
وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا۝ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا (۷، ۸)
اور قسم ہے نفس کی جیسا کہ اسے ٹھیک بنایا (اعتدالِ مزاج و قوائے طبیعیہ نیز نیکی اور بدی کے راستوں پر چلنے کی استعداد) پھر سمجھ دی اس کو بدعملی اور پرہیزگاری کی۔

وہ خود بھی غلطیوں کے مرتکب ہوتے ہیں۔ خدا کی رحمت نے ہمیں ہمارے حال پر نہیں چھوڑ دیا بلکہ اس نے ہماری رہنمائی کے لیے سچائیاں مقرر کیں تاکہ اگر ہم میں حس و جدان ذرا کمزور ہونے کا رجحان پیدا ہو تو رک جائے۔

اپنے احکام بنی نوع انسان تک پہنچانے کے لیے خدا نے ہماری عقل پر بھروسہ نہیں کیا۔ بلکہ ایسے برگزیدہ انسان اور فرشتے چنے جو خدا کی جانب سے آسمانی نور ہدایت وصول کرنے اور اسے دنیا تک پہنچانے کے اہل تھے۔ اس طرح خدا نے ہر قوم اور ہر بڑے قبیلے کے پاس انبیاء اور نذیر بھیجے۔ جو لوگ خدا کے بھیجے ہوئے پیغمبروں کے منکر ہیں سچی بات یہ ہے کہ وہ خود خدا کے منکر ہیں۔ اس لیے کہ خدا اپنے ہر رسول اور ہر پیغمبر کو وحی کے آسمانی ہونے

ۓ اللّٰہ نور السمٰوٰت والارض مثل نورہ کمشکوٰۃ فیہا مصباح المصباح فی زجاجۃ الزجاجۃ کانہا کوکب دری یوقد من شجرۃ مبٰرکۃ زیتونۃ لا شرقیۃ ولا غربیۃ یکاد زیتہا یضیٓء ولو لم تمسسہ نار نور علی نور یہدی اللّٰہ لنورہ من یشآء ویضرب اللّٰہ الامثال للناس واللّٰہ بکل شیء علیم ۔ (نور : ۳۵)

اللہ روشنی ہے آسمانوں کی اور زمین کی۔ مثال اس روشنی کی جیسے ایک طاق۔ اس میں ہو ایک چراغ۔ وہ چراغ دھرا ہو ایک شیشے میں۔ وہ شیشہ ہے جیسے ایک تارا چمکتا ہوا۔ تیل جلتا ہے اس میں ایک برکت والے درخت کا وہ زیتون ہے۔ نہ مشرق کی طرف ہے نہ مغرب کی طرف۔ قریب ہے اس کا تیل روشن ہو جائے اگرچہ نہ لگی ہو اس میں آگ۔ روشنی پر روشنی۔ اللہ راہ دکھلاتا ہے اپنی روشنی کی جسے چاہے۔ اور بیان کرتا ہے اللہ مثالیں لوگوں کے واسطے اور اللہ ہر چیز کو جانتا ہے۔

ۓ ولقد بعثنا فی کل امۃ رسولا ان اعبدوا اللّٰہ واجتنبوا الطاغوت فمنہم من ہدی اللّٰہ ومنہم من حقت علیہ الضللۃ (سورۃ النحل: ۳۶)

اور یہ واقعہ ہے کہ ہم نے دنیا کی ہر امت میں کوئی نہ کوئی رسول ضرور بھیجا کہ اللہ کی بندگی کرو اور سرکش قوتوں سے بچو۔ پھر ان میں سے بعض ایسے تھے جن پر اللہ نے ہدایت کی راہ کھول دی۔ بعض ایسے تھے جن پر گمراہی ثابت ہو گئی۔

کا ثبوت بھی عطا کر دیتا ہے[1]۔

اسلام پر ایمان کے پہلے دو عنصر ——— خدا پر ایمان اور رسالت پر ایمان ——— اس وقت تک پورے نہیں ہوتے جب تک یوم آخرت یا یوم حساب پر ایمان نہ لایا جائے خدا خالق ہے، خدا احکام دینے والا ہے، خدا یوم دین اور یوم حساب کا مالک ہے۔ وہی اول ہے اور وہی آخر ہے۔ تمام انسان اپنے اعمال کا حساب دینے کے لیے اسی کی بارگاہ میں حاضر ہوں گے اور اپنے اپنے اعمال کی بنا پر اس کا فیصلہ حق و انصاف قبول کریں گے[2]۔ موت کے بعد زندہ ہونے کے عقیدے میں روح کی زندگی اور اجساد کا حشر بھی شامل ہے۔ حیاتِ روح کے عقیدے نے قطعاً مشکلات پیدا نہ کیں، لیکن حق ناشناس لوگوں نے حشرِ اجساد کا مذاق اڑایا۔ انھوں نے کہا:۔

فَأْتُوا بِآبَآئِنَآ إِن كُنتُمْ صٰدِقِينَ ○ (الدخان: ۳۶)

بھلا واپس لے تو آؤ ہمارے باپ دادوں کو اگر تم سچے ہو۔

ؐ لقد ارسلنا رسلنا بالبینٰت وانزلنا معھم الکتٰب والمیزان لیقوم الناس بالقسط و انزلنا الحدید فیہ بأس شدید ومنافع للناس ولیعلم اللہ من ینصرہ ورسلہ بالغیب ط ان اللہ قوی عزیز○ (حدید: ۲۵)

ہم نے بھیجے اپنے رسول نشانیاں دے کر اور اتاری ان کے ساتھ کتاب اور ترازو تاکہ لوگ سیدھے رہیں انصاف پر اور ہم نے اتارا لوہا۔ اس میں سخت لڑائی ہے اور لوگوں کے کام چلتے ہیں اور تاکہ معلوم کرے اللہ کون مدد کرتا ہے اس کی اور اس کے رسولوں کی بن دیکھے۔ بے شک اللہ زور آور ہے اور زبردست۔

[2] اس سلسلے میں مصنف نے تین مقامات کا حوالہ دیا ہے جو ذیل میں مع ترجمہ درج ہیں:

۱۔ الیوم تجزیٰ کل نفس بما کسبت ط لا ظلم الیوم ان اللہ سریع الحساب (المومن: ۱۷)

آج بدلہ ملے گا ہر نفس کو جیسا اس نے کمایا۔ بالکل ظلم نہیں آج بے شک اللہ جلد حساب لینے والا ہے۔

۲۔ ھو الاول والاٰخر والظاھر والباطن و ھو بکل شیء علیم (الحدید: ۳)

وہی ہے سب سے پہلا اور سب سے پچھلا اور باہر اور اندر اور وہ سب کچھ جانتا ہے۔

۳۔ واتقوا یوما ترجعون فیہ الی اللہ ثم توفی کل نفس ما کسبت وھم لا یظلمون ○ (سورۂ بقرہ: ۲۸۱)

اور اس دن کی پرسش سے ڈرو جب کہ تم اللہ کے حضور لوٹائے جاؤ گے اور پھر ایسا ہوگا کہ ہر جان نے جو کچھ کیا ہے اس کا بدلہ پورا پورا اسے مل جائے گا اور یہ نہ ہوگا کہ کسی کی حق تلفی ہو۔

قرآنِ مجید نے اس سطحی دلیل کا رد کرتے ہوئے کائنات کے عام احوال کی طرف توجہ دلائی کہ دیکھو زمین ایک وقت بالکل مردہ اور خشک ہوتی ہے۔ پھر اس میں زندگی پیدا ہوتی ہے اور یہ سبزہ زار بن جاتی ہے[1]۔ یوں قرآن ثابت کرتا ہے کہ حشر اجساد محض ممکن ہی نہیں بلکہ یقینی اور قطعی ہے۔ یہ اس لیے یقینی ہے کہ خدا اس کا وعدہ کر چکا ہے۔ اس لیے یقینی ہے کہ ہر مخلوق کو اس کے اعمال نیک و بد کی جزا یا سزا ضرور ملنی چاہیے، ورنہ انسان کی تخلیق بالکل عبث ہوتی۔ ارشاد ہوتا ہے:

اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّ	کیا تم خیال کرتے ہو کہ ہم نے تمھیں بیکار کو پیدا کیا ہے اور تم
اَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ ٥ (مومنون: ۱۱۵)	ہماری طرف لوٹنے والے نہیں؟

یہ بھی نہ سمجھ لینا چاہیے کہ اچھے اور برے، صالح اور غیر صالح آدمیوں کے ساتھ یکساں برتاؤ ہوگا اور دونوں کو ایک طرح کی زندگی اور موت ملے گی[2]۔ حساب کے دن تمام آدمیوں کے ساتھ

---

[1] اس مقام کے دو حوالے ہیں:

۱۔ وتری الارض هامدة فاذا انزلنا عليها الماء اهتزت وربت وانبتت من كل زوج بهيج ذالك بان الله هو الحق و انه يحيي الموتى وانه على كل شيء قدير (سورۂ الحج: ۵-۶)	اور تم دیکھتے ہو کہ زمین سوکھی پڑی ہے۔ پھر جب ہم اس پر پانی برسا دیتے ہیں تو اچانک لہلہانے اور ابھرنے لگتی ہے۔ ہر قسم کی روئیدگیوں میں سے حسن و خوبی کا منظر اگ آتا ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ کی ہستی ایک حقیقت ہے اور وہ بلاشبہ مردوں کو زندہ کر دیتا ہے اور وہ ہر بات پر قادر ہے۔
۲۔ فانظر الى آثار رحمت الله كيف يحيي الارض بعد موتها ان ذلك لمحي الموتى وهو على كل شيء قدير (سورۂ روم: ۵۰)	سو دیکھ لے اللہ کی رحمت کی نشانیاں کیونکر زندہ کرتا ہے زمین کو اس کے مرجانے کے بعد۔ بے شک وہی ہے، مردوں کو زندہ کرنے والا۔ اور وہ ہر چیز پر قادر ہے

[2] ام حسب الذين اجترحوا السيئات ان نجعلهم كالذين آمنوا وعملوا الصالحات سواء محياهم ومماتهم ساء ما يحكمون (سورۂ جاثیہ: ۲۱) — جن لوگوں نے برائیاں کمائی ہیں کیا وہ یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ ہم کر دیں گے ان کو برابر ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور نیک کام کیے۔ کیا ان کا جینا اور مرنا ایک سا ہے؟ برے دعوے ہیں جو وہ کرتے ہیں۔

ٹھیک ٹھیک انصاف ہوگا۔

یہ حقیقت بھی واضح رہنی چاہیے کہ خدا کے متعلق محض یہ عقیدہ کافی نہیں، قرآن مجید کی تعلیم یہ ہے کہ ایک سچے مومن کا عقیدہ یہی ہونا چاہیے۔ ساتھ ہی اسے احکام باری تعالیٰ کے مطابق بڑے اہتمام سے عمل پیرا رہنا چاہیے۔ پختہ عقیدہ اور کامل فرمانبرداری لازم ہے۔ خدائے پاک اپنے احکام صادر فرماتا ہوا ہمارے دل میں نیک و بد خیر و شر اور حسن و قبیح کے احساس کو بیدار کرتا ہے۔ مثلاً ارشاد ہوا:

قُلْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَاْمُرُ بِالْفَحْشَاۗءِ (اعراف: ۲۸)

اے پیغمبر ان سے کہیے کہ خدا کبھی بے حیائی کی باتوں کا حکم نہیں دیتا۔

پھر فرمایا:

قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَالْاِثْمَ وَالْبَغْيَ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَاَنْ تُشْرِكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا وَّاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ (سورہ اعراف: ۳۳)

اے پیغمبر ان لوگوں سے کہو میرے پروردگار نے جو کچھ حرام ٹھہرایا ہے وہ تو یہ ہے: بے حیائی کی باتیں جو کھلے طور پر کی جائیں اور چھپا کر کی جائیں۔ گناہ کی باتیں، ناحق کی زیادتی یہ کہ خدا کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہراؤ جس کی اس نے کوئی سند نہیں اُتاری اور یہ کہ خدا کے نام سے ایسی بات کہو جس کے لیے تمھارے پاس کوئی علم نہیں۔

سورۂ حجرات میں ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ ۡ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ وَّلَا تَجَسَّسُوْا وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا ۭ اَيُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ يَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِيْهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوْهُ ۭ (سورہ حجرات: ۱۲)

اے ایمان والو بچتے رہو بہت سے گمانوں سے۔ یقیناً بعض گمان گناہ کی حد تک پہنچ جاتے ہیں۔ اور کسی کا بھید نہ ٹٹولو اور ایک دوسرے کو پیٹھ پیچھے برا نہ کہو۔ بھلا اچھا لگتا ہے تم میں سے کسی کو کہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھائے؟ سو گھن آتی ہے تم کو اس سے۔

قرآن مجید یہ بھی بتاتا ہے کہ واجبات عمومی کے یہ بلند حقائق ہمیشہ دانشمند اور خدا پرست بزرگوں نے سکھائے۔ اس سلسلے میں حضرت ابراہیمؑ، حضرت اسحاقؑ، حضرت یعقوبؑ، حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ کے اسمائے گرامی بار بار آئے ہیں۔ ان بزرگوں نے ایسی نیکیوں کی تعلیم دی، نیز نماز، زکوٰۃ، روزے اور ایسی ہی دوسری چیزوں کی پابندی سکھائی۔

ظاہر ہے کہ قرآن مجید نے خیر و صلاح کے متعلق وہ تمام تعلیمات احسن طریق پر محفوظ کریں، جو ہر اعتبار سے درست تھیں۔ لیکن یہ بھی واضح رہنا چاہیے کہ قرآن پیشتر کی بعض بظاہر متضاد تعلیمات میں توافق پیدا کرنے کی سعی نہیں کرتا بلکہ اپنا راستہ الگ پیدا کرلیتا ہے۔ مذہبی اور اخلاقی میراث کو محفوظ رکھتا ہے۔ ساتھ ہی اس خدائی عمارت کی تحسین و آرائش کو کمال پر پہنچا دیتا ہے جس کی تعمیر میں تمام سابق پیغمبر شریک رہے۔ اس حقیقت میں کوئی شبہ نہیں قرآن مجید نے صفاتِ باری تعالیٰ، مآل روح اور انسان کے اخلاقی واجبات جیسے اہم مسائل کو ارتقا کے ان مدارج پر پہنچا دیا جس کی کوئی مثال دوسری جگہ نہیں مل سکتی اور اس کے ایسے ثبوت موجود ہیں، جو عقل و دانش کے لیے باعثِ تسکین اور دل کے لیے موجب کشش ہوں۔

مثلاً قرآن مجید نے محض شراب نوشی ہی کی ممانعت ہی نہیں کی بلکہ نشہ پیدا کرنے والی ہر شے کو سختی سے ممنوع قرار دے دیا۔ اس طرح اصل برائی کی جڑ کاٹ کر رکھ دی۔ عہدِ عتیق (تورات) اور عہدِ جدید (انجیل) بہ ظاہر دو متضاد اصول چلے آتے تھے، اوّل انصاف، دوم رحم، قرآن مجید نے ان دونوں میں مطابقت پیدا کردی۔ پھر نئے اصول کا اضافہ کر دیا جنھیں ہم چاہیں تو ضابطۂ شائستگی یا ضابطہ احتیاط یا ضابطہ حسنِ آداب قرار دے سکتے ہیں، مثالوں کے لیے ملاحظہ ہو سورہ نساء، آیت ۸۶[1]، سورۂ نور آیت ۲۷

[1] وَاِذَا حُيِّيْتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوا بِاَحْسَنَ جب تمھیں دعا دے کر سلام دیا جائے تو چاہیے کہ جو کچھ

۲۸ ، ۱ ، ۳ ، ۵۸ تا ۶۱ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے احکام عشرہ پر نظر ڈالیں تو صاف واضح

بقیہ صفحہ ۶۵: منہا او ردوھا ان اللہ کان علی کل شیئٍ حسیباً ۝ (نساء : ۸۶)

سلام دعا بیں کہا گیا ہے اس سے زیادہ اچھی بات جواب میں لکھو یا جو کچھ کہا گیا اسی کو لوٹا دو۔ بلا شبہ اللہ ہر چیز کا حساب لینے والا ہے۔

صفحہ ھذا: ۱؎ یایھا الذین امنو لا تدخلوا بیوتاً غیر بیوتکم حتی تستانسوا و تسلموا علی اھلھا ذلکم خیر لکم لعلکم تذکرون ۝ فان لم تجدوا فیھا احداً فلا تدخلوھا حتی یؤذن لکم وان قیل لکم ارجعوا فارجعوا ھو ازکیٰ لکم واللہ بما تعملون علیم ۝ (النور : ۲۷-۲۸)

اے ایمان والو مت جایا کرو کسی کے گھر میں اپنے گھروں کے سوا جب تک اجازت نہ لے لو اور سلام کرو گھر والوں پر یہ بہتر ہے تمہارے حق میں تاکہ تم یاد رکھو۔ پھر اگر نہ پاؤ کسی کو اس میں تو نہ جاؤ جب تک اجازت نہ ملے تم کو، اور اگر تم کو جواب ملے کہ پھر جاؤ تو پھر جاؤ۔ یہ تمہارے لیے زیادہ پاکیزگی کی بات ہے اور جو تم کرتے ہو اللہ اسے جانتا ہے۔

۲؎ وقل للمومنٰت یغضضن من ابصارھن ویحفظن فروجھن ولا یبدین زینتھن الا ما ظھر منھا ولیضربن بخمرھن علیٰ جیوبھن ولا یبدین زینتھن الا لبعولتھن اوٰ اباءھن او اباء بعولتھن او ابنائھن او ابناء بعولتھن . . . . لعلکم تفلحون ۝ (النور : ۳۱)

اور کہہ دے ایمان والیوں سے نیچی رکھیں اپنی آنکھیں اور حفاظت کریں اپنے ستر کی اور ڈالیں اپنی اوڑھنیاں اپنے گریبان (سینہ) پر اور نہ کھولیں اپنا سنگار مگر اپنے خاوند کے آگے یا اپنے باپ کے آگے یا خاوند کے باپ کے (یا) بیٹے کے یا خاوند کے بیٹے کے (دوسری بیوی سے) یا بھائی کے یا بھتیجوں کے یا بھانجوں کے یا اپنی عورتوں کے (پاس اٹھنے بیٹھنے والی نیک چلن عورتیں) یا اپنے ہاتھ کے مال (لونڈیاں ملازمائیں) کے . . . . تاکہ تم بھلائی پاؤ۔

۳؎ یایھا الذین امنو لیستاذنکم الذین ملکت ایمانکم والذین لم یبلغوا الحلم منکم ثلٰث مرّٰت من قبل صلوٰۃ الفجر وحین تضعون ثیابکم من الظھیرۃ ومن بعد صلوٰۃ العشاء ثلٰث عورٰت لکم لیس علیکم ولا علیھم جناح بعدھن طوّٰفون علیکم بعضکم علیٰ بعض کذٰلک یبین اللہ لکم الاٰیٰت

اے ایمان والو! اجازت لے کر آئیں تم سے جو تمہارے ہاتھ کے مال ہیں (نوکر چاکر) اور جو کہ نہیں پہنچے تم میں عقل کی حد کو تین بار، فجر کی نماز سے پہلے اور جب اتار کر رکھتے ہو اپنے کپڑے دوپہر میں اور عشاء کی نماز سے پیچھے یہ تین وقت تمہارے بدن کھلنے کے ہیں۔ ان وقتوں کے علاوہ تم پر کوئی تنگی نہیں پھرا ہی کرتے ہو ایک دوسرے کے پاس، یوں کھول کر سناتا ہے اللہ تم کو اپنی باتیں . . . .

. . . . اور جو بیٹھ رہی گھروں میں تمہاری عورتوں میں سے

بقیہ صفحہ ۶۷ پر

ہو جائے گا کہ ہم بالکل بنیادی اور ابتدائی قوانین پر بیٹھے ہیں۔ گویا ابھی اخلاق کی بنیادیں استوار ہو رہی ہیں۔ حضرت مسیح علیہ السلام کا پہاڑی کا وعظ سامنے آتا ہے تو ہم سمجھتے ہیں کہ بہت بلند سطح پر پہنچ گئے جس میں رحم انصاف پر بازی لے گیا اور آسمانی بادشاہت نے زمین کی حکومت ٹھکرا دی ہے۔ آخر ہم قرآنی احکام و اوامر کے ذریعے سے چوٹی پر پہنچ جاتے ہیں جہاں رحم و انصاف باہم مل گئے ہیں اور ہم میں کامل خاطر خودداری پیدا ہو چکی ہے جس کا نصب العین خیر مطلق ہے یعنی اللہ تعالیٰ۔ نیکی اور عمل صالح کی زندگی میں بھی خدا کی رضا پوری کرتے وقت ہمیشہ اسی کو دل میں بٹھا رکھنا چاہیے۔

تمام پہلے الہامات کی طرح قرآنی وحی نے بھی اپنی نوعیت کے سابقہ ذخیرے میں اضافہ کیا۔ قرآن کا مدعا یہ ہے کہ جو کتابیں پہلے آسمان سے نازل ہوئیں، ان سب کی تصدیق کرے اور آئندہ کے لیے ان کی نگہبانی کا فرض انجام دے۔

وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا	اور اے پیغمبر ہم نے تمھاری طرف سچائی کے ساتھ کتاب
لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتٰبِ وَمُهَيْمِنًا	بھیجی، ان کتابوں کی تصدیق کرتی ہوئی جو پہلے سے موجود

بقیہ صفحہ ۶۶: واللہ علیم حکیم ۰ واذا بلغ الاطفال منکم الحلم فلیستاذنوا کما استاذن الذین من قبلھم کذلک یبین اللہ لکم آیتہٖ ....

....والقواعد من النساء التی لا یرجون نکاحاً فلیس علیھن جناح ان یضعن ثیابھن غیر متبرجت بزینۃ وان یستعففن خیر لھن ...... لیس علی الاعمیٰ حرج ولا علی الاعرج حرج ولا علی المریض حرج ولا علی انفسکم ان تاکلوا من بیوتکم او بیوت آبائکم ....فاذا دخلتم بیوتاً فسلموا علیٰ انفسکم تحیۃ من عند اللہ مبارکۃ طیبۃ (نور ۵۱، ۶۱)

جن کو توقع نہیں رہی نکاح کی ان پر گناہ نہیں کہ اتار رکھیں اپنے کپڑے۔ یہ نہیں کہ دکھاتی پھریں اپنا سنگار اور اس سے بھی بچیں تو بہتر ہے ان کے لیے ... ..
...... اندھے پر، لنگڑے پر اور بیمار پر کچھ تکلیف نہیں اور نہ تم لوگوں پر کہ کھاؤ اپنے گھروں سے یا باپ کے گھر سے یا ماں کے گھر سے۔ یا بھائی، بہن، چچا، پھوپھی ماموں، خالہ کے گھر سے۔ یا جس کے گھر کی کنجیاں تمھارے پاس ہوں یا دوست کے گھر سے
....
...... پھر جب جانے لگو گھروں میں تو سلام کہو اپنے لوگوں پر نیک دعا.........
.... — .....

عَلَيْهِ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ (مائدہ : ۴۸) ہیں اور ان پر نگہبان۔ سو چاہیے خدا کی نازل کی ہوئی کتاب کے مطابق لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو۔

نگہبانی سے یہ مراد ہے کہ ان کتابوں میں غرض پرستوں نے جو تبدیلیاں کر دی ہیں یا جو غلط تعبیرات خواہ مخواہ ان سے منسوب کر دی گئی ہیں، انھیں رد کر دیا جائے جیسا کہ ذیل کے ارشاد سے واضح ہے:

تَاللّٰهِ لَقَدْ أَرْسَلْنَا إِلَى أُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ أَعْمَالَهُمْ فَهُوَ وَلِيُّهُمُ الْيَوْمَ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝ وَمَا أَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ إِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِي اخْتَلَفُوا فِيهِ ۙ وَهُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُونَ ۝ (سورۃ النحل: ۶۳، ۶۴)

اے پیغمبر اس بات کی سچائی پر ہم شاہد ہیں کہ ہم نے تجھ سے پہلے کتنی ہی امتوں کی طرف رسول بھیجے پھر ایسا ہوا کہ شیطان نے لوگوں کو ان کی بدعملیاں اچھی کر دکھائیں، سو وہی حال آج ہو رہا ہے، وہی شیطان ان منکروں کا رفیق ہے۔ اور بالآخر ان کے لیے دردناک عذاب ہے اور ہم نے تم پر الکتاب (قرآن) نہیں اتاری مگر اس لیے کہ جن باتوں میں لوگ اختلاف کر رہے ہیں، ان کی حقیقت ان پر واضح کر دے اور ایمان والوں کے لیے یہ ہدایت اور رحمت ہے۔

قرآن مجید کا متن ہر اضافے اور تبدیلی سے محفوظ ہے، اس لیے کہ اس کی حفاظت کا وعدہ خود خدائے پاک نے فرمالیا:

إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحٰفِظُونَ ۝ (سورۃ الحجر: ۹) بلاشبہ خود ہم نے الذکر (قرآن جو سراپا نصیحت ہے) اتارا ہے اور خود ہم اس کے نگہبان ہیں۔

باقی رہیں دوسری کتابیں تو انھیں ان لوگوں کی حفاظت میں چھوڑ دیا تھا جنھوں نے وہ لکھی تھیں۔ قرآن مجید میں ایک مقام پر تورات کو ہدایت کا نور قرار دیتے ہوئے فرمایا گیا کہ خدا کے نبی اس کے مطابق یہودیوں کو حکم دیتے رہے ہیں:

وَالرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْأَحْبَارُ بِمَا اسْتُحْفِظُوا ربی اور احبار (یہود کے علماء و مشائخ) بھی اسی پر کاربند

مِن کِتٰبِ اللّٰہِ وَکَانُوۡا عَلَیۡہِ شُہَدَآءَ ۚ — رہے اور وہ کتاب اللہ کے محافظ ٹھہرائے گئے تھے
(المائدہ ۵ : ۴۴) — اور اس کے (حکموں اور ہدایتوں) کے گواہ تھے۔

قرآن مجید کا پہلا مقصد یقیناً یہی تھا کہ مذہبی اور اخلاقی حقائق کا انکشاف ہو لیکن ثانوی مقصد یہ بھی تھا کہ مثلاً خالقِ کائنات پر ایمان میں پختگی آئے اور مومنوں کو امید و آرزو میں تقویت پہنچائی جائے۔ یہ امر یقیناً دوسروں کے لیے باعث تعجب ہو گا کہ کائنات کے متعلق تعبیرات کیوں کر علم کائنات، علم تشریح، علم الاعضاء اور آج کل کے دوسرے علوم کی تازہ ترین تحقیقات کے عین مطابق ہیں۔ مثلاً سائنٹفک علم کے مندرجہ ذیل ممتاز حقائق سامنے رکھ لیجیے۔

۱۔ زمین کی کرویت یعنی گول ہونا[1]

۲۔ مینہ بننے اور برسنے کی حقیقی کیفیت[2]

۳۔ ہواؤں کی باروری[3]

۴۔ تمام جانداروں کا پانی سے پیدا ہونا[4]

---

[1] خلق السمٰوٰتِ وَالارض بالحق ۚ یکوّر الیل علی النھار ویکوّر النھار علی الیل (زمر : ۵) — اللہ نے آسمانوں اور زمین کو حکمت کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ اس نے رات اور دن کے یکے بعد دیگرے آتے رہنے کا ایسا انتظام کر دیا کہ رات دن پر لپٹی جاتی ہے اور دن رات پر لپٹتا آتا ہے

[2] اللہ الذی یرسل الریاح فتثیر سحاباً فیبسطہٗ فی السماء کیف یشاءُ وَ یجعلہٗ کسفاً فتری الودق یخرج من خلالہٖ ۚ (الروم ۴۸) — یہ اللہ ہی کی کارفرمائی ہے کہ پہلے ہوائیں چلتی ہیں پھر ہوائیں بادلوں کو چھیڑ کر حرارت حرکت لاتی ہیں۔ پھر اللہ جس طرح چاہتا ہے انھیں فضا میں پھیلا دیتا ہے اور انھیں ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا ہے۔ پھر تم دیکھتے ہو کہ بادلوں سے مینہ نکل رہا ہے۔

[3] وارسلنا الریاح لواقح فانزلنا من السماءِ ماءً فاسقینٰکموہُ ۚ وما انتم لہٗ بخازنین ۝ (الحجر ۱۵ : ۲۲) — اور ہم نے ہوائیں چلائیں (پانی کے ذروں سے) لدی بار دار تھیں پھر آسمان سے مینہ برسا دیا اور وہ تمھارے پینے کے کام آیا اور تم نے اسے ذخیرہ کر کے نہیں رکھا تھا۔

[4] وجعلنا من الماءِ کل شیءٍ حیّ ۚ (انبیاء ۳۰) — اور پانی سے ہم نے تمام جاندار چیزیں پیدا کر دیں۔

۵۔ پودوں اور دوسری مخلوق کا جوڑے ہونا[1]، یہ حقیقت نزول قرآن کے وقت کسی کو معلوم نہ تھی۔

۶۔ جانوروں کی اجتماعی زندگی[2]

۷۔ مکھیوں کی زندگی کا طریقہ[3]

۸۔ ماں کے پیٹ میں جنین کی مختلف حالتیں[4]

۱؎ سبحان الذی خلق الازواج کلھا مما تنبت الارض ومن انفسھم ومما لا یعلمون ○ (یٰس : ۳۶)	پاک ہے وہ ذات جس نے جوڑے بنائے سب چیزوں کے، اس قسم سے جو اگتا ہے زمین میں اور خود ان میں سے اور ان چیزوں میں کہ جن کی ان کو خبر نہیں۔
۲؎ وما من دآبۃ فی الارض ولا طٰئر یطیر بجناحیہ الا امم امثالکم (الانعام : ۳۸)	اور دیکھو زمین میں چلنے والا کوئی حیوان اور ہوا میں پروں سے اڑنے والا کوئی پرند ایسا نہیں جو تمھاری ہی طرح اپنی امتیں نہ رکھتا ہو۔
۳؎ واوحیٰ ربک الی النحل ان اتخذی من الجبال بیوتاً ومن الشجر ومما یعرشون ○ ثم کلی من کل الثمرات فاسلکی سبل ربک ذللاً یخرج من بطونھا شراب مختلف الوانہ فیہ شفاء للناس (سورۃ النحل ۶۸،۶۹)	اور دیکھو تمھارے پروردگار نے شہد کی مکھی کے دل میں یہ بات ڈال دی کہ پہاڑوں میں، درختوں میں اور ان ٹٹیوں میں جو اس غرض سے بلندی میں بنادی جاتی ہیں، اپنا چھتا بنائے پھر طرح طرح کے پھولوں سے رس چوستی پھرے۔ پھر اپنے پروردگار کے ٹھہرائے ہوئے طریقے پر پوری فرمانبرداری کا مزن ہوجائے۔ دیکھو اس کے پیٹ سے مختلف رنگوں کا رس نکلتا ہے۔ اس میں انسان کے لیے شفا ہے۔
۴؎ فانا خلقنٰکم من تراب ثم من نطفۃ ثم من علقۃ ثم من مضغۃ مخلقۃ وغیر مخلقۃ لنبین لکم ونقر فی الارحام ما نشاء الی اجل مسمی ثم نخرجکم طفلاً (سورۃ حج : ۵)	ہم نے تمھیں مٹی سے پیدا کیا، پھر اس طرح کہ پہلے نطفہ ہوتا ہے پھر علقہ (جونک کے طرح کی چیز) بنتا ہے۔ پھر متشکل اور غیر متشکل گوشت کا ایک ٹکڑا۔ یہ اس لیے ہوتا ہے کہ تم پر اپنی قدرت کی کارفرمائیاں واضح کردیں۔ اسے عورت کے رحم میں ایک مقررہ وقت تک ٹھہرائے رکھتے ہیں۔ پھر طفولیت کی حالت میں تمھیں باہر نکال لیتے ہیں۔
۵؎ ولقد خلقنا الانسان من سلٰلۃ من	ہم نے انسان کو مٹی کے خلاصے سے پیدا کیا۔ پھر

بقیہ ص ۹۵ پر

مومنوں کی امیدوں کو مستقل طور پر تقویت یوں پہنچتی رہی کہ جو پیشگوئیاں کی گئی تھیں، وہ پوری ہوتی گئیں۔ سورہ دخان کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے میں قرآن مجید نے بتا دیا کہ اسلامی تعلیم کن مختلف دوروں اور مرحلوں سے گزرے گی اور اسلام کے پہلے مخالفین اس کے باب میں کیا روش اختیار کریں گے۔ یعنی وہ ابتدا میں بے حس اور بے پرواہوں گے۔ پھر ان کی روش مصالحانہ ہو جائے گی اور وہ اسلام سے دلچسپی لینے لگیں گے۔ لیکن انجام کار مخالف ہی نہیں بلکہ سخت دشمن بن جائیں گے۔ ساتھ ہی یہ پیش گوئی کر دی گئی تھی کہ مکہ کے ناشکر گزار لوگوں کو پہلے ایک خوفناک مصیبت سے سابقہ پڑے گا اس دور میں بعض بے یقین لوگوں کی روحیں آسمانی برکات کی طرف کھنچی آئیں گی۔ پھر ان پر خوشحالی کا عہد آجائے گا جس میں وہ خدا کو بھلا دیں گے۔ پھر اہل مکہ کو پہلی لڑائی میں ذلت خیز شکست سے سابقہ پڑے گا۔ باقی آیات میں اسلام کی فتح مندی و کامیابی کا اعلان کر دیا گیا ہے۔ بتا دیا گیا کہ اسلام دوامی چیز ہے۔ اسلامی سلطنت پھیلے گی اور کوئی ارضی طاقت اسلام کو تباہ نہ کر سکے گی[۲]۔

بقیہ صفحہ: مِّن طِينٍ ○ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِي قَرَارٍ مَّكِينٍ ○ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ثُمَّ أَنشَأْنٰهُ خَلْقًا آخَرَ ط (مومنون: ۱۲-۱۴)

ہم نے اسے نطفہ بنا دیا۔ ایک ٹھہر جانے اور جما ؤ پانے کی جگہ میں۔ پھر نطفے کو ہم نے علقہ بنایا۔ پھر علقہ کو ایک گوشت کا ٹکڑا سا کر دیا۔ پھر اس میں ہڈیوں کا ڈھانچا پیدا کیا پھر ڈھانچے پر گوشت کی تہ چڑھا دی پھر دیکھو کس طرح اسے بالکل دوسری ہی مخلوق بنا کر نمودار کر دیا۔

صفحہ ہذا: [۱] اس کے لیے ملاحظہ ہو سورہ دخان کی آیت ۹ تا ۱۶ ان میں اہل مکہ کی پوری کیفیت درج ہے۔

[۲] یہاں مصنف نے چار مختلف مقامات کے حوالے دیے ہیں۔

[۳] لِلَّذِينَ اسْتَجَابُوا لِرَبِّهِمُ الْحُسْنٰى ۚ وَالَّذِينَ لَمْ يَسْتَجِيبُوا لَهُ لَوْ أَنَّ لَهُم مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا وَمِثْلَهُ مَعَهُ لَافْتَدَوْا بِهِ ط (الرعد: ۱۸)

جن لوگوں نے اپنے پروردگار کا حکم قبول کیا ان کے لیے سراسر خوبی ہے جنھوں نے قبول نہیں کیا، اگر کسی طرح ارض کی تمام دولت ان کے اختیار میں آجائے اور اسے دوگنا کر دیا جائے تو یہ لوگ ضرور اسے فدیے میں دے دیں (مگر کسی عذاب الٰہی سے بچاؤ نہ ہو گا)

بقیہ صفحہ پر

قرآن مجید نے مسیحیت میں دائمی افتراق کی پیش گوئی بھی کر دی تھی۔ یہ بھی بتا دیا تھا کہ اسرائیلی بکھر جائیں گے۔ اور رہتی دنیا تک وہ ظلم و ستم کا تختۂ مشق بنے رہیں گے۔ انھیں

بقیہ ص: ضرب اللہ مثلاً کلمۃً طیبۃً کشجرۃٍ طیبۃٍ اصلھا ثابتٌ و فرعھا فی السماءِ تؤتی اُکلھا کلّ حینٍ باذنِ ربّھا (ابراہیم: ۲۴-۲۵)

اللہ نے مثال بیان کی ہے کلمہ طیبہ کی مثال ایسی ہے جیسے ایک اچھا درخت، جڑ اس کی جمی ہوئی اور ٹہنیاں آسمان میں پھیلی ہوئیں۔ اپنے پروردگار کے حکم سے ہر وقت پھل پیدا کرتا رہتا ہے۔

ان الذین کفروا ینفقون اموالھم لیصدوا عن سبیل اللہ فسینفقونھا ثم تکون علیھم حسرۃً ثم یغلبون (سورۃ الانفال: ۳۶)

جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی وہ اپنا مال اس لیے خرچ کرتے ہیں کہ لوگوں کو خدا کی راہ سے روکیں تو یہ لوگ آئندہ بھی خرچ کریں گے۔ لیکن ان کے لیے سراسر پچھتاوا ہوگا اور بالآخر مغلوب کیے جاویں گے۔

وعد اللہ الذین اٰمنوا منکم وعملوا الصّٰلحٰت لیستخلفنّھم فی الارض کما استخلف الذین من قبلھم و لیمکّننّ لھم دینھم الذی ارتضٰی لھم ولیبدّلنّھم من بعد خوفھم امناً (نور: ۵۵)

وعدہ کر لیا اللہ نے ان لوگوں سے جو تم میں ایمان لائے اور کیے بھی انھوں نے نیک کام البتہ بعد کو انھیں حاکم کر دے گا جیسا حاکم کیا تھا ان سے اگلوں کو، اور جما دے گا ان کے لیے دین ان کا جو پسند کر دیا ان کے واسطے اور ان کو ڈر کے بدلے امن دے گا۔

صفحہ ھذا: ۱ ومن الذین قالوا انا نصٰرٰی اخذنا میثاقھم فنسوا حظاً مما ذکروا بہ فاغرینا بینھم العداوۃ والبغضاء الی یوم القیامۃ (مائدہ: ۱۴)

اور جو لوگ اپنے آپ کو نصاریٰ کہتے ہیں ان سے بھی ہم نے عہد لیا تھا پھر ایسا ہوا کہ جس بات کی نصیحت کی گئی تھی اس سے کچھ بھی فائدہ اٹھانا ان کے حصے میں نہ آیا، اسے بالکل فراموش کر بیٹھے پس ہم نے ان کے مختلف فرقوں کے درمیان قیامت تک کے لیے دشمنی اور کینہ کی آگ بھڑکا دی۔

۲ وقطعنٰھم فی الارض امماً (الاعراف: ۱۶۸)

اور ہم نے (بنی اسرائیل کے) الگ الگ گروہ کر کے انھیں زمین میں منتشر کر دیا۔

۳ واذ تاذّن ربّک لیبعثنّ علیھم الی یوم القیامۃ من یسومھم سوء العذاب (سورۃ الاعراف: ۱۶۷)

اور جب تیرے پروردگار نے اعلان کر دیا تھا کہ اگر بنی اسرائیل شرارت و بدعملی سے باز نہ آئے تو قیامت کے دن تک ان پر ایسے لوگوں کو مسلط کر دیگا جو انھیں ذلیل کرنے والے عذاب میں مبتلا رکھیں گے

ہمیشہ اس بات کی ضرورت رہے گی کہ کوئی حلیف ان کا معاون بنا رہے[1] اور مسیحی لوگ قیامت کے دن تک یہودیوں پر مقتدر رہیں گے[2]

یہ حقیقت خوب ذہن میں بٹھا لینی چاہیے کہ نہ صرف قرآن مجید کی پیش گوئیوں کی تصدیق ہوئی بلکہ قرآن نے کھلا ہوا چیلنج دے دیا تھا کہ اس کی پیش گوئیوں کو نہ ماضی میں جھٹلایا جا سکا۔ نہ حال میں اور نہ مستقبل میں جھٹلایا جائے گا:

لَا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَ	(اس کتاب عزیز یعنی قرآن پر) جھوٹ کا دخل نہیں،
لَا مِنْ خَلْفِهِ تَنْزِيلٌ مِنْ حَكِيمٍ حَمِيدٍ	نہ آگے اور نہ پیچھے سے، یہ حکمتوں والے اور سب
(حٰم سجدہ: ۴۲)	تعریفوں والے خدا کی اتاری ہوئی ہے۔

خود سوچو کہ زمان و مکان کے خلاف مالک زمان و مکان کے سوا کون ضمانت دے سکتا ہے؟

غرض قرآن کے آسمانی ہونے کی شہادت ہر عقلی پہلو سے ملتی ہے اور اس کے ساختہ انسان ہونے کا امکان بالکل زائل ہو جاتا ہے، اس پاک کتاب میں کہیں بھی رسول اللہ صلعم کا ذاتی کردار نمایاں نہیں ہوتا۔ نہ آپ کی روزانہ راحت و رنج کی کوئی صدا سنائی دیتی ہے، اور نہ ارضی ماحول کی جن معاملات پر اس میں بحث کی گئی ہے ان کے ضمن میں کہیں جغرافیائی، فضائی، نسلی، قبائلی، یا انفرادی خصوصیات کے اشارے نہیں ملتے۔ صرف وہی چیزیں ملتی ہیں جو عالم انسانیت کی تعلیم کے لیے ضروری تھیں۔

---

[1] ضربت علیہم الذلۃ این ما ثقفوا الا بحبل من اللہ وحبل من الناس وباؤ بغضب من اللہ وضربت علیہم المسکنۃ (آل عمران: ۱۱۲)
ان لوگوں پر (یہودیوں پر) ذلت کی مار پڑی جہاں کہیں بھی پائے گئے الا یہ کہ خدا کے عہد یا انسانوں کے عہد سے کہیں پناہ مل گئی ہو اور یہ بھی ذلت ہی کی پناہ ہوئی۔ خدا کا غضب ان پر چھا گیا۔ محتاجی اور بدحالی میں گرفتار ہو گئے۔

[2] وجاعل الذین اتبعوک فوق الذین کفروا الی یوم القیامۃ (آل عمران: ۵۵)
(حضرت عیسیٰ سے خطاب ہے) اور جن لوگوں نے تیری پیروی کی (مسیحی) انھیں قیامت تک تیرے منکروں (یہود) پر برتری دوں گا۔

قرآن کی زبان واسلوب کی جو شکل ہے، وہ بھی اس کے آسمانی ہونے کی شہادت دے رہی ہے۔ اس میں کہیں نشان یا سراغ نہیں ملتا کہ کوئی چیز دوسری کتابوں سے لی گئی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ قرآنِ مجید کو اسلام میں بلند ترین مقام حاصل ہے مسلمانوں کے لیے قرآنِ مجید محض نماز ودعا ہی کا سرمایہ نہیں، محض پیش گوئیوں ہی کی کتاب نہیں محض دل کی غذا اور روح کی پسندیدہ مناجات ہی نہیں۔ بلکہ ساتھ ہی قانونِ اساس وبنیاد بھی ہے علوم کا خزانہ بھی ہے، جو دور گزر چکے ہیں، ان کے احوال وظروف کا ایک آئینہ بھی ہے ہر حال کے لیے تسکین کا سرمایہ اور مستقبل کے لیے امید کا سہارا ہے:

تصدیق وتکذیب دونوں میں قرآنِ مجید صداقت کا معیار اور سچائی کا پیمانہ ہے، اپنے اوامر ونواہی میں یہ انسانی طرزِ عمل کا بہترین نمونہ پیش کرتا ہے۔ اس کا فیصلہ ہمیشہ درست ہوتا ہے۔ جہاں استدلال کی ضرورت پیش آتی ہے، قرآن مجید فیصلہ کن دلیلیں پیش کر دیتا ہے یہ اپنے اندازِ بیان میں پاکیزہ ترین اور جمیل ترین ہے۔ تسکین وتحریک دونوں میں بے پناہ اثر رکھتا ہے۔

چونکہ قرآن رضائے باری تعالےٰ کا براہ راست مظہر ہے، اس لیے تمام انسانوں کے تعلق میں اس کے ارشاد کی برتری قطعی طور پر مسلّم ہے۔ والدین کی فرمانبرداری، بڑوں کا احترام، جماعت کی عزّت اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی اطاعت بھی کتاب اللہ کی مقرر کردہ اصل پر مبنی ہے۔ ان کے ارشادات ہمارے لیے اس بنا پر حجت ہیں کہ یہ کسی الٰہی امر یا نہی پر مشتمل ہیں۔

متن کے متعلق خود رسول اللہ صلعم کی روش کا بھی اندازہ کر لینا چاہیے جو ہر لحاظ سے روح افروز ہے۔ آپ اس میں خفیف سا تغیّر بھی نہیں فرما سکتے تھے۔ آپ اسی طرح متن قران کی تفسیر وتشریح فرماتے تھے جس طرح کوئی شارح یا مفسر کسی ایسے متن کی تشریح کرتا

ہے، جو اس کا تیار کیا ہوا نہ ہو اور جب کبھی آپ نے کسی حکم کی تعمیل میں تھوڑی سی بھی تاخیر اس غرض سے فرمائی کہ مومنوں کے ساتھ شفقت کا برتاؤ ہو یا مخالفوں کے اعتراضات کی پیش بندی کر لی جائے تو وحی نے سختی کے ساتھ اس سے اختلاف کیا۔ رسول اللہ صلعم نے رضائے باری تعالےٰ کے سامنے بے تامل سر جھکا دیا اور اس قسم کے تمام ٹکڑے ہمیشہ کے لیے قرآن مجید میں محفوظ رہ گیے۔ مثال کے لیے ملاحظہ ہو سورۂ احزاب آیت ۳۷[1]۔

---

[1] واذ تقول للذی انعم اللہ علیہ وانعمت علیہ امسک علیک زوجک واتق اللہ وتخفی فی نفسک ما اللہ مبدیہ وتخشی الناس واللہ احق ان تخشٰہ ط (سورۂ احزاب ۳۷)

اور جب تو کہتا تھا اس شخص کو جس پر اللہ نے احسان کیا اور تو نے احسان کیا کہ بی بی کو رہنے دے اپنے پاس اور ڈر اللہ سے، اور تو چھپاتا تھا ایک چیز اپنے دل میں جسے اللہ کھولا چاہتا ہے اور ڈرتا تھا لوگوں سے اور تجھے اللہ زیادہ ڈرنا چاہیے۔

یہ معاملہ حضرت زیدؓ اور حضرت زینبؓ کا ہے۔ زید کا تعلق بڑے اونچے خاندان سے تھا لیکن بچپن ہی میں دشمن کے ہاتھ گرفتار ہو گیے اس نے غلام بنا کر فروخت کر دیا۔ ان کے پاس پہنچ گئے حضرت خدیجہؓ نے انہیں رسول اللہ صلعم کے حوالہ کر دیا زید کے والد اور چچا کو پتا چل گیا وہ لینے کے لیے آ پہنچے۔ اور معاوضہ پیش کیا حضور صلعم نے فرمایا کہ زید سے پوچھ لو۔ وہ جانا چاہے تو چلا جائے میں معاوضہ کچھ نہیں لیتا۔ زید نے انکار کر دیا رسول اللہ صلعم نے آزاد بھی کر دیا۔ یہ بھی فرمایا کہ میں اسے اپنا بیٹا سمجھتا ہوں۔ یہ زید پر اللہ اور اس کے رسول پاکؐ کے احسان تھے پھر رسول اللہ صلعم نے اپنی پھوپھی کی بیٹی زینبؓ سے زیدؓ کا نکاح کرنا چاہا تو زینبؓ اور ان کے بھائی نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ خاندانی شرف قریش کے اونچے گھرانے کی بیٹی کی شادی آزاد کردہ غلام سے کرنے کا روادار نہیں پھر جب یہ آیت نازل ہوئی کہ رسول اللہ صلعم کے فیصلے کے بعد کسی مومن مرد یا عورت کو اس میں چون وچرا زیبا نہیں۔ تو زینبؓ نکاح کے لیے راضی ہو گئیں لیکن میاں بی بی میں موافقت نہ ہو سکی اور غالباً زید بار بار رسول اللہ صلعم کی خدمت میں حاضر ہو کر کہتے تھے کہ بی بی کو طلاق دینا چاہتا ہوں رسول اللہ صلعم روکتے۔ حضور صلعم کو اول یہ خیال ہوتا کہ تفریق مٹانے کے لیے جو قدم اٹھایا گیا وہ کامیاب ہو دوسرے یہ خیال ہوتا کہ قرآن کی آیت کی بنا پر جو نکاح ہوئی، اس میں طلاق لوگوں کے لیے ابتلا کا باعث ہوگی اس کو قرآن مجید نے لوگوں کے ڈر سے تعبیر کیا۔ بعض اصحاب نے کہا ہے کہ رسول اللہ صلعم سوچتے تھے اگر زیدؓ سے نبھ نہ سکی تو زینب کی دلداری اس کے سوا کوئی صورت نہ ہوگی کہ خود ان سے نکاح کر لیں۔ ساتھ ہی یہ مشکل تھی کہ عرب میں منہ بولے بیٹوں کو حقیقی بیٹوں کے برابر سمجھتے تھے اور ان کی بیویوں سے بھی نکاح جائز نہ سمجھتے تھے اس وجہ سے رسول اللہ صلعم کو تامل ہوا اور اس کا ذکر قرآن مجید نے کیا۔

ارشاداتِ الٰہی کے متعلق یہ عاجزانہ احترام آمیز اور فرمانبردارانہ روش خود قرآن سے واضح ہے فرمایا:

قُلْ اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَ	کہہ دو میری نماز، میری قربانی، میرا جینا، میرا مرنا سب
مَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ لَا شَرِيْكَ	کچھ اللہ ہی کے لیے ہے، جو کائنات کا مالک ہے،
لَهٗ وَبِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ	اس کا کوئی شریک نہیں اس کا مجھے حکم دیا گیا ہے اور
(سورۃ الانعام: ۱۶۲-۱۶۳)	میں خدا کے فرمانبرداروں میں سے پہلا فرمانبردار ہوں۔

۲ سنت :-

قرآن کے علاوہ رسول اللہ صلعم کی جو تعلیمات ہیں، وہ سنّت کہلاتی ہیں۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، اسلام کی بنیاد و اساس قرآن مجید ہی ہے۔ اس مقدس کتاب کے خلاف جو چیز ہو، وہ نہ کی جاتی ہے اور نہ اس کا اعتقاد رکھا جا سکتا ہے۔ سنّت اسلام سے وہ اخذ کردہ قانون ہے، جسے ہر مسلمان کو لازماً ماننا چاہیے۔

رسول اللہ صلعم نے تین طریقوں سے تعلیم دی:

۱۔ خود زبان مبارک سے ہدایات دیں۔

۲۔ اپنے عمل مبارک سے سب کے روبرو مثال پیش کردی۔

۳۔ مختلف افراد کے عمل ملاحظے سے گزرے اور حضور صلعم نے سکوت فرمایا، گویا ان کے لیے سکوت سے منظوری صادر فرمادی، نہ نکتہ چینی کی اور نہ تردید۔

یہ تینوں طرح کی چیزیں روایات یا احادیث کی بنیاد و اساس ہیں جنھیں "سنّت" کہا جاتا ہے اور انھیں تعلیم و وضع قوانین کا دوسرا سرچشمہ مانا جاتا ہے۔

قرآنِ مجید نے تین صورتوں میں رسول اللہ صلعم کے احکام ماننے اور آپ کی پیروی کرنے کی ہدایت کی ہے:

۱۔ صاف حکم دیا ہے کہ رسول اللہ صلعم کے احکام مانے جائیں۔[1]

(حاشیہ صفحہ ۷۷ پر ملاحظہ فرمائیں)

۲۔ فرمایا ہے کہ جو رسول اللہ صلعم کے احکام مانتا ہے، وہ خود خدا کے احکام مانتا ہے[۱] اور ہمیں بتایا گیا ہے کہ آپ کے اسوہ حسنہ کی پیروی کریں[۲]۔

۳۔ قرآن مجید میں رسول اللہ صلعم کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ اپنی روش ایسی رکھیں جو مومنوں کیلئے اسوہ حسنہ بن سکے[۳]۔ نیز رسول اللہ صلعم کے بارے میں کہا گیا ہے کہ آپ نے الناس[۴] کو معروفات کی تاکید کی، منکرات سے روکا اور جس کام سے حضور صلعم نے منع نہیں فرمایا اس کی اجازت ہے[۵]۔

بقیہ صفحہ ۷۶: ۵۔ یا ایہا الذین آمنوا اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم فان تنازعتم فی شیء فردوہ الی اللہ والرسول (نساء: ۵۹)
مسلمانو، اللہ کی اطاعت کرو، اللہ کے رسول کی اطاعت کرو اور ان لوگوں کی اطاعت کرو جو تم میں حکم اور اختیار رکھتے ہوں پھر اگر ایسا ہو کہ کسی معاملہ میں باہم جھگڑ پڑو تو چاہیے اللہ اور اس کے رسول کی طرف رجوع کرو۔

ب: واطیعوا الرسول لعلکم ترحمون (نور: ۵۶)
اور رسول کی اطاعت کرو تاکہ تم پر رحم ہو۔

حاشیہ صفحہ هذا: ۱۔ من یطع الرسول فقد اطاع اللہ (نساء: ۸۰)
جس کسی نے اللہ کے رسول کی اطاعت کی تو فی الحقیقت اس نے اللہ کی اطاعت کی۔

۲۔ لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ لمن کان یرجوا اللہ والیوم الآخر (احزاب: ۲۱)
یقیناً تمھارے لیے رسول اللہ میں نیک نمونہ ہے، اس کے لیے جو اللہ اور یوم آخرت کی امید رکھتا ہے۔

۳۔ وما کان لمومن ولا مومنۃ اذا قضی اللہ ورسولہ امرا ان یکون لہم الخیرۃ من امرہم (احزاب ۳۶)
اور کام نہیں کسی ایمان دار مرد کا یا کسی ایمان دار عورت کا جب مقرر کر دے اللہ اور اس کا رسول کوئی کام کہ ان کو رہے اختیار اپنے کام کا۔

۴۔ الذین یتبعون الرسول النبی الامی الذی یجدونہ مکتوبا عندہم فی التوراۃ والانجیل یامرہم بالمعروف وینہٰہم عن المنکر ویحل لہم الطیبات ویحرم علیہم الخبائث ویضع
جو لوگ اس رسول کی پیروی کرتے ہیں کہ نبی امی ہے اور اس کے ظہور کی خبر اپنے یہاں تورات اور انجیل میں لکھی پاتے ہیں وہ انھیں نیکی کا حکم دیتا ہے، برائی سے روکتا ہے۔ پسندیدہ چیزیں حلال کرتا ہے، گندی چیزیں حرام کرتا ہے۔ اس بوجھ

مسلمانوں کی بہت بڑی اکثریت کا عقیدہ ہے کہ رسول اللہ صلعم کی تعلیمات یا تو براہِ راست اللہ تعالیٰ کی طرف سے القا و الہام پر مبنی ہیں یا جہاں القا و الہام نہیں ہوا اور حضور صلعم نے کوئی تعبیر فرمادی تو وہ احکام و اوامر قرآن کی حقیقی روح کے عین مطابق ہیں ایسے معاملات بھی پیش آئے کہ جن کے بارے میں کوئی وحی نازل نہ ہوئی تھی اور حضور صلعم نے ہدایات جاری فرمادیں اگر ایسی ہدایات کو منشاے الٰہی کے ساتھ پوری مطابقت نہ تھی تو وحی کے ذریعے سے حقیقت حال واضح کردی گئی[1]۔ باقی تمام معاملات کے

بقیہ صفحہ ۷۷: ۔عنھم اصرھم والاغلٰل التی کانت علیھم فالذین اٰمنوا بہ وعزروہ ونصروہ واتبعوا النور الذی اُنزل معہٗ اولٰئک ھم المفلحون (اعراف ۱۵۷) — سے نجات دلاتا ہے جن کے نیچے وہ دبے ہوئے تھے ان پھندوں سے نکالتا ہے جن میں وہ گرفتار تھے سو جو لوگ اس پر ایمان لائے اس کے مخالفوں کے لیے روک ہوئے۔ راہ حق میں اس کی مدد کی اور اس کی روشنی کے پیچھے ہولیے سو وہی ہیں جو کامیابی پانے والے ہیں۔

صفحہ ھذا: [1] اس سلسلے میں مصنف نے چار مقاموں کے حوالے دیے ہیں:

۱۔ انا انزلنا الیک الکتٰب بالحق لتحکم بین الناس بما ارٰىك اللہ ولا تکن للخائنین خصیما۝ واستغفر اللہ ان اللہ کان غفورا رحیما۝ ...... ولولا فضل اللہ علیک ورحمتہ لھمت طآئفۃ منھم ان یضلوک ...... وانزل اللہ علیک الکتٰب والحکمۃ وعلمک ما لم تکن تعلم (سورہ نساء: ۱۰۵-۱۱۳) — اے پیغمبر! ہم نے تم پر کتاب سچائی کے ساتھ نازل کی ہے تاکہ جیسا کچھ خدا نے بتادیا ہے، اس کے مطابق لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو، اور خیانت کرنے والوں کی طرف داری میں نہ جھگڑو اور اللہ سے مغفرت مانگو، بلاشبہ اللہ بخشنے والا رحمت رکھنے والا ہے...... اور اگر تم پر اللہ کا فضل نہ ہوتا اور اس کی رحمت کارفرما ہوتی تو ایک جماعت نے ارادہ کرلیا تھا کہ تجھے راستے پر ڈال دیں ...... اللہ نے تم پر کتاب اور حکمت نازل کردی اور وہ باتیں سکھلادیں جو تمھیں معلوم نہ تھیں۔

۲۔ ما کان لنبی ان یکون لہ اسرٰی حتی یثخن فی الارض تریدون عرض الدنیا واللہ یرید الاٰخرۃ واللہ عزیز حکیم۝ (الانفال: ۶۷) — نبی کے لیے سزاوار نہیں کہ اس کے قبضے میں قیدی ہوں جب تک کہ ملک میں غلبہ حاصل نہ کرلے۔ تم دنیا کی متاع چاہتے ہو اور اللہ چاہتا ہے تمھیں آخرت کا اجر دے اور اللہ غالب ہے حکمت والا۔

بقیہ صفحہ ۷۹ پر

متعلق آپ کے احکام، اجازات، فیصلے نیز آپ کا اسوہ واجب الاتباع ہے۔ قانون، یا تعلیم کے نقطۂ نگاہ سے اس میں کلام کی گنجائش نہیں، البتہ ضروری ہے کہ جو کچھ رسول اللہ صلعم سے منسوب کیا جاتا ہے وہ مستند وسائل کے رو سے درست ثابت ہو اور اس کی تصدیق میں تامل کی کوئی وجہ نہ رہے۔

یہ امر خاص توجہ کا محتاج ہے کہ ہمارے عملی فرائض میں سے دو کو حد درجہ اہم حیثیت حاصل ہے۔ اول نماز جو اللہ کے تعلق میں فرض ہے، دوم زکوٰۃ جو ہم جنسوں کے تعلق میں فرض ہے۔ قرآنِ مجید نے ان کا ذکر کرتے ہوئے بتا دیا کہ تفصیل کے لیے روایات کی طرف رجوع کیا جائے۔ نماز کے سلسلے میں واضح ارشاد ہے:

حَافِظُوا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلوٰةِ الْوُسْطٰى وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ ٥ فَاِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا اَوْ رُكْبَانًا فَاِذَآ اَمِنْتُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَمَا عَلَّمَكُمْ	تمام نمازوں کی حفاظت میں کوشاں رہو، خصوصاً بیچ کی کی نماز کی اور اللہ کے حضور میں کھڑے ہو تو ادب و نیاز میں ڈوبے ہوئے اور اگر تمھیں (دشمن کا) ڈر ہو تو پیدل ہو یا سوار جس طرح بھی بن پڑے نماز پڑھ لو جب مطمئن ہو جاؤ تو چاہیے اسی طرح ذکر کرو جس طرح تم کو سکھایا ہے

(بقرہ ۲: ۲۳۸-۲۳۹)

اسی طرح زکوٰۃ کا ذکر کرتے ہوئے ایک مقام پر فرمایا کہ یہ ضرورت مندوں کا مقررہ اور معلوم حق ہے اور وہ اسے خدا پرست لوگوں سے لینے کے حقدار ہیں:

اَلَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ ۝	وہ نمازی جو اپنی نماز پر برابر قائم ہیں۔
وَالَّذِيْنَ فِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ ۝	اور جن کے مال میں حصہ مقرر ہے۔

---

[۱]ث:۔ عفا اللہ عنک لم اذنت لہم حتی یتبین لک الذین صدقوا وتعلم الکذبین ٥ (توبہ: ۴۳)	اے پیغمبر! اللہ تجھے بخشے تو نے ایسا کیوں کیا (منافقانہ عذر داریوں پر) انھیں پیچھے رہنے کی اجازت دے دی۔ اس وقت اجازت دی ہوتی کہ تجھ پر کھل جاتا کہ کون سچے ہیں اور کون جھوٹے ہیں
:۔ ما کان للنبی والذین امنوا ان یستغفروا للمشرکین ولو کانوا اولی قربی من بعد ما تبین لہم انہم اصحب الجحیم ٥ (توبہ: ۱۱۳)	پیغمبر کو اور ان لوگوں کو جو ایمان رکھتے ہیں سزاوار نہیں کہ جب واضح ہو گیا مشرک لوگ دوزخی ہیں کہ پھر وہ ان کی بخشش کے طلبگار ہوں اگرچہ وہ عزیز و اقارب ہی کیوں نہ ہوں۔

لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُومِ (معارج ۷۰: ۲۳ تا ۲۵) مانگنے والے اور محروم کا۔

اسی طرح حج اور حرمت والے مہینوں کے تعلق میں تصریحات موجود ہیں۔ اب آپ غور فرمائیں کہ قرآن میں ان فرائض کی بجاآوری کا مفصل طریقہ بیان نہیں ہوا تو بھی ان تفصیلات کے لیے سنّت سے مدد لینی چاہیے۔ گویا خود قرآن نے سنت کو درجہ اختیار دے دیا یعنی قرآن مجید کے بیان کردہ اصول کی تفصیلات مرتب کرنے کی ذمہ دار سنت ہے۔ سنت کے بغیر یہ احکام واضح طور پر سمجھ میں نہیں آسکتے تھے۔

سنّت کا کام محض ان تفصیلات کی تشریح تک ہی محدود نہیں جو اصل احکام کا جزو ہیں اور ان میں مضمر ہیں بلکہ سنت نئے اوامر و نواہی بھی جاری کرتی ہے جن کی طرف قرآن مجید میں کوئی اشارہ نہیں پایا جاتا۔ انھیں قرآن کے قانون میں اضافے نہیں سمجھنا چاہیے، اس لیے کہ بہ نظر غور دیکھا جائے تو ایسی تمام احادیث کتاب کی عام تعلیمات کے عین مطابق نکلیں گی، اگرچہ یہ بات آسانی سے معلوم نہیں ہو سکتی کہ ہر حدیث کی بنیاد قرآن مجید میں کس مقام پر ملے گی۔

مثال کے طور پر قرآن مجید نے سونا، چاندی اور فصلوں میں سے زکوٰۃ ادا کرنے کا حکم دیا۔ ان کے علاوہ "املاک" اور "فے" کی عام اصطلاحات بھی استعمال کیں۔ رسول اللہ صلعم نے جانوروں کو بھی زکوٰۃ میں شامل فرمادیا۔ قرآن مجید نے ماہ رمضان میں روزے رکھنے کا حکم دیا تاکہ لوگوں میں تقویٰ اور صبر پیدا ہو اور وہ اللہ تعالیٰ کی عطاکردہ برکات پر شکرگزاری کا فرض ادا کریں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ رمضان شریف کے اختتام پر فطرانہ ادا کیا جائے۔ یہ تقویٰ، صبر اور شکر کے مقاصد کو پورا کرنے کا ایک مزید ذریعہ ہے۔ قرآنِ مجید نے "ربا" کو حرام قرار دیا ہے۔ سنّت میں بیع کے ان طریقوں کو بھی ممنوع قرار دیا ہے جن میں قیمت کے بڑھ جانے سے "ربا" کا رنگ پیدا ہو جاتا ہے۔ چونکہ بیع کے طریقے ممنوع ربا اور جائز کاروبار کے بیچ میں تھے اس

ان کی حیثیت کو مشتبہ سمجھ لینے کے مواقع موجود تھے لہٰذا قرآنِ مجید کے اس اصل کے مطابق انھیں ممنوع قرار دیا گیا کہ مقامات اشتباہ سے بچیں اور پرہیز کریں۔ قرآن مجید نے فحش کاری کے لیے تازیانے کی سزا مقرر کی۔ سنت نے تازیانے کی سزا ان فحش کاروں کے لیے رکھی جو غیر شادی شدہ ہوں اور شادی شدہ کے لیے سنگ ساری سے موت کی سزا مقرر کی اور اس کے لیے قرآن مجید کی اس آیت سے بناؤ اساس ملتی ہے کہ فحش کاری کی مجرم عورتوں کو اس وقت تک کے لیے گھروں میں بند رکھا جائے جب تک مر نہ جائیں۔

بہ ہر حال ثابت شدہ سنت کی وہ تمام چیزیں جو رسول اللہ صلعم کے ارشاد، عمل اور تصدیق پر مبنی ہوں مسلمانوں کے لیے بالکل بجا طور پر واجب الاتباع ہیں۔ قرآن مجید نے رسول اللہ صلعم کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل شدہ وحی کی توضیح او تشریح کا پورا اختیار دے دیا اور اس حقیقت سے کسے اختلاف ہو سکتا ہے کہ آپ ہی توضیح و تشریح کے بہترین حقدار تھے کیوں کہ آپ قانونِ الٰہی کی روح اور جوہر سب سے بہتر سمجھتے تھے۔ غرض اس پر حیران نہ ہونا چاہیے کہ سنت وجود پذیر ہوتی جس وہ احادیث جو قرآن مجید کی وحی کے مختلف پہلوؤں کو واضح کرتی ہیں۔ ان کی صحیح تعبیر بتاتی ہیں اور قیاس کی بنا پر ان سے قوانین اخذ کرتی ہیں۔

خاتمہ سخن:

ان گزارشات سے واضح ہو گیا کہ قرآن مجید اور رسول اللہ صلعم کے بارے میں مسلمانوں کا عقیدہ کیا ہے۔ قرآنِ مجید آسمانی کتاب ہے۔ وہ ایک قدوسی ہرکارے، روح الامین حضرت جبریل علیہ السلام کے ذریعے سے رسول اللہ صلعم کے قلب مبارک پر اتری۔ رسول اللہ صلی اللہ نے یہ وحی اخذ کی۔ اسے یاد کیا، لکھوایا، خلقِ خدا تک پہنچایا اس کے معنی واضح کیے اور عمل کے ذریعے سے اس کی حقیقی حیثیت متعیّن

کردی ۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا کوئی دوسرا مومن نہ اس میں تبدیلی یا ترمیم کر سکتا تھا اور
نہ اس سے تجاوز کا مرتکب ہو سکتا تھا۔ انسان کی بنائی ہوئی ہر کتاب ماضی حال اور مستقبل
کی بنا پر رد کی جا سکتی ہے یا اس کے مختلف حصوں کو غلط قرار دیا جا سکتا ہے یا اس پر بحثیں
کی جا سکتی ہیں ، لیکن قرآن خدا کا کلام ہے ۔ یہ کامل و اکمل ہے ۔ یہ صداقت کے اس درجے
تک پہنچا ہوا ہے کہ اس کے بارے میں گنجائش کلام موجود ہی نہیں ۔ سراپا عدل ہے ۔
اتنا حسین و جمیل ہے کہ اس کی مثال پیش نہیں کی جا سکتی ۔

رسول اللہ صلعم بلا شبہ بشر تھے ۔ نہ بڑے دیوتا تھے نہ چھوٹے دیوتا ، نہ دیوتاؤں
جیسے تھے اور نہ خدا کے معاون تھے ۔ ماضی اور مستقبل کے متعلق آپ کو اتنا ہی علم تھا جتنا کہ
اللہ تعالٰے نے آپ کو دے دیا تھا ۔ آپ صرف وحی کے معاملے میں ہر خطا سے پاک
اور معصوم تھے ۔ البتہ یہ بھی حقیقت ہے کہ آپ اپنی فطری پاکیزگی اخلاق اور مکارم کے
باعث دنیا بھر سے بالکل جداگانہ حیثیت کے مالک تھے ۔ پھر خدا نے آپ کو اپنے
پاس سے علم دیا اور رسالت کا عظیم القدر منصب عطا کر دیا ۔ آپ قرآن مجید کے بہترین مفسر
اور ترجمان تھے اور اس کی تعلیم کا زندہ عملی پیکر تھے ۔ لہٰذا ہم ان کا اتباع کرتے ہیں ، ان کا
احترام ہمارے فرائض میں داخل ، ان کے ساتھ محبت ہمارے ایمان کی دلیل ہے
قرآن نے ہمارے لیے واجب قرار دیا ہے کہ ان کا انتہائی احترام کریں ۔

اس پاک ذات صلعم نے ہمیں جہالت و بے خبری کی تاریکی سے نکال کر سچائی کی
روشنی میں پہنچایا ۔ ہم راستے سے بھٹک گیے تھے ، برائیوں میں پڑ گئے تھے ۔ آپ نے ہمیں
پھر اسلام کی سیدھی راہ پر لگا دیا ، لیکن واضح رہے کہ ہمیں آپ کی ذات بابرکات سے کتنی
ہی محبت ہو اور آپ کا ہم کتنا ہی احترام کریں لیکن آپ بدستور انسانی سطح پر رہتے ہیں
اور اس سے اوپر نہیں جاتے ۔ خود آپ نے کبھی الوہیت کا دعوٰے نہیں کیا ۔ آپ خدا کے
رسول اور اس کے بندے تھے ۔ آپ خود کلمہ شہادت پر غور کریں گے تو واضح ہو جائے گا

کہ پیغمبر کی عبدیت کو اس کی رسالت پر مقدم رکھا گیا ہے۔ ہمارے لیے آپ عبادت گزاری کا مرجع نہیں۔ ہم آپ سے دعا نہیں کرتے، صرف خدا سے دعا کرتے ہیں، صرف اس سے مدد مانگتے ہیں۔

اسلام کا نظام توحید ہر اعتبار سے خالص و غیر ممزوج ہے:

۱۔ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔

۲۔ محمد اس کے بندے اور رسول ہیں۔

۳۔ تمام انسان بھائی بھائی ہیں۔

یہ تین عناصر اسلامی عقیدے کے اجزا ہیں اور قرآنِ مجید کی تین سورتوں میں انھیں بالترتیب واضح کیا گیا ہے[1]۔

یہ اسلام کی صراط مستقیم (سیدھا راستہ) ہے۔ یہ ان لوگوں کا راستہ ہے جو قرآنِ مجید

---

[1] اول سورہ محمد کی انیسویں آیت۔

۱۔ فاعلم انہ لا الہ الا اللہ واستغفر لذنبک وللمؤمنین وللمؤمنٰت ط واللہ یعلم متقلبکم ومثوٰکم ہ

کسی کی بندگی نہیں سوائے اللہ کے اور معافی مانگ اپنے گناہ کے واسطے اور ایمان دار مردوں اور عورتوں کے لیے۔

۲۔ سورہ فتح کی انتیسویں آیت: ۲۹

محمد رسول اللہ والذین معہ اشداء علی الکفار رحماء بینھم ط

محمد اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ آپ کے ساتھ ہیں تیز ہیں کافروں پر اور نرم دل ہیں آپس میں۔

۳۔ سورہ حجرات کی تیرھویں آیت:

یا ایھا الناس انا خلقنٰکم من ذکر و انثیٰ وجعلنٰکم شعوبا و قبائل لتعارفوا ط ان اکرمکم عند اللہ اتقٰکم ط

(حجرات، ۱۳)

اے لوگو! ہم نے تم کو بنایا ایک مرد اور ایک عورت سے اور رکھیں تمھاری ذاتیں اور قبیلے تاکہ آپس میں پہچان ہو بلاشبہ اللہ کے ہاں اسی کی عزت زیادہ ہے جس میں تقویٰ زیادہ ہے۔

کی شکل میں نازل شدہ وحی کے مطابق اپنے آپ کو اللہ کی رضا، کے حوالے کر دیتے ہیں۔ قرآنِ مجید وہ کلام باری تعالےٰ ہے جو حضرت جبریلؑ کے ذریعے سے اللہ کے رسول محمد صلعم پر اترا۔

دوسرا باب

(استاذ شفیق غربال)

مشہور صوفی فلسفی امام غزالیؒ اپنی کتاب "المنقذ من الضلال" میں اپنی روحانی پریشانیوں کی نہایت واضح تصویر پیش کرتے ہیں، جو انھیں برداشت کرنی پڑیں۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت نے اُن کے لیے ہدایت کا راستہ روشن کر دیا اور وہ حقیقت کی جانب پیش قدمی کرنے کی صلاحیت سے ازسرِنو بہرہ مند ہو گیے۔ جن اصحاب نے حقیقت کی تلاش کے لیے زندگیاں وقف کر دی تھیں ان کے حالات کا گہرا مطالعہ کرنے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ اُنھیں چار گروہوں میں بانٹا جا سکتا ہے:۔

۱۔ وہ علماے دین جنھیں علم کلام سے دل بستگی رہی اور وہ عقل و دانش اور فکر و تحقیق کی پیروی کے مدعی تھے۔

۲۔ اسماعیلی اور دوسرے شیعہ حضرات جن کا عقیدہ یہ تھا کہ حقیقت تک پہنچنے کے لیے ایک معصوم زندہ امام کا دامن پکڑے بغیر چارہ نہیں اور امام یا معلّم ہمیشہ موجود رہتا ہے۔

۳۔ فلسفی جو ہمیشہ منطقی اور عقلی ثبوت پر انحصار رکھتے ہیں۔

۴۔ صوفی جن کا عقیدہ یہ تھا کہ وہ خدا کے برگزیدہ ہیں اور وجد و جذب، نیز صوفیانہ بصیرت کی بنا پر براہِ راست علم حاصل کر لیتے ہیں۔

اس تقسیم میں امام غزالی معاملے کی تہ تک پہنچ گیے۔ ہم اسلامی تاریخ میں تحریکات اور افکار کے موضوع پر بحث کرتے ہوئے اسی تقسیم کو پیشِ نظر رکھیں گے۔

مسلمانوں اور مسیحیوں دونوں کی کوشش یہ رہی ہے کہ اپنے اپنے دنیاوی معاملات کو جس قدر زیادہ سے زیادہ ممکن ہو خدائی قانون کے ماتحت لے آئیں اور انسانی معاشرہ کی ابتدا و انتہا کے متعلق جو کچھ اُن کے مذاہب نے سکھایا ہے اُسے عملاً موثر بنا دیں۔ عام طور پر اعتراف کیا جاتا ہے کہ یہ امید کبھی پوری نہ ہوئی ادھوری ہی رہی یا اِن قوموں کے بعض افراد کی رائے کے مطابق یہ طرزِ عمل مطلوب ہی نہ تھا، لیکن یہ حقیقت کہ اسلامی معاشرے کے تعلق میں بھی یہ امید ویسی ہی ناتمام رہی جیسی مشرقی مسیحی معاشرے میں رہی تھی، عام طور پر اچھی طرح ذہن نشین نہیں ہوتی۔ دونوں معاشروں میں اصل فرق یہ ہے کہ مسلمان سیکولر عوامل کی یا تو مذمّت کرتے رہے یا ان کو بالکل نظر انداز کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بہت سی انسانی سرگرمیوں اور روابط کے متعلق اصطلاحات ہی سرے سے موجود نہیں، مثلاً کلیسا، سیکولر دنیاوی کلیسائی، مملکت، سیاسی، مجلسی، ان کے متعلق ایسی کلیدی اصطلاحات تیار کر لی گئیں حالانکہ ہر شخص آگاہ تھا کہ ان الفاظ کا مفہوم کیا ہے۔ پیشِ نظر غور و بحث کے دوران میں ہمیں اس مشکل سے سابقہ پڑے گا اور ایسی اصطلاحات استعمال کیے بغیر چارہ نہ رہے گا جیسے سرکاری ادارات اور مذہبی ادارات۔

پروفیسر ایچ۔ اے۔ آر۔ گب[1] اسی حقیقت کی طرف توجہ دلاتے ہیں کہ اسلام کی اشاعت تیز جستوں کے انداز میں ہوئی مثلاً سنہ ۱۰ھ اور سنہ ۱۳۲ھ (سنہ ۶۳۲ء۔ سنہ ۷۵۰ء) کے درمیان ایک صدی سے کچھ ہی زیادہ مدّت میں عساکرِ خلافت، اسلامی حکومت کا دائرہ مشرق میں وسط ایشیا، اور مغرب اقصیٰ میں ہسپانیہ تک لے گئیں۔ پھر قریباً اڑھائی سو سال تک اسلامی حکومت کی حدود آگے نہ بڑھیں۔ اس کے بعد سنہ ۳۴۰ھ اور سنہ ۵۰۰ھ (سنہ ۱۰۰۰ء۔ سنہ ۱۱۰۰ء) کا درمیانی دور آیا اور اسلامی اقتدار کا دائرہ مغربی افریقہ، ایشیائے کوچک، وسطی ایشیا اور شمالی ہند تک وسیع ہو گیا۔ دو سو سال گزر جانے کے بعد پھر توسیع کے سمندر میں لہریں

[1] H.A.R. Gibb

اٹھیں اور مسلمان جزیرہ نمائے بلقان کے علاوہ روس کی سطحِ مرتفع، سائبیریا، باقی ہندوستان اور انڈونیشیا میں پہنچ گیے۔ نویں صدی ہجری (چودھویں صدی عیسوی) کی ابتدا میں دنیائے اسلام کا نقشہ وہی تھا جو آج ہے، البتہ ہسپانیہ اور پرتگال نیز سسلی سے مسلمان بالکل خارج ہو گئے تھے، کہیں کہیں انھوں نے تھوڑی سی پیش قدمی بھی کی تھی، زیادہ تر افریقہ کے اندر۔ یہ پہلو بھی پیشِ نظر رکھ لینا چاہیے کہ اسلام کے ایمانیات و معاملات ۱۳۳ھ - ۴۰۰ھ (۷۵۰ء - ۱۰۰۰ء) کے درمیان نشو و ارتقا کے درجۂ کمال تک پہنچ چکے تھے، جب واقعہ یہ ہے تو جن خطوں میں اسلام اس دور کے بعد پہنچا، انھوں نے اسلامی ثقافت کے نشو و ارتقا میں اپنا کوئی خاص کردار ادا نہ کیا، یہی وجہ ہے کہ انڈونیشیا نیز افریقی صحرا کے جنوبی حصّے میں اسلام کے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے، وہ الگ لکھا گیا ہے۔

اسلامی معاشرے کی بنیاد

(ہجرت کے پہلے دو سو سال ۶۲۲ء - ۸۵۰ء)

رسول اللہ صلعم کی حیاتِ طیبہ کا بڑا حصہ شہرِ مکہ میں گزرا جو عرب کے علاقہ حجاز میں واقع ہے، آپ کا سنِ مبارک چالیس تھا جب منصبِ رسالت عطا ہوا اور آپ نے خدائے قدیر و توحید کے لیے دعوت شروع کی۔ بتایا کہ وہی ہر شَے کا خالق ہے۔ وہی جہانوں کا پالنے والا ہے۔ وہ رحمان و رحیم ہے اور یوم الدین کا مالک ہے۔

رسول اللہ صلعم کے زمانے میں مکّہ کی حیثیت ایک شہری ریاست کی تھی۔ وضع قطع کے اعتبار سے اُسے تجارتی جمہوریت قرار دینا چاہیے، نیز یہ شہر ایک بہت بڑا مذہبی مرکز تھا۔ اس لیے کہ بیت اللہ کے اردگرد آباد ہوا تھا اور بے شمار زائر وہاں ان بتوں کی پوجا کے لیے آتے جاتے تھے، جو اِس پاک گھر میں رکھ دیے گیے تھے۔ اہل مکہ اس مقدس شہر تک آنے جانے والے راستوں کی حفاظت کا پورا پورا انتظام

کیا۔ اُن کے ہاتھ جنسیں فروخت کرتے تھے۔ اور بیت اللہ کی زیارت کے سلسلے میں انھوں نے نظم وآداب کا ایک وسیع سلسلہ قائم کر رکھا تھا، زائروں کی دیکھ بھال اور تجارتی کاروبار اہلِ مکہ کا خاص مشغلہ تھا۔ شہر کی زندگی میں اُن لوگوں کو اقتدار حاصل تھا جو بڑے قابل منتظم تھے اور گفت وشنید میں بھی اُنھیں خاص ملکہ حاصل تھا۔ یہ لوگ تشدّد کو پسند نہیں کرتے تھے اور جوش وخروش کو شُبہ کی نظروں سے دیکھتے تھے۔

مکہ کی یہ شہری حیثیت قائم رہی، اس لیے کہ عرب میں مرکزی اقتدار کا کوئی موثر بندوبست کبھی نہ ہوا۔ عرب کے جغرافیائی ماحول کی کیفیت ایسی تھی کہ مرکزی اقتدار کے لیے نشوونما کا موقع ہی نہ تھا۔ اس ماحول کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ حضری اور بدوی معاشرے کے درمیانی تعلقات غیر مستحکم رہے تھے اور ان معاشروں میں اختلاط مسلسل جاری رہا۔ یہی صورتِ حال آہستہ آہستہ شمالی جانب اُن صحرائی علاقوں میں پہنچی، جو شام اور عراق کے درمیان ہیں۔ آخر کار جزیرہ نمائے عرب کے جو علاقے حاشیوں پر واقع تھے اُنھوں نے بیرونی دنیا کے ساتھ بین الاقوامی تعلقات پیدا کر لیے اور وہی پورے جزیرہ نما کے اندر انتظاماتِ آمدورفت کے ذمہ دار بنے۔

تجارتی وزرعی آبادیوں اور بدوی زندگی میں جو امتیاز ہے وہ آب وہوا پر مبنی ہے۔ بدوی زندگی قبائلی بنا پر منظّم ہوتی ہے۔ قبیلے نہ تو بہت زیادہ بڑے ہوتے ہیں اور نہ بہت چھوٹے صحرا میں زندگی بسر کرنے کے لیے یہ دونوں صورتیں نامناسب ہیں[1] قبیلے کے افراد خونی رشتے کی بنا پر باہم پیوستہ رہتے ہیں، لیکن اجنبیوں کو بھی قبیلے میں محوّلیت یا اتحادیوں کے طور پر شامل کیا جاسکتا ہے۔ بدوی معاشرے کی نقل وحرکت اور عدم

---

[1] فاضل مقالہ نگار کا مطلب یہ ہے کہ قبیلہ بہت بڑا ہوگا تو صحرا میں کھانے پینے اور جانوروں کو چرانے کے وسائل ساتھ نہ دے سکیں گے۔ اگر بہت چھوٹا ہوگا تو حفاظت کا مسئلہ تشویش کا باعث بنا رہے گا۔

استحکام کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مستقل آبادیوں کے ہمسایہ بدوؤں کو جن حالات سے سابقہ پڑتا ہے اُس سے آبادیاں بہت زیادہ اثر قبول کیے بغیر رہ نہیں سکتیں۔ جو لوگ مستقل طور پر کسی جگہ آباد ہیں، وہ بہر حال انھیں بدویوں کے خلاف ہیں جنھوں نے نقل و حرکت چھوڑ کر اس جگہ توطّن اختیار کر لیا تھا۔ تاجروں یا کھیتی باڑی کرنے والوں کی حیثیت میں توطّن اختیار کر لینے کے بعد اُن کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ آس پاس کے بدوی قبیلوں کو زور و قوت سے یا سمجھا بجھا کر قابو میں رکھیں۔ اس طرح وہ اپنے گرد و پیش ایک حد تک امن و نظم قائم کرتے ہیں۔ یہ سلسلہ کچھ مدت کے لیے تو کامیاب رہتا ہے، لیکن اکثر یہ حالت پیش آتی ہے کہ بدوی آبادی میں بے چینی کی کوئی نئی لہر اُٹھتی ہے جو حضری آبادی کو بھی اپنی آغوش میں لے لیتی ہے۔ بعض اوقات یہ بدوی فاتح توطن پذیر ہو کر مفتوحین کے طور طریقے اختیار کر لیتے ہیں اور اسی طرح کون و فساد کا دور جاری رہتا ہے۔

یاد رکھنا چاہیے کہ جب بدوی نیا طرز زندگی اختیار کر لیتے ہیں، تو اس وقت بھی اپنے بعض پرانے طریقوں کو ترک نہیں کرتے اور اُن کے کردار میں عدمِ استحکام ایک حد تک باقی رہتا ہے۔ پرانے طریقوں سے وابستگی کی بہت سی مثالیں ہمارے سامنے موجود ہیں مثلاً شکار یا جسمانی و روحانی تازگی کے لیے صحرا میں نکل جانے کا رجحان یا بچوں کو پرورش کے لیے بدوی آبادی میں بھیج دینا، تاکہ وہ شہری زندگی کے اثرات سے محفوظ رہیں یا صحرائی داستانیں سُن کر شام کے اوقاتِ تفریح گزارنا۔

بدوی و حضری زندگی کے اختلاط نے جو کردار ادا کیا، اُسے اچھی طرح پیشِ نظر رکھنا چاہیے۔ یہ صرف عرب یا ایامِ جاہلیت تک محدود نہیں، بلکہ اسلام کی پوری تاریخ میں

• مکہ معظمہ سے بچوں کو تربیت کے لیے بدویوں کے پاس بھیجنے کے لیے مختلف وجوہ تھے، خاص طور پر قابلِ ذکر وجوہ یہ تھے کہ اول صحرائی آب و ہوا شہری آب و ہوا کے مقابلے میں صحت کے لیے زیادہ مفید تھی اور دوسرے بچے خالص عربی زبان سیکھ سکتے تھے، شہری زبان مختلف اجنبی گروہوں کے خلا ملا کے باعث خالص نہیں رہی تھی۔ لیکن فاضل مضمون نگار کی پیش کردہ وجہ بھی قابلِ توجہ ہے۔

جاری وساری ہے۔ جب تک اختلاط کے اس کردار کو واضح طور پر ذہن نشین نہ کر لیا جائے گا شمالی افریقہ یا مصر یا عراق یا شام کی اسلامی تاریخ سمجھ ہی میں نہیں آسکتی۔

مکہ معظمہ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مولد تھا، اختلاط کی ایک نہایت اچھی مثال پیش کرتا ہے۔ وہاں جو گروہ آباد تھے ان کا تعلق قبیلہ قریش سے تھا، جو اپنا سلسلۂ نسب حضرت اسماعیلؑ بن حضرت ابراہیمؑ تک پہنچاتے تھے۔ قرآن مجید میں ان دونوں کو خدا کا پیغمبر قرار دیا گیا ہے۔ کعبہ کو اللہ تعالیٰ کی مقدس عبادت گاہ اور مرکزِ حج کی حیثیت میں حضرت اسمٰعیلؑ اور حضرت ابراہیمؑ ہی نے تعمیر کیا تھا۔ رسول اللہ صلعم کا گھرانا ہاشم سے چلا دلیسا ہی ایک گھرانا ہاشم کے بھائی اُمیہّ سے چلا۔ بنو امیہّ زیادہ دولت مند تھے اور انھیں ہاشمیوں کے مقابلے میں اثر ورسوخ بھی زیادہ حاصل تھا۔ رسول اللہ صلعم کی ابتدائی زندگی میں ہاشمیوں کے رئیس ابوطالب آپ کی نگرانی کا فرض انجام دیتے رہے۔ ابوطالب کے فرزند حضرت علیؓ ان لوگوں میں تھے جو سب سے پہلے اسلام لائے۔ ان کی شادی رسول اللہ صلعم کی صاحبزادی حضرت فاطمہؓ سے ہوئی اور حضرت علی اسلام کے جوان مردِ مجاہد تھے، خود انھیں اور ان کی اولاد کو اسلام کی تاریخ میں ایک یگانہ مقام حاصل ہے۔ رسول اللہ صلعم کے ایک اور چچا حضرت عباسؓ تھے۔ یہ ان عباسی خلفاء کے ابو الآبا تھے جو پانچ صدیوں تک تختِ خلافت پہ متمکن رہے،

رسول اللہ صلعم کے زمانے میں مکہ معظمہ کی حقیقی حیثیت کو ذہن نشین کرنے کے لیے ضروری ہے کہ محض بدویوں اور ان کے گروہوں ہی کا کردار پیشِ نظر نہ رکھا جائے بلکہ عرب کے بیرونی تعلقات کے بارے میں بھی کچھ نہ کچھ جان لیا جائے عرب سے ہمسایہ علاقوں میں بخور یعنی عود لوبان وغیرہ نیز بھیڑ بکریاں یا گھوڑے اونٹ بھیجے جاتے تھے، عرب کی بندرگاہیں بحیرہ روم کے علاقوں اور ہندوستان کے درمیان تجارت کے سلسلے میں خاص کڑیوں کی حیثیت رکھتی تھیں، علاوہ بریں خشکی کے تجارتی راستے بھی عرب ہی میں سے

گزرتے تھے اور ان میں سے بعض میں مکہ معظمہ بھی ایک مرکز کی حیثیت رکھتا تھا عرب کے بدوی معاشرے کا عدم استحکام اس امر کا موجب ہوا کہ ایرانی اور بزنطینی شہنشاہیتوں نے جو باہم حریف تھیں، سرحدوں پر ایسی ریاستیں قائم کرلیں جن کی بنا پر سرحدیں محفوظ رہ سکیں اس طرح انھیں سیاسیاتِ عرب میں مداخلت کا موقع مل گیا بیزنطینی سلطنت نے یہ کوشش کی کہ مشرقی عرب میں ایرانی اثر کو ختم کیا جائے اور جنوبی عرب میں یہودیت پر غلبہ پاکر مسیحیت کی حوصلہ افزائی کی جائے۔ اسی لیے بیزنطینی سلطنت نے حبشہ کو اکسا کر یمن پر حملہ کرایا۔ جیسا کہ عام طور پر معلوم ہے، اہل حبشہ نے یمن کو مرکز بنا کر مکہ معظمہ پر حملے کی کوشش کی تاکہ بیت اللہ کو برباد کردیں۔ اللہ تعالےٰ کی رحمت نے اس مہم کو بری طرح ناکام بنایا۔ چونکہ اہل حبشہ نے اس حملے میں افریقی ہاتھی استعمال کیے تھے اس لیے مہم کے سال کا نام "عام الفیل" (ہاتھیوں کا سال) پڑ گیا۔ اسی سال رسول اللہ صلعم تشریف فرمائے عالمِ وجود ہوئے۔

ظاہر ہے کہ مکہ معظمہ رسول اللہ صلعم کے وقت میں ثقافتی اعتبار سے "بند کھاڑی"[1] کی حیثیت نہیں رکھتا تھا اس کے اکابر اہم تجارتی معاہدوں کے سلسلے میں دور دور تک سفر کر چکے تھے۔ انھوں نے رومی اور ایرانی عہدے داروں سے گفت وشنید کی تھی اور اپنے عرب بھائیوں سے بھی انھیں معاملے طے کرنے پڑتے تھے۔ علاوہ بریں وہ بدوی قبیلوں کے نظم میں بھی بڑی مہارت رکھتے تھے۔ عرب کے بیشتر حصوں میں یہودیوں اور عیسائیوں کی جماعتیں موجود تھیں۔ مدینہ منورہ نے رسول اللہ صلعم کی حیاتِ طیبہ کے آخری دس سال میں نہایت اہم حیثیت حاصل کرلی، وہاں بھی یہودی آباد تھے اور بڑے ذی اثر ملنے

[1] بند کھاڑی کا مطلب یہ ہے کہ سمندر کا وہ چھوٹا سا حصہ جو اصل سے کٹ گیا ہو اور اسے ساکن و استادہ پانی کی حیثیت حاصل ہوجائے۔ مراد یہ ہے کہ مکہ معظمہ ثقافتی اعتبار سے کوئی منقطع شہر نہ تھا بلکہ اسے ہر قسم کی ثقافتوں سے ربط ضبط تھا۔

جاتے تھے۔

اسلامی روایات کے مطابق اسلام سے پیشتر کا زمانہ "دورِ جاہلیت" کہلاتا ہے لیکن یہاں "جاہلیت" سے مراد وہ شے نہیں جسے علم کی ضد قرار دیا جاتا ہے یعنی جہل و جہالت سے مراد بے آئینی ہے یا کہہ لیجیے کہ وہ لوگ کسی بہتر چیز سے ناواقف تھے بعض علما نے رائے ظاہر کی ہے کہ "جاہلیت" سے اشارہ ان وحشیانہ اور بدوی عادات و رسوم قبول کر لینے کی طرف ہے جو رسول اللہ صلعم کی رسالت سے کچھ مدت پیشتر رائج تھیں۔ صحیح یہ ہے کہ عرب حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ کے عہد کی خالص توحید کو چھوڑ کر بت پرستی اختیار کر چکے تھے اور یہی چیز تھی جس کی مذمت رسول صلعم نے سب سے بڑھ کر کی۔

اگر آپ چاہتے ہیں کہ رسول اللہ صلعم کے مشن کا اندازہ ٹھیک ٹھیک کر سکیں تو آپ کے عہد میں مکہ معظمہ کی زندگی کے اس پہلو کو اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہیے رسول اللہ صلعم نے جو پیغام دیا وہ اُن پیغاموں کی تصدیق و تجدید پر مبنی تھا جو پہلے پیغمبر دے چکے تھے، خواہ اُن کا ذکر قرآن میں آیا یا نہیں آیا اور خاص طور پر قابلِ ذکر امر یہ ہے کہ رسول اللہ صلعم کی دعوت حضرت ابراہیمؑ علیہ السلام کے مذہب کی بحالی کے لیے تھی۔ پورے پیغام کا مرکزی موضوع یہ تھا کہ ایک ایسی جماعت پیدا کی جائے جو اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرے اور راست بازی پر کاربند ہو۔ رسول اللہ صلعم کو امید تھی کہ قریش کی حالت پلٹی جا سکے گی اور کعبہ کی ابتدائی دور کی پاکیزگی، طہارت اور تقدس بحال ہو جائے گا مگر یہ نہ ہوا اہل مکہ نے رسول اللہ صلعم کی دعوت قبول نہ کی، وہ کاروباری لوگ تھے اور طبعاً انھیں مذہبی جوش سے کوئی مناسبت نہ تھی۔ اُنھوں نے رسول اللہ صلعم کی تادیب کے لیے ہاشمیوں کو اقتصادی و مجلسی بائیکاٹ کا ہدف بنا لیا۔ اسلام کے ابتدائی پیرووں میں سے جو لوگ کمزور اور غریب تھے اُنھیں سخت جسمانی اذیتیں

دی گئیں، لیکن جن کے رشتہ دار قوی اور زور آور تھے انھیں ایسی سزا دینے کی جرات کوئی نہ کر سکا۔ خونی رشتے کی قوت واستحکام کا اندازہ کیجیے کہ جو لوگ رسول اللہ صلعم کے پیش کردہ مذہب کو ناپسند کرتے تھے وہ بھی اپنے مسلمان رشتہ داروں کی حمایت کے لیے ہمہ تن تیار رہتے تھے۔ جب رسول اللہ صلعم پر واضح ہو گیا کہ قریش کے مسلمان ہونے کی فوری امید نہیں تو آپ ہجرت کر کے مدینہ منوّرہ چلے گیے۔

رسول اللہ صلعم نے مدینہ منورہ میں نئے حالات کے ماتحت ایک نئی جماعت کی بنیاد رکھی۔ آپ کا نصب العین اور محبوب مقصد یہ تھا کہ مکہ معظمہ کو نئی جماعت کا روحانی مرکز بنا کر اس کے دائرے میں پورے عالمِ انسانیت کو لے لیں۔ ابتدا میں مسلمان دو عنصروں سے مرکب تھے۔ ایک مہاجرین جو مکہ سے ہجرت کر کے پہنچے تھے۔ دوسرے انصار یعنی مدینہ منورہ کے وہ باشندے جنھوں نے دینِ حق کی نصرت کا پرچم اٹھایا تھا۔ رسول اللہ صلعم نے ان دونوں عنصروں کو ملا کر اسلامی اخوت کی طرح ڈالی۔ یہ ایک نیا رشتہ اور نیا تعلق تھا جو خاندان، گروہ، قبیلے، یا قوم کے تمام رشتوں سے مسلمان کے نزدیک زیادہ عزیز بن گیا۔ پھر نئی جماعت کے تحفظ کے لیے متعدد معاہدے ہوئے جو باہمی فوائد کے اعتراف پر مبنی تھے اور غیر مسلموں کے ساتھ بھی معاہدے کر لیے گیے۔ چونکہ اسلامی اخوت کا دائرہ پورے عالم انسانیت پر پھیلا ہوا تھا لہذا اللہ تعالے کے احکام کو سب پر حاوی کرنے کی کوشش بھی ختم نہیں ہو سکتی تھی لیکن اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ جبر سے کام لیا جائے۔ خود رسول اللہ صلعم اور آپ کے بعد مسلمانوں کے نزدیک اصل مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کی حفاظت ہو اور اُن کی برتری قائم رہے۔ فائدے کی ہر چیز سب کے لیے تھی۔ جماعت کے اندر اور باہر غیر مسلموں سے برتاؤ یا صلح و جنگ میں باقی دنیا کے ساتھ تعلقات کا معاملہ آتا تھا تو جماعت کا عام فائدہ پیش نظر رہتا تھا۔

دس سال تک رسول اللہ صلعم جد و جہد فرماتے رہے تاکہ اُس برگزیدہ معاشرے

کی تکمیل فرمادیں، جس کا ذکر قرآن مجید میں یوں کیا گیا ہے:

کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّۃٍ اُخْرِجَتْ	مسلمانو! تم تمام امتوں میں بہتر امت ہو جو لوگوں کے
لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ	ارشاد و اصلاح کے لیے ظہور میں آئی ہے تم نیکی کا
وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ	حکم دینے والے برائی سے روکنے والے اور اللہ تعالیٰ
بِاللّٰهِ (آل عمران)	پر سچا ایمان رکھنے والے ہو۔

قرآن مجید میں دین کے اصول، راست بازی کی زندگی بسر کرنے کے قواعد اور مجلسی تعلّقات کے ضوابط موجود ہیں۔ رسول اللہ صلعم نے اپنے قول و عمل سے پیرووں کے سامنے زندہ عملی نمونہ پیش کر دیا، یہاں تک کہ کوئی معمولی سے معمولی بات بھی آپ کی توجیہ مبارک سے باہر نہ رہی، آپ کے ارشادات و اعمال کا جو مجموعہ احادیث کی شکل میں موجود ہے، وہ ہماری اصطلاح میں رسول اللہ کی "سنت" ہے۔ اسلامی معاشرے پر اس کی پابندی لازم ہے۔ ان ارشادات میں جو روح جاری و ساری ہے اور مقدس اور ممنوع میں حضور کا جو نقطۂ نگاہ رہا وہ سب سنّت میں شامل ہے۔

مکہ معظمہ سے ہجرت کے آٹھ سال بعد (۶۲۹ء) رسول اللہ صلعم فاتح کی حیثیت میں اپنے وطن لوٹے۔ آٹھ سال کی مدت میں آپ نے حرب و ضرب، نیز حسنِ تدبیر سے کام لے کر مکہ معظمہ کو ہر جانب سے بے تعلق کر دیا تھا۔ چنانچہ آپ کی پیش قدمی کے ساتھ یہ شہر پکے ہوئے پھل کی طرح آپ کے دامن میں آگرا۔ رسول اللہ صلعم نے تمام پرانی تلخیاں بھلا کر سب کو معافی دے دی اور بیت اللہ کو تمام بتوں سے پاک کر دیا۔ پھر آپ مدینہ چلے گئے جسے آپ نے اپنا وطن بنا لیا تھا۔ ہجرت کے دسویں سال آپ نے مختصر سی علالت کے بعد مدینہ منورہ میں وفات پائی (۶۳۲ء)[1]

---

[1] وفات ۱۱ھ میں ہوئی لیکن فاضل مقالہ نگار نے اپنے بیان میں سن ہجری نہیں بلکہ مدتِ ہجرت پیشِ نظر رکھی۔

رسول اللہ صلعم کی وفات کے بعد جو مشکل دور آیا، اُس میں جماعت کی رہنمائی کی ذمہ داری دو آدمیوں کے دوشِ ہمت پر آپڑی، اول حضرت ابو بکرؓ دوم حضرت عمرؓ، جو قریباً ہر چیز میں ایک دوسرے سے بالکل مختلف تھے، لیکن نقطۂ نگاہ اور نصب العین میں ان کے درمیان یگانہ اتحاد تھا۔ حضرت ابو بکرؓ رہنما اور لیڈر کی حیثیت میں منتخب ہوئے تو آپ خلیفۃ الرسول کے لقب سے مشہور ہوئے۔ یہ حقیقت حد درجہ واضح تھی کہ جماعت کی رائے عامہ رسول اللہ صلعم کے پہلے جانشین کے لیے حضرت ابو بکرؓ کے سوا اور کسی پر راضی نہ ہوئی۔ خلیفہ بننے کے دو سال بعد انھوں نے وفات پائی اور وفات سے پیشتر حضرت عمرؓ کو اپنا جانشین نامزد کر دیا۔ ان دو عظیم المرتبہ رہنماؤں نے جماعت کے نشو و ارتقا کو ایک منزل آگے بڑھا دیا۔

بعض قبائل نے یہ اعلان کر دیا تھا کہ رسول اللہ صلعم کی وفات کے بعد وہ عہد و پیمان باقی نہیں رہے جو آپ کی زندگی میں کیے گئے تھے، لہٰذا وہ اپنے حالات کے اعتبار سے جو طرزِ عمل کو مناسب سمجھیں اُس کے لیے آزاد ہیں۔ حضرت ابو بکرؓ نے اُن کے اس رویے کی مخالفت کی اور اُن کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیا۔ بعد ازاں انھیں قوت سے تھام لے کر درہم برہم کر ڈالا۔ ساتھ ہی عرب سے باہر توسیع کی پالیسی اختیار کی جس پر اس تمام سے عمل ہوا کہ حضرت عمرؓ اور اُن کے بعد تیسرے خلیفہ حضرت عثمانؓ کے زیرِ نگرانی دس سال میں مسلمان، شام، عراق، بالائے دوآبہ*، آرمینیا، ایران، مصر اور سائیرانیکا† کے مالک بن گیے۔ یہ فتوحات آگے چل کر مزید توسیع کی بنیاد بن گئیں، جو مشرقی جانب وسط ایشیا اور وادی سندھ میں پہنچیں اور مغربی جانب شمالی افریقہ، ہسپانیہ اور بحیرۂ روم

---

* دوآبے سے مراد دوآبہ دجلہ و فرات ہے۔

† جس ملک کو پہلے طرابلس اور آج کل لیبیا کہتے ہیں، اس کے دو بڑے حصے ہیں، مشرقی حصہ جو مصر سے متصل ہے، سائیرانیکا کہلاتا ہے اور مغربی حصہ طرابلس یا ٹریپولیٹانیا، کہلاتا ہے۔

کے بعض جزیروں[1] تک چلی گئیں۔

رسول اکرم صلعم نے اسلامی جماعت کی تاسیس کا جو کام شروع کیا تھا حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ نے اُسے ایک مقدس امانت سمجھتے ہوئے جاری رکھا، اُن کے نزدیک اختیارات کی اصل مالک جماعت ہی تھی۔ یقیناً اُنھیں جماعت کی عام رضامندی سے منتخب کیا گیا تھا۔ اُن دونوں کا تعلق ایسے گھرانوں سے تھا جو مکہ معظمہ میں بہت کم طاقت رکھتے تھے۔ اُمویوں اور ہاشمیوں میں سے کسی کو خلیفہ منتخب کرنے کے لیے عام لوگ تیار نہ تھے اس لیے کہ اندیشہ تھا، امویوں کی حمایت یا ہاشمیوں کے وقار سے خلیفہ کو فائدہ اُٹھانے کا موقع ملا تو وہ بہت طاقتور ہو جائے گا۔ حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ نے رسول اللہ صلعم کے دوسرے صحابیوں کے ساتھ تعلقات میں عدل اور سخت گیری کا مشترکہ مظاہرہ کیا۔ چنانچہ جو شخص بھی دیانت یا ادائے فرض کے مطلوب معیار پر پورا نہ اترا اُسے راہِ راست پر لانے میں تامل نہ کیا۔ یہ دونوں بزرگ معاملات کو ٹھیک چلاتے رہے، اس لیے کہ سب پر آشکارا تھا جہاں وہ خدمتِ جماعت کے سلسلے میں دوسروں سے کوئی نرمی برتنے کے لیے تیار نہیں وہاں اپنے اوپر زیادہ سے زیادہ سختی کے لیے تیار ہیں۔

حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ کو بہت سے مسائل سے سابقہ پڑا جن میں سے اہم ترین مسئلے یہ تھے۔

۱۔ جب مکہ معظمہ کو روحانی مرکز بنا دیا گیا تو جماعت یا ملّت کی حیثیت کیا ہو؟

۲۔ یہ معاملہ کہ کس قسم کا اندازِ حکومت اختیار کیا جائے۔؟

[1] یہاں یہ بتا دینا چاہیے کہ حضرت ابو بکر صدیقؓ نے خواہ مخواہ توسیع کی سعی نہیں فرمائی تھی اور نہ ایسی سعی اسلامی نقطۂ نگاہ سے جائز ہو سکتی تھی، جو عرب حواشی میں آباد تھے اور ان کے مختلف طبقے ایران و روم کے ماتحت چلے گیے تھے، ان میں اسلام کی طرف کشش پیدا ہوئی تو ایرانی اور رومی حکام نے اُن پر سختیاں شروع کر دیں۔ اس طرح جو لڑائیاں شروع ہوئیں اُن میں خلافت کو عربوں کی حمایت کرنی پڑی، پھر ان لڑائیوں نے وسعت اختیار کر لی۔ پیش دستی غیر مسلموں کی طرف سے ہوئی تھی نہ کہ مسلمانوں کی طرف سے۔

۳- علمی امور میں قدامت پسندی اور تغیر کے درمیان متوازن راستہ کیا ہو سکتا ہے۔

پہلے معاملے کے سلسلے میں انھوں نے توسیع کی پالیسی اختیار کرلی جس کے نتیجے میں ایک دنیائے اسلام پیدا ہو گئی۔ اس کی حدیں دریائے سندھ سے ہسپانیہ تک پھیلی ہوئی تھیں۔ ان کے محرکات کا موازنہ کرتے وقت یہ پہلو نظر انداز کرنا غیر ممکن ہے کہ جو قبائلی نئے نئے حلقہ بگوشِ اسلام ہوئے تھے، انھیں عرب سے باہر جنگی مہموں میں مصروف رکھنا قرینِ مصلحت تھا اور خلفاء کے فیصلے پر یہ عامل بھی اثر انداز ہوا۔ تاہم اصل محرک جس نے ان مہموں کی ترتیب ضروری قرار دی، یہ تھا کہ جماعت کے تحفظ اور خوشحالی کو صرف حجاز تک محدود رکھنا محلِ نظر تھا، بہ ہر حال ضروری تھا کہ اپنے حدود کو آس پاس کے ان علاقوں تک ضرور بڑھا لیتے جو ایرانی اور بیزنطینی سلطنت کے تابع تھے۔ ابتدائی دور میں حیرت انگیز سہولت سے کامیابیاں حاصل ہوئیں تو حضرت عمرؓ اور ان کے سپہ سالاروں کو یہ حوصلہ ہوا کہ جنگی کارروائیوں کا دائرہ زیادہ سے زیادہ بڑھا لیں۔

خاص طور پر قابلِ ذکر امر یہ ہے کہ خلفاء اور اُن کے سالاروں نے مفتوحہ علاقوں کو اقتصادی تباہی سے بچانے کی انتہائی کوشش کی۔ اُنھوں نے مزروعہ زمینوں کو قبائلی عربوں کے درمیان تقسیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اس لیے کہ وہ بدو زمینوں کو تباہ کر دیتے اور خزانہ خالی ہو جاتا۔ اس امر کا بھی خاص خیال رکھا گیا کہ عرب فاتحین صرف چھاؤنیوں میں رہیں۔ اُنھیں باقاعدہ وظیفے ملیں اور مالِ غنیمت سے وہ حصہ پاتے رہیں۔ مدینہ منورہ سے جو راستے اطراف کے صحرائی علاقوں کی طرف جاتے تھے۔ اُن پر نئی فوجی چھاؤنیاں قائم کر دی گئیں مثلاً جنوبی عراق میں بصرہ اور کوفہ، مصر میں فسطاط جو موجودہ قاہرہ کے جنوب میں تھا، شام کے بعض پرانے شہروں میں بھی چھاؤنیاں تھیں مثلاً حمص۔

اگرچہ اسلام نے دورِ جاہلیت کے غیر اسلامی معاشرے کے ساتھ وفاداری کی اصولی طور پر مذمت کی تھی، لیکن قبائلی نظام کی داخلی قوت اور اجنبیوں کو اپنا لینے کا طریقہ

اتنا مفید تھا کہ اُسے ختم نہ کیا گیا۔ گویا جنگی قوت کی تعمیر قبائلی خطوط پر ہوئی اور چھاؤنیوں میں
کے لیے علاقوں کی تقسیم بھی قبائلی بنیاد پر ہوتی تھی۔ باہر کے علاقوں میں جن لوگوں نے
قبول کیا، اُنھیں نہ صرف جماعت کے افراد قرار دے دیا گیا، بلکہ وہ مختلف قبائل
ساتھ بطورِ موالی وابستہ ہو گئے، لیکن انھیں اپنے عرب بھائیوں سے ہمیشہ یہ شکا
رہی کہ ہمارے ساتھ برابری کا سلوک نہیں کیا جاتا۔ موالیوں کا یہ مسئلہ اسلامی معاشرے
کے لیے مسلسل مصیبت کا باعث بنا رہا تا آنکہ عباسی خلافت کے آغاز میں اس قبائ
نظام کا شیرازہ بکھر گیا جو حضرت عمرؓ کے زمانے سے چلا آرہا تھا۔[1]

مفتوحہ علاقوں کے جن باشندوں نے اپنے سابقہ مذہب ــــــ مسیحی
یہودیت یا زرتشتیت ــــــ پر قائم رہنے کو ترجیح دی انھیں بطور "ذمی" مجلسی نظام میں
کر لیا گیا۔ "ذمی" کا مطلب یہ ہے کہ وہ لوگ جن کی حفاظت کا ذمہ اٹھا لیا گیا ہو۔ ان
جزیہ لیا جاتا تھا اور کچھ پابندیاں بھی ان پر عائد تھیں۔ وہ دوسرے درجے کے شہری
یہ ایسی ہی قسم ہے جیسے مورخین اوّل درجے کے شہری کے لیے بھی نقصان رساں
رہے، موالیوں کا مسئلہ تو اس طرح طے ہوا کہ قبائلی نظام ہی باقی نہ رہا۔ ذمیوں کا مسئلہ
عہد کی اسلامی حکومتوں نے یوں طے کر دیا کہ قدیم اسلامی معاشرے کے طریقِ عمل
انحراف اختیار کر لیا۔

اگرچہ اسلامی حکومت کا دائرہ بہت پھیل گیا تھا پہلے دو خلفا نے نظامِ حکوم

---

[1] موالی کا مسئلہ خوب ذہن نشین کر لیجیے۔ جو لوگ مختلف عرب علاقوں سے تعلق رکھ
تھے۔ وہ اسلام کے حلقہ بگوش بنتے تھے تو کسی نہ کسی عرب قبیلے سے وابستہ ہو جاتے تھے۔
طریقہ یہ تھا کہ جس عرب قبیلے کے سردار کے ہاتھ پر وہ اسلام لاتے تھے، عموماً اسی سے وابستہ ہو جا
لیکن آگے چل کر موالی کو شکایت پیدا ہوئی کہ ان کے ساتھ برابر کا برتاؤ نہیں کیا جاتا ابتدائی دور کے عربوں کی روش اور ا
کے عربوں کی روش میں تغیر آ گیا تھا۔ اس وجہ سے شکایت بے بنیاد نہ تھی۔ اسی خلافت کے آغاز پر قبائلی نظام ہی ختم کر دیا گیا۔

زیادہ سے زیادہ سادہ رکھنے کی کوشش کی۔ وہ رسول اللہ صلعم کے کسی صحابی سے کہتے کہ ان کام کر دو، اس طرح ضرورت پوری ہو جاتی۔ ابتدائی دور ہی میں انھیں بیت المال قائم کرنے احساس ہو گیا تھا، ساتھ ہی مقرر کیے ہوئے وظیفے ایک رجسٹر میں لکھنے ضروری تھے۔ طرح جیسے جیسے ضرورت پڑتی گئی نئے عہدے قائم کیے جاتے رہے، جب کوئی معاملہ پیش آتا تو حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ انتہائی چھان بین کرتے۔ انھیں بات کا خاص خیال رہتا تھا کہ کوئی ایسا قدم نہ اٹھالیں جو بدعت کی حیثیت رکھتا ہو سے وہ حد درجہ گناہ سمجھتے تھے، لیکن جب انھیں اطمینان ہو جاتا کہ نیا قدم اٹھانا ضروری ہے۔ تو پھر اپنی ذمہ داری پورا کرنے میں خفیف سا تامّل بھی نہیں کرتے تھے۔

حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ دو سال تک بہم صلاح مشورے سے سب کام کرتے رہے، پھر حضرت ابو بکرؓ کا انتقال ہو گیا اور حضرت عمرؓ دوسرے خلیفہ کی ذمہ داریاں اٹھانے کے لیے تنہا رہ گیے۔ حضرتِ موصوف پر ایک ایرانی غلام نے خنجر سے حملہ کیا۔ اس کا احساس تھا کہ خلیفہ نے اس کے سخت گیر آقا اور خود اس کے درمیان انصاف نہیں کیا، نیز اسے ایران کی شکست و محکومی کے متعلق گہرا رنج تھا۔ حضرت عمرؓ نے ۲۳ھ (۶۴۴ء) میں انتقال سے پیشتر رسول اللہ صلعم کے بڑے صحابیوں میں چھ نام تجویز کر دیے اور فرمایا کہ ان میں سے کسی ایک کو خلیفہ منتخب کر لیا جائے۔

صحابہ نے حضرت عثمانؓ کو تیسرا خلیفہ چنا، اُن کا تعلق طاقتور اُمیّہ خاندان سے تھا، لیکن وہ خود بڑی نرم طبیعت کے سن رسیدہ آدمی تھے۔ طبیعت کی نرمی اور طاقتور گھرانے سے تعلق کی یک جائی اُن کے لیے مصائب کا سبب بن گئی۔ عام لوگ بنو امیہ کے اقتدار کو نہیں دیکھتے تھے اور حضرت عثمانؓ اتنے حلیم اور شریف تھے کہ اس اقتدار کی حفاظت نہیں کر سکتے تھے۔ اُنہی کے عہدِ حکومت میں فتنہ اُٹھا اس لیے کہ حضرت عمرؓ جس قوت اور محکمی سے سارا نظامِ حکومت چلا رہے تھے وہ باقی نہیں رہی تھی۔ حضرت

عثمانؓ کے خلاف مختلف الزام لگائے گئے، مثلاً خویش پروری تاہم یہ الزامات ایسے نہ تھے کہ مختلف چھاؤنیوں کے غیر مطمئن لوگوں کے لئے ہجوم کی صورت میں مدینہ پر چڑھ دوڑنے کے لیے وجہ جواز بن جاتے اور وہ لوگ بوڑھے خلیفہ کے گھر میں گھس کر اُسے بیدردی سے شہید کر ڈالتے۔ خلافت کے ابتدائی عہد کی حقیقی کیفیت اسی واقع سے نمایاں ہے کہ جس ملّت کی حکومت دریائے سندھ سے اٹلانٹک تک پھیلی ہوئی تھی اُس کے خلیفے کی حفاظت کے لیے کوئی محافظ دستہ مقرر نہ تھا۔

حضرت عثمانؓ نے بڑی حلیمی اور صبر و شکر کے ساتھ شہادت قبول کی، وہ اس بات پر حیران تھے کہ لوگ کیوں اُن سے خوش نہیں اور سمجھ نہیں سکتے تھے کہ کس لیے اُن کا برتاؤ دوستانہ نہیں رہا۔ ملّت کی طرف سے شکر گزاری کے برتاؤ کی امید کے لیے حضرت عثمانؓ کے پاس خاصے وجوہ تھے، مثلاً وہ ابتدائی دور میں حلقہ بگوش اسلام ہوئے۔ اُنھوں نے اپنی دولت کا بڑا حصّہ جماعت کی ضرورت کے لیے بے دریغ قربان کر دیا۔ رسول صلعم نے یکے بعد دیگرے اپنی دو صاحبزادیاں حضرت عثمان سے بیاہیں۔ اُن کے عہد میں اسلامی مملکت کے حدود نے مزید وسعت اختیار کر لی تھی۔ اُنھوں نے قرآنِ مجید کی مستند قرأت کو رواج دیا تھا، لیکن اُنھیں شہید کر دیا گیا اور اُن کے ساتھ قیادت کا نصب العین بھی دفن ہو گیا جو قوت کی پشت بانی کے بغیر حکمرانی کے لیے کوشاں تھا۔

فتنہ اس لیے پیدا ہوا کہ حضرت عمرؓ نے قیادت کا جو معیار قائم کیا تھا وہ رائے عامہ، اخلاق اور ایک خاص نظم و ترتیب پر مبنی تھا اور یہ چیزیں تیزی سے ناپید ہو رہی تھیں۔ حضرت عثمان اپنے رفیقوں سے وہ تعاون اور اطاعت حاصل نہ کر سکے، اس لیے کہ وہ ذاتی مناقشوں اور رقابتوں میں اُلجھے ہوئے تھے اور حضرت عثمانؓ کی حمایت کے لیے اکٹھے نہ ہو سکے۔ حضرت عمرؓ جانتے تھے کہ تعاون اور اطاعت حاصل کرنے کی تدبیر کیا ہے۔ حضرت عثمانؓ کو صوبوں کے غیر منظم آدمیوں سے سابقہ آپڑا تھا۔ جن میں سے بعض

قبائلی بدو تھے اور انھوں نے اسلام کو بدویوں کی ناپائیداری کا حربہ بنا لیا۔ دوسرے لوگ بنو امیہ کے خلاف تعصبات میں مبتلا تھے۔ حضرت عثمانؓ کے عزیز امیر معاویہ بھی جو شام کے گورنر تھے فوج لے کر حضرت عثمانؓ کی حفاظت کے لیئے مدینے نہ پہنچے[1]۔

کچھ مدت تک یہ نظر آرہا تھا کہ رائے عامہ خلافت کے لیے حضرت علیؓ کی مرید بن جائے گی، اس لیے کہ وہ بڑے صحابہ میں سے تھے، اسلام کے ابتدائی حلقہ بگوشوں میں سے تھے، رسول اللہ صلعم کے چچیرے بھائی اور داماد تھے۔ رسول اللہ کے نواسوں اور نواسیوں کے والد تھے اور بڑے معزز مجاہد اور درویش تھے، لیکن افسوس فتنے نے جن قوتوں کے پاؤں سے زنجیریں کھول دی تھیں ان پر قابو نہ پایا جا سکا۔ حضرت علیؓ نے اپنے پیشرو کو حملے سے بچانے کے لیے گرم جوشانہ طریقہ اختیار نہیں کیا تھا اور وہ نظم و آئین کی محافظت کے لیے کھلا میدان میں نہیں اترے تھے، اب انھیں اپنی اس روش کا خمیازہ بھگتنا پڑا[2]۔ بعض لوگوں نے خود انھیں حضرت عثمانؓ کی شہادت کا ذمہ دار ٹھہرا لیا اور مطالبہ کیا کہ وہ شہادت کے ذمہ داروں کو سزا دے کر اپنی بے تعلقی کا ثبوت فراہم کریں۔ حضرت علیؓ یہ مطالبہ پورا نہ کر سکے، اس لیے نہیں کہ وہ خود کسی وجہ سے ذمہ دار تھے، صرف اس لیے کہ اصل واقع کی ذمہ داری بہت بکھری ہوئی تھی۔ ایسے لوگ بھی تھے جن کے دل میں خانہ جنگی کی خرابیوں کا سخت رنج تھا اور وہ اس بات پر زور دے رہے تھے کہ حضرت علیؓ اور امیر معاویہ حاکم شام کے درمیان ثالثی سے معاملہ طے ہو جائے۔ حضرت علیؓ ثالثی پر راضی ہوئے تو ان کے ساتھیوں میں ایک گروہ احتجاج کرتا ہوا الگ ہو گیا۔ انھوں نے یہ خیال کیا کہ ثالثی پہ راضی ہو جانے کے باعث حضرت علیؓ نے خلافت کے غیر صحیح ہونے کا اعتراف کر لیا یہاں سے

---

[1] واقعہ یہ ہے کہ امیر معاویہؓ نے حفاظت کے لیے فوج بھیجنے کی تجویز پیش کی تھی۔ لیکن حضرت عثمان نے یہ کہہ کر روک دیا کہ میں رسول اللہؐ کے حرم پاک میں خود خونریزی کبھی گوارا نہ کروں گا۔ [2] حقیقت یہ ہے کہ فتنے کے انسداد اور خلیفہ کی حفاظت کے لیے جو کچھ ممکن تھا، اس میں حضرت علیؓ کی طرف سے کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی۔

خارجیت پیدا ہوئی۔

خارجیت کی حقیقت صرف اتنی ہے کہ وہ حقائق سے بالکل بے پروا ہو کر صرف افکار کے ساتھ وابستگی پسند کرتی ہے۔ خارجیوں کو ان کے جس اصول کی بنا پر جماعت نے اپنے میں سے خارج کر دیا، یہ تھا کہ جو لوگ کسی گناہ کے نتائج کے متعلق ہم سے اتفاق رائے نہیں رکھتے، وہ مسلمان نہیں سمجھے جا سکتے۔ لہذا انھیں فی الفور قتل کر دینا چاہیے۔ بعض خارجی اس حد تک آگے نکل گیے کہ ایسے لوگوں کے بچوں کو بھی اُن کے والدین کے ساتھ موت کے گھاٹ اتار دینا چاہیے۔ اُن کی رائے یہ تھی کہ خلیفہ ملّت کی رائے سے چنا جا سکتا ہے، اور ملّت کی رائے اُسے معزول بھی کر سکتی ہے۔ منصبِ خلافت کو کسی خاندان یا قبیلے سے وابستہ کر دینے کی کوئی وجہ نہیں۔ اگر وہ غلام بھی ہو تو خلیفہ بن سکتا ہے بشرطیکہ حکومت اچھی طرح کرے۔ ان میں سے بعض نے خلیفہ کی ضرورت ہی سے انکار کر دیا اور کہا کہ جماعت خود اپنے اوپر حکومت کر سکتی ہے، یوں خارجیت عرب قبائیلوں کے تجربے اور افکار کی متاعِ مختصر کا ردِ عمل بن گئی، لیکن اس کی قوت بہت زیادہ تھی جس کے دو زبردست اثر پڑے:۔ اوّل جماعت کے دل میں یہ خوف پیدا ہو گیا کہ کہیں اس قسم کے افکار ملک میں افراتفری نہ پھیلا دیں، لہذا لوگوں میں یہ رجحان پیدا ہو گیا کہ جو شخص بھی قوت حاصل کر لے اس کو صحیح اور جائز حکمران مان لیں، یعنی قوت کا حصول اُس کے جواز کی دلیل بن گیا۔ دوسرا اثر یہ ہوا کہ اس سے "ارجاء" کا اصول پیدا کر لیا گیا جس کا مطلب یہ تھا کہ مومنوں کے اعمال کے متعلق فیصلہ ملتوی کر دینا چاہیے[1]۔ گویا سہل انداز کی وسعتِ مشرب کے سامنے سر جھکا دیا گیا۔ حضرت علیؓ نے خوارج کو قوت سے پامال کر ڈالنے کی کوشش کی اور ایک لڑائی میں ہزاروں کو موت کے گھاٹ اتار دیا، لیکن

---

[1] ارجا اُس عقیدے کو کہتے ہیں جس میں کلمہ شہادت کو مقدم رکھا جاتا ہے اور عمل کو پیچھے ڈال دیا جاتا ہے اس عقیدے کے لوگوں کو مرجیہ کہتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ معصیت انسان کو ضرر نہیں پہنچاتی۔

سنہ ۴۰ھ / سنہ ۶۶۱ء میں وہ خود ایک خارجی کے ہاتھ سے شہید ہوئے۔

یہ امر ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ حضرت علیؓ کی وفات کے بعد شیعیت کے نشو و ارتقا کا آغاز ہوا۔ ہم نے دانستہ "وفات کے بعد" کا جملہ استعمال کیا، اس لیے کہ شیعیت محض حضرت علیؓ کو خلیفہ بنانے تک محدود نہیں محض اس دعوے تک محدود نہیں کہ صرف خاندانِ نبوت کے افراد کو مسندِ خلافت پر بیٹھنا چاہیے، بلکہ شیعیت خلافت کے متعلق حضرت علیؓ کے حق کا ایک ایسا نظریہ پیش کرتی ہے جس سے ابتدائی دور کے لوگ بالکل ناآشنا تھے اور حضرت علیؓ کی ذات کے ساتھ بے قید زماں ایک ایسی تصدیق لگاتی ہے جو ان کے ہم عہد آدمیوں کو بالکل معلوم نہ تھی نیز شیعیت نے خلافت کے وظیفے کا ایک تصور شائع کیا جسے بعد میں ترتیب دیا گیا تھا۔ یہ تصور تاریخی واقعات کی ترتیب نو اور ذاتی الہیوں پر مبنی ہے لہذا اسے ان وقائع سے متاخر ہی ماننا پڑے گا۔ یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ اسلامی سلطنتوں کے تخت پر حضرت علیؓ کے اخلاف متمکن ہوتے رہے ہیں۔ جیسا کہ آج کل عراق[1] اور مراکش میں ہیں اور وہ لوگ شیعی اصول کے پیرو نہیں۔

حضرت علیؓ کی وفات کے بعد منصبِ خلافت خالی ہوا تو امیر معاویہؓ آگے بڑھ آئے وہ حاکم شام کی حیثیت سے خاصے اقتدار کے مالک تھے، ملت نے انھیں خلیفہ تسلیم کر لیا اگرچہ بعض اس تسلیم کو اچھا نہیں سمجھتے تھے۔ امیر معاویہ بڑے باتدبیر آزاد خیال، متحمل و بردبار اور دور اندیش آدمی تھے۔ وہ مکی امرا کے بہترین طبقے کی نمائندگی کر رہے تھے۔ انھوں نے اسلامی معاشرے کی بیماریوں کا علاج شروع کر دیا لیکن یہ علاج سیاسی تدبیروں سے کیا گیا، جن میں انسان کو زیادہ سے زیادہ پست مانا جاتا ہے۔ امیر موصوف نے اس سلسلے میں نہ ترہیب سے دریغ کیا اور نہ ترغیب سے۔ انھیں صاف نظر آ گیا کہ اگر

---

[1] یہ مقالہ اس وقت لکھا گیا تھا جب عراق میں شریفی خاندان کی حکومت قائم تھی اور یہ لوگ سادات کے گھرانے سے تھے اور سنی مسلمان تھے لیکن جولائی ۱۹۵۸ء میں یہ حکومت ختم ہو گئی۔

خلافت کے لیے جانشینوں کے انتخاب کے سلسلے میں خانہ جنگی سے پہلو بچانا ضروری ہے تو متبادل راستہ یہ ہے کہ خاندانی حکومت قائم کر دی جائے۔ امیر معاویہؓ سے بنو امیہ کی حکمرانی کا دور شروع ہوا اور وہ دمشق کو مرکز بنا کر قریباً ایک سو سال تک برسر اقتدار رہے (۴۱ھ ۔ ۱۳۲ھ ۔ ۶۶۱ء ۔ ۷۵۰ء تک)۔

بنو امیہ کے متعلق کہا گیا ہے کہ وہ اُن قدیم عرب حکمرانوں کا ایک طائفہ تھے جو حجر اور تدمر جیسے ترنمونہ پر مدت تک حکومت کرتے رہے اور جنھوں نے اسلام سے پیشتر کے دور میں عربی روایات پر یونانی بیزنطینی یا ایرانی ملمع چڑھا لیا تھا، سطحی نظر سے دیکھا جائے تو ایسا ہی معلوم ہوتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ بنو امیہ میں عربیت اور اسلامیت خاصی تھی، البتہ وہ اپنے عیسائیوں یا مفتوحہ علاقوں کے لوگوں کی جن باتوں کو اسلامی معاشرے کے لیئے ضروری سمجھتے تھے انھیں یقیناً اختیار کرتے رہے۔ حکومت کا ڈھانچا مفتوحہ علاقوں کے لوگوں ہی کی مدد سے تیار کیا گیا اور جب موزوں وقت آیا تو اُسے عربیت کے سانچے میں ڈھال لیا گیا، سکّہ بھی جاری کیا، علمی کاموں کی بنیاد بھی رکھی فنون اور تعمیر کو بھی عربی مذاق اور اسلامی ضروریات کے مطابق بنا کر اختیار کر لیا گیا، ہسپانیہ بھی اسی عہد میں اسلامی مملکت کا حصّہ بنا۔

اسلامی معاشرے کا بلوغ

دوسری صدی ہجری ۔ پانچویں صدی ہجری (۷۵۰ء ۔ ۱۰۵۵ء)

اس حصّے کا آغاز عباسی خاندان کے حصولِ خلافت سے ہوتا ہے، یہ لوگ

PETRA عرب کا وہ علاقہ جو خلیج عقبہ کے شمالی گوشے سے شروع ہو کر اوپر کی طرف جاتا ہے، عرب اسے وادی القریٰ اور وادی المغربہ بھی کہتے تھے PALMYRA شام کے صحرائی علاقے کا مشہور مقام جو ایک زمانے میں سلطنت کا مرکز تھا، مشہور ملکہ زنوبیہ تدمر ہی کی حکمران تھی۔

رسول اللہ صلعم کے چچا کی اولاد تھے اور اس کا خاتمہ اُس وقت ہوا جب سلجوقی ترک سلطان طغرل نے دار الخلافۃ البغداد کے معاملات خود سنبھال لیے۔ یہی دور ہے جس میں رسول اللہ صلعم کی قائم کردہ جمعیت جسے عرب قبائلیوں کی شروع کی ہوئی جنگوں سے توسیع ملی، ایک اسلامی معاشرہ بن گئی۔ اس کا ایک مستقل عقیدہ تھا۔ ایک نظامِ قانون تھا جو عقائد و مقاصد کے سرچشموں پر مبنی تھا۔ ایک حکمران ادارہ تھا اور ایک برادری تھی جو نسل اور دنیوی درجے کے اتفاقات سے بہت بالا تھی، ان تین صدیوں میں اسلامی معاشرہ ہر لحاظ سے بلوغ کی منزل پر نہ پہنچا، اس لئے کہ بعض مسائل کا فیصلہ نہ ہو سکا، لیکن بعد کے زمانہ کے لیے جو نمونہ باقی رہا، اُس کا زیادہ تر حصّہ اسلام کے اِسی سحر انگیز دور میں تیار ہوا تھا۔

اسلام کے ابتدائی دور کا سب سے اہم واقعہ بلا شبہ سنّت کی ترتیب ہے۔ یہ محض اصول نہیں بلکہ ایک طریقے، ایک نقطۂ نگاہ اور ایک مزاج کا مظہر ہے۔ اسی طریقے کے مطابق ہر مسلمان کو قانون، عقائد، اخلاق اور عبادات کا فیصلہ کرنا چاہیے۔ سنّت کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ یہ زیادہ سے زیادہ عام اور ہمہ گیر ہو۔ اِس نے ان نسلوں سے ہمہ گیری حاصل کی جو حجاز یا اسلامی دنیا کے نئے شہروں، شام، عراق اور مصر کے پرانے شہروں نیز دوسرے مقامات پر رہتی تھیں، سنت نے ان تمام مقامات پر جماعت کی رضامندی سے نشو و نما پائی۔ یہ باہر سے جبراً عائد نہیں کی گئی تھی اور نہ اس میں کسی ارضی اختیار کی آمیزش ہوئی تھی۔ سنّت وہ سب سے بڑی قوت تھی جس نے ایشیا، افریقہ اور یورپ کی اسلامی جمعیتوں کو روحانی اتحاد کے رشتے میں منسلک رکھا، حالانکہ ان کے درمیان مشترک جغرافیائی ماحول یا مشترک نسلی میراث کا کوئی رشتہ موجود نہ تھا۔ یہ سب مشترک اجتماعی اوضاع اور ادارات کے ذریعے سے متحد ہوئے۔

سنّت کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ وحی یا رسالت کو ردّ و بدل سے محفوظ رکھنے کا بندوبست ہو گیا اور جماعتی روایات، اداراتی اوضاع، صحیح دینیات اور قانونِ الٰہی کا اقتدار

قائم ہو گیا۔ تیسری خصوصیت یہ ہے کہ سنّت کے متعلق تمام روایات اُن لوگوں نے زبانی دوسروں تک پہنچائیں جنھوں نے بہ طیبِ خاطر اپنی زندگیاں مذہبی تعلیم حاصل کرنے اور تعلیم دینے کے لیے وقف کر دی تھیں۔

سنت کے یہ بڑے خصائص مجملاً پیش کئے گئے ہیں تا کہ برابر مدنظر رہیں، بنو امیہ کا دورِ حکومت ختم ہونے تک سنّت اتنی قوت پکڑ چکی تھی کہ وہ خارجیت اور اسلام سے پیش تر دوسرے فرقوں کی ملحدانہ سرگرمیوں کے خلاف کھڑی ہو گئی اور اُس نے حکمرانوں کی راہ نمائی کے لیے قانونی اصول پیش کر دیے۔ اگرچہ پیروانِ سنّت کے پیشِ نظر حکمران خاندان یا سیاسی تبدیلی کا کوئی پروگرام نہ تھا تاہم وہ اُن گروہوں کی برابر حمایت کرتے رہے جو بنو امیہ کی حکومت ختم کرنے کے لیے سرگرم تھے۔

بنو امیہ یقیناً ملت کی طرف سے ستائش کے مستحق تھے۔ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد خانہ جنگی شروع ہو گئی، پھر حضرت علیؓ کو شہید کر دیا گیا۔ ان حالات میں اس کے سوا کوئی سی قابلِ عمل صورت تھی کہ امیر معاویہؓ خود خلافت کو سنبھال لیتے اور موروثی جانشینی کا اصول قائم کر دیتے۔ حکمرانوں کے جس خاندان کی بنیاد امیر موصوف نے رکھی وہ امرائے مکّہ کی روایات پر برابر کاربند رہا اور اُس نے تعمیری تدبّر کے بھی بعض ممتاز کارنامے انجام دیئے، لیکن بنو امیہ کے موقف میں ایک مہلک خامی تھی جو ان کے زوال کا باعث بنی وہ پہلی صدی ہجری کے قبائلی تنازعات میں بری طرح الجھے رہے اور اپنی حکمرانی کے لیے اس سے بہتر کوئی وجہ جواز پیش نہ کر سکے کہ بانی خاندان نے خلافت کی مسند خالی دیکھی اور آگے بڑھ کر اس پر قبضہ کر لیا۔ نیز وہ عرب مسلمانوں اور غیر عرب مسلمانوں کے کشیدہ تعلّقات کا کوئی اطمینان بخش فیصلہ نہ کر سکے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اُن پر مختلف سمتوں سے حملے شروع ہو گئے اور خود اُنھیں بے پناہ جبر اور زبردست قوت و طاقت کے استعمال سے بہتر کوئی ذریعہ اپنے دفاع کے لئے نظر نہ آیا۔

بنوامیہ کا زوال ایک کامیاب سازش کا نتیجہ تھا جس میں سب سے بڑھ کر حصہ ایک ایرانی امیر ابومسلم خراسانی نے لیا۔ اُس کے مقاصد و محرکات پر ابھی تک پردا پڑا ہوا ہے، ابومسلم نے ایک جنگی قوت منظم کی جس میں خراسان کے عرب آباد کار اور ایران کے نومسلم زمیندار شامل تھے۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابومسلم خاندانِ نبوت میں سے کسی کو خلیفہ بنانا چاہتا تھا، لیکن کسی کا نام اس لیے تجویز نہ کیا کہ حضرت علیؓ کے تمام اخلاف کی تائید حاصل رہے، خفیہ خفیہ وہ رسول اللہ صلعم کے چچا حضرت عباس کے خاندان کے ایک فرد کو خلیفہ بنانا چاہتا تھا ابومسلم کی بغاوت کامیاب ہوئی۔ امیہ خاندان کے آخری خلیفہ نے شکست کھائی، اُس کا تعاقب ہوا اور اسے قتل کر دیا گیا۔ ابوعلی عباس السفاح نے منصب خلافت سنبھال لیا اور ایک نئے خاندانِ حکومت کی بنیاد پڑی جو پانسو سال تک خلافت پر قابض رہا۔

نئے حکمران ہر شے سے پہلے معمارانِ سلطنت تھے، اُن کے اخلاص پر حملہ کیے بغیر ہمیں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ مذہب کی حیثیت ان کے نزدیک ایک عمدہ طریق پر منظم و مرتب معاشرے میں ایک عنصر کی تھی۔ اُنھیں معاشرے میں اسلامیت کی اہم ضرورت کا اندازہ ہو گیا اور اسے تقویت پہنچانے میں انھوں نے کوئی دقیقہ سعی میں اٹھا نہ رکھا۔ انھوں نے مذہبی رہنماؤں، فقیہوں اور عالموں کی سرپرستی کی، ملحدین کو سزائیں دینے میں تامل نہ کیا اور وقتاً فوقتاً وہ مشرقی رومی سلطنت کے سرحدی علاقوں میں فوجی مہیں بھی بھیجتے رہے۔ انھوں نے عرب مسلمانوں اور غیر عرب مسلمانوں کا امتیاز مٹا دیا۔ اور فوجوں کے قبائلی ڈھانچے کو توڑ کر رکھ دیا۔ ایک عباسی خلیفہ المامون نے معتزلہ کے لئے حکومت کی حمایت بھی مہیا کرنی چاہی، لیکن وہ ناکام رہا۔ ایران کے ایک نومسلم نے جو بڑا فاضل تھا اور جس کا نام ابن مقنع تھا خلیفہ المنصور بانی شہر بغداد کو یہ مشورہ دیا کہ اسلامی قانون مرتب کر کے نافذ کر دے، لیکن فقیہوں اور عالموں نے جو ملت کے احساسات سے بخوبی واقف تھے اس کی مخالفت کی اور حکمرانوں کو عقائد و ایمانیات پر قابو پا لینے کا موقع نہ دیا۔ ایک اور نقطۂ نگاہ سے دیکھا

جائے تو عباسیوں کی پالیسی روحِ اسلام کے براہِ راست خلاف رہی۔ انھوں نے مطلق العنان حکومت کا ایک ایسا ڈھانچا تیار کیا جو قدیم ایرانی شہنشاہی کے نمونے پر مبنی تھا اور اس میں دفتری اقتدار کے تمام سروسامان بھی قائم رکھے۔ پھر اس میں وہی درباداری تھی، وہی آداب ورسوم، وہی تملق وخوشامد تھی۔ خلیفہ بھی اسی طرح عوام سے الگ تھلگ رہتا تھا جس طرح ایرانی بادشاہ عوام سے الگ تھلگ رہتے تھے، ساتھ ہی مسلمانوں کی جان، مال اور آبرو کے حقوق سے بے پروائی اختیار کرلی گئی۔

عباسیوں نے جو مطلق العنان حکومت قائم کی تھی وہ اسلام کی نشو وارتقا کے لیے نہایت اہم نتائج کی موجب بن گئی۔ خدا پرست مسلمانوں کی نظروں میں دینوی معاملات اس درجہ خراب ہوگیے کہ انھیں یا تو سراسر ہدفِ مذمت بنایا جاتا یا ان سے بالکل تغافل برتا جاتا اور جتنی تخلیقی، روحانی یا ذہنی تحریکات پیدا ہوئیں وہ سب عالمِ عقبیٰ سے متعلق ہوگئیں۔ گویا ان میں حقیقت کا کوئی پہلو باقی نہ رہا یا وہ ملت کے خلاف کھلی ہوئی بغاوت کی شکل اختیار کرگئیں اور اصلاح کی بجاے ان سے نقصان ہی پہنچا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ حکمرانوں کی سرپرستی میں علوم وفنون کو خوب فروغ حاصل ہوا لیکن اس سے معاملے کے اس پہلو پر کوئی اثر نہیں پڑتا کہ ملت کی حقیقی تخلیقی قوتیں یا تو معاشرے سے بالکل بے تعلق تھیں یا معاشرے کے سراسر خلاف تھیں،

سنت کی روح یہ ہے کہ قرآن مجید کے احکام کو رسول اللہ صلعم کے ارشادات کی روشنی میں دیکھا جاے اور ان کی پابندی کی جاے۔ اس سلسلے میں دو علم پیدا ہوے ایک علم تفسیر یعنی قران مجید کی توضیح وتشریح اور دوسرا علم حدیث۔ تفسیری دبستان کی درجہ بندی مختلف طریقوں پر کی گئی ہے، مفید ترین طریقوں میں سے ایک وہ ہے جسے گولڈزیہر[1] نے اختیار کیا یعنی:

---

[1] (Goldziher

۱۔ وہ تفسیریں جو رسول اللہ صلعم اور صحابہ کرام کے ارشادات پر مبنی ہوں اور وہ نسلاً بعد نسل" روایت ہوتی رہیں۔ الطبری (۲۲۴ھ - ۳۱۱ھ، ۸۳۸ء - ۹۲۳ء) کی عظیم القدر تفسیر اسی قسم سے تعلق رکھتی ہے۔

۲۔ وہ تفسیریں جو عقل و دلیل سے دلچسپی رکھنے والے آدمیوں نے تیار کیں، جیسے زمخشری (۴۶۷ھ - ۵۳۸ھ، ۱۰۷۴ء - ۱۱۴۴ء) کی تفسیر۔

۳۔ صوفیوں کی تفسیریں ان کا دائرہ بڑا وسیع ہے، ایک طرف قرآن مجید کے متعلق ابن عربی کے افکار پیش کیے گئے ہیں، دوسری طرف امام غزالی کے۔

۴۔ مختلف فرقوں کی تفسیریں یعنی وہ جو دوازدہ امامی شیعوں یا ہفت امامی اسماعیلیوں نے لکھی ہوں۔

۵۔ دورِ حاضر کی تفسیریں مثلاً وہ تفسیر جو بیسویں صدی کے دو مشہور عالموں شیخ محمد عبدہ اور سید محمد رشید رضا نے مرتب کی[1]۔

کتاب و سنت کے متعلق ان مختلف دبستانوں میں سے کسی ایک کا انتخاب تین بنیادی امور پر مبنی ہو سکتا ہے:

۱۔ تاریخی روایات کو کس حد تک قبول کیا جا سکتا ہے!

۲۔ قرآنِ مجید کے مخفی معنی کا دعوے کس حد تک وزن دار سمجھا جا سکتا ہے!

۳۔ تعبیر میں ذاتی رائے کو کس حد تک اجازت دی جا سکتی ہے!

جس حد تک حدیث کا تعلق ہے یہ سمجھ لینا چاہیے کہ بعض ایسے لوگ بھی جن کا تقویٰ ہر شبہ سے پاک تھا، وہ باتیں رسول اللہ صلعم سے منسوب کرتے وقت قطعاً متامل

---

[1] اس تفسیر کے سلسلے میں یہ حقیقت واضح کر دینی چاہیے کہ شیخ محمد عبدہ نے قرآن مجید کا درس دیا تھا، سید رشید رضا نے درس کے تمام نکات مرتب کر کے ان میں تمام ضروری تفسیرات شامل کر دیں، اس تفسیر کی صرف بارہ جلدیں شائع ہوئیں یعنی بارھویں پارہ کے آخر تک سید رشید رضا کا انتقال ہو گیا اور اس کے بعد تفسیر کی اشاعت بھی رک گئی۔

نہ ہوئے جو انھوں نے خود بنائی تھیں اور جن سے اُن کے فرقہ دار مقاصد کو فائدہ پہنچتا تھا اس معاملے میں بے احتیاطی یہاں تک پہنچی کہ صحیح ارشادات کے متعلق بھی شبہات پیدا ہو گئے۔ جب حالت یہ تھی تو اس طرزِ عمل کی وسعت کے بارے میں کیا کہا جا سکتا ہے باایں ہمہ ملت اس ارادے پر پختگی سے جمی رہی کہ وہ ایمان و عمل میں حدیث ہی کو بنیاد بنائے گی، لہٰذا علمائے اکرام نے انتہائی کوشش کی کہ احادیث کے سلسلے میں نقد و نظر کے اصول قائم ہو جائیں جن کی بنا پر ہر حدیث کی صحت کا درجہ متعیّن کیا جا سکے۔ صحیح احادیث کے دو مجموعوں نے شہرت و قبول کا اعلیٰ مقام حاصل کیا اوّل صحیح بخاری (۱۹۵ھ ۔ ۲۵۶ھ ۸۱۰ء ۔ ۸۷۰ء) دوم صحیح مسلم (۲۰۶ھ ۔ ۲۶۲ھ ، ۸۲۱ء ۔ ۸۷۵ء)

تفسیر و حدیث کی بنا پر دینیات اور فقہ کا نشو و ارتقا ہوا، لیکن ان پر گفت گو سے پیشتر اُن آلی اور امدادی علوم کے متعلق چند الفاظ کہہ دینے چاہئیں جو تفسیر و حدیث کے لئے ضروری تھے۔ اس میں خاص اہمیت لسانی اور تاریخی علوم کو حاصل ہے، قرآن و حدیث کی زبان عربی ہے، جو نو مسلموں کی ابتدائی نسل کی مادری زبان نہ تھی چنانچہ عربی کے تحفظ اور تعلیم کے لیے صرف نحو، اور لغت کی ضرورت محسوس ہوئی، لغت کے سلسلے میں لازم تھا کہ دورِ جاہلیت کے افسانوی اور شعری ادب کا وہ پورا ذخیرہ مہیا کر لیا جائے، جس تک رسائی ممکن تھی۔ یہ تمام چیزیں ہر پڑھے لکھے مسلمان کا ثقافتی اندوختہ بن گئیں، خواہ وہ عرب تھا یا غیر عرب۔ یہ کہنا صحیح نہیں کہ عرب کا ماضی تمام مسلمانوں کا ماضی بن گیا مثلاً یہ کہ اسلام نے مصری مسلمانوں کے فرعونی ماضی کو محو کر ڈالا حقیقت یہ ہے کہ مصر کے باشندے مسلمان بننے سے پیشتر عیسائی تھے اور فرعون کی مذمت قرآن مجید کے صفحات پر آنے سے پہلے مسیحی دستاویزوں میں کی جا چکی تھی۔ جو ذخیرہ علوم تعلیم یافتہ مسلمان کے سامنے آیا وہ بلا شبہ عربی لباس میں آیا، لیکن یہ مختلف سرچشموں سے اخذ کی ہوئی عقلی باتوں کا مجموعہ تھا۔ اس میں سلاطین و انبیاء کی تاریخی داستانیں بھی تھیں،

ہر ملک کے عجائبات بھی تھے اور اسلام سے پیشتر کے عربی افسانے بھی تھے۔ غیر تعلیم یافتہ مسلمان کے لیے شعبی ادب بہت سے عناصر سے مرکب تھا اور اُس میں اسلام سے پیشتر کا عربی عنصر سب سے کم تھا۔

لسانی آلات کی ساخت سے بھی زیادہ قابلِ توجہ عربی نثر کے اُس اسلوب کی تخلیق تھی جو بلوغ کی منزل پر پہنچنے والے اسلامی معاشرے کی ضرورت پوری کر سکتا یہ اسلوب عرب اور غیر عرب مسلمانوں دونوں، نے درجۂ کمال پر پہنچایا۔ چنانچہ یہ دینیات، فلسفہ، معرفت، فقہی اصول اور علمی تشریحات کے لیے یکساں مفید ثابت ہوا۔

قانون کے دائرے میں بھی ہمیں اسلامیات کا جذبہ صاف نظر آرہا ہے۔ ہم ابتدا کی طرف لوٹیں تو معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید نے مذہب، عبادات، عسکریت، سیاست، خاندان اور دوسرے عملی معاملات کے متعلق مختلف نسخے تجویز کیے ہیں۔ رسول اللہ صلعم اپنی حیاتِ طیبہ میں قرآن مجید کا مطلب اپنے ارشادات و اعمال سے واضح فرماتے رہے جب آپ اس دنیا سے تشریف لے گئے تو آپ کے جانشینوں نے نہایت بلند پایہ صحابیوں کی رضامندی سے ملّت کو اُس طریق پر چلایا جسے وہ صراطِ مستقیم سمجھتے تھے اور وہ رسول اللہ صلعم کے ارشادات پر لفظاً اور معناً پوری طرح کاربند رہے، ساتھ ہی ایک رواجی قانون کا مجموعہ تیار ہو گیا جو مختلف قوموں کے اُن مروّجات پر مبنی تھا جو اسلامی معاشرے میں آنے سے پیشتر اُنھوں نے اختیار کر رکھے تھے۔ حکامِ خلافت اسی کے مطابق نظم و نسق کا کام چلاتے رہے۔

وقت گزرتا گیا، حجاز، عراق، شام اور مصر میں جو علماء مقیم تھے۔ اُنھیں مذہبی جذبے نے اس امر پر آمادہ کیا کہ اسلامی معاشرے میں قانون کی جو مثالی صورت ہونی چاہیے وہ مرتّب کر دیں۔ نظامِ فقہ کے جن چار بانیوں نے قانون کے چار نظام مرتّب کیے، وہ یہ تھے:-

۱۔عراق میں امام ابوحنیفہؒ سنہ ھ۔ سنہ ۱۵۰ھ (۶۹۹ء - ۷۶۷ء)

۲۔حجاز میں امام مالکؒ وفات ۱۷۹ھ (۷۹۵ء)

۳۔مصر میں امام شافعیؒ وفات ۲۰۵ھ (۸۲۰ء)

۴۔عراق میں امام احمدؒ بن حنبل وفات ۲۴۱ھ (۸۵۵ء)

یہ چاروں نظام اب تک باقی ہیں جن خاص اصول پر ان بزرگانِ کرام نے کام کیا اُن کی توضیح کی گنجائش پیشِ نظر مقالے میں نہیں، صرف اتنا بتا دینا کافی ہے کہ ان حضرات نے شریعت کا جو نظام پیش کیا پھر اس پر نسلاً بعد نسلاً جو شرحیں لکھی جاتی رہیں ان میں وہ سب کچھ آگیا جو اللہ تعالیٰ نے انسانی چلن کے لیے تجویز کیا یعنی خانگی زندگی، سیاسی اور اجتماعی سرگرمیاں، مذہبی فرائض و عبادات، البتہ اس نظام کا تعلق خدا اور ہم جنسوں کے ساتھ بیرونی تعلقات سے ہے، ضمیر کے معاملات پر بحث نہیں کی گئی۔

اسلامی معاشرے کی سرگزشت میں مقام شریعت کا تعین آسان نہیں۔ اگر ہم وہ صورت پیشِ نظر رکھیں جس میں یہ ہم تک پہنچی، فقہا کے استعمال کردہ ذرائع، قانون مفاد اور اس کے اطلاق کے محدود دائرے سے قدم آگے نہ بڑھائیں تو اس کا وظیفہ بہت محدود رہ جاتا ہے، لیکن اگر یہ حقیقت سامنے رکھی جائے کہ یہ مشترکہ نصب العین جہاں ملتِ اسلامیہ کو پہنچنا چاہیے یا یہ ایک معیار ہے جس پر حکومت کی پالیسی اور اعمال کو پرکھا جائے گا، تو اس کا وظیفہ بہت وسیع ہو جاتا ہے، لیکن اسے اُس طریقے پر استعمال کرنا کافی نہیں، جس طرح آج کل استعمال کیا جاتا ہے، یعنی مسلمانوں کو جمع کرنے کے لیے نعرۂ جنگ کے طور پر استعمال کرنا حالانکہ جنگوں کو مذہب سے کچھ زیادہ تعلق نہیں یا کسی اونچی جگہ رکھ کر محض مدح و ستائش کرتے رہنا یا پورے نظام شریعت میں سے سوچے سمجھے بغیر صرف وہ چیزیں اُٹھا لینا جو کسی کو زیادہ پسندیدہ نظر آئیں۔ مطلوب

یہ ہے کہ شریعت کو قانون سازی کی اُن بڑی عالم گیر لہروں سے متعلق رکھا جائے جو ہمارے عہد میں ابھری ہوئی نظر آتی ہیں۔ یقیناً یہ حد درجہ مشکل کام ہے۔ غالباً مشکل کی زیادتی ہی نے جمہوریہ ترکیہ کو اس امر پر آمادہ کر دیا کہ شریعت کو اپنے معاشرے کے دائرے سے باہر رکھے۔

اُن امور کو سرسری طور پر زیرِ غور لانے سے پیشتر جنھیں ملّت نے روحانی اور ذہنی مطالبے کی بنا پر اختیار کیا ——— یعنی معتزلہ، شیعہ اور صوفیہ نے اختیار کیا ——— ہمیں تھوڑی دیر کے لیے رُک کر وہ پس منظر تازہ کر لینا چاہیے، جس میں یہ چیزیں پیش آئیں۔ سب سے پہلے یہ حقیقت یاد رکھ لینی چاہیئے کہ اسلامی معاشرے میں دو جداگانہ دنیائیں پہلی دفعہ یک جا ہوئیں، اول روما، یونان، اسرائیل اور مشرقِ قریب کی قدیم دنیا جو بحیرۂ روم کے کناروں پر بکھری ہوئی تھی، دوم ایران کی جداگانہ تہذیب جس کی زندگی اور افکار کا نمونہ بالکل مختلف تھا اور جو مشرقِ بعید کی بڑی تہذیبوں سے مستقل تعلقات پیدا کر چکی تھی۔

پھر یہ حقیقت بھی فراموش نہ کرنی چاہیے کہ اسلامی معاشرے میں مسیحیوں، یہودیوں، زرتشتوں اور دوسرے غیر مسلموں کے لیے، کلیسا، خانقاہیں، ہیکل اور مندر موجود تھے اور یہ تمام طبقے برائے نام جماعتوں یا اچھوتوں کی حیثیت میں نہیں، بلکہ زندہ مردوں اور عورتوں کی جماعتوں کی حیثیت میں موجود تھے، سب اپنے پیشے میں لگے رہتے تھے۔ اپنے مذہب کا صاف صاف اعلان کرتے تھے، اُس کے دفاع میں مناظرے کرتے تھے۔ اُنھوں نے اپنی مذہبی فلسفیانہ اور علمی وراثتوں کو ترقی دی اور اس تمام مدت میں مسلمان ہمسائیوں سے اُن کا ربط ضبط قائم تھا۔ اُن کی تاریخ کے اسلامی دور کا ایک پہلو خاص طور پر قابلِ ذکر ہے اور وہ یہ کہ اُنھوں نے روزمرّہ کی زندگی کے لیے، نیز مذہب، عبادات، تاریخ اور دوسرے مقاصد کے لیے عربی زبان اختیار

کرلی تھی۔

ایک تیسرا نکتہ بھی خاص طور پر یاد رکھنا چاہیے اور وہ یہ کہ جن لوگوں نے اسلام قبول کیا، اُن کے اخلاص کو معرضِ شبہ میں لانے کے لیے کوئی قابلِ اعتماد شہادت مل نہیں سکتی، یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ صوفیہ یا فلسفیوں یا بانیانِ فرقہ ہائے مختلفہ نے دانستہ اسلام کو خراب یا برباد کرنے کی کوشش کی۔ اس کی ایک نہایت اچھی مثال اسماعیلیہ کی مروجہ صورت ہے یعنی یہ کہنا کہ یہ ایک سازش تھی جو ایک فرد کی شیطانی عیّاری کا نتیجہ تھی۔ اس کے بجائے یہ سمجھ لینا زیادہ قرینِ قیاس ہے کہ مسلمانوں کے گروہوں میں انھیں پُر اسرار چیزوں نے بے چینی پیدا کی؛ اُنھیں تقاضوں نے انھیں حرکت دی، انھیں سوالات و شکوک نے انھیں پریشان کیا، بیشتر ان کے آباواجداد کے سامنے آچکے اور وہ گروہ اسی سکون واطمینان کے طلب گار تھے جن کے طلب گاران کے آباواجداد تھے۔ اسلام سے اُن کی مخلصانہ دل بستگی کا یہ بیّن ثبوت ہے کہ وہ اسلام کے دائرے ہی میں رہ کر اپنے مسائل کا حل تلاش کرتے رہے۔ یہ بھی واضح کر دینا چاہیے کہ جن خطوں میں اسلام پھیلا، وہاں زندگی کا پہلا دور ختم گیا، نئی اسلامی ثقافت کے دور کا آغاز یہ سراپا تبدیلیوں کا پیغام تھا۔ نئے روابط پیدا ہوے۔ جو بنیادی افکار قبول کئے گئے وہ بالکل نئے تھے۔ جو قومیں ادوار وروایات کے بوجھ میں دب کر پست ہو چکی تھیں اُن کو نئی زندگی ملی اور اُن کی قوتوں میں تازگی آگئی۔

جو یونانی سرو سامان مسلمانوں کے حوالے کیا گیا، وہ پہلے فلسفے اور سائنس کے لیے نیز بہت سی عملی چیزوں کے لیے استعمال ہو چکا تھا لیکن جیسا کہ ڈنکن بی میکڈانلڈ[1] نے بڑے ہی اچھے انداز میں بتایا ہے، یہ بڑا الجھا ہوا نظام تھا۔ یہ تراجم اور ناقص نقشوں کا مخلوط مجموعہ تھا، فارابی (وفات ۳۳۹ھ ـ ۹۵۰ء) اور ابن سینا وفات ۴۲۹

[1] Duncan B Macdonald

رشد۱۰۳۷ء) جیسے اہلِ مغرب اوسنا کہتے ہیں) جیسے عظیم الشان افراد ان علوم کے مطالعے میں ہمہ تن لگ گیے۔ اُن کے بعد نسلوں کی نسلیں محنت و مشقت کرتی رہیں جب جاکر یہ علوم مرتّب ہوئے۔ ان میں سے لغویت اور جھوٹ رد کردیا گیا۔ یہ امر حد درجہ افسوس ناک ہے کہ کلاسکی میراث تو مل گئی لیکن ان کے متون اور تاریخی حیثیت پر نقد و تبصرہ بالکل شروع نہ ہوا۔ یہی یونانی میراث تھی، جس سے متصوفانہ نقطۂ نگاہ پیدا ہوا اور اس نقطۂ نگاہ نے اسلامی نظامِ عقائد کی توضیح میں خاصا حصّہ لیا۔

بہ گوناں گوں ذہنی، مذہبی اور نسلی روایات کے پس منظر میں ملّت اسلامیہ نے اپنی روحانی اور ذہنی طلب ظاہر کرنے کے لیے متعدد واضح طریقے پیدا کیے۔ خالص سنّت کے پیرو "سُنّی" کے لقب سے مشہور ہوئے سنت کی مختصر توضیح اوپر کی جاچکی ہے۔ اسلامی حاکم کے بلوغ کی تقریر مکمل کرنے کے لیے ان تین پشتوں کا بھی ذکر کردینا چاہیے جو ملّتِ اسلامیہ کے تار و پود میں شامل ہوئے۔ اوّل معتزلی جو عقل و دانش پر زور دیتے تھے، دوم صوفیہ سوم شیعہ جنھوں نے حضرت علیؓ اور ان کے اخلاف کو اپنا روحانی رہنما تسلیم کیا۔

خارجیوں نے جو مسائل پیدا کیے تھے ـــــ جو بدوی عربی معاشرے پر اسلام کے اثر کا نتیجہ تھے ـــــ نیز جو غیر عرب قومیں اسلام کے زیرِ علَم جمع ہو گئی تھیں، اُن کے پیچ حالات کے پیشِ نظر اسلامی نظامِ عقائد کو ابتدا ہی میں زیادہ سے زیادہ واضح کرنے کی کوشش کی گئی۔ اس سلسلے میں جن لوگوں نے خلوص کے ساتھ وقت کی مشکلات سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کی اُنھیں معتزلہ کہا گیا۔ انھوں نے کوئی مرتب نظامِ اصول پیش نہ کیا۔ بلکہ جو کچھ ان سے منقول ہے، وہ مختلف تعبیرات کا مجموعہ ہے۔ ان کا بنیادی اصول یہ تھا کہ خدا عادل ہے وہ کہتے تھے کہ خدا سے جو صفات منسوب کی جاتی ہیں خطرہ ہے کہ اُن پر زیادہ زور دیتے دیتے خدا کو جداگانہ وجود کی حیثیت دے لی جائے گی۔ جیسے کہ عقیدۂ تثلیث کی سرگزشت یہی ہے۔ معتزلہ کی تعلیم تھی کہ قرآن مجید مخلوق

ہے اور وہ انسان کو مجبور نہیں مختار مانتے تھے۔

معتزلہ قرآن کے متعلق جو تعلیم دیتے تھے وہ ان کے نظام کی بنیاد ہے۔ اگر اسے مان لیا جاتا تو اس قسم کے نہایت نازک اور خطرناک نتیجے اخذ کیے جا سکتے تھے۔ جو کتاب ازل سے چلی آ رہی ہے وہ کلام الٰہی ہے اور اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی لیکن جس کتاب کو مخلوق مانا جائے اس کا ایک پہلو الٰہی حیثیت کا مالک ہوگا اور دوسرا پہلو انسانی حیثیت کا۔ جن چیزوں کو حذف یا قابلِ تبدیلی سمجھا جائے ان کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ یہ کتاب کے انسانی پہلو سے وابستہ ہیں۔ عباسی خلیفہ المامون نے جبراً یہ عقیدہ نافذ کرنا چاہا، وہ سمجھتا تھا کہ یہی روشن دین ہے۔ اس نے ۲۱۲ھ/۸۲۷ء میں ایک فرمان جاری کیا جس کا مفاد یہ تھا کہ قرآن کو مخلوق ماننے کا اصول حق پر مبنی ہے اور تمام مسلمانوں کے لیے اسے مان لینا واجب ہے۔ بہ ظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس طرح المامون قرآن کی بعض تعلیمات میں ترمیم کا خواہاں تھا۔ یہ فرمان اس لحاظ سے سراسر انقلابی تھا کہ جس منصب کو اسلام نے پوری قوم کے لیے مخصوص کر دیا تھا خلیفہ نے اسے اپنے لئے غصب کر لینے کی کوشش کی۔ المامون اس امر پر زور دیتا تھا کہ جو لوگ قرآن کو غیر مخلوق مانتے ہیں وہ خدا کی وحدت سے انکار کے گناہ گار ہیں۔ چنانچہ اس نے قرآن کو مخلوق منوانے کا مسئلہ قاضیوں کے حوالے کر دیا۔ جو گواہ عدالت میں پیش ہوتے وہ جب تک قرآن کے مخلوق ہونے کا اقرار نہ کر لیتے، ان کی گواہی قابلِ قبول نہ سمجھی جاتی۔ جن لوگوں نے اس حکم کو ماننے سے انکار کیا، انھیں بت پرست اور مشرک قرار دے کر سزا دی گئی۔ یہ پالیسی مامون کے جانشین کے عہد میں بھی قائم رہی لیکن ۲۳۴ھ/۸۴۸ء میں اسے ترک کر دیا گیا۔ پھر کبھی یہ جاری نہ ہوئی۔

اس فرمان کے خلاف قید اور تازیانے کی سزائیں برداشت کر لینے کا اعزاز امام احمد بن حنبل کے حصے میں آیا جو فقہ کے چار دبستانوں میں سے ایک کے بانی ہیں۔ ان

کے نزدیک قرآن کے متعلق وہی بنیاد درست تھی جو اسلاف کرام سے نسلاً بعد نسلٍ چلی آ رہی تھی حنبلیوں کا یہ موقف سنیوں کی عام رائے کا مظہر ہے۔ ایک اور موقف الاشعری نے اختیار کیا (وفات ۳۲۴ھ۔ ۹۳۲ء) یہ ایک مشہور معتزلی تھے اور ان ہی مباحثانہ طریقوں سے کام لیتے تھے جن سے اُن کے اساتذہ کام لینے کے عادی تھے، لیکن اس نتیجے پر پہنچے کہ اُن کے اساتذہ کا موقف غلط ہے چنانچہ ان کی تعلیمات کی بنا پر اشعریت وجود میں آئی۔

معتزلوں کے رجحانات شیعوں کے یہاں قائم رہے شیعیت کی بنا یہ عقیدہ ہے کہ حقیقت تک پہنچنے کے لیے ایک معصوم معلّم کی ضرورت ہے اور وہ امام ہی ہو سکتا ہے اور وہ اسی آسمانی ہدایت کا مشعل بردار ہے جو حضرت آدم سے رسول اللہ صلعم تک پہنچی، پھر حضور صلعم کے چچیرے بھائی اور داماد حضرت علیؓ، نیز ان کے اخلاف کے حوالے ہوئی۔

معتزلیوں کو اصرار تھا کہ حقیقت تک پہنچنے کے لیے عقل و دانش کا استعمال لازم ہے شیعیت میں بھی یہ چیز آگئی، اس لیے کہ امام کے ساتھ سرّی تعلّقات کے پیش نظر انفرادی استدلال سے کام لینے کے لیے خاصی گنجائش پیدا ہو جاتی ہے۔

شیعیت کے آج تین بڑے گروہ ہیں: اوّل زیدی جو زیادہ تر یمن میں مقیم ہیں، دوم دوازدہ امامی (اثنا عشری) جو ایران، عراق، ہندوستان، پاکستان، لبنان اور شام میں رہتے ہیں، سوم اسماعیلی یا ہفت امامی یہ ہندوستان، عرب اور مشرقی افریقہ میں پائے جاتے ہیں۔ ان میں اختلاف یہ ہے کہ حضرت علیؓ کے اخلاف میں منصب امامت کے لیے ترتیب کیا تھی۔

تاریخی نقطۂ نگاہ سے اسماعیلیوں نے بڑا شاندار اور معتدبہ وظیفہ ادا کیا اسماعیلیت ہی میں سے قرامطہ کی تحریک پیدا ہوئی جو زیادہ پھیلی اور جو سنّیوں کے خلاف بغاوت کی حیثیت رکھتی تھی۔ ایک وقت میں قرامطہ مکہ معظمہ پر بھی قابض ہو گئے تھے (۳۱۷ھ

۹۲۸-۲۹ء) انھوں نے اپنی جماعت کو روحانی اور اجتماعی حیثیت سے جس طریق پر منظم کیا
اُس کے متعلق رودادیں شبہات سے پاک نہیں، اسماعیلیّت کا زیادہ ٹھوس نتیجہ فاطمی
خلافت کا قیام تھا۔ اس کی ابتدا تیونس میں ہوئی (۲۹۸ھ۔ ۹۱۰ء) پھر مصر بھی اس
خلافت میں شامل ہو گیا، شہر قاہرہ کی بنیاد رکھی گئی اور مسجد الازہر بنی۔ (۳۶۳ھ۔ ۹۷۳ء)
فاطمی خلفاء مصر اور شام و حجاز کے بعض حصوں پر ۵۶۷ھ (۱۱۷۱ء) تک حکمران رہے
اسماعیلیّت کے مجلسی مضمرات خواہ کچھ ہوں ـــــ علماء اس باب میں بہت کچھ کہتے
ہیں ـــــ یہ حقیقت ہے کہ فاطمی خلافت کے اصول نے مصر کے انتظامی ڈھانچے
پر کوئی خاص اثر نہ ڈالا۔ اگرچہ وہاں اسماعیلیّت دو سو سال تک حکمران رہی اور اُس نے
اپنے اصول کی اشاعت کے لیے بڑی کوششیں کیں مگر مصر اُسی طرح سُنّی رہا جس طرح
فاطمیوں کے برسر اقتدار آنے سے پیشتر سنی تھا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ زندگی کے
متعلق مسلمانوں کے نقطۂ نگاہ کو ایک خاص ڈھانچے میں ڈھالنے کے لیے تصوف نے
غیر معمولی اہمیت حاصل کی۔ تصوف ایک مرتب نظام کی حیثیت میں تیسری صدی ہجری
کے اواخر میں نمودار ہوا (۸۶۵ء) یعنی معلّم بھی تھے اور شاگرد بھی، پیر بھی تھے، اور
مرید بھی۔ اس وقت سے تصوف کے اکابر اور اربابِ حال نے اسلامی دنیا کے عقائد و اعمال
کو ایک خاص شکل دینے میں جو کچھ کیا وہ ابھی ہمارے سامنے آ جائے گا۔ ممکن ہے
تصوف کی اس برتری کو اربابِ حکومت اور اصحابِ علم و فضل پر عوام کی فتح کا مظہر قرار
دیا جائے، اس لیے کہ تصوف کے ماتحت عام آدمی افکار و جذبات کی ایک ایسی دنیا
میں رہنے لگے جو خود اُن کی پیدا کردہ تھی اور اُنھیں یہ دیکھ کر اطمینان ہوتا تھا کہ بڑے
با اقتدار اور عالم فاضل بہ ظاہر گنوار پیروں کے سامنے سر جھکاتے تھے جن کی ظاہری
حیثیت درویشوں اور بھکاریوں جیسی تھی۔

اسلامی معاشرے کے بلوغ کے متعلق اس حصّے کو ختم کرنے سے پہلے ضروری

ہے کہ اُن خود مختار حکومتوں کا بھی ذکر کر دیا جائے جو خلافت کے مختلف علاقوں میں پیدا ہو گئی تھیں ابتدا یوں ہوئی تھی کہ اسلامی دنیا عرب آبادکاروں، عرب چھاؤنیوں اور مختلف صوبوں کے مقامی باشندوں پر مشتمل تھی، لیکن عرب عام باشندوں سے الگ رہتے تھے بلوغ کے عمل نے نیا دور پیدا کر دیا جس میں عربوں اور دوسرے لوگوں کے درمیان امتیاز محو ہو گیا۔ مختلف علاقوں اور خطوں نے مسلمہ اسلامی اتحاد کے دائرے میں اپنے تشخص اور خود مختاری کو بحال کر لیا۔

ہسپانیہ سب سے پہلے خلافت سے الگ ہوا۔ جب بنو امیہ کا تختہ الٹ گیا تو اُن میں ایک فرد ہسپانیہ پہنچ گیا۔ بہت سی مشکلات کا مقابلہ کرتے ہوئے اُس نے ۱۳۹ھ (۷۵۶ء) میں قرطبہ کی امارت حاصل کر لی، ۳۱۶ھ (۹۲۸ء) میں اس امارت کو خلافت کی حیثیت دے دی گئی۔ ۴۲۳ھ (۱۰۳۱ء) میں اس کا خاتمہ ہوا، لیکن اُس وقت تک اس خلافت نے بعض نہایت شاندار کارنامے انجام دیئے۔ پھر ہسپانوی خلافت کے علاقے مختلف چھوٹی چھوٹی امارتوں میں بٹ گئے اس اثنا میں شمالی افریقہ کے اندر بربروں کی ایک زبردست قوت کا ظہور ہوا یعنی مرابطین نے ہسپانیہ کو بھی شمالی افریقہ کی سلطنت میں شامل کر لیا۔ پھر اُن کی جگہ بربروں کے ایک اور خاندان نے لے لی جو موحدین کے نام سے مشہور ہے۔ یہ دونوں حکمران خاندان بربر قبیلوں میں مذہبی احیار کی تحریکات کا نتیجہ تھے۔

تیونس میں اغلبیوں نے ۱۸۴ھ (۸۰۰ء) میں خود مختاری حاصل کی۔ اُنھیں بحریات سے دلچسپی تھی، لہٰذا اُنھوں نے توسیع کا سلسلہ بھی سمندروں ہی میں جاری رکھا اور ۲۱۶ھ (۸۳۱ء) میں سسلی کو فتح کر لیا۔ سسلی اسلامی حکمرانی کے زمانے میں اسلامی تہذیب کا مرکز بنا رہا[1]۔ یہاں تک کہ ۴۵۲ھ (۱۰۶۰ء)

۱؎ سسلی کے اسی اسلامی دور کی یاد نے اقبال مرحوم سے وہ دل آویز نظم لکھوائی تھی جو مرثیہ سسلی
بقیہ صفحہ ۱۲۰ پر

کے آغاز میں نورمنوں نے اسے مسخر کر لیا۔

مصر میں احمد بن طولون نے ایک خود مختار حکمران خاندان کی بنیاد ۲۵۶ھ / ۸۶۹ء میں رکھی۔ اس خاندان کا دورِ حکومت اگرچہ مختصر تھا، لیکن بڑا شاندار تھا، فاطمیوں کے عروج و زوال کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔ مصر سے مشرق کی طرف آئیں تو شام میں ہمیں ایک عرب خاندان برسرِ حکومت نظر آتا ہے: یہ حمدانی تھے جن کا دارالحکومت حلب تھا۔ ان لوگوں نے بیزنطینیوں کے خلاف رزم و پیکار میں بڑی شہرت حاصل کی اور حلب میں اہلِ علم و فضل کا ایک بڑا اچھا حلقہ جمع کر لیا تھا۔ مشہور فلسفی فارابی بھی اسی حلقے میں شامل تھا۔

خلافت کے مشرقی صوبوں میں ایک عظیم القدر خاندان تیسری صدی ہجری (نویں صدی عیسوی) میں نمایاں ہوا یہ ماوراء النہر کا سامانی خاندان تھا، جس کے عہدِ حکومت کو بوعلی سینا کی زندگی اور کارناموں نے زینت بخشی۔ مزید ایک صدی گزر گئی تو غزنویوں نے سامانیوں کی جگہ لے لی۔ یہ لوگ سلطان محمود کی قیادت میں تسخیرِ ہند کے لیے خاص طور پر مشہور رہیں۔ سلطان موصوف کے دربار میں بہت سے علوم کا وہ شہرہ آفاق ماہر بھی رہتا تھا جو البیرونی کے نام سے مشہور ہے۔ (وفات ۴۴۲ھ۔ ۱۰۴۸ء) اسی دربار سے فارسی کی مشہور رزمیہ نظم "شاہ نامہ" کا مصنف فردوسی وابستہ تھا۔

کے نام سے مشہور ہوئی، اور "بانگ درا" میں صقلیہ کے نام سے شائع ہوئی دیکھیئے اقبال نے عربوں کے رکن اوصاف کو نمایاں کیا، فرماتے ہیں۔

تھا یہاں ہنگامہ ان صحرا نشینوں کا کبھی	بحر بازی گاہ تھا جن کے سفینوں کا کبھی
زلزلے جن سے شہنشاہوں کے درباروں میں تھے	بجلیوں کے آشیانے جن کی تلواروں میں تھے
اک جہان تازہ کا پیغام تھا جن کا ظہور	کھا گئی عصرِ کہن کو جن کی تیغ ناصبور!
مردہ عالم زندہ جن کی شورشِ قم سے ہوا	آدمی آزادِ زنجیرِ توہم سے ہوا
غافلوں سے جس کے لذت گیر اب تک گوش ہے	کیا وہ تکبیر اب ہمیشہ کے لیے خاموش ہے

ل بویا خلفا، ایک شیعی خاندان کے زیرِ اثر چلے گئے جو بغداد سے عراق اور مغربی ایران
پر حکومت کرتا تھا (آلِ بویہ) (۳۳۸ھ تا ۴۴۷ھ، ۹۴۹ء تا ۱۰۵۵ء) اس شیعہ
خاندان کو سلجوقی ترکوں نے اقتدار سے خارج کیا، ترکوں کے برسرِ اقتدار آنے پر اسلامی
معاشرہ نشوو ارتقا کے نئے دور میں داخل ہو گیا۔

اس زمانے میں جو مختلف خاندان برسرِ اقتدار آئے اُن کی قوت ایک جنگجو جیش
اور ایک قبیلے کی حمایت یا قومی وحدت کے احساس یا مذہبی فرقہ داری پر مبنی تھی۔
صر یا مشرقی علاقوں میں جو خاندان حکومت کے مالک بنے، اُن کا خاصا یہ تھا کہ جس
لد تک ممکن تھا عباسی دربار اور بغداد کے انتظامی ڈھانچے کی نقل کرتے رہے۔
نام حکمران شاعروں، سائنس دانوں فلسفیوں اور دینی عالموں کے سرپرست تھے۔
لوگ اُن کے درباروں کی شان و شوکت میں اضافہ کرتے اور اُن کے وقار کو چار چاند
لگاتے۔ یہ واقعہ ہے کہ ذہنی سرگرمیاں کسی ایک مرکز میں مرتکز نہ تھیں، لہٰذا مشکل اور
ن حالتوں میں غیر ممکن تھا کہ ان ذہنی تحریکات کو کسی سیاسی یا مذہبی اقتدار کے تابع
یا جا سکتا۔

بربر، ترک، صلیبی اور تاتاری

پانچویں صدی ہجری۔ دسویں صدی ہجری۔ (گیارھویں صدی عیسوی۔ سولھویں صدی عیسوی)

ملتِ اسلامیہ کی سرگزشت میں پانچویں صدی ہجری (گیارھویں صدی عیسوی) کو
اص اہمیت حاصل ہے۔ اُس وقت تین خلافتیں قائم تھیں۔ قرطبہ میں اُموی خلافت
اہرہ میں فاطمی خلافت اور بغداد میں عباسی خلافت، ان کے علاوہ جابجا مزید حکمران
اندان ظہور میں آ چکے تھے، لیکن خلافتیں معرضِ زوال میں تھیں۔ معاشرے کا نظام انقلابی
سرگرمیوں اور بے لگام قیاس آرائیوں کے باعث بظاہر بکھر رہا تھا، ہسپانیہ میں مسیحی

قوتوں کی پیش قدمی جاری تھی اور وہ چھنے ہوئے علاقے فتح کرتی جارہی تھیں۔ اُس وقت مغربی ایشیا اور شمالی افریقہ میں خانہ بدوش قوت کا ایک نیا مظاہرہ ہوا۔ یہ مظاہرہ عربوں میں بھی ہوا، بربروں میں بھی اور ترکوں میں بھی۔

خانہ بدوشی کی نئی لہر مصر، شام، عراق اور ایران کے سرحدی علاقوں میں اُٹھی۔ یہ لہر کچھ زیادہ زوردار نہ تھی۔ تھوڑی تھوڑی قوت فراہم کرتی رہی اور چودھویں صدی ہجری (انیسویں صدی عیسوی) تک اس کا سلسلہ جاری رہا۔ پھر اس نے ایسی قوت حاصل کرلی کہ مذکورہ بالا ملکوں کے حکمران صرف جزوی طور ہی پر اسے زیر اثر رکھ سکے۔ اس کے مقابلے میں شمالی افریقہ کے قبائلی بدوؤں کی زبردست اور تباہی خیز سرگرمی زیادہ حیرت انگیز اور زیادہ فیصلہ کن تھی۔ بالکل یہی کیفیت مغربی ایشیا میں ترکوں کی اور ہسپانیہ اور مراکش میں بربروں کی تھی جنھوں نے پہلے سے اپنی تعمیری سکیمیں بنا رکھی تھیں۔ تونیسیہ میں بدوؤں کی سرگرمیوں کے متعلق صرف اتنا بتا دینا ضروری ہے کہ اُنھوں نے اور اُن کے اخلاف نے مسیحیت اور اسلام کی کش مکش کے پھیلتے ہوئے اکھاڑے میں اپنے ہم مذہبوں کو سرگرم امداد دی۔

بربروں میں جو تحریک پیدا ہوئی تھی، اُس کا مدعا مذہبی احیا ء تھا اور اُس کی ابتدا صحرائی علاقے میں ہوئی تھی، لیکن پھر اُس نے حکمران خاندان کی صورت اختیار کرلی جس کے رئیس بڑے مجاہد تھے۔ یہ مرابطی خاندان تھا۔ جیسا کہ پہلے بتایا جاچکا ہے، اس خاندان نے ہسپانیہ پر بھی قبضہ کرلیا تھا اور عیسائیوں کو شکست دے کر کچھ مدت کے لئے اُن کی پیش قدمی روک دی تھی[1]۔ جب اِس خاندان کی روحِ جہاد افسردہ ہوگئی

---

[1] مرابطیوں کے رئیس السلار یوسف بن تاشفین نے اکتوبر ۱۰۸۶ء میں مسیحی قوت کو شکست فاش دی تھی۔ یہ لڑائی زلاقہ میں ہوئی تھی جو ہسپانیہ کے صوبہ بطلیوس (Badajoz) اور دنیا کی نہایت اہم فیصلہ کن جنگوں میں شمار ہوتی ہے۔

اسلامی تاریخ میں یہ معاملہ پے درپے پیش آتا رہا ـــ تو مرابطیوں کی جگہ موحدین نے لے لی۔ یہ بھی ایک احیائی تحریک کے علمبردار تھے۔ موحدین نے بھی مراکش اور ہسپانیہ کی سلطنت اپنے قبضے میں رکھی اُنھوں نے شریعت کی ظاہری پابندی کے سلسلے میں کوئی خلل نہ آنے دیا۔ لیکن فلسفیوں کو اُس حد تک انفرادی آزادی دے دی کہ وہ ایک خاص احتیاطی دائرے سے باہر قدم نہ رکھیں۔ ابن رُشد جو مشہور عرب فلسفی تھا، اہلِ مغرب اُسے اوارروز[1] کہتے ہیں، موحدین ہی کے زمانے میں گزرا ہے۔

ترک بھی بربروں کی طرح اصلاً خانہ بدوش تھے، لیکن اُن میں ایک فرق تھا اور وہ یہ کہ ان کی قوت کا مرکز قوم تھی، قبیلہ نہ تھا، یا قوم کی جگہ قبائل کا مجموعہ تھا، یہ ترک سلجوقیوں کے نام سے مشہور ہیں، سلجوق ان کے سردار کا نام تھا جس نے اپنے لوگوں کو بخارا کے نزدیک آباد کیا تھا اور وہ سب دائرۂ اسلام میں داخل ہو گئے تھے۔ اگرچہ ترکوں نے مذہبی پالیسی جاری رکھی اور اس پالیسی نے اُن کی سرگرمیوں میں زبردست کردار ادا کیا لیکن مذہبی تحریک کے سلسلے میں برسرِ اقتدار نہیں آئے تھے، جیسا کہ ہم مرابطینی اور موحدین کے بارے میں بتا چکے ہیں۔ ترکوں کا ماضی اسلام سے پیشتر کے سامانی ایران سے جا ملتا تھا، اس وجہ سے اُن کی ثقافتی روایت بربر معاصروں کے مقابلے میں بدرجہا زیادہ وقیع اور شاندار تھی۔ علاوہ بریں اُن کی اجتماعی اور سیاسی تنظیم بھی بہت ترقی یافتہ تھی اور وہ تنظیم اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی جو بربروں نے شمالی افریقہ یا ہسپانیہ میں پیش کی تھی۔

سلجوق اُس وقت مرکزی حیثیت حاصل کر گئے جب ۴۴۷ھ (۱۰۵۵ء) میں ان کا سردار سلطان طغرل بغداد میں داخل ہوا اور اُس نے خلیفہ کو دیلمی شیعوں کی سرپرستی سے آزاد کرایا۔ یوں سلجوقیوں کی پالیسی کا مرکزی نقطہ بروئے کار آ گیا، یعنی سنیت

---

[1] Averroes.

کی محافظت۔ خدمتِ اسلام کا فریضہ قبول کر لینے کے بعد سلجوقیوں نے پہلی مرتبہ خلافت
کا دائرۂ اناطولیہ میں بڑھایا۔ اُنھوں نے ۴۶۴ھ / ۱۰۷۱ء میں بیزنطینی شہنشاہ کو شکست
دی۔ اسی شکست کی خبر نے مسیحی دنیا کے جذبات کو برانگیختہ کیا۔ اس کے ساتھ یہ اطلاعات
بھی پھیلا دی گئیں کہ ترک شام و فلسطین پر قابض ہو چکے ہیں، یروشلم اُن کے زیرِ اقتدار ہے
مسیحی زائروں کے ساتھ نہایت سخت برتاؤ کیا جاتا ہے۔ اس سے جذبات مشتعل
ہوئے اور ہسپانیہ و سسلی سے ارضِ مقدس تک مذہبی جنگ کا سلسلہ شروع کر
دیا گیا۔

سلجوقیوں کے تمام ادارے بہ اعتبارِ اصل عسکری تھے محض اس لیے نہیں کہ اپنے
ابتدائی ماحول میں عسکری زندگی بسر کرتے آرہے تھے، اس لئے بھی کہ اُنھوں نے اسلامی
معاشرے میں اپنے لیے جو وظیفہ تجویز کر لیا تھا، وہ عسکری تنظیم ہی کا متقاضی تھا۔ اُنھوں
نے اپنے آپ کو سنیّت کا مجاہد قرار دیا۔ چنانچہ وہ اسلام کا دائرہ وسیع کرنے اور
محفوظ رکھنے میں لگ گئے اور فیصلہ کر لیا کہ تمام مادّی، اخلاقی اور ذہنی قوتوں
استعمال کر کے چھوڑیں گے،

اس سے دو اہم نتیجے نکلے اوّل سلطنت نے دعویٰ پیش کر دیا کہ حکومت کرنا اور
انسانی معاملات پر نظم و ضبط قائم رکھنا ہمارا حق ہے۔ خلافت کی حیثیت خواہ کچھ تھی لیکن
اس بارے میں اس سے رسمی تصدیق حاصل کئے بغیر چارہ نہ تھا اور سلطان اپنے اس
دعوے کی صداقت پر پورا یقین رکھتے تھے۔ اسے خوب ذہن نشین کر لینا چاہیئے اس
لئے کہ یہی تصور گزشتہ صدی کی اسلامی سلطنتوں کے لیے تاریخی بنیاد اور نمونہ بنا۔ یہ امر
بھی خالی از دلچسپی نہیں کہ تونسیہ کے مشہور مورّخ ابنِ خلدون وفات ۸۰۹ھ (۱۴۰۶ء)
نے اپنی عالمی تاریخ کے "مقدمہ" میں ان سلطنتوں اور اداروں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا
کہ وہ اپنے بل پر وجود میں آئے۔

سلجوقیوں کی حکومت کا دوسرا اہم نتیجہ یہ تھا کہ سلطانوں نے مجلسی اداروں کی تخلیق اور آرائش پر خاص توجہ مبذول کی۔ انھوں نے حکمرانی کا ایک ادارہ بنایا جس میں جنگ اور نظم ونسق دونوں کے مقاصد پیش نظر رکھے گئے۔ اس کے مطابق سلطنت کو مختلف فوجی جاگیروں میں تقسیم کر دیا۔ ایک محکمے کا کام یہ تھا کہ سرکاری دستاویزیں تیار کرے اور پوری سلطنت میں وسائل حمل ونقل زیادہ سے زیادہ اچھی حالت میں رکھے۔ ایک مذہبی ادارہ قائم کیا جس کا ایک فرض یہ تھا کہ قانون وآئین کے سلسلے میں جو ضرورتیں پیش آئیں انھیں پورا کرے۔ ایک فرض یہ بھی تھا کہ تعلیم کے ذریعے سے وہ تمام افراد اور گروہوں کو متحد رکھے۔

سلجوقیوں کے ماتحت کالج قائم ہو گئے جنھیں مدرسے کہا جاتا تھا۔ ان میں مذہبی علوم اور اخلاقیات کی تعلیم دی جاتی تھی، "تمام مضامین دو حصوں میں تقسیم تھے، ایک وہ جن کا پڑھنا پڑھانا منظور تھا، دوسرے وہ جو ان مضامین کی تعلیم کے لیے مفید ومعاون ہو سکتے تھے اور جنھیں عام طور پر آلی علوم کہا جاتا تھا۔ ان مدرسوں میں اساتذہ کو باقاعدہ مشاہرے دیئے جاتے تھے اور طلبار کے لیے خورد ونوش اور قیام کا انتظام ہوتا تھا، ممتاز ترین علمار کو ان درس گاہوں کے لئے بہ طور معلم لانے کی سعی میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا جاتا تھا، امام غزالی بھی کچھ مدت کے لیے (نظامیہ بغداد میں) معلم رہے اور جب ملازمت سے سبکدوشی حاصل کرنی چاہی تو انھیں مجبور کیا گیا کہ وہ اپنا وظیفۂ تدریس کم از کم تھوڑی دیر کے لیے جاری رکھیں ان مدرسوں سے باہر جا بجا علمار نے حلقہ ہائے تدریس قائم کر رکھے تھے اور شائقین ان میں بغیر کوئی فیس ادا کئے تعلیم پاتے تھے، لیکن ان حلقہ ہائے تدریس کا دائرۂ اثر محدود تھا۔ اعلیٰ تعلیم کے لئے سرکاری طور پر جو ترتیبات مقرر ہو چکی تھیں اگرچہ انھوں نے فوراً مطلوبہ نتیجہ پیدا کر دیا یعنی نظام بحال ہو گیا، لیکن یہ ترتیبات بدقسمتی سے نظامِ تعلیم کے ان خصائص پر پہنچ گئیں جو ہمارے زمانے تک چلے آئے

یعنی مقررہ کتابوں کا حفظ کر لینا، نسلاً بعد نسلٍ ایک ہی قسم کی کتابوں کا مطالعہ جاری رکھنا اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ کسی تحلیقی ذہنی تحریک کے لئے باقاعدہ تعلیمی اداروں سے باہر اُمید کا رشتہ قائم کرنا پڑا۔

مسلمانوں کی ذہنی زندگی میں چھٹی صدی ہجری (بارھویں صدی عیسوی) سے موجودہ دور تک جو بڑے رجحانات پائے گیے، اُن کی ابتدا امام غزالی (وفات ۵۰۵ھ ۱۱۱۱ء) کے زیر اثر ہوئی۔ امام غزالی اسلام کو اُن بنیادی اور تاریخی حقائق پر لے آئے جو کتاب اللہ اور احادیث رسول اللہ صلعم میں پائے جاتے تھے۔ اُنھوں نے فلسفے میں ایک نئی دلچسپی پیدا کی اور اپنے نظام میں جذباتی مذہبی زندگی کے لئے بھی جگہ رکھی۔ معاصرانہ مفکروں میں ویسا توازن یا ویسی ہم آہنگی شاذ ہی مل سکے۔ امام غزالی کے بعد ہم کیا دیکھتے ہیں؟ کچھ آدمی ایسے ملتے ہیں ـــــ صُوفی ـــــ جو امید لگائے بیٹھے تھے کہ اسرار خود بخود بے نقاب ہوں گے دوسروں کی امیدیں روایات پر جمی ہوئی تھیں۔ فلسفی پہلے کی طرح بیرونی دنیا کے معروضی مطالعے سے تغافل برت رہے تھے۔ اگر محدثین نے صوفیہ پر الحاد کا الزام لگایا تو صوفیہ نے محدثین کو رسم پرستی، ریاکاری، اور منطقی استدلال میں نا اہلی کا ملزم ٹھہرایا۔ اس پر حیران ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔

صوفیہ میں بھی بڑے نظری فلسفی تھے مثلاً ابن عربی (وفات ۶۳۸ھ ۱۲۴۰ء) ان میں شاعر بھی تھے مثلاً ابن فارض (وفات ۶۳۲ھ ۱۲۳۵ء) لیکن اس کا اصل اثر نظری فلسفے یا شاعری یا جذباتی مظاہروں سے متعلق نہ تھا چھٹی صدی ہجری سے تصوف ایک ہمہ گیر مجلسی ادارہ بن گیا تھا جس نے صلاحیتوں کے لئے ریاضت کا وسیع دائرہ پیدا کر دیا اور ہر سطح پر انفرادی آرزوؤں کی تسکین کا سامان بہم پہنچایا۔ یہ درویشوں اور فقیروں کے مختلف سلسلوں کا تصوف تھا۔ تصوف کے سلسلوں میں بہت سے اختلافات ہیں مثلاً آیا ریاضتیں زیباد موزوں ہیں یا ان میں بہت زیادہ مبالغہ کیا جاتا ہے

توجہات کا مرکز شہر ہیں یا دیہات۔ آیا یہ سلسلے غیر مسلموں میں اسلام کی اشاعت کرتے ہیں یا بے مقصد چکر لگاتے ہیں۔ آیا انھوں نے کوئی ایسے سلسلے قائم کئے ہیں جو جہاد کے لئے وقف ہوں اور الحاد کا خاتمہ کر دیں۔ یہ امتیازات اگرچہ بہت اہم ہیں، لیکن زندگی کے متعلق صوفیہ کی روش بڑی حد تک یکساں رہی۔ دنیائے اسلام کے ہر حصے میں اس روش نے مسلمان کی بصیرت اور نقطۂ نگاہ کو متاثر کیا۔ اہل یورپ نے اسلام سے جو سطحی لیبل وابستہ کئے اُن میں سے اکثر بہ ظاہر تصوف ہی سے لئے گئے۔

کوئی ایک شخص ایسی وسیع تحریک کا صحیح نمونہ نہیں بن سکتا جس کی شاخیں دور دور تک پھیلی ہوئی ہوں اور جس میں رنگ رنگ کی چیزیں شامل ہوں اور یہی کیفیت صوفیہ کی برادری کی ہے، تاہم یہ ممکن ہے کہ مصر کے شیخ عبد الوہاب شعرانی (وفات ۹۷۳ھ ۱۵۶۵ء) کے اوصاف و خصائص مختلف تناسبات میں دوسرے صوفی بھائیوں کے یہاں بھی نظر آئیں، شیخ عبد الوہاب شعرانی کسی آبرو باختہ سلسلے کے نمائندے نہیں اور [illegible] قسم کے سلسلوں کو تمام صوفیہ کا نمائندہ بھی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ شعرانی نے اپنی تحریرات میں ان تمام عناصر کو جمع کر دیا ہے جو حقیقت میں صوفیہ کی میراث ہیں۔ بلا شبہ وہ [illegible]ب حد تک خوش اعتقاد تھے، لیکن ساتھ ہی اُن کے اخلاق بہت بلند تھے، وہ عام زندگی [illegible] بہت حلیم و منکسر اور علمی معاملات میں بڑے سخت تھے، اُن کے نزدیک جن اور [illegible]شتے زبردست حقیقتیں تھیں اور اُن کے ساتھ شیخ موصوف بے تکلف باتیں بھی کرتے [illegible]ہے۔ وہ اس امر کے بھی معتقد تھے کہ اولیا کا اپنا نظامِ حکومت ہے اور وہ دنیائے اسلام [illegible] مختلف حصوں کے کو سنبھالے بیٹھے ہیں۔ اُن اولیا میں رقابتیں بھی موجود ہیں۔ وہ ایک [illegible]سرے سے جھگڑ بھی لیتے ہیں، لیکن خاص توازنِ قوتی کی بنا پر انھیں قابو میں رکھا جاتا [illegible]ے۔ دنیا کو اس نقطۂ نگاہ سے دیکھنے کی حقیقی حیثیت ہر اُس شخص پر آشکارا ہو سکتی ہے [illegible]س عہد کے تاریخی مواد کا مطالعہ کرے اور اس تاریخی مواد کے باقیات اب تک مختلف

لوگوں کے حافظے میں چکر لگا رہے ہیں۔

لیکن اس دور کے ذہنی نشوو ارتقا میں صرف صوفیہ ہی کا اثر کارفرما نہ رہا شیخ الاسلام ابن تیمیہ (وفات ۷۲۹ھ؎ / ۱۳۲۸ء) نے بعض امور کے خلاف جہاد جاری رکھا۔ مثلاً پرستش جسے شیخ الاسلام بت پرستی سمجھتے تھے یا مقبروں کی زیارتوں کے لئے عزم کرکے جانا اور اُن پر چڑھاوے چڑھانا، شیخ الاسلام نے ان کی مخالفت میں کوئی دقیقہ سعی اٹھا نہ رکھا اور اسی سلسلے میں اُنھیں قید و بند سے سابقہ پڑا صوفیہ، فلسفی اور ارباب علم کا سب کو شیخ الاسلام کی مذمت کے تازیانے کھانے پڑے۔ دنیا کی کوئی قوت شیخ الاسلام کو جھکا نہ سکی اور وہ تمام دلائل ابتداے اسلام کے اعمال و روایات سے پیش کرتے تھے عجیب امر یہ ہے کہ مقبروں کی جس زیارت کے عمر بھر مخالف رہے وہ خود اُس کا شکار ہو گئے؎۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے جو اصول پیش کیا تھا اور جو احادیث پر مبنی تھا اُسے شیخ محمد ابن عبدالوہاب نے اپنالیا (۱۱۱۵ھ / ۱۲۰۶ھ / ۱۷۰۳ء / ۱۷۹۲ء) اور یہ اصول اس تحریک کی ایک بنیاد بن گیا جو "وہابیت" کے نام سے مشہور ہے اور جو گزشتہ صدیوں میں مؤثر رہی۔

حکمران طبقے ذاتی طور پر صوفیہ کے زیادہ ہمدرد تھے تاہم وہ صوفیہ اور اہل حدیث (سلفیہ) کے اختلافات روکنے کی کوشش کرتے رہے تاکہ کھلم کھلا جھڑپیں شروع نہ ہو جائیں۔ انتہا پسندی قائم رہے۔ سلجوقی بعد کے مسلمان حکمران خاندانوں کے لئے نمونہ بن گئے۔ سلجوقیوں کے بعد شام، مصر اور مغربی عرب میں ایوبیوں کی حکومت

؎۱ شیخ الاسلام ابن تیمیہ کی تاریخ وفات ۲۰ ذیقعد ۷۲۸ھ / ۲۶ نومبر ۱۳۲۸ء ہے۔

؎۲ شیخ الاسلام ابن تیمیہ کو اس قبرستان میں دفن کیا گیا تھا جو مقابر صوفیہ کے نام سے مشہور تھا۔ وہی ان کا خاندانی قبرستان تھا۔ اب یہ قبرستان باقی نہیں، اس کی جگہ جامعہ سوریہ کی عمارتیں بن گئی ہیں البتہ شیخ الاسلام کی قبر [illegible]

قائم ہوئی۔ اس خاندان کا بانی سلطان صلاح الدین تھا۔ (وفات ۵۸۹ھ، ۱۱۹۳ء) ایوبی سلطنت پر اُن جنگجو سالاروں نے قبضہ کر لیا جو اصلاً غلام تھے اور اُنھوں نے مملوک خاندان کی بنیاد رکھی۔ عثمانی حکمران خاندان کی ابتدا ایشیائے کوچک کے اندر سلجوقی علاقے ہی میں ہوئی۔ عثمانیوں نے پہلے ایشیائے کوچک کو فتح کیا پھر جزیرہ نمائے بلقان، ہنگری عرب، مصر، شام، عراق، شمالی افریقہ تا بہ مراکش اُن کے قبضے میں آ گئے۔ اس طرح عثمانی سلطنت دورِ حاضر کی سب سے بڑی اسلامی سلطنت بن گئی۔

جن حکمران خاندانوں نے سلجوقیوں کے نمونے کی پیروی کی، اُنھیں مسیحی دنیا کی سرگرم دشمنی سے سابقہ پڑا۔ یہ نئی عداوتیں اصلاً مغربی یورپ کی ایک تحریک ہیں اور اُن جنگوں سے بالکل مختلف ہیں جو مسلمانوں اور بازنطینی سلطنت کے درمیان ہوتی رہیں۔ اسلامی دنیا کے خلاف اہل یورپ کی پیش قدمی کے کئی مقاصد تھے، مثلاً ایک مدعا یہ تھا کہ "کافروں" کے خلاف لڑا جائے جیسا کہ مسلمانوں کو سمجھا جاتا تھا، نیز الگ ہونے والے یونانی آرتھوڈکس اور مشرقی کلیساؤں کے خلاف پاپائی اقتدار کو زیادہ سے زیادہ وسعت دی جائے۔ ایک مقصد یہ بھی تھا کہ اطالوی جمہوریتوں کا تجارتی اقتدار جابجا قائم کیا جائے اور مغربی یورپ کے جاگیردار اُمراء کے لئے نئی ریاستیں پیدا کی جائیں۔ (جیسا کہ واضح طور پر کہا گیا، پیش قدمی کا مدعا یہ تھا کہ اُمراء کے چھوٹے بیٹے چونکہ جاگیروں میں حصہ نہیں پاتے لہذا اُن کا مسئلہ حل کرنے کی شکل یہی ہے کہ نئی ریاستیں پیدا کی جائیں) صلیبی جنگوں نے اُن لوگوں کے لئے موقع بہم پہنچا دیا جو مذہب کی خاطر لڑنا چاہتے تھے یا جن کی خواہش یہ تھی کہ جنگ مقدس کی مصیبتیں برداشت کر کے اپنے گناہوں کی تلافی کر دیں۔

تاریخی نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو صلیبی تحریک کی جڑیں ہسپانیہ کی مسیحی دنیا کے قبضے میں لانے کے لئے جنگ سے شروع ہوتی ہیں۔ نارمنوں نے سسلی میں اسلامی قوت کو تباہ کرنے میں جو کامیابی حاصل کی اُس سے تحریک کو بڑی تقویت پہنچی۔

اناطولیہ میں سلجوقیوں کی ظفر مندیوں نے ہراس پیدا کردیا تھا۔ قیصر قسطنطنیہ نے مدد کے لیئے اپیلیں کیں، اس طرح پوپوں کو ایک صلیبی جنگ کے لیئے دعوت دینے کا موقع ہاتھ آگیا۔ غرض پہلی مزعومہ صلیبی مہم شروع ہوئی۔ صلیبی جنگجو سنہ ۴۹۳ھ / سنہ ۱۰۹۹ء میں یروشلم پہنچ گئے اور انھوں نے ساحلِ لبنان پر لاطینی ریاستوں کی بنیاد رکھی۔ یہاں ہمارا مقصد یہ نہیں کہ بحیرۂ روم کے مشرقی ساحل کی یورپی ریاستوں کی سرگزشت بیان کریں لیکن یہ سمجھ لینا چاہیے کہ عمل کا دائرہ صرف بحیرۂ روم کے مشرقی ساحل تک محدود نہ تھا، اس میں مصر تونسیہ، مشرقی بحیرۂ روم کے جزیرے، جزیرہ نمائے بلقان اور قسطنطنیہ بھی الجھا لیے گیے۔ صلیبی جنگجوؤں کو صرف مسلمانوں ہی سے دشمنی نہ تھی، اس لیے کہ چوتھی صلیبی مہم بازنطینی سلطنت کے خلاف بھیجی گئی تھی، جس کے ضمن میں قسطنطنیہ کے اندر لاطینی سلطنت قائم ہوئی اور بلقان میں اطالویوں اور مغربی یورپ کے لوگوں نے ریاستیں پیدا کرلیں۔

سلطان صلاح الدین نے سنہ ۵۸۳ھ / سنہ ۱۱۸۷ء میں یروشلم کو مسیحیوں کے قبضے سے آزاد کرالیا اور ایک صدی بعد صلیبی جنگ مشرقی بحیرہ روم کے آخری حصہ سے بھی خارج کردیئے گئے تاہم صلیبی مہموں کی تلخ یاد نے مسیحیوں اور مسلمانوں کے تعلقات خراب ہی رکھے۔ ممکن ہے مسلمانوں اور مسیحیوں نے اُس دور میں ایک دوسرے سے کچھ سیکھا بھی ہو لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ صدیوں تک ایک دوسرے کو جانی دشمن ہی سمجھتے رہے۔

صلیبی مہموں نے اصولِ جہاد کو بھی زیادہ سے زیادہ تقویت پہنچائی۔ ہر خاندانِ حکمران اور ہر سلطنت اسی کو اپنے وجود کے لیے اصل وجہ جواز سمجھتی تھی اور اسی بنا پر وہ بھاری جنگی قوت فراہم کرلیتی تھی۔ صلاح الدین نے فاطمی سلطنت کو تباہ کرکے مصر اور شام پر مشتمل جو سلطنت قائم کی۔ اُس کا مدّعا یہی تھا کہ مسلمانوں کو آزادی دلائے۔ مملوک سلطان (مصر کے غلام سلطان) اپنے اقتدار کے لیے حفاظتِ اسلام کی ضرورت کے سوا کوئی دلیل پیش نہ کرسکتے تھے۔ اسلامی معاشرے میں غیر عسکری طبقات کے دب جانے

کی بڑی وجہ یہی تھی۔ چونکہ زیادہ تر فوجی اُن قوموں سے بھرتی کئے جاتے تھے جو دائرہ حکومتِ اسلام سے باہر تھیں اور مسلمان عموماً غیر عسکری انتظامی خدمات ہی انجام دیتے تھے ـــــــ خصوصاً عرب ملکوں میں ـــــــ لہذا ہم پر آسانی سے واضح ہو سکتا ہے کہ اسلامی معاشرہ کس طرح جنگی سرداروں کی اقلیت اور محض رعایا کی اکثریت پر مشتمل رہ گیا اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ یورپی قوتوں کے خلاف جہاد نے اسلامی معاشرے میں عربی مغربی حصّے اور ایرانی ترکی مشرقی حصّے کو الگ الگ کرنے کی رفتار تیز کر دی اسلامی حلقے میں تاتاریوں کی یورش نے اس عمل کو اتمام پر پہنچا دیا۔

مغربی ایشیا میں تاتاری اقدامات کی پہلی بڑی لہر وہ تھی جو ساتویں صدی ہجری (تیرھویں صدی عیسوی) میں چنگیز خاں کے ماتحت پہنچی لیکن جس لہر نے زیادہ سے زیادہ گہرا اثر چھوڑا وہ ہلاکو کے ماتحت آئی جس نے بغداد پر قبضہ کیا اور عباسی خلیفہ کو موت کے گھاٹ اتار دیا (۶۵۶ھ ۱۲۵۸ء) تاتاریوں کی پیش قدمی کو مصر کے مملوک سلطانوں نے اُس وقت روک دیا جب وہ شام میں پوری طرح قدم بھی نہ جما سکے تھے لیکن ان میں سے بعض سلطان تاتاری افکار و اعمال سے یقیناً متاثر ہوئے۔

تاتاری حملہ آوروں ہی سے تیمور کا تعلق تھا (وفات ۸۰۸ھ ۱۴۰۵ء) مگر وہ مسلمان تھا اس نے دوبارہ اناطولیہ اور شام کو مسخر کرنے کی کوشش کی، اگرچہ اسے عثمانیوں اور مملوک سلطانوں کے خلاف فوجی لحاظ سے کامیابیاں حاصل ہوئیں لیکن وہ مشرق کی طرف پلٹ کر ہندوستان پہنچ گیا اور اُس کا پروگرام یہ بھی تھا کہ چین کو فتح کرے۔ تیمور کے اخلاف میں سے بابر کو یہ اعزاز حاصل ہوا کہ اُس نے سولھویں صدی میں ہندوستان کے اندر مغلیہ سلطنت کی بنیاد رکھی جو زمانے بھر میں مشہور ہے۔

اگرچہ تاتاریوں نے بڑی تباہی پھیلائی، لیکن وہ اتنی وسیع ناقابلِ تلافی نہ تھی جیسا

ـــــــ

۱؎ تاتاریوں کو پہلی شکست مصری مملوکوں نے عین جالوت پر دی تھی (۱۲۶۰ء)

گئے عام طور پر بیان کیا جاتا ہے۔ عراق پر سب سے زیادہ ضرب پڑی محض اس لئے نہیں کہ ہلاکو نے وہاں سب کچھ تباہ کر ڈالا تھا۔ اس لئے بھی کہ پھر کوئی حکمران خاندان وہاں سے نہ اُٹھا جو نئے سرے سے امن و نظم قائم کر دیتا۔ عراق خانہ بدوش عربوں، کردوں اور ترکمان جتھوں کی شکارگاہ رہ گیا یا آگے چل کر عثمانی اور ایرانی سلطنتوں کے درمیان رقابتوں کے فیصلے اُسی سرزمین میں ہی ہوتے رہے۔

تاتاریوں کے ظہور اور اُس کے اثرات نے ایشیا اور دنیا کی تاریخ میں ایک نیا دور پیدا کر دیا جس کے اثرات اسلامی معاشرے سے بدرجہا زیادہ وسیع تھے۔ افراتفری کے اسی زمانے میں عثمانی ترکوں کی سلطنت پیدا ہوئی۔ ابتدا میں شمالی و مغربی اناطولیہ کے اندر سلجوقیوں کے ماتحت ایک ریاست تھی، پھر پھیلتے پھیلتے یہ بلقان پہنچی ۸۵۷ھ۔ ۱۴۵۳ء میں اس نے قسطنطنیہ پر قبضہ جمایا، بازنطینی سلطنت کا چراغ گُل کیا، مصر و شام کو ۹۲۲ھ۔ ۹۲۳ھ۔ ۱۵۱۶ء۔ ۱۵۱۷ء میں فتح کر لیا۔ اُسی زمانے میں ایران کے اندر صفوی خاندان نے شیعی حکومت قائم کی۔ اُسی زمانے میں عظیم الشان مغلوں نے ہندوستان میں اپنی حکومت کی بنیاد رکھی۔ ان تین حکمران خاندانوں کے ساتھ اسلامی معاشرہ اپنی تاریخ کے نئے دور میں داخل ہوا۔

اسلامی معاشرہ دورِ حاضرہ میں!

دسویں صدی ہجری، چودھویں صدی ہجری۔ سولھویں صدی عیسوی، بیسویں صدی عیسوی

دسویں صدی ہجری (سولھویں صدی عیسوی) میں دنیا کے اندر تین بڑی اسلامی بادشاہیاں تھیں! اوّل سلطنتِ عثمانیہ، دوم بادشاہی ایران، سوم ہندوستان کی مغلیہ سلطنت۔ سلطنتِ عثمانیہ مشرق میں عراق سے مغرب میں حدودِ مراکش تک، جنوب میں خلیج ایران، بحیرہ قلزم اور عدن تک پھیلی ہوئی تھی، نیز شمالی سمت میں وسطِ یورپ تک پہنچی ہوئی

تھی۔ مراکش اور جزیرہ نمائے عرب کے مختلف حصوں کو مستثنیٰ کرتے ہوئے اس میں تمام عرب علاقے شامل تھے۔ جو شہر عربی ثقافت کے مشہور مرکز تھے ـــــ بغداد، دمشق، حلب اور قاہرہ ـــــ وہ سب سلطنتِ ترکی کی حکمرانی میں آگئے تھے مسلمانوں کے تین بڑے مقدس مقامات تھے۔ مکہ معظمہ، مدینہ منورہ اور قدس شریف یعنی یروشلم ان تینوں کی خدمت و نگرانی سلاطینِ عثمانیہ نے سنبھال رکھی تھی۔ انھیں اپنے اس عظیم الشان اسلامی وقار و عظمت کا بھی پورا احساس تھا اور انھوں نے آہستہ آہستہ ایک اسلامی پالیسی بھی ترتیب دی جو پہلی جنگِ عظیم کے خاتمے پر سلطنت کا شیرازہ بکھر جانے کے ساتھ ختم ہوئی۔

عثمانی سلطانوں کی پالیسی کا ایک اہم عنصر یہ تھا کہ وہ سنیت کے زبردست محافظ تھے، اسی وجہ سے شاہانِ ایران کے ساتھ لڑائیاں شروع ہوئیں جنھوں نے دوازدہ امامی شیعیت کو اپنا سرکاری مذہب قرار دیا تھا[۱] اگرچہ افغانی سرحد اور وسطِ ایشیا کے حواشی پر تھوڑی دیر کے لیے کشور کشایانہ واقعات بھی پیش آئے لیکن ایران کی تاریخ دسویں صدی ہجری کے بعد ایک قومی سلطنت کی تاریخ بنتی گئی۔ اسی طرح وہ صورتِ حال بروئے کار آئی جو دورِ حاضر کے اسلام کا نمایاں پہلو ہے۔

ہندوستان کی مغلیہ سلطنت دوسری سلطنتوں یعنی سلطنتِ عثمانیہ اور بادشاہی ایران کی طرح متعدد مذہبی اور ثقافتی پہلوؤں کی حامل تھی لیکن یہ بہت جلد اپنی حاکمیت کھو بیٹھی اور ہندوستان کے مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد کو ایسی صورتِ حال سے سابقہ پڑا جو سلطنتِ عثمانیہ اور ایران کے ہم مذہبوں سے حد درجہ مختلف تھی۔

---

۱ ایران کے ساتھ سلطنتِ عثمانیہ کی لڑائیاں یقیناً شیعیت کی وجہ سے نہ ہوئیں۔ اگرچہ لڑائیاں چھڑ جانے کے بعد فریقین نے اپنے مقاصد کے لئے مذہب کو بھی استعمال کیا لیکن یہ عام فتح و تسخیر کی لڑائیاں تھیں اور معلوم ہے کہ ترکوں نے صرف ایرانی شیعیوں سے نہیں بلکہ مصر کے سُنّی لوگوں سے بھی لڑائیاں کیں اور تیمور جیسے سُنّی نے عثمانیوں جیسی سلطنت کو ایسی زبردست ضرب لگائی جس کی وجہ سے یورپ میں ترکی فتوحات کا سلسلہ خاصی مدت تک رکا رہا۔

دسویں صدی ہجری ہی میں بڑے بڑے جغرافیائی انکشافات ہوئے۔ سمندروں میں نئے راستے دریافت ہوئے اور یورپی ملکوں نے استعماری سلطنتوں کی تعمیر شروع کردی، یہ واقعہ دورِ حاضر کی تاریخ میں ایک انقلابی نقطہ بن گیا پہلے یورپی طاقتیں اسلامی اقتدار کے حلقے میں گھری ہوئی تھیں، اب انھوں نے یہ حلقہ توڑ کر خود اسلامی ملکوں کو نرغے میں لے لیا۔ ان تبدیلیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ بعض اسلامی حلقے براہِ راست اہلِ فرنگ کے زیرِ حکومت چلے گئے، خصوصاً جنوبی و مغربی ایشیا اور مشرقی و مغربی افریقہ کے مختلف خطے، لیکن گزشتہ صدی تک یہ مسیحی حکمرانی اسلامی سرزمینوں کے اندر تک نہ پہنچ سکی یہی وجہ ہے کہ وہ ردِ عمل پیدا نہ ہوا جو آگے چل کے ہمارے سامنے آیا۔

عثمانی ایرانی اور ہندوستانی سلطنتوں کے دائروں میں یورپی طاقتوں نے عام طور پر چھوٹے چھوٹے حلقے قائم کر لینے کی پالیسی پر عمل کیا اور غیر مسلم آبادیوں کے ساتھ تعلقات قائم کر کے اُن کے لئے خاص حقوق حاصل کر لئے۔ بعض حالتوں میں اُنھوں نے مسیحیت کی تبلیغ پر زور دیا، بعض حالتوں میں اس امر کی کوشش کی کہ جو لوگ رومن کیتھولک کے حلقے سے الگ ہوئے تھے، وہ دوبارہ اس میں شامل ہوجائیں، لیکن ان کا نصب العین بہرحال یہ رہا کہ اپنے احکام کی تعمیل کرنے والے گروہ پیدا کرلیں۔ گزشتہ صدی تک اِن حاشیہ برداروں کی حیثیت مستحکم نہیں ہوئی تھی، البتہ مغلیہ سلطنت کا معاملہ مستثنیٰ ہے، وہاں ایسٹ انڈیا کمپنی نے مغل بادشاہوں کو اقتدار سے خارج کر کے خود اُن کی جگہ سنبھال لی تھی۔

اِن تینوں سلطنتوں میں مرکزی اقتدار پر ضعف طاری ہوگیا تھا مقابلی قبائلی لیڈر یا طالع آزما یا جنگی جتھوں کے سالار اس کوشش میں لگے رہے کہ اپنے اپنے علاقوں میں خود مختار حکومتیں پیدا کرلیں۔ بعض نے خود یورپی طاقتوں سے بھی امداد حاصل کرنے کی کوشش کی یورپ سے جو خطرہ آیا تھا، سلطنت کے مالکوں کو اس کا احساس

تھا، نیز وہ اپنے ماتحتوں کے عزائم سے بھی ناواقف نہ تھے، لہٰذا انھوں نے اپنا اقتدار از سرِ نو بحال کرنے اور اپنی طاقت بڑھانے کی تدبیریں اختیار کیں، لیکن اُن کی سیاسی سرگرمیوں کو عوام سے کچھ زیادہ تعلق نہ تھا۔ عوام نے تجربات کی بنا پر احیاء اور تعمیرِ جدید کی جو تحریکات پیدا کیں وہ حاکموں کی کارروائیوں سے زیادہ اہم تھیں۔

بارھویں صدی ہجری (اٹھارھویں صدی عیسوی) میں سلسلہ ہائے تصوف کی سرگرمیاں بھی تازہ ہو گئیں، لیکن خاص طور پر قابلِ توجہ تحریک وہ تھی جو محمد ابن عبدالوہاب نے شروع کی ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ شیخ محمد نے شیخ الاسلام ابن تیمیہ کے افکار اور روحِ تعلیم کو اپنا لیا تھا۔ یعنی یہ کہ مسلمان قرآن مجید اور ابتدائی دور کی ابتدائی روایات پر کاربند ہو جائیں۔ محمد ابن عبدالوہاب نے بعض عرب لیڈروں کو اپنا ہم نوا بنایا، جن میں درعیہ کے سعودی امیر بھی تھے۔ اُنھوں نے اپنی زندگیاں شیخ کے مقاصد کی تکمیل کے لیے وقف کر دیں۔ بارھویں صدی کے اختتام، نیز تیرھویں صدی کے ابتدائی بیس سال میں سعودی امیر حرمین شریفین کے ران و محافظ رہے اور اُن کی سلطنت خلیجِ فارس نیز عراق و شام کی سرحدوں تک پھیلی ہوئی تھی۔

لیکن ان ابتدائی وہابی لیڈروں کی سرگرمیوں نے ملّت کے احساسات کو سخت صدمہ پہنچایا اور سلطنتِ عثمانیہ کی طرف سے اُن کے خلاف تعزیری مہم کا انتظام ہوا اور مصر کے نائب السلطنت محمد علی پاشا کے ذمّے یہ کام لگایا گیا۔ ۱۲۳۶ھ (۱۸۲۰ء) سے وہابیوں کی قوت برباد ہو چکی تھی، تاہم اُس کے اصول باقی رہے، عرب ممالک نیز ہندوستان میں وہابیت کا اثر گزشتہ صدی کے اندر مفید طریقوں پر نمایاں ہوا۔[1]

---

[1] یہ بالکل غلط ہے۔ ہندوستان میں بدعات سے علیحدگی کی جو تحریک شروع ہوئی تھی اور جس کا مقصد یہ تھا کہ مسلمان صرف کتاب و سنت کے پابند ہو جائیں، اسے نجدی وہابیت سے قطعاً کوئی تعلق نہ تھا۔ ہندوستان کی تحریک نجدی تحریک سے بالکل بے تعلق تھی، لیکن چونکہ دونوں کا سرچشمہ ایک تھا، اس لیے اُن میں ایک گونہ مماثلت ضرور پائی جاتی ہے۔ یہ بھی بتا دینا چاہیے کہ نجد کے وہابی امام احمد بن حنبلؒ کی فقہ کے پابند ہیں، ہندوستان [illegible]
بقیہ ص ۱۳۶

گزشتہ صدی کے آغاز سے اسلامی معاشرہ اپنے نشوو ارتقا کے نازک دور میں د
ہو گیا۔ فرانسیسیوں کے مصر پر حملے (۱۲۱۳ھ۔ ۱۷۹۸ء) سے ڈیڑھ سو سال کی مدت کا
ہو اجس میں اسلامی معاشرہ دورِ حاضر کے عالمی معاشرے میں ختم ہوتا رہا، ہم لوگ جو اسلا
معاشرے کے رکن ہیں، اس دور کے واقعات کے لازمی نتائج و مضرات سے پوری
آگاہ نہ رہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان مضرات سے آگاہی حاصل کرنا آج کے اسلامی معاشر
کا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔

عالمی معاشرے میں ضم ہونے کا عمل نسبتاً تھوڑی مدت میں پورا ہو گیا، یعنی ڈیڑ
صدی میں؛ اس پوری مدت میں دوسری عالمی جنگ کے اختتام تک عملاً تمام اسلامی
ایک حد تک یورپی طاقتوں کے مؤثر اقتدار کے ماتحت تھیں نیز اس دور میں تما
اسلامی اقوام کی زندگی مادی اور اخلاقی اعتبار سے مغربی تہذیب کے ساتھ ربط وضبط
بنا پر متاثر ہوتی رہی۔ یہ اثر اس قدر زبردست تھا کہ جب مختلف مسلمان گروہوں نے سیاسی
آزادی حاصل کر لی تو اُن پر یہ واضح ہوا کہ اب وہ چاہیں بھی تو قدیم اسلوب زندگی کی طرف
لوٹ جانا ان کے لیے ممکن نہیں رہا۔ یہ حقیقت بھی واضح کر دینا ضروری ہے کہ اگرچہ زبا
سے سب لوگ ماضی کی شاندار روایات کے ستائش گر ہیں، لیکن دل سے کوئی بھی نہیں
چاہتا کہ سابقہ طرزِ زندگی کی طرف لوٹ جائے۔

اگر ہم آج کی دنیا میں معلوم کرنا چاہیں کہ امام غزالی نے حقیقت کی جستجو کرنے
والوں کی جو چار قسمیں قرار دی ہیں، آیا اُن کی کوئی مثال مل سکتی ہے تو ہم یقین کی بنا پر نہ
کہہ سکتے کہ ان کی کوئی مثال اسلامی دنیا میں موجود ہے۔ یقیناً ایسے علماء موجود ہیں جو
الہیات، فلسفہ اور تصوف میں منہمک ہیں، لیکن صرف اس لیے کہ یہ چیزیں تاریخی مظاہر
کی حیثیت رکھتی ہیں موجودہ زمانے کے مصنفین لکھ لکھ کر ثابت کرتے رہتے ہیں کہ اسا

بقیہ حاشیہ ۱۳۳: کہ اہل حدیث صرف کتاب و سنت کی پابندی پر قائم ہیں۔

یہ ہے یا اسلام وہ ہے، یہ ترقی کی راہ میں رکاوٹ نہیں۔ یہ انتزاعیت ہے۔ لیکن جس معنی میں امام غزالیؒ نے حقیقت جوئی کا ذکر کیا تھا، اُس میں کوئی بھی حقیقت جُو نہیں۔ عملی دائرے پر نظر ڈالی جائے تو اسلام کو قومیّت یا فاشیّت کے مقاصد کی تقویت کے لیے استعمال کیا گیا۔ ایسی کوئی مذہبی جمعیّت موجود نہیں جو روحانی رفاقت کے مقاصد کو تقویت پہنچائے۔ جو جمعیتیں ان مقاصد کے حصول میں لگی ہوئی ہیں، انھیں ہم سیاسی کلبوں یا پارٹیوں کے ساتھ وابستہ سمجھتے ہیں۔

یہ معاملات ان حالات کی روشنی میں ذہن نشین کیے جا سکتے ہیں جن میں اسلامی معاشرہ گزشتہ ڈیڑھ صدی کے اندر زندگی بسر کرتا رہا ہے۔ یہ سمجھ لینا چاہیے کہ اگرچہ اسلام کی طویل تاریخ نے موجودہ دَور کے لیے بڑی شاندار میراث چھوڑی، لیکن کوئی معاشرہ تنہا اپنے اندرونی وسائل سے کام لے کر ہمارے عہد کی تمام ضروریات پوری نہیں کر سکتا۔ اسلامی معاشرے نیز تمام دوسرے معاشروں کو اعتراف کر لینا چاہیے کہ ان کے اپنے وسائل ناکافی ہیں اور انسانیت کے سلسلے میں ان پر جو واجبات ہیں، وہ بہت وسیع ہیں۔ عالمی مذہب پیدا کرنا محض ایک استحقاق ہی نہیں بلکہ ایک ذمّہ داری بھی ہے۔[1]

اسلام سوڈان اور مشرقی افریقہ میں

اگرچہ سوڈان اور مشرقی افریقہ کے مسلمانوں کا تعلق اہم واقعات کی رُو سے نہ رہا، لیکن ان کی تعداد بہت زیادہ ہو گئی۔ شمالی افریقہ کے ممالک کے جنوب میں جو افریقی علاقہ واقع ہے اس کے بڑے حصّے پر یورپ کی استعماری طاقتیں قابض ہیں۔ ہمارے مقاصد کے لیے

[1] تعجب ہے کہ مقالہ نگار ایک نئے عالمی مذہب کا امیدوار و منتظر ہے، حالانکہ اسلام بجائے خود عالمی مذہب کی ہی حیثیت میں نازل ہُوا اور اسی کے ساتھ سب کی نجات وابستہ ہے۔ اس امر کا تعجب ہے کہ اسلام کے ہوتے ہوئے اسے دورِ حاضر کی عالمی ضرورتیں پورا نہ ہونے کا وہم ہے۔ البتہ جو اسلامی تعبیرات قرونِ وسطیٰ سے چلی آ رہی ہیں ان کا معاملہ دوسرا ہے۔

سہولت اسی میں ہے کہ سوڈان کی عام تقسیمات کو پیشِ نظر رکھ لیں۔ یعنی مشرقی سوڈان، وسطی سوڈان اور مغربی سوڈان۔ مغربی سوڈان میں دریائے سینی گال[1] اور دریائے گیمبیا[2] نیز دریائے نائیجر[3] کے وسطی حصّے کے طاس شامل ہیں۔ وسطی سوڈان میں جھیل چاڈ کے آس پاس کا علاقہ آجاتا ہے۔ مشرقی سوڈان دریائے نیل کے طاس میں واقع ہے۔ یہی علاقہ ہے، جہاں حال میں خود مختار سوڈانی جمہوریت کی بنیاد رکھی گئی۔

مغربی سوڈان میں اسلام صحرا کے بربروں کے ذریعے سے پہنچا۔ مذہبی احیاء کی ایک وسیع تحریک پانچویں صدی ہجری (گیارھویں صدی عیسوی) میں رونما ہوئی اور اسی کی وجہ سے مراکش اور ہسپانیہ میں مرابطین کی سلطنت کا قیام عمل میں آیا۔ اس تحریک نے تبلیغِ اسلام میں نیا جوش و خروش پیدا کردیا۔ چنانچہ افریقہ میں گھانا (عربی تلفّظ غانہ) کی جو سلطنت موجود تھی، اُس کی لامذہب رعایا میں اسلام کی صدائے حق پہنچی۔ یہ سلطنت ایک زمانے میں بالائی سینی گال کی سونے کی کانوں اور صحرا کے بیشتر بربر قبیلوں پر حاوی تھی۔ ساتویں صدی ہجری (تیرھویں صدی عیسوی) میں ٹمبکٹو[4] اسلامی ثقافت کا مرکز بن گیا۔ پانچ سو سال بعد اسلامی حلقے کی توسیع کو ایک نئی تحریک ملی۔ اس لیے کہ اسکوٹو[5] میں ایک نئی سلطنت کی بنیاد رکھی گئی اور مراکشی صوفیہ کے نیجانی سلطنت کی مدد سے مغربی سوڈان کا بڑا حصّہ مسخّر کرلیا گیا۔

---

[1] SENEGAL مغربی افریقہ کا مشہور دریا جو اندرونِ ملک کے پہاڑوں سے نکلتا ہے۔ پہلے اس کا رخ شمال مغرب کی جانب ہے پھر مغربی جانب پلٹ کر اٹلانٹک میں جاگرتا ہے۔

[2] GANIBIA یہ دریا بھی اندرونِ ملک سے نکل کر مغربی جانب بہتا ہوا سمندر میں جاگرتا ہے۔ سینی گال کے جنوب میں ہے۔

[3] NIGER افریقہ کا یہ بہت بڑا دریا ہے۔ مغربی افریقہ کے پہاڑوں سے نکل کر پہلے شمال مشرق کی طرف جاتا ہے، پھر چکّر کاٹ کر رُخ بدل لیتا ہے اور جنوب کی طرف آتے آتے نائیجیریا میں سے گزرتا ہوا خلیج گنّی میں گرتا ہے۔

[4] TINBUKTU یہ عہدِ گزشتہ کا مشہور مقام تھا اور دریائے نائیجریا کے وسطی حصّے میں اس کے کنارے واقع ہے۔ آج کل یہ فرانسیسی مغربی افریقہ میں شامل ہے۔

[5] SOKOTO مغربی افریقہ میں نائیجیریا کے شمالی و مغربی گوشے میں اسکوٹو واقع ہے۔ یہ ایک وسیع سلطنت کا مرکز تھا۔

وسطی سوڈان میں جھیل چاڈ کے ساتھ ساتھ اسلام پانچویں صدی ہجری میں پہنچ گیا تھا، لیکن پانچ سو سال کے بعد جا کر اس نے وہاں مستحکم حیثیت حاصل کی۔

مشرقی سوڈان کی حد جنوبی سمت میں مصر سے ملی ہوئی تھی، لیکن اس نے اپنی آزادی اور مسیحیت بہ دستور برقرار رکھی۔ اگرچہ مصر پہلی صدی ہجری میں اسلامی حکومت کا صوبہ بن چکا تھا۔ بلاشبہ مشرقی سوڈان، مصر، شمالی افریقہ اور عرب کی اسلامی دنیا کے درمیان گہرے تعلقات کا کوئی ذریعہ نہ تھا، تاہم آمد و رفت کا سلسلہ جاری تھا۔ اس وجہ سے کامل انقطاع کی صورت پیدا نہ ہوئی۔ مصر کے مملوک سلطانوں نے ساتویں صدی ہجری (تیرھویں صدی عیسوی) میں معاملاتِ سوڈان کے اندر سرگرم مداخلت کی۔ یہ حقیقت ہے کہ سوڈان کے مسیحیوں اور کافروں کو حلقہ بگوشِ اسلام بنانے کے براہِ راست ذمہ دار وہ قبائلی عرب تھے جو مصر میں اپنے گھر بار چھوڑ کر سوڈان میں آباد ہو گئے تھے۔ سمجھا جاتا ہے کہ جب مصر کی عنانِ حکومت ترک حکمرانوں کے ہاتھ میں چلی گئی تو ان قبائلیوں نے مصر کو چھوڑا اور سوڈان پہنچے تاکہ زیادہ خوش گوار فضا میں زندگی بسر کریں۔

مشرقی سوڈان میں دسویں صدی ہجری سے بارھویں صدی ہجری تک (سولھویں صدی سے اٹھارھویں صدی تک) جو خاندان حکمران رہا، وہ "فنج" کہلاتا تھا۔ یہ لوگ اپنے آپ کو اُمیہ خاندان کے افراد بتاتے تھے لیکن سب سمجھتے تھے کہ یہ افریقہ ہی کے کسی قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں اور کچھ دیر پہلے مسلمان ہو گئے تھے۔ یہ حکمران افریقی قبائل میں سے غلاموں کی فوجیں بھرتی کر لیتے تھے اور اسی بل پر حکومت کا کاروبار چلاتے تھے۔ گزشتہ صدی میں سوڈان کو مصر سے ملا دیا گیا، تو مصر میں جدید تمدن اور افرنجیت کا جو سلسلہ جاری تھا وہ سوڈان میں بھی پہنچ گیا۔ کچھ مدت تک بغاوت[1] کا

---

[1] بظاہر یہ سید محمد احمد کی تحریکِ آزادی کی طرف اشارہ ہے جنھیں عام طور پر مہدیِ سوڈان کہا جاتا ہے سید محمد احمد کی تحریک کا آغاز دراصل مصر کی انتہائی بدنظمی اور ظلم و جور سے ہوا تھا۔ انگریز اس وقت تک مصر پر قابض نہیں تھے، مگر انھیں خاصا اثر و رسوخ حاصل تھا اور انھوں نے بھی اس ظلم و جور کو روکنے کی کوئی کوشش نہ کی۔

سلسلہ جاری رہا، پھر سوڈان برطانوی استعمار کے زیرِ حکومت آگیا۔ مشرقی سوڈان کے اسلامی معاشرے کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں اسلام سے پیشتر کے افریقی افکار و اعمال کا اثر باقی رہا۔ نیز اس میں صوفیہ کے سلسلوں کی مذہبی زندگی کا اثر تھا اور ان لوگوں کے دل میں یہ بھی جوش تھا کہ عالموں اور بزرگوں کو اپنے یہاں آباد کریں۔

مشرقی افریقہ کے ساحلی علاقے شمال میں راس گاردافوئی[1] سے جنوب میں خلیج دلگوآ[2] تک چلے جاتے ہیں۔ ان علاقوں میں عرب، ایران اور ہندوستان کے بحر پیما تعاون کے ساتھ کام کرتے رہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ وہاں مختلف گروہوں نے خاص خوش حالی حاصل کرلی۔ نیز ان کی مختلف ثقافتی روایات میں امتزاج پیدا ہوگیا۔ ابتدائی دور کے یہی بحر پیما تھے جنھوں نے مغربی بحرِ ہند کی چھان بین کی اور مشرقی افریقہ کے ساحل پر نوآبادیاں قائم کرلیں۔ اپنے رہنے کے لیے عام طور پر وہ قصبے ان جزیروں میں آباد کرتے، جو برِّاعظم کے قریب واقع تھے۔ اس لیے کہ ملک کے قبائل اگر اچانک حملے کر دیتے تو برِّاعظم پر ان کے لیے بچاؤ کی کوئی صورت نہ تھی۔ وہ آباد ہوگئے تو افریقی عورتوں سے شادیاں کرلیں۔ سونے، ہاتھی دانت اور غلاموں کی تجارت کرتے رہے۔ دوسری افریقی پیداوار بھی خریدتے اور بیچتے تھے۔

عرب، ایران اور ہندوستان کے گہرے تعلقات کا نتیجہ یہ ہوا کہ مشرقی افریقہ میں اسلام کی تبلیغ شروع ہوگئی۔ جن فرقوں کو دوسرے فرقوں میں ضم ہوجانے کا خطرہ تھا۔ انھوں نے مشرقی افریقہ کو پناہ گاہ بنالیا اور وہیں آباد ہوگئے۔ چنانچہ آج مشرقی افریقہ میں اسماعیلی، دوازدہ امامی (اثنا عشری) اور عبادی پہلو بہ پہلو رواداری و سلامتی سے زندگی بسر کرتے ہوئے پائے جاتے ہیں۔ یہ رجحان بھی موجود ہے کہ مختلف الاصل ثقافتی عناصر کو ملا کر ایک "کُل" پیدا کرلیا

---

[1] GAURDAFUI افریقہ کی مشہور راس جو خلیج عدن کے دہانے میں واقع ہے۔ یہ اس علاقے کا انتہائی شمالی و مشرقی گوشہ ہے جو پہلے اطالوی صومالی لینڈ کہلاتا تھا۔

[2] DELAGOA BAY یہ خلیج مشرقی ساحل پر موزنبیق کے جنوبی حصے میں ہے۔

جائے۔ معلوم ہے کہ سواحلی زبان اور سواحلی ثقافت عربی اور افریقی عناصر کے امتزاج ہی سے پیدا ہوئی ہیں۔ سواحلی اب اسلامی دنیا کی ثقافتی زبانوں میں سے ایک ہے اور اس کے لیے اچھا موقع ہے کہ پورے مشرقی افریقہ کی آبائی زبان بن جائے۔

مشرقی افریقہ کی آبادیوں نے ابتدا میں جو خوش حالی حاصل کی تھی، وہ پرتگیزوں کی آمد پر ختم ہوگئی[1]۔ پرتگیزوں کو راس امید کے اوپر سے نیا بحری راستہ مل گیا، تو انھوں نے مشرقی افریقہ کی اسلامی نو آبادیوں کی تسخیر شروع کر دی۔ اس طرح جنگی نقطہ نگاہ سے مستحکم مرکز حاصل کرنے کے بعد ان کے سامنے دو مقصد تھے: اوّل اپنے تجارتی مفاد کی پیش بُرد۔ دوم مسلمانوں کے خلاف دشمنی کا جو سلسلہ ان کے وطن میں شروع ہوا تھا، اُسے ہر جگہ لے جانے کا جوش۔ پرتگیزوں کا استیصال انگریزوں کی آمد سے ہو گیا۔ پھر گزشتہ صدی میں افریقہ فرانسیسیوں، جرمنوں، اطالویوں وغیرہ میں تقسیم ہوگیا۔ اس وقت وہاں مسلمانوں کی پوزیشن ویسی ہی ہے جیسی مغربی سوڈان میں ہے، یعنی لوگ یورپی اقتدار کے تابع ہیں۔ ان کے علاقے مختلف حصّوں میں بٹے ہوئے ہیں جن میں سے بعض کا رقبہ بڑا ہے اور بعض کا چھوٹا اور ان کی ثقافتی روایات مختلف ہیں۔ (مقالہ لکھے جانے کے وقت یقیناً یہی حالت تھی، لیکن اب یہ حالت سراسر بدل گئی ہے اور مختلف علاقے آزادی حاصل کر چکے ہیں یا حاصل کر لینے کے قریب ہیں)

اسلام ملایا اور انڈونیشیا میں

اسلام کے ظہور سے بھی بہت پہلے عرب کے بحر پیماؤں نے اپنے وطن اور چین کے تجارتی راستے پر نو آبادیاں قائم کر لی تھیں۔ جب عرب مسلمان ہو گئے تو ان کی تجارتی سرگرمیاں تیز تر

[1] پرتگیزوں نے جو ظلم اسلامی آبادیوں پر بالخصوص کیے، ان کی نظیر پیش کرنا مشکل ہے۔ یہ پرتگیز ہی تھے جنھوں نے فرنگیوں کے متعلق شدید تعصبات ہر جگہ پیدا کیے۔ اگرچہ دوسرے فرنگی بھی انگریزوں سے کم متشدد نہ تھے۔

اور وسیع تر ہوگئیں۔ انھوں نے تجارت کے ساتھ اسلام کی تبلیغ بھی شروع کر دی او
ہندوستان میں جن لوگوں نے اسلام قبول کر لیا تھا، وہ تبلیغ میں عربوں کے مددگار بن گئے
ہمیں بتایا جاتا ہے کہ عرب کے تاجروں اور بحر پیماؤں نے ۱۴۱ھ (۷۵۸ء) میں
جنوبی چین کے مشہور شہر کانٹن کو لوٹا تھا۔ اِس سے ظاہر ہے کہ وہ خاصے طاقت ور تھے
ہندوستان کے مسلمانوں نے بھی چین کے راستے پر مختلف بندرگاہوں میں آبادیاں قائم کر لی
تھیں۔ وہ طرح طرح کے تحائف دے کر مقامی سرداروں اور رئیسوں کے لطف و نوازش
سے مستفید ہونے لگے اور تعویذ دے دے کر انھوں نے عوام کا اعتماد حاصل کر لیا۔ اس
طرح وہ شہرت اور اثر کے مالک بن گئے۔ علم سحر میں بھی لوگ انھیں ماننے لگے۔ یہ
بھی کہا جاتا تھا کہ خاندانی لحاظ سے بہت بلند پایہ ہیں اور ان کا تعلق امراء سے ہے۔ ان
سے مقامی سرداروں نے اپنی بیٹیوں کی شادیاں ان سے کر دیں۔

جزیرہ نمائے ملایا میں جب ملکّا نے اسلام قبول کر لیا اور اسے عروج و اقتدار
حاصل ہُوا تو ملایا اور انڈونیشیا میں اسلام کے قدم جم گئے۔ ملکّا کے عروج کی ابتدا
بحری قزاقی سے ہوئی۔ یہاں کے لوگ آبنائے ملکّا[1] سے گزرنے والے ہر جہاز کو مجبور کرتے
کہ وہ ملکّا سے اجازت نامہ لے کر جائے۔ اس طرح مشرق میں مصالحوں کی تجارت کا ایک
مرکز ملکّا بھی بن گیا۔ یہاں کے حکمران نویں صدی ہجری (پندرھویں صدی عیسوی) میں مسلمان
ہوئے تھے۔ انھوں نے اہلِ جاوا سے خوش گوار تعلقات قائم رکھنے پر زور دیا۔ اس طرح جاوا
بھی مسلمان بن گئے۔ فوج اور تجارت جاویوں کی اس نو آبادی کے ہاتھ میں تھی، جو
ملکّا میں قائم ہو گئی تھی۔ اہلِ ملکّا نے ملایا اور سماٹرا میں اسلام کی تبلیغ کی۔

---

[1] وہ آبنائے جو ملایا اور سماٹرا کے درمیان واقع ہے۔ اس کے انتہائی مشرقی حصّے کا مشہور
مقام سنگاپور ہے۔

پرتگیزوں نے ملکا کو ۹۱۷ھ (۱۵۱۱ء) میں فتح کیا۔ تاہم اسلام ملایا اور جزائر انڈونیشیا میں برابر پھیلتا رہا۔ پرتگیزوں کو برطانوی اور ولندیزی سلطنتوں کے لیے جگہ خالی کرنی پڑی۔ اس طرح ملایا اور انڈونیشیا اسلامی دنیا کے دوسرے حصوں کے مقابلے میں بہت پہلے یورپی اقتدار کے ماتحت چلے گئے، لیکن استعماری اقتدار کا جائزہ لیتے وقت یہ ضرور پیشِ نظر رکھنا چاہیے کہ ابتدا میں معاملہ محض عمومی اقتدار تک محدود تھا۔ البتہ گزشتہ صدی میں اس پالیسی نے آہستہ آہستہ بدلتے بدلتے زبردست مداخلت کی حیثیت حاصل کر لی اور یہ سب کچھ سوچے سمجھے ہوئے نقشے کے مطابق عمل میں آیا۔ ابتدا میں یورپی طاقتیں اتنی قوت نہیں رکھتی تھیں کہ اپنے وطن سے اتنی دور بڑے بڑے علاقوں پر پورا کنٹرول قائم کر لیں۔ لہٰذا انھوں نے تجارت کا ملّا اپنے ہاتھ میں لے لی۔ مختلف قلعوں اور بحری قوت کے بل پر اپنی پوزیشن محفوظ رکھی اور علاقوں پر دیسی حکمرانوں کے ذریعے سے بالواسطہ اقتدار کے استعمال کو کافی سمجھ لیا۔ پرتگیزوں کا قطعی یہ فیصلہ تھا کہ اسلام اور بدھمت کے خلاف برابر جہاد جاری رکھیں گے، مگر ان کے مبلغ کہیں بھی کامیاب نہ ہوئے۔ انگریزوں اور ولندیزوں نے قائم شدہ نظام مذہبی کے خلاف گزشتہ صدی سے پیشتر کوئی کوشش نہ کی۔ اس کے برعکس فرانس نے ایک موقع پر بظاہر مشنریوں کی بڑی زبردست سکیم جاری کی لیکن اس سے کوئی قابلِ ذکر نتیجہ برآمد نہ ہوا۔

گزشتہ صدی میں فرنگیوں اور ملایا و انڈونیشیا کے درمیان تعلقات کا نیا دور شروع ہوا۔ اس کی خصوصیت یہ تھی کہ ایک طرف زیادہ سرمایہ لگانے اور اقتصادی نشو و ارتقاء و ترقی دینے کی پالیسی اختیار کی گئی۔ دوسری طرف مغربی اصول پر تعلیم اور مجلسی خدمات کا سلسلہ جاری کر دیا گیا۔ صوبے بیرونی منڈیوں پر انحصار کے لیے مجبور ہو گئے۔ زرعی قرض بڑھ گیا۔ چین اور ہندوستان سے بے شمار اشخاص ترک وطن کر کے ملایا اور انڈونیشیا پہنچ گئے۔ ان تبدیلیوں کا اثر اسلامی معاشرے پر بہت زیادہ پڑا۔ ایک مثبت ردِعمل یہ تھا کہ جنوبی و مشرقی ایشیا کے مسلمانوں نے روحِ حیات کی تلاش میں

اس معاشرے کی طرف رجوع کیا، جس کی وہ ایک شاخ تھے۔ اس سلسلے میں جو طریقہ بالاہتمام اختیار کیا گیا، یہ تھا کہ اعلیٰ تعلیم کے لیے طلباء کو مقاماتِ مقدسہ حجاز نیز قاہرہ کی یونیورسٹی الازہر میں بھیجا جانے لگا۔ یہ طلباء فارغ التحصیل ہو کر وطن لوٹے تو انھوں نے زیادہ سے زیادہ وسیع پیمانے پر اسلامی تعلیم کا پروگرام جاری کیا۔ پرانے اسلامی مرکزوں سے وابستگی ہی کا ایک مظہر یہ تھا کہ اہلِ انڈونیشیا میں حج کے لیے زیادہ شیفتگی پائی جاتی ہے۔

آج کی اسلامی دُنیا

اس مقالے میں ہم مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ سے اسلام کی اشاعت کا نقشہ مغرب میں اٹلانٹک اور مشرق میں بحرالکاہل تک پیش کر چکے ہیں۔ صرف یورپ کے حواشی میں سے اسلام کو ان علاقوں سے خارج کیا جا سکا ہے، جہاں لوگ رسُول اللہ صلعم کی تعلیمات قبول کر چکے تھے۔ اگرچہ دنیا کے مسلمانوں کی کوئی صحیح مردم شماری اب تک نہیں ہوئی، لیکن کم سے کم اندازہ بھی یہ ہے کہ مسلمان چالیس کروڑ سے زیادہ ہیں۔ مندرجہ ذیل نقشے سے مختلف ملکوں کی اسلامی آبادیاں واضح ہو سکتی ہیں:۔

اطراف و ممالک	آبادیاں
چین	۴۲،۰۰۰،۰۰۰
جاپان	۵،۰۰۰
مشرق بعید کی کل میزان	۴۲،۰۰۵،۰۰۰
انڈونیشیا	۷۴،۲۰۰،۰۰۰
فلپائن	۷۹۰،۰۰۰
ہند چینی	۲۵۰،۰۰۰

ملایا	۳،۳۰۰،۰۰۰
تھائی لینڈ	۶۴۰،۰۰۰
جنوبی و مشرقی ایشیا کی کل میزان	۷۹،۱۸۰،۰۰۰
پاکستان	۶۶،۰۰۰،۰۰۰
ہندوستان	۴۰،۲۰۰،۰۰۰
برما	۷۵۰،۰۰۰
سیلون	۵۰۰،۰۰۰
پاکستان وہند کی کل میزان	۱۰۷،۴۵۰،۰۰۰
سنکیانگ	۳،۰۰۰،۰۰۰
افغانستان	۱۲،۰۰۰،۰۰۰
ترکی	۲۳،۶۰۰،۰۰۰
سوویٹ یونین	۲۲،۰۰۰،۰۰۰
البانیا	۷۰۰،۰۰۰
یوگوسلاویا	۱،۹۰۰،۰۰۰
بلغاریا	۸۰۰،۰۰۰
یونان	۲۰۰،۰۰۰
رومانیا	۵۰،۰۰۰
ترک علاقوں کی کل میزان	۴۴،۲۵۰،۰۰۰
ایران	۱۸،۵۰۰،۰۰۰
عراق	۵،۰۰۰،۰۰۰
جزیرۃ العرب	۱۲،۵۰۰،۰۰۰

شام، لبنان، اردن، اسرائیل	۵،۰۰۰،۰۰۰
مصر	۲۰،۰۰۰،۰۰۰
لبیا	۱،۱۰۰،۰۰۰
تونسیہ	۳،۲۰۰،۰۰۰
الجزائر	۸،۰۰۰،۰۰۰
مراکش	۹،۴۰۰،۰۰۰
عربی خطوں کی کل میزان	۴۶،۲۰۰،۰۰۰
صومالی لینڈ	۱،۸۰۰،۰۰۰
حبشہ	۴،۲۰۰،۰۰۰
ٹانگانیکا	۱،۶۰۰،۰۰۰
سوڈان	۶،۱۰۰،۰۰۰
فرانسیسی استوائی افریقہ	۱،۵۰۰،۰۰۰
فرانسیسی مغربی افریقہ	۹،۳۰۰،۰۰۰
دوسرے افریقی خطے	۱۲،۶۰۰،۰۰۰
افریقہ کی کل میزان	۲۵،۰۰۰،۰۰۰
مغربی ممالک	۸۰۰،۰۰۰
میزان[1]	۴۱۳،۵۸۵،۰۰۰

یہ اعداد محض تخمینوں پر مبنی ہیں جو مختلف خطوں کی مردم شماری کے اعداد اور پو
آبادیوں میں مسلمانوں کے تناسب کی بنا پر فراہم کئے گئے ہیں۔ زیادہ بھروسا انجمن اقو

[1] یہاں اتنا عرض کر دینا چاہیے کہ بعض خطوں کی آبادیاں یقینی طور پر معلوم آبادیوں سے کم بتائی گئی ہیں۔ مثلاً
سوڈان، الجزائر اور بعض دوسرے ممالک، مجموعی اسلامی آبادی ۴۵ کروڑ سے ہرگز کم نہ ہوگی۔

لے اعداد، نیز اسلامی تاریخ کی اس اٹلس[۲] کے اعداد پر کیا گیا ہے جو ہیری ڈبلیو ہیزرڈ[۳]
نے مرتب کی۔ دو اور ماخذوں سے بھی فائدہ اٹھایا گیا، اول گستاو ی۔ وون گرون باؤم[۴]
ایڈٹ کی ہوئی کتاب[۵] دوم لوئی مسینان[۶] کا ایڈٹ کیا ہوا "اسلامی دنیا کا سالنامہ"[۷] بابت
۱۹۵۵ء رہے۔

چین میں مسلمانوں کی تعداد کے متعلق بہت اختلاف ہے۔ موجودہ حکومت نے
کروڑ تعداد بتائی ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس میں صرف وہ نسلی اقلیتیں ... ہیں
لیم کی جا چکی ہیں مثلاً ہوئی، اوئی غور، قازق، قلخاص، تاجیک، تاتار، ازبک، تنگ تیگ
ہیں ایاؤن۔ اُن چینیوں کو اس تعداد میں شامل نہیں کیا، جو مسلمان ہو چکے ہیں چین اور
ہیں چار کروڑ بیس لاکھ کی تعداد اس اندازے پر مبنی ہے جو موجودہ حکومت کے
قتدار آنے سے پیشتر کیا جا چکا تھا۔ اس اثنا میں آبادی کے اندر جو اضافہ ہوا ہو گا اس
یک حد تک لحاظ رکھ لیا گیا ہے۔ خود چینی مسلمان اپنی تعداد پانچ کروڑ بتاتے ہیں۔
ترکی علاقوں میں اُن مسلمانوں کو شامل کر لیا گیا ہے جن کے روابط عربی دنیا یا ایرانی
کے مقابلے میں ترکی سے زیادہ گہرے ہیں۔ سوویٹ یونین میں جو مسلمان آباد ہیں
ب کو حقیقتِ حال کے اعتبار سے ترک علاقوں کے مسلمانوں میں شامل نہیں کیا
نا، اس لیے کہ اُن میں کم و بیش بیس لاکھ مسلمان ایسے ہیں جن کا ثقافتی مرکز ایران ہے۔
یونین کی مسلم آبادی کے اعداد بھی محلِ نظر بتائے جا سکتے ہیں، اس لیے کہ ماضی قریب
ن مسلمانوں کے متعلق صحیح اطلاعات نہیں مل سکیں جو کمیونزم کے زیرِ اثر آئے اور نہ
یا جا سکتا ہے کہ اُن کی تقدیر کیا ہوئی۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ اسلامی اثر کو کم کرنے

اٹلس اعداد و معلومات دونوں کے لحاظ سے نظر ثانی کی محتاج ہے۔ [۳] Harry W. Hazard
[۴] Gustave E. von Grunebaum [۵] ان کی کتاب کا نام ہے Unity and variety in Muslim Civ
[۶] Louis Massignon
سیسی نام: Gustave E. von Grunebaum

کی کوششیں جاری ہیں، اس لیے بھی کہ نظریاتی وجوہ کا تقاضا یہی ہے، اس لیے بھی کہ روس کے اندر رہنے والے مسلمانوں کے تعلقات ترکی اور ایرانی علاقوں کے مسلمانوں سے کٹ جائیں۔

مشرقِ قریب میں بھی آبادیوں کے اندر رد و بدل ہوا ہے۔ اسی وجہ سے شام، لبنان، اردن اور اسرائیل کے اعداد یکجا کر دئے گئے ہیں۔ افریقہ کے متعلق اندازوں میں بڑا اختلاف ہے۔ نقشے میں جو اعداد دیے گئے ہیں وہ زیادہ سے زیادہ محتاط اندازے پر مبنی ہیں۔ مغربی ممالک کے مسلمانوں میں ساڑھے تین لاکھ الجزائری مسلمان بھی شامل ہیں، جو فرانس میں آباد ہو چکے ہیں۔

ان اعداد سے صاف ظاہر ہے کہ دنیا بھر میں مسلمانوں کی تعداد کا کم سے کم اندازہ چالیس کروڑ کے لگ بھگ ہے تقریباً نصف مسلمان مشرقی ایشیا میں چین اور انڈونیشیا سے پاکستان تک آباد ہیں جس ملک کی اسلامی آبادی سب سے زیادہ ہے وہ انڈونیشیا ہے اس کے بعد دوسرا درجہ پاکستان کا ہے۔

اسلامی دنیا میں ثقافت کے پانچ بڑے علاقے ہیں:

۱۔ انڈونیشیا اور ملایا کا حلقہ: یہاں ساڑھے سات کروڑ مسلمان آباد ہیں۔ ان مسلمانوں کے بیرونی تعلقات زیادہ تر عربی دنیا سے رہے ہیں، اگرچہ حال میں انھیں چین سے بھی زیادہ دلچسپی پیدا ہو گئی ہے۔

۲۔ پاکستان و ہند کا حلقہ: اس میں برما اور سیلون بھی شامل ہیں، اس علاقے کی آبادی ساڑھے دس کروڑ سے زیادہ ہے اور یہ سب سے بڑا حلقہ ہے۔ مسلمان اردو زبان استعمال کرتے ہیں اور یہ خاصا رواج پا چکی ہے۔ ان کے تعلقات زیادہ تر عرب اور ایران کے علاقوں سے ہیں۔

۳۔ ایرانی حلقہ: اس حلقے میں عراق کے تیس لاکھ شیعہ، افغانستان کے گیارہ لاکھ شیعہ اور سوویٹ یونین کے چودہ لاکھ تاجیک بھی شامل ہیں۔ اگر پاکستان، ہندوستان، عرب

اور افریقہ کے شیعوں کو بھی شامل کر لیا جائے تو ایرانی اثر کا پورا حلقہ تین کروڑ مسلمانوں پر حاوی ہو جائے۔

۴۔ ترکی حلقہ: یہ منکیانگ سے بلقان تک پھیلا ہوا ہے، سویٹ یونین کے زیادہ تر مسلمان اسی میں شامل ہیں، اس حلقے کی آبادی چھ کروڑ کے قریب ہے۔

۵۔ عربی حلقہ: اس میں بھی چھ کروڑ سے زیادہ مسلمان شامل ہیں، اُن کی زبان عربی ہے اور عربی ثقافت ہی کو خاص اقتدار حاصل ہے، علاوہ بریں ساڑھے تین کروڑ افریقی مسلمان ہیں جو قیادت کے لئے عربی دنیا ہی کی طرف نظریں جمائے ہوئے ہیں چینی مسلمانوں کو اسلامی دنیا کے دوسرے بھائیوں سے زیادہ تعلق نہیں رہا، لیکن عرب، مصر، اور ترکی حلقے سے کچھ نہ کچھ ربط ضبط رہا ہے۔

یہ حقیقت بھی پیش نظر رکھ لینی چاہیے کہ قریباً نصف ترک مسلمان، ۱/۲ ایرانی حلقے کے مسلمان اور تمام چینی مسلمان آج کل کمیونزم کے زیر اقتدار ہیں اور ان کی مجموعی آبادی سات کروڑ دس لاکھ سے کم نہیں۔

تیسرا باب

اسلامی عقائد اور شریعت

(استاذ محمود شلتوت)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اسلام خدا کا بھیجا ہوا دین ہے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر بذریعہ وحی نازل ہوا اور آپ کے ذریعے سے یہ عالم انسانیت کے سامنے آیا، تاکہ انسان اس پر اعتقاد رکھیں اور اس کی تعلیمات و ضوابط پر عمل کریں۔ رسول اللہ صلعم پر کتاب اللہ جس طرح نازل ہوئی، ٹھیک اسی طرح آپ نے اسے انسانوں تک پہنچا دیا، اس کی بنیادی تعلیمات کی تشریح کر دی، اپنی حیاتِ طیبہ میں کتاب کے اصول و ضوابط پر عمل کر کے دکھا دیا۔ رسول اللہ صلعم کے بعد قرآن مجید نسلاً بعد نسلٍ محفوظ صورت میں چلا آ رہا ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح اللہ تعالیٰ نے اسے رسول اللہ صلعم پر وحی کیا تھا اور جس طرح ابتداء میں اسے پڑھا اور پڑھایا گیا تھا۔ یہ تمام حقائق ہر شبہ سے بالا ہیں۔

یہ قطعی طور پر ثابت ہو چکا ہے کہ قرآن مجید نہ رسول اللہ صلعم مرتب کر سکتے تھے، نہ کوئی اور انسان اسے ترتیب دے سکتا تھا۔ یہ حقائق قرآن کے اسلوبِ بیان اور اس کی تعلیمات کے بیش بہا خزانوں سے بھی واضح ہیں اور جس ماحول میں رسول اللہ صلعم نے حیاتِ طیبہ بسر کی وہ بھی اس بارے میں ثبوت کی ایک قطعی دستاویز ہے۔ خود اللہ تعالیٰ نے بڑے زور اور تحدی سے منکروں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ کہ قرآن مجید کی مثل پیش کرنا غیر ممکن ہے۔

وَإِن كُنتُمْ فِي رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلَىٰ   اور اگر تمھیں اس کلام کی سچائی میں شک ہے

عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ ۖ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ ۝

جو ہم نے اپنے بندے (پیغمبر اسلام) پر اتاری تو اس کی سی ایک ہی سورۃ بنا لاؤ اور اللہ کے سوا جن طاقتوں کو تم نے اپنا حمایتی سمجھ رکھا ہے، اُن سب کو بھی اپنی مدد کے لئے بلا لو۔ پھر اگر تم ایسا نہ کر سکو اور حقیقت یہ ہے کہ کبھی نہ کر سکو گے۔ تو اس آگ سے ڈرو جو انسان اور پتھر سے سلگتی ہے اور منکرین حق کے لئے تیار ہے۔

(البقرہ ۲: ۲۲-۲۳)

یہ اس امر کا قطعی ثبوت ہے کہ قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسول اللہ صلعم پر نازل ہوا، اسی وجہ سے اس کتابِ مقدس کو اسلامی عقائد اور اعمال کے لیے اسلامی ضوابط کا سب سے بڑا سرچشمہ مانا جاتا ہے۔

جب رسول اللہ صلعم کو اللہ نے اس دنیا سے بلا لیا تو علماء ــــــ وہ دینی رہنما جو اسلام کے متعلق گہری واقفیت رکھتے تھے انہوں نے محسوس کیا کہ قرآنی متن دو قسم پر مشتمل ہے: ایک وہ جو بالکل واضح، قطعی اور غیر مشتبہ ہے، دوسری وہ جسے ایک سے زیادہ معنی پہنائے جا سکتے ہیں (محکم و متشابہ) جو آیات واضح، قطعی اور حتمی ہیں، اُن کا تعلق بنیادی عقیدوں سے ہے مثلاً اللہ تعالیٰ اور یوم آخرت کے متعلق عقیدہ۔ ایسی ہی آیات سے قوانین اخذ کئے گئے ہیں خواہ وہ عبادات کے متعلق تھے جیسے نماز، زکوٰۃ، روزہ یا نواہی کے متعلق تھے مثلاً عمداً انسان کا قتل، پاک دامن عورتوں پر الزام تراشی، نیز املاک سے تعلق رکھنے والے قوانین۔ ان کے متعلق تعبیر میں آزادی کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔ جن آیات کو ایک سے زیادہ معنی پہنائے جا سکتے ہیں ان کا تعلق اصول و اساسات سے نہیں بلکہ انسان کے ثانوی اور ضمنی پہلوؤں سے ہے۔ ان ہی آیات سے مختلف اسلامی نظریے اور تنازع پیدا ہوئے جنھیں بہرحال ذاتی نقطۂ نگاہ سمجھنا

چاہیے اور اُن میں سے کسی ایک کو واجب نہیں مانا جا سکتا۔

اسلام بنیادی عقائد اور اہم عملی ضوابط کو مستثنیٰ کر دینے کے بعد ایک خاص اسلوب فکر اور ایک خاص وضع قانون تک محدود نہیں، یہ روادار مذہب ہے اور محتاط و دانش مندانہ آزادِ خیال کی اجازت دیتا ہے جیسے کہ اسلامی دنیا میں مظاہرہ ہو چکا ہے، یہ دین حق تمام بڑی ثقافتوں اور تمام تعمیری تہذیبوں کے مطابق ثابت ہوا اور یہی صورت قائم رہے گی۔

قرآن اسلام کی اصل بنیاد و اساس ہے۔ یہ ہمیں بتاتا ہے کہ اسلام اُس وقت تک کسی دل میں جگہ نہیں پا سکتا جب تک دو بنیادی چیزوں کو مان نہ لیا جائے: اول عقائد دوم قوانین و ضوابط۔ اسلام کا سب سے بڑا تقاضا یہ ہے کہ پختہ ایمان دل میں پیدا ہو جو ہر شک شبہ سے بالکل پاک ہو، قرآن مجید کی متعدد آیات میں یہ حقیقت واضح کی گئی ہے اور علمائے اسلام کا اس پر عام اجماع ہے۔ ایمان پہلا پیغام تھا جو رسول اللہ صلعم نے عربوں کو دیا۔ تمام رسول اور انبیاء یہی پیغام دیتے رہے جیسا کہ قرآن نے فرمایا ہے:

قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰہِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَیْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓی اِبْرٰھٖمَ وَاِسْمٰعِیْلَ وَاِسْحٰقَ وَیَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِیَ مُوْسٰی وَعِیْسٰی وَمَآ اُوْتِیَ النَّبِیُّوْنَ مِنْ رَّبِّھِمْ لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْھُمْ وَنَحْنُ لَہٗ مُسْلِمُوْنَ ۝ (بقرہ: ۱۳۶)	مسلمانو! تم کہو کہ ہمارا طریقہ تو یہ ہے کہ ہم اللہ پر ایمان لائے ہیں، قرآن پر ایمان لائے ہیں جو ہمارے لیے نازل ہوا اور ان تمام تعلیموں پر ایمان لائے ہیں جو ابراہیمؑ کو، اسماعیلؑ کو، اسحاقؑ کو، یعقوبؑ کو اور اولادِ یعقوب کو دی گئیں نیز ان کتابوں پر ایمان لائے ہیں جو موسٰےؑ اور عیسٰےؑ کو دی گئی تھیں، بلکہ ان تعلیموں پر بھی ایمان رکھتے ہیں جو دنیا کے تمام نبیوں کو ان کے پروردگار سے ملی ہیں ہم ان سب میں فرق نہیں کرتے اور ہم خدا کے فرمانبردار ہیں

مجموعۂ قوانین وضوابط خدا اور انسان کے درمیان صحیح روابط کے قاعدے متعین کرتا ہے، مثلاً نماز، روزہ یا دوسرے مذہبی فرائض۔ یہ مسلمانوں اور غیر مسلم گروہوں سے تعلقات کی نوعیت کے بارے میں مسلمانوں کی رہنمائی کرتا ہے۔ اس سے انھیں یہ پتا چلتا ہے کہ کنبوں کی تعمیر کیوں کر ہونی چاہیے اور اس کے ذریعے ایک دوسرے سے محبت کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔ یہی ضوابطِ انسان پر یہ حقیقت واضح کرتے ہیں کہ کائنات میں اس کا مقام کیا ہے انسانوں اور حیوانوں کی فطرت کے متعلق تحقیق و تفتیش کی رغبت پیدا کرتے ہیں اور انسان کو بتاتے ہیں کہ کائنات سے مستفید ہونے کے طریقے کیا ہیں۔

قرآنِ مجید واضح کر دیتا ہے کہ عقائد کا نتیجہ ایمان ہے اور مجموعۂ ضوابط انسان کے لئے عمل صالح کا راستہ متعین کرتے ہیں جیسا کہ قرآن کی متعدد آیات میں بیان کیا گیا ہے، مثلاً:

۱۔ اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَانَتْ لَهُمْ جَنّٰتُ الْفِرْدَوْسِ نُزُلًاۙ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا لَا یَبْغُوْنَ عَنْهَا حِوَلًا (کھف : ۱۰۷-۱۰۸)

جو لوگ ایمان لائے اور اچھے کام کئے تو اُن کی مہمانی کے لئے فردوس کے باغ ہوں گے، وہ ہمیشہ ان میں رہیں گے کبھی نہیں چاہیں گے کہ اپنی جگہ بدلیں۔

۲۔ اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ (احقاف : ۱۳)

تحقیق جنھوں نے کہا ہمارا ربّ اللہ ہے پھر ثابت قدم رہے تو نہ ان کے لیے ڈر ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

اسلام جو انسانوں کے درمیان تعلقات کا سلسلہ استوار کرتا ہے عقائد و قوانین دونوں کا مجموعہ ہے۔ عقائد ضابطۂ قوانین کی بنیاد ہیں اور ضابطہ قوانین عقائد کا نتیجہ ہے۔ عقیدے کے بغیر وضع قوانین کا مطلب یہ ہوگا کہ بنیاد کے بغیر عمارت کھڑی کرنے کی کوشش کی جائے اور جس عقیدے کے ساتھ ضابطہ قوانین نہ ہوں، وہ محض نظری حیثیت رکھے گا اور غیر موثر رہے گا۔ یوں اسلام میں عقائد اور اس ضابطۂ قوانین کے درمیان گہرا تعلق ہے جو انسان کے پورے

اعمال اور چلن پر حاوی ہے۔ جو لوگ ان بنیادی چیزوں کے منکر ہیں انھیں کسی بھی حالت میں مسلمان نہیں سمجھا جا سکتا۔

اسلام تمام انسانوں کو دعوت دیتا ہے کہ وہ اس کے عقائد اور مجموعہ قوانین کو قبول کریں خواہ ان کی کوئی نسل ہو، کوئی صنف ہو اور کوئی درجہ ہو۔ اللہ کے روبرو تمام انسان یکساں ہیں، اور وحی کے ذریعے سے نازل شدہ قرآن کو قبول کرنے کی ذمہ داری ہر شخص پر یکساں عائد ہوتی ہے۔

۱۔ یَآ اَیُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ ؕ (حجرات: ۱۳)

لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمھاری ذاتیں اور قبیلے بنائے تاکہ آپس کی پہچان ہو، بتحقیق اللہ کے یہاں اس کو بڑی عزت ہے جو تقویٰ میں بڑھا ہوا ہے۔

۲۔ لَیْسَ بِاَمَانِیِّكُمْ وَلَآ اَمَانِیِّ اَهْلِ الْكِتٰبِ ؕ مَنْ یَّعْمَلْ سُوْٓءًا یُّجْزَ بِهٖ وَلَا یَجِدْ لَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِیًّا وَّلَا نَصِیْرًا ۝ وَمَنْ یَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ یَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا یُظْلَمُوْنَ نَقِیْرًا ۝ (نساء: ۱۲۳-۱۲۴)

نجات (وسعادت) نہ تو تمھاری آرزوؤں پر موقوف ہے اور نہ اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) کی آرزوؤں پر۔ جو کوئی برائی کرے گا ضروری ہے کہ اس کا بدلہ پائے۔ پھر اللہ کے سوا نہ تو اسے کوئی دوست ملے گا اور نہ مددگار۔ اور جو کوئی اچھے کام کرے گا خواہ مرد ہو خواہ عورت، اور وہ خدا پر ایمان بھی رکھتا ہوگا تو ایسے ہی لوگ ہیں جو جنت میں داخل ہوں گے اور رائی برابر بھی ان کے ساتھ بے انصافی ہونے والی نہیں۔

ان دو آیتوں سے صاف واضح ہو جاتا ہے کہ خود رسولوں اور نبیوں کے اخلاف یا رشتے دار بھی اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں عام مومنوں سے زیادہ کوئی حق نہیں رکھتے۔ ان آیتوں میں یہ بھی بتا دیا گیا ہے کہ مرد و زن مذہبی ذمہ داری میں برابر ہیں اور ان کا صنفی اختلاف اس معاملے میں کچھ حیثیت نہیں رکھتا۔ بیوی کی ذمہ داری شوہر سے بالکل الگ ہے، شوہر

کا نیک عمل بیوی کو فائدہ نہیں پہنچا سکتا اور اس کی بدعمل بیوی کے لیے نقصان کا باعث نہیں ہو سکتی۔ عالمِ آخرت میں ہر ایک کو مرد ہو یا عورت اس کے اعمال کے متعلق جزاء یا سزا ملے گی۔

وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِیْنَ كَفَرُوا	اللہ نے ایک مثال دی ہے منکروں کے لیے، نوح کی بیوی اور
امْرَاَتَ نُوْحٍ وَّامْرَاَتَ لُوْطٍ كَانَتَا	لوط کی بیوی کی، یہ دونوں ہمارے نیک بندوں میں سے دو
تَحْتَ عَبْدَیْنِ مِنْ عِبَادِنَا صَالِحَیْنِ	نیک بندوں کے گھر میں تھیں۔ انھوں نے ان سے خیانت
فَخَانَتٰهُمَا فَلَمْ یُغْنِیَا عَنْهُمَا مِنَ اللّٰهِ شَیْئًا	کی اور اللہ سے انھیں کوئی چیز بچا نہ سکی اور حکم ہوا کہ چلی
وَّقِیْلَ ادْخُلَا النَّارَ مَعَ الدّٰخِلِیْنَ ○	جاؤ دوزخ میں جانے والوں کے ساتھ۔

(تحریم: ۱۰)

بیٹا بالغ ہو جانے کے بعد اپنے اعمال کا خود ذمہ دار ہوتا ہے۔ اس کے والدین کا ایمان و عمل نہ اسے نفع دے سکتا ہے، نہ نقصان پہنچا سکتا ہے اور نہ خود اس کا ایمان یا عمل والدین کے لیے نفع یا نقصان کا موجب ہو سکتا ہے۔ قرآنِ مجید کا ارشاد ہے:-

یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمْ وَاخْشَوْا یَوْمًا	لوگو! اپنے رب سے ڈرو اور اس دن سے ڈرو کہ نہ کوئی
لَّا یَجْزِیْ وَالِدٌ عَنْ وَّلَدِهٖ وَلَا مَوْلُوْدٌ هُوَ	باپ اپنے بیٹے کے بدلے کام آسکے نہ کوئی بیٹا اپنے باپ
جَازٍ عَنْ وَّالِدِهٖ شَیْئًا	(لقمان: ۳۳) کے بدلے کچھ بھی کام آئے۔

اس طرح آشکارا ہو گیا کہ ہر شخص انفرادی طور پر اللہ تعالیٰ کی بھیجی ہوئی وحی کے قبول کرنے کا ذمہ دار ہے یعنی ان عقائد اور مجموعۂ قوانین کا جو قرآن مجید میں آئے، خواہ اس کی کوئی صنف ہو، کوئی درجہ اور کوئی نسل ہو۔

اسلام کے بنیادی عقائد

جب کوئی آدمی کلمہ شہادت پڑھتا ہے یعنی "اشھد ان لا الٰہ الا اللہ و اشھد ان محمداً عبدہ و رسولہ" میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمدؐ اس کے بندے

اور رسول ہیں) تو وہ اسلامی عقائد اور مجموعہ قوانین کو زبان سے تسلیم کرتا ہے۔ ساتھ ہی یہ اقرار کرتا ہے کہ اُس کے دل میں ایمان موجود ہے۔ یہ گواہی دینا کہ خدا ایک ہے۔ اس پر ایمان کامل کا مظاہرہ ہے۔ اُسی نے دنیا کو پیدا کیا۔ وہی علم کا سرچشمہ ہے اور اُسی کی عبادت کی جاسکتی ہے۔ یہ گواہی دینا کہ محمد صلعم اللہ کے بندے اور رسول ہیں، فرشتوں، کتابوں، رسولوں اور حشر پر ایمان کے علاوہ یہ بھی واضح کرتا ہے کہ مجموعۂ قوانین کے اصول پر ایمان ہے۔ یہ شہادت اسلام کی کلید ہے اور شہادت دینے والا اسلام کے عقائد و ضوابط کے تابع آجاتا ہے۔ قرآن مجید کا ارشاد ہے۔

۱۔ اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ؕ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ ۟ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ ۟ وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا

(البقرہ ۲ : ۲۸۵)

اللہ کا رسول اس کلام پر ایمان رکھتا ہے جو اس پر وردگار کی طرف سے اُس پر نازل ہوا ہے اور جو لوگ دعوتِ حق پر ایمان لائے ہیں وہ بھی اس پر ایمان رکھتے ہیں۔ یہ سب اللہ اس کی کتابوں پر اور اُس کے رسولوں پر ایمان لائے ہیں (وہ کہتے ہیں) ہم اللہ کے رسولوں میں کوئی فرق نہیں کرتے اور انھوں نے کہا اے خدا ہم نے تیرا حکم سنا اور اطاعت کا سر جھکا دیا۔

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ

(البقرہ ۲ : ۱۷۷)

نیکی اور بھلائی کی راہ یہ نہیں کہ تم نے عبادت کے وقت اپنا منہ پورب کی طرف اور پچھم کی طرف کر لیا، نیکی اور بھلائی کی راہ تو ان لوگوں کی ہے جو اللہ پر آخرت کے دن پر، فرشتوں پر، آسمانی کتابوں پر اور خدا کے تمام نبیوں پر ایمان لاتے ہیں۔

ہمیں خدا کی ہستی اور اس کی یکتائی پر ایمان لانا چاہیے نیز اس پر کہ وہی کائنات کا خالق و مالک ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں، اس کا ہمسر نہیں اور کوئی عبادت کے لائق نہیں مگر اللہ تعالیٰ؛

۔ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۝ لَمْ يَلِدْ ۝ وَلَمْ يُوْلَدْ ۝ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۝ — تو کہہ وہ اللہ ایک ہے۔ اللہ بے نیاز ہے۔ نہ کسی کو جنا، نہ کسی سے جنا، اور اس کے جوڑ کا کوئی نہیں۔ (سورہ اخلاص)

۔ قُلْ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْغِيْ رَبًّا وَّهُوَ رَبُّ كُلِّ شَيْءٍ — تم ان لوگوں سے پوچھو کیا (تم یہ چاہتے ہو کہ) میں خدا کے سوا کوئی دوسرا پروردگار ڈھونڈوں حالانکہ وہی ہر چیز کا پروردگار ہے۔ (انعام: ۱۶۴)

۔ قُلْ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَتَّخِذُ وَلِيًّا فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ يُطْعِمُ وَلَا يُطْعَمُ — کہو کیا میں خدا کو چھوڑ کر جو آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے کسی دوسری ہستی کو کارساز بنالوں اور وہ سب کو روزی دیتا ہے لیکن کوئی نہیں جو اس کو روزی دینے والا ہو۔ (انعام: ۱۴)

ہمیں اُن تمام انبیاء و رسل پر ایمان لانا چاہیے جن کا ذکر قرآن مجید میں حضرت نوح سے رسول اللہ صلعم تک آچکا ہے۔ اللہ کی برکتیں ان پر نازل ہوں اور انھیں سلامتی ملے۔ اللہ تعالیٰ اپنے بعض بندوں کو چن لیتا ہے اور اپنی خاص تعلیم کے ذریعے سے انھیں تیار کرتا ہے کہ عالمِ انسانیت کے لیے اس کی طرف سے پیغمبر بن سکیں۔ ان میں سے بعض رسولوں کا ذکر قرآن مجید میں آچکا ہے اور دوسروں کا ذکر نہیں آیا۔ ہمیں ان سب پر ایمان رکھنا چاہیے۔

ہمیں فرشتوں پر بھی ایمان رکھنا چاہیے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی رسولوں تک پہنچاتے ہیں اسی طرح کتابوں پر ایمان ضروری ہے جو انسانیت کے لیے خدا کی طرف سے پیغاماتِ ہدایت ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے وضعِ قانون کے جو اصول مقرر فرمائے ہیں ان کی پابندی کرنی چاہیے۔ جس شے کو اللہ تعالیٰ نے حرام کیا اُسے حلال نہیں سمجھنا چاہیے۔ جسے حلال کیا اسے حرام نہیں قرار دینا چاہیے۔ مجموعۂ قوانین کے متعلق

اِن پیغامات میں جو کچھ ہے وہ اس لیے ہے کہ انسانی زندگی ایسے طریقے پر منظم ہو، جس کے مطابق انسانی ضرورتیں پوری ہو سکیں اور اللہ کے عدل و رحم کے مطابق عالم انسانی کی خوش حالی میں اضافہ ہوتا رہے، ہمیں ان پر بھی ایمان رکھنا چاہیے۔ ساتھ ہی یوم آخرت اور عالم عقبیٰ پر بھی ایمان ضروری ہے، وہی حقیقی زندگی ہوگی اور اُسی میں سزا و جزا ملے گی ضروری ہے کہ ہم اِن تمام حقائق پر ایمان رکھیں۔

جو شخص ان میں سے کسی ایک چیز کا انکار کرے اُسے مسلمان نہیں سمجھا جا سکتا۔ نہ اُسے اسلامی ضابطوں کے تابع قرار دیا جا سکتا ہے، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ جو شخص ان میں سے کسی ایک چیز پر ایمان نہیں رکھتا اسے اللہ تعالےٰ کی بارگاہ میں غیر مومن سمجھا جائے گا اور اس وجہ سے وہ دائمی لعنت کا مستوجب ہوگا۔ مطلب صرف یہ ہے کہ اسے مسلمان نہیں سمجھا جائے گا۔ اسلامی قانون کے مطابق اُسے اللہ تعالےٰ کی عبادت پر مجبور نہیں کیا جائے گا۔ اگر وہ ایسی چیزیں کرے جو اسلام میں ممنوع ہیں مثلاً شراب پیئے یا لحم خنزیر کھائے تو اسے روکا نہیں جا سکے گا۔ موت کے بعد نہ تو اسے مسلمان غسل دیں گے اور نہ نمازِ جنازہ پڑھیں گے

اس شخص کو البتہ غیر مومن سمجھا جائے گا جسے مذکورہ بالا اجزائے ایمان کی حقیقت بخوبی ذہن نشین کی جا چکی ہو، پھر بھی وہ اپنی ضد یا غرور یا دولت اور شان و شکوہ کی محبت یا کسی گروہ کی نکتہ چینی کے خوف سے ان سب کو یا بعض کو رد کر دے۔ اگر ایمان کے اجزا اُس کے سامنے پیش ہی نہیں ہوئے یا غیر مناسب طریقے پر پیش ہوئے یا صحیح اور درست طریقے پر پیش ہوئے، لیکن وہ انھیں پوری طرح سمجھ نہیں سکا یا اسے کچھ کچھ پتا بھی چلا، لیکن پوری طرح ذہن نشین کر لینے سے پیشتر وہ مر گیا تو ایسے شخص کو اللہ تعالےٰ کی بارگاہ میں غیر مومن نہیں سمجھا جائے گا اور وہ دائمی عذاب کا مستوجب نہیں ہوگا۔ قرآن کی رو سے صرف وہ شخص باز پرس کا مستحق سمجھا جائے گا جو ضد یا گھمنڈ کی بنا پر ایمان

ں لاتا، وہ دور! فتادہ لوگ جن تک اسلام ابھی پہنچ ہی نہیں سکا یا بری صورت میں پہنچا۔
لوگ کوشش کے باوجود ٹھیک ٹھیک نہ سمجھ سکے اُن سے محاسبہ نہیں ہوگا لیکن
ں مسلمان نہیں سمجھا جائے گا؛ اس لیے کہ انھوں نے کلمہ شہادت نہیں پڑھا اور تصدیق
کے ساتھ اشہد ان لا الہ الا اللہ .... نہیں کہا۔

اسلام اپنے عقائدِ حقہ کو قبول کر لینے کی دعوت دیتا ہے لیکن جبر قطعاً نہیں کرتا۔
لیے کہ جبر سے اُسے نفرت ہے۔ ایمان جبر کے ذریعے سے پیدا نہیں کیا جا سکتا۔
ایک شخص کو کسی بات پر مجبور کیا جائے گا تو صاف ظاہر ہے کہ اس طرح اس کے دل
ں سچا عقیدہ پیدا نہیں کیا جا سکے گا۔ قرآنِ مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

لَآ اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ	دین کے بارے میں کسی طرح کا جبر نہیں کیونکہ وہ دل کے اعتقاد سے تعلق
(بقرہ: ۲۵۶)	رکھتا ہے اور جبر و تشدد سے اعتقاد پیدا نہیں کیا جا سکتا۔
وَلَوْ شَآءَ رَبُّکَ لَاٰمَنَ مَنْ فِی	(اے پیغمبر!) اگر تیرا پروردگار چاہتا تو جتنے آدمی
الْاَرْضِ کُلُّھُمْ جَمِیْعًا اَفَاَنْتَ	روئے زمین پر ہیں سب ایمان لے آتے کیا تو ان پر
تُکْرِہُ النَّاسَ حَتّٰی یَکُوْنُوْا مُؤْمِنِیْنَ	جبر کرے گا کہ جب تک ایمان نہ لائیں چھوڑنے
(یونس: ۹۹)	والا نہیں!

محض یہی نہیں کہ اسلام کی تبلیغ کے سلسلے میں جبر کا استعمال جائز نہیں، بلکہ اسلام ایسے
ت کے ذریعے سے بھی ایمان کی طرف لوگوں کو نہیں لاتا جنھیں دیکھ کر انسان مبہوت
ں اور جن کا مدعا بظاہر یہ سمجھا جا سکتا ہو کہ سمجھنے سوچنے اور رائے کے آزادانہ استعمال
دیئے بغیر لوگوں کو متاثر کرنا منظور ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

اِنْ نَّشَاْ نُنَزِّلْ عَلَیْھِمْ مِّنَ السَّمَآءِ	اگر ہم چاہیں تو آسمان سے ایک نشانی ان پر اتار دیں
اٰیَۃً فَظَلَّتْ اَعْنَاقُھُمْ لَھَا خٰضِعِیْنَ ○	یہاں تک کہ ان کی گردنیں اس نشانی کے آگے جھکی
(شعرا: ۴)	کی جھکی رہ جائیں۔

غرض اسلام اپنے عقائد کے قبول اور ضوابط کی تسلیم کے سلسلے میں دعوت دیتے وقت ہر اس نظریے کو نظر انداز کر دیتا ہے جو زیادہ سے زیادہ وسعت فکر و نظر اور آزادی انتخاب کے مطابق نہ ہو۔ ہر شخص کو عقلی آزادی ہے کہ وہ بطیب خاطر اور حسنِ اعتقاد و خلوص کی بنا پر اسلام کو قبول کرے۔ اسی طرح اسلام اپنے معتقدات کی تائید پختہ شہادت اور کاملاً منطقی دلائل کی بنا پر کرتا ہے۔ اللہ تعالےٰ کی وحی کے لیے قرآنی شہادت ——— خدا کی یکتائی پر ایمان، فرشتوں پر ایمان، کتابوں پر ایمان، انبیا پر ایمان اور یوم آخرت پر ایمان کے متعلق خود قرآن ہے جو اللہ کا کلام ہے۔ اس بارے میں شبہ کی قطعاً گنجائش نہیں جیسا کہ ہم پہلے غور کر چکے ہیں۔ اس عقیدے کی دلیل یہ ہے کہ قرآن مجید میں جو کچھ بھی بیان ہوا ہے۔ وہ حقیقت اس لیے کہ ایک زندہ معجزہ ——— قرآن مجید ——— اس کا مؤید ہے اور یہ معجزہ برابر باقی رہے گا، ارشاد ہوتا ہے:-

وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ۝ بَلْ هُوَ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ ۭ وَمَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَآ اِلَّا الظّٰلِمُوْنَ۝ وَقَالُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيٰتٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ۭ قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ ۭ وَاِنَّمَآ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ۝ اَوَلَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَرَحْمَةً وَّذِكْرٰى لِقَوْمٍ

اور تو اس سے پہلے کوئی کتاب نہ پڑھتا تھا اور نہ اپنے داہنے ہاتھ سے لکھتا تھا، اس حالت میں بے شک یہ جھوٹے شبہے میں پڑ سکتے تھے، بلکہ یہ تو قرآن کی روشن آیتیں ہیں ان لوگوں کے سینے میں جنہیں سمجھ عطا ہوئی ہے اور ہماری نشانیوں سے انکار نہیں کرتے، مگر وہ لوگ بے انصاف ہیں اور کہتے ہیں کہ کیوں نہیں اتریں اللہ کی طرف سے اس پر کچھ نشانیاں، تو کہہ کہ نشانیاں تو اللہ کے اختیار میں ہیں اور میں تو بس کھول کر سنا دینے والا ہوں، کیا ان لوگوں کے لئے کافی نہیں کہ ہم نے تجھ پر کتاب اتاری جو ان پر پڑھی جاتی ہے، بے شک اس میں رحمت اور ذکر ہے ان لوگوں کے

يُؤْمِنُوْنَ ۝ (عنکبوت: ۴۸-۵۱) لئے جو ایمان والے ہیں۔

للہ پر ایمان اسلام میں اللہ پر ایمان کو بنیادی حیثیت حاصل ہے یعنی اُس کے وجود، یکتائی اور اُس کے کمال پر ایمان جن دلائل کی بنا پر قرآن لوگوں کی توجہ ایمان باللہ طرف مبذول کراتا ہے وہ عقلِ سلیم باطنی شعور اور وجدان پر مبنی ہیں۔

عقلی شہادت یہ ہے کہ اسلام لوگوں کو کائنات ——— زمین، آسمان طبعی قوانین ئنات کی ہم آہنگی اور وحدت وغیرہ ——— پر غور و فکر کی دعوت دیتا ہے اس طرح مان کے دل میں یہ شعور بیدار ہوتا ہے کہ کائنات کا خود بخود پیدا ہو جانا یا اس میں موجود الف یا متصادم قوتوں کے ذریعے پیدا ہونا یا عبث پیدا ہونا غیر ممکن ہے۔ کائنات خالقِ مطلق نے پیدا کی۔ اُس وقت سے پیدا ہوئی جو طبیعت سے وراء الورا ہے جو علم و حکمتِ مطلقہ بنا پر نظم اور رہنمائی کا کاروبار چلا رہی ہے۔ یہ کائنات خالقِ قدیر کی مشیت کے مطابق مقصد پورا کر رہی ہے۔ اس کا ایک مقصد یہ ہے کہ یہ سلسلہ انجام کار درہم برہم ہو جائے ور صرف عالم عقبیٰ باقی رہ جائے گا، جیسا کہ قرآنِ مجید میں ہمیں جا بجا بتایا گیا ہے۔

اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ ۝ وَاَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ ۝ وَاِذَا الْاَرْضُ مُدَّتْ ۝ وَاَلْقَتْ مَا فِيْهَا وَتَخَلَّتْ ۝ وَاَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ ۝ (سورۃ انشقاق: ۱-۵)	جب آسمان پھٹ جائے۔ اور اپنے رب کا حکم سن لے اور آسمان اسی لائق ہے، اور جب زمین پھیلا دی جائے اور باہر نکال دے جو کچھ اس میں ہے، اور خالی ہو جائے اور اپنے رب کا حکم سن لے اور وہ زمین اسی لائق ہے۔
اِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ ۝ وَاِذَا الْكَوَاكِبُ انْتَثَرَتْ ۝ وَاِذَا الْبِحَارُ فُجِّرَتْ ۝ وَاِذَا الْقُبُوْرُ بُعْثِرَتْ ۝ عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ وَاَخَّرَتْ ۝ (انفطار: ۱-۵)	جب آسمان چر جائے اور جب تارے جھڑ پڑیں اور جب دریا اُبل نکلیں۔ اور جب قبریں زیر و زبر کر دی جائیں۔ جان لے ہر ایک نفس جو کچھ کہ آگے بھیجا اور پیچھے چھوڑا۔
اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ ۝ وَاِذَا النُّجُوْمُ	جب سورج کی دھوپ لپیٹی جائے اور جب تارے میلے

انْكَدَرَتْ ۝ وَاِذَا الْجِبَالُ سُيِّرَتْ ۝	ہو جائیں اور جب پہاڑ چلائے جائیں۔ جب دس ماہ
وَاِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ ۝ وَاِذَا الْوُحُوْشُ	کی گابھن اونٹنیاں بیکار کھلی پھریں، جب وحشی جانور
حُشِرَتْ ۝ وَاِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ ۝	اکٹھے کیے جائیں جب دریا بھڑکائے جائیں جب
وَاِذَا النُّفُوْسُ زُوِّجَتْ ۝ وَاِذَا الْمَوْءٗدَةُ	نفوس کے جوڑے باندھے جائیں اور جب جیتے
سُئِلَتْ ۝ بِاَيِّ ذَنْۢبٍ قُتِلَتْ ۝ وَ	جی دفن کی ہوئی بیٹی کے بارے میں پوچھا جائے کہ کس
اِذَا الصُّحُفُ نُشِرَتْ ۝ وَاِذَا السَّمَآءُ	گناہ پر وہ ماری گئی اور جب اعمال نامے کھولے جائیں
كُشِطَتْ ۝ وَاِذَا الْجَحِيْمُ سُعِّرَتْ ۝	اور جب آسمان کا پوست اتار لیں اور جب دوزخ
وَاِذَا الْجَنَّةُ اُزْلِفَتْ ۝ عَلِمَتْ نَفْسٌ	دہکائی جائے اور جب بہشت پاس لائی جائے
مَّآ اَحْضَرَتْ ۝ (تکویر: ۱-۱۴)	جان لے گا ہر ایک نفس جو وہ لے کر آیا ہے۔

اس معقول شہادت کے ساتھ قرآن کے ذریعے سے ہمیں بتایا گیا ہے کہ یہ کائنات اصلاً کس طرف جا رہی ہے۔ اس آخری تباہی کی طرف جا رہی ہے، جو ہر شئے کو پیش آئے
قریباً ہر ایک سورت میں ہمیں عقلی استدلال کی بنا پر بتایا گیا ہے کہ کائنات کو اللہ ہی نے پیدا کیا اور اللہ ہی اس کا پروردگار ہے:۔

۱۔ اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ	بلاشبہ آسمان و زمین کے پیدا کرنے میں اور رات دن کے
وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ	ایک بعد ایک آتے رہنے میں اور جہاز میں جو انسانوں کی کار برآری
الَّتِيْ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ	کے لیے سمندر میں چلتا ہے اور برسات میں جسے اللہ آسمان
وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ	سے برساتا ہے اور اس کی آبیاری سے زمین جی اٹھتی
مِنْ مَّآءٍ فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ	ہے، اور اس بات میں کہ ہر قسم کے جانور زمین میں پھیلے
مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ	ہوئے ہیں اور ہواؤں کے مختلف رخ پھرنے میں اور
وَّتَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ وَالسَّحَابِ	بادلوں میں جو زمین و آسمان کے درمیان بندھے ہوئے
الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ	ہیں اور ان لوگوں کے لیے جو عقل رکھنے والے ہیں

لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ ۝	(اللہ کی ہستی اور یگانگی اور اس کے قوانینِ رحمت کی) بڑی
(سورۃ بقرہ: ۱۶۴)	ہی نشانیاں ہیں۔
وَفِی الْاَرْضِ قِطَعٌ مُّتَجٰوِرٰتٌ وَّ جَنّٰتٌ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّزَرْعٌ وَّ نَخِیْلٌ صِنْوَانٌ وَّغَیْرُ صِنْوَانٍ یُّسْقٰی بِمَآءٍ وَّاحِدٍ وَّنُفَضِّلُ بَعْضَهَا عَلٰی بَعْضٍ فِی الْاُكُلِ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ ۝	اور دیکھو زمین میں طرح طرح کے ٹکڑے ہیں ایک دوسرے سے ملے ہوئے ان میں انگور کے باغ ہیں کھیتیاں ہیں کھجور کے درخت ہیں، باہم دیگر ملتے جلتے ہوئے اور ایسے بھی جو ملتے جلتے ہوئے نہیں، سب ایک ہی پانی سے سیراب ہوتے ہیں مگر ہم بعض پھلوں کو بعض پر مزے میں برتری دے دیتے ہیں، یقیناً اس بات میں ان لوگوں کے لیے بڑی ہی نشانیاں ہیں جو عقل سے کام لیتے ہیں۔
(رعد: ۴)	
وَالسَّمَآءَ بَنَیْنٰهَا بِاَیْىدٍ وَّاِنَّا لَمُوْسِعُوْنَ ۝ وَالْاَرْضَ فَرَشْنٰهَا فَنِعْمَ الْمٰهِدُوْنَ ۝ وَمِنْ كُلِّ شَیْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَیْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ۝ (الذاریات: ۴۹)	اور ہم نے آسمان کو اپنے ہاتھ کے بل سے بنایا اور ہم کو سب مقدور ہے، اور ہم نے زمین کو بچھایا سو کیا خوب بچھانا جانتے ہیں ہم، اور ہم نے ہر چیز کے جوڑے بنائے تاکہ تم غور و فکر اور دھیان سے کام لو۔

یہ صرف چند مثالیں ہیں، اس قسم کی اور بھی بہت سی آیات ہیں جو اللہ تعالیٰ کی قوتِ تخلیق کے لیے عقلی شہادت بہم پہنچاتی ہیں۔

ایمان باللہ کے لیے وجدانی شہادت یعنی اس امر کا ثبوت کہ اللہ تعالےٰ کی ہستی کا اظہار اخفی شعور کر رہا ہے، قرآنِ مجید اس کی طرف توجہ دلاتے ہوئے اس اہم نفسیاتی حقیقت کو پیشِ نظر لاتا ہے کہ اللہ تعالےٰ کے خالقِ کائنات ہونے کا اعتراف ہماری فطرت کر رہی ہے اور جب انسان تمام توجہات سے الگ ہو جاتے ہیں اور ان کام کاج ختم ہو جاتا ہے یا کائنات کی ابتدا کا مسئلہ سامنے آتا ہے یا انھیں مشکلات و مصائب

سے سابقہ پڑتا ہے جن سے وہ خود عہدہ برآ نہیں ہو سکتے تو خدا ہی کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ قرآنِ مجید کی متعدد آیات میں ان حقائق کی توضیح کی گئی ہے:

۱۔ وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ لَيَقُولُنَّ خَلَقَهُنَّ الْعَزِيزُ الْعَلِيمُ ۝ (زخرف: ۹)

اور اگر تو ان سے پوچھے کس نے بنائے آسمان اور زمین تو کہیں۔ بنائے اُس زبردست اور خبردار اور علیم نے۔

۲۔ وَإِذَا أَنْعَمْنَا عَلَى الْإِنْسَانِ أَعْرَضَ وَنَأَىٰ بِجَانِبِهِ وَإِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ فَذُو دُعَاءٍ عَرِيضٍ ۝ (حم سجدۃ: ۵۱)

اور جب ہم نعمتیں بھیجیں انسان پر تو ٹل جائے اور موڑ لے اپنی کروٹ اور جب اُس کی برائی پہنچے تو لمبی چوڑی دعائیں کرے۔

۳۔ وَإِذَا غَشِيَهُمْ مَوْجٌ كَالظُّلَلِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ ۚ فَلَمَّا نَجَّاهُمْ إِلَى الْبَرِّ فَمِنْهُمْ مُقْتَصِدٌ ۚ وَمَا يَجْحَدُ بِآيَاتِنَا إِلَّا كُلُّ خَتَّارٍ كَفُورٍ ۝ (لقمان: ۳۲)

اور جب موج ان کے سر پر آئے جیسے بادل تو وہ پکارنے لگیں اللہ کو اخلاص کے ساتھ لیکن جب بچ جائیں خشکی کی طرف تو کوئی ہوتا ہے جو ان میں سے بیچ کی چال پر رہتا ہے اور ہماری نشانیوں سے منکر وہی لوگ ہوتے ہیں جو قول کے جھوٹے ہیں اور حق کو نہ ماننے والے۔

قرآنِ مجید اللہ تعالیٰ پر اس فطری ایمان کی تشریح فرعون کے احساسات کی شکل میں پیش کرتا ہے۔ جب وہ موت سے دوچار ہوا تھا اور بچ نکلنے کی کوئی راہ اس کے سامنے نہیں رہی تھی۔

وَجَاوَزْنَا بِبَنِي إِسْرَائِيلَ الْبَحْرَ فَأَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ وَجُنُودُهُ بَغْيًا وَعَدْوًا ۖ حَتَّىٰ إِذَا أَدْرَكَهُ الْغَرَقُ قَالَ آمَنْتُ أَنَّهُ لَا إِلٰهَ إِلَّا الَّذِي آمَنَتْ بِهِ بَنُو إِسْرَائِيلَ وَأَنَا مِنَ الْمُسْلِمِينَ ۝

پھر ایسا ہوا کہ ہم نے بنی اسرائیل کو سمندر کے پار اتار دیا۔ یہ دیکھ کر فرعون اور اس کے لشکر نے پیچھا کیا مقصود یہ تھا کہ ظلم و شرارت کریں لیکن جب حالت یہاں تک پہنچ گئی کہ فرعون سمندر میں غرق ہونے لگا تو اس وقت پکار اٹھا۔ میں یقین کرتا ہوں کہ اس ہستی کے سوا کوئی معبود

آٰلْئٰنَ وَقَدْ عَصَیْتَ قَبْلُ وَكُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِیْنَ○ فَالْیَوْمَ نُنَجِّیْكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُوْنَ لِمَنْ خَلْفَكَ اٰیَةً ؕ وَاِنَّ كَثِیْرًا مِّنَ النَّاسِ عَنْ اٰیٰتِنَا لَغٰفِلُوْنَ○ (یونس: ۹۰)

نہیں جس پر بنی اسرائیل ایمان رکھتے ہیں اور میں بھی اس کے فرمانبرداروں میں سے ہوں۔ (ہم نے کہا) ہاں اب تو ایمان (لایا) حالانکہ پہلے برابر نافرمانی کرتا رہا اور تو دنیا کے مفسد انسانوں میں سے ایک (بڑا ہی) مفسد انسان تھا پس آج ہم ایسا کریں گے کہ تیرے جسم کو (سمندر کی موجوں سے) بچالیں گے تاکہ ان لوگوں کے لیے جو تیرے بعد آنے والے ہیں (قدرتِ حق کی) ایک نشانی ہو۔

ظاہر ہے کہ اللہ پر ایمان کی تائید کے لیے عقلی شہادت بھی موجود ہے اور وجدانی بصیرت بھی۔ یہ ایسی چیزیں ہیں جو ہر انسان کو نصیب ہیں، بشرطیکہ وہ خدا کی نشانیوں سے بے پروا نہ ہو۔

کتاب میں خدا تعالے کے اسماء اور صفات کا بھی ذکر ہے، تمام صفات اس کی قدرت، حکمت اور کمال کے مظہر ہیں۔ بہت سے اسماء ایسے ہیں جن کا عربی زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ کرنا بہت مشکل ہے۔ مثلاً خدا یگانہ و یکتا ہے، وہ ازل سے ہے، وہ اوّل ہے اور آخر ہے، وہ رحمان و رحیم ہے، قدیر ہے، عزیز ہے، حکیم ہے، علیم و خالق ہے، وہ چیزوں کو نیست سے ہست میں شکل دینے والا اور درست کرنے والا ہے، وہ حافظ ہے، قادر و توانا ہے، سب پر حاوی ہے، ذی شان ہے، خود خدا نے اپنے اسماء یوں بیان کیے ہیں:-

هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ عٰلِمُ الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ ۚ هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ○ هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَیْمِنُ الْعَزِیْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ ؕ

وہ اللہ ہے جس کے سوا بندگی نہیں ہے کسی کی۔ وہ جانتا ہے جو پوشیدہ ہے اور جو ظاہر ہے۔ وہ ہے بڑا مہربان، رحم والا۔ وہ اللہ ہے جس کے سوا بندگی نہیں کسی کی، وہ بادشاہ ہے، پاک ذات ہے، سب عیبوں سے بری ہے۔ امان دینے والا، پناہ دینے والا

سُبْحَانَ اللّٰهِ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۝ هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْاَسْمَاءُ الْحُسْنٰى يُسَبِّحُ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝

زبردست، دباؤ والا، صاحب عظمت پاک ہے اللہ ان کے شریک بتلانے سے، وہ اللہ ہے بنانے والا نکال کھڑا کرنے والا صورت کھینچنے والا اسی کے ہیں سب نام جو اعلیٰ درجے کی خوبیوں اور کمالات پر دلالت کرتے ہیں۔ تسبیح کرتا ہے اُس کی جو کچھ ہے آسمانوں میں اور زمین میں اور وہی ہے زبردست حکمتوں والا۔

(الحشر: ۲۴)

یہ اسماء جو اللہ تعالیٰ کی برتری اور حاکمیت، رحم اور کمال کے مظہر ہیں۔ تمام ارباب عقل و دانش نے انھیں سچا مانا ہے، ان کا اطلاق درست تسلیم کیا ہے اور کائنات کی فطرت کو صحیح طور سے ذہن نشین کر لیا جائے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی صفات ہیں عقلمند آدمی اس حقیقت کا بھی اعتراف کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا ایسے اسماء و صفات کا اور کوئی اہل نہیں، اس لیے کہ سب مخلوق ہیں، حادث ہیں، محتاج ہیں اور ناقص ہیں اللہ تعالیٰ کے وجود کے متعلق قرآن مجید میں جو جامع نام استعمال کیا گیا ہے وہ اللہ ہے، یعنی خدائے لطیف و قدیر،

مسلمان ایسے ہی اسماء سے اللہ کو پکارتے ہیں اور ایسے ہی اسماء سے اُس کی عبادت کرتے ہیں۔ وہ خود فرماتا ہے:

وَلِلّٰهِ الْاَسْمَاءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا وَذَرُوا الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْٓ اَسْمَآئِهٖ سَيُجْزَوْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝

اور دیکھو، اللہ کے لیے حسن و خوبی والے نام (صفات) ہیں سو تم انہی ناموں سے پکارو اور جو لوگ اس کے ناموں میں کج اندیشیاں کرتے ہیں (ایسی صفتیں گھڑتے ہیں جو اس کے جمال و پاکی کے خلاف ہیں) تم انھیں ان کے حال پر چھوڑ دو۔ وہ وقت دور نہیں کہ اپنے کیے کا بدلہ پائیں گے۔

(اعراف: ۱۸۰)

مسلمان کے لیے ممنوع ہے کہ اللہ تعالیٰ کو کسی ایسے نام یا صفت سے پکارے

[illegible]س کا ذکر نہ تو کتاب اللہ میں آیا ہو اور نہ رسولوں نے وہ نام بتایا ہو۔

قادرِ مطلق کی تعریف کی جاسکتی ہے لیکن انسان اُس کا تصور نہیں کر سکتے۔ قرآن مجید [illegible]ب انسانوں کی رہنمائی ایمان باللہ کی طرف کرتا ہے تو اُس کا یہ مقصد بھی ہوتا ہے کہ اُس [illegible]تِ پاک کی کنہ اور حقیقت جاننے کی بے سود کوشش سے انھیں باز رکھے۔ قرآن [illegible]لہ تعالےٰ کی تخلیقی صلاحیتوں، نیز اُن سرگرمیوں کے اظہار پر زور دیتا ہے جن سے اس [illegible]صفات نمایاں ہوتی ہیں اور اُس کی قدرت و کمال کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ قرآن بتاتا ہے کہ اللہ تعالےٰ مخلوق کی تمام صفات سے بالا ہے۔ اُس کی صفات سب سے اُونچی [illegible]سب سے ارفع ہیں اور اُس کی کُنہ کو جاننے کی کوشش اور اُسے وحدت الوجود [illegible]یسے تصورات کی بنا پر پیش کرنے کی کوشش بالکل ناکام رہے گی۔ خدا خود فرماتا ہے:

ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ فَاعْبُدُوْهُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ ۝ لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ ۝ (انعام [illegible])	یہی خدا تمہارا پروردگار ہے۔ کوئی معبود نہیں مگر وہی تمام چیزوں کا پیدا کرنے والا ہے۔ سو دیکھو اس کی بندگی کرو۔ ہر چیز اس کے حوالے ہے۔ اسے نگاہیں نہیں پاسکتیں، لیکن وہ تمام نگاہوں کو پارہا ہے۔ وہ بڑا ہی باریک بیں اور آگاہ ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب اللہ تعالےٰ سے التجا کی کہ مجھے اپنے جمال کا نظارہ [illegible]یجئے تو جو صورتِ حال پیش آئی وہ اس کی ایک اچھی مثال ہے کہ انسان کے لئے اللہ تعالیٰ [illegible]مال دیکھنا غیر ممکن ہے:

وَوٰعَدْنَا مُوْسٰى ثَلٰثِيْنَ لَيْلَةً وَّاَتْمَمْنٰهَا بِعَشْرٍ فَتَمَّ مِيْقَاتُ رَبِّهٖٓ اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً ۚ وَقَالَ	اور ہم نے موسیٰ سے تیس راتوں (کے اعتکاف) کا وعدہ کیا تھا پھر دس راتیں بڑھا کر اسے پورا (چلہ) کر دیا۔ اس طرح پروردگار کے حضور آنے کی میعاد

مُوسٰی لِاَخِیْہِ هٰرُوْنَ اخْلُفْنِیْ	چالیس راتوں کی پوری میعاد ہو گئی۔ موسیٰ نے اپنے بھائی ہارون
فِیْ قَوْمِیْ وَاَصْلِحْ وَلَا تَتَّبِعْ سَبِیْلَ	سے کہا میں اعتکاف کے لیے پہاڑ پر جاتا ہوں، تم میرے بعد قوم
الْمُفْسِدِیْنَ ٥ وَلَمَّا جَآءَ مُوْسٰی	میں میرے جانشین بن کر رہو اور دیکھو سب کام درستگی سے کرنا
لِمِیْقَاتِنَا وَکَلَّمَهٗ رَبُّهٗ قَالَ رَبِّ	خرابی ڈالنے والوں کی راہ نہ چلنا اور جب موسیٰ آیا کہ مقررہ وقت
اَرِنِیْٓ اَنْظُرْ اِلَیْكَ قَالَ لَنْ	میں حاضری دے، اور اس کے پروردگار اس سے کلام کیا
تَرٰىنِیْ وَلٰكِنِ انْظُرْ اِلَى الْجَبَلِ	تو جوشِ طلب میں بے اختیار ہو کر پکار اٹھا پروردگار! مجھے اپنا
فَاِنِ اسْتَقَرَّ مَكَانَهٗ فَسَوْفَ	جمال دکھا کہ تیری طرف نگاہ کر سکوں، حکم ہوا تو مجھے نہ دیکھ سکےگا، ہاں
تَرٰىنِیْ فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ	اس پہاڑ کی طرف دیکھ اگر یہ تجلی حق کی تاب لے آیا اور اپنی جگہ ٹکا رہا تو
جَعَلَهٗ دَكًّا وَّخَرَّ مُوْسٰى صَعِقًا	سمجھ لیجیے تجھ میں میرے نظارے کی تاب ہے اور تو مجھے دیکھ سکےگا
فَلَمَّآ اَفَاقَ قَالَ سُبْحٰنَكَ	پھر اس کے پروردگار (کی قدرت) نے نمود کی تو پہاڑ ریزہ ریزہ کر دیا اور موسیٰ
تُبْتُ اِلَیْكَ وَاَنَا اَوَّلُ	غش کھا کر گر پڑا جب موسیٰ کو ہوش آیا تو بولا: اے خدا تیرے لیے ہر طرح
الْمُؤْمِنِیْنَ ٥	کی تقدیس ہو، میں اپنی جسارت سے تیرے حضور توبہ کرتا ہوں میں ان میں پہلا
(سورۃ الاعراف ۱۴۲-۱۴۳)	شخص ہوں گا جو اس حقیقت پر یقین رکھتے ہیں۔

قرآنِ مجید کی اِن آیات سے واضح ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالےٰ کی تعریف کی جا سکتی ہے، اُس کی صفات جزواً جانی جا سکتی ہیں، لیکن انسان اُس کی ذات کا تصور نہیں کر سکتا۔

ایمان باللہ کے اسلامی عقیدے کے متعلق ایک آخری نقطہ بھی واضح کر دینا چاہیے۔ اسلام شرک کو ہر شکل میں رد کرتا ہے اللہ ایک ہے۔ قرآن اُن لوگوں کو سرزنش کرتا ہے جو دو یا تین خداؤں کو مانتے ہیں یا اس کی مخلوقات میں سے کسی چیز کی پرستش کرتے ہیں، مثلاً سورج، چاند یا بُت بنا کر پوجتے ہیں۔ قرآن ان مشرکوں کو بار بار دعوت دیتا ہے کہ وہ خدا کی یگانگی کے متعلق بے شمار شہادتوں پر غور کریں۔

۱۔ لَوْ كَانَ فِیْهِمَآ اٰلِهَةٌ — اگر آسمان و زمین میں اللہ کے سوا کوئی اور بھی معبود ہوتا تو ممکن نہ

اِذًا لَّذَهَبَ كُلُّ اِلٰهٍ بِمَا خَلَقَ ... (انبیاء: ۲۲)	تھا کہ ان کا کارخانہ اس نظم و ہم آہنگی سے چلتا، وہ یقیناً بگڑ کر برباد ہو جاتے
مَا اتَّخَذَ اللّٰهُ مِنْ وَّلَدٍ وَّمَا كَانَ مَعَهٗ مِنْ اِلٰهٍ اِذًا لَّذَهَبَ كُلُّ اِلٰهٍۢ بِمَا خَلَقَ وَلَعَلَا بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۭ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوْنَ (مؤمنون: ۹۱)	نہ تو اللہ نے کسی ہستی کو اپنا بیٹا بنایا، نہ اس کے ساتھ کوئی دوسرا معبود ہو سکتا ہے۔ اگر ہوتا تو ہر معبود اپنی ہی مخلوق کی فکر میں رہتا اور ایک معبود دوسرے معبود پر چڑھ دوڑتا۔ اللہ کی ذات ان باتوں سے پاک ہے جو یہ اس کی نسبت بیان کرتے ہیں۔
قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَاۗءٍۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـــًٔـا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ (آل عمران: ۶۴)	(اے پیغمبر) کہہ دو کہ اے اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) اس بات کی طرف آؤ (اختلاف و نزاع کی باتیں چھوڑ کر) جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں طور پر مسلّم ہے، یعنی اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں، کسی کی ہستی کو اس کا شریک نہ ٹھہرائیں ہم میں سے کوئی انسان دوسرے انسان کے ساتھ ایسا برتاؤ نہ کرے گویا خدا کو چھوڑ کر اسے پروردگار بنالیا ہے۔
اِنِّىْ وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِيْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ (انعام: ۷۹)	میں نے ہر طرف سے منہ موڑ کر صرف اسی ہستی کی طرف اپنا رخ کر لیا ہے جو آسمانوں اور زمین کی بنانے والی ہے اور ان میں سے نہیں جو اس کے ساتھ شریک ٹھہرانے والے ہیں۔

ان آیات سے واضح ہے کہ اسلام نے شرک یا تثلیث یا بت پرستی کو بے تامل رد کیا اور صرف ایک کی پرستش پر زور دیا۔

فرشتوں پر ایمان

جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں، اسلام کا پہلا بنیادی عقیدہ اللہ پر ایمان اور دوسرا بنیادی عقیدہ فرشتوں پر ایمان ہے۔ کتاب اللہ میں فرشتوں کو ایسی مخلوق قرار دیا گیا ہے جو ماورائے طبعی ہے۔ ہمیں بتایا گیا ہے، اُن کی حقیقی فطرت ایسی ہے کہ وہ مادی دنیا میں عموماً نہیں آتے، البتہ خدا کا حکم ہوتا ہے تو آتے ہیں۔ قرآن کہتا

ہے:

وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ ۝ لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ ۝ (انبیاء: ۲۶-۲۷)

اور انھوں نے کہا: خدائے رحمٰن نے اپنے لئے اولاد بنا لی ہے۔ پاک ہے وہ اس سے بلکہ (یہ جنھیں اس کی اولاد بتاتے ہیں) وہ اس کے معزز بندے ہیں۔ وہ اس کے آگے بڑھ کر بات نہیں کر سکتے اور اس کے حکم پر سرتاسر کاربند رہتے ہیں۔

فرشتوں کے وظائف کا تعلق ارواح سے ہے۔ اِن میں سے بعض وظیفے جن ذریعے سے انھوں نے خدا کے احکام اور اُس کی مشیّت پوری کی، قرآن مجید میں آچکے بعض فرشتے اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی یا احکام اور پیغامات اُس کے رسولوں اور نبیوں تک پہنچاتے ہیں:

وَاِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ ۝ عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ ۝ (شعراء: ۱۹۲-۱۹۴)

اور یہ قرآن ہے اتارا ہوا پروردگارِ عالم کا، اسے لے کر اترا ہے فرشتہ معتبر تیرے دل پر کہ تو ڈر سنانے والا ہو۔

دوسرے فرشتے انبیاء کرام کی بھی حمایت کرتے ہیں اور مومنوں کو بھی راہِ حق و صداقت پر ثابت قدم رکھتے ہیں:

۱۔ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ (البقرہ: ۲۵۳)

اور ہم نے مریم کے بیٹے عیسیٰ کو روشن دلیلیں عطا فرمائیں اور روح القدس کی تائید سے سرفراز کیا (جبریل علیہ السلام)

۲۔ اِذْ يُوْحِيْ رَبُّكَ اِلَى الْمَلٰٓئِكَةِ اَنِّيْ مَعَكُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سَاُلْقِيْ فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ (انفال: ۱۲)

(اے پیغمبر!) یہ وہ وقت تھا کہ تیرے پروردگار نے فرشتوں پر وحی کی تھی: میں تمھارے ساتھ ہوں پس مومنوں کو استوار رکھو عنقریب ایسا ہو گا کہ میں کافروں کے دلوں میں دہشت ڈال دوں گا۔

ایسے فرشتے بھی ہیں جو فریضۂ تبلیغ ادا کرتے ہیں وہ سچائی اور خیر کی تبلیغ کرتے ہیں اور مومنوں کو دائمی بہشت کی خوشخبری سنا کر ان کی حوصلہ افزائی کرتے رہتے ہیں:

اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِیْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ نَحْنُ اَوْلِیٰٓؤُكُمْ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَفِی الْاٰخِرَةِ وَلَكُمْ فِیْهَا مَا تَشْتَهِیْٓ اَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِیْهَا مَا تَدَّعُوْنَ (حم سجدہ: ۳۰-۳۱)	تحقیق جنھوں نے کہا رب ہمارا اللہ ہے پھر اسی پر قائم رہے۔ ان پر اترتے ہیں فرشتے کہ تم مت ڈرو اور نہ غم کھاؤ اور خوش خبری سنو اس بہشت کی جس کا تم سے وعدہ تھا۔ ہم ہیں تمھارے رفیق دنیا میں اور آخرت میں اور تمھارے لیے وہاں ہے جو جو چاہے جی تمھارا اور تمھارے لئے وہاں ہے جو جو چاہو مانگو۔

بعض موت کے فرشتے ہیں:

قُلْ یَتَوَفّٰىكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِیْ وُكِّلَ بِكُمْ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ تُرْجَعُوْنَ ٥ (سجدہ: ۱۱)	تو کہہ قبض کر لیتا ہے تم کو موت کا فرشتہ جو تم پر مقرر ہے، بعد میں اپنے رب کی طرف پھر جاؤ گے۔
الَّذِیْنَ تَتَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ طَیِّبِیْنَ یَقُوْلُوْنَ سَلٰمٌ عَلَیْكُمُ ادْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ٥ (نحل: ۳۲)	وہ (متقی) لوگ جن کی روح فرشتے اس حال میں قبض کرتے ہیں کہ وہ دل کے اطمینان اور ایمان کے یقین کی وجہ سے خوش حال ہوتے ہیں، فرشتے انھیں کہتے ہیں تم پر سلامتی ہو جنت میں داخل ہو جاؤ یہ نتیجہ ہے ان کاموں کا جو تم کرتے رہے ہو۔
اِنَّ الَّذِیْنَ تَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِیْٓ اَنْفُسِهِمْ قَالُوْا فِیْمَ كُنْتُمْ قَالُوْا كُنَّا مُسْتَضْعَفِیْنَ فِی الْاَرْضِ قَالُوْٓا اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا	جو لوگ (دشمنوں کے ساتھ رہ کر) اپنے ہاتھوں اپنا نقصان کر رہے ہیں ان کی روح قبض کرنے کے بعد فرشتے ان سے پوچھیں گے: "تم کس حال میں تھے؟" وہ جواب میں کہیں گے، ہم کیا کرتے ہم ملک میں دبے ہوئے اور بے بس

فِيهَا فَأُولَٰئِكَ مَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ ۖ وَسَاءَتْ مَصِيرًا ۝ تھے؟ اس پر فرشتے کہیں گے کیا خدا کی زمین وسیع نہ تھی کہ کسی دوسری جگہ ہجرت کر کے چلے جاتے۔ غرض یہ وہ لوگ ہیں جن کا ٹھکانا دوزخ (النساء: ۹۷) ہوا اور (دوزخ) کیا ہی بُری جگہ ہے۔

فرشتوں کے ایسے گروہ بھی ہیں جو انسانوں کے اعمال لکھتے ہیں، اور یہ دستاویزیں یوں کے لیے محفوظ رکھی جا رہی ہیں:

وَإِنَّ عَلَيْكُمْ لَحَافِظِينَ ۝ كِرَامًا كَاتِبِينَ ۝ يَعْلَمُونَ مَا تَفْعَلُونَ ۝ (انفطار: ۱۰-۱۲) اور تم پر نگہبان مقرر ہیں، عزت والے عمل لکھنے والے جانتے ہیں جو کچھ تم کرتے ہو۔

یہ چند وظیفے فرشتوں کے دوسرے وظیفوں کی طرح طبیعت سے وراء الورائی ہیں

قرآن فرشتوں کو پروں والے اور قوت والے پیغام رساں بتاتا ہے:

۱۔ اَللّٰهُ يَصْطَفِي مِنَ الْمَلَائِكَةِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ ۚ (الحج: ۷۵) اللہ نے فرشتوں میں سے بعض کو پیام رسانی کے لیے برگزیدہ کر لیا اسی طرح بعض انسانوں کو بھی۔

۲۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ جَاعِلِ الْمَلَائِكَةِ رُسُلًا أُولِي أَجْنِحَةٍ مَّثْنَىٰ وَثُلَاثَ وَرُبَاعَ ۚ يَزِيدُ فِي الْخَلْقِ مَا يَشَاءُ ۚ إِنَّ اللّٰهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝ (فاطر: ۱) سب خوبی اللہ کو ہے جس نے بنا نکالے آسمان اور زمین جس نے ٹھہرایا فرشتوں کو پیغام رساں جن کے پر ہیں دو دو، تین تین، چار چار بے شک اللہ جو چاہے پیدائش میں بڑھا دیتا ہے، بے شک اللہ ہر چیز کر سکتا ہے۔

جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے قرآنِ مجید اسلام کا بنیادی سرچشمہ ہے، لہٰذا فرشتوں کے متعلق ایمان قرآن مجید کی قطعی آیات کے مطابق ہونا چاہیئے اور ان حقائق کے لیے جو طبیعت سے بالاتر ہیں اور کوئی سرچشمہ معلومات نہیں۔

طبیعت سے بالاتر مخلوق کی ایک قسم وہ ہے جسے "جن" کہتے ہیں، قرآن مجید مختلف طریقوں سے جنوں اور فرشتوں کا فرق واضح کر دیا ہے۔ جنوں کا ذکر کرتے ہو

قرآن نے کئی مرتبہ بیان کیا ہے کہ وہ آگ سے پیدا کئے گئے:

وَالْجَانَّ خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ مِنْ	اور ہم جنوں کو اس سے پہلے جلتی ہوئی ہوا کی گرمی
نَّارِ السَّمُوْمِ ○ الحجر : ۲۷	پیدا کر چکے تھے۔

بعض جن نیک ہوتے ہیں اور بعض شریر۔ قرآنِ مجید خود جنوں کی زبان سے بیان کرتا ہے:

وَاَنَّا مِنَّا الْمُسْلِمُوْنَ وَمِنَّا الْقٰسِطُوْنَ	کچھ ہم میں خدا کے حکم بردار ہیں اور کچھ بے انصاف ہیں
فَمَنْ اَسْلَمَ فَاُولٰٓئِكَ تَحَرَّوْا رَشَدًا	سو جو لوگ حکم میں آ گئے تو وہی بھلائی کا قصد کرتے
وَاَمَّا الْقٰسِطُوْنَ فَكَانُوْا لِجَهَنَّمَ	ہیں اور جو بے انصاف ہیں وہ دوزخ کے ایندھن
حَطَبًا ○ (سورۃ الجن: ۱۴-۱۵)	ہوئے۔

جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں، فرشتے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے نبیوں اور رسولوں کو پیغام پہنچاتے ہیں، لیکن جنوں کو بھی انسانوں ہی کی طرح نبیوں کے ذریعے دعوت پہنچائی جاتی ہے:

وَاِذْ صَرَفْنَآ اِلَيْكَ نَفَرًا مِّنَ	اور جس وقت متوجہ کر دئے ہم نے تیری طرف کتنے
الْجِنِّ يَسْتَمِعُوْنَ الْقُرْاٰنَ ۚ فَلَمَّا	لوگ جنوں میں سے سننے لگے قرآن، پھر جب وہاں
حَضَرُوْهُ قَالُوْٓا اَنْصِتُوْا ۚ فَلَمَّا	پہنچ گئے بولے چپ رہو، پھر جب ختم ہوا الٹے پھرے
قُضِيَ وَلَّوْا اِلٰى قَوْمِهِمْ مُّنْذِرِيْنَ ○	اپنی قوم کی طرف ڈر سناتے ہوئے، انھوں نے کہا
قَالُوْا يٰقَوْمَنَآ اِنَّا سَمِعْنَا كِتٰبًا	ہماری قوم موسیٰ کے بعد جو ایک کتاب اتری ہے ہم
اُنْزِلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰى مُصَدِّقًا	نے سنی وہ تمام پہلی نازل شدہ کتابوں کی تصدیق
لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ يَهْدِيْٓ اِلَى الْحَقِّ	کرتی ہے، سچا دین اور سیدھی راہ سمجھاتی ہے۔
وَاِلٰى طَرِيْقٍ مُّسْتَقِيْمٍ ○ يٰقَوْمَنَآ	اے ہماری قوم اللہ کی طرف بلانے والے کی دعوت
اَجِيْبُوْا دَاعِيَ اللّٰهِ وَاٰمِنُوْا	قبول کرو اور اس پر ایمان لاؤ تاکہ تمہارے گناہ

بہ یَغۡفِرۡ لَکُمۡ مِّنۡ ذُنُوۡبِکُمۡ وَ یُجِرۡکُمۡ مِّنۡ عَذَابٍ اَلِیۡمٍ ۝ — اللہ بخشے اور تمھیں دردناک عذاب سے نجات دے۔ (احقاف: ۲۹-۳۱)

جن بھی اسلامی تعلیمات کے سننے اور اُن پر ایمان لانے کے سلسلے میں انسانوں کی ذمہ داری میں شریک ہیں۔ حساب کے دن اللہ تعالٰے جنوں اور انسانوں دونوں کو بلائے گا اور دونوں کی ذمہ داری یکساں ہوگی:

وَ یَوۡمَ یَحۡشُرُہُمۡ جَمِیۡعًا ۚ یٰمَعۡشَرَ الۡجِنِّ قَدِ اسۡتَکۡثَرۡتُمۡ مِّنَ الۡاِنۡسِ ۚ وَ قَالَ اَوۡلِیٰٓؤُہُمۡ مِّنَ الۡاِنۡسِ رَبَّنَا اسۡتَمۡتَعَ بَعۡضُنَا بِبَعۡضٍ وَّ بَلَغۡنَاۤ اَجَلَنَا الَّذِیۡۤ اَجَّلۡتَ لَنَا ؕ قَالَ النَّارُ مَثۡوٰىکُمۡ خٰلِدِیۡنَ فِیۡہَاۤ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰہُ ؕ اِنَّ رَبَّکَ حَکِیۡمٌ عَلِیۡمٌ ۝ (سورۃ الانعام آیہ: ۱۲۸)

اور دیکھو اُس دن کیا ہوگا جب خدا ان سب کو اپنے حضور جمع کرے گا اور فرمائے گا کہ اے گروہ جن تم نے تو انسانوں سے بڑی تعداد اپنے ساتھ لے لی اور انسانوں میں سے جو لوگ اُن کے ساتھ رہے کہیں گے ہم ایک دوسرے سے گمراہی کے کاموں میں فائدہ اٹھاتے رہے اور بالآخر میعاد کی اس منزل تک پہنچ گئے جو تو نے ہمارے لیے ٹھہرادی تھی خدا کہے گا کہ تمھارا ٹھکانا آتش دوزخ ہے اس میں ہمیشہ رہوگے لیکن صرف ان کے جنھیں ہم نجات دینا چاہیں (اے پیغمبر!) بلاشبہ تمھارا پروردگار حکمت والا اور سب کچھ جاننے والا ہے۔

لیکن فرشتے انسانوں کے ساتھ ایسی کسی ذمہ داری میں شریک نہیں۔

قرآنِ مجید کی متعدد آیات میں یہ واضح کردیا گیا ہے کہ فرشتوں میں تمام روحانی نیکیاں موجود ہیں اور انسانوں کی کوتاہیاں ان میں قطعاً نہیں، لیکن جنوں کو بعض اوقات وسوسہ انداز اور اشتعال دلانے والا بھی کہا گیا ہے۔ یہ برائیاں انسانوں میں پائی جاتی ہیں۔

روح کے متعلق قرآنِ مجید میں بہت تھوڑا ذکر ہے:

وَ اِذۡ قَالَ رَبُّکَ لِلۡمَلٰٓئِکَۃِ اِنِّیۡ — اور جب تیرے پروردگار نے فرشتوں سے کہا تھا میں

خَالِقٌ بَشَرًا مِّنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ۝ فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَ نَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ ۝ (سورۃ الحجر: ۲۸-۲۹)

خمیر اٹھے ہوئے گارے سے جو سوکھ کر بجنے لگتا ہے ایک بشر پیدا کرنے والا ہوں تو جب ایسا ہو کہ میں اسے درست کردوں اور اس میں اپنی روح پھونک دوں تو چاہیئے تم سب اس کے آگے سربسجود ہو جاؤ۔

ایک اور مقام پر فرمایا۔

فَلَوْلَآ اِذَا بَلَغَتِ الْحُلْقُوْمَ ۝ وَاَنْتُمْ حِيْنَئِذٍ تَنْظُرُوْنَ ۝ (واقعہ: ۸۳-۸۴)

پھر کیوں نہیں جس وقت جان پہنچے حلق کو اور تم اس وقت دیکھ رہے ہو۔

ان آیات سے جو نتیجہ نکالا جا سکتا ہے یہ ہے کہ روح زندگی کا سرچشمہ ہے۔ یہ وجود کی وہ زندہ قوت ہے جس کے بغیر وہ مردہ ہو جاتا ہے۔ باقی رہا روح کی فطرت و طبیعت کا معاملہ تو قرآن اس باب میں کچھ نہیں کہتا، لیکن آیاتِ قرآنی میں اس ماوراے طبعی روح کی تلاش ممنوع قرار نہیں دی گئی خواہ تلاش و تحقیقات کا کوئی نتیجہ نکلے یا نہ نکلے۔ قرآنِ مجید میں ہے:

وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ ؕ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا ۝ (بنی اسرائیل: ۸۵)

اور (اے پیغمبر!) یہ لوگ تجھ سے روح کے بارے میں سوال کرتے ہیں تو کہہ دے روح میرے پروردگار کے حکم سے ہے اور تمہیں اسرار کائنات کا جو کچھ دیا گیا ہے وہ بہت تھوڑا ہے۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ روح کو اللہ تعالٰے نے اپنی طرف منسوب کر لیا اور انسانی قلب اس حقیقت کو سمجھ نہیں سکتا جو طبیعت سے بہت بلند ہے روح کے متعلق سائنس نے بہت تحقیقات کیں، لیکن جن لوگوں نے اس مسئلے کی چھان بین میں وقت صرف کیا وہ ابھی تک اسے ٹھیک سمجھ نہیں سکے۔

موت کے بعد روح کے متعلق قرآنِ مجید یا احادیث میں اس کے سوا کچھ نہیں بتایا

گیا کہ روح زندہ رہتی ہے، خواہ وہ امن و راحت میں رہے یا تکلیف و عذاب میں چنانچہ قرآنِ مجید میں بتایا گیا ہے:

وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا بَلْ اَحْيَاۗءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ فَرِحِيْنَ بِمَآ اٰتٰىھُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ (اٰل عمران: ۱۶۹-۱۷۰)

(اے پیغمبر!) جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل ہوئے ہیں ان کی نسبت ایسا خیال نہ کرنا کہ وہ مر گئے، نہیں وہ زندہ ہیں اور اپنے پروردگار کے حضور روزی پا رہے ہیں اللہ نے اپنے فضل و کرم سے جو کچھ انہیں عطا فرمایا ہے اس سے خوش ہیں۔

رسولوں پر ایمان

فرشتوں پر ایمان درحقیقت بلند ترین درجہ ہے۔ جو انسان کو ایمان کے سیدھے راستے پر لگا دیتا ہے۔ رسولوں پر ایمان کسی فوق وجود پر ایمان نہیں۔ اس لئے کہ رسول انسان ہوتے ہیں اور ان کی فطرت ویسی ہی ہوتی ہے جیسی کہ دوسرے ہم جنسوں کی ہوتی ہے۔ ان میں دوسرے انسانوں سے کا صرف یہ پہلو ہوتا ہے کہ خدا انہیں رسالت کے لیے چن لیتا ہے، وہ فرشتوں کے ذریعہ سے وحی وصول کرنے کے حق دار بن جاتے ہیں، تاکہ اس وحی کا اعلان انسانوں میں کریں اور احکام کے مطابق عمل کا راستہ دکھائیں، خدا کی طرف سے منتخب ہونے کے باعث وہ الٰہی پیغامات وصول کرنے کے سلسلے میں ہر غلطی اور خطا سے محفوظ ہو جاتے ہیں ساتھ ہی ان کی انسانی فطرت اور ان کے اوصاف و محاسن ایسے ہوتے ہیں کہ لوگ ان کے کہنے پر کان دھرتے ہیں اور ان کے اعمال کی پیروی کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ فَسْـَٔلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ وَمَا جَعَلْنٰهُمْ

(اے پیغمبر!) ہم نے تجھ سے پہلے کوئی پیغمبر نہیں بھیجا مگر اس طرح کہ وہ آدمی تھے ان پر ہماری وحی اترتی تھی پھر (اے گروہ منکرین) اگر تمہیں یہ بات معلوم نہیں تو ان لوگوں سے معلوم کر لو جو اہل کتاب ہیں (یہودی عالم) اور

جَسَدًا لَّا يَأْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَمَا كَانُوْا خٰلِدِيْنَ ○
(سورہ الانبیاء: ۸)

اور ہم نے پیغمبروں کو کبھی ایسے جسم کا نہیں بنایا کہ کھانا نہ کھاتے ہوں اور نہ وہ ہمیشہ زندہ رہنے والے ہی تھے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ اللہ تعالےٰ ہر زمانے میں اپنے پیغاماتِ ہدایت پیغمبروں کے ذریعے سے بھیجتا رہا تاکہ انسانوں کو نیک عملی اور خیر کی راہ پر پکا کر دے۔ جب سے اس کائنات کی صبحِ اوّل طلوع ہوئی مشیّتِ الٰہی کا تقاضا یہ ہوا کہ انسانوں کے لئے ہدایت کا سامان فراہم کر دے تاکہ وہ روحانی اعتبار سے ترقی جاری رکھیں۔ ہر آدمی اپنے روزانہ معاملات کا انتظام ایسے طریق پر کرلے کہ زندگی کا ہر سانس عقل و دانش کے ساتھ اور صحیح اصول کے مطابق گزار سکے۔ قرآنِ مجید میں ہے۔

وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ
(فاطر: ۲۴)

اور انسان کا کوئی گروہ ایسا نہیں جس میں کوئی نہ کوئی ڈر سنانے والا نہیں آچکا۔

اس طرح ہدایت کے پیغامات بار بار آتے رہے ان کا صرف ایک مقصد و مدعا تھا اور وہ یہ کہ انسان کی رہنمائی درجہ کمال کی طرف ہوتی رہے ہر عہد کے لئے ایک خاص پیغام تھا اور ہر نسل کو ہدایت کے الفاظ سننے کا موقع ملا۔ ان تمام پیغامات میں صرف ایک اصول کی تعلیم دی گئی:

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ
(شوریٰ: ۱۳)

تمھارے لئے دین کی وہی راہ ڈال دی جس کا حکم کیا تھا نوحؑ کو اور جس کا حکم بھیجا ہم نے تیری طرف اور جس کا حکم کیا ہم نے ابراہیمؑ کو اور موسیٰؑ کو اور عیسیٰؑ کو اور یہ کہ قائم رکھو دین کو اور اختلاف نہ ڈالو اس میں۔

رسول اللہ صلعم نے آسمانی پیغاماتِ ہدایت کی وحدت بڑے عمدہ طریق پر واضح فرمادی

جب ارشاد فرمایا کہ تمام انبیاء ایک عمارت کے بنانے میں لگے ہوئے تھے، ابتدائی دور کے انبیاء نے بنیادیں استوار کیں اور بعد کے انبیاء نے اصل عمارت کھڑی کی۔ قرآن کا حکم عالم انسانیت کو یہ ہے کہ تمام انبیاء پر ایمان لایا جائے، نیز اُن کتابوں پر ایمان لایا جائے جو پیغمبروں پر نازل ہوئیں۔ ارشاد ہوتا ہے:

۱۔ قُوْلُوْا اٰمَنَّا بِاللّٰہِ وَمَا اُنْزِلَ اِلٰی اِبْرٰھِیْمَ وَاِسْمٰعِیْلَ وَاِسْحٰقَ وَیَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَا اُوْتِیَ مُوْسٰی وَعِیْسٰی وَمَا اُوْتِیَ النَّبِیُّوْنَ مِنْ رَّبِّھِمْ لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْھُمْ وَنَحْنُ لَہٗ مُسْلِمُوْنَ ؇ (سورۂ بقرہ: ۱۳۶)	مسلمانو! تم کہو ہمارا طریقہ تو یہ ہے کہ ہم اللہ پر ایمان لائے ہیں قرآن پر ایمان لائے ہیں جو ہم پر نازل ہوا ہے ان تمام تعلیموں پر ایمان لائے ہیں جو ابراہیم کو اسماعیل کو، اسحاق کو یعقوب کو اور اولادِ یعقوب کو دی گئیں نیز ان کتابوں پر جو موسیٰ اور عیسیٰ کو دی گئیں اور ان تمام تعلیموں پر بھی ایمان رکھتے ہیں جو دنیا کے تمام نبیوں کو ان کے پروردگار سے ملی ہیں ہم ان میں فرق نہیں کرتے اور ہم خدا کے فرمانبردار ہیں۔
۲۔ وَالَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِکَ وَبِالْاٰخِرَۃِ ھُمْ یُوْقِنُوْنَ ؇ (بقرہ: ۴)	اور وہ لوگ جو اس سچائی پر ایمان رکھتے ہیں کہ تم پر (پیغمبر اسلام پر) نازل ہوئی اور ان تمام سچائیوں پر جو تم سے پہلے نازل ہو چکی ہیں اور آخرت کی زندگی کے لئے بھی ان کے اندر یقین ہے۔

جو لوگ بعض انبیائے کرام کو مانتے اور دوسروں کو رد کرتے ہیں، انھیں سزا ملے گی۔ قرآن مجید کا ارشاد ہے:

۳۔ اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْفُرُوْنَ بِاللّٰہِ وَرُسُلِہٖ وَیُرِیْدُوْنَ اَنْ یُّفَرِّقُوْا بَیْنَ اللّٰہِ وَرُسُلِہٖ وَیَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّنَکْفُرُ بِبَعْضٍ	جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں سے برگشتہ ہیں اور چاہتے ہیں اللہ اور اس کے رسولوں میں (تصدیق کے لحاظ سے) تفرقہ کریں اور کہتے ہیں ہم ان میں سے بعض کو مانتے ہیں اور بعض کو نہیں مانتے اور اس طرح چاہتے ہیں کہ ایمان

وَيُرِيدُونَ اَنْ يَّتَّخِذُوا بَيْنَ ذٰلِكَ	اور کفر کے درمیان کوئی (تیسری) راہ اختیار کرلیں
سَبِيْلًا ۝ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ	تو ایسے لوگ یقیناً کافر ہیں اور کافروں کے لیے
حَقًّا ۚ وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا	ہم نے ذلت دینے والا عذاب تیار کر رکھا ہے۔
مُّهِيْنًا ۝ (النساء: ۱۵۰-۱۵۱)	

اس کے برعکس جو لوگ تمام انبیا پر ایمان رکھتے ہیں انھیں نیک بدلہ ملے گا:

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ	اور جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے
وَلَمْ يُفَرِّقُوْا بَيْنَ اَحَدٍ	اور ان میں سے کسی ایک کو بھی دوسروں سے جدا نہیں
مِّنْهُمْ اُولٰٓئِكَ سَوْفَ	کیا (کسی ایک سے بھی انکار نہیں کیا)، تو بلاشبہ ایسے
يُؤْتِيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ ۚ وَكَانَ	ہی لوگ ہیں کہ عنقریب ہم انھیں ان کے اجر عطا فرمائیں گے
اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝ (النساء: ۱۵۲)	اور اللہ بخشنے والا رحمت رکھنے والا ہے۔

رسول اللہ صلعم کے پیغام ہدایت میں تمام سابقہ پیغامات ہدایت کے اصول شامل ہیں جو انسانوں کے لیے منزلِ کمال کی طرف رہنمائی کرتے ہیں اور انہیں مادی و روحانی ترقی کی راہ پر چلاتے ہیں۔ اسلام نے عالم انسانیت کو یہ تعلیم دی کہ رسول اللہ صلعم آخری نبی اور آخری رسول تھے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں واضح کر دیا گیا ہے:

۱۔ مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ	محمد تمہارے مردوں میں سے کسی کا باپ نہیں
وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ ۗ	لیکن وہ اللہ کا رسول ہے اور مہر سب نبیوں
وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا ۝	پر اور اللہ سب چیزوں کا جاننے والا
(الاحزاب: ۴۰)	ہے۔
۲۔ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ	آج کے دن میں نے تمہارے لئے تمہارا دین
عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ	کامل کر دیا اور اپنی نعمت تم پر پوری کر دی اور
دِيْنًا ۭ (المائدۃ: ۳)	تمہارے لئے پسند کر لیا کہ دین "الاسلام" ہو۔

رسول اللہ صلعم کا پیغام ہدایت یا "اسلام" پوری انسانیت کے لیے ہے جو دنیا بھر میں
ہوئی ہے، خواہ اس کا تعلق کسی دور سے ہو اور خواہ اس کا رنگ، نسل، قومیت کچھ ہو:

قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا - (اعراف: ۱۵۸)

(اے پیغمبر!) کہو: اے افرادِ نسلِ انسانی! میں تم سب کی طرف خدا کا بھیجا ہوا آیا ہوں۔

رسول اللہ صلعم سے پیشتر جو پیغمبر گزرے ان کے پیغامات اس لحاظ سے رسول اللہ کے پیغام سے مختلف تھے کہ ان پیغمبروں کی تعلیم ان کی قوم یا قبیلے تک محدود تھی۔

۱۔ لَقَدْ أَرْسَلْنَا نُوحًا إِلَىٰ قَوْمِهِ فَقَالَ يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُم مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُ ۔ (اعراف: ۵۹)

یہ واقعہ ہے کہ ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف (تبلیغ حق کے لیے) بھیجا تھا۔ اس نے کہا: اے برادری قوم کے لوگو! اللہ ہی کی بندگی کرو۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں

۲۔ وَإِلَىٰ عَادٍ أَخَاهُمْ هُودًا (اعراف: ۶۵)

اور قوم عاد کی طرف اس کے بھائی بندوں میں سے ہود کو بھیجا۔

۳۔ وَإِلَىٰ ثَمُودَ أَخَاهُمْ صَالِحًا (اعراف: ۷۳)

اور قوم ثمود کی طرف اس کے بھائی بندوں میں سے صالح کو بھیجا۔

اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے سلسلے میں قرآن مجید بتاتا ہے:

قَالَ كَذَٰلِكِ اللَّهُ يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ ۚ إِذَا قَضَىٰ أَمْرًا فَإِنَّمَا يَقُولُ لَهُ كُن فَيَكُونُ ۝ وَيُعَلِّمُهُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرَاةَ وَالْإِنجِيلَ ۝ وَرَسُولًا إِلَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ ۔ (آل عمران: ۴۷، ۴۹)

ارشاد الٰہی ہوا: اسی طرح اللہ جو کچھ چاہتا ہے پیدا کر دیتا ہے وہ جب کسی کام کا فیصلہ کر لیتا ہے تو حکم دیتا ہے کہ ہو جا اور جیسا کچھ اس نے چاہا تھا، ویسا ہی ظہور میں آجاتا ہے اور (اے مریم!) اللہ اس (ہونے والے لڑکے یعنی عیسیٰ) کو کتاب اور حکمت کا علم عطا فرمائے گا نیز تورات اور انجیل کا اور اسے بنی اسرائیل کی طرف بحیثیت رسول کے بھیجے گا

اس طرح یہ حقیقت بھی واضح ہوگئی کہ آخری نبی محمد رسول اللہ صلعم جو پیغام لے کر

نے تھے، اس اعتبار سے یگانہ تھا کہ وہ پورے عالم انسانیت کے لیے تھا۔

یہ حقیقت بھی اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہیے، قرآن کے مطابق پیغمبروں کا وظیفہ محدود ہے یعنی یہ کہ جو وحی اُن پر اُتری اس کے مطابق لوگوں کو چلنے کی تلقین کریں اور اس کے مطابق علم و تربیت دیں پیغمبر انتہائی عزت و احترام کے مستحق ہیں اس لیے کہ انھیں انسانوں کی روحانی و تعلیمی قیادت کا اختیار دے دیا جاتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود انھیں لوگوں کے عقائد و قلوب پر کوئی اختیار حاصل نہیں۔ جو لوگ ایمان نہیں لاتے، اُن کے لیے انبیاء ذمہ دار نہیں۔ انھیں یہ اختیار حاصل نہیں کہ اپنے لیے کوئی خاص فائدہ حاصل کرلیں اور دوسرے انسانوں کو سزا دے سکیں۔ اللہ تعالٰے فرماتا ہے:

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ وَكِيْلًا ۝	اور ہم نے تجھے ان لوگوں پر پاسبان بنا کر
(بنی اسرائیل: ۵۴)	نہیں بھیجا۔
وَكَذَّبَ بِهٖ قَوْمُكَ وَهُوَ الْحَقُّ ۭ قُلْ لَّسْتُ عَلَيْكُمْ بِوَكِيْلٍ ۝	اور (اے پیغمبر!) تیری قوم نے اسے جھٹلایا ہے حالانکہ وہ حق ہے۔ تو کہہ دے کہ (جھٹلاتے ہو تو جھٹلاؤ)
(انعام: ۶۶)	میں تم پر کچھ نگہبان نہیں ہوں۔
قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَاۗءَ اللّٰهُ ۝	(اے پیغمبر!) کہہ دے: میرا حال تو یہ ہے کہ خود اپنی جان کا نفع نقصان بھی اپنے قبضے میں نہیں رکھتا وہی
(اعراف: ۱۸۸)	ہو کر رہتا ہے جو خدا چاہتا ہے۔

رسول انسان ہوتے ہیں۔ قرآن اس امر پر خاص زور دیتا ہے کہ بے شک انھیں خدا کی طرف سے وحی کے ذریعے پیغامات ملتے ہیں لیکن اس وجہ سے نہ اُن کی انسانی فطرت بدلتی ہے اور نہ وہ فوق الفطرت وجود بن جاتے ہیں۔ رسالت کے لیے ان کا انتخاب بے شک و شبہ بہت بڑا اعزاز ہے۔ تاہم وہ بدستور انسان رہتے ہیں۔ ان کی معصومیت صرف اس حد تک ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ مذہبی امور میں انھیں خطا و نسیان سے محفوظ کر دیتا ہے۔ قرآن مجید

کا ارشاد ہے :

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا ۝

(اے پیغمبر!) کہہ دے: میں تو اس کے سوا کچھ نہیں کہ تمھارے ہی جیسا آدمی ہوں۔ البتہ اللہ نے پر وحی کی ہے کہ تمھارا معبود وہی ایک ہے اس کے کوئی نہیں پس جو کوئی اپنے پروردگار سے ملنے آرزو رکھتا ہے چاہیے کہ اچھے کام انجام دے اور اپنے کی ہستی میں کسی دوسرے کو شریک نہ کرے۔

(کہف : ۱۱۰)

اللہ تعالےٰ کی طرف سے پیغام پہنچانے کے سوا انبیاء کرام ہر لحاظ سے انسان اور دوسرے انسانوں کی طرح ان سے بھی صحیح اور درست عمل کی طرح خطا کا امکان تھا سے واضح ہوتا ہے کہ اللہ تعالےٰ نے بعض امور کے سلسلے میں رسول اللہ صلعم کو تنبیہ جیسا کہ سورۂ عبس سے واضح ہوتا ہے۔ رسول اللہ صلعم بت پرستوں کو اسلام کی تبلیغ و تلقین نہایت اہم کام میں مصروف تھے اور اس کے سلسلے میں مسلمانوں کے متعلق ہیں ذمہ سے توجہ تھوڑی دیر کے لیے ہٹانی پڑی تھی[1] ـــــ ہم یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ عبادت اللہ تعالےٰ کے لیے مخصوص ہے۔ کسی فرشتے یا انسان کو قطعاً حق حاصل نہیں کہ اپنی کرائے۔ حساب کے دن کوئی انسان کسی کی مدد نہیں کر سکتا اور نہ اپنے یا کسی دوسرے گناہ بخشوا سکتا ہے۔ سزا و جزا صرف اللہ کے اختیار میں ہے جس طرح فرشتے یا جنّ کی عبا جائز نہیں اسی طرح کسی تعلیم یافتہ مومن یا دینی رہنما کی عبادت بھی جائز نہیں خواہ وہ کتنا ہی

[1] اصل معاملہ یوں تھا کہ رسول اللہ صلعم کسی بت پرست سردار کو تلقین فرما رہے تھے۔ اس حالت میں ابن ام تشریف لائے جو آنکھوں سے معذور تھے۔ انھیں یقیناً معلوم نہ تھا کہ رسول اللہ صلعم کس کام مشغول ہیں انھوں نے آپ سے چاہا۔ بدیہی طور پر سابقہ گفتگو میں مداخلت کی اور ادب گفتگو کو ملحوظ نہ رکھا۔ اغلب ہے رسول اللہ صلعم کو مناسب نظر نہ چونکہ موقع و محل ایسا تھا جس سے دیکھنے والوں پر اثر پڑ سکتا تھا۔ کہ ایک سردار سے گفتگو کو ترجیح دی گئی اور ایک غریب پردیسی توجہ نہ فرمائی گئی لہٰذا تنبیہ ضروری ہو گئی۔

ندپایہ کیوں نہ ہو۔ اسلام میں ایسے اولیاء کا کوئی وجود نہیں جو قوتِ شفاعت کے مالک ہوں اور
ن کی پوجا کی جائے ۔ اسلام میں لفظِ اولیاء کے معنی یہ ہیں کہ برابر اللہ تعالیٰ کا حکم ماننے والے
راسے دوست رکھنے والے قرآنِ مجید کے رُو سے اُنھیں کوئی امتیاز حاصل نہیں جس
بناپر وہ فوق الفطرت صلاحیت کے مالک بن جائیں یا شفاعت کرسکیں یا کسی کے گناہ
شوا سکیں۔ اللہ تعالیٰ کا حکم مسلسل ماننے والے یا اُسے دوست رکھنے والے سچے مومن
ن جو رسولوں کی پیروی اُسی طرح کرتے ہیں جس طرح اللہ تعالیٰ نے اُن کے لیے احکام
در کیے ہیں، وہ خدا کے حکموں کے مطابق چلتے ہیں اور جن باتوں سے اُنھیں روکا گیا اُن
سے پرہیز کرتے ہیں بعض لوگ غیر مسلم اثرات کے ماتحت کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے رسول
لے علاوہ بھی اپنے ممتاز بندوں کو یہ اختیار دے رکھا ہے کہ اُس کی کائنات پر حکم چلائیں
لوگوں کی التجائیں سن کر انھیں پورا کریں ۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ایسے بزرگ وفات پائیں
ان کے عالی شان مقبرے بنوانے چاہئیں، جن کے گنبد اونچے ہوں اور اُن میں رات
لے وقت روشنی ہوتی رہے ۔ لوگوں کو چاہیے کہ اُن سے برکات حاصل کرتے رہیں، اُنھیں
رانے دیں اور اُن کے سامنے جھکیں اس قسم کی گمراہیاں بعض مسلمانوں کے درمیان
ر دوسری مذہبی جماعتوں کے درمیان پھیل گئی ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ کے دین میں اور اس کے
م پیغاماتِ ہدایت میں اس قسم کی گمراہیوں کو رد کر دیا گیا ہے ۔

تابوں پر ایمان

اللہ تعالیٰ نے جو کتابیں نازل کیں اُنھیں ماننا اور ان پر ایمان لانا فرشتوں اور رسولوں پر ایمان کا منطقی نتیجہ ہے ۔ اللہ تعالیٰ کے
غاماتِ ہدایت اُس کی کتابوں کے سوا کیا ہیں جن میں سچے عقائد اور قوانین کے بنیادی اصول
ضع کیے گئے ہیں ؟ یہی اصول ہیں جن کی بنا پر انسان مطلوب اور ممنوع اعمال میں فرق کر
سکتے ہیں۔ اسلام عالمِ انسانیت کو دعوت دیتا ہے کہ اس کی اُتاری ہوئی تمام کتابوں پر ایمان
یا جائے جو مختلف رسولوں کے ذریعے سے سامنے آئیں ۔ مثلاً حضرت ابراہیم علیہ السلام

کے صحیفے ،حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تورات ،حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی انجیل اور
صلعم کا قرآن ۔جو شخص ان میں سے کسی ایک کتاب کا بھی انکار کرتا ہے وہ اسلامی نقطۂ
سے مومن نہیں سمجھا جا سکتا۔

یہ بھی واضح ہے کہ اگر رسول اللہ صلعم آخری نبی ہیں تو قرآنِ مجید بھی آخری کتاب ۔
جیسا کہ ہر عالمِ قرآن جانتا ہے ۔اس کتابِ الٰہی میں بنیادی عقائد ،عبادت کے بنیادی
انسانوں کے باہمی معاملات اور اخلاقی مقاصد بیان کیے گیے ہیں ۔قرآن نے معاملات
متعلق ضوابط و قوانین کی تفصیلات نہیں بیان کیں البتہ وہ عام اصول پیش کر دیے
جو انسانوں کو ہم آہنگی کی زندگی اور درجۂ کمال کی طرف لے جا سکتے ہیں ۔ہم آہنگی سے
مراد یہ ہے کہ انسان کی جسمانی ضرورتوں اور روحانی خواہشوں میں یکجہتی پیدا ہو جائے
طرح انسان اور کائنات کے درمیان ،مختلف افراد کے درمیان جس معاشرے میں
رہتا ہے اُس کے درمیان ،یکجہتی کی روح کارفرما رہتی ہے ،قرآنِ مجید نے ہم آہنگی پید
کرنے کے جو ذریعے بتائے ہیں وہ ایمان ،انصاف اور فطرتِ انسانی کے حکیما
پر مبنی ہیں :۔

قرآنِ مجید کا یہ وظیفہ نہیں کہ کائنات کے حقائق یا اس کے اسرار کی تفصیلات وا
کرے یا بتائے کہ کائنات کے لیے عالمِ انسانیت کی خدمت کے مفید طریقے کیا
ہیں ۔البتہ قرآنِ مجید انسانوں سے بار بار کہتا ہے کہ وہ اپنی توجہات اور صلاحیتوں
کام لے کر کائنات کے حقائق سمجھیں ،اس کے اسرار ذہن نشین کریں اور اس کے عجیب
مظاہر سے فائدہ اٹھائیں ۔قرآن مجید نے انسان کے لیے ہر اس پیشے میں اپنا دل ا
اپنی قوتیں صرف کرنے کے طریقے واضح کر دیے ہیں جسے وہ اختیار کرتا ہے ،ساتھ
بتا دیا ہے کہ اپنا علم بڑھاؤ اور اللہ تعالٰی پر ایمان کو مضبوط کرو ۔قرآن افراد و جماعت
کی بہبودی کا درس دیتا ہے اور انسانوں کے درمیان عدل قائم کرتا ہے ۔اس کی

صرف بنیادی عقائد اور وضع قانون کے بنیادی اصول تک محدود ہے، یہ پابندی سراسر حکمت پر مبنی ہے اور اس لیے ضروری ہے کہ انسانوں کو ایمان اور اللہ تعالیٰ کی رضاجوئی کی طرف لے جانے کا اور کوئی ذریعہ نہیں۔

یومِ آخرت پر ایمان

اسلام میں ایمان کا پانچواں شعبہ ——— یعنی اللہ، اُس کے فرشتوں، اُس کے رسولوں اور اُس کی اُتاری ہوئی کتابوں پر ایمان کے بعد ——— یومِ آخرت پر ایمان ہے۔ یہ یومِ آخرت یا یومِ حشر یا یوم الدین انسان کا انجام یعنی تخلیق کا آخری باب ہے قرآنِ مجید کا ارشاد ہے۔

وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى ○	اور یہ کہ آدمی کو وہی ملتا ہے جو اس نے کمایا
وَاَنَّ سَعْيَهٗ سَوْفَ يُرٰى ○ ثُمَّ	اور یہ کہ اُس کی کمائی اس کو دکھانی ضروری ہے
يُجْزٰىهُ الْجَزَآءَ الْاَوْفٰى ○	پھر اس کو پورا پورا بدلہ ملنا ہے اس
(النجم: ۳۹-۴۱)	کا۔

حساب کے دن انسان سے جو سلوک ہوگا، یعنی اُس کو جزا ملے گی یا سزا، راحت حاصل ہوگی یا رنج یہ سب کچھ دنیا میں اُس کے اعمال پر موقوف ہے۔ دوسری دنیا انسان کے کیے ہوئے اعمال کے حساب اور فیصلے کی دنیا ہے۔

يَوْمَ نَدْعُوْا كُلَّ اُنَاسٍۭ بِاِمَامِهِمْ ۚ فَمَنْ	وہ دن جب کہ ہم تمام انسانوں کو ان کے پیشواؤں کے
اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِيَمِيْنِهٖ فَاُولٰٓئِكَ يَقْرَءُوْنَ	ساتھ بلائیں گے پھر جو کوئی اپنا اعمال نامہ داہنے ہاتھ
كِتٰبَهُمْ وَلَا يُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا ○	میں پائے گا، وہ اُن لوگوں میں ہوگا جو اپنا نامہ پڑھ
وَمَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ	لیں گے، اور اُن پر رائی برابر بھی زیادتی نہ ہوگی اور
فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى وَاَضَلُّ سَبِيْلًا ○	جو کوئی اس دنیا میں اندھا رہا تو یقین کرو آخرت میں
(بنی اسرائیل: ۷۱-۷۲)	بھی اندھا رہے گا اور راستے سے بہت دور بھٹکا ہوا۔

اس سے ظاہر ہے کہ آخرت کے دن حساب کتاب کا عقیدہ انسان کے لیے

اس دنیا میں ترقی اور کمال حاصل کرنے کا زبردست ترین محرک ہے یعنی وہ اس جذبے کے ماتحت اچھے کام کرتا ہے کہ اللہ تعالٰی کی بارگاہ میں درجہ وقبول پائے اور دوسری دنیا میں اس کے ساتھ اچھا برتاؤ ہو۔

قرآنِ مجید نے متعدد مقامات پر جزا / وسزا کا ذکر کیا ہے جن سے دوسری دنیا میں انسانوں کو سابقہ پڑے گا۔ اگرچہ اس میں عام طور پر ایسے ہی جملے استعمال کیے ہیں جیسے انسان روزمرہ کی زندگی میں استعمال کرتے ہیں لیکن دینِ اسلام کے ماخذ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ دوسری دنیا کی زندگی بالکل نئی زندگی ہوگی اور ناموں کے سوا اس دنیا کی زندگی سے بالکل مختلف ہوگی:

وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ ۝ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝ ذَوَاتَآ اَفْنَانٍ ۝ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝ فِیْهِمَا عَیْنٰنِ تَجْرِیٰنِ ۝ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝ فِیْهِمَا مِنْ كُلِّ فَاكِهَةٍ زَوْجٰنِ ۝ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝ مُتَّكِـِٕیْنَ عَلٰی فُرُشٍۭ بَطَآىِٕنُهَا مِنْ اِسْتَبْرَقٍؕ وَجَنَا الْجَنَّتَیْنِ دَانٍ ۝ (رحمٰن: ۴۶: ۵۴)	اور جو کوئی اپنے رب کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرا اس کے لیے دو باغ ہیں، پھر کیا کیا نعمتیں اپنے رب کی جھٹلاؤ گے، جن میں بہت سی شاخیں ہیں پھر کیا کیا نعمتیں اپنے رب کی جھٹلاؤ گے ان دونوں میں دو چشمے بہتے ہیں پھر کیا کیا نعمتیں اپنے رب کی جھٹلاؤ گے ان دونوں میں ہر میوہ قسم قسم کا ہوگا، پھر کیا کیا نعمتیں اپنے رب کی جھٹلاؤ گے۔ تکیہ لگائے بیٹھے ہوں گے، بچھونوں پر جن کے استر بافتے کے ہوں گے اور میوہ اُن باغوں کا جھک رہا ہوگا۔

دوسری دنیا کے عذاب کے متعلق قرآن مجید بتاتا ہے:

۱۔ یُعْرَفُ الْمُجْرِمُوْنَ بِسِیْمٰهُمْ فَیُؤْخَذُ بِالنَّوَاصِیْ وَالْاَقْدَامِ ۝ (الرحمٰن: ۴۱)	گنہ گار اپنے چہرے سے پہچانے جائیں گے، پھر پکڑے جائیں گے پیشانی کے بالوں سے اور پاؤں سے۔

۲۔ وَعُقْبَی الْکٰفِرِیْنَ النَّارُ ٥ (رعد: ۳۵)　　اور کافروں کا انجام آگ ہے۔

۳۔ اِنَّ جَھَنَّمَ لَمَوْعِدُھُمْ اَجْمَعِیْنَ ٥ (الحجر: ۴۳)　　اور ان سب (جو راہ سے بھٹک گئے) کے لیے جہنم کے عذاب کا وعدہ ہے۔

اسی طرح قرآنِ مجید نے بہت سے مقامات پر دوسری دنیا کی راحت و عذاب کا ذکر ایسے طریق پر کیا ہے جو انسانوں میں یہ جذبہ پیدا کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے پیغامات ہدایت پر ایمان رکھیں اور قرآن مجید نے معاملات کے جو اصول مقرر کیے ہیں ان کے مطابق کاربند رہیں۔

عالمِ عقبیٰ کی برکتوں اور رحمتوں کے دائمی ہونے کے متعلق مسلمان کے عقیدے کی پختگی میں نہ کبھی خلل آیا ہے اور نہ کبھی کوئی شک پیدا ہوا ہے۔ اُسے علم ہے کہ جو لوگ وحدت کے ساتھ ایمان سے گریزاں ہیں، وہ سزا پائیں گے، اس لیے کہ اُن کا طرزِ عمل فطرتِ انسانی کے خلاف ہے۔ قرآن کے بیان کے مطابق اُنھیں دائمی عذاب کی سزا ملے گی۔ قرآنِ مجید میں کہیں بھی واضح طور پر بیان نہیں ہوا کہ دوزخ ابدی ہے یا نہیں، لیکن بہشت اور اس کی برکات کو وضاحت سے ابدی بتایا گیا ہے۔ یوم حساب اور عالمِ عقبیٰ کے عقیدے کے متعلق تمام معاملات میں انسان کا قلب قرآن کی محکم آیات اور رسول اللہ صلعم کے ارشادات کے تابع ہے۔

بس یہ اسلام کے بنیادی عقیدے ہیں یعنی اللہ تعالیٰ کی وحدت پر ایمان، فرشتوں پر ایمان، رسولوں پر ایمان، اللہ تعالیٰ کی نازل کی ہوئی کتابوں پر ایمان، اور یوم آخرت یا یوم حساب پر ایمان۔ اسلام کے مطابق یہ عقائد ہر الہامی مذہب کی بنیاد ہیں اور جو مذہب ان عقائد سے خالی ہیں وہ سچے نہیں ہو سکتے۔ اللہ تعالیٰ اُن لوگوں کو رد کرتا ہے جو ایمان نہیں لاتے اور جو مشرک ہیں یعنی جو اللہ پر اس کے فرشتوں پر اس کے رسولوں پر، اُس کی کتابوں پر اور یوم آخرت پر ایمان نہیں لاتے۔ اُنھیں دعوت

دی گئی ہے کہ وہ اسلام قبول کریں فکرونظر کی منطقی حیثیت کا تقاضا بھی یہی ہے اور انسا[illegible] وجدان کی شہادت بھی اس کے سوا کچھ نہیں۔ انسان کے لیے ان عقائد کو قبول کرنا ال[illegible] کی طرف سے لازم ہے۔ اُس پاک ذات نے اپنی رحمت اور شفقت سے اپنے بن[illegible] کو روئے زمین پر اشرفیت کا درجہ دے دیا۔ وہ خدا کا خلیفہ یا نائب قرار پایا تاکہ زمین[illegible] طبعی وسائل کو ترقی دے، انھیں استعمال کرے تاکہ اللہ تعالیٰ کی تخلیق کے عجائبات [illegible] کے ذہن نشیں ہو سکیں۔ اس طرح اُس کا ایمان پختہ ہو جائے اور وہ روحانی و مادی [illegible] سے مستفید ہو:

۱۔ هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُم مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا (بقرۃ : ۲۹)

اور یہ اسی (پروردگار) کی کارفرمائی ہے کہ اس نے زمین کی ساری چیزیں تمھارے لیے پیدا کیں۔

۲۔ أَلَمْ تَرَوْا أَنَّ اللَّهَ سَخَّرَ لَكُم مَّا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ وَأَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهُ ظَاهِرَةً وَبَاطِنَةً (لقمان : ۲۰)

کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے آسم[illegible] وزمین تمھارے کام میں لگا رکھے، اور پوری کر دیں تم پر اپنی نعمتیں کھلی اور چھپی۔

۳۔ اللَّهُ الَّذِي سَخَّرَ لَكُمُ الْبَحْرَ لِتَجْرِيَ الْفُلْكُ فِيهِ بِأَمْرِهِ وَلِتَبْتَغُوا مِن فَضْلِهِ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ○ وَسَخَّرَ لَكُم مَّا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا مِّنْهُ ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ ○ (الجاثیہ : ۱۲-۱۳)

اللہ وہ ہے جس نے تمھارے بس میں کر دیا سمندر کو کہ چلیں اُس میں جہاز اُس کے حکم سے تاکہ تلاش کرو اس کے فضل سے اور تاکہ تم شکر ادا کرو اور آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے وہ سب بھی اپنی طرف سے تمھارے کام میں لگا دیا۔ اس بیان لوگوں کے واسطے نشانیاں ہیں جو غور و فکر کرتے ہیں۔

قرآنِ مجید نے بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایک فطرت کے ساتھ

یا جو کبھی تو اُسے اچھائیوں کے انتخاب کی طرف رہنمائی کرتی ہے اور کبھی اسے برائیوں کی طرف لے جاتی ہے، نیک اعمال اُس کے لیے راحت اور جماعتی بہبود کا باعث ہوتے ہیں اور وہ اللہ تعالےٰ کی بارگاہ میں مقبول ہو جاتا ہے، بُرے اعمال اُس کے لیے رنج و ناخوشی کا باعث ہوتے ہیں۔ اس کی دنیاوی زندگی برباد ہو جاتی ہے اور آنے والی زندگی میں وہ ملعون قرار پاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

أَلَمْ نَجْعَل لَّهُ عَيْنَيْنِ ۝ وَلِسَانًا	بھلا ہم نے اُسے (انسان کو) دو آنکھیں نہیں دیں
وَشَفَتَيْنِ ۝ وَهَدَيْنَاهُ النَّجْدَيْنِ ۝	زبان اور دو ہونٹ نہیں دیے اور دکھا دیے اس
فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ ۝ وَمَا	کو دو راستے، سو وہ دھک نہ سکا گھاٹی پر اور تو
أَدْرَاكَ مَا الْعَقَبَةُ ۝ فَكُّ	کیا سمجھا کیا ہے وہ گھاٹی۔ چھڑانا گردن کا غلام
رَقَبَةٍ ۝ أَوْ إِطْعَامٌ فِي يَوْمٍ	آزاد کرانا یا کھلا بھوک کے دن میں یتیم کو جو
ذِي مَسْغَبَةٍ ۝ يَتِيمًا ذَا مَقْرَبَةٍ	قرابت والا ہے یا محتاج کو خاک میں رُل رہا ہے،
أَوْ مِسْكِينًا ذَا مَتْرَبَةٍ ۝ ثُمَّ كَانَ	پھر ہوئے ایمان والوں میں جو تاکید کرتے ہیں
مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا وَتَوَاصَوْا	آپس میں تحمل کی اور تاکید
بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ ۝	کرتے ہیں رحم
(سورۃ البلد: ۸-۱۷)	کھانے کی۔

اللہ تعالےٰ کے تمام پیغامات اور الہامات کا مقصد و مدّعا یہ ہے کہ انسانوں کے ...ل رجحانات کو تقویت پہنچے اور وہ اپنی زندگی میں درجۂ کمال حاصل کر لیں۔ اس طرح اُن ...ی آئندہ زندگی کے لیے بنیاد استوار ہو جائے گی۔ اسلام بتاتا ہے کہ ہر انسان کو نیک ...مال کے ذریعے سے راحت کا راستہ چن لینا چاہیے اور وہ برائی کا مرتکب ہوگا تو رنج و سزا کے راستے پر لگ جائے گا۔ اسلام نے ہر فرد کو ذمہ دار قرار دیا ہے۔ پھر اس لحاظ سے اُن میں کوئی فرق نہیں کیا۔ سب کے یکساں حقوق اور یکساں ذمہ داریاں ہیں خواہ اُن کا

تعلق کسی صنف، کسی نسل یا کسی رنگ سے ہو۔ مبارک ہیں وہ لوگ جو پکے اور سچے م
ماں ہیں۔ قرآنِ مجید کا ارشاد ہے:

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً ۚ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ

(النحل: ۹۷)

جس کسی نے اچھا کام کیا خواہ مرد ہو خواہ عورت اور وہ ایمان بھی رکھتا ہے تو ہم اسے دنیا میں اچھی زندگی بسر کرائیں گے، اور آخرت میں بھی ضرور اُ اجر دیں گے، اُنھوں نے جیسے جیسے اچھے کام کیے ہیں اُس کے مطابق ہمارا اجر بھی ہوگا۔

اسلام کے نزدیک ہر انسان اپنی مرضی کے مطابق اچھائی یا برائی کا انتخاب کرتا ہ
اور اپنے اعمال کے مطابق جزا یا سزا پاتا ہے، اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں کے ذر
سے ہدایت کے جو پیغامات بھیجے اُن کی حیثیت مشورے، نصیحت اور رہنمائی کی
انسان اپنی خواہش کے مطابق انتخاب میں آزاد رہتا ہے، یہ بالکل واضح ہے کہ اگر
چاہتا تو انسان کو سراپا نیک پیدا کر دیتا اور برائی کا اس میں شائبہ تک نہ رہتا چونکہ ا
کو اچھائی اور برائی کے درمیان انتخاب کا اختیار دیا گیا ہے، لہٰذا قیامت کے دن
کے انتخاب کے متعلق اسے جزا یا سزا ملے گی۔ ایسی کوئی فوق الفطرت قوت موجود
جس نے انسان پر کوئی پابندی لگائی ہو یا اُسے کوئی خاص طریقہ چُن لینے پر مجبور کر
ہو جس شے کو تقدیر کہا جاتا ہے وہ در اصل طبعی قوانین کا عمل ہے، بالکل اس طرح
جس طرح علت معلول یا انسان کا صاحبِ اختیار ہونا۔

زمانۂ ماضی میں غیر مومن یہ عذر پیش کیا کرتے تھے کہ خدا نے پہلے سے بعض اعما
ان کے لیے مقرر کر دیے ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ نے اس عذر کو رد کر دیا اور واضح فرما
پوری ذمہ داری خود انسان کی گردن پر ہے، اس لیے کہ وہ آزاد اور صاحبِ اختیار۔
اور رسولوں نے اُس کے لیے ہدایت کا سرمایہ بہم پہنچا دیا ہے:

سَيَقُولُ الَّذِينَ أَشْرَكُوا لَوْ شَاءَ اللّٰهُ مَا أَشْرَكْنَا وَلَا آبَاؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِنْ شَيْءٍ ۚ كَذَٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ حَتَّىٰ ذَاقُوا بَأْسَنَا ۗ قُلْ هَلْ عِنْدَكُمْ مِنْ عِلْمٍ فَتُخْرِجُوهُ لَنَا ۖ إِنْ تَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَإِنْ أَنْتُمْ إِلَّا تَخْرُصُونَ ۝ قُلْ فَلِلّٰهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ ۖ فَلَوْ شَاءَ لَهَدَاكُمْ أَجْمَعِينَ ۝

(سورۃ الانعام
آیہ: ۱۴۹ - ۱۵۰)

جن لوگوں نے شرک کا ڈھنگ اختیار کیا ہے وہ کہیں گے کہ اگر اللہ چاہتا تو ہم اور ہمارے باپ دادا شرک نہ کرتے نہ کسی چیز سے اپنی رائے کو حرام ٹھہراتے، اسی طرح ان لوگوں نے بھی سچائی کو جھٹلایا تھا جو اُن سے پہلے گزر چکے ہیں، یہاں تک کہ ہمارے عذاب کا مزا چکھنا پڑا (اے پیغمبر!) تم کہو کیا تمھارے پاس علم کی کوئی روشنی ہے جسے ہمارے سامنے پیش کر سکتے ہو حقیقت یہ ہے کہ تم محض وہم اور اٹکل کی پیروی کر رہے ہو اور تم اس کے سوا کچھ نہیں ہو کہ بے سمجھے بوجھے باتیں بنانے والے (اے پیغمبر!) تم کہہ دو اللہ ہی کے لیے پہنچی ہوئی اور پکی دلیل ہے اگر وہ چاہتا تو تم سب کو راہ دکھا دیتا۔ (مگر اس نے ایسا نہیں چاہا اور اس کی حکمت کا فیصلہ یہی ہوا)۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اللہ تعالٰے کو علم ہے، انسان کیا کرے گا لیکن یہ الٰہی علم تو ... بھی قانون ہے۔

غرض اسلام کسی انسان کے لیے روا نہیں رکھتا کہ وہ راہِ راست اور سچے ایمان ... ہٹ کر ادھر اُدھر سرگرداں پھرتا رہے اور پھر اس سلسلے میں تقدیر کا عذر پیش کر دے۔ ... ایسا ہوتا تو اللہ تعالٰے کا احکام دینا، رسولوں کا بھیجنا، کتابوں کا اتارنا، جزا و سزا کے ... نے کرنا سب پیچھے رہ جاتے اور انھیں خدائے قدیر کی حکمت اور عدل کے موافق ... ت کرنا غیر ممکن ہو جاتا۔

...ربیتِ اسلام اس مقالے کے آغاز میں بتا دیا گیا تھا کہ قرآنِ مجید اسلام کے سچے تصور کا ہمہ گیر سرچشمہ ہے۔ وہ ہمیں بتاتا ہے کہ اسلام کے عقائد و ضوابط

دونوں کا مجموعہ ہے۔ ہم اب تک صرف عقائد پر بحث کرتے رہے ہیں جنھیں فہم و خلوص

اختیار کیے بغیر کوئی شخص مسلمان نہیں ہو سکتا۔ ان عقائد کے قبول و رد ہی کی بنا پر اس

کے ساتھ وفاداری اور اُس سے سرکشی کے درمیان حدِ فاصل متعین ہوتی ہے۔

اسلامی مجموعۂ قوانین یا شریعت سے مراد وہ اصول و قوانین ہیں جو خدا نے وحی کے

ذریعے سے اتارے اور جن پر ٹھیک ٹھیک کاربند ہونا ہر مسلمان کے لیے لازم ہے

خواہ اُن کا تعلق خدا سے ہو یا باہم انسانوں سے۔ جن اعمال کے ذریعے سے مسلمان

کے مقرب بنتے ہیں، اس کی کبریائی کی یاد تازہ کرتے ہیں اور اس پر ایمان کا ثبوت د

ہیں، اُنھیں اسلام میں "عبادات" قرار دیا گیا ہے۔ جن اعمال کا تعلق مسلمانوں کے

اور دفعِ ضرر سے ہے، جن کا تعلق مسلمانوں اور ان کے ہمسایوں نیز مسلمانوں اور غیر

سے ہے، جن کی بنا پر بدسلوکی کو روکا جاتا ہے، حقوق کی حفاظت کی جاتی ہے، عموم

کو تقویت پہنچائی جاتی ہے اور امن و تحفظ کو قائم رکھا جاتا ہے، اُنھیں اسلامی اصطل

میں معاملات کہا جاتا ہے۔ اسلامی شریعت کے قوانین کا بیشتر حصہ انہی دو صنفوں کے

تابع آجاتا ہے یعنی عبادات اور معاملات۔

خدا کی عبادت

خدا کی عبادت میں نماز، روزہ، ادائے زکوٰۃ اور حج شامل

خدا کی عبادت کی بنیادی اساس یہ ہے کہ خدا کو ایک مانا جا

اور محمد صلعم کی رسالت پر ایمان لایا جائے۔ دل اور روح کا تزکیہ کیا جائے اور تمام ام

میں خدا کی اطاعت پوری پابندی سے کی جائے۔ یہ بنیاد ہے اور یہ ارکان ہیں جن پر ا

کی عمارت تعمیر ہوئی۔ اسی لیے رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ اسلام کی پانچ بنیادیں ہیں

اللہ تعالےٰ کی توحید، محمد کی رسالت، پانچ وقت کی نماز، زکوٰۃ، ماہِ رمضان کے روز

اور خانۂ کعبہ کی زیارت اس کے لیے، جس کے پاس راستے کا خرچ موجود ہو۔

نماز نماز جسمانی عبادت کی ایک شکل ہے، جسے دن میں مقررہ اوقات پر پانچ مرتبہ

مان پر واجب ہے۔ مسلمان کہیں بھی ہو مقررہ وقت آئے گا تو ادائے نماز کے لیے وہ
ا ہو جائے گا اور کعبہ کی طرف منہ کرلے گا، نماز کی ابتدا خاص بلند آواز سے "اللہ اکبر"
کرتی ہے اور مسلمان بڑے ادب، عجز و انکسار اور گہری توجہ سے خدا کی عبادت میں
جاتا ہے۔ پھر وہ قرآنِ مجید کی پہلی صورت (سورۂ فاتحہ) اور اس کے ساتھ قرآنِ مجید کا
ٹکڑا جو یاد کر رکھا ہو، پڑھتا ہے۔ ساتھ ہی ان آیات کے معنی سمجھنے کی کوشش کرتا ہے
ہ رکوع کے لیے جھک جاتا ہے اور اس جھکنے میں کمر بالکل سیدھی ہو جاتی ہے، ہاتھ
نوں پر رکھے ہوتے ہیں اور وہ تین مرتبہ سبحان ربی العظیم کہتا ہے پھر اللہ اکبر
سیدھا کھڑا ہو جاتا ہے، بعد ازاں اللہ اکبر کہہ کر سجدہ کرتا ہے اور اس کی پیشانی زمین
چھوتی ہے، سجدے میں سبحان ربی الاعلیٰ کہتا ہے اور اللہ اکبر کہہ کر اطمینان
بیٹھ جاتا ہے، دوبارہ پہلے کی طرح سجدہ کرتا ہے۔

دن میں پانچ نمازیں ادا کرنا ضروری ہے: اوّل صبح کی نماز جو طلوعِ آفتاب سے پہلے
صبح ادا کی جاتی ہے اور اسی سے دن کا کاروبار شروع ہوتا ہے۔ اس کی دو رکعتیں ہیں
کے آخر میں عبادت گزار بیٹھ کر التحیات پڑھتا ہے۔ اس میں اللہ تعالےٰ کی توحید اور
اللہ صلعم کی رسالت کے متعلق اسی طرح اقرار کرتا ہے جس طرح رسول اللہ صلعم
اب تک چلا آیا ہے۔ بعد ازاں وہ دائیں بائیں باری باری منہ موڑ کر کہتا ہے السلام
م و رحمۃ اللہ یعنی سلامتی ہو تم پر اور اللہ کی رحمت و برکت ہو۔ دوسری نماز ظہر
ہے جو سورج ڈھلنے سے اس وقت تک ادا کی جاتی ہے جب سورج غروب
ف جاتا ہوا نصف منزل طے کر لیتا ہے۔ تیسری نماز عصر کی ہے جو عموماً ظہر اور مغرب
از کے درمیان ادا کی جاتی ہے۔ ان دونوں نمازوں (ظہر و عصر) کی چار چار رکعتیں ہیں
ب کے غروب ہو جانے پر نمازِ مغرب ادا کی جاتی ہے جس کی تین رکعتیں ہیں۔ آخری
نشا کی ہے جب شفق بالکل ناپید ہو جاتی ہے۔ اس کی چار رکعتیں ہیں جس طرح

صبح کی نماز سے مسلمانوں نے دِن کو خوش آمدید کہا تھا، اُسی طرح عشار کی نماز سے رات کو
کہتا ہے۔

اِن نمازوں میں ہر مسلمان دِن رات کے اندر پانچ مرتبہ اپنے خالق و مالک سے
لگاتا ہے۔ اُس کی بارگاہ میں حاضر ہوتا ہے۔ قلب و روح کے ساتھ اُس کے آ
جھکتا ہے۔ اُس سے فضل و رحم کا طالب گار ہوتا ہے۔ اِس طرح اللہ تعالٰے کی فرماں
میں اُسے ثباتِ قدم نصیب ہوتا ہے۔

مسلمان جہاں چاہے نماز ادا کر سکتا ہے یعنی مسجد میں یا گھر میں یا کھیت میں کا
میں یا دفتر میں۔ نماز کا وقت جہاں آجائے، مسلمان کو نماز ادا کرلینی چاہیے وہ تنہا بھی
پڑھ سکتا ہے اور دوسروں کے ساتھ صفوں میں کھڑے ہو کر بھی اس فرض کو ادا کر
با جماعت نماز کی حیثیت اعلیٰ درجے کی فوجی قواعد کی بن جاتی ہے۔ تمام نمازی ا
کے پیچھے کھڑے ہوتے ہیں اور پوری جماعت امام کی پیروی کرتی جاتی ہے۔ نما
بہترین شکل یہی ہے کہ با جماعت پڑھی جائے۔ اس طرح مسلمان ایک دوسرے
شناسائی حاصل کرتے ہیں۔ اُن میں محبت اور تعاون پیدا ہوتا ہے۔ وہ مل کر دعا
مانگتے ہیں۔ اللہ تعالٰے کو مل کر یاد کرتے ہیں، اس کے سامنے خوشی سے سر جھ
ہیں۔

مسلمانوں کو نماز کے وقت سے آگاہی آذان کے ذریعے سے ہو جاتی ہے
مسجد کے مینار پر کھڑے ہو کر اُسی طرح کہی جاتی ہے جس طرح رسول اللہ صلعم
تعلیم دی تھی، یعنی:

اللہ اکبر اللہ اکبر اللہ اکبر اللہ اکبر — اللہ سب سے بڑا ہے، اللہ سب سے بڑا

اشھد ان لا الہ الا اللہ (دو مرتبہ) — اللہ سب سے بڑا ہے، اللہ سب سے بڑا ہے، میں

یہ رکعتیں صرف فرضوں کی بیان کی گئی ہیں۔ سنتیں ان کے علاوہ ہیں۔

اشهد ان محمد آ رسول اللہ (دو مرتبہ) دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، میں گواہی
علی الصلوٰۃ (دو مرتبہ) حی علی دیتا ہوں کہ محمد اس کے رسول ہیں آؤ نماز کی
فلاح (دو مرتبہ) اللہ اکبر اللہ اکبر طرف آؤ فلاح کی طرف۔ اللہ سب سے بڑا ہے
لا الہ الا اللہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں۔

اسلام میں ایک ہفتہ وار نماز بھی ہے جسے نماز جمعہ کہتے ہیں اس لیے کہ یہ جمعہ کے
دوپہر ادا کی جاتی ہے۔ یہ اجتماعی نماز ہے اور نماز سے پہلے خطبہ بھی دیا جاتا ہے اس
دو رکعتیں ہیں ان کے علاوہ بھی نمازیں ہیں، مثلاً عیدین کی نمازیں، جو اسلامی جشنوں
ن ادا کی جاتی ہیں۔ تاریخ کو منایا جاتا ہے اور اسے عید الضحیٰ یا عید قربان کہا
ہے۔

روزانہ پانچ نمازوں نیز جمعہ کی نماز اور عیدین کی نمازوں کے علاوہ ایک نماز جنازے
ہے یہ ایک مذہبی رسم ہے جس میں مسلمان اپنے موتی کے حقوق ادا کرتے ہیں۔
پہلے میت کو غسل دے کر اور سر سے پاؤں تک کفن میں لپیٹ کر دفن کے لیے
کرتے ہیں۔ کفن سلا ہوا نہیں ہوتا، پھر میت کو ایک چارپائی پر ڈال کر نماز ادا کرنے
صفیں باندھ لیتے ہیں، ایک شخص امامت کا فرض انجام دیتا ہے۔ اس نماز میں
فاتحہ پڑھی جاتی ہے اور میت کے لیے دعا کی جاتی ہے نیز اس نماز میں چار تکبیریں
ہیں بعد ازاں میت کو دفن کیا جاتا ہے۔ اسلام کے مطابق قبر گہری بھی کھودی جاسکتی
ہے میت کو سطح ارض پر رکھ کر بھی دفن کیا جا سکتا ہے، لیکن یہ ضروری ہے کہ قبر اونچی
نہ جائے اور یہ حکم جس طرح عام لوگوں کے لیے ہے اُسی طرح نبیؐ کے لیے بھی
و اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت لے کر آیا۔

اس سلسلے میں یہ بھی واضح کر دینا چاہیے کہ جو کچھ اوپر بیان ہو چکا ہے اس کے
کے سلسلے میں اسلام نے کوئی اور رسم مقرر نہیں کی، رسوم کا لمبا چوڑا سلسلہ ان

کے لیے خاص مقامات کا تعین اور وضع کے جلوس ہائے تدفین، نیز قبروں پر بڑے
گنبد بنانا، ان میں سے کسی چیز کو اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ بعض مقبروں کے خاص اہ
کرنے اور اُن سے برکات حاصل کرنے کا جو طریقہ رائج ہے، اُس کے لیے بھی دی
کوئی بنیاد موجود نہیں۔ اسلام نے ہدایت یا برکت کے لیے قبرستان جانے کے
بھی کچھ نہیں کہا۔ یہ تمام رسمیں مسلمانوں نے غیروں کی نقالی میں اختیار کرلیں۔

اسلام اس کے بھی خلاف ہے کہ خانقاہوں یا غاروں میں جاکر نمازیں ادا کی
اسلام کے نزدیک اہلِ خانہ کی ضروریات پوری کرنے اور اجتماعی زندگی کو بہتر
کے لیے کام کرنا بھی ویسا ہی فرض ہے جیساکہ نماز حقیقت یہ ہے کہ نمازیں م
اللہ تعالٰی کی اطاعت کا فرض پورا کرنے کے لیے مقرر ہوئیں اور مدّعا یہ تھا کہ دنیا
زندگی کی جدوجہد میں اللہ تعالٰی کی مدد حاصل کرنے کا یہ بہترین ذریعہ ہے۔ اس
میں مسلمان کے یومیہ فرائض واضح کردیے گیے ہیں نیز یہ کہ عبادت کے ذریعے
روح کے لیے غذا مہیا کی جائے، یہ بھی کہ انفرادی اور اجتماعی بہبود کی ترقی کے
محنت ومشقت میں تامل نہ کیا جائے۔ اسلامی قانون انسان کے لیے خدا کے سا
تعلق اور اس دنیا کی زندگی میں صحیح حصہ داری کا بہترین طریقہ پیش کرتا
اس طریقہ سے صرف مسلمان فائدہ اٹھا سکتا ہے۔

پانچ نمازوں کے سوا جو مسلمان اور غیر مسلموں کے درمیان وجہ امتیاز ہیں، عام
اور دوسرے انسانوں میں کوئی فرق نہیں۔ مسلمان وہی کام کرتا ہے جس کی صلاحیت
میں موجود ہے، روزی پیدا کرتا ہے، اپنے اہل وعیال اور مفاد کی حفاظت کا فرض
دیتا ہے کھانے پینے میں گناہ کی چیزوں سے بچتا رہتا ہے۔ بری تفریحات میں شا
نہیں ہوتا۔ دن بھر کام کرتے کرتے تھک جاتا ہے۔ رات اللہ تعالٰی نے اُس
کے لیے مقرر کردی ہے۔ اسلام مسلمانوں کو زندگی کی اچھی چیزوں سے استفادے

نہیں، ارشاد ہوتا ہے:

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ أَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ (اعراف: ۳۲)

(اے پیغمبر!) ان لوگوں سے کہو خدا کی زینتیں جو اس نے اپنے بندوں کے برتنے کے لیے پیدا کیں اور کھانے پینے کی اچھی چیزیں کس نے حرام کی ہیں۔

رمضان نماز پہلی بدنی عبادت ہے، دوسری بدنی عبادت روزہ ہے یعنی ہر سال رمضان کے مہینے میں سحری سے افطار تک کھانے پینے اور وظائفِ زوجیت سے باز رہنا۔ یہ اللہ کی فرمانبرداری ہے، روزے اس لیے رکھے جاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے رمضان ہی کے مبارک مہینے میں رسول اللہ صلعم پر قرآن مجید کے نزول کا آغاز ہوا اور روزے اللہ تعالےٰ کی اس رحمت کا شکریہ ہیں۔

روزے میں مسلمان بطیبِ خاطر جائز معمولی مشغلے بھی ترک کر دیتا ہے، تاکہ اُس کی روح کی آزمائش ہو، استقامت اور استقلال کی صلاحیت بڑھے اور اُس کا ارادہ ظاہر اور مخفی گناہوں سے باز رہنے میں زیادہ مستحکم ہو جائے۔ بھوک کی حالت اپنے اوپر طاری کر کے مسلمان کا دل زیادہ نرم ہو جاتا ہے۔ وہ زیادہ مہمان نواز بن جاتا ہے، غریبوں اور محتاجوں کے لیے اُس میں ہمدردی کا جذبہ اُبھر آتا ہے، اسلام نے مسلمانوں کے قلوب میں یہی روح پیدا کرنے کے لیے روزے کو عبادت بنایا اور جو روزہ انسانی ہمدردی کا صحیح جذبہ پیدا نہ کرے اسلام میں اُس کی کوئی اہمیت نہیں اور کسی دوسرے مقصد کے لیے روزے رکھنے سے اپنے اوپر بھوک اور پیاس طاری کر لینے کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

زکوٰۃ تیسری عبادت مذہبی ٹیکس یا زکوٰۃ ہے، یہ مالی عبادت ہے جس کے مطابق اسلام خوش حال اور دولت مند اصحاب سے غریبوں کی ضرورتوں کے لیے رقمیں وصول

کرتا ہے۔ زکوٰۃ کی رقمیں ہسپتالوں، تعلیمی اداروں، دفاعی وسیلوں وغیرہ میں صرف کی جاسکتی ہیں۔ یہ دولت مندوں پر ایک مقدس فرض ہے کہ اپنی اور متعلقین کی جائز ضرورتوں سے زائد جو کچھ اُن کے پاس ہو اُس کا ایک حصّہ ادا کریں اور وہ اتنا ہونا چاہیے کہ غریبوں کی ضرورتیں پوری ہو سکیں اور جماعت کے عام مفاد کو تقویت پہنچے، ساتھ ہی مالکوں پر برا اثر نہ پڑے:۔ عام رواج یہ ہے کہ بارانی زمین کی پیداوار کا $\frac{1}{10}$ اور جو انسانی کوششوں سے سیراب ہو (چاہی یا نہری) اس کی پیداوار کا $\frac{1}{20}$ حصّہ ادا کیا جائے۔ بچت کی رقم میں سے ۲$\frac{1}{2}$ فی صدی دینا لازم ہے، اسی طرح مویشی اور تجارتی مال پر زکوٰۃ کا نصاب مقرر ہے۔ ادائے زکوٰۃ کا محرک داخلی ہے، خارجی دباؤ سے اسے کوئی تعلق نہیں۔

زکوٰۃ کی مالی عبادت معاشرے کی بہبود کو تقویت پہنچانے کا بہترین ذریعہ ہے اس طرح ملّت کے مختلف طبقوں میں ایک دوسرے سے ہمدردی اور مروت کا رشتہ پیدا ہو جاتا ہے، اور عوام میں محبت و تعاون کے جذبات نشوونما پاتے ہیں۔ زکوٰۃ قوم کو مالی استبداد کی لعنت سے محفوظ رکھتی ہے، اس لیے کہ قومی آمدنی کا بڑا حصّہ نہ تو چند افراد کے ہاتھ میں رہتا ہے اور نہ حکمران کے ہاتھ میں رہتا ہے جو اسے حکومت کے نام پر وصول کر سکے اللہ تعالےٰ نے زکوٰۃ مقرر کر کے عام آدمیوں کے لیے وجہ معاش کے انتخاب کی آزادی محفوظ رکھی۔ ساتھ ہی ملّت کے لیے فرد کے سلسلے میں امداد و تعاون کا بندوبست کر دیا۔ جو مسلمان زکوٰۃ ادا نہیں کرتا وہ ایک مذہبی فرض کے ادا کرنے سے محروم رہتا ہے، اور اسلام کے ایک بہت بڑے رُکن کی بنیاد کھوکھلی کرتا ہے۔

حج حج اسلام میں ایک بدنی عبادت ہے، اس کا مدّعا یہ ہے کہ ہر سال جو مسلمان دنیا بھر کے مختلف حصوں سے مکہ معظمہ پہنچ سکتے ہیں جہاں وحی کا آغاز ہوا وہ سب اکٹھے ہو کر عبادت کریں۔ وہاں وہ خانۂ کعبہ کی زیارت سے مشرف ہوتے ہیں

عرفات میں دعائیں کرتے ہیں جو مکہ معظمہ سے تیرہ میل پر ایک وادی ہے۔ یہ عبادت علی الاعلان کی جاتی ہے جس میں جمع ہونے والے تمام مسلمانوں میں کامل مساوات ہوتی ہے۔ اُن سب کا مقصد ایک ہوتا ہے، سب ایک قسم کے اعمال انجام دیتے ہیں۔ سب کی آرزو یہ ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فضل ورحمت کے مستحق بن جائیں۔ مکہ معظمہ میں امیر وغریب، حکام وعوام، عالم وفاضل اور مزدور سب یکساں ہوتے ہیں۔ ایک قسم کا سفید لباس پہنتے ہیں، جس میں کوئی سلائی نہیں ہوتی، ان کے درمیان طبقاتی امتیازات مٹ جاتے ہیں۔ وہ سب ایک مرکز کے گرد جمع ہوتے ہیں جو ان کے دل میں اتحاد ویگانگی کا زبردست احساس پیدا کر دیتا ہے۔ وہاں اُن کے نظریات ومقاصد بھی متحد ہوتے ہیں اور وہ پختہ عہد کرتے ہیں کہ عوامی بہبود کے لیے مل جل کر کام کریں گے۔

یہ اسلامی عبادات ہیں اور اُن عقائد پر مبنی ہیں جو مسلمانوں کے لیے واجب ہیں، عبادت نماز، روزے، اداے زکوٰۃ اور حج کے ذریعہ سے کی جاتی ہے۔ اسلام ان عبادات کو اس لیے ضروری قرار دیتا ہے کہ انسان خدا کی خوشنودی حاصل کرے، اُس کے احکام کا پابند رہے اور ہر وقت اُس کا شکر ادا کرے، عبادت کے اوقات میں مسلمان کے دل میں صرف خدا اور اُس کی ان رحمتوں کا خیال ہوتا ہے جو اُس نے جسم، دولت اور معاشرے کے تعلق میں عطا کیں۔ ساتھ ہی مسلمان کو یہ احساس ہوتا ہے کہ اُس نے خدا کی بارگاہ میں جو عبادت کی وہ خود اُس کے لیے بھی نفع بخش ہے۔ نماز اور روزے سے مسلمان میں نظم وجمعیت پیدا ہوتی ہے جس کی اُسے ضرورت ہے اور ان سے روحانی زندگی کے نشو وارتقا کو فائدہ پہنچتا ہے، زکوٰۃ ملی تعاون کی حوصلہ افزائی کے علاوہ غریبوں کی ضرورتیں پوری کرتی ہے اور اس طرح معاشرے کے اہم تقاضے پورے ہوتے ہیں جو شناسائی کے دائرے کو وسیع کرتا ہے نیز ایک دوسرے کے حالات کو سمجھنے میں معاون بنتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے پیغام ہدایت کے ماتحت تعاون میں اضافہ کرتا ہے۔

مسجد اگرچہ نماز مقررہ اوقات پر ہر جگہ ادا کی جا سکتی ہے، جہاں کوئی مسلمان ہو، لیکن مسجد

آغازِ اسلام ہی سے اسلامی تعلیم اور مذہبی عبادت کی بجا آوری کا بہترین مرکز بن گئی ہے، یہ تبلیغ کا بھی مرکز ہے۔ عدالت کا کام دیتی ہے، جہاں باہمی جھگڑے طے ہوتے ہیں۔ ایک مجلسی کلب بھی ہے جہاں مسلمان مشترکہ مفاد کے معاملات پر بات چیت کرتے ہیں۔ مسجد اسلام نے ایجاد نہیں کی تھی، بلکہ یہ پہلے ہی نزولِ وحی کے ساتھ شروع ہوگئی تھی۔ قرآن نے بتایا ہے کہ پہلی عمارت جو خدا کی عبادت کے لیے مخصوص ہوئی وہ مقدس عمارت تھی جسے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور اُن کے فرزند اسماعیل علیہ السلام نے تعمیر کیا۔ کتاب اللہ میں مسجدوں کے متعلق فرمایا گیا ہے:

اِنَّمَا یَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰہِ مَنْ اٰمَنَ	فی الحقیقت مسجدوں کو آباد کرنے والا تو وہ ہے
بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَاَقَامَ	جو اللہ پر اور آخرت پر ایمان لایا۔ نماز قائم کی زکوٰۃ
الصَّلٰوۃَ وَاٰتَی الزَّکٰوۃَ وَلَمْ یَخْشَ	ادا کی اور اللہ کے سوا اور کسی کا ڈر نہ مانا جو لوگ
اِلَّا اللّٰہَ فَعَسٰٓی اُولٰٓئِکَ اَنْ یَّکُوْنُوْا	ایسے ہیں، انھیں سے توقع کی جاسکتی ہے کہ
مِنَ الْمُهْتَدِیْنَ ٥ (توبہ: ۱۸)	وہ راہ پانے والے ثابت ہوں گے۔

قرآنِ مجید نے دو مسجدوں کا نام لے کر ذکر کیا ہے۔ اوّل مسجد الحرام مکہ معظمہ میں، دوم اقصیٰ یروشلم میں:

سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ لَیْلًا مِّنَ	پاک ہے وہ ذات جس نے اپنے بندے کو راتوں
الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا	رات مسجدِ حرام سے مسجدِ اقصیٰ تک کی سیر کرائی جس
الَّذِیْ بٰرَکْنَا حَوْلَهٗ لِنُرِیَهٗ مِنْ اٰیٰتِنَا	کے اطراف کو ہم نے بڑی ہی برکت دی، اس لیے
اِنَّهٗ هُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ ٥	سیر کرائی کہ اپنی نشانیاں اُسے دکھائیں۔ جا شبہ وہی
(بنی اسرائیل: ۱)	ذات ہے جو سننے والی اور دیکھنے والی۔

رسول اللہ صلعم نے مدینہ منورہ پہنچنے کے بعد جو کام سب سے پہلے انجام دیے اُن میں سے ایک یہ بھی تھا کہ ایک مسجد تعمیر کرائی تاکہ مسلمان ایک دوسرے سے قرب پیدا کریں۔ اس طرح

کی شکل اختیار کریں، نیز باجماعت نماز ادا کرنے کے لیے ایک جگہ مہیا ہو جائے۔ رسول اللہ
مثال سامنے رکھتے ہوئے خلفاء نے بھی مسجدیں تعمیر کرائیں تاکہ مسلمان بلا امتیاز یکساں
میں اکٹھے ہو کر خدائے پاک کی عبادت کر سکیں۔ آج دنیائے اسلام میں مسجدیں اوّل
نشان ہیں، دوسرے اسلامی عبادت، اسلامی تعلیم اور خدمتِ عامہ کے مرکز ہیں۔

اسلامی شریعت جو مختلف سرگرمیوں میں انسان کی رہنمائی کرتی ہے عبادات اور
معاملات میں صرف اس لیے امتیاز کرتی ہے کہ اسلامی مقاصد کی توضیح میں سہولت
ہم حقیقی عبادت کی صحیح حیثیت کا اندازہ کر چکے ہیں۔ معاملات پر غور کرتے وقت ہم سب
لے اُن اُمور پر بحث کریں گے جن کا تعلق ملتِ اسلامیہ سے ہے یعنی اہل و عیال، مالی
مسلمانوں کا باہم تعلق اور حکومت۔ اس کے بعد غیر مسلم افراد اور غیر مسلم اقوام سے
کی بحث آئے گی۔ اسلامی شریعت نے مسلمانوں کے تمام واجباتِ زندگی کے ہر دائرے
کر دیے ہیں اور اُن سے کوتاہی یا سرتابی کی سزائیں بھی بتا دی ہیں۔

ریعت کے ماتحت اسلام خدائے واحد کی دعوت دیتا ہے اور مساوات کے اصول کو
ہے۔ وہ تمام انسانیت کی وحدت پر زور دیتا ہے اور لوگوں نے رنگ، نسل، یا جغرافیائی
کی بنیاد پر جو امتیازات قائم کر رکھے ہیں، اُن کی مذمت کرتا ہے۔ وہ کسی اجنبی کو
نے میں محض اس لیے بدسلوکی کا مستوجب نہیں ٹھہراتا ہے کہ وہ اجنبی ہے۔ نہ کسی
بنا پر، نہ کسی دشمن کو دشمنی کی بنا پر سزا دیتا ہے۔ اسی طرح کسی قریبی رشتہ دار کے
می شریعت محض اس بنا پر خاص سلوک کی اجازت نہیں دیتی کہ وہ رشتے دار ہے،
کے ساتھ دوستی کی بنا پر جانب داری جائز ہے، نہ کسی مسلمان کو محض اسلام کی وجہ
انی کے برتاؤ کا مستحق ٹھہرایا جاتا ہے:

لَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُوْنُوْا قَوّٰامِیْنَ — مسلمانو! ایسے ہو جاؤ کہ خدا کے لیے مضبوطی سے قائم
ہَدَآءَ بِالْقِسْطِ وَلَا یَجْرِمَنَّکُمْ — رہنے والے اور انصاف کے لیے گواہی دینے والے

شَنَاٰنُ قَوۡمٍ عَلٰۤى اَلَّا تَعۡدِلُوۡا اِعۡدِلُوۡا ۔ هُوَ اَقۡرَبُ لِلتَّقۡوٰى وَاتَّقُوا اللّٰهَ (مائدہ : ۸)

ہو، اور ایسا کبھی نہ ہو کہ کسی گروہ کی دشمنی تمہیں اس بات کے لیے اُبھار دے کہ تم انصاف نہ کرو، کرو کہ یہی تقویٰ سے لگتی بات ہے اور اللہ سے

عیال داری

اسلام میں شادی کے لیے فریقین کی کامل رضامندی ضروری ہے جبر کا خفیف سا دباؤ بھی نہیں ڈالا جا سکتا۔ جس شادی میں جبر ہو جائے وہ صحیح شادی ہی نہ ہوگی۔ جب فریقین میں معاہدہ ہو جاتا ہے تو مرد، عورت رقم ادا کرتا ہے، یہ عورت کے ساتھ مہر و محبت کا ایک نشان ہے، یہ نہیں سمجھنا کہ یہ رقم عورت کی قیمت یا رضامندی کا معاوضہ ہے۔ مہر یا کابین کی رقم کا فیصلہ بیوی کی رضامندی سے ہوتا ہے اور اس رقم کو ہونے والی دلہن کی ذاتی ملکیت سمجھ شوہر بیوی کی رضامندی کے بغیر اس رقم کا کوئی حصہ خرچ کرنے کا مجاز نہیں

شادی کا عہد نامہ دو یا دو سے زیادہ گواہوں کے سامنے دہرایا جاتا کہتی ہے کہ میں اپنا نکاح تمہارے ساتھ کرتی ہوں، دولہا جواب دیتا ہے کہ مجھے سے نکاح منظور ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ دولہن اور دولہا کی طرف سے دو قابل کارندے معاہدۂ نکاح کے الفاظ دہرا دیں[1] اگر اصل معاہدے کی تصدیق دو گو کریں تو یہ معاہدہ غیر آئینی ہوگا اور سمجھ لینا چاہیے کہ نکاح ہوا ہی نہیں۔ نکاح زبانی قول و قرار دو آدمیوں کی گواہی سے مکمل ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد میاں بیو مشترکہ گھر بنا سکتے ہیں۔

اسلام میں شوہر کو بیوی اور گھر کی نگرانی کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا ہے، اس لیے کہ اعتبار سے یہ خدمت انجام دینے کا اہل ہوتا ہے اور وہی معاش پیدا کرنے کا و

---

[1] ہمارے یہاں عام طریقہ یہی ہے کہ لڑکی کی طرف سے ولی یا اس کا کوئی قابلِ اعتماد نمائندہ شرطیں پیش کرتا ہے اور اُس سے قبول کراتا ہے۔

ں سے اُن حقوق و واجبات پر کوئی اثر نہیں پڑتا جو آئینی اعتبار سے دونوں باہم مقرر
یں۔ یہ بھی واضح کر دینا چاہیے کہ گھر بار کی نگرانی مرد کو اختیاراتِ مطلقہ کا مالک نہیں
ں میں بیوی اپنا نقطۂ نگاہ بھی پیش کرنے کی مجاز نہ ہو یا اُس سے مشورہ بھی نہ لیا جائے
نگرانی کا اعزازی درجہ ہے اور شوہر کے لیے ضروری ہے کہ وہ بیوی کے نقطۂ نگاہ
م ملحوظ رکھے۔

رض اسلام میں شادی یا نکاح دو فریقوں کے درمیان رضامندی پر موقوف ہے
سلسلے میں مذہبی یا انتظامی حکام کو کوئی دخل نہیں اس معاہدے سے بیوی کی
ل یا اپنی جائیداد کے انتظام پر بھی کوئی قید عائد نہیں ہوتی، البتہ یہ ضروری ہے کہ
ندگی...... کی ذمہ داریوں کا پورا خیال رکھے۔ گھر بار اور بچوں کی نگہداشت میں
نہ آنے دے۔

سلام خاص حالات میں مرد کو دوسرے نکاح کی اجازت دیتا ہے۔ خاص حالات سے
ہے کہ ابتدائی شادی میں جو مقاصد پیش نظر تھے، وہ پورے نہ ہوں، مثلاً اولاد نہ ہو
دوسری شادی مسئلے کا بہترین حل پیش کرتی ہے خصوصاً ایسے حالات میں جب
کہ اگر پہلی بیوی کو طلاق دے دی گئی تو ممکن ہے وہ دوبارہ شادی سے محروم
ر کوئی اُس کی دیکھ بھال کرنے والا نہ ہو۔ اسلام نے زیادہ سے زیادہ چار شادیوں
ت دی ہے لیکن یہ شرط لگادی ہے کہ ایک سے زیادہ بیوی رکھنا اسی حالت
ہے، جب کہ وہ ہر بیوی کے حقوق پورے کر سکے اور ان کے درمیان مساوات
لے سکے۔ اگر پہلی بیوی یہ سمجھے کہ شوہر دوسری شادی کر کے میرے حقوق کو نقصان
ہے، تو اسے اپنا معاملہ عدالت میں لانے کا اختیار حاصل ہے۔

سلام یہودی اور عیسائی عورتوں سے شادی کی اجازت دیتا ہے۔ قرآنِ مجید

اَلْيَوْمَ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ ؕ وَطَعَامُ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حِلٌّ لَّكُمْ ۪ وَطَعَامُكُمْ حِلٌّ لَّهُمْ ۫ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ

(مائدہ ۵ : ۵)

آج تمام اچھی چیزیں تم پر حلال کر دی گئیں، ان لوگوں کا کھانا جنھیں کتاب دی گئی ہے (یہود و نصاریٰ) تمہارے لیے حلال ہے اور تمہارا کھانا اُن کے لیے حلال ہے، نیز تمہارے لیے مسلمان بیویاں اور اُن لوگوں کی بیویاں جنھیں تم سے پہلے کتاب دی گئی ہے حلال ہیں۔

لیکن کافر اور مشرک عورتوں سے شادی کی اجازت نہیں دیتا:

وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ ؕ وَلَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ وَّلَوْ اَعْجَبَتْكُمْ ۚ وَلَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يُؤْمِنُوْا ؕ وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ وَّلَوْ اَعْجَبَكُمْ ؕ

(بقرہ ۲ : ۲۲۱)

اور مشرک عورتوں سے نکاح نہ کرو، جب تک ایمان نہ لے آئیں، ایک مشرک عورت تمھیں کتنی پسند آئے لیکن مومن عورت اُس سے کہیں بہتر ہے، اسی طرح مشرک مرد ایمان نہ لے آئیں، مومن عورتیں ان کے نکاح میں نہ دی جائیں، یقیناً خدا کا مومن بندہ ایک مشرک مرد سے بہتر ہے اگرچہ بظاہر مشرک تمھیں کتنا ہی پسند آئے۔

اسلام متاہل زندگی کو زیادہ سے زیادہ پائیدار بنانا چاہتا ہے۔ اگر میاں بیوی میں اختلافات پیدا ہو جائیں تو اُن کے درمیان مصالحت کرا دینا ضروری ہے، مثلاً جب دونوں کے درمیان اختلاف ہو تو چاہیے کہ اپنے خاندان کے افراد اور قریبی رشتہ داروں کو ثالث بنا لیں، لیکن جب ناراضی اس قدر پہنچ جائے کہ اُن کا اکٹھا رہنا خطرے میں پڑ جائے، ثالثی کامیاب نہ ہو سکے اور متاہل زندگی امن و سکون، محبت اور رحمت کی حالت کے بجائے تشویش مشکل اور مقاطع کی صورت اختیار کر جائے، جس کی حیثیت قریباً دوزخ کی ہے تو اُس حالت میں اسلام شوہر کو اجازت دیتا ہے کہ وہ طلاق

ذریعے سے مداوا کرے حقیقتِ حال کے اعتبار سے دیکھا جائے تو طلاق ایک حق ہے جو اس لیے شوہر کو دیا گیا ہے کہ وہ شادی کے واجبات پورا کرنے کا اہل ہے اور بیوی کے بجائے بہتر ضبطِ نفس کر سکتا ہے۔

اگر طلاق کی ضرب اُس مقصد کو پورا کر جائے جو اس میں پیشِ نظر ہے اور میاں بیوی دونوں کو عقل آجائے تو اسلام اجازت دیتا ہے کہ وہ اسلامی شریعت کی واضح ہدایت کے مطابق اپنا نکاح بحال کر لیں اسلام شوہر کو بطورِ مداوا دو مرتبہ طلاق کی اجازت دیتا ہے اگر میاں بیوی میں اطمینان بخش مصالحت ہو جائے تو وہ اپنی متاہل زندگی شروع کر سکتے ہیں، لیکن تیسری طلاق آخری اور قطعی ہوتی ہے اور ایسی مطلقہ بیوی اُس وقت تک اپنے پہلے شوہر سے شادی نہیں کر سکتی جب تک کسی دوسرے مرد سے شادی نہ کر لے اور وہ مرد بھی اپنی مرضی سے طلاق نہ دے دے۔ اگر دوسری شادی کا انتظام اس نیّت سے کیا جلئے گا کہ دوسرا شوہر طلاق دے دے، تاکہ بیوی اپنے شوہر کے پاس جا سکے تو یہ معاہدہ جائز نہ ہوگا۔

ظاہر ہے کہ اسلام نے طلاق کی اجازت اس لیے نہیں دی کہ شوہر اس دھمکی کو تلوار کی حیثیت میں بیوی کے سامنے ڈرانے کی غرض سے پیش کرتا رہے۔ اس کے برعکس اسلام طلاق کو ایک تلخ دوا سمجھ کر استعمال کرنے کی اجازت دیتا ہے، تاکہ بیمار کی بیماری زائل ہو جلئے اور وہ اتحاد ختم کر دیا جائے جس کا مداوا اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ اسلام کا نظریہ یہ ہے کہ اگر کوئی شوہر بلا وجہ بیوی کو طلاق دے کر اُس کے حقوق سے تجاوز کرتا ہے تو وہ اپنے اختیار کا غلط استعمال کرتا ہے اور اُسے فرض شکنی کا ملزم قرار دینا چاہیے۔ اسلامی عدالتوں کو اختیار ہے کہ حقِ طلاق کے غلط استعمال پر مرد کو مطعون کرے۔

شریعتِ اسلام عورت کو اجازت دیتی ہے کہ اگر شوہر کا برتاؤ اُس کے ساتھ

ناخوش گوار ہو یا اُسے ناجائز طریق پر مشقت میں ڈالا جاتا ہو یا مرد کسی ایسی جسمانی یا دماغی بیماری میں مبتلا ہو جس کے پیشِ نظر عورت اپنی عفت محفوظ نہیں رکھ سکتی تو وہ اپنا معاملہ اسلامی عدالت کے سامنے لے جائے۔ اگر اُس کا دعویٰ درست ثابت ہوا اور شوہر طلاق دینے سے انکار کرے تو عدالت عورت کو حکماً طلاق دلا سکتی ہے۔

چونکہ اسلام متاہل زندگی میں مرد و عورت کے درمیان مساوات قائم رکھنا ہے، اس لیے تعلق کے ختم پر بھی مساوات میں فرق آنے نہیں دیتا۔ اُس نے مرد کو کسی بھی حالت میں یہ اجازت نہیں دی کہ عورت کی صنفی کمزوری سے ناجائز فائدہ اٹھائے، یعنی اُس کے کسی حق سے انکار کر دے یا عورت کے ذمے اُس کے جو حقوق ہیں اُن کا غلط استعمال کرے۔ ساتھ ہی وہ عورت کو اجازت نہیں دیتا کہ وہ اپنے واجبات سے تجاوز کرے، یعنی اپنی عفت بحال نہ رکھے یا شوہر کی جائیداد یا گھر کے سر و سامان کے تحفظ میں کوتاہی کرے۔

اسلام میں خاندان کے لیے بچوں کی تعلیم و تربیت ایک خاص ذمہ داری ہے تعلیم و تربیت کا آغاز اُس وقت سے ہوتا ہے جب بچہ اسلامی عقائد کے متعلق مختلف اسباق دہرانے اور اسلامی عبادات انجام دینے کے قابل ہو جاتا ہے۔ خاندان اس امر کا بھی ذمہ دار ہے کہ بچے کو درس گاہ یا مسجد بھیج کر مزید تعلیم دلائے، جہاں عقائد و اعمال کے جائز و ناجائز ہونے کا درس دیا جاتا ہے، تاکہ بچہ بالغ ہو تو وہ اسلام کے فہم صحیح سے پوری طرح آشنا ہو۔

مالی اُمور

اسلام میں وراثت والدین، بھائیوں، بہنوں اور بچوں کے خونی رشتے اور میاں بیوی کے رشتہ زوجیت پر مبنی ہے اور حقِ وراثت میں صنف یا عمر کی کوئی قید نہیں۔ والدین یا اولاد یا میاں بیوی کسی بھی حالت میں اپنے حقوق زائل نہیں کرتے البتہ وارث زیادہ ہوں تو ان کے حصے یقیناً کم ہو جائیں گے، اگر والدین زندہ ہوں تو

بھائیوں اور بہنوں کو میراث نہیں ملتی۔ اگر مرد اور عورت دونوں وارث ہوں تو مرد کو عورت سے دوگنا حصہ ملتا ہے۔ البتہ علاتی بھائیوں اور بہنوں کو برابر حصہ ملتا ہے۔

اسلامی شریعت کے مطابق مرد کو عورت کے مقابلے میں اس لیے وراثت سے دوگونہ حصہ دیا گیا ہے کہ اس کے ذمے عورت کی نگہداری ہوتی ہے، بچوں کی تعلیم و تربیت کا خرچ بھی وہی برداشت کرتا ہے اور شادی کا خرچ بھی عورت کو وہی دیتا ہے۔ عورت کو جو حصہ ملتا ہے، وہ اس حالت میں اس کے لیے بالکل کفایت کرتا ہے جب وہ معاش کے ہر وسیلے سے محروم ہو جائے۔ اسلام نے میراث میں خونی رشتہ داروں نیز میاں بیوی کو شریک رکھنے میں یہ مصلحت بھی پیش نظر رکھی ہے کہ ان کے درمیان محبت کے رشتے مستحکم ہو جائیں اور تمام رشتہ داروں میں مشترکہ بہبود کے ساتھ عام دل چسپی پیدا کر دی جائے اگر ایک حیثیت کے وارثوں میں سے کسی سے طرفداری کا برتاؤ مرعی رکھا جاتا تو رقابتیں فروغ پاتیں اور خاندانی ڈھانچے کا شیرازہ درہم برہم ہو جاتا۔ اس نظام کی برکت ہے کہ اسلامی معاشرہ اس استبداد کے خطرے سے محفوظ ہو گیا ہے۔ پوری میراث ایک فرد کو مل جاتی تو یقیناً مالی استبداد کا خطرہ پیدا ہو جاتا۔ یہ خطرہ بھی باقی نہیں رہا کہ میراث سرکاری خزانے کی نذر ہو جائے گی۔ اس صورت میں خاندان کے افراد ان کوششوں کے نتائج سے محروم ہو جاتے جن میں والدین، بچے، رشتے دار، شوہر، بیوی یکساں شریک رہیں اور معاشرے کو نقصان پہنچتا ــــــ اسلامی شریعت نے مالی معاملات کے لیے بھی ضوابط کے ذریعے سے معیار مقرر کر دیے ہیں۔ یہ ضوابط خرید و فروخت سے متعلق ہیں یعنی ان چیزوں سے متعلق جن میں خرید و فروخت ہے نیز ان چیزوں سے متعلق جن میں خرید و فروخت نہیں ہو سکتی۔ یہ بتایا گیا ہے کہ سرمایے کو کس طرح کام میں لگایا جائے۔ امانتوں کے لیے کیا کیا شرطیں رکھی جا سکتی ہیں۔ قرضوں کے کاغذات کیوں کر تیار کیے جائیں۔ ایسے ہی دوسرے معاملات کے متعلق توضیحات ہیں جو جھگڑے کا باعث ہو سکتے ہیں۔ اسلام کے نزدیک اپنے تمام معاملات

سچائی، دیانت اور ادائے واجبات کے لیے آمادگی کی بنیاد پر انجام پانے چاہئیں

حکومت قرآنِ مجید میں متعدد آیات ہیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ ملتِ اسلامیہ کے لیے کسی نہ کسی طور کی حکومت ضروری سمجھی گئی ہے۔ مثلاً:

۱- كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلَىٰ — جو لوگ قتل کر دیے جائیں، ان کے لیے ہیں قصاص کا حکم دیا گیا ہے۔ (بقرہ ۲: ۱۷۸)

۲- اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ (نساء: ۵۸) — (مسلمانو!) خدا تمہیں حکم دیتا ہے کہ جو جس کی امانت ہو، وہ اس کے حوالے کر دیا کرو اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو چاہیے کہ انصاف کے ساتھ کرو۔

ملت پر جو واجبات عائد کیے گیے ہیں وہ اسی حالت میں پورے ہو سکتے ہیں کہ ملت اپنی طرف سے کسی کو ترجمان بنا دے یہ آدمی ایسا ہونا چاہیے جس کے دماغی قویٰ پیشِ نظر کام کے لیے موزوں ہوں جس میں عزم ہو، عقل و دانش ہو اور جو بہبود و فلاحِ عامہ کے لیے کام کرتے وقت عوام کے فکر و نظر کو متحد رکھ سکے اور ان کا تعاون حاصل کر لے۔ ایسے شخص کو اسلام میں خلیفہ یا امام کہتے ہیں۔

خلیفہ یا امام کا فرض ہے کہ مسلمانوں کا لیڈر ہونے کی حیثیت میں رائے عامہ کو مجتمع رکھے تنازعات کے فیصلے کرے۔ حکومت کا نظم و نسق چلائے اور لوگوں سے دینی احکام کی پابندی کرائے مثلاً قیامِ صلوٰۃ، ادائے زکوٰۃ اور پارلیمانی جمہوریت کی رہنمائی میں مفادِ عامہ کا خاص خیال رکھے۔ جمہوریت ہی دراصل اسلام میں حکومت کی بنیاد و اساس ہے خلیفہ قومی کنٹرول کے تابع ہے۔ اسے ملت کے نمائندے کی حیثیت میں جو اختیارات سونپ دیے گیے، ان کے سوا وہ کسی اختیار کا مالک نہیں اور اس کا فرض یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو احکام صادر ہو چکے ہیں، ان پر عمل کرائے۔ اگر وہ قومی نمائندگی کی شرطوں میں

ں سے کسی ایک کے خلاف کرے یا خدا کے کسی حکم کو توڑے تو ملّت کو حق حاصل ہے
اسے معزول کر کے کسی دوسرے کو اس کی جگہ بٹھا دے اسلام میں خلافت یا امامت کسی
مانی تصدیق پر مبنی نہیں جس کے مطابق خلیفہ کو خدا کی طرف سے قوم پر حکمرانی کا حق حاصل
ہو۔ اس کے اختیار کی حیثیت آسمانی نہیں کہ لوگ بہرحال بے چون و چرا اس کا حکم
نے پر مجبور ہوں۔ خلیفہ یا امام بھی معاشرے کا ایک جسم ہوتا ہے اس کے اعمال کا جائزہ
انی احکام کی بنا پر لیا جاتا ہے۔ خلیفہ اور ملّت ایک ایسا کل ہیں جنھیں ایک دوسرے
الگ الگ نہیں کیا جا سکتا۔ وہ ایمان، عبادت، عدل و انصاف اور بہبود عامہ کے
ں میں جکڑے رہتے ہیں رسول اللہ صلعم نے فرمایا خدا کے سامنے سب مسلمان برابر
اسلام کے خلیفۂ اوّل (حضرت صدیقؓ) نے فرمایا: میں تمھارے تعلق میں جب تک
ور رسول کے حکموں پر چلوں، میری اطاعت کرو۔ اگر میں ان حکموں پر چلنا چھوڑ دوں
یرا حکم ماننے پر تم مجبور نہ ہوگے۔

ظاہر ہے کہ اسلام نے جماعتی و ملّی زندگی میں مذہبی اور غیر مذہبی .... معاملات
درمیان کوئی فرق روا نہیں رکھا۔ اسلام میں مذہب کا تعلق ایمان و عبادات، قوم کے
ارتقا، تعلیم و رہنمائی، تمام اقتصادی اور مجلسی معاملات سے ہے۔ اسی سلسلے میں
ناجائز، حلال و حرام اور درست و نادرست آتے ہیں پھر مذہب کا تعلق حکومت سے
نظم و نسق سے ہے، قوم و ملت کے تمام وظائف سے ہے۔ کوئی ایسی صورت
ں نہیں آسکتی جس نے نظم و نسق کے ڈھانچے سے الگ مذہب کے لیے
کر رکھا ہو۔ جن مسلم حکومتوں نے حکومت کو مذہب سے الگ رکھا ہے وہ ذاتی رائے
ی کر رہی ہیں اور یہ طرز عمل اسلامی تعلیمات کے سراسر خلاف ہے۔

اسلام فرد اور ملّت کے حقوق و واجبات کا یکساں اعتراف کرتا ہے اس نے اپنے
ی بنیاد یہ رکھی کہ فرد کی ایک مستقل شخصیت ہے جو اس کے ہم وطنوں اور ملّت

سے بالکل جداگانہ ہے۔ یہ شخصیت مجلسی اور اجتماعی نظام کا ایک عنصر ہے۔ فرد کی معیت میں اس کے حقوق و واجبات جداگانہ ہیں اور قوم کا جزو ہونے کی حیثیت میں اس کے حقوق و واجبات جداگانہ ہیں۔ ایک مستقل فرد کی حیثیت میں اس کا تقاضا یہ ہے کہ وہ خدا پر ایمان لائے، اس کی عبادت کرے اور ایسی زندگی بسر کرے کہ اس کے ضمیر کا دامن داغ دار نہ ہو۔ روزی کے لیے محنت و مشقت اس کے لیے لازم ہے، تاکہ اپنا اور اپنے بال بچوں کا گزارا چلائے، اپنی بھلائی کی چیزوں سے مستفید ہو، اپنی بقا کے لیے اسباب و وسائل مہیا رکھے اور یہ سب کچھ ایسے انداز میں پورا ہو کہ دوسرے شہریوں کی زندگی اور بہبود پر کوئی چھاپہ نہ پڑے۔ جائیداد پیدا کرنا اس کا حق ہے، اسی طرح وہ زندگی کی جائز راحتوں سے فائدہ اٹھانے کا حق دار ہے۔ ملت کے رکن کی حیثیت میں خدا نے اس کا فرض یہ قرار دیا ہے کہ عام لوگوں کی بھلائی کے کام میں اپنا حصہ ادا کرے۔ اپنے ہم جنسوں کی رہنمائی اور دست گیری میں سرگرم رہے، ملت کی اجتماعی سہولتوں اور آسائشوں کی فراوانی کو تقویت پہنچائے اور مشترکہ دشمن سے لڑائی کی نوبت آجائے تو وہ بھی ہتھیار سنبھال کر کھڑا ہو جائے۔

ان واجبات کو پورا کرنے کے بدلے میں جماعت کا فرض ہے کہ فرد کی زندگی اور جائیداد کی حفاظت کرے اور اس کی مستورات کی عفت و پاک دامنی پر کوئی حرف نہ آنے دے۔ اس مقصد کے لیے اسلام کے احکام موجود ہیں جن میں حاکم کے فرائض بڑی تفصیل سے واضح کیے گئے ہیں۔ وہ قوم و ملت کا نمائندہ ہوتا ہے۔ اسی طرح اس کا فرض ہے مقررہ سزائیں بھی جاری کرے۔

اسلامی نظام کے اندر فرد اور ملت کے حقوق و واجبات قطعی طور پر متعین کر دیے گئے ہیں اس طرح دونوں میں تعاون اور مساوات کی بنا پر زندگی اور راحت کی حفاظت کا بندوبست ہو گیا ہے دونوں (فرد اور ملت) کے حقوق و واجبات میں تداخل کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی۔ اگر کوئی فرد عائد شدہ ملی واجبات کو پورا نہ کرے تو وہ مذمت کا مستوجب

ٹھہرے گا۔ حاکم کا فرض ہو گا کہ ملّت کی طرف سے اسے ملزم گردانے اور اگر معاشرہ جس
کی نمائندگی ہیئتِ حاکمی کرتی ہے فرد کے حقوق کی حفاظت نہ کرے تو حاکم خدا کی طرف
سے ناراضی کا مستوجب ہو گا۔ اگر حاکم فرد کے حقوق کی حفاظت نہ کرے تو معاشرے
اور ملّت کو پورا حق حاصل ہو گا کہ حاکم کو معزول کر کے کسی ایسے آدمی کو اس کا منصب
سونپے جو اس بلند منصب کے واجبات و وظائف پورے کرنے کا اہل ہو۔

غیر مسلموں کے ساتھ معاملات

اسلام غیر مسلموں کے ساتھ دشمنی یا نفرت کا روادار نہیں، بلکہ روزانہ زندگی میں ان کے ساتھ تعاون کا خواہاں ہے اور پہلو بہ پہلو اطمینان و دل جمعی سے رہنا چاہتا ہے۔ قرآنِ مجید کا ارشاد ہے:

قُلْ يَا أَيُّهَا الْكَافِرُونَ لَا أَعْبُدُ مَا تَعْبُدُونَ ۝ وَلَا أَنْتُمْ عَابِدُونَ مَا أَعْبُدُ ۝ وَلَا أَنَا عَابِدٌ مَا عَبَدْتُمْ وَلَا أَنْتُمْ عَابِدُونَ مَا أَعْبُدُ ۝ لَكُمْ دِينُكُمْ وَلِيَ دِينِ ۝ (الکافرون)

تو کہہ دے منکرو، میں نہیں پوجتا جس کو تم پوجتے ہو اور نہ تم پوجو جس کو میں پوجتا ہوں، نہ مجھ کو پوجنا ہے اس کا جس کو تم نے پوجا اور نہ تم کو پوجنا ہے اس کا جس کو میں پوجوں۔ تم کو تمھاری راہ اور مجھ کو میری راہ۔

فَلِذَٰلِكَ فَادْعُ ۖ وَاسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتَ ۖ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَهُمْ ۖ وَقُلْ آمَنْتُ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ مِنْ كِتَابٍ ۖ وَأُمِرْتُ لِأَعْدِلَ بَيْنَكُمُ ۖ اللَّهُ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ ۖ لَنَا أَعْمَالُنَا وَلَكُمْ أَعْمَالُكُمْ ۖ لَا حُجَّةَ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ ۖ اللَّهُ يَجْمَعُ بَيْنَنَا ۖ وَإِلَيْهِ الْمَصِيرُ ۝ (شوریٰ: ١٥)

سو تو اسی طرف بلا اور قائم رہ جیسا کہ فرما دیا ہے تجھ کو اور مت چل ان کی خواہشوں پر اور کہہ میں یقین لایا ہر کتاب پر جو اتاری اللہ نے، اور مجھ کو حکم ہے کہ انصاف کروں تمھارے بیچ میں، اللہ رب ہے ہمارا اور تمھارا۔ ہم کو ملیں گے ہمارے کام، اور تم کو ملیں گے تمھارے کام کچھ جھگڑا نہیں ہم میں اور تم میں اللہ اکٹھا کرے گا ہم سب کو اور اسی طرف پھر جانا ہے

جب غیر مسلم مسلمانوں کے ساتھ ایک ہی ملک میں رہتے ہوں تو حد درجہ ضروری امر ہے کہ عقیدے کی آزادی بہرحال محفوظ رہے لیکن غیر مسلم اپنے طریقے کے مطابق خدا کی عبادت کر سکیں یا مجلسیں منعقد کریں۔ عوامی حقوق و واجبات میں انھیں ہم وطن مسلمانوں کے ساتھ کامل مساوات کا درجہ حاصل رہے۔ ہم بتا چکے ہیں کہ مسلمان مسیحی اور یہودی عورت سے شادی کر سکتا ہے۔ ان بیویوں کو وہی حقوق حاصل رہتے ہیں جو مسلم بیویوں کو حاصل ہیں۔ نیز وہ اپنے مذہب میں بالکل آزاد ہوں گی اور مذہبی فرائض بجا لانے میں ان پر کوئی پابندی عائد نہ ہوگی۔

اگر کسی مسلمان نوجوان کے ماں باپ مشرک ہوں اور وہ نوجوان کو اسلام سے ہٹا کر اپنے مسلک پر لانے کی بھی کوشش کریں، پھر بھی قرآن کا حکم یہی ہے کہ ان کے ساتھ اچھے طریقے پر پیش آنا چاہیے اور ان سے بہت نرمی کا برتاؤ کرنا چاہیے:

وَوَصَّيْنَا الْإِنسَانَ بِوَالِدَيْهِ.... ....وَإِن جَاهَدَاكَ عَلَىٰ أَن تُشْرِكَ بِي مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوفًا وَاتَّبِعْ سَبِيلَ مَنْ أَنَابَ إِلَيَّ	ہم نے تاکید کر دی انسان کو اس کے ماں باپ کے واسطے...... اور اگر وہ دونوں تجھ سے اڑیں اس بات پر کہ شریک مان میرا اس چیز کو جو تجھ کو معلوم نہیں تو ان کا کہنا مت مان اور ساتھ دے ان کا دنیا میں دستور کے موافق اور راہ چل اس کی جو رجوع ہوا میری طرف۔
(لقمان: ۱۴۔۱۵)	

تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ رسول اللہ صلعم کے چچا ابوطالب اپنی موت تک پہلے راستے پر قائم رہے، لیکن انھوں نے رسول اللہ صلعم کی حفاظت کی اور آپ کا زیادہ سے زیادہ ساتھ دیا۔

اسلام تبلیغ کے سلسلے میں جبر استعمال کرنے اور لوگوں کو مجبور کر کے مسلمان بنانے کا سخت مخالف ہے وہ اپنی طرف غیر مسلموں کو دعوت دیتا ہے تو محض فوائد پر زور دیتا ہے

...ثلاً یہ دین بہ آسانی ذہن نشیں ہو جاتا ہے، اس کے واجبات، افعالِ عبادت اور معاملات بہت
...ادہ ہیں اس کے اخلاقی اصول ہیں رواداری کی روح سرایت کیے ہوئے ہے۔ اس میں چھان
...ن اور غور و فکر کی آزادی ہے۔ یہ کائنات کے حقائق ذہن نشین کرنے کی طرف متوجہ
...رتا ہے۔ اس نے انسان کے درمیان تمام امتیازات ختم کر دیے ہیں، صرف تقویٰ اور
...ن عمل کا امتیاز باقی رکھا ہے۔ یہ دینِ حق سکھاتا ہے کہ کسی شخص کو دوسرے کے عقائد
...ی قسم کا اختیار حاصل نہیں۔ صرف خدا کا حکم عقائد کے باب میں قبول کرنا چاہیے، اس
...ی عبادت ہونی چاہیے اور وہی عبادت کا مرجع ہے۔

اسلام نے مسلمانوں اور دوسرے مذاہب کے پیراؤں کے درمیان مشترکہ بہبود کے
...ے رفاقت اور تعاون کا مسلک اختیار کیا۔ جو غیر مسلمانوں کے درمیان امن سے رہتے ہیں
...تعاون سے کام کرتے ہیں، اسلام انھیں مسلمانوں کے برابر سمجھتا ہے۔ ہر شخص جو عقیدہ
...ہے رکھے لیکن یہ ضروری ہے کہ اپنے مقاصد سوچ سمجھ کر اور دوستانہ استدلال سے
...ن کرتا رہے۔ نہ کسی پر دباؤ ڈالے، نہ کسی کے حقوق میں رخنہ انداز ہو۔ اسلام صرف یہ
...ضا کرتا ہے کہ مسلمانوں کے خلاف دشمنی یا فتنہ و فساد یا اسلامی طریقِ زندگی کی صریح
...لفت سے احتراز کیا جائے۔

مسلم اور غیر مسلم حکومتوں کے تعلق میں اسلام کا موقف یہ ہے کہ ساری دنیا کو بہبودِ عامہ
...ے لیے کام کی دعوت دی جائے۔ اسلام حالتِ امن میں غیر مسلم طاقتوں کے ساتھ عہد و پیمان
...تعاون کی اجازت دیتا ہے بہ شرطیکہ عہد و پیماں اسلام کے بنیادی اصول سے متصادم نہ
...قرآنِ مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

لَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ	اللہ تم کو منع نہیں کرتا ان لوگوں سے جو لڑے
يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ	نہیں تم سے دین پر اور نکالا نہیں تم کو تمھارے
مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَ	گھروں سے کہ ان سے کرو بھلائی اور انصاف کا

تُقْسِطُوْٓا اِلَيْهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ۝ اِنَّمَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ قٰتَلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَاَخْرَجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ وَظٰهَرُوْا عَلٰٓي اِخْرَاجِكُمْ اَنْ تَوَلَّوْهُمْ ۚ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝

سلوک بے شک اللہ چاہتا ہے انصاف کرنے والوں کو۔ اللہ تو منع کرتا ہے تم کو ان سے جو لڑے تم سے دین پر اور نکالا تم کو تمھارے گھروں سے اور شریک ہوئے تمھارے نکالنے میں کہ ان سے کرو دوستی اور جو کوئی ان سے دوستی کرے سو وہی لوگ ہیں گناہگار

(الممتحنہ: ۸-۹)

اسلام اس وقت تک غیر مسلم ممالک کے ساتھ تعلقات کے انقطاع کی ضرورت محسوس نہیں کرتا جب تک خود کوئی غیر مسلم ملک اس پر جارحانہ حملہ نہ کر دے یا اسلام کی راہ میں مشکلات پیدا نہ کر دی جائیں یا مسلمانوں کا اغوا شروع نہ ہو جائے۔ اگر اس قسم کی مصیبت سے سابقہ آپڑے تو مومنوں کو اجازت ہے بلکہ فرض ہے کہ حملے کو روکیں، حملہ آور کو شکست دیں۔ امن بحال کر دیں اور ایسی حالت از سر نو رونما ہو جائے جس میں لوگ آزادانہ فکر و عمل کے مجاز ہوں۔ اسلام مسلمانوں کو کسی ایسے جارحانہ حملے کی اجازت نہیں دیتا جس کا محرک لوگوں کے جذبۂ ظلم و جور کو تسکین بہم پہنچانا ہو۔ یہ بھی جائز نہیں کہ کسی قوم کے وسائل کو نقصان پہنچایا جائے یا انھیں مصائب کا ہدف بنایا جائے یا انھیں گھروں سے باہر نکالا جائے۔ جب واقعی جنگ چھڑ جائے تو اس وقت بھی اسلام نے تباہی اور کامل بربادی کو جائز نہیں رکھا، بلکہ وہ غیر مضافی آبادی کے اس حصے کو قتل کرنے کی اجازت نہیں دیتا جو براہ راست جنگ میں شریک نہ ہو مثلاً عورتیں، بچے، بوڑھے یا اپاہج۔ رسول اللہ صلعم کا ارشاد ہے کہ بچوں کو نہ مارو جب عرض کیا گیا کہ کیا وہ کافروں کے بچے نہیں تو فرمایا کیا تم میں بہترین آدمی کافروں کی اولاد نہیں؟

اسلام اس وقت تک جنگ میں شریک ہونے کی اجازت نہیں دیتا جب تک ابا

ی طرح واضح نہ ہوجائیں اور دشمن کو مناسب طریق پر متنبہ نہ کردیا جائے جنگی قیدیوں سے
وکی اسلام کے نزدیک قابل مذمت ہے، اُنھیں اذیت نہیں پہنچانی چاہیے۔ قتل نہیں
اچاہیے۔ قرآن میں صاف صاف بیان کردیا گیا ہے کہ قیدیوں کو مناسب غذا دی جائے
ر اللہ تعالٰے سے محبت کا ثبوت ہے:

وَيُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلَىٰ حُبِّهِ مِسْكِينًا وَيَتِيمًا وَأَسِيرًا (دہر:۸)

اور کھلاتے ہیں کھانا اللہ تعالٰے کی محبت کے جوش میں محتاج کو اور یتیم کو اور قیدی کو۔

باقاعدہ جنگ ختم ہوجائے تو پھر مسلمانوں کی طرف سے یہ تقاضا نہیں کیا جاسکتا کہ دشمن
رح اسلام قبول کرلے اگر دشمن جارحانہ اقدام چھوڑ دے، معاہدے پر دستخط کر
ے جس میں لوگوں کے حقوق کی حفاظت اور اُنھیں ظلم و فساد سے بچانے کا اقرار ہو تو بس
ی ہوگا۔

یہ اصول ہیں جن پر مسلمانوں اور غیر مسلموں کے تعلقات اور ضوابط کی بنیاد رکھی گئی ہے
بطِ جنگ کی بنیاد قرآنِ مجید نے رکھی ہے، رسول اللہ صلعم اور آپ کے ممتاز خلفا نے
ں جامۂ عمل پہنایا۔

ا و سزا یہاں تک ہم اسلامی قواعد و ضوابط —— عبادت و معاملات —— پر
گفتگو کرتے رہے ہیں۔ ان قواعد و ضوابط میں جزا و سزا کا بھی ذکر آتا ہے
س دنیا اور آئندہ دنیا میں مقرر ہے۔ اسلام نے قتل کے لیے موت کی چوری کے لیے
کاٹنے کی اور زنا اور تہمت کے لیے تازیانے کی سزا تجویز کی ہے۔ یہی تین جرم
جن کے لیے قطعی سزائیں بنادی گئی ہیں۔ دوسرے جرم اور خلاف ورزیوں کی سزائیں
م کے صواب دید پر چھوڑ دی گئی ہیں۔ جو قوم کا نمائندہ ہوتا ہے اور مشورے کے بعد عمل
اہے۔

عالمِ عقبیٰ میں جزا و سزا کے متعلق اللہ تعالٰی فرماتا ہے:

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ وَذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيْهَا ۠ وَلَهٗ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ۝

(النساء: ۱۳-۱۴)

اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول کی فرمانبرداری کرے گا تو اللہ اُسے ایسے باغوں میں داخل کر دے گا جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی۔ وہ اس حالت میں ہمیشہ رہیں گے اور بڑی ہی کامیابی ہے جو انھیں حاصل ہوگی لیکن جس کسی نے اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کی اور اُس کی ٹھہرائی ہوئی حدبندیوں سے باہر نکل گیا تو وہ آگ کے عذاب میں ڈالا جائے گا۔ وہ ہمیشہ اس حالت میں رہے گا اور اُس کے لیے رسوا کرنے والا عذاب ہوگا۔

مقررہ حدود سے تجاوز کرنے والوں اور بدعملوں کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

اِنَّمَا جَزٰۗؤُا الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَسْعَوْنَ فِي الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ يُّقَتَّلُوْٓا اَوْ يُصَلَّبُوْٓا اَوْ تُـقَطَّعَ اَيْدِيْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ مِّنْ خِلَافٍ اَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ ۭ ذٰلِكَ لَهُمْ خِزْيٌ فِي الدُّنْيَا وَلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝

(مائدہ: ۳۳)

جو لوگ اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کرتے ہیں اور ملک میں خرابی پھیلانے کے لیے دوڑتے پھرتے ہیں یہی سزا ہے کہ قتل کردیے جائیں یا سولی پر چڑھائے جائیں یا ان کے ہاتھ پاؤں مخالف جہتوں سے کاٹ ڈالے جائیں یا انھیں جلاوطن کر دیا جائے۔ یہ ان کے لیے دنیا میں رسوائی ہے اور آخرت میں بھی ان کے لیے عذابِ عظیم ہے۔

غرض ہم پر یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ عبادات و معاملات دونوں کے سلسلے میں اپنے آقا و مولیٰ کے سامنے پیش ہونا ہے اور اپنے اعمال کے مطابق آخرت کی زندگی میں جزا و سزا پانا ہے۔ اسلام میں عبادات و معاملات دونوں کی حیثیت مذہبی ہے اور مسلمان اپنے تمام اعمال کے لیے آخرت کی زندگی میں خدا کے روبرو جواب دہ ہے جس طرح کہ اس زندگی

دالت کے روبرو جواب دہ ہوتا ہے۔

اگر کوئی مسلمان عمداً قانونِ الٰہی کو توڑتا ہے تو یہ بڑا سخت گناہ ہے اور اس کے
ہی ذمہ دار ہے۔ اور جو اسے گناہ پر آمادہ کرتا ہے وہ ذمہ داری سے اسے پاک
رسکتا البتہ شریک و معین جرم کی حیثیت میں وہ بھی اپنے گناہ کی سزا پائے گا قرآن مجید
رشاد کے مطابق خدا کا یہ پرانا قانون ہے کہ گناہ گار اپنے گناہ کی ذمہ داری خود
تا ہے۔

وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی — موسیٰ اور ابراہیم کے صحیفوں میں یہی تھا کہ نہیں اٹھاتا

(النجم: ۳۸) — بوجھ کوئی اٹھانے والا کسی دوسرے کا۔

اسلام کے مسلمہ اصول میں سے ایک یہ ہے کہ صرف خدا گناہ معاف کرتا ہے اور خدا نے
رحق یا اختیار نہیں دیا کہ کسی کے گناہ معاف کرے:

مَنْ یَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰہُ — اور خدا کے سوا کون ہے جو گناہوں

(آل عمران: ۱۳۵) — کا بخشنے والا ہو۔

دوسرا اصول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تمام گناہ بخش سکتا ہے مگر شرک کا گناہ نہیں بخشے گا:

اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَكَ بِهٖ وَ — اللہ یہ بات بخشنے والا نہیں کہ اس کے ساتھ
یَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ یَّشَآءُ — کسی کو شریک ٹھہرایا جائے۔ اس کے سوا جتنے

(النساء: ۱۱۶) — گناہ ہیں وہ جسے چاہے بخش دے۔

شرک میں خدا کی وحدت اور الوہیت کے متعلق شبہ بھی شامل ہے۔ جو لوگ خالق کو
نتے۔ خدا کے سوا کسی اور کی عبادت کرتے ہیں یا حلال و حرام اور جائز و ناجائز کے متعلق
ے قانون سے اختلاف رکھتے ہیں۔ وہ سب منکر ہیں۔

اسلام کا ایک اصول یہ بھی ہے کہ اگر گناہ گار توبہ کرلے، آئندہ اللہ تعالیٰ سے ڈر کی
بر گناہ نہ کرے اور اس کے احکام پر کاربند رہنے کا عزم مصمم کرلے تو خدا نے اُسے

بخش دینے کا عہد کر رکھا ہے:

وَهُوَ الَّذِي يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهِ وَ يَعْفُوا عَنِ السَّيِّاٰتِ وَيَعْلَمُ مَا تَفْعَلُوْنَ ○ (شوریٰ : ۲۵)

اور وہی ہے جو قبول کرتا ہے توبہ اپنے بندوں کی اور معاف کرتا ہے برائیاں اور جانتا ہے جو کچھ تم کرتے ہو۔

اسلام اس اصل پر پختگی سے جما ہوا ہے کہ انسان گناہوں سے پاک پیدا ہوتا ہے جب تک بالغ نہیں ہو جاتا اور اللہ کا کلام نہیں سن لیتا پاک رہتا ہے۔ اس کے بعد اگر وہ خدا کی تعلیمات سے آنکھیں بند کر لے گا، ان کی پابندی نہیں کرے گا تو اس وقت گناہ گار متصور ہو گا اور ذمہ داری اس کی گردن پر ہو گی۔

اخلاقی نظام

اب تک ہم نے اس مقالے میں اسلامی عقائد، اسلامی عبادات اور اسلامی معاملات کے متعلق بحث کی۔ اسلام کا اخلاقی نظام مسلمان کی زندگی میں عنصر ہے اور اتنا ہی اہم ہے جتنے کہ پہلے تین ہیں۔ اس پر بھی کاربندی آخرت کی زندگی میں اور اس سے غفلت مستوجب سزا ہوتی ہے۔ اسلام کے اخلاقی اصول، اسلامی تعلیمات قواعد پر مسلمان کو پختہ کر دیتے ہیں اور اس وجہ سے مہذب معاشرہ معرضِ وجود میں آتا ہے۔ اخلاقی اصول مفاہمت کے رشتوں کو مضبوط بناتے ہیں اور مسلمانوں کے درمیان جذبات احساسات کا اشتراک و اتحاد پیدا کرتے ہیں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو تاکید کی ہے کہ وہ سچ بولیں، دوسروں کے ساتھ عفو و درگزر سے پیش آئیں اور تمام روابط میں ملائمت، رحم جواں مردی اور محبت کا مظاہرہ کریں۔

اسلام کا اخلاقی نظام مہذب معاشرے کے اصولِ آداب پیش کرتا ہے، یہ معاشرہ اور حد درجہ ترقی یافتہ لوگوں دونوں کے لیے یکساں ہے، قرآن مجید چلن اور روش میں درمیانہ درجہ پیش کرنے کے متعلق کہتا ہے:

وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ

اور اپنے گال مت پھلا لوگوں کی طرف اور مت چل زمین

وَلَا تَمْشِ فِی الْاَرْضِ مَرَحًا ۚ اِنَّ اللّٰہَ	اتراتا۔ بے شک اللہ کو نہیں بھاتا کوئی اتراتا
لَا یُحِبُّ کُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ ۝	بڑائیاں کرنے والا اور چل بیچ کی چال اور نیچی
(لقمان: ۱۸، ۱۹)	کر آواز اپنی۔

اپنے ہمسایے کو آواز دینے کے آداب یہ بتاتے ہیں:

اِنَّ الَّذِیْنَ یُنَادُوْنَکَ مِنْ وَّرَآءِ الْحُجُرٰتِ	جو لوگ پکارتے ہیں تجھ کو دیوار کے پیچھے سے
اَکْثَرُھُمْ لَا یَعْقِلُوْنَ ۝ (حجرات: ۴)	ان میں سے اکثر عقل نہیں رکھتے۔
لَا تَدْخُلُوْا بُیُوْتًا غَیْرَ بُیُوْتِکُمْ حَتّٰی	مت جایا کرو کسی گھر میں اپنے گھروں
تَسْتَاْنِسُوْا وَتُسَلِّمُوْا عَلٰۤی اَھْلِھَا	کے سوا جب تک اجازت نہ لے لو اور سلام
(النور: ۲۷)	کر لو ان گھر والوں پر۔

جنسی بے قاعدگیوں کا دروازہ بند کرتے ہوئے قرآنِ مجید کہتا ہے:

قُلْ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ یَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِھِمْ	ایمان والوں کو کہہ دو کہ اپنی آنکھیں ذرا نیچی رکھیں
وَیَحْفَظُوْا فُرُوْجَھُمْ ۚ ذٰلِکَ اَزْکٰی	اور اپنے ستر کو تھامتے رہیں، ان میں خوب ستھرائی
لَھُمْ ۚ اِنَّ اللّٰہَ خَبِیْرٌۢ بِمَا یَصْنَعُوْنَ ۝	ہے ان کے لیے، بے شک اللہ کو خبر ہے
وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ یَغْضُضْنَ مِنْ	ان کے پیشے۔ اور ایمان والی عورتوں کو کہہ دو
اَبْصَارِھِنَّ وَیَحْفَظْنَ فُرُوْجَھُنَّ	کہ اپنی آنکھیں نیچی رکھیں اور اپنے ستر کو تھامتی رہیں
وَلَا یُبْدِیْنَ زِیْنَتَھُنَّ اِلَّا مَا ظَھَرَ	اور اپنا سنگھار نہ دکھائیں مگر جو کھلی چیز ہے اس
مِنْھَا وَلْیَضْرِبْنَ بِخُمُرِھِنَّ عَلٰی	میں سے اور ڈال لیں اپنی اوڑھنیاں اپنے
جُیُوْبِھِنَّ (نور: ۳۰، ۳۱)	گریبان پر۔

غیر مناسب گفت گو کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے:

لَا یَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰۤی اَنْ	ٹھٹھا نہ کرے ایک قوم دوسری سے، شاید
یَّکُوْنُوْا خَیْرًا مِّنْھُمْ وَلَا نِسَآءٌ	وہ بہتر ہو اس سے اور نہ عورتیں دوسری عورتوں

مِّنْ نِّسَآءٍ عَسٰٓى اَنْ يَّكُنَّ خَيْرًا مِّنْهُنَّ ۚ سے شاید وہ بہتر ہوں اُن سے، اور عیب
وَلَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوْا لگاؤ ایک دوسرے کو اور نام نہ ڈالو واسطے
بِالْاَلْقَابِ ۭ (حجرات: ۱۱) ایک دوسرے کے۔

اسلام نے مجلسی آداب کے ان ہی قواعد اور اُن جیسے دوسرے قواعد سے اُن کی رہنمائی کی جو نشوو ارتقا کی منزلوں میں پس ماندہ تھے۔ انھیں اس امر پر آمادہ کیا کہ مناسب حاصل کریں اور ترقی یافتہ مجلسی طبقات کے برابر پہنچ جائیں؎۔ ساتھ ہی اسلام تمام طبقوں لوگوں کو دعوت دیتا ہے کہ وہ ترقی کے انتہائی اخلاقی اور روحانی معیار کے مطابق بسر کریں۔

۱۔ خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ وَاَعْرِضْ نرمی اور درگزر سے کام لو نیکی کا حکم دو، جاہل
عَنِ الْجٰهِلِيْنَ ۝ (اعراف: ۱۹۹) کی طرف متوجہ نہ ہو۔

۲۔ وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ۭ اور برابر نہیں نیکی اور بدی، جواب میں وہ کہہ جو
اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِىَ اَحْسَنُ (حٰم سجدہ: ۳۴) سے بہتر ہو۔

۳۔ اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِي السَّرَّاۗءِ وَالضَّرَّاۗءِ وہ لوگ جو خوش حالی ہو یا تنگ دستی ہر حال میں خدا
وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ کے لیے مال خرچ کرتے ہیں غصے میں آکر بے تاب
النَّاسِ ۭ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ۝ نہیں ہو جاتے اور لوگوں کے قصور بخش دیتے ہیں
(آل عمران: ۱۳۴) اور اللہ نیک کرداروں کو دوست رکھتا ہے۔

؎ اس عبارت سے دل میں یہ شبہ پیدا نہ ہونا چاہیئے کہ یہ عرب کے پس ماندہ معاشرے کے لیے ہدایت تھی یورپ بڑی ترقی کر چکا ہے۔ یہ تاثر درست نہ ہوگا۔ نزول قرآن کے وقت یورپ عربوں سے زیادہ وحشی تھا اور شائستگی کے جو جوہر اسلام سے لیے وہی اس کا سرمایہ ناز ہیں ورنہ فرانس الجزائر میں بلجیم اور کانگو میں یورپ اب جو کچھ کر چکا ہے .... اب کر رہا ہے یا فرانس نے اس سے دو سال پیش تر مصر کیا تھا۔ کیا وہ وحشت کی بدترین صورتیں نہ تھیں؟ کیا یورپ کے استعمار کی پوری سرگزشت وحشت اور حق ناشناسی کا سیاہ ترین مرقع نہیں؟

إِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِيَ ۚ — اگر تم پورے طور پر خیرات کرو تو یہ بھی اچھی بات ہے
وَإِنْ تُخْفُوهَا وَتُؤْتُوهَا الْفُقَرَاءَ — اور اگر پوشیدہ رکھو اور محتاجوں کو دے دو تو یہ تمہارے
فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ (البقرہ: ۲۷۱) — لیے بہتری ہے۔

ان اخلاقی اصول کے مطابق زندگی بسر کرنے کی دعوت دیتے ہوئے اسلام حقیقت میں یہ بتاتا ہے کہ تمام اُمور میں اعتدال اور توسط پیشِ نظر رہنا چاہیے۔ اس طرح پریشانی بھی پیدا نہ ہوگی اور کسی کا درجہ بھی نیچا نہ ہوگا۔ اسلام مسلمانوں سے ہمت و کشادہ دلی کا تقاضا کرتا ہے۔ اُنھیں بزدلی اور اسراف سے روکتا ہے۔ وہ عفو و درگزر کی تاکید کرتا ہے۔ نہ کسی کے سامنے خواہ مخواہ جھکنا اُسے پسند ہے، نہ بدلہ لینا۔ اسلام مہمان نوازی کی تاکید کرتا ہے۔ فضول خرچی اور بخل دونوں کو بُرا بتاتا ہے:

۱۔ وَآتِ ذَا الْقُرْبَىٰ حَقَّهُ وَالْمِسْكِينَ — اور جو لوگ تمھارے قرابت دار ہیں جو مسکین ہیں، جو مسافر
وَابْنَ السَّبِيلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيرًا ۝ — ہیں ان سب کا تم پر حق ہے۔ ان کا حق ادا کرتے رہو
(بنی اسرآءیل: ۲۶) — اور مال و دولت کو بے محل خرچ نہ کرو جیسا کہ بے محل خرچ کرنا ہوتا ہے

۲۔ وَالَّذِينَ إِذَا أَنْفَقُوا لَمْ يُسْرِفُوا وَلَمْ — اور وہ لوگ کہ جب خرچ کرنے لگیں، نہ بیجا اڑا دیں
يَقْتُرُوا وَكَانَ بَيْنَ ذَٰلِكَ قَوَامًا ۝ — اور نہ تنگی کریں اور ہے اس کے بیچ بیچ سیدھی
(فرقان: ۶۷) — گزران۔

یہ مسلمانوں کے لیے اخلاقی اصول کا اجمالی ساخاکہ ہے۔

قانون سازی کے ماخذ

اسلام میں قانون سازی کا بنیادی سرچشمہ قرآنِ مجید ہے، جو بے شک و شبہ خدا کی کتاب ہے، اس کے رسول صلعم پر نازل ہوئی تاکہ لوگ ہدایت پائیں۔ اللہ تعالیٰ کے احکام کے روبرو سرِ تسلیم خم کریں اور جن کاموں سے اُنھیں منع کیا گیا ہے، اُن سے دُور رہیں۔ قرآن مجید میں قانون سازی کی دو قسمیں ہیں اول وہ آیات جن کے معنی آئینہ کی طرح روشن ہیں اور اُن کے تعلق میں بحث کی کوئی

گنجائش نہیں. دوسری وہ آیات جن کے دو یا زیادہ مطلب ہو سکتے ہیں۔

قانونی ماخذ سنّت ہے۔ اور وہ دبستان ہائے افکار جن کا تعلق ان آیات سے ہے جن کے معنی میں مزید تعبیر کی گنجائش ہے۔ قرآنِ مجید کے بعد اسلامی قانون سازی میں تعبیر کا سب سے بڑا سرچشمہ سنت ہے یعنی رسول صلعم کے ارشادات، اعمال، قانونی فیصلے جو مستند طریقے پر ہمارے پاس پہنچے۔ اگر کوئی ایسا مسئلہ پیدا ہو جس کے لیے قرآن مجید یا سنت میں کوئی واضح حکم موجود نہ ہو، تو پھر اس کے متعلق دبستان ہائے افکار میں نظیر تلاش کی جاتی ہے یعنی ان نظریات میں جو ایسے ارباب فکر نے مدوّن کیے جنھیں قرآن و سنّت کے لحاظ عالم سمجھا جاتا تھا۔ پھر ان کے معنی پر غور کرتے رہے اور عام اصول ذہن میں بٹھاتے رہے نیز انھیں نیکی اور بہبودِ عامہ کے متعلق گہری واقفیت تھی۔ ترتیب درجات کے اعتبار سے یہی تینوں ماخذ ہیں جو مسلمانوں کے نزدیک رسول اللہ کے عہدِ مبارک سے مسلّم چلے آئے ہیں، یہی اس دنیا کے قیام تک اسلامی قانون سازی کے ماخذ بنے رہے ہیں۔

قرآنِ مجید قرآنِ مجید کے متعلق ہم پہلے جو گفت گو کر چکے ہیں، اس میں بتایا گیا تھا کہ اس کی بہت سی آیات میں لوگوں کو اس کی تعلیمات کی پیروی کرنے اور قانون سازی میں اس کی رہنمائی قبول کرنے کی دعوت دی گئی ہے،

۱۔ اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ (النساء: ۱۰۵)	ہم نے (اے پیغمبر!) تم پر الکتاب سچائی کے ساتھ نازل کر دی ہے تاکہ جیسا کچھ خدا نے بتلا دیا ہے اس کے مطابق لوگوں کے درمیان فیصلہ کرے۔
۲۔ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ (البقرہ ۲: ۲۲۹)	یہ اللہ کی ٹھہرائی ہوئی حدبندیاں ہیں، پس ان سے باہر قدم نہ نکالو جو کوئی اللہ کی حدبندیوں سے باہر نکل جائے گا تو ایسے ہی لوگ ہیں جو ظلم کرنے والے ہیں۔

قرآنِ مجید عبادات کے متعلق ہدایات دیتا ہے، مثلاً نماز کے مقررہ اوقات، روزہ، زکوٰۃ اور حج، خاندانی زندگی کے قواعد وضع کرتا ہے یعنی شادی بیاہ اور طلاق۔ مالی اُمور کے متعلق واضح ہدایات دیتا ہے، مثلاً عہد و پیماں۔ اہل کتاب اور منکروں کے ساتھ تعلقات، جہاد، مجاہدین اور غیر مجاہدین، ملت کا اجتماعی نظم و نسق، حالاتِ قانون سازی، فرمانبرداری سے انحراف کی سزائیں۔

اس طرح قرآنِ مجید ایمان اور مجموعۂ قوانین کی بنیاد قرار پایا، اگرچہ متشابہ آیات کے سلسلے میں قانون سازی محلِ نظر اور مزید غور و فکر کی موجب ہو سکتی ہے، لیکن جو آیات واضح محکم ہیں اور ان میں ایک سے زیادہ معنی کی گنجائش نہیں، وہ تمام مسلمانوں پر واجب و لازم اگر کوئی مسلمان عملی معاملات میں اُس قانون کی پیروی نہ کرے گا، تو یہی سمجھا جائے گا وہ اسلام سے اعراض کر رہا ہے۔ جو شخص یہ کہے قرآن (معاذ اللہ) ایک خاص قوم اور خاص کے لیے نازل ہوا تھا یا اُس کا تعلق انسانی زندگی کے محدود پہلو سے ہے تو وہ اسلام ور اللہ تعالیٰ کی کتاب کا منکر ہے۔

سنت سنّت کے دو پہلو ہیں: ایک رسول اللہ صلعم کے وہ فیصلے جن کے متعلق قرآن میں کوئی تفصیل موجود نہ تھی، دوسرے انسان ہونے کی حیثیت میں رسول اللہ صلعم کے اعمال و ارشادات کے متعلق روایات۔

جو فیصلے رسول اللہ صلعم نے فرمائے ان کی مثال میں نماز کی وضع و ہیئت کے قواعد کے مناسک اور شادی کی تفصیلات پیش کی جا سکتی ہیں، مثلاً دو ایسے افراد میں شادی نہیں جو بچپن میں ایک ماں کا دودھ پیتے رہے، یا مرد ایک ہی وقت میں پھوپھی اور بھتیجی سے شادی نہیں کر سکتا، اس قسم کی تعلیمات ان معاملات کے متعلق رسول اللہ صلعم کی ہدایات پر مبنی ہیں جن کا ذکر قرآنِ مجید میں نہیں آیا۔

سنّت کے دوسرے پہلو کا تعلق وضعِ قانون سے نہیں، اس میں رسول اللہ صلعم

کی تعلیمات اور اعمال کے متعلق وہ روایات آتی ہیں جنھیں انسان کے صواب دید پر چھوڑ دیا گیا ہے، یعنی وہ معاملات جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے جائز و ناجائز کا کوئی قطعی حکم نہیں دیا، مثلاً کب کھڑا ہونا چاہیے اور کب بیٹھنا چاہیے، کھانے پینے اور سونے کے متعلق آداب یا ایسے معاملات جن کے متعلق معلومات، تجربے یا مہارت فن سے حاصل کی جاتی ہیں، اس سلسلے میں زراعت، صنعت و حرفت، طب، فوجی نظم و نسق اور حربی تدابیر پیش کی جا سکتی ہیں۔ مستند روایت ہے کہ ایک جنگ میں رسول اللہ صلعم نے فوج کے ایک دستے کو ایک خاص مقام پر ٹھہرانا چاہا۔ آپ کے پیروؤں نے اس سے اختلاف کرتے ہوئے عرض کیا کہ آپ نے یہ مقام خدا کے حکم سے انتخاب کیا ہے یا اپنی رائے سے چنا ہے؟ رسول اللہ صلعم نے فرمایا: نہیں، یہ تو میں نے اپنی رائے سے چنا ہے۔ پیروؤں نے عرض کیا کہ یہ موزوں مقام نہیں اور دوسری جگہ کو ترجیح دینے کے سلسلے میں دلائل پیش کر دیے۔ رسول اللہ صلعم کو یہ رائے صحیح نظر آئی، لہٰذا اپنا اختیار کردہ نقشہ ترک کر دیا۔ اک موقع پر رسول اللہ صلعم نے کھجور کے درختوں میں پھل آنے کے متعلق مروجہ طریقوں سے اختلاف فرمایا اور اس سال درختوں میں پھل کی کمی رہی، جب یہ معاملہ رسول اللہ صلعم کی خدمت میں عرض کیا گیا تو فرمایا اپنے دنیاوی معاملات کو تم بہتر جانتے ہو۔

جو علم تجربے پر موقوف ہے اس کے متعلق رسول اللہ صلعم سے منسوب روایات اسلامی قانون کی بنیاد نہیں، صرف وہی روایات قانون کا سرچشمہ ہو سکتی ہیں اور اُن کی پیروی لازم ہے، جو آپ پر رہنمائی کے لیے نازل ہوئی ہو۔

سنّت، وضع قانون کے سلسلے میں قرآن کے اصول اور بنیادی قوانین کے تابع ہے۔ سنّت کی اہمیت کا پہلو یہ ہے کہ اس نے قرآن کے عام اصول کو معین شکل دے دی اور اُن کی یہ تعیین عملی صورت میں سامنے آیا، جیسے نماز کے متعلق پڑھ کر دکھا دیا اور ہر نماز کی رکعتوں کی گنتی واضح فرما دی ادائے نماز کے اوقات بھی مقرر کر دیے۔ اس سلسلے میں یہ بھی ہو سکتا

ہے کہ بعض مراسم کا اضافہ کر دیا گیا ہو جن کا ذکر قرآنِ مجید میں نہیں آیا۔ ایک صورت یہ بھی ہے کہ
من عام اصول کے متعلق ایک راے پیش فرمادی گئی مثلاً یہ راے کہ قرآنِ مجید میں بیان کردہ
ی اثر کے متعلق دو پہلو ہوں تو سادہ تر اور واضح تر پہلو اختیار کر لیا جاے۔ اس طرح ہم کہہ
سکتے ہیں کہ سنت میں وضع قانون کے متعلق جو کچھ موجود ہے وہ دراصل قرآن کے مطالب و مقاصد
ر داخلی مضمرات کے بارے میں رسول اللہ صلعم کی تعلیم ہے بغرض جو قانون سنت پر مبنی
ہے وہ بھی دراصل قرآن ہی سے ناشی ہوا۔

رسول اللہ صلعم نے قرآن کی تعبیر و تفصیل کے بارے میں جو کچھ فرمایا اُس میں سے
مت و مناسب کے متعلق اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے تصدیق ہوئی جہاں کوئی اختلاف نظر آیا،
س کی تصحیح کر دی ایک مرتبہ رسول اللہ صلعم نے ایمان کے سلسلے میں احتیاط کی بنا پر بعض
ل چیزیں ترک فرماویں تو باری تعالیٰ کا ارشاد ہوا۔

یا اَیُّھَا النَّبِیُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَا اَحَلَّ اللّٰہُ لَکَ تَبْتَغِیْ مَرْضَاتَ اَزْوَاجِکَ
(تحریم ۶۶: ۱)

اے نبی کیوں حرام کرتا ہے جو حلال کیا اللہ نے تجھ پر، چاہتا ہے تو رضامندی اپنی عورتوں کی۔

یہ اور اس قسم کی دوسری مثالیں جن میں رسول اللہ صلعم نے صحیح جواب حاصل کرنے
کوشش کی لیکن حاصل نہ ہوا، اس امر کی بہترین دلیل ہیں کہ رسول اللہ صلعم نے مختلف
املات کے متعلق صواب دید سے کام لیا لیکن اُن ہی معاملات کے متعلق جن کے بارے
کوئی وحی نازل نہ ہوئی تھی اور اگر کہیں منشاے باری تعالیٰ پورا نہ ہوا تو تصحیح کر دی
ی۔

رسول اللہ صلعم نے جب صواب دید کے مطابق عمل کیا اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے
کی صحت کی تصدیق ہو گئی تو جو قانون اس طرح وضع ہوا وہ تمام لوگوں کے لیے لازم بن
یا۔ اس طرح رسول اللہ صلعم کے صحابہ نے آپ کے اسوۂ حسنہ کی پیروی کی، جب ضرورت

پڑی اپنی فہم اور سمجھ سوجھ سے کام لیتے رہے۔ جب رسول اللہ صلعم کو نتیجے کے
میں اطلاع ہوئی تو اگر وہ درست تھا اور اللہ تعالےٰ کی طرف سے اس کی تصدیق ہوتی
رسول اللہ صلعم نے بھی تصدیق فرمادی اگر اُن کا فیصلہ صحیح نہ تھا تو رسول اللہ صلعم نے
صحیح رائے کی طرف توجہ دلادی جس کی طرف خدا نے آپ کی رہبری کی تھی ۔ اس طرح
کی کوششوں سے جو نتیجے برآمد ہوئے وہ رسول اللہ صلعم کی تصدیق کے بعد تعبیرو
کے سلسلے میں آپ کی کوششوں کا جزو بن گیے اور اُنھیں بھی سنّت میں وضع قانو
درجہ حاصل ہے اور یہ حصہ بھی لوگوں پر واجب و لازم ہے ۔ اس طرح واضح ہوگیا کہ
صلعم کی حیاتِ طیبہ میں قرآن اور رسول اللہ کی تعبیرات کے سوا قانون سازی کا کوئی
نہ تھا اور رسول اللہ کی تعبیرات یا تو وحی پر مبنی ہیں یا صوابِ دید پر۔

سنّت کی صحت و درستی قرآنِ مجید سے ثابت ہے ۔ قرآنِ مجید کا حکم ہے کہ خدا
کی پیروی کرو اور رسول اللہ صلعم کی پیروی خدا کی پیروی اور اس کے ساتھ محبت
نشان ہے :

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا	تمھارا پروردگار اس بات کا گواہ ہے کہ یہ لوگ کبھی مومن نہیں ہو سکتے جب تک اپنے تمام جھگڑوں فیصلوں میں تمھیں حاکم نہ بنائیں پھر اُن کے دلوں کی حالت بھی ایسی ہو جائے جو تم فیصلہ کر دو اس کے خلاف اپنے اندر کسی قسم کی کھٹک محسوس نہ کریں اور ٹھیک اسی طرح مان لیں جس طرح کسی بات کو مان لینا ہوتا ہے ۔

(النساء : ۶۵)

جب سنّت کے وضع قانون کا مدعا قرآن کے وضعِ قانون کی تشریح تھی اور جب
تعالےٰ رسول اللہ صلعم کی تمام تعبیرات کی تصدیق کرتا تھا یا اصلاح کر دیتا تھا تو پھر سنّت
قوانین بالکل قرآن کے قوانین کی حیثیت اختیار کر گیے اور وہ تمام مسلمانوں پر حاوی

ستاں ہائے فکر

جیساکہ بتایا جاچکا ہے، رسول اللہ صلعم کے عہدِ مبارک میں اسلامی
قانون سازی کے دو سرچشمے تھے، اول بنیادی سرچشمۂ قرآنِ مجید
م تفسیری و تعبیری سرچشمۂ سنّت۔ رسول اللہ صلعم اس دنیا سے تشریف لے گئے تو
ہ کو توسیع پذیر اسلامی دنیا سے سابقہ پڑا، نئے نئے مسائل سامنے آئے، جن کے
ے واضح قانون کی رہنمائی درکار تھی۔ وہ پہلے قرآنِ مجید کی طرف توجہ کرتے۔ وہاں سے
سب جواب نہ ملتا تو سنّت پر نظر ڈالتے، جسے قابلِ اعتماد اشخاص نے محفوظ کر لیا
ور وہ رسول اللہ صلعم کی تعبیرات سے بخوبی واقف تھے۔ دونوں سے معاملہ حل نہ ہوتا
و غور کرتے ــــ اسلامی قانون کے رہنما اصول ان کے سامنے ہوتے اور مقاصد
ہ بارے میں انھیں پورا علم تھا ــــ اور وہ ایسے نتیجے پر پہنچ جاتے جو قرآن و سنّت
ے عین مطابق ہوتا۔ اور اسے قانون کا درجہ مل جاتا۔ اس طرح حد درجہ احتیاط
بنا پر معرضِ منضبط میں رکھے ہوئے حالات کے ماتحت مختلف دبستان ہائے فکر پیدا
ئے اور یہ اسلامی قانون سازی کا تیسرا ماخذ بن گئے۔

ان دبستان ہائے فکر نے قرآن و سنّت کی عبارتوں کے اغلب معانی کی تعبیر کرنے،
جن مسائل کے متعلق قطعی طور پر قرآن و سنت میں کوئی چیز موجود نہ تھی، ان کے متعلق
ئے فیصلے صادر کرنے میں ایسے اصول اختیار کر لیے جو قرآن کی بنا پر قانون سازی میں
نمائی کا کام دیتے تھے۔ ذیل میں چند اصول پیش کیے جاتے ہیں، جن پر ان دبستان ہائے فکر
لے فیصلے مبنی ہیں:

۱۔ اصل اباحت ہے اِلّا یہ کہ کوئی امر بہ غور خاص ممنوع قرار پا چکا ہو۔
۲۔ قانون سازی کا مدعا یہ ہونا چاہیے کہ رواداری برتی جائے اور پابندیاں
ھٹائی جائیں۔
۳۔ نظم و نسق کی غرض و غایت یہ ہے کہ شر و فساد کا استیصال ہو جائے۔

۴۔خاص ضرورت کے وقت وہ چیزیں بھی جائز ہو جاتی ہیں جو عام حالات میں جا
نہیں۔

۵۔ضرورت کا پورا خیال رکھا جائے۔

۶۔فتنہ و فساد کے انسداد کو بہبود کے کام پر ترجیح حاصل ہے۔

۷۔اجتماعی مصیبت کو روکنے کے لیے ایک فرد کو ذاتی نقصان برداشت کر
چاہیے۔

یہ عام اصول اسلامی قانون کی ترتیب و تعبیر ہی کا کام دیتے ہیں۔

پہلے دو خلیفوں ——— حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ ——— کے زمانے
طریقہ یہ تھا کہ جب کوئی عوامی مسئلہ پیش آجاتا تو ان ممتاز صحابہ سے مشورہ کیا جاتا ج
کی صحتِ فکر مسلّم تھی۔وہ عوام کے مفاد کا صحیح اندازہ کر سکتے تھے اور کتاب و سنت
قوانین کی روح کو سمجھتے تھے۔جب یہ ذمہ دار اصحاب بالاتفاق کسی ایک فیصلے پر پہنچ
تو اس فیصلے کو نافذ کر دیا جاتا۔اس طرح مشورہ اور لیڈروں کا اتفاق (اجماع) رسول اللہ
کے بعد اسلامی قانون کا ایک نیا سرچشمہ بن گیا۔اس میں وہ تمام مسائل آجاتے تھے ج
کے بارے میں قرآن و سنت کے اندر کوئی واضح چیز موجود نہ تھی۔

دبستان ہائے فکر کے قانون کی صحت و درستی قرآن سے ثابت ہوتی ہے۔قرآن ک
ہے کہ آپس کے معاملات میں مشورہ کرو اور اس کا حکم ہے کہ اُن لوگوں کا اختیار مانا جا
جو بہبودِ عامہ کے ذمہ دار ہیں اور صحتِ تعبیر کے لیے معروف ہیں۔سنّت اس قانون کو بھی صح
سمجھتی ہے، اس لیے کہ رسول اللہ صلعم نے اپنے ناظم مختلف خطوں میں بھیجے اور اُنھ
اختیار دیا کہ جن امور میں قرآن و سنّت کے اندر کوئی چیز نہ مل سکے وہ اپنے صواب دید ک
مطابق فیصلے کریں اور اجماع کو پیشِ نظر رکھیں۔

پہلے دو خلیفوں کے عہدِ حکومت میں اختلافات بہت محدود تھے، اس لیے کہ ج

اُصولِ صحیح سنت کے دریافت میں بڑا اہتمام کرتے تھے اور رسول اللہ صلعم کے صحابۂ کرام سے مشورے کی اہمیت کا انھیں خاص خیال تھا۔ ان میں سے زیادہ تر لوگ خود خلیفہ کے صدر مقام میں رہتے تھے۔ یہ امر خوب ذہن نشیں کر لینا چاہیے کہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے عہدِ حکومت ہی میں صوابدید کو ماخذِ قانون کی حیثیت میں ٹھیک استعمال کیا گیا۔ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اُن کے زمانے میں مشورے ہوتے تھے، وہ لوگ اِن مشوروں میں حصہ لیتے تھے جو رائے دینے کے اہل تھے، پھر اُن کے اتفاق سے معاملہ طے ہوتا تھا۔ نظریات کی یہ وحدت اسلام نے صرف اُن معاملات کے متعلق قانون سازی کے لیے جائز رکھی ہے جن کے بارے میں کتاب و سنت سے کوئی واضح چیز نہ مل سکے ایسے موقع پر چھان بین اور اصحابِ فکر کے غور و خوض کے سوا چارہ نہیں رہتا اور اصحابِ فکر بھی وہ جنھیں اسلامی قانون کی روح کا صحیح اندازہ ہو اور وہ ملت کے افراد کو مفاد کی راہ لگانے کے ذمہ دار ہوں۔ ایسے لوگوں کا اتفاق یقیناً قانون کا ماخذ ہو سکتا ہے۔

نظریات کی وحدت پر اسلامی قانون سازی کے ماخذ کی حیثیت میں غور کیا جائے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ پوری ملت کے درمیان کامل اتفاق ہو جائے اور اس میں اصحابِ فکر اور عامی فضلاء اور سب لوگ شامل ہوں۔ اسلامی اصول کے متعلق اس قسم کا عمومی اتفاق فکر و صوابدید کا موضوع نہیں ہو سکتا اور تمام مسلمانوں کو چاہیے کہ اُسے تسلیم کریں۔ صرف عقائد اور قوانین کا عام اصولِ ملت کے تمام افراد کے لیے ضروری ہے۔

واجب الاطاعت قانون کے سرچشمے کی حیثیت میں وحدتِ خیال کے لیے اُن لوگوں کا اتفاق یا عدمِ اتفاق کوئی حیثیت نہیں رکھتا جو رائے دینے کے اہل نہیں۔ جو وحدتِ فکر قانون سازی کا ماخذ بن سکتی ہے وہ صرف غور و فکر اور تحقیق و تفتیش ہی کے ذریعے استعمال کرنے سے حاصل ہو سکتی ہے اور ذریعے بھی ایسے جو سب کے

نزدیک درست ہوں۔ قوم کے مختلف طبقوں میں سے ایک محدود تعداد کا اتفاق ضروری ہے جن میں مسلمہ وسائل سے کام لینے کے اوصاف موجود ہوں اور عام طور پر تسلیم کیے جاتے ہوں۔ تمام اہل آدمیوں کی رائے لینا ضروری ہے اور یہ بھی ضروری ہے کہ ایک خاص فیصلے کے متعلق وہ اتفاق کر لیں۔ کامل اتفاق اس وجہ سے مشکل ہے کہ مشورے میں شریک ہونے والے افراد کی صلاحیتیں مختلف ہوتی ہیں اور سب کے مفاد نیز مختلف خطوں کے اثرات و ماحول بھی مختلف ہوتے ہیں۔ اسی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ اتفاق صرف اصول کی بنیاد پر ہو سکتا ہے وحدتِ فکر ورائے کے متعلق زیادہ سے زیادہ یہی کہا جا سکتا ہے۔ قرآن مجید کا ارشاد ہے:

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا — اللہ کسی کی جان پر اُس کی طاقت سے زیادہ ذمہ داری نہیں ڈالتا۔ (بقرہ ۲:۲۸۶)

یہ بھی ضروری ہے کہ وحدتِ فکر بہ غرضِ بنیادِ قانون سازی حاصل کرنے کے سلسلے میں ان تمام لوگوں کو آزادیِ رائے کا یقین دلا دیا جائے جو اس میں شریک ہوں اور اُن پر کوئی دباؤ نہ ڈالنا چاہیے جو ان کی آزادیِ فکر کو سلب کر لے۔

جو اسلامی قانون ممتاز اصحابِ فکر کے اجماع پر موقوف ہو گا، اُس پر نظرِ ثانی بھی ہو سکتی ہے اور اُسے بدلا بھی جا سکتا ہے۔ جن امور کے لیے ممتاز اصحابِ فکر سے رائے لی گئی تھی وہ مختلف خطوں، مختلف مقامات اور مختلف حالات میں تھوڑے سے بہت تبدیل ہو سکتے ہیں اور ایسی صورت پیش آ سکتی ہے کہ بعد میں آنے والی نسلیں نئے حالات کی روشنی میں ان پر نظرِ ثانی کریں اور بدلے ہوئے حالات کا تقاضا یہی ہو تو نئے فیصلے کر دیں۔ نیا اجماع پہلے قانون کی جگہ لے لے گا اور وہی نیا قانون بن جائے گا۔

انفرادی صوابدید

ایک صوابدید تو یہ ہے کہ جو قرآن و سنّت میں غیر مذکور معاملات کے متعلق اجماعی مشوروں کے بعد قرار پاتا ہے۔ ایک انفرادی صوابدید بھی ہے جس پر آدمی خود غور و فکر کے بعد پہنچتا ہے۔ یہ انفرادی

صوابِ دید اجسے اصطلاح میں "اجتہاد" کہتے ہیں اکسی شخص پر واجب و لازم نہیں سوائے اس شخص کے جو اس کے مطابق کاربند ہوتا ہے ۔ اسلام میں فرد کا حق اجتہاد یا حقِ صوابِ دید مسلّم ہے ، بہ شرطیکہ اس میں صلاحیت ہو یعنی اس کا دماغ مجلّی ہو اور وہ ماخذِ دین پر نظر رکھتا ہو ۔ خواہ مرد ہو خواہ عورت ، حاکم ہو یا محکوم ، ممتاز سرکاری عہدیدار ہو یا عام شہری جس طرح انفرادی اجتہاد میں مشغولیت ہر شخص کا حق ہے اسی طرح خطا اور غلطی کی ذمہ داری بھی اسی پر ہو گی ۔

پہلے دو خلیفوں کا زمانہ گزر جانے کے بعد انفرادی صوابِ دید یا اجتہاد خاصا پھیلا ہوا تھا ۔ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد جو فتنہ پیدا ہوا ، اس میں انفرادی صوابِ دید یا اجتہاد کا دائرہ اور بھی وسیع ہو گیا ۔ اس انتہا پسندی کا نتیجہ یہ ہوا کہ مختلف فرقے پیدا ہو گیے جو آپس میں جھگڑتے رہتے تھے ۔ اس سلسلے میں فکر و نظر کے متعلق ذاتی رجحانات بھی کارفرما تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی احادیث بیان کرنے میں بھی ذاتی رجحانات مقدم رہتے تھے ۔

یہ حقیقت خوب ذہن نشیں کر لینی چاہیے کہ اسلام نہ کسی فرد کو قرآن و سنّت کی تعبیر و تفسیر کا خاص حق دیتا ہے اور نہ قوم و ملّت کا فرض قرار دیتا ہے کہ وہ ایسے معاملات میں کسی ایک فرد کے نظریات پر مبنی رہے ، جب کہ ان میں انفرادی رائے کا حق محفوظ ہے ۔ جس شخص میں مسائل کا جائزہ لینے کی صلاحیت موجود ہو وہ جائزے کا حق دار ہے ۔ جن لوگوں میں یہ صلاحیت نہ ہو ، انھیں حق حاصل ہے کہ اسلامی قانون کے واجبات پر گفت گو کرنے والوں کی صلاحیت دریافت کر لیں ۔ اسلام کسی مسلمان کو کسی خاص فرد کی رائے کا پابند نہیں بناتا ، اس لیے کہ خدا اور اُس کے رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے جو واجبات مقرر ہو چکے ہیں ، ان کے سوا کوئی چیز بہ اعتبارِ فرض قابلِ تسلیم نہیں ۔ نہ خدا اور رسول پاک صلعم نے کسی خاص مذہبی دبستانِ فکر کی پیروی کا حکم دیا ہے ۔ اسی آزادی کا نتیجہ ہے کہ ابتدائے اسلام سے اب تک مسلمان ممتاز علمائے دین سے استفسار کرتے رہتے ہیں اور اپنے

آپ کو کسی خاص عالم کے فیصلوں کے پابند نہیں سمجھتے۔ لہذا اسلام کے نزدیک کسی خاص دبستانِ فکر کی پیروی لازم نہیں۔ جن اصحاب نے صواب دید سے کام لیا، انھوں نے یہ انتباہ بھی کر دیا کہ جب تک کسی تحقیق و دریافت کی صحت کے متعلق پورا اطمینان نہ ہو جائے اسے درست نہ مانا جائے۔ بعض کی طرف سے ایسے الفاظ منقول ہیں: اگر میر النظریہ غلط ثابت ہو تو وہ صرف میر النظریہ ہے اور آپ کا فرض ہے کہ جو کچھ میں نے کہا ہے اسے پس پشت ڈال دیں۔

یہ بھی واضح ہو گیا کہ جن اصحاب کو خاص مذہبی حیثیت حاصل ہے مثلاً خلیفہ یا امام وہ بھی غور و فکر اور فہم و دانست کے اجارہ دار نہیں، نہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ خطاؤں سے پاک ہیں، یا انھیں وحی یا الہام ہوتا ہے۔ ان اصحاب کو صرف یہ حق حاصل ہے کہ اسلامی قانون کے حدود کے مطابق عدل و انصاف سے کام لیں۔ لوگوں کو مشورہ دے دیں انھیں نصیحت کر دیں اور اُن کی رہنمائی فرما دیں۔ خلیفہ یا امام کا انتخاب ملّت کرتی ہے اور جب تک وہ منصبِ خلافت یا منصبِ امامت پر فائز رہتا ہے ملّت کا نمائندہ ہوتا ہے۔ جب تک وہ اوامر و نواہی کے اندر رہ کر اپنے فرائض ادا کرتا رہتا ہے۔ ملّت اس کی معین و یاور ہوتی ہے اور اس کی فرمانبرداری کرتی ہے، اگر وہ صراطِ مستقیم سے انحراف کرے تو ملت اسے معزول کر سکتی ہے۔

قاضی یعنی جج، یا مفتی یا شیخ الاسلام اور علما کی حیثیت مسائل کے فہم اور قانون کی وضع و تعبیر کے تعلق میں رہی ہے جو خلیفہ کی ہے۔ قاضی یعنی جج کا کام یہ ہے کہ دو فریقوں کے درمیان جھگڑے کا فیصلہ شریعت کے مطابق صادر کر دے۔ مفتی کا وظیفہ یہ ہے کہ جو مسئلہ اس سے پوچھا جائے اسے واضح طور پر سمجھا دے۔ اگر مفتی صاحبِ فہم و بصیرت ہے تو وہ اپنی رائے بتا دیتا ہے ورنہ وہ ان آئمہ کے اظہار پر قناعت کر لیتا ہے جو پہلے دی جا چکی ہیں۔ بہر حال مستفسر احوس کے جو جواب اس کی طرف سے دیے جاتے ہیں۔ انھیں ماننا

لوگوں کے لیے لازم نہیں جو اس سے سوال کرتے ہیں۔ وہ جوابات کی صحت کے متعلق ثبوت
ب سکتے ہیں۔ یہ پوچھ سکتے ہیں کہ جن روایات وآرا پر اس نے اعتماد کیا۔ کس حد تک درست
ا نیز دینی سوالات کسی دوسرے شخص سے بھی کیے جا سکتے ہیں جن کے علم پر سوال
نے والوں کو اعتماد ہو۔

"شیخ الاسلام" اور "ملا" خطابات ہیں جو خاص خطوں اور خاص دوروں میں مسلمانوں کے
ہر دلعزیزی حاصل کر گیے۔ یہ خطابات ان علما کو دیے گیے تھے جنھوں نے علوم و فقہ
درجۂ امتیاز حاصل کیا۔ تاہم ان میں سے کوئی بھی یہ حیثیت نہیں رکھتا کہ وضع و ترتیب
ن کے معاملات میں ان کے فیصلوں کو اٹل مانا جاے انھیں بھی غلطیوں اور خطاؤں
ے پاک نہیں سمجھا جا سکتا۔ اسلام کسی شیخ اور کسی ملا کو اسلامی علوم میں ممتاز و مجاز تسلیم نہیں
اور بعض مذہبی طبقے جو ایسی قیادت کے مدعی ہیں، دراصل اسلامی تعلیمات سے انحراف
ت پیش کر رہے ہیں۔

جن امور و مسائل میں انفرادی صوابدید یا اجتہاد مناسب ہے ان میں جو شخص غور و فکر
ں تھا، اسلامی تعلیمات کے مضمرات کو سمجھنے کی اس نے انتہائی کوشش کی ہے۔ ہر
نے اپنے طریق مطالعہ اور اپنے اسلوب فکر سے اخذ نتائج کی پیروی کی۔ بعض مفکروں نے
فکر کو احادیث کے ایک محدود حصے میں محصور رکھا۔ اس لیے کہ وضعی حدیثیں بہت
گئی تھیں اور اس وجہ سے بعض مسلّمہ ارشادات کے متعلق بھی شک و شبہ پیدا ہو گیا تھا۔
ں نے صرف عمومی اصول اور اسلامی شریعت کی روح پر انحصار کیا۔ اسلامی فقہ کی
خ میں ایسے اصحاب کو عقلیت پسند یا اصحاب راے قرار دیا جاتا ہے۔ دوسرے
اب علم حدیث کا خاص ذوق رکھتے تھے۔ انھوں نے رسول اللہ صلعم کے بہت سے
ادات کی صحت کے بارے میں اطمینان کر لیا اور اپنے فیصلوں میں انھیں روایات
نحصار کیا۔ ایسے مفکر بھی ہیں جنھوں نے ان روایات پر اپنے فیصلوں کی بنیاد رکھی جو

مدینہ منورہ میں رائج تھیں اور یہ وہ حلقہ تھا جہاں رسول اللہ صلعم کے عہدِ مبارک، نیز پہلے دو
خلیفوں کے عہد میں شرعی قانون سازی کا آغاز ہوا یعنی فتنہ اٹھنے سے پیشتر۔

انفرادی صواب دید یعنی اجتہاد۔ یہی حق مختلف صورتوں میں استعمال ہوا اور مذ
فکر کے ایسے دبستان پیدا ہوئے جنھوں نے وقت گزرنے پر مسلمانوں میں ہر دلعزیزی
حاصل کر لی اور انھیں پھیلنے کا موقع مل گیا۔ دورِ حاضر میں چار دبستان ہائے تعبیر
دبستان ہائے فقہ پائے جاتے ہیں جو اسلامی دنیا کے مختلف حصوں میں خوشگواری سے
وقت گزار رہے ہیں۔ ان میں سے حنفی فقہ کے دبستان کی بنیاد امام نعمان بن ثابت
یعنی امام ابو حنیفہؒ نے رکھی جن کی وفات ۱۵۰ھ (۷۶۵ء) میں بہ مقام بغداد ہوئی۔ مالکی
فقہ کے بانی امام مالکؒ بن انس تھے (وفات مدینہ منورہ ۱۷۹ھ ۷۹۰ء) شافعی فقہ
کی ابتدا امام محمد بن ادریس شافعی سے ہوئی۔ امام شافعی غزہ کے تھے اور ۲۰۵ھ (۸۲۰ء)
میں بہ مقام قاہرہ وفات پائی۔ حنبلی فقہ کے بانی امام احمدؒ بن حنبل تھے یہ ایرانی الاصل تھے
اور بہ مقام بغداد ۲۴۱ھ (۸۵۵ء) میں وفات پائی۔

اسلامی ملکوں کے دینی اداروں میں آج کل بھی انھیں دبستان ہائے فکر کی تعلیم دی
جاتی ہے۔ حنفی فقہ کے پیرو زیادہ تر ہندوستان، چین اور ان علاقوں میں پائے جاتے
ہیں جو پہلے عثمانی ترکوں کے ماتحت تھے۔ مالکی فقہ کے پیرو زیادہ تر مصرِ بالا اور شمالی
افریقہ میں ملتے ہیں۔ شافعی فقہ کے پیرو انڈونیشیا، جنوبی عرب، مصرِ زیریں اور بعض علاقہ جات
شام میں اور حنبلی فقہ کو زیادہ اثر و رسوخ دولتِ سعودیہ میں حاصل ہے۔

بہرحال اسلام نے انفرادی صواب دید اور اجتماعی صواب دید دونوں کی اجازت
ان معاملات میں دی ہے جہاں قرآن و سنّت کا کوئی قطعی حکم موجود نہیں اور قرآن و سنت
میں عدل و انصاف کا راستہ متعیّن کرتے ہیں۔ اس طرح اسلامی شریعت کے عالموں کو
موقع مل گیا ہے کہ وہ اسلامی معاشرے کے معاملات سے تعلق رکھنے والے قوانین وضوابط

ں سے جنھیں مناسب سمجھیں اختیار کر لیں۔ یہی رواداری اسلامی ضوابط کے دائمی افادے
کی بنیاد ہے اور اسی کی بنا پر شریعت میں یہ صلاحیت موجود ہے کہ وہ ہر زمانے میں اور
ہر جگہ زندگی کے کاروبار کو ٹھیک چلا سکتی ہے۔

چوتھا باب
اسلام کی عقلی اور صوفیانہ تدبیریں

(استاذ اے ای عفیفی)

اسلام کے متعلق کوئی بیان اس وقت تک مکمل نہیں سمجھا جا سکتا جب تک ان غیر معمولی مساعی کو زیرِ غور نہ لایا جائے جو مختلف اسلامی فرقوں نے اسلام کو سمجھنے لیے کیں، نیز ان کے حاصل کیے ہوئے نتائج سامنے نہ رکھ لیے جائیں۔ اسلام محض اصول و عقائد کا مجموعہ نہیں جو قرآنِ مجید یا احادیثِ رسول میں مذکور ہوئے۔ یہ بھی نہ چاہیے کہ کسی وقت میں صرف راسخ العقیدہ مسلمان ہی اس کی بہترین نمائندگی کرتے رہے۔ یہ ایک زندہ مذہب ہے، جو اپنے پیرووں سے قوت حاصل کرتا رہا اور اب تک کر رہا ہے۔ یہ ایک تحریک ہے جو اپنی طویل اور پُرپیچ تاریخ میں نشو و ارتقا کے مختلف مراحل سے گزری، اپنے ماحول کی مذہبی و ثقافتی قوتوں پر بھی اثر ڈالتی رہی اور خود بھی متاثر ہوتی رہی۔ اسلام کی ابتدائی شکل اور بیرونی قوتوں کے تعامل سے اسلامی عقائد و اعمال کے بعض بنیادی تصورات کی تعبیر از سرِ نو ہوئی اور انھیں نئے سانچے میں ڈھالا گیا۔ ان میں سے بعض تعبیرات کو یقیناً راسخ العقیدہ مسلمانوں کی تعبیرات کے مطابق ثابت نہیں کیا جا سکتا، لیکن وہ بہر حال اسلامی تعبیرات ہیں، کم از کم اس اعتبار سے کہ ان کی بنیاد آیات و احادیث ہیں اگرچہ ان کا جائزہ نئی روشنی میں لیا گیا ہے۔

اس مقالے کا مدعا یہ ہے کہ ان تعبیرات پر بحث کی جائے جو مسلمانوں کے پرانے دبستانوں کی تحریرات سے اخذ کی گئیں ــــــ خواہ صوفیہ ہوں یا عقلیت پسند

علماے دین ہوں یا فلسفی انھیں راسخ العقیدہ مسلمان عام طور پر صحیح قسم کے مسلمان نہیں
سمجھتے تاہم اسلامی فکر اور مسلمانوں کی علمی مذہبی زندگی پر ان کا اثر آج بھی محسوس کیا جا رہا ہے
بتدائی دور کے عقلیت پسند مسلمانوں کو معتزلہ کہا جاتا تھا۔ دوسرا گروہ وہ ہے جنھیں صوفی
کہتے ہیں۔ اس مقالے میں ہماری بحث اسلام کے بعض بنیادی عقائد و اعمال کے متعلق
لماے دین، فلسفیوں اور صوفیوں کی روش تک محدود رہے گی۔

علماے دین کی روش دوسرے مذاہب کی طرح اسلام کی بھی اپنی الٰہیات ہے جس کا مقصد
یہ ہے کہ ایمان کے بنیادی ارکان قائم کرے اور الحاد و بدعت کو
رد کر ڈالے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم پر وحی نازل ہوتی رہی اور وحی
لے نزول کو دینیات نظامی کے تابع نہیں لایا جا سکتا۔ اسلام میں مذہبی عقائد کی تنظیم کا کام
ول اللہ صلعم کے پیرووں نے اس وقت سنبھالا، جب انھیں علم دین کی ضرورت محسوس
ئی۔ ابتدائی دور کے علم دین کا معیار ابن خلدون اور عضدالدین الایجی جیسے مصنفوں کے
یک ابتدائی دور کے مسلمانوں اور راسخ العقیدہ جماعت کی تعلیمات تھیں۔ ان مصنفوں
لے نزدیک معتزلہ، شیعہ اور بہت سے دوسرے دبستان متبدع تھے۔ یہ نقطۂ نگاہ بہت
ت اور محدود ہے اور اسلامی دینیات کے بارے میں گفت گو کرتے وقت ہم نے
یات کو زیادہ وسیع معنی میں استعمال کیا ہے یعنی اس میں راسخ العقیدہ اور غیر راسخ العقیدہ
یاتی دبستان دونوں کے افکار کو شامل کر لیا ہے۔

اسلامی الٰہیات کا بنیادی اصول توحیدِ باری تعالیٰ کا اثبات ہے۔ اس اصول سے
سا بھی اختلاف گوارا نہیں کیا جا سکتا۔ یہ اسلام میں ایمان کی کلید ہے اور اسی اصل سے
م کے دوسرے عقائد متفرع ہوتے ہیں۔ اس وجہ سے اسلامی دینیات کو علم توحید
کہا جاتا ہے، اس لیے کہ اصل مدعا خدا کی ذات و صفات کا اثبات ہے، نیز خالق و مخلوق
ے درمیان تعلق کی تشریح اور تمام دوسری چیزیں صرف اللہ تعالیٰ کی وحدانیت سے

خود بخود رونما ہوتی ہیں۔

قرآن مجید ان معنوں میں دینیات کی کتاب نہیں، مگر اس میں تمام دینیاتی مسائل کے اجزا موجود ہیں۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ صرف خدا عبادت کے لائق ہے۔ وہی مالک الملک ہے۔ وہی کائنات پر حکم چلاتا ہے دیکھیے، سورہ اخلاص میں خدا کو کن الفاظ کے ذریعے سے پیش کیا گیا ہے:

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۚ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۚ لَمْ یَلِدْ ۙ وَلَمْ یُوْلَدْ ۙ وَلَمْ یَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۠ (سورہ اخلاص)

تو کہہ وہ اللہ ایک ہے، اللہ بے نیاز ہے نہ کسی کو جنا، نہ کسی سے جنا گیا اور نہیں اس کے جوڑ کا کوئی۔

قرآن مجید میں صفاتِ باری تعالیٰ کی ایک طبی فہرست پیش ہوئی ہے، جن کے متعلق مسلم علمائے دینیات بڑی بحثیں اور مجادلے کر چکے ہیں۔ قرآن مجید نے شرک، دہریت اور مذہب فطرت کی مذمت کی ہے، یہ کائنات کے دوام کا پورے زور سے انکار کرتا ہے۔ اگرچہ قرآن بہ حیثیت عمومی مسیحیت کا ہمدرد ہے لیکن مسیحیت کے عقیدہ تثلیث اور اس کے تمام لوازم کو رد کرتا ہے۔

الٰہیات کے ان مسائل پر بحث کرتے وقت قرآن نے مختلف اسلوب اختیار کیے کبھی تو وہ منطقی دلیلیں پیش کرتا ہے ——— قیاسی ثبوت یا تحقیقی استدلال ——— لیکن عموماً وہ خطابت کا طریق اختیار کرتا ہے۔ مثلاً انسان کو دعوت دیتا ہے کہ وہ اپنی حالت پر غور کرے، پھر اپنے گردوپیش نظر ڈالے اور کائنات کے عجائبات زیر غور لائے۔ یہی غور و فکر اسے مالکِ کائنات تک پہنچا دے گا۔ جب قرآن اخلاقی ہدایات پیش کرتا ہے تو انسان کو دعوت دیتا ہے کہ اپنے ضمیر پر غور کرے۔ پھر اپنے اعمال اور اپنے ہم جنسوں کے اعمال زیرِ غور لائے۔

یہ اجزا تھے جن کی بنا پر سازگار حالات کے ماتحت دینیات کا ایک منظم و مرتب سلسلہ

ے اسلام میں ظہور پذیر ہوا، رسول اللہ صلعم اور خلفاے راشدین کے زمانے میں ایسی
چیز موجود نہ تھی۔ ابتدائی دور کے مسلمان قرآن مجید کے ظاہر الفاظ پر عمل کرتے تھے۔ وہ
فوق الفطرت یا دینیاتی مسئلہ نہ اٹھاتے تھے جب اللہ تعالیٰ اور اس کی صفات کے
کسی آیت کے بارے میں انھیں شبہ پیدا ہوتا تو کہہ دیا جاتا کہ جو کچھ قرآن مجید میں بیان
سی طرح مانا جائے، نہ مزید تشریح کی ضرورت ہے اور نہ جدید تعبیر کی۔ گویا ان کا اصل
یہ تھا کہ اسلام پر ایمان لائیں، اس کی تبلیغ و اشاعت کریں، اس کے دفاع کے لیے تیار
ر اس کی فطرت میں چھان بین پر زیادہ متوجہ نہ ہوں۔ راسخ العقیدہ مسلمان جن کے ایک
ہ امام احمد بن حنبل (وفات ۲۴۱ھ، ۸۵۵ء) تھے سختی اور اہتمام سے روایات کے
لے اور ہر آزادانہ غور و فکر کی مخالفت کرتے تھے۔

آگے چل کر ان لوگوں نے اس الہیاتی تحقیق کی بھی مخالفت شروع کر دی جو قرآنی اصول
ی مطابق تھی اور وہ اپنے زمانے کے تارک الدنیا درویشوں کی تعلیمات کو بھی شبہ
ل سے دیکھتے تھے۔ وہ صرف ان مسائل پر بحث کی اجازت دیتے تھے جن کا تعلق
سے یا روزانہ زندگی کے عملی معاملات سے تھا۔ رسول اللہ صلعم کی وفات کے بعد
ح جانشینی کا سیاسی مسئلہ سامنے آگیا۔ ساتھ ہی بعض دینیاتی مسائل اٹھے، مثلاً حقیقی
طرت، ایمان، گناہ، کفر، عالمِ عقبیٰ میں سزا کا مفہوم وغیرہ۔ بغرض ابتدا میں دلچسپی کا
سیاسی تھا لیکن مخالف فریقوں نے اپنے نظریات کو مذہبی رنگ دے دیا۔ مذہب
پر لوگوں کو بہت دکھ دیے گئے اور بہت خونریزی ہوئی، سیاسی اور دینی فریق برسرِ کار
لاً خارجی، قدری، شیعہ اور مرجیہ۔ بنو امیہ کو خود سرکاری فریق قرار دینا چاہیے۔ وہ
ی اور ان کے ساتھیوں کے سخت دشمن تھے، یہ ملتِ اسلامیہ کے اندر تنازع
ی کا دور تھا اور اس میں اسلام کا پورا مستقبل معرضِ خطر میں رہا۔

یہاں ہماری توجہ کا مرکز وہ بحث ہے جو یہ لوگ ایمان، گناہ اور جزا و سزا کے سلسلے

میں کرتے ہیں۔ مرجیہ ـــــ لفظی معنی التوء ـــــ کا یہاں یہ مفہوم ہے کہ یوم حساب پر
خدا کی طرف سے فیصلے کا اعلان ہونے تک سزا و جزا کے بارے میں اپنا فیصلہ ملتوی کر
جائے ـــــ یہ لوگ اپنے سیاسی نظریات میں دوسروں کے بالمقابل زیادہ روادار او
دینیات کے مسائل میں زیادہ وسیع النظر تھے۔ اُن کا عقیدہ یہ تھا کہ انسان کی نجات کے
لیے صرف ایمان کافی ہے جو گناہ گار مومن اللہ تعالیٰ کی وحدت پر ایمان رکھتا ہے۔ اور
رسول اللہ صلعم کی رسالت کو مانتا ہے وہ ہمیشہ دوزخ میں نہیں رہے گا۔ یہ عقیدہ خارجیو
کے عقیدے کے صریح خلاف تھا۔ مرجیہ یہاں تک آگے بڑھ گیے کہ کہتے تھے مومن کے
لیے اسلام کا اعلان بھی ضروری نہیں۔ اس لیے کہ ایمان کا تعلق تصدیقِ قلب سے ہے
اور اسلام زبان سے اقرار کا متقاضی ہے۔

یہ مسئلہ بعد میں زیادہ اہمیت اختیار کر گیا، جب اس کی سیاسی اہمیت زائل ہو گ
اور اس کے دینی پہلو نے علمی حیثیت اختیار کر لی۔ مثلاً یہ کہ ایمان کی حقیقت کیا ہے
اور اسے مذہبی اعمال سے کیا تعلق ہے۔ کیا ایمان کے درجات ہیں یعنی کیا کوئی شخص
دوسرے شخص کے مقابلے میں زیادہ مومن ہو سکتا ہے یا کیا ایک ہی شخص ایمان کے زینے
میں درجہ بدرجہ اوپر چڑھ سکتا ہے۔ مرجیہ ایمان کی کمیت سے انکار کرتے تھے۔ باقی
علمائے دینیات کا نظریہ یہ تھا کہ ایمان میں کمی یا بیشی ہو سکتی ہے۔ ایمان اُس وقت تک
سے زیادہ قریب پہنچ جاتا ہے جب اس کے مطابق عمل کیا جائے۔ اس کی حیثیت
اور بہتر ہو جاتی ہے جب یہ دل میں اس طرح جڑ پکڑے کہ اس سے نیک اعمال یقینی طور پر صادر ہوتے ہیں جن ایمان کے سا
نیک اعمال نہ ہوں اُس کی حیثیت ایک ایسے درخت کی ہے جس میں پھل نہ آئے۔ اس گروہ کے قول کے مطابق سچا ایمان دل
وظیفہ بن جاتا ہے، جو مومن سے مذہبی واجبات پورے کراتا ہے اور معصیت سے
اسے روکتا ہے۔ رسول اللہ صلعم کا ارشاد ہے کہ سچا مومن نہ زنا کا مرتکب ہوتا ہے، نہ
چوری کا، دوسرے لفظوں میں حقیقی ایمان اور گناہ کا ارتکاب ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے

ن کی کمی یا بیشی کے نظریے کی تائید خود قرآنِ مجید کے ارشادات سے ہوتی ہے مثلاً :

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اِذَا ذُکِرَ اللّٰہُ	مومنوں کی شان تو یہ ہے کہ جب اللہ کا ذکر کیا
وَجِلَتْ قُلُوْبُھُمْ وَاِذَا تُلِیَتْ عَلَیْھِمْ	جاتا ہے تو ان کے دل دہل جاتے ہیں اور جب اُن کی
اٰیٰتُہٗ زَادَتْھُمْ اِیْمَانًا وَّعَلٰی رَبِّھِمْ یَتَوَکَّلُوْنَ	آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو اُن کے ایمان کو اور
(انفال: ۲)	زیادہ کر دیتی ہیں اور وہ ہر حال میں اپنے پروردگار پر بھروسا رکھتے ہیں

یہ اس دور کا آغاز تھا جس میں اسلامی الٰہیات نے وضع و ترتیب کا لباس پہننا شروع
لیکن یہ اجزار اور بعض مذہبی معاملات کے متعلق ابتدائی تصورات جلد وسیع حیثیت
بار کر گیے جب علم کلام کے ماہر مسلمان علمار بروے کار آئے جنھیں یونانی فلسفے میں
خاصی مہارت حاصل تھی۔ اب دو اہم عامل نمودار ہوئے جنھوں نے دینیاتِ نو کے
ارتقا کو بڑی تقویت پہنچائی۔ ایک داخلی عامل اور دوسرا خارجی عامل۔

داخلی عامل خود قرآنِ مجید کے اندر موجود تھا جیساکہ سابقہ مقالوں میں بتایا جاچکا
ہے۔ قرآن میں دو قسم کی آیات ہیں، اول وہ جنھیں کتاب کے اصل وجوہر کی حیثیت حاصل
۔ وہ اپنے مفہوم و معنی میں بالکل واضح اور قطعی ہیں (محکمات) کچھ آیات نسبتہً ایسی بھی
ہیں متشابہ یا کم درجے میں قطعی سمجھنا چاہیے۔ یہ حقیقت خود ایک مدنی وحی میں بیان
ہے جو یہ ہے :

ھُوَ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ عَلَیْکَ الْکِتٰبَ	وہی حی و قیوم ذات ہے جس نے تم پر الکتاب نازل
مِنْہُ اٰیٰتٌ مُّحْکَمٰتٌ ھُنَّ اُمُّ	کی۔ ان میں ایک آیت تو محکم آیتوں کی ہے (ایسی آیتوں
الْکِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِھٰتٌ ؕ	کی جو ایک ہی معنوں میں اٹل اور ظاہر ہیں) دوسری قسم
فَاَمَّا الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِھِمْ زَیْغٌ	متشابہات کی ہے (جن کا مطلب کھلا اور قطعی
فَیَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَہَ مِنْہُ ابْتِغَآءَ	نہیں) تو جن لوگوں کے دلوں میں کجی ہے وہ اُن
الْفِتْنَۃِ وَابْتِغَآءَ تَاْوِیْلِہٖ ۚ وَ	آیتوں کے پیچھے پڑ جاتے ہیں جو کتاب اللہ میں

مَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللَّهُ ۘ	متشابہ ہیں اس غرض سے کہ فتنہ پیدا کریں اور حالانکہ ان
وَالرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ يَقُولُونَ	کی حقیقت اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا اور جو لوگ
آمَنَّا بِهِ كُلٌّ مِنْ عِنْدِ رَبِّنَا ۗ	علم میں پکے ہیں وہ کہتے ہیں ہم ان پر ایمان رکھتے ہیں
وَمَا يَذَّكَّرُ إِلَّا أُولُو الْأَلْبَابِ	کیونکہ یہ سب کچھ پروردگار کی طرف سے ہے اور دانائی
(آل عمران: ۷)	حاصل نہیں کرتے مگر وہی جو عقل و بصیرت رکھتے ہیں۔

دینیات کے عالموں نے قرآنِ مجید میں متشابہ آیات کے متعلق دلیلیں بھی دی ہیں اکثریت کی رائے کا رجحان یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیتیں دانستہ رکھی گئیں تاکہ انسان کے کی صحت و پختگی کی آزمائش ہو جائے جن لوگوں کا ایمان پختہ ہے وہ بے چون و چرا انھیں قبول کر لیتے ہیں لیکن جن کے قلوب میں غلطی کا رجحان موجود ہے وہ انھیں رد کر دیتے یا اُن کی تعبیر ایسے طریق پر کرتے ہیں جس سے ملّتِ اسلامیہ میں تفرقہ پیدا ہو حقیقی وجہ خواہ ہو، یہ بات اپنی جگہ قائم ہے کہ متشابہ آیات نے دوسرے قرن کے پیروانِ دین میں پیدا کرنے کے لیے خاصا کام کیا[1]۔ ان ہی جھگڑوں سے مختلف فریق پیدا ہوئے، ہر فریق اپنا جداگانہ نقطۂ نگاہ کی حمایت میں سرگرم تھا، ابن خلدون نے اس موضوع پر جو کچھ لکھا، وہ اقتباس کے قابل ہے 'مقدمہ' میں لکھتا ہے:

قرآنِ مجید میں ایسی آیات بھی ہیں جن میں خدا ایک ایسی ہستی ہے جو انسانی تصور سے ورارالورا ہے۔ ان آیات کے معنی بالکل واضح ہیں اور اُن میں تعبیر کا اختلاف ہو ہی نہ

[1] حقیقت صرف یہ ہے کہ دین میں دو قسم کے معاملات آتے ہیں۔ اول جن میں انسانی عقل کے لیے الجھن نہیں ہو سکتی اور وہ بالکل صاف اور واضح ہیں۔ مثلاً توحید و رسالت، اوامر و نواہی، حلال و حرام بعض حقائق ایسے ہیں جو انسانی عقل سے ماوراء ہیں مثلاً خدا کی ہستی، موت کے بعد زندگی عالم آخرت کے احوال عذاب و ثواب کی حقیقت حقائق کے بیان میں ایسا پیرایہ اختیار کیے بغیر چارہ نہیں جو فہم انسانی کے لیے ناقابلِ برداشت نہ ہو اس لیے تشبیہ و مجاز سے خالی نہیں ہوتا کج فہم لوگ ان بیانات میں انہماک سے فتنے کا موجب بن جاتے ہیں موسوی کے لیے یہی مناسب ہوتا ہے کہ ان پر ایمان لائیں اور مزید کاوش نہ کریں غرض یہ آیات ایمان کی آزمائش کا یقیناً ایک ذریعہ ہیں۔ مگر اس لیے نہیں رکھی گئیں کہ ایمان کی آزمائش ہو۔ ان کا آنا ناگزیر اس لیے کہ ان حقائق کو بالکل نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا اور بیان کے لیے تشبیہ و مجاز سے کام لینا ناگزیر تھا۔

ام سلبی بیانات ہیں اور اپنی وضاحت کے لحاظ سے تمام مومن انھیں مانتے ہیں.....
.... مقابلۃً تھوڑی آیات ایسی بھی ہیں جن سے تجسیم کا خیال پیدا ہوتا ہے یہ
بہ آیات ہیں۔ ابتدائی دور کے مسلمانوں نے انھیں قبول کر لیا اور ان کے معنی کے متعلق
سوال نہ اٹھایا، لیکن مبتدعین نے مختلف طریقہ اختیار کیا، یعنی اِن متشابہ آیات کا بہ
ِن نظر جائزہ لیا۔ بعض نے اُن کی تجسیمی حیثیت میں مبالغہ کرتے ہوئے خدا کے
ہاتھ، چہرہ، پاؤں وغیرہ منسوب کر دیے۔ اس طرح وہ تجسیم کے گڑھے میں گر گیے۔
خدا کی تنزیہی حیثیت گم کر دی جو متعدد آیات میں واضح اور غیر مشتبہ طور پر بیان ہوئی
.... دوسرے لوگوں نے مختلف صفات کے متعلق تجسیم
عتراف کر لیا۔ مثلاً یہ کہ خدا کی بھی ایک جہت ہے، وہ تخت پر بیٹھا ہے، آتا جاتا ہے
کرتا ہے، وغیرہ، یہ لوگ بھی دوسروں کی طرح تجسیم ہی کا شکار ہو گیے۔
اس قسم کی آیات پر جو جھگڑے پیدا ہوئے اُنھوں نے بہت سے اصول دینیات کے
ارتقا پر گہرا اثر ڈالا اور یہ اصول پشتوں تک مسلمانوں کے دل و دماغ پر حاوی رہے۔
حاضر میں بھی ان جھگڑوں کے بعض آثار دیکھے جا سکتے ہیں۔
اسلامی دینیات کے نشو و ارتقا میں جو خارجی عامل کار فرما ہوا وہ ثقافتی اثر تھا جو باہر
، آیا اور اُس نے اسلامی فکر کو متاثر کیا۔ دوسری صدی کے نصف تک ہمیں صرف
ف افراد ملتے ہیں جو بعض مذہبی مسائل کے متعلق رایئں ظاہر کرتے رہے۔ مذہبی
کوئی عام یا مسلمہ نظام موجود نہ تھا اور نہ دینیات کے دبستان موجود تھے۔ اگرچہ
ے فریق ضرور موجود تھے جنھیں ایک حد تک دینیاتی فریق کہا جا سکتا ہے۔
جب بیرونی اثرات پڑنے لگے تو نشو و ارتقا کے سلسلے میں تبدیلیاں آگئیں،
ن اخلاقی مسائل پیش کر دیے گیے خصوصاً جبر و قدر کا مسئلہ۔ اس قسم کے
الفطرت مسائل بھی سامنے آگیے مثلاً خدا کی صفات، صفتِ کلام، کلام باری تعالیٰ

ہونے کے باعث قرآن کا ابدی ہونا، دوسری دنیا میں اللہ تعالیٰ کے لقا کا مسئلہ وغیرہ
یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ مذہب کے بڑے بڑے مسائل میں بیشتر پر زیادہ بحثیں شام
میں ہوئیں جو مسیحی دینیات کا ایک اہم مرکز تھا۔ ہم جانتے ہیں کہ دمشق کا جان[1] جو یونانی
کلیسا کا ایک بڑا فاضل تھا بنو امیہ کے زمانۂ حکومت میں وزارت کے منصب پر
تھا، اُس نے اور اُس کے شاگرد تھیوڈورس ابو کرہ[2] نے مناظرات کے انداز میں رسالے
لکھے جن میں مسلمانوں اور مسیحیوں کے درمیان بحث و گفتگو کے سلسلے میں اسلامی نقطۂ نظر
کا خلاصہ پیش کیا۔ بعض رسائل سوال و جواب کے انداز میں لکھے مثلاً "اگر کوئی مسلمان
سوال کرے تو اُس کا جواب یوں اور یوں دو۔ یہ اس امر کی شہادت تسلیم کی جاتی ہے
کہ مسلمان عالموں اور عیسائی عالموں کے درمیان ابتدائی مرحلے ہی میں براہِ راست تعلق
پیدا ہو گیا ہوگا، لیکن اس تعلق کے امکان کا اعتراف کر لینے کے باوجود یہ مبالغہ آمیز
درست ماننے کی کوئی وجہ نہیں جو ڈی بور[3]، فان کریمر[4]، ڈی۔ بی میکڈانلڈ[5]، جیسے
فاضلوں نے پیش کی کہ اسلامی الٰہیات کے نشوو ارتقا میں مسیحی افکار کا اثر سب سے زیادہ
پڑا ہے۔

دوسرا اجنبی عامل جس نے اسلامی الٰہیات کو متاثر کیا، خصوصاً جب یہ بلوغ کی منزل
پر پہنچ چکی تھی، یونانی فلسفہ ہے۔ ہمیں اس کے آثار قریباً تمام دینیاتی نظریات میں ملتے
ہیں بخواہ یہ ہوا ہو کہ کسی یونانی تصور نے ان نظریات پر اثر ڈالا یا وہ انداز سامنے رکھ لیے
میں اُن نظریات کو پیش کیا گیا، لیکن یہ بھی ظاہر ہے کہ یونانی افکار غیر متبدل نہ رہے بلکہ انھیں
ایسے انداز میں موڑ لیا گیا جو اسلام کے بنیادی تصورات سے ہم آہنگ تھا۔ اسلامی الٰہیات
کے اسلوبِ نشوو ارتقا میں جو اہم اثرات پڑے، اُن کی توضیح کے لیے دینیات کے دو بڑے

---

1. John
2. Theodorus Abucara
3. De Boer
4. Von Kremer
5. D. B. Macdonald

مسئلوں پر غور کر لینا مناسب ہوگا: اول اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کا مسئلہ؛ دوم انسان اور اُس
کے دائرۂ اختیار کا مسئلہ۔

خدا کا دینیاتی تصوّر خدا کے متعلق مختلف تصوّرات کے لیے قرآن مجید میں کوئی نہ کوئی
بنیاد مل جائے گی، اس میں عامیانہ تجسیم سے لے کر کامل تنزیہہ
تک کے تمام تصوّرات شامل ہیں۔ جب دینیات کے مسلّمہ عالموں نے خدا کی ذات پر
غور و فکر شروع کیا تو دو قسم کی قرآنی آیات اُن کے سامنے آئیں۔ اوّل وہ آیات جن میں خدا کا
ذکر اس کی مخلوق کے سلسلے میں بیان کیا گیا ہے، دوم وہ آیات جو براہِ راست خدا کے
بارے پر مشتمل ہیں۔ پہلی قسم کی آیات میں خدا کا ذکر یوں آیا ہے کہ وہ اپنے بندوں کو دیکھتا ہے،
ان کی دعائیں سنتا ہے، اُن سے کلام کرتا ہے، اپنے ہاتھ سے بناتا ہے، اپنے تخت
پر بیٹھتا ہے، اپنے فرشتوں کے ساتھ آتا ہے اور حساب کے دن اُس کا لقا نصیب ہوگا۔
ان آیات میں خدا کی صفات انسانی صفات کے انداز میں بیان کی گئی ہیں۔ مثلاً اُس کی خوشی،
ناراضگی، محبت، نفرت وغیرہ۔ یہ صفات ایک خدا کے وجود کے بعض اجزا ہیں جو اپنے
بندوں سے کلام کرتا ہے، اُن کی دعائیں سنتا ہے۔ نیکوں سے محبت کرتا ہے اور بروں
سے اُسے نفرت ہے۔ رسول اللہ صلعم کا ارشاد ہے کہ خدا کی عبادت اس طرح کرو گویا تم
اسے دیکھتے ہو۔ اگر تم اُسے نہیں دیکھتے تو وہ تمھیں ضرور دیکھتا ہے۔ دوسرے لفظوں
میں خدا کا تصور ایسے انداز میں پیش کیا گیا ہے جیسے وہ کوئی شخصیت ہو اور ظاہر ہے کہ
یہ باتیں کسی ایسے ہی وجود سے کی جا سکتی ہیں جو تصوّر سے ماورا نہ ہو۔

قرآن مجید کی دوسری قسم کی آیات سامنے رکھی جائیں تو اُن میں خدا کی صفات تنزیہی
طریق پر بیان کی گئی ہیں۔ اس لحاظ سے خدا مخلوق سے بالکل الگ ہے۔ سوال یہ ہے
کہ کیا ہم صفاتِ باری تعالیٰ کا اثبات کر بھی سکتے ہیں؟ قرآن نے یقیناً اثبات کیا ہے، قرآن
میں خدا کو قادر، علیم، سب کچھ جاننے والا، ازلی اور ابدی، مطلق، ہمیشہ رہنے والا اور تمام

مخلوقات سے بالکل الگ قرار دیا گیا ہے۔ بعض صفات ایجابی ہیں اور بعض سلبی۔ کیا
سب کا اثبات ایک رنگ میں کیا جا سکتا ہے؟ راسخ العقیدہ مسلمانوں کا جواب اثبات
ہے، لیکن وہ اثبات کے منطقی مضمرات میں نہیں جاتے، معتزلہ ان مضمرات کا جائزہ
ہیں۔ البتہ سلبی صفات کے اثبات میں کوئی مشکل پیش نہیں آتی، لہذا انھیں سب مانتے
ایجابی صفات کو یا تو سلبی بنا لیا جاتا ہے یا انھیں ذاتِ باری تعالیٰ سے الگ صفات
سے انکار کر دیا جاتا ہے، مثلاً وہ خدا کے علم، ارادے اور کارفرمائی سے انکار نہیں
البتہ اس سے انکار کرتے ہیں کہ اس کا علم، ارادہ یا کارفرمائی اس کی ذات سے الگ
دائمی چلے آ رہے ہیں۔ یہ صفات ذات میں شامل ہیں۔ اگر انھیں الگ اور دائمی مانا جا
دائمی ہستیوں کا تعدد لازم آئے گا، جو توحید کے منافی ہے۔ بعض معتزلہ اس حد تک آگے
گیے کہ انھوں نے تمام ایجابی صفات کا انکار کر دیا اگر کہا جائے کہ خدا فلاں اور فلاں چیز
سے آگاہ ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ناواقف نہیں اور یہی کیفیت باقی صفات کی
یہ امر خاص طور پر دلچسپ ہے کہ جس پہلے مسلمان مفکر نے مذکورہ بالا انداز میں صفات باری
سے انکار کیا وہ واصل بن عطا تھا (وفات ۱۳۱ھ / ۷۴۸ء) اور یہ انکار اس نے
مسیحی عقیدہ تثلیث کے رد میں کیا، جیسے وہ ذاتِ واحد کی دائمی صفات میں تعدد کا موجب
سمجھتا تھا، بعد کے معتزلیوں نے اس کے نظریے میں مزید توضیحات کر دیں اور اسے
زیادہ تر فلسفیانہ بنا دیا۔ انھوں نے خدا کو تمام صفات سے مبرا کر دیا۔ اسی بنا پر مخالفوں
نے انھیں "معطلہ" قرار دیا، یعنی وہ لوگ جنھوں نے صفاتِ باری تعالیٰ کو بیکار یا معطل کر
دیا۔

راسخ العقیدہ فریق کی رائے ان کے خلاف تھی اور یہی دبستانِ فکر آگے چل کر اشعری
کہلایا۔ ان کا استدلال بہ حیثیت عمومی دل نشین نہیں۔ وہ زیادہ تر لفظی ہیر پھیر سے کام لیتے
ہیں وہ کہتے ہیں کہ خدا کی صفات موجود ہیں، لیکن نہ تو وہ اس کی ذات میں شامل ہیں اور نہ اس سے

...ک ہیں۔ وہ حالتیں ہیں جو ذات سے الگ ہیں ساتھ ہی اُس کا جزو ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ساری
...بحثیں ایک بنیادی غلط فہمی سے پیدا ہوئیں۔ اُنھوں نے صفات کو متشخّص کر لیا، لیکن
...سمجھتے یہی رہے کہ وہ خدا کی عام اور سادہ صفات سے بحث کر رہے ہیں یہ کہنا کہ خدا کی
...صفات وائمی ہیں اور اُس کی ذات سے الگ ہیں مگر ساتھ چلی آتی ہیں، اس کا مطلب یہ تھا کہ
...کی صفات کو متشخّص کر لیا جاتا اور اُنھیں مادّوں کا درجہ دے دیا جاتا۔ مسیحیوں کے عقیدۂ تثلیث
...حقیقت بھی یہی تھی۔ اگر یہ علماے دینیات فرماتے کہ خدا کی صفات محض قابلِ فہم متعلقات
...جن سے ذات متصف ہے یا محض اسما ہیں جنھیں خدا نے اپنے ذکر میں استعمال کیا
...ہے تو بہت اچھا ہوتا، اس صورت میں صفات کو خدا میں شامل کرنے یا نہ کرنے اور اُنھیں
...ئمی یا عارضی ماننے کے سوالات پیدا ہی نہ ہوتے۔

اسلامی الٰہیات کی کتابیں جن جھگڑوں اور فضول و بے لطف بازیوں سے بھری پڑی ہیں، اُن
...سے بیشتر صرف اس امر کا نتیجہ تھیں کہ صفاتِ باری تعالیٰ کو دو مختلف حیثیتوں میں بیان کرنے
...حقیقت کا صحیح اندازہ نہ کیا گیا۔ بحث و مباحثہ کے دو فریقوں —— روایاتِ درست
...عقلیت پسند —— میں سے ہر ایک نے ایک نوع کی صفات کو توجہ کا مرکز بنا لیا اور دوسری
...سے مقابلۃً تغافل برتا۔ اس سے دو انتہائی نظریے پیدا ہوئے: تجسیم یا معتدل درجے کی تشبیہ
...طرف اور کامل تنزیہہ دوسری طرف۔ معتزلہ آخری نظریے کے حامی تھے۔ انھوں نے
...ویل کا ایسا طریقہ اختیار کیا جس کے مطابق قرآنِ مجید کی وہ تمام آیات تشبیہ کے ہر شبہ
...سے پاک ہو گئیں اور اُنھوں نے رسول اللہ صلعم کے ان تمام ارشادات کو غیر مستند قرار دیا
...جن میں تشبیہ کا کوئی پہلو موجود تھا۔ توحید و تنزیہہ کاملہ کا تصوّر محفوظ رکھنے کے لیے اس
...کے سوا چارہ نہ تھا روایات کے پابند نہ رہے۔

معتزلیوں نے عقلی تعبیر و تاویل کا جو طریقہ اختیار کیا تھا، اس میں اچھائی کے پہلو بھی
...ہے اور برائی کے پہلو بھی۔ ایک لحاظ سے ان کے طریقے نے اسلام کو خدا کے مادی اور

اساطیری تصورات سے نجات دلائی اس لیے کہ معتزلہ نے روشن عقلی صفات پر زور
دیا لیکن اس طبقے کے بعض افراد دوسری حد پر پہنچ گئے اور خدا کو اخلاق کی ایسی منزل پر
لے گئے جہاں اس میں کچھ بھی باقی نہ رہا۔

اللہ تعالیٰ کی صفات کے متعلق غور و تحقیق نے قرآن مجید کی حقیقی حیثیت کا مسئلہ
پیدا کر دیا کہ آیا یہ خدا کا نازل کیا ہوا کلام ہے یا صفتِ کلام کا ایک خارجی مظہر ہے؟
راسخ العقیدہ مسلمان صفات کے ازلی ہونے کے قائل تھے۔ انھوں نے قرآن مجید کو
ازلی قرار دیا ہے۔ معتزلہ نے کہا کہ نہیں قرآن مخلوق ہے۔ اگر یہ نہ مانا جائے گا تو خدا کے
سوا کوئی اور شے ازلی بن جائے گی اور اس طرح توحید معرضِ زوال میں آ جائے گی۔ حضور
صلعم پر قرآن نازل ہوا۔ انھوں نے خدا کی آواز نہیں سنی بلکہ ایک ایسی آواز سنی جسے اللہ
نے مادی وسیلے اور واسطے میں خلق کیا۔ اس طرح منشائے الٰہی رسول اللہ صلعم تک
گیا لہٰذا جو قرآن مجید ہمارے پاس ہے وہ مخلوق ہے۔ معتزلہ کا یہی دعویٰ تھا جس
حمایت عباسی خلیفہ المامون نے کی۔

جب معتزلہ کا دور ختم ہو گیا تو راسخ العقیدہ جماعت نے پھر موقع پا کر اعلان کر دیا کہ قرآن
غیر مخلوق ہے بلکہ کتاب اللہ میں جو الفاظ مکتوب ہیں اور جو نمازوں میں پڑھے جاتے ہیں
وہ بھی غیر مخلوق ہیں۔ اشاعرہ نے بعد میں اس مسئلے کو اٹھایا اور اونچی سطح پر اسے موضوع
بحث بنایا۔ انھوں نے اس سلسلے میں زمانہ ماضی کے ایسے ہی مباحث سے اثر قبول
کیا خصوصاً "کلامِ الٰہی" کے متعلق یہودیوں اور مسیحیوں کے نظریات سے جو بجائے خود قدیم
نظریات کا ثمر تھے۔

اشاعرہ کا عقیدہ یہ تھا کہ خدا کا کلام ازلی ہے۔ قرآن "الٰہی کلام بلا حرف کن" سب کلمات
کی ازلی صفات ہیں:

إِنَّمَا أَمْرُهُ إِذَا أَرَادَ شَيْئًا أَنْ يَقُولَ لَهُ كُنْ — اس کا حکم یہی ہے کہ جب کرنا چاہیے

کُوْن (یٰس : ۸۱) کسی چیز کو تو کہے اس کو ہو وہ اسی وقت ہو جائے۔

اس سے ثابت ہوا کہ حکم خلق اور لفظ خلق یعنی "کن" کو ہر وجود پر تقدم حاصل ہے قرآن مجید
میں آیا ہے:

وَمِنْ اٰیٰتِہٖٓ اَنْ تَقُوْمَ السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ بِاَمْرِہٖ اور اس کی نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ
(روم: ۲۵) کھڑا ہے آسمان اور زمین اس کے حکم سے۔

گویا حکم الٰہی محض تخلیق ہی کا وسیلہ نہیں بلکہ یہ خلق کردہ کائنات کے قیام کا ذریعہ بھی ہے
ت کا مطلب ابتدا میں یہ سمجھا جاتا تھا کہ یہ خدا کی مطلق برتری کی توضیح کرتی ہیں اور
ں کہ وہی خالق برحق ہے اور وہی کائنات کی بقا کا سہارا ہے لیکن اشاعرہ نے
ی کے متعلق اپنے نظریے کی حمایت میں ان آیات کو نئے معنی کا لباس پہنا دیا اور
لی کے متعلق ان کا نظریہ مختلف حیثیتوں سے مسیحیوں اور رومیوں کے نظریات
تا جلتا تھا۔ اس طرح امر الٰہی اور لفظِ تخلیق یعنی "کن" کو متشخص کیا گیا۔ انھیں کو تخلیق
اور خلق کردہ اشیا سے بقا کا ذریعہ قرار دیا گیا پھر کلام یا کلام الٰہی ایک لحاظ سے
میں شامل ہے اور ایک لحاظ سے الگ اسی کی طرح ازلی ہے۔ اس طرح کلام باری
نے وہی مقام حاصل کر لیا جو یہودیوں کی دینیات میں میمرا* کو اور عیسائیوں کے عقیدہ
میں اقنومِ ثانی کو حاصل تھا۔

اشاعرہ اس سے ایک قدم اور آگے بڑھ گیے۔ انھوں نے دو قسم کے کلام بی
ا، ایک خارجی دوسرا داخلی۔ خارجی جو الفاظ آواز پر مشتمل ہے اور اُسے لکھا جا سکتا
وہ مخلوق ہے لیکن داخلی جو الفاظ و آواز میں بیان ہوتا ہے، ذاتِ الٰہی کے ساتھ
ہے، لہذا اُسے ازلی سمجھنا چاہیے یہ امتیاز یقیناً رواقیوں کے فلسفے سے مستعار
ہے جو بالقوّا اور بالفعل یا داخلی و خارجی کلام کا ذکر کرتے ہیں یہ مسیحیوں کے
کلام الٰہی کے بھی مطابق ہے مسیحی کلام کو جو ازل سے خدا کے ساتھ تھا اور ازل سے

* MEMRA یہودیوں کی اصطلاح کلام الٰہی کے لیے۔

خدا تھا، اُس کلام سے جو دنیاوی شکل میں بصورتِ مسیح علیہ السلام نمایاں ہوا، الگ ہیں۔ غالباً ابتدائی دور کے اشعریوں نے ایسے واضح انداز میں اپنے خیال کا اظہار کیا تھا، انھوں نے اپنے نظریے کے فوق الفطرت مضمرات کے ہر پہلو کی وضاحت نہیں کی تھی۔ وہ قرآن کی ازلیت کے مسئلے میں منہمک تھے اور سمجھتے تھے کہ ہم نے ثابت کردیا ہے جو کچھ درحقیقت انھوں نے ثابت کیا وہ خدائی منشار یا خدائی علم کی ہے اور یہ کہ جو کچھ رسول اللہ صلعم پر وحی ہوا وہ اس علم کا مادی مظہر تھا۔ امام غزالی کے اشاعرہ کا موقف یہی تھا۔

جبر و اختیار جبر و اختیار کا مسئلہ اخلاقی ہے اور اُس کی جڑیں بہت وسیع ماورائی مسئلے میں پہنچی ہوئی ہیں یعنی کائنات کے تعلق میں عموماً اور عالمِ انسانی کے تعلق میں خصوصاً تصوّرِ باری تعالیٰ کا مسئلہ —— دنیا کے متعلق سامیوں کی قنوطیت پر مبنی تھی۔ وہ اسے تیزی سے گزر جانے والا ایک سایہ سمجھتے تھے اُن کے مطابق اس مقام کی قدر و قیمت صرف اتنی ہے کہ انسان یہاں ایک زیادہ پائیدار کے لیے اپنے آپ کو تیار کرتا ہے، اس تصور نے خدا کے متعلق یہ تصوّر پیدا کیا کہ مطلق اختیار قوت حاصل ہے وہ تمام اشیاء پر حکومت کرتا ہے اس میں انسان اور کے اعمال بھی شامل ہیں، اس تصوّر کا اثر قرآنِ مجید میں بھی پایا جاتا ہے۔ خدا زمین اور کا حاکمِ اعلیٰ ہے اور اُس کے اختیار میں کسی کے لیے چون وچرا کی گنجائش نہیں مند ذیل مثالیں قرآنِ مجید میں اس قسم کی آیات کا نمونہ پیش کرتی ہیں۔

۱۔ لَا یُسْئَلُ عَمَّا یَفْعَلُ وَهُمْ یُسْئَلُوْنَ (انبیا: ۲۳) — وہ جو کچھ بھی کرے اُسے کوئی پوچھنے والا نہیں اور سب سے کے روبرو بازپرس ہوئی ہے۔

۲۔ یَخْلُقُ مَا یَشَآءُ (روم: ۵۴) — بناتا ہے جو کچھ چاہتا ہے۔

۳۔ هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ (مومن: ۶۷) — وہی ہے جس نے بنایا تم کو خاک سے

...إِنَّ اللّٰهَ يُضِلُّ مَنْ يَّشَاءُ وَيَهْدِيْ مَنْ ... اللہ بھٹکاتا ہے جسے چاہے اور سمجھاتا ہے

...ءُ (فاطر: ۸) جسے چاہے۔

اور اپنی قوم سے خطاب کرتے ہوئے نوح علیہ السلام کہتے ہیں:

...يَنْفَعُكُمْ نُصْحِيْٓ إِنْ أَرَدْتُّ ... اور اگر اللہ کی مشیت یہی ہے کہ تمھیں ہلاک کرے تو

...أَنْصَحَ لَكُمْ إِنْ كَانَ اللّٰهُ يُرِيْدُ ... میں کتنا ہی نصیحت کرنا چاہوں وہی نصیحت،

...يُّغْوِيَكُمْ هُوَ رَبُّكُمْ وَإِلَيْهِ ... کچھ سودمند نہ ہوگی۔ وہی تمھارا پروردگار ہے۔ اسی

...جَعُوْنَ ۝ (ھود: ۳۴) کی طرف تم کو لوٹنا ہے۔

...یہ تصویر کا صرف ایک رُخ ہے۔ دینیات کا پہلو پیشِ نظر رکھا جائے تو اس سے ... ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مخلوق پر اپنی مطلق برتری اور اقتدار کا اظہار کیا ہے۔ اخلاقی ... رکھی جائے تو یہ خیال ہوتا ہے کہ انسانی اعمال کے سلسلے میں جبری پہلو پیش کیا

...لیکن تصویر کے دوسرے رُخ کے بھی دو ہی پہلو ہیں جو ایک دوسرے سے گہرے ... البتہ ہیں، اللہ تعالیٰ کو جہاں اختیار وعزم میں بالاترین قرار دیا گیا ہے وہاں اُسے ... کہا گیا ہے۔ مندرجہ ذیل آیاتِ قرآن سے خدا کے عدل کا اثبات ہوتا ہے:

...نُكَلِّفُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا وَ ... ہم کسی جان پر ذمہ داری نہیں ڈالتے مگر اتنی ہی جتنی

...دَيْنَا كِتٰبٌ يَّنْطِقُ بِالْحَقِّ وَهُمْ ... اس میں طاقت ہے ہمارے پاس نوشتہ ہے جو

...يُظْلَمُوْنَ ۝ ٹھیک ٹھیک حکم لگا دیتا ہے۔ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا

(مؤمنون: ۶۲) کہ کسی جان کے ساتھ ناانصافی ہو۔

...آيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ... یہ اللہ کی آیتیں ہیں جو ہم تمھیں فی الحقیقت سنا

...اللّٰهُ يُرِيْدُ ظُلْمًا لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝ رہے ہیں اور یہ نہیں ہو سکتا کہ خدا تمام دنیا پر ظلم

(آل عمران: ۱۰۸) کرنا چاہے۔

۳۔ وَمَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ وَلٰكِنْ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ○ — جو کچھ انھیں پیش آیا تو اس لیے نہیں کہ خدا ان پر ظلم کیا، یہ خود اپنے ہاتھوں اپنے اوپر (آل عمران: ۱۱۷) کر رہے ہیں۔

۴۔ وَخَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَلِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۢ بِمَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ○ (جاثیہ: ۲۲) — اور بنائے اللہ نے آسمان اور زمین جیسا چاہئیں اور تاکہ بدلہ پائے ہر کوئی اپنی کمائی کا ان پر ظلم نہ ہوگا۔

غرض قرآنِ مجید کے مطابق عدل خدا کی بنیادی صفت ہے اور یہ بات تصور آسکتی کہ اللہ تعالیٰ ایک مطلق العنان حکمران ہے جو اپنی مرضی کے مطابق جو چاہتا ہے، اگرچہ اُس کے اعمال انصاف کے خلاف ہوں (معاذ اللہ)

ظاہر ہے کہ جبر و اختیار کے دو مخالف نظریے باری تعالیٰ کے متعلق دو تصوّرات کا نتیجہ ہیں یعنی خدا کو مطلق العنان ماننا نیز اُسے عادل تسلیم کرنا۔

ابتدائی دور کے مسلمان صحرائی علاقے کے باشندے تھے۔ اُن کا تصورِ باری کے متعلق ویسا ہی تھا جیسا کہ کسی قبیلے کا خدا کے متعلق ہونا چاہیے۔ یعنی لامحدود اختیار کا مالک۔ اسی تصوّر سے اُنھوں نے جبر کا اخلاقی نظریہ پیدا کر لیا۔ اُن کا خدا سب کچھ کر سکتا ہے اگرچہ وہ غیر معقول اور خلافِ عدل ہی ہو۔ اخلاقی پہلو سے ان کی تعلیم یہ تھی کہ انسان مالک کے ہاتھ میں ایک آلہ ہے اور جبر کے انتہائی سخت گیر قوانین اُس پر نافذ ہیں یہ مشرقی جبریت کے نام سے مشہور ہوا اور اس کی وجہ سے اسلام پر جبری مذہب ہونے کی تہمت لگائی گئی لیکن یہ تہمت حقیقت سے بہت بعید تھی اس لیے کہ اسلام کردار کو زیادہ سے زیادہ اہمیّت دیتا ہے جو انسان کے دائرۂ اعمال میں کار فرما ہوتا ہے۔

اس کے برعکس معتزلہ نے اس امر پر زور دیا کہ انسان اپنے اعمال کا خود ذمہ دار ہے انھوں نے خدا کی مطلق العنانی اور جبر و قدر کے خلاف دلیلیں پیش کیں اور اپنا انحصار انسانی

پر رکھا جو اُن کے نزدیک مقدس تھی۔ اُن کی تعلیم یہ تھی کہ سب سے پہلے مذہبی قانون نہیں، بلکہ انسانی عقل سے اپیل کرنی چاہیے۔ عقل ہمیں بتاتی ہے کہ ہم اپنے اعمال کے خود ذمہ دار ہیں۔ اُن میں سے بعض اعمال صحیح ہوتے ہیں بعض غلط۔ یہ صحیح اور غلط کا تصور انسان کی فطرت میں مضمر ہے اور یہ مذہب کے سکھائے ہوئے علم پر مبنی نہیں۔ اس بنا پر انسان اپنی تقدیر کا خود ساز گار ہے اور اپنے دائرے میں آزاد ہے۔ اپنے لیے اخلاقی قواعد بھی وہی بناتا ہے اور وہ قواعد مذہبی قانون کے عین مطابق ہونے چاہئیں، اس لیے کہ مذہبی قانون عقل پر مبنی ہے، کوئی مذہبی حکم عقل کے خلاف نہیں ہو سکتا۔

لیکن معتزلیوں کے نزدیک انسان محض عقلیت پسند ہی نہیں، اُس میں ایک عنصر غیر معقولیت کا بھی شامل ہے، جس کے سامنے وہ کبھی کبھی جھک جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ بعض اوقات گمراہی میں پڑ جاتا ہے اور خطا و گناہ کا مرتکب ہوتا ہے۔ اسی لیے مذہب کی ضرورت پیش آتی ہے کہ وہ بھولے ہوئے لوگوں کو یاد دلا دے اور جن کی عقل پر جسمانی خواہشات کا پردہ چھا جاتا ہے، اُنھیں آگاہ کر دے۔ اس لحاظ سے عقلیت پسند مسلمان اسی راستے پر جا رہے تھے جس پر بعد میں جرمنی کا مشہور فلسفی کانٹ چلا۔ اخلاقی زندگی میں حقیقی قدر و قیمت نیک ارادے کو حاصل ہے اور وہ انسان کا اپنا ارادہ ہے۔ اختیار اور شخصی ذمہ داری کے بغیر بدلہ، جزا و سزا اور آئندہ زندگی مع بہشت و دوزخ ایسے الفاظ رہ جاتے ہیں جو معنی سے بالکل خالی ہوں۔

عقلیت انسانی عقائد و اعمال میں صرف رہنما اصول ہی نہیں، جیسا کہ مسلم عقلیت پسند کہتے ہیں، یہ کائنات میں سب پر حاوی اصول بھی ہے۔ یہ دنیا تمام ممکن دنیاؤں میں بہترین ہے اس لیے کہ یہ ایک اعلیٰ قلب کی بنائی ہوئی ہے اور دنیا میں جو شر پایا جاتا ہے وہ بحیثیت مجموعی خیر کا ایک لاینفک حصہ ہے۔

اختیار کے اصول کی جڑ خود قرآنِ مجید میں ملتی ہے، لہٰذا اس کے لیے خارجی چشمے

کی تلاش قطعاً مناسب نہیں حقیقت یہ ہے کہ اختیار کے حق میں قرآنی آیات اُن آیات کے مقابلے میں بدرجہا زیادہ ہیں جن سے جبریت نکالی جاتی ہے:

۱۔ وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ ۚ — اور کہہ دو یہ سچائی تمہارے پروردگار کی جانب سے ہے۔ اب جو چاہے مانے جو چاہے نہ مانے۔ (کہف: ۳۰)

۲۔ اِنَّ هٰذِهٖ تَذْكِرَةٌ ۚ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا ۝ — یہ نصیحت ہے جو کوئی چاہے پکڑ لے اپنے رب تک راہ۔ (دھر: ۲۹)

۳۔ قُلْ كُلٌّ يَّعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖ ۭ فَرَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَنْ هُوَ اَهْدٰى سَبِيْلًا ۝ — (اے پیغمبر!) کہہ دو ہر انسان اپنے طور طریقے کے مطابق عمل کرتا ہے پس تمہارا پروردگار ہی بہتر جانتا ہے کون سب سے زیادہ ٹھیک راہ پر ہے۔ (بنی اسرائیل: ۸۴)

۴۔ وَمَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا اَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهٗ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ اللّٰهَ يَجِدِ اللّٰهَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝ وَمَنْ يَّكْسِبْ اِثْمًا فَاِنَّمَا يَكْسِبُهٗ عَلٰى نَفْسِهٖ ۭ — اور جو شخص کوئی برائی کر بیٹھتا ہے یا اپنے ہاتھوں اپنا نقصان کر لیتا ہے پھر اللہ سے بخشش طلب کرتا ہے تو وہ اللہ کو بخشنے والا، رحمت رکھنے والا پائے گا اور جو کوئی برائی کماتا ہے تو اپنی جان ہی سے کماتا ہے۔ (نساء: ۱۱۱-۱۱۰)

قرآن کے رو سے انسان اپنے عقائد و اعمال کے انتخاب میں آزاد و مختار ہے اور اپنے انتخاب کی درستی و نادرستی کے مطابق وہ جزا و سزا کا مستحق ہے۔ خدا نے سیدھا راستہ دکھا دیا، اب انسان کا کام ہے کہ اُس پر چلے یا نہ چلے۔ ہر چیز کا فیصلہ پہلے ہو جانے کا مفہوم یہ ہے کہ انسانی فطرت میں وہ چیز آ گئی اور خدا کو ازل سے اُس کا علم تھا۔ خدا کا ازلی علم انسان کے انتخاب میں خفیف مداخلت کا بھی موجب نہیں۔ صرف اسی نقطۂ نگاہ سے اخلاقی اور مذہبی واجبات کو معنی خیز بنایا جا سکتا ہے۔ آدمی خود ایمان اور عمل صالح

ی بنا پر انہی نجات کا راستہ ہموار کرتا ہے، ایمان کا ذکر قرآن میں تنہا بہت کم آیا ہے۔ اسے
عموماً عمل صالح سے وابستہ کیا گیا ہے اور یقیناً عملِ صالح بہشت میں داخل ہونے کی
لازمی دستاویز ہے؛

- وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ (بقرہ ۲ : ۲۵)
جن لوگوں نے ایمان کی راہ اختیار کی اور اُن کے کام بھی اچھے ہوئے تو اُن کے لیے باغوں کی بشارت ہے جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں۔

- وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ (بقرہ ۲ : ۸۲)
اور جو کوئی بھی ایمان لایا اور اس کے کام بھی اچھے ہوئے تو وہ بہشتی گروہ میں سے ہے۔

لسفیانہ نقطۂ نگاہ اسلام کے متعلق مسلم فلسفیوں کا نقطۂ نگاہ علمائے دینیات سے کسی قدر مختلف ہے، علمائے دینیات کا اصل مقصد
تھا کہ اسلامی اصول کو اپنے اسلوب کے مطابق اعتراضات سے محفوظ کریں۔ فلسفیوں
کوشش یہ تھی کہ اسلامی اصول اور فلسفیانہ افکار میں تطبیق ہو جائے، یعنی خدا کا
سا تصوّر پیش کیا جائے جو مذہبی آدمیوں اور آزاد خیال لوگوں، دونوں کی ضروریات کو
را کر سکے۔ خدا کا ایک تصوّر یہ تھا کہ جو کچھ بھی وجود پذیر ہوا، اُس کا پیدا کرنے والا اور
لق بھی ہونا چاہیے اور وہ خدا ہے اس تصوّر کو مسلمان فلسفی کسی نہ کسی طرح خدا کے شخصی
لامی تصوّر سے ہم آہنگ کرنا چاہتے تھے یہ کوشش کس حد تک کامیاب ہوئی؟ اس
اندازہ آگے چل کر ہوگا۔

سب سے پہلے جن مسلمانوں نے اسلام کے سادہ افکار میں فلسفیانہ استدلال کا
خل ڈالا وہ معتزلی تھے۔ اس کے بعد مشہور فلسفی یعنی الکندی، الفارابی اور ابنِ سینا
ور آیا۔ وہ لوگ عام طور پر معتزلہ کو وقعت کی نظروں سے دیکھتے تھے۔ امام غزالی بھی

علماے دینیات کے طور طریقوں کی نسبت اپنی مایوسی کو چھپا نہ سکے۔ امام موصوف لکھتے ہیں کہ اُن کا اختیار کردہ طریقہ اُس حد تک اُن کا مقصد پورا کرتا ہے، لیکن یہ طریقہ اُن لوگوں کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتا جو بدیہی حقائق کے سوا کسی حقیقت کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں۔

عمومی حیثیت میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ علماے الٰہیات کے طریقے کی بنیاد فلسفیانہ تھی اگرچہ یہ دعویٰ معتزلہ کے بجاے اشعریوں کے تعلق میں زیادہ صحیح ہوگا۔ اشعری علت و معلول کے سلسلے کے منکر تھے اور اس کی کوئی ضرورت بھی نہ سمجھتے تھے بلکہ خدا کو سببِ اوّل کہنے کے لیے بھی تیار نہ تھے۔ اُن کی تعلیم یہ تھی کہ طبعی مظاہر میں جو یکسانی نظر آتی ہے، لیکن اس وجہ سے نہیں کہ وہ لازمی قوانین کے تابع ہیں صرف اس وجہ سے کہ انسانی دل و دماغ ان میں تسلسل دیکھ لیا خدا چاہے تو اس یکسانی کو کسی وقت بھی درہم برہم کر سکتا ہے اور اس کی مشیت کے مطابق عجائبات کا ظہور ہوتا ہے۔ یہ کہنا صحیح نہیں کہ طبعی مظاہر میں ہر واقعہ باہم دگر ربط و تعلق کا نتیجہ ہے۔ صحیح یہ ہے کہ ہر شے تازہ تخلیق ہے۔ خدا اور کائنات کے متعلق اُن کا پورا تصور ارسطو کے فلسفے سے مختلف تھا، بلکہ اُس کے خلاف تھا اور ارسطو ہی کا فلسفہ مسلم فلسفیوں کے غور و فکر کی بنیاد تھا۔

اسلام کے تمام فلسفیوں کے جداگانہ نظاموں کی کیفیت یہاں بیان کرنا غیر ممکن ہے۔ اس عام جائزے میں ہم صرف فارابی اور ابن سینا کے دبستانوں کی روش پیش کریں گے جو حقیقت میں اسلامی فلسفے کے نمائندے سمجھے جا سکتے ہیں خصوصاً ابن سینا جو اس فلسفہ کے دورِ بلوغ میں پیدا ہوا اُس نے اُسے بڑے واضح اور مدلّل طریق پر آخر شکل میں پیش کیا۔ پیشتر کے اور بعد کے مسلم فلسفیوں کی طرح ابن سینا کا مقصد بھی یہ تھا کہ کوئی ایسا فارمولا دریافت کرے جو مذہبی اصول اور فلسفیانہ اصول میں مطابقت کا ذریعہ بن سکے۔ اس سلسلے میں وہ فارابی کا بہت صحیح پیرو تھا۔ اُن دونوں کے نزدیک

ی فلسفہ، قریباً ہر خطا سے پاک تھا، تاہم وہ اپنے طریقے کے مطابق اسلام کے بنیادی
صول کو بھی مانتے تھے۔ اس وجہ سے اُن کا فلسفہ ایسے افکار سے مرکب نظر آتا
جن میں سے اکثر میں مطابقت کا پہلو پیدا کرنا مشکل ہے، الّا یہ کہ مخالفانہ تصوّرات
ضیحات کے ذریعے سے ختم کرنے کا طریقہ اختیار کر لیا جائے۔ نیز ان کے فلسفے
یت بڑی حد تک انتخابی ہے اور انتخابیت صرف مسلمانوں کا کام نہیں جیسا کہ بعض
م نے سمجھا جن دو نہایت اہم سرچشموں سے مسلمانوں نے زیادہ تر افکار حاصل کیے یعنی
ایک تو نوافلاطونیت اور دوسرے مخفی و پر اسرار علوم — یہ ان کے پاس انتخابی شکل
ں پہنچے تھے، افلاطون اور ارسطو کے افکار کے ساتھ ایک گونہ ہم آہنگی پیدا کی
ی تھی۔ اُن کے افکار کو سرزمینِ مشرق کی قدیم حکمت کی روشنی میں تعبیر کر لیا گیا تھا اور
شرقی حکمت کی اصل مذہبی تھی۔ اس طرح افلاطون اور ارسطو لقمان، فلسفیوں کے
ک بدرجہا زیادہ جاذب بن گیے اور مسلمان فلسفیوں کا مقصد یہی تھا کہ اسلامی اصول
یر فلسفیانہ انداز میں کریں۔

ا جب یونانی افکار اسلامی دنیا میں پہنچے، تو فلسفیوں کو ایک نئے مسئلے سے دوچار
پڑا، جسے حل کرنے کی اُنھوں نے کوشش کی، ایک طرف اسلام خدا پر سادا ایمان
عوت دیتا تھا جو کائنات کا خالق اور اُس کا پروردگار ہے، اس میں فلسفے کی کوئی چیز
ں نہ تھی اور نہ فلسفے کے لیے بنیاد مہیّا ہوتی تھی، دوسری طرف یونانی فلسفہ تھا اور یہ
ز مسلمانوں کے سامنے ایسے انداز میں پیش ہوا تھا گویا مسئلہ بقا کے حل کی تلاش میں
نی دل و دماغ کا یہ آخری کارنامہ تھا۔ مسلمانوں کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ کسی مذہبی تعلیم
و فلسفیانہ افکار سے بظاہر متصادم تھی، کسی ترمیم کے بغیر قبول کریں۔ لیکن یہ بھی ممکن
ا کہ یونانیوں کے فلسفیانہ نظریات کو اُسی صورت میں مان لیں جس صورت میں یہ
منے آئے تھے، ساتھ ہی اُن کے نتائج و لوازم قبول کریں۔ لہٰذا اُن کے لیے صرف

ایک راستہ باقی رہ گیا تھا اور وہ یہ کہ دونوں میں مطابقت کا کوئی پہلو نکالیں۔ سوال یہ تھا کہ ان میں سے کس کے فلسفیانہ نظریات قبول کیے جائیں، آیا ارسطو کے نظریۂ محرک اول کو اختیار کیا جائے جس نے پوری کائنات کو متحرک کیا اور پھر اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا یا افلاطون کے نظریے کو قبول کیا جائے جو خدا کو خیر مطلق مانتا تھا، لیکن دنیا کے ساتھ اُس کے تعلقات کو اُس نے غیر واضح اور غیر معین چھوڑ دیا تھا، رواقیوں کا نظریہ وحدت الوجود یا نوافلاطونیوں کا نظریہ قبول کیا جائے؟

خدا کے متعلق یونانیوں کے یہی بڑے نظریے تھے جو مسلمانوں تک پہنچے۔ لیکن ان میں کوئی بھی خاصی ترمیم کے بغیر قبول نہیں کیا جا سکتا تھا۔ وحدت الوجود کا نظریہ اُس اسلامی فلسفے میں کبھی نمودار نہ ہوا جو ہمارے زیرِ بحث ہے، لیکن آگے چل کر وحدت الوجود کا مستقل طور پر شیخ محی الدین ابن عربی نے پیش کیا، جو بڑے عظیم الشان مسلم صوفی تھے کے متعلق ہم موقع پر ذکر کریں گے۔ مسلمان فلسفیوں نے افلاطون، ارسطو اور نوافلاطونیوں کے افکار سے فائدہ اٹھا کر اپنا علم ماوراء الفطرت مرتب کیا جس میں اسلامی افکار کا بھی خاصا بڑا حصہ ہے، لیکن اسلامی تصوّرات کی تعبیر ایسے انداز میں کی گئی کہ وہ فلسفیانہ معلوم ہوں۔ اس طرح اسلامی فکر اور دورِ کفر کے فکر کے درمیان جو خلیج حائل تھی، اُس کا عرض کم رہ گیا۔ مسلمان فلسفی جس مسئلے سے دوچار تھے وہ یہ تھا کہ ایک طرف کائنات تھی جس میں گوناگوں زمانی و مکانی اور بند مظاہر تھے، دوسری طرف جوہرِ اوّل تھا جو نہ تبدیل ہو سکتا تھا نہ اُس میں کسی حد کی گنجائش تھی، ان کے درمیان تعلقات کی کیا صورت ہو سکتی ہے؟ فلسفے کی زبان میں یہ مسئلہ وحدت اور کثرت یا ذات اور مظہر کے درمیان تعلق کا مسئلہ تھا۔ دینیات کی زبان میں ہم اسے خدا اور کائنات کے تعلق کا مسئلہ کہہ سکتے ہیں۔ یونانی مفکر خدا کے اس تصور سے بہت دُور تھے جس کی وضاحت خدا کی طرف سے نازل شدہ ادیان میں ہوئی تھی۔ ارسطو کا فلسفہ خالص جبری فلسفہ ہے جس میں مادی دنیا اور خدا دونوں ذاتی ضرورت کے ایک اعلیٰ قانون کے تابع

لیے تھے۔ افلاطون نے ماورائے طبعی اور شاعرانہ تصورات کی بنا پر خدا کو تجریدیت کی آخری منزل پر پہنچا
یا تھا البتہ نو فلاطونیوں نے اپنی غیر مذہبی روایات کے ساتھ عمومی وابستگی کے باوجود کسی نہ
کسی طرح کا مذہبی فلسفہ پیش کیا۔ اگر یہ کہا جائے کہ انھوں نے مسیحی یا اسلامی فلسفۂ مذہب کے
لیے راستہ ہموار کیا اور مسلمانوں کے مذہبی افکار میں اُن کا اثر سب سے زیادہ نمایاں ہے
تو اس پر تعجب ہرگز نہ ہونا چاہیے۔

اسلام کو یونانی فلسفے سے عموماً اور نو فلاطونیت سے خصوصاً مطابق و ہم آہنگ
کرنے کی کوشش دیانت داری پر مبنی تھی لیکن یہ بڑی جسارت تھی مسلمان فلسفی اس
میں کامیاب ہوئے یا ناکام رہے، یہ ایک جداگانہ معاملہ ہے، لیکن اس حقیقت میں کوئی
شک نہیں کہ اس کوشش کے سلسلے میں انھوں نے انسانی افکار کی تاریخ میں خاصا اہم کام
انجام دیا۔ ساتھ ہی اپنے آپ کو حریفوں کی شدید نکتہ چینی کا ہدف بھی بنا لیا۔ امام غزالی نے
ان کے نظریات پر جو سخت حملے کیے، اُن کا ذکر آگے آئے گا۔

ابن سینا کے متعلق عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ وہ فلسفے کا حقیقی نمائندہ تھا جس
نے اسلامی فکر اور نو فلاطونی فکر میں مطابقت کی کوشش کی۔ امام غزالی نے بھی اُس کے اور
(؟) کے نظریات کو فلسفیوں کے بہترین نظریات قرار دیا ہے اور امام موصوف جب فلسفیوں پر حملہ کرتے
ہیں تو اُن کے پیش نظر ابن سینا ہی ہوتا ہے۔ الفارابی بھی ایک اچھا نمونہ پیش کرتا ہے، لیکن اُس
میں وہ سلاست، وضاحت اور جامعیت نہیں جو اُس کے بعد آنے والے فلسفی یعنی ابن سینا
میں ہے۔ الکندی زیادہ منطقی، طبعاً فلسفی اور عالم دینیات ہے۔ ابن رُشد کی عظمت ارسطو
کے فلسفے کی شرح میں ہے نہ کہ مستقل فلسفیانہ فکر میں۔ ان کے سوا جو مسلمان فلسفی مغرب
میں پیدا ہوئے وہ محض فارابی اور ابن سینا کے اردگرد گھومنے والے تھے۔

خدا اور کائنات

ابن سینا، خدا کو اللہ کے بجائے واجب الوجود کہنا قابلِ ترجیح قرار
دیتا ہے۔ وہ خدا کے متعلق مذہبی اور فلسفیانہ تصورات کی درمیانی

خلیج پر پُل بنا دینا چاہتا ہے اس طرح وہ وجود اور وجوب کے تجزیے کو منطقی نتائج تک
دینے کا آرزومند ہے۔ اسم اللہ کے ساتھ بعض ایسی اسلامی چیزیں وابستہ ہیں جو اسے
اصطلاح بنا دیتی ہیں۔

ابن سینا خدا اور کائنات کے تعلق کا تجزیہ شروع کرتا ہے تو سب سے پہلے وجود
مسئلہ زیرِ غور لاتا ہے۔ اسے محض ایک علمی طریقہ سمجھنا چاہیے ــــ وجود کو وہ دو
میں تقسیم کر لیتا ہے یعنی واجب اور ممکن۔ وجود واجب وہ ہے جو بہ ذات خود قائم ہو
کی ذات اور وجود ایک حیثیت رکھتے ہیں۔ اس کے متعلق یہ فرض کرنا کہ موجود نہیں تضاد کا
ہے۔ ممکن کا وجود نہ ضروری ہے اور نہ اُس کے لیے کوئی ضروری دلیل پیش کی جا سکتی
اس کا ہونا نہ ہونا برابر ہے اس کی ذات اس کے وجود سے مختلف ہے، یہ عالم عارضی اور حادث
ہے اور یہ خدا کے سوا ہے۔ ابن سینا کہتا ہے کہ محض یہ واقعہ کہ ہمارے دل میں وجود
کا تصوّر موجود ہے ثابت کرتا ہے کہ وہ موجود ہے۔ بقا کمال کی ایک مثبت خصوصیت
اور ہم وجود کامل کا تصوّر کرتے ہیں تو اسے موجود ہونا چاہیے ورنہ ہمارا تصوّر غلط ہو
گا۔ یہ علمی دلیلِ وجود ڈیکارٹ اور لائبنز نے موجودہ فلسفے میں استعمال کی۔ اگرچہ ان
نے اس سے جو نتیجے نکالے وہ مختلف تھے۔

ابنِ سینا واجب و ممکن کے درمیان ارسطو کا قائم کیا ہوا امتیاز بھی استعمال کرتا
لیکن اس موضوع پر بحث کرتے ہوئے ارسطو سے بہت آگے نکل جاتا ہے، خدا کی
کے ثبوت میں بھی اور خدا اور کائنات کے ربط و تعلق کی تشریح میں بھی۔ وہ علمائے دین کی
دلیل پر بھی نکتہ چینی کرتا ہے، جس کا مدّعا یہ ہے کہ مظاہر عالم کے وجود سے خالق مطلق
وجود کا اثبات کیا جائے۔ ابن سینا کہتا ہے کہ خدا پر کائنات کے انحصار کی علّت تقدم
نہیں، بلکہ حدوث ہے۔ اگر تقدم زمانی کا دعویٰ کیا جائے تو مندرجہ ذیل مہمل نتیجے پیدا
ہیں مثلاً خدا کا ارادہ اور قوتِ تخلیق عالم سے پیشتر لامتناہی زمانے تک معطل رہے نیز ایک خاص و

...الم کو پیدا کرنے کا ارادہ جس سے تقدم و تاخر خارج تھا، ایسے حالات کا نتیجہ سمجھا جا سکتا ہے جو خدا کی ذات سے باہر تھے، اس کا مطلب یہ ہو گا کہ اس کے اندر کوئی خاص تبدیلی پیدا ہوئی۔ ایک نتیجہ یہ پیدا ہو گا کہ خدا عالم کو پیدا کر چکا تو یہ خالق سے مستقل حیثیت اختیار کر سکتا تھا، اس لیے کہ خالق سے اس کا تعلق صرف تخلیق کا تھا، تخلیق کے بعد اپنے قیام و تحفظ کے لیے خدا سے اسے کوئی واسطہ نہ تھا۔

اگر عالم یا کائنات کو حادث یا ممکن مانا جائے تو ساتھ ہی یہ بھی طے ہو جائے گا ۔ وہ اپنی بقا اور تسلسل کے لیے خدا کی ہستی پر موقوف ہے۔ یہ ایک ازلی وجود ہے جو ہر لمحہ خدا سے بقا حاصل کر رہا ہے، اُن کے درمیان صرف منطقی تقدم ہے، یعنی معلول پر علت کا تقدم۔ علت اس سلسلے میں بلحاظ زمان معلول پر مقدم نہیں، ہم اسے درجے کی برتری بھی قرار دے سکتے ہیں، اس لیے کہ علت کا درجہ معلول سے بلند ہوتا ہے۔ یہاں ابن سینا ارسطو کا کامل ہم نوا ہے اور علمائے دینیات سے اُسے صریح اختلاف ہے، جو تخلیق پر اصرار کرتے ہیں اور یہ اسلامی اصول کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ خدا نے عالم کو عدم محض سے پیدا کیا اور اُس وقت پیدا کیا جو اُس نے مقرر کر لیا تھا۔ یہ سوال نہیں کیا جا سکتا کہ کیوں اس سے پہلے یا بعد پیدا نہیں کیا، اس لیے کہ ازلی ارادے کے دائرے میں تقدم و تاخر استعمال نہیں ہو سکتا۔ امام غزالی نے کائنات کے ازلی ہونے کے سلسلے میں فلسفیوں کے دعوے کا رد کرتے ہوئے یہی دلیل پیش کی ہے۔

کائنات کو ازلی ماننے کے نظریے کے باوجود ابن سینا خدا کو اس کا بنانے والا، درست کرنے والا اور خلق کرنے والا قرار دیتا ہے، یہ صفات خود قرآن میں آئی ہیں اور ان کا ایک مقصد ہے اور وہ یہ کہ کائنات کو عدم محض سے پیدا کیا گیا۔ ابن سینا عدم محض سے کسی چیز کا پیدا ہونا غیر ممکن سمجھتا تھا۔ لہذا اُس نے ان اصطلاحات کی زمانی حیثیت ختم کر دی وہ کہتا ہے کہ جو چیز وجود میں آتی ہے، ضروری نہیں کہ اُس کا زمانی آغاز مانا جائے، نہ اُسے

لازماً ارادے کا فعل قرار دینا چاہیے۔ ممکن ہے وہ اچانک پیدا ہوگئی ہو اور زندگی کے
سرچشمے سے کوئی چیز اُسی طرح باہر اچھل آئی ہو جیسے کرنیں سورج سے باہر نکل رہی ہیں
سے کائنات کے تعلق کی یہی صورت ہے۔ اگر دوام و وجوب علتِ اولی ہونے کی
میں خدا کی صفات ہیں تو یہ اُس کے افعال کی صفات بھی ہونی چاہیے جو اُس کے
ہیں۔

دیکھیے ابن سینا اس طرح اپنے جبری فلسفے میں کہاں پہنچ گیا۔ اُس کے نزدیک
وجوب بنیادی شے ہے اور کائنات کے مظاہر اور خدا دونوں اس کے تابع ہیں۔

صفاتِ باری تعالیٰ جو کچھ کہا جا چکا ہے، اس کے باوجود مسلمانوں کے فلسفے کا تصور ہرگز ارسطو کے تصور کے مطابق نہیں۔ فارابی اور
کے ہاں بھی خدا کی حیثیت مادی دنیا میں محض قوتِ فعال کی نہیں، بلکہ وہ ایک جداگانہ
ہے۔ جو مادی دنیا سے بہت بلند ہے وہ ہمیشہ تخلیق میں لگا رہتا ہے اور اسے
رکھنے کا واحد سہارا ہے۔

مسلمان فلسفیوں کا تصور باری تعالیٰ بہ یک وقت دینیاتی بھی ہے اور فلسفیانہ
بھی۔ ان کے نزدیک خدا کی گوناگوں صفات ہیں۔ ایک حصہ ماورائے طبعی صفات کا ہے
خدا کے واجب الوجود ہونے سے خود بخود نکلتی ہیں یا اس تعریف سے نکالی جا سکتی ہیں
دینیاتی صفات وہ ہیں جن کی بنا پر خدا نے قرآنِ مجید میں اپنا ذکر کیا ہے۔ ماورائے طبعی
صفات بھی عموماً مذہبی رنگ میں رنگی جاتی ہیں اور اُن کی تشریح ایسے انداز میں کی جاتی ہے
کہ وہ جزواً اخلاقی اور جزواً دینیاتی حیثیت اختیار کر لیتی ہیں۔ اس کی حقیقت یہ ہے کہ
فلسفی مذہب اور فلسفے کے درمیان چکر لگاتے رہتے ہیں اگرچہ اُن کا اصل مرجع فلسفہ ہی
ہے۔ ابن سینا کے بیان کے مطابق خدا کی صفات یہ ہیں: بسیط، واحد، کمالِ مطلق، خیر
اُس جیسا کوئی نہیں، اور نہ کوئی اُس کا جوڑ ہے۔ صفتِ بسیط خدا کے واجب الوجود

نے کی تعریف کا منطقی نتیجہ ہے، اس لیے کہ اگر مرکب ہو، خواہ مادّی ہو یا مقداری واجب
قائم بالذات ہونے کے منافی ہے، مرکّب بہر حال یا تو اپنے اجزا پر موقوف ہوگا یا تکمیل کے
دوسرے وجود پر انحصار رکھے گا۔ ظاہر ہے کہ خدا نہ مادی ہے، نہ تقسیم ہو سکتا ہے، نہ
زیادہ جوہروں سے مرکّب ہے اور نہ اُس کی حد بندی کی جا سکتی ہے۔

وحدت بھی خدا کی صفت ہے، اس لیے کہ خدا ہر اعتبار سے واحد ہے، اُس کا کوئی
یک نہیں جو اُس کی ذات یا صفات میں حصہ دار ہو، یہ مسلمان کے ایمان کا پہلا اصول ہے،
دُں کا تعدد، خدا کے قائم بالذات ہونے کے منافی ہے، کمالِ مطلق بھی خدا کی ایک صفت
خدا کامل ہے، مکمل ہے۔ ارسطو کی زبان میں خدا خالص واقعیت ہے۔ اُس میں کوئی
یں جو درجۂ کمال پر نہ ہو: مثلاً اُس کا ارادہ، اُس کا علم، اُس کا عمل اور اُس کی ذات۔ اُس
سوا جو کچھ ہے وہ عملِ تکمیل میں ہے، خدا کے سوا ہر شئے کی تکمیل بالقوہ مانی جا سکتی
خدا اُسے بالفعل لا رہا ہے،

خیر محض بھی خدا کی ایک صفت ہے جو مادے اور قوت سے اُس کے پاک ہونے
ہا پر نکلتی ہے۔ یہاں خیر سے مراد ہے شر کی ضد ——— جتنی بھی چیزیں ہیں اُن
دو پہلو ہیں، ایک خیر کا پہلو دوسرا شر کا پہلو ——— ایک لحاظ سے دونوں بالفعل
دہیں، ایک لحاظ سے بالقوہ ہیں۔ خدا صرف خیر محض ہی نہیں بلکہ وہ خیر کا اصل سرچشمہ بھی ہے
اس سے خیر ہر وقت دنیا کی ہر چیز میں جاری وساری رہتی ہے۔ پوری کائنات کا وجود اور جو محبت
ہی کی طرف متوجہ ہوتا ہے، یہ نتیجہ ہے اُس خیر کا جو ہر شے کو حاصل ہوتی ہے اسی طرح
منزلِ کمال کی طرف گام زن ہے۔ دنیا کو حقیقتاً خدا سے محبت ہے، اس لیے کہ اُسے
سے محبت ہے اور صرف خیر ایسی شے ہے جس کے ساتھ اُس کی خاطر محبت کی جاتی
محبت ہی کی بنا پر خدا پوری کائنات کو حرکت میں لایا، للہذا جو کچھ بھی عالمِ بقا میں ہوتا ہے
بت کا ثمرہ ہے۔ ابن سینا نے خدا کے متعلق علتِ فاعل کا جو نظریہ قائم کیا تھا اُس میں

تو وہ کامیاب نہ ہوا لیکن خدا کو بحیثیتِ علّتِ اولیٰ پیش کرنے میں اُس نے شاندار کامیابی حا
کی ہے اس سلسلے میں اُس کی دلیل قوی اور واضح ہے اور اُس میں کسی لفظی ہیر پھیر سے کا
نہیں لیا گیا حق یہ ہے کہ اُس کے ماورائے طبعی علم کا یہ بہترین حصّہ ہے جہاں فلسفہ اور تصو
مل جاتے ہیں۔ خدا اور بیرونی دنیا کا تعلق اس نے محبت اور وحی کی اصطلاح میں پیش کیا
یعنی دنیا کی طرف سے محبت اور خدا کی طرف سے دنیا کی ہدایت کے لیے قوتِ تخلیق کی نم
اللہ تعالیٰ ہر شئے کو وجود عطا کرتا ہے، یہ بذاتِ خود اُس کی قوتِ تخلیق کی نمود ہے۔ اللہ تعالیٰ
مخلوق کے سامنے اُن کی فطرت کے مطابق اپنے وجود کا اظہار کرتا رہتا ہے اُن کی فطر
محکم اور غیر متبدّل ہے یا ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ وہ کمال کے اُس درجے کے تناسب
اپنے وجود کا اظہار کرتا رہتا ہے جس کے لیے وہ مخلوق آرزو مند ہے یہ جو
ہو رہا ہے ایک ایسے وجود کے ذریعے سے ہو رہا ہے جس نے تمام چیز
ایک خاص تنظیم و ترتیب میں رکھ دیا اور وہ تدریجاً منکشف ہو رہی ہیں
مظاہر عالم کا ظہور خدا کی ازلی نمائش کے متوازی ہے اور یہ دونوں عم
ایک دوسرے سے غیر منفک ہیں۔ ابن سینا کا عقیدہ خدا کے متعلق
کا فلسفۂ جمال نیز فطرت عالم کے متعلق اُس کا رجائی نظریہ اُس کے
متصوفانہ فلسفے کی شاخیں ہیں۔ یہی وہ مقام ہے جہاں ہم اسے ارسطو
بجائے افلاطون اور پلاٹینس کے زیادہ زیرِ اثر پاتے ہیں۔

ابنِ سینا کے نزدیک خدا اصلاً عقلِ کُل ہے جس کی ساری حرکت صرف اپنی معرف
میں صرف ہو رہی ہے۔ وہ خود ہی عارف کرنے والا ہے اور خود ہی عرفان کا موضوع ہے اس
دوئی قطعاً نہیں جس طرح کہ دوسروں میں ہے۔ دوئی اس کی توحید کے بھی منافی اور اس
بسیط ہونے کے بھی منافی ہے۔

اللہ تعالیٰ کے علم کے متعلق بھی بڑی بحثیں ہیں علمائے الٰہیات قرآنِ مجید کی

کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ماضی، حال، مستقبل دیدہ و نادیدہ سب کچھ جانتا ہے۔ اُن کے نزدیک
تعالیٰ ہر جگہ حاظر و ناضر ہے، اور دنیا میں کچھ نہیں ہوتا جس کا پہلے سے اسے علم نہ ہو۔ فلسفی
تے ہیں کہ خدا کا علم اصلاً اپنے متعلق ہے اور اپنے متعلق علم کے بعد کائنات کے متعلق اُسے
عمومی علم ہے۔ وہ تمام چیزوں کی قطعی علت ہے اور علت کے علم میں معلول کا علم بھی
تا ہے۔ وہ یوں استدلال کرتے ہیں کہ دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کا علم جاننے والے
جاننے ہوسے کے درمیان زمانی تعلق پر منحصر ہے۔ اس طرح جاننے والے میں تبدیلی
مانا لازم ہے لیکن خدا کا علم وقت اور تبدیلی سے بالا ہے۔

ابن سینا یہ بھی مانتا ہے کہ نہ خدا کا کوئی جوڑ ہے اور نہ مقابل۔ اس کا جوڑا اس لیے
نہیں کہ اس صورت میں دو واجب الوجود ماننے پڑیں گے۔ اگر کوئی مقابل مانا جائے
تو یہی ماننا پڑے گا کہ دو وجود ایک دوسرے کے بالمقابل ہیں جو ایک لحاظ سے متشابہ
یک لحاظ سے متفاوت ہیں اور خدا کا مشابہ یا تمثیل کوئی نہیں۔ لہٰذا اس کا مقابل بھی کوئی
۔

مسلمان فلسفی خدا کی صفات کو نظر انداز نہیں کرتے، مثلاً اس کی ہمہ گیر قدرت، اس کا
یر علم، اس کا عدل، اس کی بخشش وغیرہ، مگر انھیں فلسفیانہ انداز میں تعبیر کرتے ہیں۔ ہم علم
راوسے کی صفات بہ طور مثال پیش کر چکے ہیں، پس ظاہر ہے کہ خدا کے متعلق ان کا تصور
یونانی فلسفیوں کا کافرانہ تصور ہے اور نہ راسخ العقیدہ مسلمانوں کا سا تصور۔ عام معنی میں
ق سے انکار اور عالم کے قدیم ہونے کا اعتقاد قطعاً غیر اسلامی چیزیں ہیں۔ انھوں نے
یا کہ کائنات خدا کی داخلی ضرورت کا نتیجہ ہے اور اپنی بخشش و ربوبیت کے مشہور
ار کے لیے اس کے اندر ایک ازلی خواہش موجود تھی۔ یہ کہہ کر انھوں نے اپنے خیال
ے مطابق معاملے کو بالائی سطح پر پہنچا دیا۔
اگرچہ نظریاتی لحاظ سے مسلمان فلسفی کم از کم اپنی بعض آرا میں یقیناً اسلام کے خلاف

گیے لیکن ان کے سوانح حیات سے ہم جو معلومات حاصل کر سکے ہیں ایہی ظاہر ہوتا
وہ عملی اعتبار سے سچے مسلمان تھے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ فارابی نے خدا پرستی اور
زندگی بسر کی۔ وہ مذہبی عبادات اور مراقبات میں مصروف رہتا تھا۔ ابن سینا نے
جسمانی استراحتوں اور لذتوں سے ایک حد تک فائدہ اٹھایا مگر ایسا کوئی بیان نہیں ملا کہ
مذہبی فرائض پس پشت ڈالے ہوں۔ بلا شبہ بہشت و دوزخ اور حشر کے متعلق ا
تصوّرات راسخ العقیدہ مسلمانوں کے تصوّرات سے مختلف ہیں لیکن وہ ان آغزا
تصوّرات کا بالکل منکر نہیں تھا۔ ہم مقالے کے اس عنوان پر بحث کو خود اس کے الفا
کرتے ہیں۔ وہ کہتا ہے:

"انسان کا اصل مقصد اس کے سوا کچھ نہیں کہ جس حد تک ممکن ہو، وہ اشیاء کی
حقیقت کا علم حاصل کرے، اسی پر آئندہ زندگی میں اس کی سب سے بڑی
راحت کا انحصار ہے۔ نیز ضروری ہے کہ جو کچھ واجب قرار دیا جا چکا ہے
اسے پورا کرے۔ اس طرح انسان کی روح زیادہ محترم و کامل ہوتی ہے اجو
وجود کے عالم کبیر کے مقابلے میں ایک عالم صغیر کی حیثیت رکھتی ہے اسی
طرح انسان آئندہ زندگی میں زیادہ سے زیادہ راحت سے استفادے کے
لیے تیار ہو سکتا ہے"۔

متصوّفانہ نقطۂ نظر

لفظ تصوف صوف سے مشتق ہے، جس کے معنی اون کے ہیں۔
صوفی عام طور پر اونی جبے پہنتے تھے اس لیے لوگوں میں اس نام
مشہور ہو گئے۔ اسلامی تصوّف نے اسلامی تعلیم اور مذہبی زندگی کے
کو کمال پر پہنچا دیا۔ مذہب کی معنویت میں گہرائی اور اس کی تعلیمات کی بیش بہائی کے
کام صوفیوں نے انجام دیا وہ نہ فلسفی انجام دے سکے نہ علمائے الٰہیات اور زند
جس انداز میں صوفی اسلام کو سمجھتے اور پیش کرتے ہیں اس کو سامنے رکھ کر اس دین ح

دنیا کے دوسرے بڑے مذاہب سے کیا جاسکتا ہے اور تصوف ہی ایک مشترک
میدان ہے جہاں بڑے بڑے مذاہب جمع ہوتے ہیں۔

اسلامی تصوف اپنے آغاز ہی کے وقت سے مختلف مجلسی و مذہبی اشکال داوضاع
یوں کے خلاف ایک روحانی انقلاب کی حیثیت رکھتا تھا طویل اور شدید جدوجہد
د تصوف کو دو مختلف شکلوں میں قیام نصیب ہوا اول مذہبی فلسفے کی حیثیت میں
ہب کی ہردلعزیز اور عوامی حیثیت میں اور عروج میں اسلامی سلطنت کے اندر لاکھوں کر دو ڈ
ے اور بعض ممالک میں ان کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ مختلف سلسلہ ہائے تصوف کے مشائخ
ہبی یا عام اداروں کے مسائل میں فیصلے کے مجاز مانا جاتا تھا، بعض اسلامی جماعتوں
وں میں اب بھی اس اثر و رسوخ کی مثالیں ملتی ہیں۔

روحانی زندگی کی ایک مثالی شکل کی حیثیت میں تصوف مختلف مراحل سے گزرا ہے
قات وہ ٹھیٹھ اسلام کا نمونہ بنا رہا اور بعض اوقات ٹھیٹھ اسلام سے اتنا دور ہو گیا
ے محض ایک مذہبی فلسفہ قرار دیا جاسکتا تھا سکون اور خرابی کے دور بھی آئے جن میں
ے پیرو سلسلوں کے بانیوں کے بلند اور اعلیٰ مقاصد کو بالکل بھلا چکے تھے اور محض چند
رسوم کے پابند رہ گئے تھے جنہیں دل کی ہم آہنگی سے کوئی واسطہ اور تعلق نہ تھا ہمارا
مقصد اس وقت یہ ہے کہ اسلام سے متعلق تصوف کے نقطۂ نگاہ کو واضح طریق پر پیش کریں
راس سلسلے میں بھی ہم اکابر صوفیہ کے سوانح اور تحریرات سے مختلف اقتباسات
یں گے، باقی تمام امور کو نظر انداز کر دیں گے۔

اسلام کے متعلق مسلم صوفیہ کا خاص نقطۂ نگاہ اسی وقت سے بالکل واضح ہو گیا تھا،
ان کی تحریک کا آغاز ہوا تھا۔ دوسری صدی ہجری (آٹھویں صدی عیسوی) کے اختتام
ذہبی قوانین قرآن و حدیث کے ظواہر الفاظ پر مبنی تھے اور ان کی پوری پابندی کی جاتی تھی
مطالعہ بڑے اہتمام سے کیا جاتا تھا اور ٹھیک ٹھیک ان پر عمل ہوتا تھا، علم فقہ کو

حد درجہ احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا اور اس کے قواعد کی پابندی کو اصل مقصد اور متقی مسلمان کا سچا نشان سمجھا جاتا تھا صوفیہ آئے تو انہوں نے ایک اور ہی مذہبی نصب العین پیش کر دیا۔ اُن کے نزدیک قانون کے مخفی معنی کا جائزہ قانون کے ظاہری مطالعے سے زیادہ قابلِ قدر مقصد تھا۔ یوں قانون کے ظاہری الفاظ اور اُس کی اندرونی اہمیت پر پیدا ہوا یہی امتیاز فقہ اور تصوف کے مطالعے میں باقی رہا۔ فقہا کو علماے ظاہر اور صوفیہ کو روح و محصن قرار دیا گیا۔ تدریجاً دونوں فریقوں میں اختلاف بڑھتا گیا اس لیے کہ دونوں کا یہ تھا کہ وہ اسلام اور اُس کی تعلیمات کے متعلق دو مختلف تصوروں کے لیے کوشاں ہیں۔

فقہا اور صوفیوں کے اختلافات بہ ظاہر مذہبی قوانین کے معنی اور اُن کے استعمال کے طریقوں میں تھے۔ مثلاً عبادت کی حیثیت اور اُس کے طریقِ ادا میں وہ ایک دوسرے سے مختلف تھے۔ اس امر پر بھی متفق نہ تھے کہ کون سے افعال جائز اور کون سے افعال ناجائز اور شریعت کے کن حصوں کو بنیادی قرار دیا جا سکتا ہے۔ ایک اختلافی معاملہ یہ بھی تھا کہ اور نفلی مذہبی عبادات کا مقصد، مدّعا اور قدر و قیمت کیا ہے۔ کیا اللہ تعالیٰ رسمِ عبادت کا ہے یا محبّت کا۔ اسلامی عقائد و احکام کے بہت سے دوسرے معاملات میں بھی ان کے درمیان اختلاف تھا خصوصاً انسان کے تعلق میں خدا کا تصوّر اور معنیِ توحید۔

ظاہر ہے کہ اس قسم کے جھگڑے اسلام کی بنیاد پر اثر انداز ہوتے تھے۔ اس پر تعجب نہ ہونا چاہیے کہ مسلمان فقیہ صوفیہ کے سخت دشمن ہو گئے اور صدیوں تک مختلف محاذوں پر ان کے خلاف لڑتے رہے۔ مخالفت کی پہلی تحریک مشہور محدّث امام احمد بن حنبل (م ۲۴۱ھ / ۸۵۵ء) سے چلی۔ امام موصوف حارث (وفات ۲۴۳ھ / ۸۵۷ء) جیسے صوفی کی مدح سے رُک نہ سکے لیکن ساتھ ہی کہا کہ حارث اپنے مواعظ میں جو زبان استعمال کرتا ہے یعنی ... کی زبان اُس سے میں بالکل ناواقف ہوں یعنی حارث کے اخلاص میں قطعاً شبہ نہ تھا لیکن اُن کی روش کے متعلق شک و شبہ بھی تھا اور خطرہ بھی۔ امام موصوف کے ساتھیوں اور الٰہیات کے دوسرے گروہوں نے صوفیہ کے خلاف جبر و تشدّد شروع کر دیا تاکہ اُن کے بڑھتے ہوئے

کو ختم کر دیا جائے۔

آہستہ آہستہ تصوف کی ایک نئی لہر یعنی ایک نئی مذہبی روح پیدا ہوئی۔ یہ احساس ہو رہا تھا کہ فقہا نے اسلام کو جس انداز میں سمجھا اور پیش کیا ہے اُس میں وہ ایسے مراسم کا مجموعہ بن گیا ہے جو چند جسمانی حرکات پر مشتمل ہیں۔ نماز، روزہ اور حج کی تمام تفصیلات اور جسمانی حرکات متعین ہو چکی ہیں، ان کے اندر کوئی روحِ اخلاص نہیں پائی جاتی۔ اسلام کے متعلق اس قسم کا نقطۂ نگاہ ظاہر کی تسلی کے لیے کافی ہے جو مذہبی اصطلاحات کی معین تعریفوں کے سوا کسی بات سے سروکار نہیں رکھتے۔ انھوں نے عام قوانین و ضوابط تیار کر لیے اور چاہتے تھے کہ ٹھیک ٹھیک اُن کی پابندی ہوتی رہے۔ یہ طرزِ عمل صوفیہ کے مذہبی جذبات کی تسلّی کے لیے کافی نہ تھا جو ان ظاہری مراسم و اوضاع کے اندر گہرے معنی تلاش کرتے تھے۔ قشیری ہمیں بتاتا ہے کہ رویم بغدادی (وفات ۳۰۳ھ ۔ ۹۱۵ء) نے کہا:

"تمام لوگ محض ظاہری مراسم سے وابستہ ہیں۔ صرف یہ گروہ (گروہ صوفیہ) حقائق سے وابستگی اختیار کیے بیٹھا ہے۔ تمام لوگ شریعت کے ظاہری پہلو کی پابندی اپنا فرض سمجھتے ہیں صرف صوفیہ کے نزدیک یہ ضروری ہے کہ تقویٰ اور بے پناہ اخلاص پیدا ہو۔"

ان الفاظ میں اسلام کے متعلق صوفیہ اور دوسرے مسلمانوں کے مخصوص نقطہ ہائے نگاہ کا فرق پیش کر دیا۔ صوفیہ کے نزدیک اسلام ایک حقیقت ہے جو الفاظ و اشکال کے پیچھے مستور ہے عام مسلمانوں کے نزدیک اصل شے یہی الفاظ و اشکال ہیں۔

اس قسم کا امتیاز ابتدائی دور کے مسلمانوں میں بالکل ناپید تھا۔ امتیاز کا سلسلہ شیعہ سے شروع ہوا جن کی تعلیم یہ تھی کہ دوسری چیزوں کی طرح قرآن مجید کے بھی دو پہلو ہیں ایک ظاہری، دوسرا باطنی۔ باطنی پہلو ہی کو وہ قرآن کے مخفی معنی قرار دیتے ہیں جو خدا کے برگزیدہ بندوں ہی پر منکشف ہوتے ہیں۔ اُنھوں نے اس سلسلے کو اسلام کی ہر شے پر پھیلا دیا نتیجہ یہ کہ شریعت کے مذہبی اصول اور عملی، نیز حقیقت کے درمیان واضح فرق پیدا ہو گیا اسی کو ہم شریعت

اور اُس کے معنی کا فرق قرار دے سکتے ہیں۔

یہ درست ہے کہ تصوف کے بڑے بڑے مشائخ ہمیشہ شریعت کی پوری پابندی پر متفق رہے اور حقیقت کے لیے شریعت کے ترک کو محض خلافِ تقویٰ ہی نہیں خلافِ ایمان بھی قرار دیا گیا۔ وہ کہتے ہیں کہ شریعت کے بغیر حقیقت بے بنیاد ہے اور حقیقت کے بغیر شریعت بے معنی ہے صحیح مذہبی زندگی کے لیے ضروری ہے کہ دونوں کے درمیان ایک معقول توازن قائم رہے۔ امام غزالی نے اس توازن کو مندرجہ ذیل الفاظ میں پیش کیا ہے۔

"جو شخص کہتا ہے کہ حقیقت شریعت کے خلاف ہے یا مذہب کی باطنی حیثیت ظاہری حیثیت سے متفاوت ہے تو اُس کا معاملہ کفر کے قریب پہنچ جاتا ہے۔ ہر حقیقت جس کی بنیاد شریعت میں نہ ہو ٹھکرا دینی چاہیے۔ شریعت ایک قانون ہے جو تمام لوگوں پر واجب ہے حقیقت سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کا معائنہ کیا جائے۔ شریعت خدا کی عبادت ہے حقیقت خدا کی زیارت ہے۔ شریعت احکام الٰہی کی پابندی ہے حقیقت کا مدعا یہ ہے کہ دل کی آنکھوں سے دیکھا جائے خدا نے کیا کچھ فیصلے کر دیے ہیں، کیا کچھ دنیا پر ظاہر کیا ہے اور کیا کچھ ابھی تک مخفی ہے۔"

پس امام غزالی کے نزدیک حقیقت مذہب کا ثبوت اور روحانی جواز ہے، صوفی مذہبی تعلیم کے حقیقی معنی اپنے دل میں دیکھتا ہے۔ اس کی حقیقی حیثیت اُس پر منکشف ہوتی ہے مثلاً جب صوفی عبادت کے لیے کھڑا ہوتا ہے تو الوہیت و عبادت کے معنی باطنی روشنی میں اُسے از سر نو نظر آتے ہیں۔ راسخ العقیدہ صوفیہ کی اکثریت نے عموماً یہی روش اختیار کی ہے اور قشیری (وفات ۳۷۳ھ۔ ۹۸۶ء) خراز (وفات ۲۷۷ھ۔ ۸۹۰ء) جنید (وفات ۲۹۷ھ۔ ۹۰۹ء) اور غزالی (وفات ۵۰۵ھ۔ ۱۱۱۱ء) جیسے بزرگ بڑی سرگرمی سے اس تصوف کا دفاع کرتے رہے، لیکن بعض صوفیہ حقیقت پر زور دیتے دیتے بہت آگے نکل گئے۔ انھوں نے شریعت

ں اہمیت گھٹادی اور انجام کار مختلف درجوں کے غلط عقیدوں میں مبتلا ہو گئے۔ مثلاً یہ کہ جو شخص
قیقت سے آگاہ ہو جائے وہ شریعت کی اخلاقی پابندیوں سے آزاد ہو جاتا ہے۔ یہ لوگ
صوّف کی دوسری انتہائی حد کے نمائندے تھے، جسے متقی مسلمان بجا طور پر ہدفِ ملامت
اتے رہے۔ صوفیہ میں ایسے لوگ بھی ہوئے ہیں جو شریعت کے بڑے پابند تھے، لیکن
ں کا مفہوم سمجھنے میں راسخ العقیدہ لوگوں کے طریقِ تعبیر سے بہت زیادہ آزاد اور وسیع المشرب
ھے۔ وہ قانونِ شریعت کو یا تو محض ضبط و نظم کا ایک نظام قرار دیتے تھے یا چند مراسم کا مجموعہ
مجھتے تھے جو خفیہ مذہبی معنویت کے لیے پیش کیے گئے۔

جو صوفی شریعت کو اصلاً نظم و ضبط کا ایک نظام قرار دیتے تھے، انھوں نے یہ دعویٰ
ں رَدّ کر دیا کہ شریعت معیاروں اور ضابطوں کا ایک مجموعہ ہے، جس سے مزید ضابطے اور
ہار شاخ بہ شاخ پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ ان صوفیہ کے نزدیک شریعت کو ان محدود حدود
مخصوص تعریفوں کے اندر رہ کر نہ سمجھنا چاہیے جو علماء، فقیہ الٰہیات نے تجویز کر دی ہیں۔ کسی
ی کام کی قدر و قیمت کا اندازہ محض قانونی مطابقت کی بنا پر نہیں کیا جا سکتا۔ قدر و قیمت کے
زے کے لیے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ شریعت عطا کرنے والے نے جو نصب العین پیشِ نظر
ا تھا، وہ کس حد تک پورا ہوا۔ عبادت کے اختیاری اوضاع کو واجب اعمال سے اس لیے
تر سمجھا جاتا ہے کہ وہ خدا کی محبت کا ایک اونچا نصب العین پورا کرتے ہیں۔ واجب عبادات
ے محض یہ ظاہر ہوتا ہے کہ خدا کے حکموں کی اطاعت کر لی گئی۔ صوفی اپنے نقطۂ نگاہ کی
ید میں وہ حدیث پیش کرتے ہیں جس میں اللہ تعالیٰ کہتا ہے:

"میرا بندہ کسی طرح مجھ سے زیادہ قریب نہیں ہوتا مگر ان فرائض کی بجا آوری سے
جو میں نے اس کے ذمے لگا دیے ہیں اور میرا بندہ نوافل کے ذریعے سے
میرے قریب تر آتا جاتا ہے حتّٰی کہ میں اُس سے پیار کرنے لگتا ہوں اور جب
پیار کرنے لگتا ہوں تو اُس کی آنکھ بن جاتا ہوں اور وہ مجھ سے دیکھتا ہے

اور کان بن جاتا ہوں، وہ مجھ سے سنتا ہے، اور زبان بن جاتا ہوں، وہ مجھ سے بولتا ہے اور ہاتھ بن جاتا ہوں، وہ مجھ سے کام کرتا ہے"۔

مطلب یہ ہے کہ دورانِ عبادت میں بندہ خدا میں جذب ہو جاتا ہے اور اپنے وجود کا ہر رشتہ ختم کر دیتا ہے۔ اس طرح وہ اپنے محبوب کا جزو ہونا محسوس کرنے لگتا ہے حالت مذہبی فرائض عام انداز میں ادا کرتے رہنے سے میسر نہیں آتی۔ صوفی روحانی فوائد حصول پر نظر رکھتا ہے، یہ فوائد اُسے اخلاص کی بنا پر حاصل ہوتے ہیں، محض ظاہری ا کی بجا آوری سے حاصل نہیں ہوتے گویا مذہب کی روح اور مذہب کا جوہر وہ شے جو قلب میں پیدا ہوتی ہے، وہ نہیں جو جسم سے ادا کی جاتی ہے۔ مذہبی حکم کا مرجع قلب ہو نہ کہ جسمانی عذاب۔

یہ نقطۂ نگاہ یقیناً بڑا بلند اور قابلِ قدر تھا معلوم ہوتا ہے، اسی نے صوفیہ کے بعض حلقوں میں شریعت سے آزادی کا راستہ ہموار کر دیا۔ اُن کا استدلال یہ ہے کہ مذہبی فرا ایک مقصد کا ذریعہ ہیں خود مقصد نہیں اور جب مقصد حاصل ہو گیا تو پھر ذریعوں کو چھوڑ دینا چاہیے۔ اُن کے نزدیک حقیقت یعنی مذہبی سچائی مقصد ہے اور شریعت یعنی مذہبی قا ذریعہ ہے۔ جب تصوّف کا سنہری دور جاری تھا معلوم ہوتا ہے کہ اُس وقت بھی ایسے آ موجود تھے جو اپنے لیے ہر قسم کی آزادی اور بے قیدی اس محل عذر کی بنا پر جائز سمجھتے تھے کہ اپنے مقصد پر پہنچ چکے ہیں یہی وجہ ہے کہ قشیری (وفات ۴۶۵ھ۔ ۱۰۷۲ء) نے تصوّف پر جو رسالہ لکھا اُس کے ابتدائی ابواب میں ایسے لوگوں پر نہایت سخت نکتہ چینی کی، قشیر اپنے عہد کے اُن آدمیوں پر شدید حملہ کرتا ہے جن کا عقیدہ یہ تھا کہ حقیقت انسان کو اخلا واجبات سے آزاد کر دیتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تصوف کے اکابر کی تعلیمات پیشِ نظر رکھتے ہو اس پر نظرِ ثانی ہونی چاہیے۔ صوفیہ کا فرض ہے کہ قرآنِ مجید کے احکام اور بانیانِ تصوف کی سامنے رکھتے ہوئے صحیح مذہبی زندگی بسر کریں۔

قشیری کا انتباہ بیکار نہ گیا۔ پچاس سال بعد امام غزالی نے اپنی تصانیف کے ذریعے
ے وہی مقاصد بہتر طریق پر پورے کیے امام موصوف نے اپنے ذمے یہ کام لے لیا تھا
سلام اور تصوف میں تطابق پیدا کریں۔ انھوں نے تصوف کے اصول کی تعبیر اسلام کی روشنی
کی اور دکھادیا کہ اُن میں کتنا گہرا تعلق ہے۔ بلا شبہ امام غزالی کا اولین مقصد یہ تھا کہ اپنے روحانی
لے کا حل تلاش کریں اور وہ خود سچائی کی تلاش میں گھوم پھر رہے تھے لیکن اپنے عقدے کا
تلاش کرنے کے سلسلے میں انھوں نے لاکھوں دوسرے افراد کی عقدہ کشائی بھی کردی
ان کی طرح اُسی سچائی کی تلاش میں تھے۔ اُنھیں اپنے عقدہ کا حل یہ ملا کہ اسلامی شریعت
ے مطابق تصوّف کی زندگی بسر کی جائے مذہبی سچائی، قانونِ شریعت کے داخلی معنی کا دوسرا
ہے جو آسمانی روشنی کے ذریعے سے صوفی کے قلب پر منکشف ہوتے ہیں۔

جو صوفی شریعت کو نظم و ضبط کا ذریعہ سمجھتے تھے اُن کے علاوہ ایسے لوگ بھی تھے جن
ے نزدیک شریعت محض چند مذہبی معانی کے نشانات کا مجموعہ ہے۔ اُن کے نزدیک یہ
نات صرف اس حد تک قدر و قیمت رکھتے تھے کہ مخفی معنی کی یاد تازہ کر دیتے تھے یا ان
ے ذریعے سے مخفی معنی تک پہنچنے کا موقعہ مل جاتا پرہیزگار مسلمان کو چاہیے کہ شریعت نے
دت کے جو طریقے مقرر کر دیے ہیں اُن پر عمل کرے لیکن اُس کا دل روحانی معنی پر جما رہنا
ہیے۔ اگر ایسا نہ ہوگا تو اُس کی عبادت محض خالی میکانیکی حرکت رہ جائے گی۔ اس نقطۂ نگاہ
عبادت کے خارجی یعنی جسمانی اعمال کے ساتھ دل کے داخلی اعمال بھی پیشِ نظر رکھ لیے
ے ہیں، اس تعبیر میں خطرہ یہ ہے کہ خارجی اعمال کو بے کار سمجھ کر کہیں بالکل نظر انداز نہ
کر دیا جائے جن صوفیہ نے عبادت کے داخلی اور خارجی دونوں اعمال کی پابندی کی اُنھیں
سلام کی خارجی تعلیم میں وہ معنویت مل گئی جو فقہا کے خواب و خیال میں بھی نہ آئی تھی۔ مثال
لے طور پر نماز کو محض مقررہ الفاظ کا مجموعہ نہیں سمجھا جاتا جو ایک خاص طریق پر ادا کیے
تے ہیں اور ساتھ ساتھ کچھ حرکتیں کی جائیں، بلکہ اسے خالق اور انسان کے درمیان اصلاً

روحانی مذاکرہ سمجھا جاتا ہے۔ تمام ظاہری حرکات اور الفاظ نشان ہیں جن کے معنی داخلی مذاکرے کا حصہ بن جاتے ہیں اسی طرح حج کا مطلب یہ نہیں کہ خانہ کعبہ کے لیے مکہ معظمہ تک سفر کیا جائے یہ انسانی نفس کا خدا کی طرف روحانی سفر ہے۔ اس سفر کا ہر قدم اور حج کی رسم مثلاً خانہ کعبہ کا طواف، حجر اسود کا بوسہ، عرفات میں وقوف، اہم روحانیت کے نشان ہیں۔ حج کی ہر جسمانی حرکت کے ساتھ دل کی بھی حرکت ہوتی ہے۔

خدا کا ذکر اسلامی عبادت کی ایک اور مثال ہے جسے نشان کے طور پیش کیا جاتا ہے۔ مقصود یہ نہیں کہ اللہ کا نام بار بار دہرایا جائے۔ مقصود یہ ہے کہ خاموشی سے خدا کو یاد کیا جائے اور اُسے مَن میں بسایا جائے۔ یہ سب کچھ ایسے انداز میں ہو کہ عبادت کرنے والے کے دل میں خدا کے سوا کسی کے لیے جگہ باقی نہ رہے اور محب کاملاً اپنے محبوب میں جذب ہو جائے۔

صوفی عبادت کے باقی مراسم کی تعبیر بھی اسی طرح کرتے ہیں جو شخص مذہبی امور کو اُن کے حقیقی معنی سمجھے بغیر انجام دیتا ہے۔ صوفیہ کے نزدیک اُس کی حیثیت ایک بچے کی ہے جو کتاب کے الفاظ پڑھتا ہے مگر اُس کا مطلب نہیں سمجھتا۔ اُس کی مذہبی زندگی بے کیف رہتی ہے اس لیے کہ دل کیف سے خالی ہوتا ہے۔ ذکر و دعا میں اُس شخص کا دل صرف خدا کے نام سے گھرا رہتا ہے خود خدا سے نہیں گھرتا۔

صوفیہ کا تصوّرِ باری تعالیٰ

ہم بتا چکے ہیں کہ اسلام کی مذہبی تعلیمات کے متعلق صوفیہ کے نقطۂ نگاہ کو فقہا کے خلاف بغاوت سے تعبیر کیا جا سکتا ہے جو مذہب کی سچی روح کو دبانے اور محض اس کی وضع وہیئت ظاہری کو محفوظ رکھنا چاہتے تھے۔ اسی طرح انھوں نے خدا کے متعلق جو نقطۂ نگاہ اختیار کیا وہ علمائے الٰہیات اور فلسفیوں کے خلاف بغاوت کی حیثیت رکھتا تھا۔ عقلیت پسند مسلمانوں کی نتیجہ قیاس آرائیوں نے اُلوہیت کو آہستہ آہستہ ہر صفت سے معرّا کر دیا اور خدا ایک منطقی قیاس رہ گیا۔ راسخ العقیدہ علمائے الٰہیات نے خدا کو ایک مطلق العنان فرمانروا کی شکل دے

جس کا اختیار و اقتدار مطلقہ جو کچھ چاہتا کر سکتا تھا خواہ وہ غیر ممکن اور غیر معقول ہی ہوتا۔
ن فلسفی اسلامی عقائد اور یونانی فلسفے کے درمیان تطابق کرنے میں مجبور ہوے کہ خدا کے
سے صفات ترک کر دیں یا انھیں تشریح و توضیح کے سلسلے میں درجۂ صفر پر پہنچا دیں اور انھوں
خالقِ کائنات کی جگہ ایک علت فاعلی کھڑی کر دی۔ بیشتر صوفیہ کے نزدیک خدا کا ایک
ل وجود ہے جس کی صفات ہیں انھیں صفات کی بنا پر خدا کے تعلقات دنیا کے ساتھ
اور انسان کے ساتھ خصوصاً متعین ہوتے ہیں۔ انھوں نے خدا کے متعلق جو خاکہ تیار
ہے، وہ قرآنِ مجید سے ماخوذ ہے، لیکن اس تصور کے بڑے بڑے خط و خال کی تفصیلات
ل نے خود تیار کیں۔

وہ کہتے ہیں کہ خدا کائنات یا عالم کا خالق ہے، وہی اس کا مالک ہے۔ وہی ہر شے کا فاعل
وہی زمین و آسمان کا نور ہے۔ وہ رحمٰن ہے، رحیم ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ
ل کے قلوب میں رہتا ہے۔ ایک روایت صوفی اکثر بیان کرتے رہتے ہیں۔ اس میں
تا ہے: نہ میں آسمانوں میں سما سکا اور نہ زمین میں۔ مگر اپنے مومن بندے کے دل میں سما
رض صوفی خدا کو اپنے سے دور نہیں دیکھتا، بلکہ خدا کا تخت خود اس کے دل میں چھایا ہوا
البتہ اُسے دیکھنا شرط ہے۔ مسلمان صوفیہ کی غرض و غایت یہ ہے کہ ایسی حالت اپنے
اری کر لیں جس میں خدا دل کے اندر محسوس ہونے لگے اور ایسی صورت میں کہ وہاں اور
شے کے لیے گنجائش باقی نہ رہے۔ وہ اپنی مستقل ہستی کو خدا کے تصور و مراقبہ میں گم
نا چاہتے ہیں۔

اگر ہم تصوف کی طویل اور پُرپیچ تاریخ پر ایک نظر بازگشت ڈالیں تو ہمیں خدا کے
تین تصور ملیں گے ——— اخلاقی، جمالیاتی اور وجودی ——— یہ تصور نشو و ارتقا
تلف مراحل میں پیش آتے رہے۔ ان سب کی جڑیں قرآنِ مجید اور احادیث میں بلا واسطہ
سط موجود نہیں یا یہ کہہ لیجیے کہ تعبیرات کے ذریعے سے ان کا رشتہ مختلف آیات و روایات

سے جوڑ لیا گیا تھا۔

اسلامی تصوف کے ابتدائی دور میں اخلاقی تصور کو بہ طور خاص درجہ حاصل تھا۔ سب سے زیادہ زور خدا کے ارادے اور ہمہ گیر قوت پر دیا جاتا تھا۔ وہی تمام اشیا کا خالق و مالک تھا ان میں انسانوں کے اعمال بھی شامل تھے۔ دنیوی زندگی کو اصلاً برا سمجھا جاتا تھا۔ اور کہا جاتا تھا کہ اسے چھوڑ دینا چاہیے تاکہ عالم عقبیٰ کی دائمی راحتیں حاصل ہوں۔ ابتدائی دور کے صوفیہ کا احساس جرم بہت مبالغہ آمیز تھا بالکل یہی کیفیت اس دردناک عذاب کی تھی جو دوزخ میں گناہ گاروں اور معصیت کاروں کے لیے مہیا تھا۔ اس وجہ سے ان کے قلوب پر خدا کا غضب اور خوف مسلط تھا اور وہ اپنی مخلصانہ عبادتوں اور ریاضتوں کو حساب کے دن عذاب سے بچاؤ کا ایک ذریعہ سمجھتے تھے۔ وہ خدا کے ان الفاظ کو بالکل بھول گئے تھے :

۱۔ رَحْمَتِیْ وَسِعَتْ کُلَّ شَیْءٍ — میری رحمت کا یہ حال ہے کہ ہر شے پر چھائی ہوئی ہے۔ (اعراف: ۱۵۶)

۲۔ اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِہٖ وَ یَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِکَ لِمَنْ یَّشَآءُ — اللہ یہ بات کبھی بخشنے والا نہیں کہ اس کے ساتھ کسی دوسری ہستی کو شریک ٹھہرایا جائے۔ اس کے سوا اور جتنے گناہ ہیں وہ چاہے تو بخش دے۔ (نساء : ۴۸)

ابتدائی دور کے درویشوں کی اخلاقی اور مذہبی زندگی پر اس خوف کا رنگ چڑھا ہوا تھا اور اسی کی بنا پر خدا، کائنات اور انسانوں کے متعلق ان کا نقطۂ نگاہ متعین ہوا تھا۔

صوفیہ کے علم ماوراے طبعی میں خدا کا جمالیاتی تصور اس خیال پر مبنی تھا کہ خدا اور انسان ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ اس عقیدے کی اصل و اساس بھی قرآن مجید میں ملتی ہے مگر اس میں زیادہ پھیلاؤ بیرونی اثرات کے باعث پیدا ہوا جو مثلاً مانویت اور نوفلاطونیت سے لیے گئے تھے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلی آواز مشہور ولیہ رابعہ بصریہ (وفات ۱۸۵ھ/ ۸۰۱ء) نے بلند کی۔ تیسری صدی ہجری سے باری تعالیٰ کے ساتھ محبت کا اصول تصوف

خاص پہلو بن گیا۔ خدا صوفیوں کا محبوب تھا اور اُس کے ساتھ اسی کی خاطر محبت کرتے ۔۔ اب دوزخ کا خوف یا بہشت کی اُمید صوفیوں کے دل میں نہ تھی بلکہ اللہ تعالیٰ کے ازلی و ابدی کی جھلک اُن کی تمام عبادتوں اور ریاضتوں کی محرک تھی۔ رالعبہ بصریہ کی ایک دُعا یوں منقول

"الٰہی اگر میں دوزخ کے خوف سے تیری عبادت کرتی ہوں تو مجھے دوزخ کی آگ میں جلا اگر بہشت کی امید مجھے تیری عبادت پر آمادہ کرتی ہے تو بہشت سے مجھے محروم کر دے۔ اگر میں صرف تیری خاطر عبادت کرتی ہوں تو مجھے جمال کی جھلک سے محروم نہ رکھ۔"

مندرجہ ذیل اشعار بھی رالعبہ ہی سے منسوب ہیں، جن کا ترجمہ آر۔ اے۔ نکلسن[1] نے اسلام[1] میں کیا ہے:

"میں دو طریقوں پر تجھ سے محبت کرتی ہوں، ایک خود غرضی کی بنا پر، دوسری ایسے طریقے پر جو تیرے تعلق میں زیبا ہے۔ خود غرضانہ محبت یہ ہے کہ میں تیرے متعلق سوچتی رہتی ہوں اور اس کے سوا کچھ نہیں کرتی۔ ہر غرض سے پاک محبت وہ ہے جب تو میری آرزو مند نگاہوں کے لیے اپنے چہرے سے پردہ الٹ دیتا ہے، میں کسی بھی مدح کی مستحق نہیں ہوں، سب مدح و ستائش صرف تیرے لائق ہے۔"

جوں جوں وقت گزرتا گیا، خدا کے ساتھ محبت مسلم صوفیوں کے فکر و حیات میں زیادہ سے گہری ہوتی گئی۔ عملی پہلو پر نظر ڈالی جائے تو یہ محبت اُن کے اعمال کا واحد محرک رہ گئی۔ اخلاقی افکار اس کے گرد گھومنے لگے، جس طرح ابتدائی دور میں وہ خوف خدا کے گرد گھومتے تھے، بے غرضی و بے نفسی سب سے بڑی نیکی بن گئی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ دنیا و

---

[1] Legacy Of Islam از R. A. Nicholson

راحتوں کو ٹھکرا دیا جائے اور خدا کی خاطر ہر غرض سے منہ پھیر لیا جائے امام غزالی فرماتے
ایثار روحِ محبت ہے۔ صوفیہ کے تمام مقامات کی یہ آخری منزل ہے اس کے بعد جو
حالت پیش آتی ہے وہ اس کا ثمرہ ہوتی ہے اور جو بھی مقام اس سے پہلے گزر چکا وہ ا
طرف ایک قدم۔ مولانا جلال الدین رومی بھی ایک بہت بڑے صوفی تھے۔ وہ فرما
ہیں:

شاد باش اے عشقِ خوش سودائے ما
اے طبیب جملہ علت ہائے ما
اے علاج نخوت و ناموس ما
اے تو افلاطون و جالینوس ما

(اے ہمارے خوش سودا عشق تو شادماں رہیو، تو ہی ہماری تمام بیماریوں کا طبیب
ہے۔ تیرے ہی ذریعے سے ہمارے غرور و خود فریبی کا علاج ہوا تو ہی ہمارا افلا
ہے، تو ہی ہمارا جالینوس ہے۔)

صوفیوں نے اپنی زندگیاں اس لیے عبادت کی نذر کر دیں کہ اُنھیں خدا سے محبت
اور وہ اُس کی محبت حاصل کرنے کے آرزومند تھے۔ بنظر یاتی نقطۂ نگاہ سے تخلیقِ عا
کی واحد علت خدا کی محبت کے سوا کچھ نہ تھی۔ وہ کہتے تھے تخلیق خدا کی محبت کا اظہار
اور اُس نے اپنے دائمی جمال کو بیرونی شکل میں منعکس کر دیا ہے۔ صوفی لوگ عموماً وہ ر
بیان کرتے ہیں جس میں خدا کہتا ہے کہ میں ایک مخفی خزانہ تھا اور مجھے پسند آیا کہ سب م
دیکھیں اور پہچانیں، للذا میں نے دنیا پیدا کر دی تاکہ وہ مجھے جانے اور پہچانے
یہ بھی کہتے ہیں کہ محبت تمام الٰہی اسرار کی کلید ہے ....
اور یہی تمام سچے مذاہب کی روح ہے۔ محبت اپنے ساتھ معقول عقیدے نہیں لا
لیکن ایسے عقیدے ضرور لاتی ہے جو وجدان کے ناقابلِ تردید ثبوت پر مبنی ہوں۔ یہ آم

…ٹنی ہے جو خدا کی طرف سفر میں مسافر کی رہنمائی کرتی ہے۔

مسئلہ وحدتِ وجود اسلامی تصوف میں محی الدین ابن عربی (۶۳۸ھ - ۱۲۴۰ء) سے …ے نمودار نہیں ہوا، کم از کم منظم شکل میں اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا اور ابنِ عربی، عربی بولنے والے، …ان صوفیہ میں سب سے بڑا تھا۔ وجودی رجحانات تیسری صدی کے اوائل ہی میں سامنے …گئے تھے، مثلاً بایزید بسطامی (وفات ۲۶۱ھ - ۸۷۵ء) کے بعض اقوال میں، لیکن اُن کی …کوئی مسلسل وجودی نظام قائم نہ ہوا۔ اس کے برعکس ابنِ عربی پہلا شخص تھا جس نے مکمل …دی فلسفہ پیش کیا اور اُس وقت سے اس فلسفے نے پورے تصوّف پر ایسے نشان چھوڑے …و نہ ہو سکے۔ اس فلسفے کا بنیادی اصول یہ ہے کہ وجود ایک ہے۔ اس اصول کے متعلق جو …ابنِ عربی کے ذہن میں تھا، وہ مندرجہ ذیل الفاظ سے بخوبی واضح ہے "حمد اُس خدا کے …جس نے تمام چیزیں پیدا کیں اور خود اُن سب کی روحِ حیات بن گیا۔ ابن عربی "فصوص الحکم" …ہتا ہے:

> الٰہی، تو نے اپنے اندر یہ ساری چیزیں پیدا کیں۔ تو جیسے پیدا کرتا ہے، اُسے اپنے ساتھ ملا لیتا ہے۔ تو جو کچھ پیدا کرتا ہے، وہ موجود ہے اور تیرے اندر موجود رہتا ہے۔

اسلامی وجودیت میں مظاہرِ عالم کو صرف حقیقت کا ظل، یعنی سایہ قرار دیا گیا ہے اور خدا کو حقیقی …مانا گیا ہے۔ وہی اُن تمام چیزوں کی بنیاد ہے جو تھیں، ہیں، اور ہوں گی۔ خدا اور کائنات میں …، نہیں، لیکن عقل کو بظاہر دوئی نظر آتی ہے اور عقلِ کُل کی بنیادی وحدت کا تصوّر کرنے …، ناقابل ہے۔ اسے ہم ایک وجود کی حالتوں کی دوئی قرار دے سکتے ہیں، دو مستقل وجود قرار نہیں …ے سکتے۔ ایک کل کے دو پہلوؤں پر نظر ڈالی جائے تو حقیقت خدا اور کائنات، وحدت …ثرت عارضی اور دائمی، داخلی اور خارجی، دونوں پہلو معلوم ہوتے ہیں، اگر ہم دوئی کے رنگ …سوچیں تو مخالف صفات کے تمام جوڑوں کو حقیقت قرار دیں گے، لیکن صوفیانہ وجدان

کا فیصلہ یہ ہے کہ صرف خدا حقیقی وجود ہے۔ وہ تمام بیانات وصفات سے بالا ہے اور
محض نظر کا دھوکا ہے۔

اس فلسفے میں خدا کے لیے جگہ موجود ہے، اگرچہ بعض اعتبارات کو پیش نظر رکھتے ہو
خدا کے اسلامی تصور سے بہت ہٹا ہوا ہے۔ ابنِ عربی اپنے ماورائے طبعی نظریے اور
میں فرق کرتا ہے۔ ایک خدا ہے، جو ایسی حقیقت ہے کہ نہ اُسے کوئی جان سکتا ہے اور ن
کے ساتھ ربط و تعلق پیدا کر سکتا ہے۔ ایک خدا ہے جو ایمان، عبادت اور محبت کا مرکز
ابنِ عربی کا تصوّر اُس خدا کے متعلق جو ایمان کا مرکز ہے، عام موحدین کے تصوّر سے بہت
آجاتا ہے، لیکن وحدۃ الوجود اور ٹھیٹ اسلامی توحید کے درمیان ایسی وسیع خلیج حائل
جسے ابنِ عربی پاٹ نہ سکا۔ وہ خدا کو عبادت کا مرکز سمجھتا ہے، مگر اُس طرح نہیں جس طرح م
یا عیسائیوں یا دوسرے مذاہب کے پیروؤں کا عقیدہ خدا کے متعلق ہے صرف اس لحاظ
کہ خدا ہر شئے کا جوہر ہے جس کی عبادت کی جاتی ہے۔ اُسے کسی خاص عقیدے کی شکل میں
نہیں کیا جا سکتا۔ جس شئے کی پرستش کی جاتی ہے وہ لاتعداد شکلوں میں سے ایک شکل ہے جس
خدا نے اپنا جمال دکھایا۔ خدا کو کسی ایک شکل سے وابستہ کرنا اور دوسری شکلوں سے الگ کر لینا
ہے۔ مذہب کی صحیح روح کا تقاضا یہی ہے کہ تمام شکلوں میں اُس کی عبادت کی جائے۔

یہی عالمگیر مذہب ہے جسے وجودی ابنِ عربی پہنچانا چاہتا ہے یہ ایک ایسا مذہب
جو تمام مذاہب پر مشتمل ہے اور تمام عقیدوں کو ملا دیتا ہے۔ ابنِ عربی ترجمان الشواق میں
عقیدہ یوں بیان کرتا ہے:

میرا قلب تمام اشکال و صُوَر کا ذخیرہ بن گیا ہے۔ یہ غزالوں کے لیے چراگاہ ہے
مسیحی راہبوں کے لیے خانقاہ، بتوں کے لیے مندر، حاجیوں کے لیے کعبہ ہے
تورات کی الواح اور قرآنِ مجید دونوں اس میں موجود ہیں۔ میں محبّت کے مذہب کا
پیرو ہوں محبت کی ناقہ جدھر لے جائے چلا جاتا ہوں۔ یہی میرا مذہب ہے اور یہی

میرا ایمان۔

مذہبِ محبت ابنِ عربی کے قول کے مطابق ہمہ گیر عالمی مذہب ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تمام عبادت
ا کی عبادت کرتے ہیں، اگرچہ بہ ظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے مخصوص خداؤں کی عبادت
تے ہیں۔ محبت عبادت کا جوہر ہے اس لیے کہ عبادت محبت ہی کی ایک انتہائی شکل ہے
ونکہ عبادت کا مرکز خدا کے خارجی مظاہر ہیں، نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ خدا انتہائی محبوب بھی ہے اور
کی عبادت بھی سب سے بڑھ کر کی جاتی ہے۔

س سلسلے میں علامہ اقبالؒ مرحوم کے ایک مکتوبِ گرامی سے مختصر سا اقتباس غالباً بہت مناسب سمجھا جائے
۔ ۳۰ دسمبر ۱۹۱۵ء کو خواجہ حسن نظامی مرحوم کے نام بھیجا گیا تھا۔ اس میں حضرت علامہ کی کتاب "اسرارِ خودی" زیرِ
تھی۔ حضرت علامہ فرماتے ہیں کہ میں شیخ ابنِ عربی کی عظمت اور فضیلت کا قائل ہوں اور انہیں اسلام کے
بڑے حکماء میں سے سمجھتا ہوں۔ اُن کے عقائد صحیح ہوں یا غلط وہ قرآن کی تاویل پر مبنی ہیں۔ میں ان کو ایک مخلص
ن سمجھتا ہوں لیکن ان کے عقائد کا پیرو نہیں:

> اصل بات یہ ہے کہ صوفیہ کو توحید اور وحدت الوجود کا مفہوم سمجھنے میں سخت غلطی ہوئی ہے، یہ
> دونوں اصطلاحیں مترادف نہیں۔ مقدم الذکر (توحید) کا مفہوم مذہبی ہے اور مؤخر الذکر (وحدۃ الوجود)
> کا مفہوم خالص فلسفیانہ ہے۔ توحید کی ضد کثرت نہیں جیسا کہ بعض صوفیہ سمجھتے ہیں، بلکہ شرک ہے
> ہاں وحدۃ الوجود کی ضد کثرت ہے۔ اس غلطی کا نتیجہ یہ ہوا کہ جن لوگوں نے وحدۃ الوجود یا زمانۂ حال
> کے فلسفۂ یورپ کی اصطلاح میں توحید کو ثابت کیا وہ موحد تصور کیے گئے، حالانکہ اُن کے ثابت
> کردہ مسئلے کا تعلق مذہب سے بالکل نہ تھا، بلکہ نظامِ عالم کی حقیقت سے تھا۔ اسلام کی تعلیم
> نہایت صاف، واضح اور روشن ہے یعنی یہ کہ عبادت کے لائق صرف ایک ذات ہے۔ باقی جو
> کچھ کثرتِ عالم میں نظر آتی ہے، وہ سب کچھ مخلوق ہے، گو علمی اور فلسفیانہ اعتبار سے اُس
> کی حقیقت ایک ہی کیوں نہ ہو۔ چونکہ صوفیہ نے فلسفے اور مذہب سے دو مختلف مسئلوں (توحید
> اور وحدت الوجود) کو ایک ہی سمجھ لیا اس لیے اُن کو یہ فکر لاحق ہوئی کہ توحید کو ثابت کرنے

اس مختصر سی بحث سے وہ چند طریقے ضرور واضح ہو گئے جن سے کام لے
علماے الہیات، مسلمان فلسفیوں اور صوفیوں نے اسلام کی طویل تاریخ کے دور
کی روحِ حیات کو تقویت پہنچائی۔ ان لوگوں کی محنت سے اسلامی فکر کے نشو وارتقا
پہنچا اور اسلامی اعمال پر بھی اثر پڑا۔ اگرچہ ان چیزوں کو مسلمان رہنما عموماً اسلام کے
رہے لیکن ان لوگوں کی کوشش یہ تھی کہ اسلامی عقائد کے لیے ایک معقول بنیاد مہیا
عبادت گزاری کی متصوفانہ بنیاد صدیوں تک ملّتِ اسلامیہ میں حرکت کا باعث بنی رہی
افکار کی دولت میں اُس نے اضافہ کیا۔

بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۸۱ :- کا کوئی اور طریقہ ہونا چاہیے جو عقل اور ادراک کے قوانین سے تعلق نہ رکھے
. . . . قرآنی تعلیمات کی روشنی میں یا اُس کے روسے وجود فی الخارج
کو ذاتِ باری تعالیٰ کے ساتھ اتحاد یا عینیت کی نسبت نہیں، بلکہ مخلوقیت کی نسبت ہے . . . .
کے روسے خالق اور مخلوق یا عابد اور معبود میں مغائرت کلی ثابت ہوتی ہے۔

اں باب

شیعہ

(محمود شہابی)

س مقالے کو کتاب کے موضوع اور مقررہ حدود سے کوئی مناسبت نہیں. عام مقالوں میں یا تو
ت کے مختلف پہلو آشکارا کیے گئے ہیں یا یہ بتایا گیا ہے کہ مختلف خطّوں میں اسلام کیونکر
ہل اسلامی ثقافت و حضارت نے کن اصولوں پر نشوونما پائی۔ اس کے برعکس زیرِ غور مقالے
ایک اسلامی فرقے کے عقائد و خصوصیات زیرِ بحث آئے ہیں اور اس کے مقابلے
رے کسی فرقے کے متعلق معلومات کا ایسا کوئی ذخیرہ مہیّا نہیں ہوا۔ مترجم کا خیال ہے
لرکسی غلط فہمی کی بنا پر لکھا یا لکھوایا گیا۔ مقالے لکھانے والے کو صحیح اندازہ نہ تھا کہ کیا کیا
بنی چاہئیں اور مقالہ لکھنے والے نے بھی نہ حدود معلوم کرنے کی کوشش کی اور نہ مخصوص
کے عقائد یا خصوصیّات بیان کرنے میں وہ احتیاط پیشِ نظر رکھی جو آج کل بطورِ خاص پیشِ نظر
ے اور فضیلتِ علم کی شان کا تقاضا بھی یہی تھا کہ پیشِ نظر رہتی۔

چونکہ مقالے مرتب کرانے والے کو اصرار تھا کہ یہ مقالہ حذف نہ کیا جائے، لہٰذا مترجم کے

لیے کوئی چارہ کار نہ رہا حالانکہ اسے دوسرے مقالات کے ساتھ شامل کرنا موزوں نہ تھا
نے مقالہ نگار کے بیشتر مطالب اصل صورت میں قائم رکھے اور جابجا "دوسرا رخ" اجمالاً
پیش کر دینے پر اکتفا کی، البتہ بعض بیانات و تراکیب عام احتیاط کے بھی خلاف تھے او
فرقوں کے لیے صریحاً دل آزار بھی تھے اس لیے ان بیانات کا صرف مفہوم لے لیا گیا۔

لفظ شیعہ کے معنی ہیں پیرو، اب یہ لفظ اُن مسلمانوں کے لیے مستعمل ہے جو حضرت
پیرو ہیں اور شیعوں کے عقیدے کے مطابق حضرت علیؓ کا درجہ رسول اللہ صلعم کے بعد
اونچا تھا۔ شیعہ قرآن کو خدا کی الہامی کتاب اور محمد صلعم کو خدا کا آخری رسول مانتے ہیں۔ ساتھ
عقیدہ یہ ہے کہ اپنی جانشینی کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کو
ہر انسان میں مذہب سے دلچسپی خدا پیدا کرتا ہے جس کے الہام کی غرض یہ ہوتی ہے کہ انسان کو معلوم ہو جائے جس درجہ
کا اسے علم لاحق ہے اسے حاصل کرنے کے لیے کیا کچھ کرنا چاہیے تاکہ وہ عالم آخرت کی طرف جائے تو خوش اور مطمئن جائے گویا مذہب قواعد و ضوابط
کا ایک مجموعہ ہوتا ہے، جو خدا انسانی زندگی کی رہنمائی کے لیے مقرر کر دیتا ہے، تاکہ وہ دونوں
میں خوش رہے۔ مذہبی آدمی وہ ہے جو خدائی قاعدوں کے روبرو سر جھکاتا اور ان کے
عمل پیرا ہوتا ہے:

اس دنیا میں ایسے بلند پایہ انسان بھی گزرے ہیں، جن کے باطن پاک تھے، دل خدا
محبت سے سرشار تھے، روح و قلب میں ایسی توانائی تھی کہ انھوں نے حق کبھی نہ چھوڑا اور
سے انھیں گہرا تعلق تھا جس کی بنا پر ذاتِ باری تعالےٰ سے اُن کا رشتہ برابر استوار رہا۔ اور
پر ہمیشہ خدا کی بہ کتیں نازل ہوئیں اور وہ ان انتہائی بلندیوں تک پہنچیں جو انسان کی دسترس
فرشتے اُن کے یاور تھے۔ نورِ الہام ان کی رہنمائی کر رہا تھا۔ ان کا رشتہ سرچشمۂ تخلیق سے
گیا تھا۔ خدا نے انھیں رحمت کا مورد بنایا اور انسانوں کی ہدایت کا کام سونپا۔ یہ برگزیدہ

[illegible]دا کے نبی اور رسول تھے خدائی الہام کی برکت سے وہ حق و باطل میں تمیز کرتے رہے اور انسانوں [illegible]
راہِ حق پر چلاتے رہے، جو اُنھیں شادمانی اور کمال پہ پہنچانے والی تھی۔

مومن انجام کار اسی نتیجے پر پہنچتا ہے کہ ہدایت و رہنمائی کے لیے خدائے قدیر و علیم کے [illegible]مبروں کی اشد ضرورت ہے۔ جب لوگوں کو نبوّت کے متعلق شہادت مل جاتی ہے تو وہ خلوص سے اُس دین کو قبول کر لیتے ہیں جو انبیا پر نازل ہوا اور اُس پر کاربند ہو جاتے ہیں تاکہ شادمانی [illegible]ر کمال حاصل کر لیں۔ معجزے نبوت کی شہادت ہیں۔ تمام سچے پیغمبروں سے معجزے رونما [illegible]وے اور تمام لوگ معجزوں سے قائل ہو گئے۔ معجزہ اُس خارقِ عادت فعل کا صدور ہے، جو [illegible]وت کے دعوے کی تصدیق سے متعلق ہو۔ یہ فعل عام آدمیوں سے صادر نہیں ہو سکتا۔

[illegible]رآن مجید

اسلامیات کی کتابوں میں بتایا گیا ہے کہ بہت سے پیغمبر گزرے ہیں جن سے مختلف مذاہب منسوب ہیں۔ اُن کی تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار تک بتائی جاتی ہے، لیکن [illegible]اں سچے پیغمبروں اور سچے مذہبوں کی تعداد زیرِ بحث نہیں، البتہ یہ جان لینا چاہیے کہ قرآنِ مجید [illegible]ں تمام سابقہ پیغمبروں، خصوصاً موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کا ذکر بڑے احترام سے کیا گیا ہے۔ یہ بھی بتایا [illegible]ہے کہ ان سے معجزے رونما ہوئے، مثلاً موسیٰؑ کا عصا اژدہا بن جاتا تھا اور عیسیٰؑ اندھوں [illegible]دینا اور مردوں کو زندہ کر دیتے تھے۔ بہت سے دوسرے معجزوں کا بھی ذکر ہے۔ قرآن نے [illegible]جزے بتانے ہی پر اکتفا نہیں کیا، اُنھیں قبول بھی کر لیا ہے، لیکن جو مکروہ اور ناقابلِ قبول اعمال "عہد نامۂ قدیم" میں پیغمبروں سے منسوب ہیں، اُن کا ذکر قرآن میں کہیں نہیں ملتا۔ قرآن نے پیغمبروں [illegible]ا جو نقشہ پیش کیا ہے، اُس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُن کے تمام افعال بڑے مقدس تھے اور [illegible]ن سے کبھی ناخوشگوار عمل رونما نہ ہوا۔ قرآن کے متعدد مقامات پر یہ بھی صاف صاف بتا دیا گیا ہے کہ سابقہ پیغمبروں، خصوصاً موسیٰؑ اور عیسیٰؑ نے محمدؐ کی آمد کے متعلق پیشگوئیاں کر دی تھیں۔

قرآنِ مجید کا خطاب کسی خاص قوم کے لیے نہیں، بلکہ یہ تمام زمانوں اور تمام خطوں کی تمام قوموں اور تمام نسلوں کے لیے ہے۔ سب کو دعوت دی گئی ہے کہ وہ قرآن کو زندگی کے

لیے کتابِ ہدایت سمجھیں اور اس کے احکام کو اپنی زندگی کے لیے دستور العمل بنالیں۔
قرآن کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ یہ بجائے خود ایک معجزہ ہے، زندہ اور دائم وقائم معجزہ ایسا ہونا ناگزیر تھا۔ قرآنِ مجید میں بتایا گیا ہے کہ اسلام کامل ترین مذہب ہے۔ رسول اللہ صلعم اس دنیا میں خدا کے آخری نبی ہیں اور قرآن تمام مقدس کتابوں میں سب سے بڑھ کر جامع ہے۔ حق یہ ہے کہ تمام مقدس کتابوں میں سے اُن نہایت اہم مسائل کے جواب میں قرآن یگانہ ہے، جن سے انسانیت کو سابقہ پڑا، مثلاً یہ کہ انسان کہاں سے آیا، کہاں جارہا ہے اور اُسے کیا کرنا چاہیے۔

خدا کی ہستی کے اثبات اور اصل اشیا کی توضیح کے سلسلے میں قرآن نے نہایت معقول اور روحانی ثبوت پیش کیے ہیں۔ قرآن اپنی واضح ترین توجیہات ایسے انداز میں پیش کرتا ہے کہ عالم و عامی دونوں اس سے یکساں فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ پورے عالم انسانیت نے اسے دنیا کے عجائبات میں شمار کیا ہے۔

یوم حشر اور عالم عقبیٰ کی تشریح، نیز اس عالم کے مراحل کے بیان میں قرآن نے ایسا سیدھا سادا اور معقول طریقہ اختیار کیا ہے جو ہر شخص کی سمجھ میں آسکتا ہے۔ گویا راز کو بے نقاب کردیا ہے۔ اس زندگی کی خوشی و ناخوشی، نیز موت اور ابدی زندگی اس طریق پر واضح کردی گئی ہیں کہ کوئی دوسری توضیح اس کے برابر نہیں پہنچ سکتی۔

جس حد تک اس دنیا میں زندگی بسر کرنے کے فرائض و واجبات کا تعلق ہے، ہم کہہ سکتے ہیں کہ اسلام اور اس کے قواعد، فرد اور اس کی مجلسی زندگی کے تمام پہلوؤں کے لیے جامع ترین رہنما ہیں۔ قرآن اس قدر جامع اور مکمل ہے کہ اس لحاظ سے بھی اسے معجزہ سمجھنا چاہیے۔ اگر اسلام کا مقابلہ دوسرے مذاہب کے الہامی قواعد یا انسانوں کے بنائے ہوئے ضوابط سے کیا جائے تو ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام اپنے جامع نقطۂ نگاہ کے ساتھ سب پر فائق ہے اور اُس کی نظیر کوئی نہیں پیش کرسکتا۔ معاشرے کے تمام معاملات کے لیے ایسے ضابطے

مقرر ہیں جو جسم و روح دونوں کا تقدس محفوظ رکھتے ہیں اور فرد کے لیے دنیا و عاقبت میں برتری اور شادمانی کے ضامن ہیں۔ یہ قاعدے اس وضاحت سے پیش کیے گئے ہیں کہ انھیں ہر مقام پر زندگی کی ہر حالت کے مطابق بنایا جا سکتا ہے۔ جو شخص کمال اور شادمانی کی مقررہ منزل پر پہنچنا چاہتا ہے، اس کے لیے ان قواعد کے مطابق عمل لازم ہے جو رسول اللہ صلعم پر الہام ہوئے۔ اسلامی طریقِ عمل کی جامع حیثیت کا اندازہ کرنے کے لیے یہ آیت ایک عمدہ شہادت بن سکتی ہے:

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ	نیکی یہ نہیں کہ تم اپنے منہ پورب یا پچھم کی طرف کر لو، بلکہ
الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ	حقیقی نیکی یہ ہے کہ کوئی اللہ پر، روزِ آخرت پر، فرشتوں
اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَ	پر، کتاب پر، اور نبیوں پر ایمان لائے اور اس کی
الْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى	محبت کے لیے قرابتیوں، یتیموں، مسکینوں اور
حُبِّهٖ ذَوِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ	مسافروں اور سوالیوں میں اور غلاموں کو آزاد کرانے
وَابْنَ السَّبِيْلِ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِى الرِّقَابِ	میں اپنا مال خرچ کرے اور نماز قائم کرے اور
وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ	زکوٰۃ دے اور جب آپس میں عہد کریں تو اسے
وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا	پورا کرنے والے ہوں۔ تنگی اور سختی میں اور لڑائی
وَالصّٰبِرِيْنَ فِى الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ	کے وقت صبر کرنے والے ہوں۔ یہی لوگ
وَحِيْنَ الْبَاْسِ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا	راست باز ہیں اور یہی متقی ہیں۔
وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ۞ (بقرہ ۲: ۱۷۷)	

رسول اللہ صلعم رسول اللہ صلعم کی حیاتِ طیبہ کے متعلق جو تفصیلات معلوم ہیں، وہ کسی نبی کے متعلق معلوم نہیں۔ دوست اور دشمن سب بالاتفاق تسلیم کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلعم چالیس سال کی عمر تک پہنچنے اور نبی مقرر ہونے سے پیشتر بھی سب سے اعلیٰ اور سب پر فائق تھے۔ وہ تمام نیکیوں کے جامع تھے۔ دوسروں میں مختلف درجوں کی اچھی خصلتیں

موجود ہوں گی لیکن رسول اللہ صلعم کی ذات مبارک میں تمام نیکیاں، خوبیاں اور اچھائیاں جمع تھیں، چونکہ آپ کے اوضاع واطوار ابتدا ہی سے بہت ممتاز تھے، اس لیے دوسروں نے تفصیلات محفوظ رکھیں اور وہ سب کو سناتے رہے۔

جب رسول اللہ صلعم کو نبوّت کا منصب عطا ہوا تو اہلِ مکّہ اور اہلِ عرب کے اخلاق پستی کی آخری منزل پر پہنچے ہوئے تھے۔ اس سلسلے میں صرف اُن کے دیوتاؤں کو پیشِ نظر رکھ لینا کافی ہے۔ وہ پتھر اور لکڑی کے بت بنا کر ان کی پوجا کرتے تھے اور ان سے دنیا کی مرادیں مانگتے تھے۔ اُن کے معمولات کیا تھے؟ رہزنی، قتل وغارت، نوزائیدہ لڑکیوں کی زندہ تدفین، قبائلی معاملات پر رزم و پیکار، کمزور اور بے آزار لوگوں پر ظلم و جور۔ روپے کی خاطر عورتوں کو بداخلاقی پر مجبور کرتے اور خود عورتوں کو کوئی حق حاصل نہ تھا۔ بداخلاقیاں اُن کی زندگی کا لازمی جزو بن گئی تھیں اور وہ ان چیزوں پر فخر کرتے ہوئے ذرا شرم محسوس نہ کرتے تھے۔

یہ صورتِ حال تھی جب رسول اللہ صلعم کو ان کی ہدایت پر مامور کیا گیا۔ اس سے پیشتر آپ صلعم اپنے چچیرے بھائی حضرت علیؓ کو اپنے ہاں لے آئے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ کے چچا ابوطالب کثیر الاولاد تھے۔ ان کی امداد کی یہ بھی ایک صورت تھی کہ ایک بیٹے کی پرورش اپنے ذمّے لے لی۔ چنانچہ حضرت علیؓ رسول اللہ صلعم ہی کی آغوشِ تربیت میں پلے۔ جب رسول اللہ کو نبوت ملی تو خواتین میں سے آپ کی بیوی خدیجہؓ سب سے پہلے اسلام لائیں۔ مردوں میں سب سے پہلے مومن آپ کے چچیرے بھائی علیؓ تھے[1]۔

جب رسول اللہ صلعم نے اہلِ خاندان کو ایک مقام پر جمع کیا اور ان سے فرمایا: "مجھے خدا نے تمھاری ہدایت کے لیے بھیجا ہے اور جو چیز لے کر آیا ہوں وہ دین اور دنیا دونوں کو کفیل ہے۔ میری تعلیم سے تمھیں اس دنیا میں راحت اور آنے والی دنیا میں سعادت ملے گی"۔ اہلِ خاندان

[1] ایک روایت یہ ہے کہ چار بزرگوں نے سب سے پہلے اسلام قبول کیا (۱) حضرت خدیجہؓ (۲) حضرت ابوبکر صدیقؓ (۳) حضرت علیؓ اور (۴) حضرت زیدؓ۔ (مترجم)

ے صرف حضرت علیؓ نے اٹھ کر کہا کہ میں آپ کا ساتھ دوں گا۔ باقی سب خاموش رہے، بلکہ بعض
حضرت علیؓ کے قبولِ اسلام کا مذاق بھی اُڑایا۔ رسول اللہ صلعم نے تین مرتبہ پوچھا کہ کوئی
دینے کے لیے تیار ہو جائے اور تینوں مرتبہ صرف حضرت علیؓ نے حامی بھری۔

اہلِ خاندان کو دعوت دے چکنے کے بعد جیسے صرف حضرت علیؓ نے اسلام قبول کیا رسول اللہ صلعم اہلِ مکہ سے مخاطب ہوئے
سال آپ اُن لوگوں کو صبر، سکون، رحمت و رافت اور انتہائی رواداری سے قرآن مجید کی
ں سناتے اور خدا کی عبادت کرنے کی دعوت دیتے رہے تاکہ اُنھیں راحت نصیب ہو
اہلِ مکّہ کی تربیت ہی رزم و پیکار میں ہوئی تھی۔ تکبّر، خود غرضی، تعصّب، لاف زنی اور جہالت
ی گھٹّی میں پڑی ہوئی تھی۔ جب اکابر دعوتِ حق کا مذاق اڑاتے اڑاتے تھک جاتے تو نوجوانوں
ے کہتے کہ آپ کی مزاحمت کریں، بُرا بھلا کہیں، آپ پر پتھر برسائیں اور جسمانی آزار پہنچائیں۔
ل اللہ صلعم نے یہ تمام مصیبتیں صبر سے برداشت کرلیں اور معمول کے مطابق سب کو
ت و مہربانی سے نصیحت فرماتے رہے۔ حضرت علیؓ اس کام میں آپ کے معاون تھے
لی آپ کو تنہا نہ چھوڑا، بلکہ دوش بدوش ساتھ رہے۔ حضرت علیؓ ہی آپ کو بچوں کی ایذا رسانی
بچاتے رہے۔

پہلے تیرہ سال میں مکے کے صرف چند لوگوں نے اسلام قبول کیا تھا، لیکن رسول اللہ صلعم
شہرت مکّے سے باہر پہنچ گئی تھی اور آپ کے پاس دعوت آگئی تھی کہ مدینہ میں اپنے عقیدت مندوں
پاس تشریف لے آئیں۔ قبائلِ مکّہ کے رئیسوں نے جب یہ دیکھا کہ رسول اللہ صلعم کے
پیروؤں کی تعداد مکّہ اور دوسرے مقامات پر بڑھ رہی ہے تو آپ کو شہید کر دینے کا
ارادہ کر لیا۔ منصوبہ یہ باندھا گیا کہ مختلف قبیلوں سے پچاس آدمی منتخب کیے جائیں۔ وہ مقررہ
ب میں رسول اللہ صلعم کے گھر پہنچیں اور آپ پر حملہ کر دیں۔

رسول اللہ صلعم کو الہام کے ذریعے سے اس منصوبے کا علم ہو گیا۔ آپ نے حضرت
سے صورتِ حال کے متعلق مشورہ کیا۔ آخر یہ قرار پایا کہ رسول اللہ صلعم شب کی تاریکی میں

مدینہ جانے کے لیے سفر اختیار کریں اور آپ کے بستر پر کوئی دوسرا شخص سو جائے حضرت علیؓ رسول اللہ صلعم کے سچے وفادار، معتمد علیہ اور جاں نثار پیرو تھے، اُنھوں نے قاتلوں کا ہدف بننے کے لیے اپنے آپ کو پیش کر دیا، چنانچہ حضرت علیؓ رسول اللہ صلعم کے بستر پر سو گیے تاکہ قاتل سمجھیں، رسول اللہ صلعم گھر میں ہیں۔ حملہ کریں تو حضرت علیؓ شہادت پائیں اور رسول اللہ صلعم کو مدینہ پہنچنے کے لیے وقت مل جائے۔

طے شدہ تجویز کے مطابق حضرت علیؓ رسول اللہ صلعم کے خانۂ مبارک میں سو گئے اور رسول اللہ صلعم حضرت ابو بکرؓ کے ساتھ مکّہ سے نکل پڑے، جو اُنھیں راستے میں مل گئے تھے سازشی گروہ رسول اللہ صلعم کے گھر میں داخل ہو گیا اور ایک شخص کی تجویز کے مطابق یہ فیصلہ ہوا کہ صبح انتظار کریں۔ رسول اللہ صلعم اٹھیں تو اُن پر حملہ کیا جائے، حضرت علیؓ نے یہ تجویز سن لی، مگر خاموش رہے، تاکہ وہ شبہے میں پڑ کر رسول اللہ صلعم کا تعاقب نہ کریں۔ صبح ہوئی، قاتلوں نے تلوار سونتیں اور بستر سے حضرت علیؓ اُٹھے تو سازشی ہکّا بکّا رہ گئے۔ وہ کیا کر سکتے تھے، حضرت علیؓ کی جوانمردی اور ایثار کی بدولت بہترین موقع اُن سے چھن گیا تھا۔

مدینے پہنچ کر اسلام کی ترقی کا نیا دور شروع ہوا۔ رسول اللہ صلعم کے دوسرے پیرو اور حضرت علیؓ مکّہ چھوڑ کر مدینہ آپ سے جا ملے مدینہ میں رسول اللہ صلعم کے داخلے سے وفات تک دس برس کی مختصر مدت میں تمام قبیلوں پر اسلام کی صداقت روشن ہو گئی اور وہ جوق در جوق دائرۂ اسلام میں آ گئے

ؔ مقالہ نگار نے واقعۂ ہجرت کو اختصار سے پیش کرتے ہوئے اس کے متعدد اہم پہلو نظر انداز کر دیے مثلاً اہلِ مکہ کا منصوبہ سفرِ ہجرت کا باعث نہ تھا، اسباب دوسرے تھے۔ یہ اتفاق ہے کہ ادھر ہجرت کی تیاری ہو رہی تھی، اُدھر اہلِ مکّہ نے مجاہدانہ منصوبہ کر لیا۔ بلاشبہ حضرت علیؓ ہجرت کی پہلی رات رسول اللہ صلعم کے بستر پر سوے۔ اس میں بھی کلام نہیں کہ حضرت علیؓ کی جاں نثاری کے بیسیوں واقعات میں اس واقعہ کو بھی بڑی اہمیت حاصل ہے، لیکن ہجرت کا بیان محض اتنے واقعے تک محدود نہ رہنا چاہیے تفصیلات دیکھی جائیں تو دوسرے افراد بھی اپنی اپنی جگہ انتہائی جاں نثاری کے پیکر بنے رہے مقالہ کا بیان ہجرت کی صحیح کیفیت پیش نہیں کر رہا۔ (ح)

اس مدت میں متعدد لڑائیاں بھی ہوئیں جو مسلمانوں پر منکروں کے حملے کا نتیجہ تھیں۔ اگرچہ منکر تعداد اور سامانِ جنگ میں مسلمانوں پر فائق تھے، لیکن رسول اللہ صلعم کے عساکر فتح مند رہے۔ لڑائیوں میں حضرت علیؓ کی بہادری ایثار، حسنِ تدبیر، تجربہ کاری اور قوتِ ایمان فیصلہ کن عوامل بنی رہیں۔ حضرت علیؓ ہی مسلمانوں کو فتح دلاتے رہے اور دوسرے رفقا کے مقابلے میں کامیابی کا سہرا انھیں کے سر رہا۔

اگرچہ قیامِ مدینہ کا زمانہ مختصر ہے، تاہم لوگوں کو حلقہ بگوشِ اسلام بنانے میں رسول اللہ صلعم کو معجز نما کامیابی حاصل ہوئی۔ جو بری رسمیں دلوں میں گہری جڑ پکڑ گئی تھیں محو ہو گئیں اور نیکی اور فضائلِ اخلاق نے اُن کی جگہ لے لی۔ قتل، خود غرضی، بدنظمی اور بے رحمی کی جگہ اخوت، مساوات اور عدل کا دور دورہ ہو گیا۔ خدا پر سچا ایمان رکھنے والے اور رسول اللہ صلعم کے سچے پیرو اس انداز میں مذہبی احکام پر کاربند ہوئے کہ ظاہر و باطن میں راست بازی ان کے ہر عمل کی بنیاد بنی رہی۔ عرب کے ہزاروں، لاکھوں آدمیوں نے رسول اللہ صلعم کے ارشادات سنے اور آپ کو عمل کرتے دیکھا۔ سب کا اعتماد آپ پر تھا۔ الہام کے ذریعے سے جو احکام نازل ہوئے، سب نے اُنھیں تسلیم کر لیا۔ وہ کفر سے نکل کر ایمان کے دائرے میں آئے تو اُن کی سیرت میں تغیر پیدا ہو گیا۔ اُن کے ظاہری اعمال دیکھ کر ہر شخص کو یقین ہو جاتا تھا کہ اُنھوں نے راہِ تسلیم اختیار کر لی ہے اور مسلمان بن گئے ہیں۔ تاریخ کا یہ نہایت غیر معمولی واقعہ ہے۔

کون سا دوسرا قائد ہے جس نے ایسی تنظیم کی اور اس قسم کا نظام قائم کیا، تھوڑی سی مدت میں ایسی کامیابی حاصل کی یا انسانوں کی اتنی بڑی تعداد کو حلقہ بگوشِ دین بنایا؟ رسول اللہ صلعم کے پاس دولت نہ تھی، ہتھیار نہ تھے، فنونِ جنگ کا بھی کوئی تجربہ نہ تھا، آپ نے کہیں تعلیم نہیں پائی تھی۔ ایسے ماحول میں رہے جو بدنظمی اور انارکی سے لبریز تھا اور ایک جابرانہ و معاندانہ نظام کے ماتحت ظلم و جور ہوتا تھا۔ خود آپ کا اپنا قبیلہ بھی سخت دشمن تھا، تاہم ان حالات میں کسی قسم کی قوت استعمال کیے بغیر آپ نے اُن لوگوں کی سیرتیں یکسر بدل ڈالیں جو متعصب، بے رحم اور جابر تھے۔ اُن لوگوں نے اپنے اندر فضائلِ اخلاق پیدا کر لیے اور اس درجہ مخلص ثابت ہوئے کہ اسلام کی

عظمت و شان کے لیے اپنی جانیں بطیب خاطر قربان کر دیں۔ رسول اللہ صلعم نے جن اخلاق
کام لیا، وہ کیا تھے؟ فضائلِ اخلاق، ایمان افروز ارشادات، طبعی اور شریفانہ رسولِ عمل، اعدا
راست بازانہ روش، لطف و مروّت، امداد و دست گیری۔

ہجرت سے دس سال بعد ماہ ذوالحجہ میں —— وفات سے صرف تین مہینے
رسول اللہ صلعم ادائے حج کے بعد مکہ سے مدینہ آ رہے تھے راستے میں غدیر خم
مقام پر ٹھہر گئے اور جو لوگ آپ کے ہم رکاب تھے —— آپ کے صحابہ کی تعداد ایک لا
بیس ہزار بتائی جاتی ہے —— اُن سے کہا کہ جمع ہو جائیں، بلکہ جو لوگ آگے نکل گئے تھ
اُنھیں بھی حکم دے دیا کہ واپس آئیں اور قافلے کے عقبی حصّے کے پہنچنے کا بھی انتظار فرمایا
روز آپ دوپہر کی گرم دھوپ میں خطبہ ارشاد فرمانے کے لیے کھڑے ہوئے۔ معلوم ہوتا تھا
بڑی اہم چیز فرمانے والے ہیں۔ حسبِ معمول اونٹ کا زین منبر کے طور پر استعمال کیا اور بڑا بلیغ
ارشاد فرمایا۔ سب کو مذہبی فرائض اور الٰہی احکام یاد دلائے۔ پھر قرآن اور اپنے اہلِ خاندان کا ذ
کیا۔ آخر میں حضرت علیؓ کو اپنے برابر کھڑا کر لیا تاکہ سب اُنھیں پہچان لیں۔ پھر حاضرین سے پوچھا
مومنوں کا آقا کون ہے؟ جواب ملا خدا اور اُس کا رسولؐ بہتر جانتے ہیں۔ رسول اللہ صلعم نے فرمایا
خدا میرا مولا ہے اور میں مومنوں کا مولا ہوں جن کا میں مولا ہوں اُن کا علیؓ بھی مولا ہے۔ یہ فقرہ
یا چار مرتبہ فرمایا، پھر ارشاد ہوا: اے اللہ! جو علیؓ سے محبت رکھے، تو بھی اُس سے محبت رکھ
جو علیؓ سے عداوت رکھے تو بھی اُس سے عداوت رکھ۔

گویا اُس روز رسول اللہ صلعم نے مندرجہ صدر الفاظ میں حضرت علیؓ کی عظمت ظاہر فرما دی اور
یہ اشارہ بھی فرما دیا کہ حضرت علیؓ آپ کے جانشین ہوں گے[1]۔ شیعہ حضرات کے عقیدے کے

---

[1] خطبۂ غدیر خم کی روایت صحیح مسلم، نسائی، ترمذی، مسند احمد وغیرہ میں آئی ہے اور سب روایتوں میں تھوڑا بہت اختلاف ہے یہ فقرہ
اکثر روایتوں میں مشترک ہے کہ "جسے میں محبوب ہوں، اُسے علی بھی محبوب ہونا چاہیے اور اے اللہ علی سے محبت رکھنے والے سے
محبت رکھ اور علیؓ سے عداوت رکھنے والے سے عداوت رکھ" بہ ظاہر اس خطبے کی ضرورت یوں پیش آئی کہ حضرت علیؓ کی امارت میں
باقی صفحہ ۲۹۳ پر دیکھیے

ابق رسول اللہ صلعم کے ارادہ مبارک میں شبہے کی گنجائش ہی نہیں۔ آپ نے دھوپ میں لوگوں کو جمع
اپنی وفات کے قرب کی خبر دی، پھر حضرت علیؓ کو خطبے کا خاص موضوع بنا لیا، گویا آپ نے
رت علیؓ کو عوام کا نیا آقا بنایا اور خدا کے تعلق میں حضرت علیؓ کا رتبہ اپنے برابر پہنچا دیا۔ بلا شبہ رسول اللہ
کے ذہن مبارک میں تھا کہ حضرت علیؓ آپ کے جانشین ہیں۔

جب رسول اللہ صلعم اس دنیا سے رخصت ہوئے تو پیچھے ایک ایسی قوم چھوڑی جو خدا کی
دت سیکھ چکی تھی۔ روحانی علم سے معمور تھی۔ اُس قوم کے دل پاک تھے۔ آرزو یہ تھی کہ دنیا
عدل قائم ہو جائے۔ عوام کی خدمت انجام پائے۔ ان میں قربانی کا جذبہ موج زن تھا۔ وہ عامل بالخیر
۔ رسول اللہ صلعم نے امت کے لیے جو میراث چھوڑی وہ قرآن وسنت اور عترت پر مشتمل تھی۔ قرآن خدا کی
م کی ہوئی کتاب ہے جس میں تخلیق اور یوم حشر کے واقعات بھی شامل ہیں اور انسانی زندگی کا مکمل
موجود ہے۔ سنت رسول اللہ صلعم کے ارشادات و اعمال کا مجموعہ ہے۔ شیعوں کے عقیدے
مطابق خاندانِ رسالت کے ارشادات و اعمال بھی سنت میں شامل ہیں۔

رسول اللہ صلعم کے اہل خاندان میں آپ کی پہلی بیوی حضرت خدیجہؓ کے بچے اور بعض دوسری
ں کے بچے شامل ہیں۔ آپ کے فرزند ابراہیم کا انتقال بچپن ہی میں ہو گیا۔ اتفاق سے وفات
ج گہن کے موقع پر ہوئی۔ سادہ لوح عوام نے سمجھا کہ ابراہیمؓ کی وفات کے باعث گہن لگا ہے
ل اللہ صلعم کو معلوم ہوا تو آپ بہت خفا ہوئے اور اعلانیہ فرمایا کہ اس قسم کے خیالات نادرست
سورج اور چاند بھی خدا کی مخلوق ہیں اور اسی کے حکم سے یہ چلتے ہیں۔ کسی کی موت ان پر کوئی

صحاب نے بیجا اعتراض کیے تھے۔ رسول اللہ صلعم ایک غلط اثر زائل فرما دینا چاہتے تھے۔ باقی رہا مسئلۂ امامت و خلافت تو اس خطبے کو
ستدلال حضرت علیؓ نے پیش کیا اور نہ کسی دوسرے شخص نے۔

رد صفحہ ۱: ۔۔ رسول اللہ صلعم کے الفاظ یہ تھے: میں بھی بشر ہوں، ممکن ہے خدا کا فرشتہ جلد آ جائے اور مجھے قبول کرنا پڑے۔
دیم سے واضح ہوتا ہے کہ غدیر خم کا خطبہ تقریباً وسط مارچ میں دیا گیا، کیونکہ ذوالحجہ ۲۸ فروری کو شروع

اثر نہیں ڈال سکتی اور نہ اُن کا راستہ بدل سکتی ہے۔

رسول اللہ صلعم کی ایک صاحبزادی حضرت فاطمہؓ حضرت خدیجہؓ کے بطن سے تھیں
صلعم کو ان صاحبزادی سے بہت محبت تھی اور ان کی بہت عزت کرتے تھے۔ اُن کی
علی سے ہوئی جو سب سے بڑھ کر رسول اللہ صلعم کے معتمد علیہ تھے۔ آپ کو اپنے د
حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ سے بھی بڑی محبت تھی۔ آپ ہر موقع پر اُن کا خاص خیا
مسجد میں ہوتے یا گھر پر۔ اُنھیں اپنے فرزند کہتے اور فرماتے "یہ نوجوانانِ جنت کے
حضرت حسنؓ حضرت حسینؓ حضرت فاطمہؓ اور حضرت علیؓ کو صدمہ پہنچانا خدا ا
مخالفت سمجھا جاتا تھا۔

حضرت علیؓ اور ظہورِ شیعہ

حضرت علیؓ رسول اللہ صلعم کے چچیرے بھائی تھے اور آپ ہی
میں پلے تھے۔ رسول اللہ صلعم کی محبوب صاحبزادی سے حضر
ہوئی تھی اور حضرت علیؓ رسول اللہ صلعم کے سب سے قریب
بچپن کے آغاز سے رسول اللہ صلعم کی وفات تک دن اور رات، سفر اور حضر میں، پہاڑ
میدانوں میں جنگ اور صلح میں تنگی اور کشائش میں حضرت علیؓ رسول اللہ صلعم کے سا
حضرت علیؓ نے رسول اللہ صلعم کا طریقِ زندگی بہ صمیم قلب اختیار کیا۔ تبلیغ کے مقاصد
کی باقاعدہ تعلیم پائی اور وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کو سب سے
تھے۔

متعدد مواقع پر حضرت علیؓ نے رسول اللہ صلعم اور اسلام کے لیے قربانیاں کیں
موصوف کی بہادری کی محرک قوتِ ایمان تھی۔ اس سے اسلام کی ابتدائی ترقی کا
ہر اچھے وصف میں حضرت علیؓ دوسروں پر فائق تھے، مثلاً نکوکاری علم، بہادری وفا
اور اعتماد گویا رسول اللہ صلعم کے بعد آپ کا درجہ تھا۔

رسول اللہ صلعم نے صراحتاً اور ضمناً حضرت علیؓ کی رخصتِ منصب کا ذکر

...ئیں دوسروں سے بلند تر ظاہر کیا۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ غدیر خم کا واقعہ حضرت علیؓ کے اعزاز کا نمایاں
...ا۔ وہیں رسول اللہ صلعم نے اپنے آپ کو لوگوں کا آقا و مولا اور خدا کے تعلق میں حضرت علیؓ کو اپنے
...برے درجے پر قرار دیا جب عیسائیوں کو مباہلے کی دعوت دی گئی تھی تو رسول اللہ صلعم نے
...فاطمہؓ، حضرت حسنؓ، حضرت حسینؓ اور حضرت علیؓ کو اپنے پاس بٹھا لیا تھا۔ اسی موقع پر حضرت
...پنی روح قرار دیا تھا۔ اسی طرح زبان رسالت سے حضرت علیؓ کی عظمت ظاہر ہوتی ہی۔ ان
...اور اس قسم کے دوسرے واقعات نے واضح کر دیا کہ رسول اللہ صلعم حضرت علیؓ کو اپنا جانشین
...تھے۔ تمام شہادتوں کا مرجع یہ ہے کہ رسول اللہ صلعم چاہتے تھے، حضرت علیؓ عوام
...ائی کے لیے پورے اختیارات سے جانشین بنیں۔ حضرت علیؓ مسلمانوں کی رہنمائی اور
...معاملات کی سربراہی کے لیے ہر لحاظ سے موزوں تھے۔

حضرت علیؓ اپنی حیثیت بالکل محفوظ تصور فرماتے تھے، چنانچہ رسول اللہ صلعم نے وفات
...حضرت علیؓ کو سخت قلق ہوا اور وہ رسول اللہ صلعم کی مرضی مبارک کے مطابق تجہیز و تکفین
...دف ہو گئے۔ اس اثنا میں کچھ صحابہ ایک مقام پر جمع ہو گئے تاکہ رسول اللہ صلعم کی جانشینی
...طے کر لیں۔* حضرت ابو بکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت ابو عبیدہؓ نے وہاں پہنچ کر تقریریں کیں
...وہاں موجود تھے، ان میں سے بعض ساتھ ہو گئے، بعض نے کوئی فیصلہ نہ کیا۔ حضرت عمرؓ
...رت ابو عبیدہؓ کی حمایت سے حضرت ابو بکرؓ خلیفہ نامزد ہوئے۔ اس انتخاب سے حضرت
...کے حامیوں اور دوسرے مسلمانوں میں نزاع پیدا ہو گئی۔ جب آخر الذکر مسلمانوں کو اندازہ
...نزاع جاری رہی تو اسلام کمزور ہو جائے گا اور یہ نزاع مسلمانوں کی تباہی پر منتج ہو سکتی ہے
...امی مقاصد کے پیش نظر ان مسلمانوں نے آہستہ آہستہ حضرت ابو بکرؓ کی خلافت کا حلف اٹھا لیا

...* انصار تھے جنھوں نے سقیفۂ بنو ساعدہ میں جانشینی کا مسئلہ چھیڑ دیا تھا۔ چونکہ اس سے اختلافات پیدا ہونے
...یشہ تھا، لہذا اجتماع کی اطلاع ملتے ہی حضرت ابو بکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت ابو عبیدہ وہاں
...بچے۔

اور جب حضرت موصوف نے منصب خلافت سنبھالا تو اختلاف نہ کیا[1]۔

ایسے مسلمان بھی تھے جنھیں علم تھا کہ خلافت کا منصب حضرت علیؓ کو ملنا چاہیے تھا وہ انھیں کو تائید اسلام مانتے تھے۔ یہی لوگ تھے جو آگے چل کر شیعہ کہلائے۔ ان کا عقیدہ کہ رسول اللہ صلعم کا جانشین خدا اور رسولؐ کے ذریعے سے مقرر ہونا چاہیے تھا اور یہ معاملہ پر موقوف رکھنا مناسب نہ تھا۔ ان میں سے اکثر نے با دل ناخواستہ اطاعت کا حلف اٹھایا اور علیؓ نے چھ مہینے گزرنے پر حضرت ابو بکرؓ کی خلافت کی تصدیق کی[2]۔

حضرت ابو بکرؓ تقریباً دو سال منصب خلافت کے حامل رہے اور انھوں نے حضرت کو اپنا جانشین نامزد کیا۔ حضرت عمرؓ بڑے صاحب عزم اور زبردست منتظم تھے اور زہد کے دنیوی راحت و آرائش سے بالکل کنارہ کش رہتے تھے۔ خلیفہ کی حیثیت میں آپ نے فیصلہ کیا اسلامی حدود بڑھائیں چنانچہ ایران اور بعض رومی علاقے فتح کر کے ایک وسیع سلطنت منظم کر لی[3]۔

---

[1] دیں تقریریں ہوئیں اور حضرت ابو بکر کی خلافت پر اتفاق ہو گیا۔ مولنا شبلی نے "الفاروق" میں روایات سامنے رکھ کر یہ نتیجہ نکالا ہے کہ خلافت کے باب میں تین گروہ ہو گئے تھے، اول انصار مہاجرین، سوم بنو ہاشم جو اگرچہ مہاجرین تھے لیکن ان کا گروہ الگ تھا۔ مہاجرین حضرت ابو بکرؓ پر متفق انصار کے رئیس سعد بن عبادہ تھے اور بنو ہاشم کا اجتماع حضرت فاطمہ کے گھر میں تھا۔ بالآخر بہت بڑی اکثریت نے حضرت ابو بکرؓ کو خلیفہ تصور کر لیا اگرچہ بعض اصحاب نے مقالہ نگار کے بیان کے صرف اس لیے اطاعت قبول کی ہو کہ نزاع مسلمانوں کی تضعیف کا باعث ہو سکتی ہے۔

[2] اس باب میں بھی روایتیں مختلف ہیں اور بیعت میں تامل کے اسباب بھی مختلف بیان کیے

[3] مقالہ نگار کا یہ بیان توضیح کا محتاج ہے۔ محض سلطنت کی توسیع کے لیے لڑائی نہیں چھیڑی جا سکتی تھی ابو بکرؓ کے عہد میں مرتدین اور مانعین زکوٰۃ سے لڑائیاں شروع ہوئیں۔ پھر سرحدوں پر کشمکش کا آغاز ہو گیا۔ وجہ یہ تھی کہ ایران اور رومی سرحدوں پر جو عرب آباد تھے وہ اسلام قبول کر چکے تھے یا اس طرف مائل ہو رہے تھے اور رومی شہنشاہیوں نے اسے اپنے خلاف سرکشی قرار دیتے ہوئے ان پر سختیاں شروع کر دیں۔ مسلمانوں کو ان مظلوموں کی اعانت کرنی پڑی۔ اس طرح جنگوں کی نوبت آئی یہاں تک کہ ایران بالکل فتح ہو گیا۔ رومیوں کے دو بہترین صوبے یعنی شام اور مصر جن میں سے مصر عملاً آزاد تھا۔ مسلمانوں کے قبضے میں آگئے۔ مترجم ؂

جب حضرت عمرؓ خلیفہ تھے تو حضرت علیؓ کی حیثیت سب سے بلند تھی حضرت عمرؓ اسلام میں حضرت
لی اعلیٰ حیثیت کو تسلیم کرتے تھے اور اہم معاملات کے متعلق اُن سے مشورے لیتے تھے مختلف
ات میں حضرت عمرؓ نے حضرت علیؓ ہی کی رائے پر عمل کیا اور بعض اوقات حضرت علیؓ نے خلیفہ
لطیاں بتادیں حضرت عمرؓ نے غلطیوں کا اعتراف کیا اور ایک مرتبہ فرمایا کہ علیؓ نہ ہوتے تو
ہلاک ہوجاتا۔

جب ایران فتح ہوگیا تو یزدجرد شاہِ ایران کی بیٹیاں اسیر ہوکر آئیں حضرت عمرؓ انھیں غلاموں
لنیزوں کی طرح فروخت کردینا چاہتے تھے حضرت علیؓ نے مشورہ دیا کہ شہزادیوں سے ایسا
ل خلافِ انصاف ہے اور مذہب اس سے روکتا ہے نتیجہ یہ نکلا کہ اُن شہزادیوں کو شوہر
لینے کی اجازت دے دی گئی چنانچہ ان میں سے ایک نے حضرت علیؓ کے صاحبزادے
رت حسینؓ سے اور دوسری نے حضرت ابوبکرؓ کے صاحبزادے حضرت محمدؓ سے شادی کر
دوسرے موقع پر حضرت عمرؓ ایک ایرانی امیر ہرمزان کو موت کی سزا دینے والے تھے جو قید

رف ایک مرتبہ ایک خاص معاملے میں ایسا واقعہ پیش آیا ورنہ پیغمبروں کے سوا اس دنیا میں معصوم کوئی نہیں۔

اس واقعہ کو مستند مورخوں نے بے اصل قرار دیا ہے۔ مولانا شبلی نے لکھا ہے کہ یہ قصہ زمخشری سے چلا جیسے تاریخ سے کچھ واسطہ
ا ایران ۲۱ھ میں فتح ہوا لیکن یزدجرد نکل گیا تھا اور اہل و عیال یقیناً اس کے ساتھ ہوں گے۔ وہ ۳۱ھ میں بزمانۂ
لتِ عثمانؓ مارا گیا۔ اہل و عیال اُس کے بعد ہی گرفتار ہو سکتے تھے" (الفاروق حصہ دوم ص۱۲۱) علاوہ بریں تاریخ سے ثابت ہے
۱۵ھ میں یزدجرد تخت نشین ہوا تو اس کی عمر سولہ سال کی تھی (الفاروق حصہ اول ص۹۱) پھر ۲۱ھ میں اُس کی صاحبزادیاں
اس سے اُنکی تھیں اگر انھیں شاہی خاندان کے کسی دوسرے فرد کی بیٹیاں فرض کیا جائے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسلام جیسا
ئی صداقت مذہب صرف شہزادیوں کو اس سلوک سے کیوں کر مستثنیٰ رکھ سکتا ہے جو ہر خاتون کے تعلق میں نازیبا ہے حقیقت
ہے کہ اس واقعہ کا کوئی بھی پہلو استقام سے خالی نہیں علاوہ بریں حضرت حسینؓ کی عمر ۲۱ھ میں بارہ سال کی تھی اور حضرت
مدؓ ان سے بھی چھوٹے تھے۔ حضرت حسینؓ کی ازواج میں شہربانو نام کسی خاتون کا ذکر نہیں ملتا۔ مثلاً ملاحظہ ہو سیر الصحابہ
حصہ ششم ص۲۴۴

مترجم

رحال یہ معاملہ مختلف فیہ ضرور ہے۔

ہو کر آیا تھا۔ حضرت علیؓ نے اسے مسلمان ہو جانے پر راضی کر لیا اور اس کی جان بچ گئی۔[1] ہرمزان حضرت علیؓ کا احترام کرتا رہا۔

حضرت عمرؓ دس سال خلیفہ رہے اور اسلام کی عظمت و شان کے لیے بڑی فتوحات کیں۔ وفات سے پیشتر انھوں نے جانشین کے انتخاب کے لیے منصوبہ تیار کیا۔ اگرچہ وہ جانتے حضرت علیؓ جانشینی کے پورے اہل ہیں، مگر انھیں جانشین نہ بنایا، بلکہ چھ آدمی تجویز کر دیے جن میں حضرت علیؓ اور حضرت عثمانؓ بھی شامل تھے اور فرمایا کہ ان میں سے کسی ایک کو خلیفہ اور مومنوں کا روحانی چن لیا جائے۔ جب یہ چھ اصحاب فیصلے کی غرض سے جمع ہوں تو پچاس آدمی تلواریں ہاتھ میں گھیرے رہیں۔ اگر تین روز کے بعد بھی وہ کسی فیصلے پر نہ پہنچیں تو انھیں قتل کر دیا جائے۔ اگر وہ خلیفہ منتخب کر لیں لیکن بالاتفاق نہیں بلکہ اکثریت سے تو اقلیت کو موت کے گھاٹ اتار دیا جائے۔ اگر تین آدمی ایک کو خلیفہ منتخب کریں اور تین دوسرے کو تو جس فریق میں عبدالرحمٰن بن عوف ہوں ان کی رائے ترجیح کی مستحق ہوگی۔ دوسرا فریق اسے قبول نہ کرے تو اسے قتل کر دیا جائے۔ یہ حضرت عمرؓ کا منصوبہ تھا جس پر آپ کی وفات کے بعد عمل ہونا تھا۔[2]

---

[1] واقعہ یہ ہے کہ ہرمزان نے جنگ قادسیہ کے بعد حضرت سعدؓ بن ابی وقاص سے کئی مرتبہ صلح کی، لیکن ہر مرتبہ توڑ دیا جاتا تھا اور شوستر کے معرکے میں دو بڑے مسلمان افسر اس کے ہاتھ سے شہید ہو چکے تھے لہٰذا وہ سزائے موت کا مستوجب جانا جاتا تھا۔ جب اس نے اسلام قبول کر لیا تو حضرت عمرؓ خوش ہوئے اور مدینہ میں رہنے کی اجازت دے دی بھی مقرر کر دیا اور اس سے ایران کے معاملات میں مشورے بھی لیتے رہے۔

[2] تاریخی روایات کے مطابق منصوبے کی تفصیلات مستند نہیں ہیں۔ معاملہ یہ ہے کہ حضرت عمرؓ چھ آدمیوں کو منصب خلافت کا اہل سمجھتے تھے: حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، حضرت طلحہؓ، حضرت زبیرؓ، حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف اور حضرت سعدؓ بن ابی وقاص۔ چنانچہ انھی چھ آدمیوں کو انھوں نے خلافت کے لیے تجویز کیا۔ طبری کے بیان کے مطابق وہ حضرت علیؓ کو سب سے بہتر جانتے تھے، لیکن بعض اسباب کی بنا پر ان کے حق میں قطعی فیصلہ نہ کر سکے۔ حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف کو اس مجلس میں آج کل کی اصطلاح کے مطابق کنوینر (داعی) کی حیثیت حاصل تھی۔ دو روز تک کوئی فیصلہ نہ ہو سکا تو پہلے کہا گیا کہ

بقیہ حاشیہ

مقالہ نگار نے اس کے بعد حضرت عثمانؓ کی خلافت کے متعلق جو کچھ لکھا اس کا مدعا یہ ہے
ب دو امیدوار رہ گئے یعنی حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ تو حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے دونوں
لگ الگ پوچھا کہ اگر آپ کو خلیفہ چُنا گیا تو کیا آپ کتاب و سنّت کی پابندی کریں گے اور پہلے
ں کے نقشِ قدم پر چلیں گے۔ حضرت علیؓ کا جواب یہ تھا کہ میں کتاب و سنت کا پابند رہوں گا
دوسروں کی رائے کا پابند نہیں ہو سکتا۔ اس کے بعد حضرت عثمانؓ کو خلیفہ چُن لیا گیا۔
حضرت عثمانؓ نے بطور خلیفہ پیشروؤں کے اصول کی پابندی نہ کی اور اپنے رشتہ داروں
رے دے دیے۔ جمہوریت، آزادی، عدل اور مساوات کی وہ صورت قائم نہ رہی
عمرؓ کے عہد میں کم و بیش نظر آتی تھی۔ اس وجہ سے لوگوں میں مایوسی پیدا ہوئی اور خلیفہ کے خلاف
ں کا سر و سامان ہو گیا۔ حضرت عثمانؓ کو بار بار متنبہ کیا گیا۔ دُور دُور کے شہروں سے لوگ
یں پیش کرنے کی غرض سے مدینہ منورہ آ گئے۔ اصلاحِ حال کی کوئی صورت نکل نہ سکی۔ ۳۵ھ
ی کے گھر پر حملہ ہوا اور انھیں شہید کر دیا گیا۔ اس وقت تک ان کی حکومت کو بارہ سال گزر
تھے۔

حضرت عثمانؓ کی وفات کے بعد اسلامی شہروں کے جو نمائندے مدینہ منورہ میں موجود
انھوں نے حضرت علیؓ سے خلافت کی درخواست کی۔ اس وقت سے حضرت علیؓ کے
دست اور پیرو آزادانہ اور علانیہ حضرت سے عقیدت کا اظہار کرنے لگے اور اس پر وہ فخر محسوس
ے تھے۔ انھوں نے شیعی عقیدے کا حلف اٹھایا اور اس پر مضبوطی سے قائم رہے[۱]۔

۱۔ کچھ کی بجائے تین میں محدود کیا جائے یعنی جو شخص اپنے ساتھی کو مستحق سمجھتا ہو اس کے حق میں دست بردار ہو جائے چنانچہ زبیرؓ
نے علیؓ کو سعدؓ نے عبدالرحمٰنؓ کو اور طلحہؓ نے عثمانؓ کو پیش کیا۔ عبدالرحمٰنؓ نے اپنا حق چھوڑ دیا صرف علیؓ اور عثمانؓ امیدوار رہ گئے دونوں
عبدالرحمٰنؓ نے کہا اس امر کا فیصلہ میرے حوالے کر دیں۔ پھر بطور خود صحابہؓ سے مشورے کے بعد حضرت عثمانؓ کی بیعت کا اعلان
حاشیہ صفحہ ہذا: جس حد تک عام روایات و تاریخ کا تعلق ہے، نہ کسی کو آزادانہ اور علانیہ اظہار عقیدت سے کبھی روکا
گیا نہ کوئی ضرورت تھی اور نہ حضرت علیؓ کے خلیفہ ہونے پر کوئی خاص حلف اٹھایا گیا جس کی طرف مقالہ نگار نے اشارہ کیا ہے۔

حضرت علیؓ کی خلافت امیر معاویہؓ نے قبول نہ کی جو شام کے گورنر تھے۔ بلکہ حضرت عثمانؓ کے خون بہا کا مطالبہ پیش کر دیا۔ کچھ دیر لڑائیاں جاری رہیں جن میں فریقین کے آدمیوں کی خاصی تعداد ماری گئی۔ جب آشکارا ہوا کہ شامی فوج کا پلہ کمزور ہو گیا ہے اور حضرت علیؓ ہی کامیاب ہوں گے تو امیر معاویہؓ نے لڑائی روکنے کے لیے تحکیم کی تجویز ایسے طریقے پر پیش کرائی کہ عراقیوں یعنی حضرت علیؓ کے طرفداروں میں پھوٹ پڑ گئی۔ ان کی ضد کے باعث حضرت علیؓ کو یہ تجویز قبول کرنی پڑی۔ امیر معاویہؓ کی طرف سے عمرو بن العاص اور حضرت علیؓ کی طرف سے ابوموسیٰ اشعریؓ مقرر ہوئے۔ تحکیم کے ذریعے بھی معاملہ طے نہ ہوا اور عام روایت یہ ہے کہ عمرو بن عاصؓ نے گفت و شنید میں ایک خاص انداز اختیار کیا جسے حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ سمجھ نہ سکے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ الجھن بڑھ گئی۔

چنانچہ پھر لڑائی کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ اس دوران میں حضرت علیؓ کے انھیں ساتھیوں نے جو تحکیم پر بضد ہوئے تھے یہ کہنا شروع کر دیا کہ آدمیوں کو حکم بنانا ہی ٹھیک نہ تھا۔ ان پر سمجھانے کا کچھ اثر نہ ہوا اور انھوں نے حضرت علیؓ سے علیحدگی اختیار کر لی۔ یہی لوگ خارجی کہلائے۔ حضرت علیؓ کو مجبور ہو کر جنگ کرنی پڑی جس میں بہت سے خارجی مارے گئے۔

حضرت علیؓ تقریباً پانچ سال خلیفہ رہے۔ اس اثنا میں انھیں اندرونی ضربوں نے مصروف رکھا اور امیر معاویہؓ کے ساتھ کشمکش کی طرف پوری طرح متوجہ نہ ہو سکے۔ ۱۹ رمضان سنہ ۴۰ھ کو وہ کوفہ کی جامع مسجد میں نماز ادا کر رہے تھے اس اثنا میں ابن ملجم خارجی نے زہر میں بجھی ہوئی تلوار سے انھیں شدید زخمی کر دیا۔

انھوں نے اپنے بستر مرگ پر لوگوں کو بار بار نیکی کی تعلیم دی۔ فرمایا: ایثار سے کام لو، دین پر کاربند رہو۔ نرمی اور ملائمت اختیار کرو، یتیموں اور کمزوروں کا ہاتھ بٹاؤ اور مذہب کے احکام بجا لاؤ۔ فرمایا: "لوگو! ہم خدا کی طرف سے آئے ہیں اور اسی کے پاس جائیں گے۔ خدا کو جاننے کی کوشش کرو۔ اس کی عبادت بجا لاؤ۔ نیک اور اچھے بنو۔ جو مختصر سی فرصت تمھیں اس دنیا میں گزارنے کے لیے ملی ہے اس میں آئندہ زندگی کے لیے تیاری کرو۔ خدا کے سچے عبادت گزار اور مومن کی حیثیت

...ت کے خیر مقدم کے لیے تیار تھے۔ انھوں نے بار بار فرمایا: "خدا کی قسم بچہ ماں کی چھاتیوں سے ...ا واقف نہیں جس قدر علیؓ موت سے واقف ہے"۔ جب مسجد میں آپ پر حملہ ہوا تھا تو فرمایا تھا ...یری مراد حاصل ہو گئی اور میں خدا سے جا ملوں گا"۔ وفات سے پیشتر حضرت علیؓ نے پھر روح عفو ...یر کا اظہار کرتے ہوئے قاتل کے متعلق فرمایا: جب تک میں زندہ ہوں، اسے کسی قسم کا گزند نہ پہنچاؤ ...ی کا برتاؤ کرو۔ اگر میں زندہ رہا تو اس کے متعلق جو کچھ کرنا ہے میں خود کروں گا۔ اگر میں جانبر نہ ہو سکا تو ...پر ایک سے زیادہ ضرب ہرگز نہ لگانا کیونکہ اس نے مجھ پر صرف ایک ضرب لگائی ہے"۔ یوں ...ت سے پیشتر انھوں نے قاتل کو تعذیب سے محفوظ کر دیا۔

حضرت علیؓ کے محامد و مناقب اور نیکیوں کے بیان میں ایک عقیدت مند کا یہ قول نقل کر دینا ...ی ہے:

"آپ کی نیکیوں کے وفاتر کی ورق گردانی کے لیے سر انگشت تر کرنے کی غرض سے سمندروں کا پانی بھی کافی نہیں"۔

ایک مرتبہ مشہور سنی امام حضرت محمد بن ادریس الشافی سے کہا گیا کہ حضرت علیؓ کے متعلق کچھ فرمایئے ...ھوں نے جواب دیا:

"میں ان کے متعلق کیا کہوں، جب کہ دوستوں نے خوف کے مارے اور دشمنوں نے حسد کے باعث اُن کی نیکیوں پر پردہ ڈال دیا، بایں ہمہ اُن کی راست بازی اور نیک کرداری نمایاں رہی اور ہم اُس سے آگاہ ہوئے"۔

عبادت، شجاعت، فصاحت، عفت، صبر و تحمل، غریبوں کی دست گیری اور کمزوروں کی ...انت میں وہ سب پر فائق تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی ان کا ہمنا نہ تھا۔ ایک ...بہ پے در پے تین روزے رکھے۔ جب افطار کا وقت آتا، کوئی سائل آ جاتا، وہ اپنا کھانا اُس ...کے حوالے کر دیتے اور خود بھوکے رہتے۔ خلیفہ ہوئے تو جو کی روٹی تناول فرماتے۔ موٹے ...موٹے اونی کپڑے پہنتے۔ جب لوگوں نے اچھا کھانے اور پہننے کی درخواست کی تو فرمایا:

"کیا یہ مناسب ہے کہ مسلمانوں کا امیر ہو کر میں تنگی اور عسر میں اُن کی معیّت سے انکار کر دوں! میں زند
کی وہی روش قائم رکھوں گا جو غریبوں کے لیے بھی باعثِ اطمینان ہو۔ اگر وہ جَو کی روٹی کھائیں
تو خوش ہوں گے کہ اُن کے امیر کی غذا بھی وہی ہے۔

حضرت علیؓ کے ارشادات: تمام لوگوں کے ارشادات سے بہتر تھے رسول اللہ صلی اللہ
کے ارشادات سے تصادم کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کیونکہ حضرت علیؓ نے جو کچھ فرمایا، قرآن
اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کے متعلق مفصل علم کی بنا پر فرمایا۔ آپ کے خطبے، خط
اور جوامع الکلم بہت سی کتابوں میں محفوظ ہیں اور انھیں "نہج البلاغہ" میں مرتّب کر دیا گیا ہے
حضرت علیؓ نے بہت سے عنوانوں پر خطبے ارشاد فرمائے، مثلاً عبادت، حمد باری
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، نبوت، اخلاق و فضائل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، قرآن، مدا
نبوی زندگی کے طریقے، جہاد، وغیرہ۔ ان خطبوں سے لوگ اس درجہ متاثر ہوتے کہ انھیں
بار بار دہراتے۔ یہ "نہج البلاغہ" میں جمع ہو گئے۔ شیعہ اس کتاب کا بڑا احترام کرتے ہیں
کے بعد اس کا درجہ سمجھتے ہیں۔ اس کتاب میں جو خطبے شامل ہوئے ان میں سے مثالاً ایک
سا خطبہ بہ طور تلخیص پیش کیا جاتا ہے:

"بتحقیق خدا نے قرآنِ مجید تمھاری ہدایت کے لیے بھیجا اس میں راست بازی،
معصیت کاری اور غلط روی کو واضح کیا گیا ہے۔ راست بازی پر کاربند رہو تاکہ
تم ہدایت کا راستہ پاؤ۔ گناہوں سے بچو۔ راہ اعتدال اختیار کرو۔ عدل پر کاربند رہو۔
خدا کے احکام پر جم جاؤ، یہاں تک کہ تمھیں موت آجائے۔ بتحقیق خدا نے انھیں چیزوں
کی ممانعت کی ہے جن کی خرابی واضح ہے۔ خدا نے تمھارے لیے ایسی چیزیں
بھی مہیّا کی ہیں جو نقص اور نا تمامی سے پاک ہیں۔ مسلمانوں کا احترام اس کے لیے
سب سے بڑا اخراج ہے۔ توحید اور عبادتِ الٰہی کے ذریعے سے افراد کے
حق کی حفاظت کی گئی ہے کیونکہ خدا پر ایمان رکھنے والے دوسروں پر جبر کے روادار

نہیں ہو سکتے، بلکہ وہ دوسروں کے حقوق کا احترام کرتے ہیں۔ لوگو! سچے مومن بنو اور خدا کو ہمیشہ یاد رکھو۔ تم سے ہر حرکت اور ہر عمل کا حساب لیا جائے گا۔ اگر تم نے کسی پناہ گاہ کو نقصان پہنچایا ہے اور کسی جانور کو ستایا ہے تو اس کے متعلق بھی بازپرس کی جائے گی۔ احکامِ الٰہی کے فرمانبردار بنو، نافرمان نہ بنو۔ اچھائی دیکھو تو اس کی طرف بڑھو، برائی دیکھو تو اس سے باز رہو۔"

حضرت علیؓ کے خطبات ہی شہکار نہیں جو قرآن مجید کے بعد لاثانی ہیں، بلکہ آپ کے مکاتیب بھی نہایت فصیح اور تمام دوسرے مکاتیب سے اعلیٰ ہیں۔ ان مکاتیب میں حسنِ عمل کی طرف رہنمائی کی گئی ہے اور ایسے عنوان زیرِ بحث آئے ہیں جیسے اللہ تعالیٰ کی معرفت، عرفانِ نفس، دنیا و آخرت میں اپنے مقام کی پہچان، خلوص سے علم کی تلاش اور مخلصانہ روش کی پابندی۔ یہ مکاتیب ان لوگوں کے نام بھیجے گئے تھے جو سرکاری عہدوں پر مامور تھے مثلاً بصرہ اور کوفہ کے گورنر، نیز امیر معاویہؓ کے اصحاب کو بھیجے گئے تھے۔ ایک نہایت اہم مکتوب وہ ہے جو مالکِ اشتر کو ارسال کیا گیا۔ یہ جب عاملِ مصر بن گئے تھے۔ اس مکتوب نے مالک کا قلب بیدار کر دیا اور یہ سکھایا کہ مصر میں حکومت کس طرح کرنی چاہیے۔ بنا بریں یہ مکتوب تمام زمانوں اور تمام مقاموں کے مدبرین کے لیے عمل کا ایک نمونہ ہے۔ اتنا ہی اہم وہ مکتوب تھا جو حضرت علیؓ نے اپنے فرزند ارجمند حضرت حسنؓ کو بطور وصیت بھیجا اور اس سلسلے میں یہ ان کا آخری مکتوب تھا۔ زندگی، موت، تخلیق اور حشر کا ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

> عزیز فرزند! جو معاملات تمہارے اور دوسروں کے درمیان پیش آتے ہیں، ان کا اندازہ کرنے کے لیے اپنی جان کا معیار بناؤ۔ جو اپنے لیے چاہتے ہو، وہی دوسروں کے لیے چاہو۔ جن چیزوں سے خود دور رہتے ہو ان سے دور رہنے میں دوسروں کی بھی مدد کرو۔ تم خود بے رحمی کا ہدف بننا پسند نہیں کرتے، دوسروں پر بھی بے رحمی نہ کرو۔ تمہاری خواہش یہی ہو سکتی ہے کہ دوسرے تم سے اچھا برتاؤ

کریں، تم بھی دوسروں سے اچھا برتاؤ کرو۔ جس شے کو اپنے لیے نازیبا سمجھتے ہو، اُسے دوسروں کے لیے بھی نازیبا سمجھو۔ جس چیز کا تمھیں علم نہیں، اُس کے متعلق ہرگز بات چیت نہ کرو۔ جو کچھ دوسروں کی زبان سے سننا پسند نہیں کرتے، دوسروں کو بھی نہ سناؤ۔ یقین رکھو کہ خود غرضی عقل سلیم کو زائل کر دیتی ہے۔ جو کچھ تم نے حاصل کیا، وہ دوسروں میں تقسیم کر دو۔ نہ اپنے لیے بچاؤ اور نہ دوسروں کے لیے جب تم زندگی کی ایسی منزل پر پہنچ جاؤ تو ان چیزوں کے لیے خدا کا شکر ادا کرو۔"

حضرت علیؓ کے جوامع الکلم بھی بہت مشہور ہیں بعض ان کے خطبات و مکاتیب میں اور بعض الگ منقول ہیں۔ ان میں سے چند یہاں درج کیے جاتے ہیں :

۱۔ زندگی میں تمھارا برتاؤ ایسا ہونا چاہیے کہ اگر مر جاؤ تو لوگ تمھارے لیے روئیں رہو تو تمھارے پاس آنے کے لیے کوشاں رہیں۔

۲۔ صحیح مواقع بادلوں کی طرح تیزی سے گزرتے جاتے ہیں۔ جب کوئی ایسا موقع آئے تو اس سے فائدہ اٹھاؤ۔

۳۔ کامیابی دور اندیشی پر موقوف ہے۔ دور اندیشی حاضر دماغی کی متقاضی ہے۔ کوئی کرلو تو اسے مخفی رکھو۔

۴۔ جو شخص خود رائی پر عمل کرے گا، جلد مارا جائے گا جو دوسروں سے مشورے گا۔ وہ دوسروں کی عقل و دانش میں حصہ دار بن جائے گا۔

۵۔ جو شخص اپنی کوتاہیوں پر نظر رکھے گا۔ وہ دوسروں کی نارسائیوں پر درگزر لے گا۔

حضرت علیؓ کی تعلیمات سے جو چند مثالیں پیش کی گئی ہیں، یہ موصوف کی عظمت کی جھلک پیش کرتی ہیں۔ موصوف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب ترین صحابی، اور آپ کے جانشین تھے۔ ذاتِ باری سے تعلق میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد انھیں کا د

...رت علیؓ کے ... شیعوں کے امام

حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد امیر معاویہؓ نے اپنے زیر سایہ ایک زبردست سلطنت قائم کرنے کی کوششیں تیز کر دیں۔ انھوں نے جلد سے جلد اُن تمام لوگوں کو جلاوطن کر دیا جو حضرت علیؓ کے ماتحت ...ت پا چکے تھے۔ وہ آزادی کے شیدائی حضرت علیؓ کے شیعہ اور محب تھے۔ (ترغیب و ترتیب ...حربے بھی استعمال کیے گئے بلکہ خطبے میں حضرت علیؓ کے لیے اہانت آمیز کلمات بھی آگے ...کہے جانے لگے، لیکن خدا کے سچے بندے، جو اہل بیت کی عظمت سے آگاہ تھے، ...ر شیعہ رہے۔)

...حسنؓ

حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد شیعہ حضرات نے آپ کے فرزند اکبر اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نواسے حضرت حسنؓ کو آئندہ امام تسلیم کر لیا۔ امیر معاویہؓ کے ...ا اتنے بڑھ گئے تھے کہ چند مہینے بعد امام حسنؓ کو صلح کر لینی پڑی۔ اس طرح منصب خلافت ...ی اور مذہبی رنگ سے عاری رہ گیا اور آہستہ آہستہ اس نے دنیوی اور مادّی شکل اختیار ...۔ اگرچہ امیر معاویہؓ خلیفہ کہلاتے تھے اور لوگ بہر حال انھیں حاکم مانتے تھے، پھر بھی ایسے موجود تھے، جنھیں علم تھا کہ حضرت حسنؓ امام ہیں اور وہ مذہبی اصول نیز روحانی فرائض کے متعلق ...حسنؓ ہی سے سب کچھ پوچھتے تھے۔

امام حسنؓ کی مصالحت کے باوجود امیر معاویہؓ کو آپ کی حمایت کے متعلق یقین نہیں تھا۔ وہ ...و نے تھے کہ حضرت حسنؓ خلافت کو اموی خاندان میں موروثی بنانے اور یزید کو جانشین مقرر کرنے ...صوبہ کبھی منظور نہ کریں گے، لہٰذا امام موصوف کو زہر دلا دینے کا فیصلہ کر لیا گیا[1]۔ اگرچہ ایسی ...ششیں ناکام رہیں، آخر کار زہر اثر کر گیا۔ حضرت امام حسنؓ نے ۵۰ھ (۶۷۰ء) میں وفات ...اور مدینہ منورہ میں دفن ہوئے۔

---

[1] امام حسنؓ کو زہر دیے جانے کے متعلق روایات میں اختلاف ہے۔ ایک روایت کے مطابق زہر دیا ہی نہ گیا، دوسری ...ت کے مطابق زہر دیا گیا تو بعض روایتوں میں دینے والے کا نام ہی موجود نہیں، جن روایتوں میں نام ہے، وہ

حضرت امام حسین رضؓ

حضرت امام حسنؓ کی وفات کے بعد حضرت علیؓ کے سچے پیروؤں نے حضرت حسینؓ کو آئندہ امام تسلیم کیا۔ یہ حضرت علیؓ کے دوسرے فرزند تھے اور رسول اللہ صلعم کے نواسوں میں سب سے زیادہ گراں قدر تھے۔

امیر معاویہؓ نے ۶۰ھ میں وفات پائی اور یزید جانشین ہوا۔ وہ فاسق آدمی تھا اور اعمال و احکام سے بالکل ناواقف تھا۔ لوگوں کو علم تھا کہ وہ کتنا خراب آدمی ہے، یہاں تک کہ عہدے کا کام بھی سنبھالنے کے قابل نہیں۔ بہت سے لوگ اُسے خلیفہ ماننے کے لیے بھی تیار نہ تھے۔ یزیدؒ نے فیصلہ کر لیا کہ امام حسینؓ سے اپنی خلافت کی اعلانیہ تصدیق کرالے۔ حاکم مدینہ کے نام حکم بھیجا کہ امام حسینؓ کو بیعت پر مجبور کیا جائے۔ اس اثنا میں امام حسینؓ مکہ چلے گئے۔ یزیدؒ نے ایک مسلح فوج ...... بھیج دی جسے خفیہ حکم دے دیا کہ امام کو گرفتار کر لیا جائے یا قتل کر دیا جائے اور تیس آدمیوں کو عازمین حج کی حیثیت میں بھیجا کہ امام حسینؓ کو خفیہ طور پر شہید کر دیں۔[1]

امام حسینؓ کو یزیدؒ کے منصوبوں کا علم ہوا تو آپ نے اہل کوفہ کی دعوت منظور کر لینے کا فیصلہ کر لیا اور مکہ معظمہ سے کوفہ روانہ ہو گئے۔ کوفہ میں اپنے حامیوں تک پہنچنے سے پہلے حضرت امامؓ کو یزیدؒ کی فوج نے کربلا میں روک لیا۔ ابن زیاد یزید کی فوج کا سالار تھا۔[2]

بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۰۵ :۔ [1] نام حضرت حسنؓ کی اہلیہ جعدہ بنت الاشعث کا ہے اور اس کی کوئی معین شہادت پیش نہیں کی گئی۔ بہر حال اس سلسلے میں امیر معاویہؓ پر الزام سراسر بے اصل ہے اسی طرح بعض دوسرے الزامات بھی صحیح نہیں، اگرچہ یہ واقعہ ہے کہ امیر معاویہؓ کا عہد خلافت مختلف حیثیتوں میں خلافتِ راشدہ سے متفاوت تھا۔ یزید کی ولی عہدی کے معاملے میں جمہوری نظام کو موروثی شاہی حکومت بنا دیا۔ اگرچہ اس ولی عہدی کے حق میں مصلحتیں پیش کی جائیں، لیکن جو نتیجہ نکلا وہ بہر حال ابتدائی نظام حکومت میں بنیادی تبدیلی پیدا کر گیا۔

حاشیہ صفحہ ہذا :۔ [1] یہ روایت بھی مسلّم نہیں :۔ [2] ابن زیاد کوفہ اور بصرہ کا گورنر تھا۔ کربلا میں سردار عمر ابن سعد تھا۔ یہ صحیح نہیں کہ امام حسینؓ کو کربلا میں روک لیا گیا، یہ کہنا چاہیے کہ وہ مکہ معظمہ سے کوفہ جا

بقیہ ص ۳۰

۶۱ھ میں امام حسینؓ ان کے فرزند، رفیق، بھائی اور رشتہ دار شہید کر دیے گئے۔ تاریخ کا یہ سب سے زیادہ دردناک واقعہ ہے۔

حضرت علیؓ پہلے امام تھے حضرت حسنؓ دوسرے اور حضرت حسینؓ تیسرے

امام حضرت حسینؓ کے ایک فرزند علیؓ تھے، جن کی والدہ ایران کی شہزادی اور آخری ایرانی بادشاہ یزدجرد کی دختر تھی۔ جنگِ کربلا کے وقت یہ صاحبزادے گھر میں بیمار تھے، اس لیے بچ گئے[1]۔ والد کی وصیت کے مطابق انھیں مذہبی پیشوا اور امام تسلیم کر لیا گیا اور وہ زین العابدین یعنی عبادت گزار لوگوں کے لیے باعثِ زینت کے لقب سے موسوم ہوئے۔ امام موصوف کا انتقال محرم ۹۵ھ (۷۱۳ء)[2] میں ہوا

پانچویں امام حضرت محمد باقرؓ تھے، جو ۱۱۴ھ تک فرائضِ امامت انجام دیتے رہے، ان کے فرزند امام جعفر صادق جانشین ہوئے۔ امام موصوف ہی کے عہد میں بنو امیہ کی حکومت اختتام کو پہنچی اور اُن کی سلطنت کا شیرازہ درہم برہم ہو گیا۔ نئی خلافت عباسیوں نے قائم کی۔ پہلا عباسی خلیفہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمِ محترم حضرت عباس کے اخلاف میں سے تھا۔ ربیع الاول ۱۳۲ھ (۷۴۹ء) کو جمعہ کے دن لوگ ابوالعباس کی بیعت کے لیے جمع ہوئے۔ وہ منبر پر کھڑا ہوا لیکن بخار میں مبتلا ہونے کے باعث کچھ کہہ نہ سکا۔ اُس کا چچا داؤد ایک پایہ نیچے کھڑا تھا اور اس نے بلند آواز سے کہا: "خدا کی قسم، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت علیؓ کے بعد خلافت کے لیے ابوالعباس سے بہتر کوئی نہیں۔"

عباسی حکومت کے سربراہ بن گئے تو صورتِ حال میں اتنی تبدیلی ہو گئی کہ خاندانِ رسالت

صفحہ ۳۰۶: کوفہ تھوڑے فاصلے پر رہ گیا تو یزید کی فوج کے ایک دستے نے انھیں آگے بڑھا دیا یہاں تک کہ کربلا پہنچ گئے۔ کربلا کوفہ سے شمال میں ہے۔

یہ صفحہ ھذا: [1] امام زین العابدینؓ گھر میں بیمار نہ تھے، امام حسینؓ کے ساتھ تھے البتہ سخت بیمار ہونے کے باعث جنگ میں حصہ نہ لے سکے۔ [2] مستند روایت کے مطابق آپ کی وفات ۹۵ھ میں نہیں، ۹۴ھ میں ہوئی۔

لوگوں کی رہنمائی میں حصہ لے سکتا تھا۔ امام جعفر صادقؒ نے لوگوں کو تعلیم دینی شروع کی اور مذہبی
سے ان کی دلچسپی بڑھائی جو علما اچھی تعلیم پا چکے تھے، انھوں نے امام موصوف کی تعلیما
کر لیں اور بعض لوگ شیعہ مذہب کے لوگوں کو جعفری فرقہ کہنے لگے۔

امام جعفر صادقؒ کا انتقال ۱۴۸ھ (۷۶۵ء) میں ہوا اور وصیت کے مطابق ان
صاحبزادے حضرت موسیٰ کاظمؒ ساتویں امام بنے۔ ہارون الرشید نے خلافت کو موروثی بنا
فیصلہ کر لیا جب اسے معلوم ہوا کہ علوی خاندان اس تجویز کا مخالف ہے تو حضرت موسیٰ
بغداد بلا لیا اور انھیں قید کر دیا تئیس سال گزر جانے کے بعد ۱۸۳ھ (۷۹۹ء) میں
دیا۔ بغداد کے نزدیک کاظمین میں ان کا مزار ہے۔

حضرت موسیٰ کاظمؒ کی وصیت کے مطابق ان کے فرزند حضرت علیؒ الرضا آٹھویں اما
آپ کو سب لوگ شیعی عقائد و اعمال کے مطابق سند مانتے تھے۔ اس زمانے میں ہارون
فرزند مامون رشید خلیفہ تھا۔ وہ بڑا عالم اور بہت اچھا مدبر تھا۔ اس نے متعدد مباحث
علیؓ کی اعلیٰ حیثیت ثابت کر دی اور یہ بھی بتا دیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جانشینی
حق وار وہی تھے۔ خاندان رسالت سے دلچسپی کے باعث مامون نے فیصلہ کیا کہ امام علی
کو اپنا جانشین بنا دے تاکہ خاندانِ رسالت کا جائز حق اسے مل جائے۔ مامون نے امام
کو مدینہ سے بلایا اور خلافت کے متعلق جانشینی پر راضی کر لیا۔ امام رضاؒ نے اس شرط پر جانشی
کی کہ آپ کو ملکی معاملات میں دخل دینے کے لیے نہ بلایا جائے تاکہ پورا وقت عبادت و م
میں صرف ہو۔ عوام حضرت امام کے اعلیٰ اوصاف، علم و فضل، سیرت اور مکارم سے پوری طر
تھے اور بہت احترام کرتے تھے، لیکن عباسی خاندان کے دل میں حسد کی آگ بھڑک اٹھی
ازاں مامون بھی حضرت امام کے جانشین بنانے پر پشیمان ہوا اور خفیہ خفیہ انھیں زہر دلا دیا[1]۔ امام

---

[1] بلاشبہ بعض روایتوں میں مامون پر یہ الزام لگایا گیا ہے لیکن ثابت نہیں ہوا اور معاملہ قیاسات سے آگے نہیں
ظاہر ہے کہ قیاسات تاریخی حقائق کا درجہ حاصل نہیں کر سکتے۔

۲۰۳ھ (۸۱۸ء) میں وفات پائی اور مشہد میں آخری نیند سوئے۔ آپ کا مزار زیارت گاہِ عوام ہے۔

نویں امام حضرت محمد تقیؒ تھے، جو والد کی وصیت کے مطابق مسندِ امامت پر بیٹھے انھیں ۲۲۰ھ (۸۳۵ء) میں شہید کر ڈالا گیا اور وہ کاظمین میں دفن ہوئے۔

دسویں امام حضرت محمد تقیؒ کے فرزند حضرت علی نقیؒ تھے۔ آپ آٹھ برس کی عمر میں مسندِ امامت پر رونق افروز ہوئے اور ۲۵۴ھ (۸۶۸ء) تک فرائض انجام دیتے رہے اسی سال انھیں عراق میں شہید کر دیا گیا۔

گیارھویں امام حضرت حسن عسکری تھے۔ یہ لقب اس مقام سے انتساب کی بنا پر مشہور ہوا جہاں وہ پیدا ہوئے تھے۔ انھیں بھی ۲۶۰ھ (۸۷۳ء) میں شہید کر دیا گیا وہ سامرہ میں دفن ہوئے، جو بغداد سے نزدیک ہے۔ وہیں ان کے والدِ ماجد کو شہید کیا گیا تھا۔

گیارھویں امام کی شہادت کے بعد ان کا بیٹا جانشین ہوا۔ اس امام کے جو عدد کے اعتبار سے بارھویں تھے، متعدد القاب ہیں۔ عربی زبان کا مشہور ترین لقب امام زمان ہے۔ شیعوں کے نزدیک بارھویں امام کی ولادت ۲۵۵ھ (۸۶۹ء) میں ہوئی اور وہ اب تک زندہ ہیں، لیکن نظروں سے غائب ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ جب زمین ظلم و جور سے بھر جائے گی تو بارھویں امام ظاہر ہوں گے اور وہ دنیا کو عدل سے بھر دیں گے۔ دوسروں کی پیش گوئیاں بھی موجود ہیں۔

امام بن جانے کے بعد آپ کو علم ہو گیا کہ خلیفہ شہید کر دینے کے درپے ہے، اس وجہ سے آپ غائب ہو گئے، اسے "غیبت" کہتے ہیں۔ امام زماں کو دو مرتبہ غائب ہونے کی ضرورت پیش آئی۔ ایک مرتبہ تھوڑی مدت کے لیے، دوسری مرتبہ طویل مدت کے لیے۔ پہلی مرتبہ وہ اُنہتر سال غائب رہے اس زمانے میں چار بڑے شیعوں کی وساطت سے لوگوں کی رہنمائی فرماتے اور ان کے سوالات کا جواب دیتے چونکہ یہ غائب ہونا تھوڑے وقت کے لیے تھا اور اس

زمانے میں لوگوں کو سوالوں کے جواب بھی ملتے تھے۔ اس لیے اسے "غیوبتِ صغریٰ" کہ
ہے۔ جن اصحاب کی وساطت سے بات چیت ہوتی تھی، وہ سفیر یعنی خاص طور پر مقرر کیے ہوئے
نائب کہلاتے تھے۔ اس زمانے میں چار سفیر شیعوں کی رہنمائی کرتے تھے۔ چوتھے سفیر کے
یہ فرض لگایا گیا تھا کہ لوگوں کو امام کی جانب سے ایک مکتوب میں جسمانی موت کی خبر دے دے
امام نے فرمایا کہ جسمانی موت کے بعد کوئی شخص امام کی طرف سے سفارت کا حق دار نہ ہوگا اور
لمبی مدت کے لیے غائب ہو جائے گا یہی صورت پیش آئی۔

شیعہ اور سُنّی دونوں نے اپنی کتابوں میں بارہ اماموں کے اعلیٰ اوصاف اور پاکیزہ سیرت
ذکر کیا ہے شیعوں کا عقیدہ ہے کہ اوصاف و مناقب کے اعتبار سے وہ اپنے زمانے کے
آدمیوں پر فائق تھے۔ اُنھیں عظمت و رفعت عطا ہوئی تھی اور وہ کرامتیں بھی دکھا سکتے تھے
معصوم تھے۔ ہر امام کو اس کا پیش رو جانشین بناتا تھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے
اور تعداد دونوں کا ذکر فرمایا۔ انھوں نے اصل انسان اور یوم حشر کے متعلق اعلیٰ درجے کے
واضح ترین بیانات دیے۔ رسول اللہ صلعم کے بعد وہ دنیوی معاملات میں روش اور مذہبی امور
ہدایت کے سب سے بڑھ کر حق دار تھے۔

غیوبتِ کبریٰ! سنہ ۳۲۹ھ (سنہ ۹۴۰ء) میں چوتھے سفیر نے وفات پائی۔ پھر کوئی سفیر مقرر نہ ہوا
اگر کوئی شخص سفیر ہونے کا مدعی ہو تو مذہبی شہادت کی بنا پر سمجھنا چاہیے کہ اُ
دعویٰ باطل ہے۔ غیوبتِ صغریٰ میں جن چار آدمیوں کو سفیر مقرر کیا گیا تھا، اُن کے نام معلوم تھے
خاص سفیر مذہبی اصول سے واقف تھے یا نہ تھے، بلکہ انھیں علم بھی حاصل تھا یا نہ تھا، تاہم وہ امام کی
کے مطابق چلتے تھے اور مذہبی ضوابط و احکام میں اپنی خواہش کے مطابق کچھ کرنے کے مجاز نہ تھے امام کی موجودگی میں ہر شخص پر اُن کی
شیعوں کے لیے یہ جان لینا ضروری ہے کہ غیوبتِ کبریٰ میں اُن کے فرائض کیا ہیں اور کن
انھیں قوانین و ضوابط پر عمل کرنا چاہیے چونکہ اس مدت میں سفیر کوئی نہیں، لہٰذا شیعوں کے لیے
ضروری ہے کہ اپنے آپ کو ان مذہبی پیشواؤں کے رُوبرُو جواب دہ سمجھیں جو فقہ سے پوری طرح

...ف ہیں اور دین کو بہ درجہ کمال سمجھتے ہیں۔ حکم یہ تھا کہ غیوبت کبریٰ میں نا واقفوں کی رہنمائی قائم ہوں
...کے مذہبی افکار اور احکام کی بنا پر ہوگی جنھیں عوامی مندوب یا ایسے مندوب قرار دیا جاتا ہے جو بہ طور
...ص مقرر نہ کیے گئے ہوں جو فقہ جانتے ہوں۔ مذہب کی حفاظت کا فرض انجام دے سکتے ہوں
...طرح عوام کو گناہوں، خرابیوں اور دنیوی غرضوں سے بچائے رکھیں۔ ایسے نائب یا مندوب
...قیقی وسائل کا پورا علم رکھتے ہوں غیوبِ کبریٰ میں امام کے بدل ہوں گے اور ان کی پیروی
...ویسی ہی حیثیت حاصل ہوگی جیسی امام کی پیروی کو۔ شیعہ اعلیٰ درجہ کے عالموں ہی کو نائب مانتے
...اور ہر دور میں انھیں افراد کو نائب مانا گیا جو علم و فضل و زہد و تقویٰ میں بہت بلند پایہ تھے۔ مذہبی
...لات میں لوگ انھیں کی پیروی کرتے۔

...یعہ فرقے شیعہ انھیں کہا جاتا ہے جو حضرت علیؓ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بلا فصل خلیفہ سمجھیں، نیز حضرت علیؓ کے گیارہ اخلاف کو اسلام کے امام تسلیم کریں۔ جو بارہ
...وں کو مانتے ہیں، انھیں اثنا عشریہ کہا جاتا ہے اور شیعوں کی اکثریت کا عقیدہ یہی رہا ہے لیکن
...ند دوسرے فرقے بھی ہیں جو شیعہ کہلاتے ہیں کیونکہ وہ حضرت علیؓ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا
...فصل خلیفہ مانتے ہیں لیکن اُن میں سے بیشتر فرقے غیر معروف ہیں یا غائب ہو چکے ہیں البتہ تین کا
...ضروری ہے۔ ایک کیسانی، دوسرا زیدی، تیسرا اسمٰعیلی۔ ان میں سے آج کیسانیوں کا صرف نام باقی ہے
...ی بڑی زیادہ تر یمن میں ہیں۔ اسمٰعیلیوں کی اکثریت پاک و ہند میں ہے تھوڑے سے ایران اور افریقہ
...ں رہتے ہیں۔ کیسانیوں کا عقیدہ یہ تھا کہ محمد بن حنفیہ بھی ایک امام تھے وہ بنی حنفیہ کی ایک خاتون
...سے حضرت علیؓ کے بیٹے تھے۔ حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ حضرت فاطمہؓ کے بطن سے تھے۔
...ض کا عقیدہ یہ تھا کہ محمد بن حنفیہ کو حضرت علیؓ کے بعد بلا فصل امامت مل گئی۔ دوسروں کا عقیدہ یہ
...ہے کہ امام حسینؓ کی شہادت کے بعد وہ امام بنے۔ کہا جاتا ہے کہ سب سے پہلے حضرت علیؓ کا
...ک غلام کیسان اُن پر ایمان لایا۔ اسی کے نام پر فرقے کا نام مشہور ہوا۔ دوسرے گروہ کا بیان ہے
...کیسان اُس شخص کا نام تھا جس نے حضرت حسینؓ کی شہادت کا بدلہ یہ کہتے ہوئے لیا کہ میں یہ فرض

محمد بن حنفیہ کی طرف سے ادا کر رہا ہوں۔ بہرحال کیسانی فرقہ موجودہ زمانے میں کوئی اہمیت
رکھتا۔

زیدی چوتھے امام کے زمانے سے شیعوں کا ایک فرقہ چلے آتے ہیں۔ یہ زیادہ تر یمن
رہتے ہیں۔ ان کا ایک حصہ عراق اور افریقہ میں بھی ہے۔ زید امام محمد الباقر کے بھائی تھے۔ اُن کا عقیدہ
امام کے لیے سلطنت کا مالک ہونا ضروری ہے اور اسے اپنے حقوق کے لیے جہاد کرنا چاہیے
چنانچہ انھوں نے بنو امیہ کے خلاف بغاوت کی اور کوفہ کے قریب شہید ہوئے۔ زیدی پہلے
اماموں کو مانتے ہیں، بعد ازاں ان کا سلسلہ الگ ہو جاتا ہے۔

اسماعیلی حضرات اسمٰعیل کے پیرو ہیں جو چھٹے امام حضرت جعفر صادقؓ کے ایک فرزند
والد کو اُن سے بڑی محبت تھی۔ اگر وہ والد کی زندگی میں انتقال نہ کر جاتے تو ممکن ہے امام بن
بعض لوگوں نے کہا کہ اسمٰعیل کی اولاد کو امامت ملنی چاہیے، چنانچہ وہ لوگ یکے بعد دیگرے
ہی کی پیروی کرتے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس فرقے کے لوگ اسماعیلی کہلاتے ہیں۔ مصر
فاطمی خلافت کے بانی ہوئے اور آج اس فرقے کی معتد بہ حیثیت صرف پاک و ہند
ہے۔

صوفیہ شیعوں کے اندر کوئی جداگانہ اور منظم فرقہ نہیں، لیکن تصوف کا ذکر بدیں وجہ ضروری
کہ اس نے شیعہ افکار پر گہرا اثر ڈالا۔ بعض لوگوں کی رائے ہے کہ لفظ صوفی، صوف یعنی اونی کپڑے
سے نکلا ہے جو صوفیوں کا عام لباس تھا۔ دوسروں کی رائے ہے کہ اس سے اشارہ بصیرت
کی پاکیزگی کی طرف ہے۔ اغلب ہے یہ یونانی سیلان کے لفظ سوفوسؔ سے نکلا جو عربی زبان میں د
ہو گیا اور اس سے مقصود ایک خاص قسم کی عقل و بصیرت تھی جو صوفیہ کو حاصل
تھی۔

صوفیہ کا عقیدہ یہ ہے کہ انسان تزکیہ باطن اور ذہنی ضبط و نظم کے ذریعے سے حقیقت

ل دنہ الجدید ی بمعنی عقل و بصیرت

می و یقینی سراغ پاسکتا ہے اور اسے منطقی دلائل سے کام لینے کی ضرورت نہیں رہتی۔
کہتے ہیں کہ فلسفی جو کچھ عقل و دانش کے ذریعے سے حاصل کرتے ہیں، صوفیہ کو اس کا ادراک وجدان
کے ذریعے سے ہو جاتا ہے۔ یہ تصوّف صرف اسلام تک محدود نہیں بلکہ بہت سی دوسری حضارتوں
میں بھی پایا جاتا ہے۔ اسلام میں پہلی صدی ہی سے ایسے اصحاب کا ظہور شروع ہو گیا تھا جو تصوّف
کے ذریعے سے لوگوں کی رہنمائی کرتے تھے مثلاً حضرت حسن بصریؒ۔ رفتہ رفتہ تصوّف نے مخلص
لطے اور قاعدے، خاص رسمیں اور زہد و عبادت کے خاص طریقے پیدا کر لیے۔ شیعہ سُنّی دونوں
میں تصوّف کے مختلف سلسلے جاری ہو گئے۔

صوفیہ کے تمام سلسلے نہیں، مگر ان کی خاصی بڑی تعداد حضرت علیؓ تک پہنچتی ہے۔ جو لوگ
حضرت علیؓ کا خاص احترام کرتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ اسلام کے پوشیدہ معنی بھی تھے ان کا عقیدہ ہے کہ
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کے یہ بھید حضرت علیؓ پر منکشف کر دیے تھے اور حضرت علیؓ
نے وہ بھید ان لوگوں کو بتا دیے جو انھیں سننے اور قبول کرنے کے لیے تیار تھے۔ تصوّف کے
تنوع اور صوفیہ کے سلسلوں پر زیادہ بحث و مطالعہ کی ضرورت ہے تاکہ اُن کے اتحاد و اختلاف کی
حقیقت واضح ہو سکے اور یہ معلوم ہو جائے کہ اسلام میں انھوں نے کتنا اہم کردار ادا کیا۔

ایران میں ایک بہت بڑے صوفی شیخ صفی الدین تھے جن کے آبا و اجداد سُنّی چلے آتے
تھے جب انھوں نے موقع پایا تو اپنے اعتراضات کا ذکر کیا اور شیعہ ہو گئے۔ شیخ صفی الدین کا بیٹا شاہ
اسمٰعیل تھا جس نے ایران میں صفوی خاندان کی حکومت کی بنیاد رکھی اور شیعیت کو ملک کا سرکاری مذہب
بنایا۔

یعہ ایران میں

ایرانی ایک پرانی حضارت کے مالک تھے۔ انھیں ایسی تہذیب عطا ہوئی تھی
جو گوناگوں خوبیوں سے مالامال تھی۔ وہ منطق، فلسفے اور دوسرے علوم عالیہ
سے آگاہ تھے۔ اس حالت میں وہ اسلام کی تعلیمات سے آشنا ہوئے۔ آہستہ آہستہ انھوں نے
مذہب کے مقاصد ذہن نشین کیے اور عقلی معیاروں کے مطابق ان کا جائزہ لیا تو یہ حقیقت پا لی کہ

اس کے ذریعے سے وہ درجۂ کمال اور حقیقی راحت حاصل کر سکتے ہیں۔ چنانچہ وہ اسلام قبول
لگے۔ انھوں نے بانیِ اسلام کے حالات کی چھان بین کی۔ آپ کی نیکیوں اور اعمالِ حسنہ، نیز قواعد
کے متعلق سب کچھ دریافت کر لیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رشتہ داروں، دوستوں اور جان
کے متعلق بھی پورے حالات معلوم کیے تاکہ فیصلہ کر سکیں، کس نے آپ کی سیرتِ طیبہ اور تصورِ عد
کی حقیقی میراث پائی۔

اس مطالعے اور چھان بین کے نتیجے میں انھیں حضرت علیؓ کی حیثیت کا علم ہوا اور وہ حضرت
موصوف کی قیادتِ عالیہ کے معترف ہو گئے۔ چنانچہ انھوں نے اس امر پر اتفاق کر لیا کہ حضرت
ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانشینی کے لیے ہر اعتبار سے موزوں تھے اور وہی اس
حق دار تھے۔ چنانچہ اہلِ ایران نے انھیں کی قیادت قبول کی اور خلوصِ صمیمِ قلب سے اُن کی
کرنے لگے۔ جن ایرانیوں کو وسیع آگاہی حاصل تھی، انھیں اسلام کے ساتھ دلچسپی پیدا
وہ جس قدر چھان بین کرتے گئے، حضرت علیؓ کی قدر و منزلت ان کی نظروں میں بڑھتی گئی۔ انھ
معلوم ہو گیا کہ حضرت علیؓ راست بازی اور تلاشِ حق میں سب سے بڑھے ہوئے تھے۔ جب
انھوں نے مذہب، علوم، اخلاق اور ایمان کے متعلق حضرت علیؓ کی تعلیمات پر نظر ڈالی، نیز
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے آپ کے قریبی رشتے اور رحم و مروت کا اندازہ کیا تو اُن کا
رجحان حضرت موصوف کی طرف ہو گیا۔ اس طرح وہ حضرت کے پیرو، معتقد اور مدّاح بن گئے

غیر عرب قومیں خصوصاً وہ جو تہذیب و حضارت اور مکمل فلسفے کی مالک تھیں، عرب
کے مقابلے میں حقیقت بینی کی صلاحیت رکھتی تھیں۔ اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ ان میں دوسری قوموں
اور قبیلوں کے خلاف تعصب نہیں تھا۔ حسد، غصہ، حرص و ہوس سے ان کے احسا
اندازہ کی قابلیتیں ماؤف نہیں ہوئی تھیں۔ وہ حق کے طالب گار تھے اور جذبات انھیں

[1] ظاہر ہے کہ ایرانیوں کی پرانی حضارت نیز منطق، فلسفے اور علومِ عالیہ سے آگاہی اور سب سے آخر میں
کردہ چھان بین کسی بھی درجے میں وہ حیثیت نہیں رکھتی جو مصنف نے اسے دے دی ہے۔

حق رسی سے روک نہیں سکتے تھے۔

عرب حضرت علیؓ سے پوری طرح آگاہ تھے۔ یہ بھی جانتے تھے کہ انھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خاص قرب حاصل ہے نیز اُن کا ایمان بڑا پختہ ہے۔ انھیں یہ بھی علم تھا کہ وہ مسلسل رسول اللہ صلعم کے ساتھ رہے اور خاص تربیت حاصل کی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کی خدمات قربانیوں، نیکیوں، سخاوت، شجاعت اور دوسرے اعلیٰ اوصاف کا بھی ذکر فرمایا تھا۔ یہ تمام حقائق اُن کو معلوم تھے لیکن ان کے دلوں پر حسد، تعصب، خود غرضی، رقابت اور عداوت کا تاریک پردہ پڑا ہوا تھا حضرت علیؓ کے خلاف اُن کی دشمنی اس لیے بڑھ گئی کہ شاید ہی کوئی عرب گھرانا ہو جس کے چند افراد اسلام کی خاطر جہاد میں حضرت علیؓ کی تلوار کا نوالہ نہ ہوئے ہوں، مثلاً امیر معاویہؓ کے بعض رشتہ دار بدر کی لڑائی میں حضرت علیؓ کے ہاتھ سے مارے گئے تھے۔ یہ امر بھی خاص توجہ کا محتاج ہے کہ عرب اپنے آپ کو تمام قوموں سے بالاتر سمجھتے تھے اور حضرت علیؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح سب کے ساتھ یکساں برتاؤ کے حامی تھے۔ عرب، غیر عرب اور حبشی سب سے انھوں نے انصاف کا برتاؤ کیا تھا۔[1]

ان وجوہ کے پیش نظر امید تھی کہ اہل مصر اور اہل شام بھی ایرانیوں کے طرزِ عمل کی پیروی کریں گے کیوں کہ وہ مکہ معظمہ سے دور تھے لیکن یہ نہ ہوا۔ وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ امیر معاویہؓ اور عمرو بن العاص حضرت علیؓ کے سخت مخالف تھے اور انھوں نے عوام کو حضرت موصوف کی عظمت کا اندازہ ہی نہ کرنے دیا اور ان کی خواہش تھی کہ خود ان ملکوں کے حاکم بن جائیں۔ امیر معاویہؓ نے بالخصوص حضرت علیؓ کے متعلق حقیقتِ حال کا اندازہ عوام کو نہ کرنے دیا، بلکہ غلط فہمیاں بھی پھیلائیں۔

---

[1] مقالہ نگار نے عربوں کے متعلق بڑا انتہا جو کچھ لکھ دیا ہے اس کے غیر مناسب ہونے میں شاید ہی کسی کو کلام ہو تمام عرب کبھی حضرت علیؓ کے خلاف ہوئے نہ حضرت علیؓ نے ہر عرب گھرانے کے افراد قتل کیے اور نہ مساوات کا وہ تصور کبھی کسی غیر عرب کے دماغ میں پیدا ہوا جسے عربوں نے بہ تمام و کمال عمل کا لباس پہنایا، چونکہ فاضل مقالہ نگار پورا موقف سرسری ہے، اس لیے اُن کے قلم سے ایسی تحریر نکلی۔

اس کے برعکس ایران میں حضرت علیؑ، اُن کے فرزندوں، دوستوں اور پیروؤں کو احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ فاضل ایرانیوں نے پہلی صدی ہی میں کتابیں تصنیف کیں اور خاندان رسالت کے متعلق مذہبی افکار نشر کیے۔ چوتھی صدی ہجری کے وسط میں آل بویہ ایران کے ایک حصے کے حکمران بن گئے اور انھوں نے رسماً شیعیت کی حمایت کی۔ محمد خدا بندہ تاتاری اپنے لیے ایک سرکاری مذہب منتخب کرنا چاہتا تھا۔ اُس نے اسلام کے چاروں فقہی دبستانوں کی چھان بین کی، ان کے اکابر سے گفتگو کرتا رہا لیکن مطمئن نہ ہوا کیونکہ ہر دبستان نے ایک دوسرے کی خامیاں ظاہر کیں۔ پھر اُس نے ایک شیعہ عالم کو حکم دیا کہ شیعوں کی تعلیمات کے متعلق بحث کرے، وہ شیعہ مذہب کی خوبیوں کا قائل ہو گیا اور اسی کو اس نے سرکاری مذہب بنا لیا۔ دسویں صدی ہجری کے آغاز (سولھویں صدی عیسوی) میں شاہ اسمٰعیل نے صفوی خاندان حکومت کی بنیاد ڈالی اور شیعیت کو ایران کا سرکاری مذہب قرار دیا۔ آج بھی ایرانی دستور میں یہ روایت قائم ہے کہ شیعیت ہی ایران کا سرکاری مذہب ہے۔

شیعی عقائد

اسلام شیعوں سے دو قسم کے واجبات کا متقاضی ہے ——— بڑے مذہبی اصول پر اعتقاد اور مذہب کے خاص واجبات کے مطابق عمل۔ بڑے مذہبی اصول وہ ہیں جن پر عمل لازم اور مطلوب ہے۔ خاص مقصود وہ قواعد و ضوابط اور قانون ہیں جنھیں از روے ایمان تسلیم کیا جائے اور اُنھیں رہنماے عمل بنایا جائے۔

مذہب کے بڑے اُصول

ہر شیعہ کو ان پانچ بڑے اصول اور ارکان سے آگاہ ہونا اور ان پر ایمان رکھنا چاہیے، یعنی توحید باری تعالیٰ، عدلِ الٰہی، رسالت، بارہ امام اور یوم حشر۔

شیعی عقیدے کے مطابق اللہ تعالیٰ نے ہر چیز پیدا کی اور اسے زندگی بخشی اور ہر چیز اُسی کی طرف لوٹ جائے گی۔ اللہ اپنی صفات میں کامل ہے اور اس میں کوئی نقص نہیں۔ وہ علیم و قادر اور کافی ہے۔ اُس سے پہلے کوئی چیز موجود نہ تھی اور وہ اوّل ہے۔ ہر چیز نے اُس سے وجود

لی صرف اُس کی ذات کے لیے ہے۔ وہ اُس وقت بھی باقی رہے گا جب ہر چیز فنا ہو جائے گی۔
خالق کی ایک خاص صفت وحدت اور یگانگی ہے یعنی وہ وحدہٗ لاشریک ہے۔ وہ اپنی ذات میں یگانہ
، اُس کی ذات وصفات میں دوئی کو کوئی دخل نہیں۔ اُس کی صفات بھی ذات ہی ہیں، کیونکہ وہ یگانہ ہے۔
غرض خدا کی صفات دو قسم کی ہیں ایجابی جن کا اثبات کیا جاتا ہے اور سلبی جن کی نفی کی جاتی ہے
بی صفات یہ ہیں کہ خدا علیم ہے، قدیر ہے، وہ سراپا عزم ہے، وہ بصیر ہے، سمیع ہے، کلیم
، حق ہے۔ سلبی صفات یہ ہیں کہ خدا کسی چیز سے مرکب نہیں۔ اسے دیکھا نہیں جا سکتا۔ اُس کا کوئی
ن نہیں۔ اُس کا کوئی شریک نہیں۔

عدل الٰہی کے عقیدے کا مطلب یہ ہے کہ خدا عادل ہے۔ اس نے دنیا کے تمام
ں کو درجۂ کمال حاصل کرنے میں ایسے طریق پر لگا دیا ہے کہ ہر موجود ٹھیک اپنی جگہ قائم ہے۔
کائنات کی روشنی میں ہر چیز اپنی جگہ عیب سے پاک ہے۔ خدا نے دنیا پیدا کی اور بہ درجۂ کمال
ف بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ اس میں انحراف نہیں ہوا۔ آخرت کی زندگی میں نہ کسی سے بے انصافی
ی نہ کسی پر ظلم ہوگا۔ غرض اس دنیا میں جو کچھ کرتا ہے، عالم آخرت میں اس کی جزا یا سزا پائے گا
ما نیکیاں کرے گا، انھیں کے مطابق آئندہ زندگی میں اُسے جزا ملے گی۔ اگر وہ دنیا میں بُرے
رے گا تو بے شبہہ اُن کی سزا پائے گا اور اپنے اعمال کا تلخ ذائقہ چکھے گا جیسا کہ قرآن مجید
واضح طور پر بیان کر دیا گیا ہے۔ غرض اصول عدل کے مطابق خدا ہر شخص کے اعمال کا جائزہ
ے گا۔ جن لوگوں نے مذہب کے عین مطابق زندگی بسر کی، انھیں آئندہ زندگی میں جزائے خیر دے
یعنی انھیں روحانی فائدے پہنچیں گے۔ روحانی خوشیاں حاصل ہوں گی اور دائمی شادمانی میں رہیں
ے۔ لیکن جن لوگوں نے اہوا و اغراض کی پیروی کی وہ دائمی سزا پائیں گے۔ روحانی و ذہنی تکلیفیں
پائیں گے۔

انبیا اور نبوت کا مفصل ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔ نبی وہ ہیں جو طبعی صلاحیتوں، عبادتوں،
الٰہی اور خدمتِ حق کی بنا پر تکمیل کی بلند ترین منزل پر پہنچ جاتے ہیں۔ خدا کی طرف سے ان پر

برکات نازل ہوتی ہیں اور انجام کار انھیں مخلوق کی رہنمائی کا منصب دے دیا جاتا ہے
تمام صفات عالیہ میں عام انسانوں سے مختلف ہوتا ہے۔ اس قسم کی صفات کسی انسان میں پیدا
ہوجاتی ہیں۔ نبی کی ایک صفت یہ ہے کہ وہ معصوم ہوتا ہے یعنی اس کا دامن ہر خطا سے پاک
نبی سے کبھی کوئی برا کام سرزد نہیں ہوتا۔ وہ حق و صداقت پر عمل پیرا رہتا ہے۔ ہمیشہ اسے خدا
رہتی ہے۔ خدا کی رضا کے مطابق زندگی بسر کرتا ہے۔ روح کی پاکیزگی اسے ودیعت ہو
اور اُس کی معصومیت میں کمی کے لیے کلام کی گنجائش نہیں ہوتی۔ شیعوں کے عقیدے
مطابق حضرت ابراہیمؑ حضرت موسیٰؑ حضرت عیسیٰؑ اور تمام دوسرے پیغمبر معصوم تھے۔ پیغمبر
بھی معصوم تھے۔ اگرچہ آباؤ اجداد معصوم نہ تھے، تاہم وہ خدا کے عبادت گزار، پاکباز اور شریف
شیعوں کے عقیدے کے مطابق پیغمبر اسلام نے جو کچھ فرمایا اور جو کچھ کیا، وہ عین خدا کے
مطابق تھا اور یہ سب کچھ اُن پر الہام ہوا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی کوئی کام
سے نہ کیا۔

شیعوں کا چوتھا بڑا اصول یہ ہے کہ بارہ اماموں پر ایمان لایا جائے۔ امام کے لغوی م
اور قائد کے ہیں۔ دوسرے اسلامی فرقوں میں یہ اصطلاح اُن لوگوں کے لیے مستعمل
جنھیں مذہب و علوم میں درجۂ استنباط حاصل ہوتا ہے اور وہ پیشوا مان لیے جاتے ہیں
کو امام کہا جاتا ہے لیکن شیعوں کے نزدیک اس لقب کا خاص مفہوم ہے اور یہ صرف
کے لیے مستعمل ہے۔ کوئی شخص کتنا ہی بڑا عالم اور کتنا ہی عظیم القدر ہو، مگر شیعہ اس کے
امام کا لقب استعمال نہیں کرتے۔

شیعوں کے نزدیک امام وہ ہے جو علم کے تمام دائروں خصوصاً مذہبی علوم میں
پہنچا ہوا ہو۔ وہ نہایت اعلیٰ اوصاف سے مزین ہو، ساتھ ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف
ہو اور خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے لوگوں کی ہدایت کے لیے مقرر کیا ہو۔ پیغمبر اور امام
فرق یہ ہے کہ پیغمبر تمام مذہبی احکام الہام کے ذریعے سے حاصل کرتا ہے اور امام متع

ے لیتا ہے۔ امام کا فرض یہ ہے کہ لوگوں کو خدا کی رضا اور پیغمبر کی روایات کے مطابق

ہم دیکھ چکے ہیں کہ شیعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت علیؓ پر ایمان رکھتے ہیں جو
ند صلعم کے چچیرے بھائی اور داماد تھے اور جن کی تربیت رسول اللہ صلعم ہی نے
ی حضرت علیؓ اپنے زمانے کے سب سے بڑے متقی اور مذہبی اصول کے سب
ے عالم تھے۔ عہدِ طفلی ہی میں وہ خدا کی عبادت کرنے لگے تھے کبھی کوئی گناہ ان سے سرزد
۔ وہ معصوم تھے چونکہ ان میں نیکیاں ہی نیکیاں موجود تھیں، اس لیے رسول اللہ
علیہ وسلم نے کئی مرتبہ انھیں اپنا جانشین کہا اور انھیں امام کا لقب دیا حضرت علیؓ کے گیارہ
یکے بعد دیگرے ان کے جانشین بنے۔ انھیں امام اس لیے کہا جاتا ہے کہ ان میں
ان ہی نیکیاں موجود تھیں۔ ان سے بھی کوئی گناہ سرزد نہ ہوا اور وہ روحانی اعتبار سے
ے۔ دینی امور کے متعلق ان کی تعبیرات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت علیؓ کی تعبیرات کی
ی خدا کی مرضی کے مطابق تھیں ہر امام اپنا جانشین نامزد کرتا رہا، لہٰذا اس میں غلطی کا کوئی امکان

پانچواں بڑا اصول یہ ہے کہ یوم حشر پر ایمان لایا جائے۔ اس ایمان کا مطلب یہ ہے
نیا میں مرنے کے بعد ہر شخص عالم عقبیٰ میں زندہ ہوگا۔ وہاں ہر شخص کے اعمال تولے جائیں
ان کے مطابق بدلا ملے گا۔ اس دنیا میں ہر شخص کو عمل کرنا چاہیے اور اگلی دنیا میں اُسے
زا ملے گی۔ انسان یہاں کاشت کرتا ہے اور عالم عقبیٰ میں فصل کاٹتا ہے۔ جو شخص آسمانی
ی پیروی کرتا ہے اُس کے لیے آنے والی دنیا میں بہشت کے دروازے کھلے
گے۔ اگر وہ فرائض سے بے پروا رہتا ہے اور مذہبی احکام سے سرتابی کرتا ہے تو وہ دوزخ
ی عذاب و سزا پائے گا۔

قرآن کی متعدد آیتوں میں بہشت کی کیفیت بیان کی گئی ہے۔ یہ ایسا مقام ہے جہاں اچھے

کام کرنے والوں کو لامتناہی برکتیں، راحتیں اور الطاف و عنایات حاصل ہوں گی۔ قرآنِ مجید کے مختلف درجے بھی واضح کر دیے گئے ہیں مثلاً جن لوگوں نے اچھے کام کئے اور کے درجۂ اعلیٰ تک پہنچ گئے، اُن کا مقام بہشت میں ان لوگوں سے اونچا ہوگا جن سے تھوڑی بہت غلطیاں بھی سرزد ہوئیں۔

دوزخ بدعمل لوگوں کے لیے ہے۔ وہاں گناہ گار دائمی عذاب و سزا پائیں گے کی مصیبتوں، اذیتوں، تعذیبوں اور دائمی الم زدگیوں کا ذکر قرآن مجید میں بھی ہے اور رسول اللہ کے ارشادات میں بھی۔ دوسرے لوگوں نے بھی یہ سب کچھ بیان کیا ہے۔

بڑے اصول کا ذریعۂ علم

جس حد تک بڑے اصول کے علم کا تعلق ہے، ہر شخص کے لیے کی چھان بین اور اصول کے علم کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ اسی طرح انسان اور عدلِ الٰہی سے آگاہی حاصل ہوتی ہے۔ خدا نے ہر شخص کو عقل عطا کی ہے جس کی بنا پر اُسے معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ پہلے موجود نہیں تھا اور اب موجود اس وجود کا کوئی نہ کوئی سبب ہونا چاہیے۔ یا وہ خود سبب ہوگا یا کوئی اور سبب ہوگا۔ اگر اپنے وجود کا سبب ہے تو دو صورتیں ہو سکتی ہیں: یا تو اس وقت سبب بنا جب خود موجو یا وہ اپنے وجود کا سبب بننے سے پیشتر موجود تھا، حالانکہ یہ دونوں صورتیں ناممکن ہیں کیونکہ نہیں وہ موجود کا سبب نہیں بن سکتا اور اگر وہ موجود ہے تو اسے اپنے وجود کا سبب بننے ضرورت نہیں اور اگر کوئی دوسرا وجود انسان کے وجود کا سبب بنا تو اس کے تعلق میں بھی عد کی وہی صورت سامنے آئے گی جس کی کیفیت اوپر پیش کی جا چکی ہے لہٰذا نتیجہ یہ نکلتا جو چیزیں موجود نہ تھیں پھر وجود میں آئیں، وہ کسی ایسے سبب کا نتیجہ تھیں جو کسی دوسرے سبب محتاج نہ تھا اور وہی وجود کی علّتُ العلل ہے۔ وہ وجود عدم یا خلا سے پیدا نہ ہوا، لہٰذا وہ ہے اور وہی خدا ہے۔

اُس خلّاق وجود کے مظاہر ——— حیات، علم، قدرت اور عزم

...ت کی تخلیق میں نمایاں ہیں۔ یہ مسلّمہ عقلی اصول پر مبنی ہے۔ ہر چیز کو اس کی مناسب جگہ ملی ہے
... مقررہ وقت پر ہوتا ہے کائنات کا راز تخلیق کا بھید، ہر مخلوق کی ابتدا اور انتہا، یہ تمام چیزیں اس
... قرار دی گئی ہیں کہ کوئی فرد کائنات کے نظام کو اتفاقات کا نتیجہ قرار نہیں دے سکتا، لہٰذا ماننا
... کہ واجب الوجود کو مخلوق کا علم ہے اور جو صفات تخلیق میں نمایاں ہوئیں وہ ذاتِ باری تعالیٰ
... دائمی ہیں۔

... توحید اور عدلِ الٰہی کے اصول جاننے کا یہ ذریعہ ہر شخص کے لیے کھلا ہوا ہے۔ ہر شخص
... کا یہ راستہ اختیار کر سکتا ہے۔ اُسے جاننا چاہیے کہ وہ کہاں سے آیا اور اُ سے
... الوجود کو پہچاننا چاہیے، جو علیم و قدیر ہے، سراپا عزم، سراپا حکمت اور سراپا عدل ہے،
... نے انسان کو پیدا کیا۔

... مذہب کے بڑے اصول جاننے کے لیے مومن کو چاہیے کہ اصل وحدت اور اصل عدل
... سے وہ راحت کا طلب گار ہے، اسے معلوم ہو جائے گا کہ راحت کیونکر حاصل
... ہے کیونکر یقین دلا دیا گیا ہے۔ اللہ نے اسے عبث پیدا نہیں کیا۔ یہاں پہنچ کر انسان پر واضح
... ہے کہ خدا نے پیغمبر بھیجے، اُنھیں ایسا علم اور ایسی صلاحیتیں عطا کیں کہ انسانوں کو راحت و...
... کے اُس نصب العین کی طرف لے جائیں، جس کے لیے یہ تخلیق وجود میں آئی۔ اس طرح نبوت
... رت و حقانیت ہر شخص پر واضح ہو جائے گی اور مذہب کا تیسرا بڑا اصول مان لیا جائے گا۔

... پھر مومن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات سامنے رکھ کر عقلِ سلیم کی روشنی میں امامت
... حشر کے اصول کی تلاش کرے گا۔ چونکہ وہ عقل کی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ائمہ کے
... ات کو بنائے حق تسلیم کر لیتا ہے، لہٰذا وہ یوم حشر کی حقانیت کا قائل ہو جائے گا۔ یوں انسان
... ب کے پانچ بڑے اصول کی سچائی روشن ہو جائے گی۔

...ل مذہب میں اختلاف

عمومی نقطۂ نگاہ سے شیعوں اور سنّیوں کے درمیان چوتھے بڑے اصول یعنی امامت کے متعلق اتفاق نہیں اس لیے کہ شیعوں کے سوا...

کوئی اسلامی فرقہ امامت کو ایمان کا بڑا اُصول نہیں مانتا شیعوں کا عقیدہ ہے کہ امامت نبوت کی بنا پر قائم ہوئی اور لوگوں کی ہدایت کے لیے یہ ضروری ہے جس طرح اللہ تعالیٰ مذہب کی حفاظت کے لیے انبیا مقرر کرتا ہے، اُسی طرح امام مقرر کرتا ہے۔ اس کے برعکس سنّی کہتے ہیں کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے جانشین کا انتخاب عوام کی ذمہ داری ہے، وہ جس کو پسند کریں، جن لیں۔ ان کے نزدیک جو شخص چُنا جائے وہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانشینی کے فرائض انجام دے گا۔ مذہب کی حفاظت اُسی کے ذمے ہوگی اور لوگوں پر اُس کی اطاعت واجب۔

شیعوں، نیز سنّیوں کے بعض دوسرے فرقوں، خصوصاً اشعریہ اور معتزلہ کے درمیان اختلاف ہے۔ اشعریہ خدا کے لیے صفتِ عدل سے انکار کرتے ہیں۔ اصولِ عدل کے مطابق خدا نیکی کے کام کرنے والوں کو جزا اور بُرائی کے کام کرنے والوں کو سزا دے گا۔ اشعریہ کہتے ہیں کہ خدا چاہے تو گناہ گاروں اور دہریہ کو جزا دے دے اور چاہے تو نیکی کا کام کرنے والوں اور مومنوں کو عذاب دے دے۔ خدا جو چاہے، کرے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ خدا نیکیوں کو جزا اور بدوں کو سزا دیتا ہے، گویا اُن کے عقیدے کے مطابق یہاں علّت کا سلسلہ موجود نہیں۔ جو کچھ موجود ہے وہ صرف وقائع کا تواتر ہے جو خدا کی عبادت اور مرضی کے مطابق یکے بعد دیگرے وقوع پذیر ہے۔ اُس کے لیے علّت و معلول کا سلسلہ ماننا ضروری نہیں ہے۔

معتزلہ شیعوں کی طرح مانتے ہیں کہ عدل، اللہ تعالیٰ کی ایک بنیادی صفت ہے اور ہر شخص کو اس کے اعمال کا مناسب بدلا ملے گا۔

شیعوں کے عقیدے کے مطابق تمام صفات خدا کی ذات میں شامل ہیں۔ وہ اتفاقی نہیں بلکہ ذات کا جزو ہیں۔ خدا ایک ہے جو علم، قدرت، طاقت، عزم وغیرہ کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ اشعریہ کہتے ہیں کہ خدا کی آٹھ صفتیں ہیں یعنی حیات، علم، قدرت، عزم، کلام، سماعت، بصارت اور وجود۔ یہ سب صفات پہلو بہ پہلو موجود چلی آتی ہیں اور انھیں ذاتِ باری تعالیٰ سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔

سے پہلے کچھ نہ تھا وہ کہتے ہیں کہ اس کی ضد انسانوں کے تعلق میں درست ہے۔ مثلاً علم انسان
ایک صفت ہے۔ یہ اُس کے وجود میں شامل ہے۔ وہ اسے دی نہیں جاتی، بلکہ اُسے اتنا ہی
حاصل ہوتا ہے جتنا وہ سیکھتا ہے۔

لبعض اور معاملات بھی ہیں جن میں شیعوں کو اشعریوں سے اتفاق نہیں مثلاً اشعریہ کا عقیدہ
ہے کہ بہشت بھی ازل سے چلی آرہی ہے۔ یہ اُسی وقت سے موجود ہے جب سے کائنات
وجود میں آئی شیعہ اسے تسلیم نہیں کرتے۔

جبر و اختیار کے سلسلے میں شیعہ کو اشعریہ اور معتزلہ دونوں سے اختلاف ہے۔ انسان
جب سے وجود میں آیا، جبر و اختیار کے معمّے سے دوچار ہے۔ بلاشبہ انسان کو زندگی کی بعض
منزلوں سے بے اختیار گزرنا پڑتا ہے۔ مثلاً پہلے وہ باپ کے صلب میں تھا پھر ماں کے رحم میں
آیا اور آخر اُس نے اس دنیا میں قدم رکھا، لیکن سوال یہ ہے کہ جب وہ بالغ ہو جاتا ہے تو کیا
اس وقت آزاد و مختار ہوتا ہے؟ حلقہ بگوشانِ اسلام نے اس معمّے کے حل کی کوششیں کی ہیں۔
جبر یہ اختیار کے نتائج کے متعلق عقلی، آیاتِ قرآنی اور احادیث رسول اللہ صلعم سے شہادتیں پیش ہوتی رہیں اشعریہ
جبر کے معتقد ہو گئے، معتزلہ نے اختیار کا عقیدہ قبول کر لیا شیعہ کہتے ہیں کہ دونوں گروہوں کے دلائل ناکافی ہیں انھوں نے
درمیانی راہ اختیار کر لی اُن کا عقیدہ یہ ہے کہ یہاں نہ تو پورا جبر ہے اور نہ پورا اختیار۔ بلکہ دونوں کے بین بین ہے۔

مذہب کے واجبات مذہب کے خاص واجبات ان قواعد و ضوابط میں شامل ہیں جو افراد کی اور
اجتماعی بہبود کے لیے ہدایت نامے کے طور پر مقرر کیے گئے۔ انسانی
زندگی میں ایک لمحہ بھی ایسا نہیں آتا ہے اور ایک عمل بھی ایسا نہیں جس کے لیے اسلام نے کوئی
قاعدہ جاری نہ کر دیا ہو اور تمام مسلمانوں کا فرض ہے کہ ان قواعد پر ایمان لائیں اور عمل کریں انسان کے
نفس اپنے لیے (حقوق النفس) اور دوسروں کے لیے (حقوق العباد) واضح طور پر مذکور ہیں جب
بچہ والد کے صلب میں بالقوۃ اور والدہ کے بطن میں بہ صورت جنین ہوتا ہے تو اُس وقت بھی والدین
کے لیے طریقِ عمل کے لیے قواعد موجود ہیں۔ مثلاً والدہ کو کوئی نشہ آور شے استعمال نہ کرنی چاہیے

اور یہ بھی سکھایا جاتا ہے کہ بچہ پیدا کرنے کے لیے اختلاط کے ضوابط کیا ہیں، نیز والد کا فرض
جنین کی حفاظت کرے۔ جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو والدین کے ذمے فرض عائد ہو جاتا
اس کی تربیت کے خاص قواعد کی پیروی کریں، یہاں تک کہ وہ جسمانی لحاظ سے بلوغ کی
پہنچ جائے۔ پھر اسلامی قواعد کی پیروی خود اس کے ذمے عائد ہو جائے گی۔ اسلام
قواعد و ضوابط میں غذا، لباس، سونا، جاگنا، دوستی، دشمنی، سکوت و کلام وغیرہ
کے متعلق مناسب طریقِ عمل موجود ہے۔ یہ بھی بتا دیا گیا ہے کہ انسان کا فائدہ کن چیز
ہے۔ جب انسان اس دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے تو اسلام کے قواعد موجود ہیں جن
کے ساتھ زندہ متعلقین کو اسے دفن کرنا چاہیے۔

مذہب کے خاص تقاضوں کا تعلق عبادات، معاملات، انفرادی عہد و پیمان او
سے کے عملی قواعد سے ہے۔

عبادات میں وہ تمام مذہبی اعمال شامل ہیں جو انسان کو خدا تک پہنچا دیتے ہیں۔ ان
کی پابندی کسی جذبے یا ذاتی خواہش کی بنا پر نہیں، بلکہ انسان کی تکمیل کے لیے ضروری
اس نقطۂ نگاہ سے عبادت میں نماز، روزہ، خمس، زکوٰۃ، حج، جہاد، امر بالمعروف اور نہی عن
شامل ہیں۔ عمومی لحاظ سے کہا جا سکتا ہے کہ اسلام کے تمام قواعد و ضوابط میں ان آٹھ
کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے کیونکہ یہی راحت و اطمینان حاصل کرنے کا وسیلہ ہیں۔ عقل ان قواع
کی مصدّق ہے اور جو کچھ عقلِ سلیم کے مطابق ہو، وہ مذہب کے نزدیک مطلوب ہے،
بعض اعمال ایسے بھی ہیں، جن کے فائدوں اور مضرتوں کا صحیح اندازہ عقل اور فہمِ عامہ نہیں
سکتے۔ اس وجہ سے ایک ایسی سند کی ضرورت ہے جو رہنمائی کا حق ادا کر سکے۔ اس غر
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کے لیے قواعد و ضوابط بنائے۔

نماز چوبیس گھنٹے میں پانچ مرتبہ ہر اس فرد پر واجب ہے جو بالغ ہو اور صاحبِ عقل
ہو۔ شیعوں کے نزدیک لڑکی دس سال اور لڑکا پندرہ سال کی عمر میں بالغ ہو جاتا ہے

ازوں کے خاص قواعد وضوابط ہیں، مثلاً لباس اور جسم پاک وصاف ہونا چاہیے۔ نماز کے لیے
ڑے ہونے سے پیشتر وضو ضروری ہے۔ نماز ادا کرنے کی جگہ ایسی نہ ہونا چاہیے، جسے قوت
ے بل پر غصب کر لیا گیا ہو۔ ادائے نماز کے وقت منہ مکہ معظمہ کی طرف رہنا چاہیے۔ اسی
رح نماز کے دوسرے آداب ہیں۔ ایک نماز صبح کے وقت طلوعِ آفتاب سے پہلے ادا ہونی چاہیے،
سری بعد دوپہر، تیسری شام سے پہلے، چوتھی بعد غروب آفتاب۔ پانچویں نماز سونے سے پیشتر
ہونی چاہیے۔

پانچوں نمازوں کا مقصد و مدعا یہ ہے کہ انسان خدا کی طرف متوجہ ہو۔ روح کے لیے معرفت
ی روشنی حاصل کرے اور خدا کے قرب میں راحت و تکمیل کا جویا ہو۔ جس شخص کا جسم پاک وصاف
گا اور وہ دن میں پانچ وقت خدا کی باقاعدہ عبادت سے روح کے لیے روشنی کا سامان بہم
نچاتا رہے گا، یقین ہے کہ وہ اسلامی احکام کے مطابق کاربند رہے گا۔ اس سے ہمیشہ اچھے
م انجام پائیں گے، بُرے کبھی انجام نہ پائیں گے۔ ایسے انسان کے جسم و روح اس دنیا
ور آئندہ دنیا میں ترقی کی منزلیں طے کریں گے اور جس معاشرے میں ایسے افراد کی کثرت ہوگی،
کمیل کے راستے پر بڑھتا چلا جائے گا۔

رمضان کے مہینے میں روزہ اسلام نے ہر عاقل و بالغ مسلمان پر فرض قرار دیا ہے۔ صبح کی
بتدائی روشنی نمودار ہونے کے وقت سے غروب تک نہ اُسے کھانے پینے کی اجازت ہے،
جنسی اختلاط کی۔ روزہ جسم و روح دونوں کے لیے فائدہ مند ہے۔ اس سے فرد بھی فائدہ اٹھاتا
ہے اور معاشرہ بھی۔ یہ اس دنیا کے لیے بھی نفع بخش ہے اور آئندہ دنیا کے لیے بھی، مثلاً
وزہ رکھنے والے کی قوتِ ارادی مستحکم ہو جاتی ہے، کیونکہ وہ عزم کے ساتھ ایک خاص وقت کے
لیے کھانے پینے سے باز رہتا ہے۔ روزہ اُس کے دل میں ہم جنسوں کے لیے ہمدردی کا
ذبہ ابھارتا ہے۔ روزہ دار زیادہ پرہیزگار اور نکوکار بن جاتا ہے۔ اُس کی روح منوّر اور جسم گناہوں
سے پاک رہتا ہے۔ اگر وہ دولت مند ہے تو غریبوں سے اُس کا گہرا تعلق قائم ہو جائے گا۔ یہ

تعلق معاشرے کے لیے مفید ہوگا کیونکہ دولت مند کی جائیداد کا کچھ حصہ غریبوں میں تقسیم ہوگا۔
اس امر پر خوش ہوں گے کہ مذہب نے ایک خاص وقت کے لیے امیروں کو بھی شادمانی سے
دیا ہے۔ روزے کے اور بھی بہت سے فائدے ہیں جو اسلام میں مسلّم ہیں۔

زکوٰۃ و صدقات تمام اسلامی فرقوں کے نزدیک فرض ہیں، لیکن جس طرح شیعوں میں ان
ہوتا ہے، وہ دوسرے فرقوں کے عمل سے مختلف ہے۔ شیعوں کے نزدیک زکوٰۃ و صدقہ
کی دو صورتیں ہیں، ایک خمس، دوسری زکوٰۃ۔ خمس کا مطلب یہ ہے کہ شیعہ اپنی جائدادوں میں سے
حصہ الگ کرتے ہیں۔ اس میں سونا، چاندی، قیمتی اشیاء، مالِ غنیمت اور کاروبار کے فائدے
ایک خاص حصہ سب کچھ شامل ہوتا ہے۔ شیعہ یہ خمس امام یا خاندانِ سادات کے حوالے کر دیتے
زکوٰۃ نہیں لیتے۔ امام اپنے حصے کی رقم جس طرح چاہے، استعمال کرے۔ خاندانِ رسالت
افرادِ ضرورت مند ہوں، وہ اس روپے کو ذاتی مصارف میں لا سکتے ہیں۔ خمس کا مدعا یہ ہے کہ خاندان
کے اُن افراد کی دیکھ بھال ہوتی رہے جو آنکھوں سے معذور ہیں یا بوڑھے ہیں اور کام نہیں کر
مقصد یہ ہے کہ بھیک مانگنے کی نوبت نہ آئے اور ان کی خودداری کو صدمہ نہ پہنچے۔ امام
رقم کو عوام کی تعلیم، ضرورت مندوں کی امداد اور اجتماعی حالات کی اصلاح کے لیے بھی استعمال کر
ہے۔

دوسری صورت زکوٰۃ ہے یعنی ایک خاص درجے کے دولت مند کے لیے آمدنی کا
دینا جس میں سونا، چاندی، مویشی اور ایک خاص مقدار کی فصل بھی شامل ہے۔ زکوٰۃ غریبوں
اور قرضوں کی امداد کے لیے ہے، نیز اُن لوگوں کی امداد کے لیے، جو مسلمان نہیں لیکن اُن سے
اسلام کی امید ہے۔ یا وہ کسی نہ کسی شکل میں اسلام کے لیے معاون بن سکتے ہیں۔ زکوٰۃ کا روپیہ
میں بھی صرف ہو سکتا ہے۔ مثلاً درس گاہوں، پلوں، تالابوں وغیرہ کی تعمیر کے لیے۔

حج کی غرض سے مکہ معظمہ کا سفر ہر مسلمان پر فرض ہے جس کے پاس مناسب خرچ موجود
اور وہ سفر کر سکے۔ جو فرائض وہ مکہ معظمہ میں انجام دیتا ہے، اُن کا عام نام حج ہے اور یہ فرض

والاحاجی کہلاتا ہے۔ حج کا ایک اجتماعی فائدہ ہے کہ ہر سال دنیا کے ہر حصے سے مسلمان
ام پر جمع ہوتے ہیں۔ وہاں دولت مند اور عالم مبادلۂ خیال کرتے ہیں اور ایک دوسرے سے
ریق حیات اور باشندوں کے متعلق حالات پوچھتے ہیں۔ اس طرح دنیائے اسلام کے
حصوں کی ضرورتیں سامنے آجاتی ہیں۔ دوست و دشمن کا پتا چل جاتا ہے اور ہر ضرورت کو
نے کے لیے ان میں تعاون کی صورتیں نکل آتی ہیں۔ ابتدائی دور میں حمل و نقل کے وہ وسائل
تھے جو اب جا بجا مہیا ہو گئے ہیں۔ اس زمانے میں یہ مذہبی مرکز بطور خاص اہم تھا۔ آج بھی
ں کو اتحاد و اختلاف میں مشترکہ زندگی بسر کرنے کا درس دیتا ہے۔ مکہ معظمہ میں حج کے علاوہ
لی ایک بڑی تعداد کربلا، نجف، مشہد، قم اور ایسے دوسرے مرکزوں کی زیارت کے لیے
ہے۔ یہ سب کچھ حضرت علیؓ اور ائمہ کے احترام میں کیا جاتا ہے۔ یہ زیارتیں فرض نہیں لیکن لوگ
سے جانتے ہیں کہ حضرت علیؓ اور ان کے اخلاف کا حقِ احترام ادا ہو اور ایمان کو تقویت پہنچے
مہ کا سفر بہت طویل ہے اور مذکورہ بالا مقامات کی زیارت بہ آسانی ہو سکتی ہے۔

جہاد بھی خاص حالات میں مسلمانوں پر فرض ہے۔ ہر مسلمان کو چاہیے کہ کافروں، بت پرستوں
منوں سے لڑے، اسلام کی حفاظت کرے، اسلامی ممالک کی حدیں بڑھائے اور اسلام
م دوسرے مقامات پر پہنچائے۔ شیعوں کا عقیدہ یہ ہے کہ اگر امام موجود نہ ہو اور کسی خاص
کا انتظام بھی نہ ہو تو جہاد فرض نہیں رہتا، تاہم اگر دشمن حملہ کرے اور کوئی اسلامی ملک خطرے
جائے تو ہر مسلمان کا فرض ہے کہ اس کی حفاظت کے لیے لڑے۔

عبادت میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر بھی شامل ہیں۔ ہر شخص اپنے لیے اور دوسروں
لیے ذمہ دار ہے۔ ہر شخص کو چاہیے کہ دوسروں کو نیک کاموں کے لیے ابھارے اور
ے کاموں سے روکے۔

جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں عبادات کے علاوہ مذہبی فرائض میں معاملات، عہد و پیماں اور روش
ی اصول بھی شامل ہیں۔ وہ آدمیوں کے مابین زبانی یا تحریری جو عہد و پیماں ہوتا ہے جن

کے متعلق خاص ضابطے ہیں جن کی پابندی کرنی چاہیے جب دو فریق معاہدے کے متعلق الفاظ زبان سے ادا کر دیتے ہیں تو معاہدہ پختہ ہو جاتا ہے اور ہر فریق کا فرض ہے کہ اس کے ایفا میں کوتاہی نہ کرے، البتہ اگر مقررہ شرطوں میں واضح طور پر گنجائش موجود ہو تو معاملہ دوسرا ہے۔ معاہدات انسانی تعلقات کے بہت سے پہلوؤں پر حاوی ہیں مثلاً کرایہ داری، شادی، خرید و فروخت وغیرہ۔

معاہدے کی ایک شکل یہ بھی ہے کہ اس کا تعلق تو دو آدمیوں سے ہو لیکن کسی ایک کے چند الفاظ کہہ دینے پر وہ ختم ہو جائے۔ مثلاً طلاق، اقبالِ جرم، حلف۔

عملی قواعد میں انفرادی اعمال بھی شامل ہیں اور اجتماعی بھی، مثلاً میراث، گواہی، سیاسی و معاشی زندگی کے ایسے ہی دوسرے متعدد پہلو۔ ان میں اسلامی فقہ کے وہ تمام قواعد آجاتے ہیں جو مذہبی فرائض کی دوسری شقوں میں نہیں آئے۔

عملی واجبات معلوم کرنے کا ذریعہ

مذہب کے خاص واجبات و فرائض معلوم کرنے کے دو طریقے ہیں اوّل اجتہاد، دوم تقلید۔ جو لوگ اجتہاد کا طریقہ استعمال کرتے ہیں، وہ بحث و مذاکرہ، تحقیق و تفتیش اور عقل و بصیرت سے کام لے کر انفرادی تعبیر کے ذریعے سے حقیقت معلوم کر لیتے ہیں۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ حقیقت معلوم کرنے کے لیے معتمد علیہ علما کے پاس پہنچا جائے۔ یہ بھی درست ہے کیونکہ جو اس طریقے کی پیروی کرتے ہیں، وہ بہرحال مستند ذریعہ معلومات سے استفادہ کرتے ہیں غرض ان ذریعوں سے مذہب کے قواعد و ضوابط ذہن نشین کر لینا ممکن ہے، ساتھ ہی خاص حالتوں میں ان کا مناسب اطلاق بھی واضح ہو جاتا ہے۔

ان دو ذریعوں سے مذہب کے خاص واجبات تو معلوم ہو جاتے ہیں، لیکن مذہب کے بڑے اصول پر ایمان کے لیے یہ طریقے کام نہیں دے سکتے۔ مذہب کے اصول ہر شخص کو ذاتی علم اور غور و فکر سے دریافت کرنے چاہئیں، اور خدا کی عبادت، اُس کی صفات کی معرفت

اللہ پر ایمان، رسالتوں اور یوم حشر پر ایمان کسی کی اندھی تقلید پر موقوف نہ رہنا چاہیے۔ ہر
شخص کے لیے لازم ہے کہ حقیقت معلوم کرے اور اس پر ایمان لائے۔

اس کے برعکس یہ ضروری نہیں کہ ہر فرد اسلام کے احکام و ضوابط پر غور کرے اور اپنے
فہم کے مطابق ان پر عمل پیرا ہو بلکہ اگر کسی مستند مذہبی عالم نے ذاتی مطالعے سے ان احکام و ضوابط
کو معلوم کر لیا ہے تو باقی لوگوں کے لیے یہ بس کرتا ہے کہ خود مطالعے کی مشقتوں میں سے گزرے بغیر
اس کی پیروی کرتے رہیں۔ اسلام کے احکام و ضوابط قرآن نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ائمہ
کے ارشادات عوام تک پہنچے، لہٰذا جس شخص میں مذہبی قائد بننے کے ممکنات موجود ہیں، وہ ان
سرچشموں کا علم حاصل کرنے کے لیے کوشاں ہوتا ہے اور عوام کے لیے ان سے خاص
احکام اخذ کرتا ہے۔ وہ ان قوانین پر عمل پیرا ہو کر اسلام کے لیے مثال چھوڑ جاتا ہے۔ ایسے عالم
کو مجتہد کہتے ہیں اور جو اس کی پیروی کرتے ہیں، وہ مقلد کہلاتے ہیں۔

مذہبی قائد مذہب کے پانچ اصول اور بارہ اماموں پر ایمان رکھتے ہیں۔ بارھویں امام کو
غائب مانتے ہیں، البتہ مذہبی قوانین کی تعبیر میں انھیں اختلاف ہو سکتا ہے۔ مجتہدوں کا ایک گروہ
قوانین کے متعلق فہم و تعبیر کے لیے قرآن مجید اور دوسرے اہم ذرائع نیز عقل کو بنیاد بناتا
ہے۔ دوسرے گروہ کے نزدیک روایات بنیاد ہیں۔ پہلے گروہ نے فقہ کے اصول بغرض رہنمائی
کے لیے اور قانونی اعمال کا طریقہ ملحوظ رکھا، دوسرے گروہ نے صرف روایات اور کلی شہادتوں
کو رہنما بنا دیا۔

شیعوں کے نزدیک خاص مذہبی فرائض و احکام کے چار سرچشمے ہیں: اوّل قرآن،
دوم سنت، سوم اجماع، چہارم قیاس۔ مذہبی قوانین کی ترتیب کے لیے ہدایت کا پہلا سرچشمہ
قرآن ہے اور قرآن میں محکم اور متشابہ دونوں شامل ہیں۔ اسی سے معلوم کیا جا سکتا ہے کہ مقررہ
حالات میں کون سا فعل و عمل نیک اور مستحسن ہو گا۔ اگر قرآن سے کچھ معلوم نہ ہو سکے گا تو سنت کی
جانب توجہ کی جائے گی۔ اگر دونوں میں کچھ نہ مل سکے گا تو مذہبی رہنماؤں کے اجماع یعنی عمومی

اتفاق کو دیکھا جائے گا۔ بعض اوقات کسی ایک معاملے میں اتفاق کی نوبت نہیں آتی، اس مو
قیاس کے سوا چارہ نہیں رہتا۔ چنانچہ قیاس بھی مذہبی اصولوں میں فیصلے کا ایک ذریعہ ہے
مذہبی احکام کے ان چار سرچشموں کو مانتے ہیں اور جو لوگ مذہبی احکام روایات سے اخذ کر
ہیں، وہ استقرائی یا استنباطی استدلال کے بجائے قیاس و تمثیل پر انحصار رکھتے
جب مذہبی قوانین ان چار سرچشموں سے اخذ کر لیے جاتے ہیں تو پھر بھی غلط فہم
باقی رہتا ہے، کیونکہ لوگوں کی فہم و عقل یکساں نہیں۔ شیعوں اور سنیوں کے درمیان
اختلاف ان چار سرچشموں کی مختلف تعبیرات کا نتیجہ ہیں۔ جب حضرت علیؓ خلیفہ تھے اور
ان کے ہاتھ میں تھی، اس وقت بھی ان سرچشموں کے متعلق تعبیر کے اختلاف ہو جا
یعنی سب لوگ حضرت علیؓ کی پیروی نہیں کرتے تھے، البتہ شیعہ ضرور حضرت کی
پر کاربند تھے۔ اسلام کے ابتدائی قرون میں اسلامی دنیا کے اندر مذہبی احکام کے پانچ د
ہو گئے۔ چار سُنّی —— حنبلی، مالکی، شافعی اور حنفی —— پانچواں شیعہ
بعض اوقات چھٹے امام کے اسم گرامی پر جعفری کہتے ہیں۔
شیعوں کا عقیدہ یہ ہے کہ عملیات کے لیے قوانین بناتے وقت رسول اللہ کے
کی حرفاً حرفاً پیروی ضروری ہے۔ حضورؐ نے فرمایا: "میں تم میں دو چیزیں چھوڑے جا رہا ہ
ایک قرآن دوسری عترت جو تمھیں سیدھا راستہ دکھائے گی۔ شیعہ رسول اللہ کے ان اعمال
اور مواعظ کو تسلیم کرتے ہیں، جو حضور کے نواسوں کے ذریعے سے پہنچے نہ کہ دوسر
کے ذریعے سے۔ بنو امیہ کے ماتحت اماموں کو کھلم کھلا تعلیم دینے کی اجازت نہ تھی۔ جب
بر سر اقتدار آئے تو چھٹے امام کو اسلام کے احکام اور مذہب کی تفصیلات بیان کرنے
حاصل ہوئی۔ چنانچہ آپ نے بہت بڑے گروہ کو تعلیم دی۔ ان لوگوں نے آپ کی تعلیما
ایک کتاب کی شکل میں مرتب کر لیں۔ یوں شیعی فقہ کی بنیاد پڑی۔ چھٹے امام اور دوسرے آئمہ
تعلیمات سے چار سو اصول دور حاضر کے شیعوں تک پہنچے ہیں۔ قرآن مجید کے بعد ان

ذہب میں بنیادی حیثیت حاصل ہے۔
بارسو اصول ہر شخص نہیں سیکھ سکتا تھا اور اندیشہ تھا کہ یہ کہیں ضائع نہ ہو جائیں، لہذا قابلِ اعتماد
نے جنھیں مذہبی قیادت کا درجہ حاصل تھا۔ مناسب سمجھا کہ ان اصول کی تلخیص کر دیں
سے بہ سہولت فائدہ اٹھایا جا سکے۔ چوتھی اور پانچویں صدی میں ان چارسو اصول کو چار
میں مدوّن کر دیا گیا تھا جو شیعی احکام کی بنیاد ہیں۔ یہ بڑی خوش نصیبی کی بات تھی، کیونکہ
چارسو اصول، تقریباً سب کے سب گم ہو گئے۔ چوتھی صدی کے اوائل میں بارہویں
غیبتِ کبریٰ سے پیشتر ایک فاضل تھے جن کا نام محمد ابن یعقوب الکلینی (وفات
یہ، ۹۴۰ء) اور ان کا لقب محافظِ اسلام تھا۔
انھوں نے پہلی کتاب کے مرتب کی حیثیت میں بہت شہرت پائی۔ اس کتاب کا نام "کافی"
دوسری کتاب ایک اور جلیل القدر عالم محمد ابن علی بابویہ القمیؒ (وفات ۳۸۱ھ / ۹۹۱ء)
کی جس کا نام "من لایحضرہ الفقیہ" ہے۔ تیسری اور چوتھی کتابیں "تہذیب الاحکام"
استبصار" ہیں۔ یہ محمد ابن حسن الطوسی (وفات ۴۶۰ھ / ۱۰۶۷ء) کی تصنیف ہیں۔
یہ چار کتابیں جو جلیل القدر مذہبی علماء نے مرتب کیں شیعی فقہ کی بنیاد ہیں۔ شیعہ قرآنِ مجید
انھیں کو مذہبی احکام کا سرچشمہ مانتے ہیں۔

فرائض کے ... اختلافات

اسلام کے ان پانچ فقہی دبستانوں میں تعبیر کے اختلافات ہیں لیکن
یہ جان لینا چاہیے کہ شیعوں کو چار سنّی دبستانوں سے اُن قوانین
کے متعلق زیادہ اختلافات ہیں جو قرآن و سنّت، مذہبی اکابر
اجماع اور انفرادی تعبیرات سے اخذ کیے جاتے ہیں۔ مثلاً اگرچہ بعض فرقے قیاس کو
قوانین کا ایک صحیح ذریعہ تسلیم کرتے ہیں، شیعہ قیاس کی بنا پر اخذ کردہ نتائج کو حتمی اور قطعی نہیں

شیعہ روایات کو مذہبی ضوابط کا سرچشمہ مانتے ہیں، لیکن وہ ہر قسم کی روایات کو قبول نہیں

کرتے بلکہ صرف ان روایات کو مانتے ہیں جو خاندانِ رسالت کے ذریعے سے پہنچیں
نیز ان علماء نے ان کی تعبیر کی جو خاندانِ رسالت کو سند مانتے تھے۔ احادیث کی جو کتابیں
نے مرتب کیں شیعہ انھیں مستند نہیں مانتے۔ شیعہ یعنی دوازدہ امامی شیعہ کو اسلام کے
فرقوں سے اجتہاد میں بھی اختلاف ہے۔ شیعہ کا عقیدہ یہ ہے کہ ہر شخص کے لیے
میں سند بن جانے کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ مومن مذہبی قواعد و ضوابط کا مطالعہ کر سکتا
متعلقہ سرچشموں کے مطالعے اور عقل کے استعمال سے خاص حالات میں قواعد کے
کے لیے معلومات حاصل کر سکتا ہے۔ وہ اپنے فہم کے مطابق اسلامی قواعد ذہن نشین
سکتا ہے۔ اور وہ دوسروں کی پیروی پر مجبور نہیں۔ ہر شخص واضح اور معیّن حالات
ماتحت قرآنِ مجید، سنّتِ اجماع اور عقل سے اپنے لیے ضابطے نکال سکتا ہے۔
سنّیوں کے چار دبستانوں میں اجتہاد کی اجازت نہیں۔ مقلد کے لیے لازم
کہ وہ مذہبی پیشواؤں کے احکام پر پورے اہتمام سے عمل کرے، مثلاً حنفی حضرات
کے ارشادات کے پابند ہیں جو بارہ سو سال سے بیشتر گزرے ہیں، خواہ ان کا ارشاد صحیح ہو
نہیں اور مذہبی احکام کے ابتدائی سرچشموں یعنی قرآن و حدیث کے مطالعے کی اجازت نہیں
حضرت ابو حنیفہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک سو سال بعد ہوئے اور آپ نے رسول
صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات براہِ راست نہیں سُنی تھیں، نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی یہ فر
فقہی معاملات میں تعبیر کا حق دار صرف ابو حنیفہ ہے۔ دوسرے کسی شخص کو ان کے ارشادات
تعصب کا حق نہیں اور نہ وہ لوگوں کو کسی ترمیم شدہ اصول پر عمل کی دعوت دے سکتا ہے، اگر
وہ حضرت ابو حنیفہ سے زیادہ عالم ہو۔ ہر شخص کو بہر حال ابو حنیفہ ہی کی پیروی کرنی چاہیے
تبصرہ دوسروں کے تعلق میں بھی یکساں مؤثر ہے۔
شیعہ اصول کے مطابق مذہب میں شخصی ذمہ داری یعنی اجتہاد کا دروازہ ہر مسلمان کے لیے
کھلا ہوا ہے جس شخص کی قوتِ فیصلہ اچھی ہو۔ وہ ابتدائی سرچشموں سے مذہب کے خاص اطلاقات

سکتا ہے۔ مذہبی واجبات کے دائرے میں شیعہ اور سنی کے درمیان اختلاف کا بڑا نکتہ ہے۔

ام بہ حیثیت معاشرہ اسلام نے اپنے احکام میں انسانوں کے درمیان مساوات، اخوت اور دوستی کی بنیاد استوار کی۔ اسلام کے مطابق کسی دوسرے پر ترجیح نہیں مگر تقویٰ اور علم کی بنا پر۔ اپنے بڑے مذہبی اصول کے مطابق ہر شخص سے امید رکھتا ہے کہ وہ خدا کو قدیر، علیم، حیّ و قیّوم مان کر اطمینانِ قلب کا سامان کرے۔ انسان جو کچھ ہے خدا کا بنایا ہوا ہے اور جو کچھ وہ حاصل کرتا ہے، خدا سے حاصل ہے۔

اسلام ہر شخص سے ہر مقام پر برابر اخلاقی محاسن کا طلب گار رہتا ہے اس کا تقاضا یہ ہے کہ ہم جنسوں سے محبت رکھے، حق کی تلاش میں رہے، شجاع، وفاکیش، دیانت دار، شریف، باز، عادل اور قابلِ اعتماد بن جائے۔ اسے چاہیے کہ بد اخلاقی سے دور رہے کسی کے سے درُوی سے پیش نہ آئے۔ جھوٹ نہ بولے، غداری نہ کرے، فریب، حسد اور سے اجتناب کرے، جانوروں کو بھی نقصان نہ پہنچائے۔ اسلام افراد کے درمیان کسی کا روادار نہیں۔ طبقاتی امتیاز کے بھی وہ حق میں نہیں عرب، ترک، عزبی، شرقی، شمالی، سب اُس کی نگاہوں میں یکساں ہیں۔ سب لوگ بھائی بھائی ہیں۔ اسلام چاہتا ہے کہ دنیا کے آدمی ایک دوسرے کے ساتھ مہربانی سے پیش آئیں۔ ایک دوسرے کی مدد کریں خوت کے ذریعے سے راحت حاصل کرلیں اور رتبۂ تکمیل پر پہنچ جائیں۔ اسلام انسانوں درمیان صرف ایک برتری کو تسلیم کرتا ہے اور وہ علم و تقویٰ کی برتری ہے۔ متقی اور اہلِ علم کی نگاہوں میں بلند تر ہیں۔

اسلام یہ حقیقت ذہن نشین کرنا چاہتا ہے۔ کہ دنیا عارضی ہے۔ ہم اس جگہ سے گزرتے ے عالمِ عقبیٰ میں پہنچیں گے۔ یہاں ہم فصل بوتے ہیں اور اگلی دنیا میں کاٹتے ہیں۔ انسان

کو چاہیے کہ اس دنیا کی ظاہری حیثیت سے مسحور نہ ہو۔ یہاں حقیقی راحت نہیں ہو سکتی۔ وہ صرف اگلی دنیا میں حاصل ہو سکتی ہے۔ اس دنیا کی اصلاح انسان کا حقیقی نصب العین نہیں ہو سکتا۔ یہ نصب العین ہے کہ کسی تہذیب کو تقویت پہنچائی جائے یا دنیا کے مادی پہلوؤں کی تعمیر پر وقت صرف کیا جائے حقیقی نصب العین یہ ہے کہ عالم عقبیٰ کی فلاح کے لیے کام کیا جائے جب تک انسان اس حقیقت کا احساس نہ کرے گا، وہ اسی دنیا میں تکلیفیں اور مشقتیں اٹھاتے اٹھاتے پورا وقت صرف کر دے گا اور اس دنیا کو چھوڑے گا تو ہاتھ خالی ہوں گے۔ دل امید کی روشنی سے محروم ہو گا۔ احساس یہ ہو گا کہ زندگی برباد ہوئی اور کوئی قابل ذکر چیز حاصل نہ ہو سکی عقل و فہم جانتے ہیں کہ انسان اس دنیا میں مسافر ہے اور وہ دائمی تکمیل کے راستے پر چلا جا رہا ہے بگوشِ اسلام کی زندگی ایسی ہونی چاہیے کہ انسان کو حقیقی منزل مقصود کی طرف لے جائے اگر انسان اس دنیا کی بے حقیقتی کے خطرے سے اپنے آپ کو بچا لے، اُن مشکلات سے باہر نکل جائے، جن کا جال اس نے مکڑی کی طرح اپنے آپ پر تن لیا ہے۔ اگر وہ اپنی حقیقی فطرت سے آگاہ ہو جائے! جان لے کہ انسان کی بہتری اور بہبود کس میں ہے تو عالم عقبیٰ کی جھلک وقتاً فوقتاً اُسے نظر آتی رہے گی اور وہ اپنی مقدر منزل مقصود کی طرف کو کاری سے بڑھتا چلا جائے گا۔ اگر اس وقت اکابرِ مذہب کی سیرتوں پر غور کرے گا اور یہ سوچے گا کہ وہ کس طرح منزلِ مقصود پر پہنچے تو وہ حقیقی اسلامی اصول کا پابند ہو جائے گا نیز بہ صمیم قلب پیغمبر اسلام اور ان کے حقیقی اخلاق کی پیروی کرے گا۔

چھٹا باب

اسلامی ثقافت عرب اور افریقہ میں

(اُستاذ اسحاق، ایم، حسینی)

اسلامی ثقافت کے نشوو ارتقا میں بہت سے اثرات کارفرما رہے ہیں۔ مثلاً:

۱- ان مسلمان گروہوں اور قوموں کا باہم دگر یہ اثر جن کے جغرافیائی اور نسلی پس منظر بالکل مختلف تھے۔

۲- ابتدائی دور میں یونان، ایران اور ہندوستان کی تہذیبوں کے زبردست ثقافتی اثرات۔

۳- دورِ حاضر میں مغربی یورپ کی تہذیب کے اثرات۔

عباسی حکومت کے سنہری دور میں قدیم اسلامی ثقافت نشوو ارتقا کی اعلیٰ منزل پر پہنچ گئی پھر ... طرح زوال کا دور شروع ہو گیا جس طرح یونانی، چینی اور ایرانی ثقافتوں پر پہلے طاری ہو چکا تھا۔ ... اسلامی ثقافت کو قدیم اسلامی ثقافت سے گہرے روابط حاصل ہیں لیکن دورِ قدیم اور دورِ حاضر ... کے درمیان تنزل واضح اور بدیہی تھا کہ موجودہ ثقافت کو قدیم ثقافت کے سلسلہ کی ارتقائی کڑی ... نہیں سمجھا جاتا۔ یہ سمجھا جاتا ہے کہ پرانی ثقافت کو از سرِ نو زندہ کرنے کی کوشش کی گئی اور اس ... دورِ حاضر اور مغربیت کے بھی بہت سے اوضاع شامل کر لیے گئے۔ بدقسمتی سے گزشتہ ڈیڑھ ... سال کے احیار کا دائرہ بہت محدود رہا، اس لیے کہ بہت سے اسلامی ملک سیاسی اور ... اقتصادی پابندیوں کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے اور انھیں ثقافتی سرگرمیوں میں تخلیقی جد داری ... موقع حاصل نہ تھا جو ماضی کے شاندار دور میں مسلمانوں کی خصوصیت رہی تھی۔

تاہم اس باب اور آئندہ ابواب میں ہم اسلامی ثقافت پر بحیثیت مجموعی بحث نہیں کریں گے

ہمارا مدعا صرف یہ ہے کہ اس خاص مذہبی ثقافت پر غور کریں، جو قرآن مجید، رسول اللہ صلعم کی احادیث
اور ان دو بنیادی سرچشموں کی مختلف تعبیرات سے پیدا ہوتی ہے۔ بے شک ہم یہاں عرب ملکوں
اور افریقی ملکوں کی اسلامی ثقافت پر بحث کرنا چاہتے ہیں، لیکن یہ حقیقت پہلے ہی واضح کر دینی
چاہیے کہ مسلمانوں میں مذہبی اعتبار سے جو اختلافات پائے جاتے ہیں، اُنھیں ہمارے نزدیک
جغرافیائی ماحول یا تہذیبوں کے اختلاف سے کوئی تعلق نہیں، وہ مسلّمہ فرقہ وار اختلافات کا نتیجہ
ہیں۔ لبنان کے دروزی، مصر کے سُنّیوں سے جو اختلاف رکھتے ہیں وہ قرآن یا رسول اللہ
کی احادیث کے باب میں تعبیرات کے اختلاف کا نتیجہ ہے، اس امر کا نتیجہ نہیں کہ دروزی ان
کے مقابلے میں مختلف ثقافتی یا جغرافیائی ماحول میں مقیم ہیں۔ بلاشبہ مسلمانوں میں فرقہ وار اختلافات ہیں،
لیکن عرب کے مسلمان یا عجم کے مسلمان جغرافیائی یا ثقافتی اختلاف کی بنا پر الگ الگ نہیں۔

افریقہ کی عربی دنیا میں مصر، سودان، لیبیا، تونسیہ، الجزائر اور مراکش شامل ہیں۔ ان ممالک کا رقبہ
قریباً تیس لاکھ مربع میل ہوگا اور آبادی چار کروڑ نوّے لاکھ کے لگ بھگ ہے۔ ان علاقوں
سے باہر بھی افریقہ میں دو کروڑ اسی لاکھ مسلمان بستے ہیں، جنھیں کہیں کہیں اکثریت حاصل ہے اور
مقامات پر وہ اقلیت میں ہیں۔ گھانا کے سوا اُن سب پر استعماری طاقتیں مسلط ہیں۔

ایشیا کی عربی دنیا جزیرہ نمائے عرب، عراق اور لیوانٹ[1] پر مشتمل ہے۔ پورے رقبے کا
حصہ دولتِ سعودیہ عربیہ نے گھیر رکھا ہے۔ اُس کی آبادی ساٹھ لاکھ کے قریب ہوگی۔ اس
جنوب اور مغرب میں سلطنتِ یمن واقع ہے اس کی آبادی چالیس لاکھ ہے، جنوب اور مشرق
چھوٹی چھوٹی امارتیں اور سلطنتیں ہیں، اُن میں بھی بیس لاکھ کے قریب مسلمان آباد ہیں، لیوانٹ
اردن، فلسطین، شام اور لبنان واقع ہیں، ان کی اسلامی آبادی پچاس لاکھ سمجھنی چاہیے
ہی آبادی ہمسایہ ملک عراق کی ہے۔

---

[1] Levant یہ اطالوی لفظ ہے جس کے معنی ہیں سرزمینِ مشرق جدھر سے سورج نکلتا ہے رومی اسے بحیرہ روم کے
مشرقی ساحل کی سرزمین کے لیے استعمال کرتے تھے یعنی شام، لبنان، فلسطین وغیرہ کے لیے۔

اس طرح عربی اور افریقی علاقوں میں دس کروڑ سے زیادہ مسلمان موجود ہیں۔ اور وہ ایسی سرزمینوں
سے ہیں جنھیں جنگی نقطۂ نگاہ سے انتہائی اہمیت حاصل ہے اور ان سرزمینوں میں تیل کے
اندازہ ذخیرے موجود ہیں جو ان کی آئندہ بہبود اور پوری دنیا کی بہتری کا سرچشمہ ہیں۔

اسلام پہلے پہل جزیرہ نمائے عرب کے اُس مغربی علاقے میں نمودار ہوا جسے
۔۔۔نمائے عرب حجاز کہتے ہیں، اُس کا سرچشمہ مکہ تھا پھر مدینہ مرکزِ محور بن گیا۔ حجاز کو سرزمین
۔۔۔تے ہیں، اس لیے کہ اُس میں کعبہ واقع ہے، جہاں ہر سال لاکھوں حاجی پہنچتے ہیں۔
۔۔۔ہی منیٰ اور عرفات ہیں، ۹ ذی الحجہ کو عرفات کے میدان میں قیام کیا جاتا ہے ۱۰ کو منیٰ میں قربانیاں
۔۔۔تی ہیں۔ اس پر حج مکمل ہو جاتا ہے، بعد ازاں بہت سے لوگ مدینہ منورہ پہنچتے ہیں۔ حج صرف
۔۔۔ پر فرض ہے جن کے پاس اس فرض کے ادا کرنے کا خرچ موجود ہو، لیکن ہر مسلمان انتہائی
۔۔۔ش کرتا ہے کہ اُسے فریضۂ حج کی تسکین حاصل ہو، ادائے حج کے بعد "حاجی" کا لقب
۔۔۔ے ساتھ شامل ہو جاتا ہے[1]۔ جزیرہ نمائے عرب کے اس چھوٹے سے حصے کو اسلامی دنیا
۔۔۔ہمیت حاصل ہے اُس کا مقابلہ کوئی دوسرا خطہ نہیں کر سکتا۔

جب بنی امیہ نے مرکزِ حکومت مدینے سے دمشق منتقل کر لیا تو جزیرہ نمائے عرب کا
۔۔۔ اور ذہنی مرکز بھی باہر چلا گیا، عباسیوں نے بغداد کو اپنا مرکز بنا لیا جو دمشق کے مقابلے میں حجاز
۔۔۔ سے بھی دُور تھا، اُس وقت سے بغداد ہی کو سیاسی، علمی اور ادبی سرگرمیوں کے مرکز کی حیثیت
۔۔۔ ہو گئی اگر حج کا سلسلہ جاری نہ رہتا تو حجاز اپنی مذہبی اہمیت بھی کھو بیٹھتا۔

دار الحکومت منتقل ہو جانے کے بعد سے جزیرہ نمائے عرب میں کوئی اہم واقعہ پیش نہ آیا،
۔۔۔ لکہ وہابیت کی تحریک پیدا ہوئی اور چند سال بعد اُس نے جزیرہ نما کی مرکزی سطح مرتفع
۔۔۔ سلطانوں میں اُستواری حاصل کر لی، یعنی وہابیت ہی اُن کا مذہب بن گیا (۱۱۵۷ھ، ۱۷۴۴ء

[1] یہ لقب غالباً مغلوں اور مطوفوں نے رائج کیا۔ اس سے پہلے ضروری نہ تھا جس طرح نماز ادا کرنے والا یا روزہ رکھنے والا نمازی
۔۔۔روزہ دار نہیں کہلاتا۔ حج کرنے والا کیوں حاجی کہلائے؟

اور اب تک وہ لوگ وہابیت ہی کے پابند ہیں جیسا کہ دوسرے باب میں واضح کیا جا چکا ہے
کی تحریک ابن تیمیہ کی تعلیمات سے پیدا ہوئی تھی۔ ابن تیمیہ وہ مصلح اور مجدد تھا جس نے اسلامی
تفرقہ و انتشار کی قوتوں سے نجات دلا کر متحد کرنے اور اجنبی اقدامات کے مقابلے پر جم کر کھڑے
کا سر و سامان کیا تھا۔ اس نے فقہا کے تعصب اور صوفیوں کی بدعات دونوں کو رد کیا اور
کی کہ اسلام کا ارتقائی دور صالحیت بحال ہو جائے اور مسلمان اپنی روزانہ زندگی کو قرآن و سنت
مطابق بنا لیں۔

جزیرہ نمائے عرب اور اس پاس کے علاقوں میں حالات ایسے تھے کہ محمد ابن عبدالو
کو ابن تیمیہ کی بعض تعلیمات پر بہت زیادہ زور دینا پڑا۔ اس نے سب سے پہلے توحید کو شرک
پاک کرنے کی کوشش کی۔ اس کے نزدیک شرک یہ تھا کہ لوگ انبیا اور بزرگوں کے مقا
احترام ایسے انداز میں کرتے تھے جو عبادت سے مختلف نہ تھا۔ وہابیوں کے نزدیک یہ احت
پرستی اور ستارہ پرستی کے برابر تھا جسے اسلام نے خدا سے سرکشی و بغاوت قرار دیا اور اس
یہ حد درجہ سنگین گناہ بن گیا چنانچہ وہابیوں نے ایسے تمام مقبرے منہدم کر دیے اور خود رسو
صلی اللہ علیہ وسلم کے روضہ اطہر کے سامنے ایسے اعمال کو روکا جو شرک کی حد تک پہنچے

محمد ابن وہاب نے یہ اعلان بھی کیا کہ محض کلمہ شہادت یعنی اشہد ان لا الہ الا اللہ و
ان محمداً رسول اللہ کافی نہیں، اس کے ساتھ عبادت اور دوسرے احکام کی پیروی بھی لازم ہے
اور زکوٰۃ کو جان بوجھ کر ترک کرنا کفر ہے۔ اس عقیدے کی بنا پر وہابیوں میں ایک گروہ پیدا ہوا ج
محتسب کہتے تھے۔ وہ اپنا فرض سمجھتے تھے کہ تمام مسلمانوں سے مذہبی فرائض کی تعمیل کرائیں
اس فرض کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر مبنی قرار دیتے تھے۔ انھوں نے شراب نو
قمار بازی کا بھی سختی سے انسداد کیا بلکہ تمباکو پینے کی بھی شدید مذمت کی۔

محمد ابن عبدالوہاب کا عقیدہ یہ تھا کہ قرآن مجید کلام باری تعالیٰ ہونے کی بنا پر قدیم اور غیر مخلوق
یہ کلام خدا کی طرف سے آیا اور خدا کی طرف لوٹ جائے گا حضرت جبریلؑ نے جس طرح

سے سُنا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچادیا۔ محمد بن عبدالوہاب یہ بھی کہتا تھا کہ مسلمانوں کو
ی اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اُن تمام احادیث پر عقیدہ رکھنا چاہیے جن کا تعلق حشر، اعمال کی جزا و سزا
سے ہے کسی مجتہد کے استنباط یا پیش کردہ رائے کی بنا پر صحیح حدیث کو نظر انداز نہیں
سکتا اور ایسی کوئی رائے قبول نہیں کی جاسکتی جب تک کتاب و سنّت سے اُس کی تائید نہ
ئی نیا خیال یا قول پیش نہیں کیا جاسکتا جو چار اماموں یعنی خلفائے راشدین کی طرف سے
۔ وہابی ان تمام صفاتِ باری تعالیٰ پر پختہ عقیدہ رکھتے ہیں جن کا ذکر قرآن میں آیا ہے، نہ تو اُن
ی تعبیر کرتے ہیں جس سے صفات محض نشان رہ جائیں اور نہ انھیں مادّی صورت دیتے ہیں،
یہ تعطیل کو گوارا کرتے ہیں نہ تجسیم کو۔

ایمان کی اساسات کے متعلق وہابیوں کی تعلیمات کا یہ خلاصہ ہے۔ باقی رہے مذہب کے
وص تقاضے تو ان کے تعلق میں وہ حنبلی فقہ پر عمل کرتے ہیں جو قرآن اور حدیث کے مطابق
اور قیاس کو درست نہیں سمجھتے۔ ساتھ ہی وہ دوسرے ائمہ فقہ کی تصریحات کو ممنوع قرار
دیتے۔ وہابی شیعی فقہ کے منکر ہیں اور قبائلی قوانین کو ترجیح دینے کو موجب کفر سمجھتے ہیں۔
ن تمام بدعات کے شدید مخالف ہیں جو صوفیوں نے یا انتہا پسند شیعوں نے رائج کیں، یہاں تک
دالتوں میں اُن کی شہادت قبول نہیں کرتے اور اُن کے ساتھ شادیوں سے انکار کرتے ہیں۔

وہابیوں میں ایک گروہ ایسا بھی تھا جو اس سلسلے میں حد سے آگے نکل گیا وہ لوگ ہر نئی چیز کے مقابلے میں چٹان کی طرح کھڑے
تے تھے مثلاً دورِ حاضرہ کی تہذیب میں جو مفید اور نفع بخش ایجادات ہوئیں ان کے بھی مخالف تھے۔ ملک عبدالعزیز ابن سعود نے انھیں

یادہ ملکِ مرحوم کا مسلک دانش مندی اور اعتدال پر مبنی تھا اور وہ دورِ حاضر کی ایجادات
ے مناسب استفادے کے حامی تھے ابتدا میں وہابی جہاں پہنچتے تھے ہر مسلمان سے
لبہ کرتے تھے وہابیت قبول کرلو۔ آہستہ آہستہ وہ مسلک اعتدال پر آگئے اور اپنے سے
لاف رکھنے والوں کے تعلق میں بھی رواداری کا برتاؤ شروع کر دیا یہاں تک کہ تبلیغ کوششی کی
لعت بھی باقی نہ رہی۔ اس طرح مسلمان مزید انتشار سے محفوظ ہو گئے۔ اب وہابیوں کو ایک جداگانہ

فرقہ نہیں بلکہ مسلمانوں کا ایک قدامت پسند اور آرتھوڈکس گروہ مانا جاتا ہے، جن کا عقیدہ قرآن و حدیث پر مبنی ہے اور جو قول و عمل دونوں کے ذریعے سے مظاہرِ ایمان کے قائل ہیں اور جن کا مقصد یہ ہے کہ اسلامی قانون کے مطابق اسلامی حکومت قائم کی جائے۔

جزیرہ نمائے عرب کے مسلمانوں کی اکثریت سُنّی ہے۔ خواہ وہ سب وہابی ہوں یا نہ ہوں۔ دو گروہ مستثنیٰ ہیں ایک یمن کے زیدی اور دوسرے عُمان کے خارجی۔ اسلام سے پیشتر یمن کو العرب المیمونہ یعنی عرب آبادان کہتے تھے، اس لیے کہ یہ خطہ جزیرہ نمائے عرب کے دوسرے بنجر حصّوں کے مقابلے میں زیادہ خوش حال تھا۔ مارب کا بندِ آبپاری دنیا کے قدیم ترین بندوں سے پرانا بند ہے۔ یہ آج بھی اس امر کی شہادت پیش کر رہا ہے کہ یمن نے تہذیب و تمدن میں اعلیٰ درجہ حاصل کر لیا تھا۔ وہاں بارش بھی خوب ہوتی ہے، پہاڑ بھی کثرت ہیں، جن میں وادیاں، پانی کے چشمے اور بے شمار ندیاں ہیں۔ یہ تمام وسائل کھیتی باڑی کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ یمن اپنی بلند عمارتوں کے لیے بھی مشہور ہے۔ یہودیوں کے سوا جو صنعاء میں مقیم ہیں تمام باشندے خالص عرب اور پیروانِ اسلام ہیں۔ اِن میں سے خاصی بڑی اکثریت زیدی شیعوں کی ہے، باقی سُنّی ہیں اور امام شافعیؒ کی فقہ کی پیروی کرتے ہیں۔ زیدی پہاڑی خطّوں میں رہتے ہیں۔ اُنھوں نے اپنی نسل مخلوط نہیں ہونے دی۔ سُنّی ساحلی علاقوں میں تقسیم ہیں اور وہ اہلِ افریقہ سے شادیاں کرتے رہے ہیں۔

یمن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک ہی میں اسلام کا حلقہ بگوش بن گیا تھا۔ تیسری صدی ہجری میں زیدی فرقہ اُس امام کے ذریعہ سے یمن میں داخل ہوا جو عراق سے آیا تھا۔ اس خاندان کے لوگ یکے بعد دیگرے برسرِ کار آئے، ان میں زیدیت کا یہ اصول بھی اثر انداز ہوا کہ امام کے لیے مجاہد ہونا ضروری ہے اور اُسے اپنی قوت سے اقتدار کا مالک بننا چاہیے۔ یہی امام زید کا مسلک ہے۔ شروع میں حکومتِ حجاز کی طرف سے یمن میں گورنر مقرر ہوتے تھے، پھر زیدی امام حکمرانی کرنے لگے، ان کے بعد قرمطیوں نے بھی، جو شیعوں کی ایک انتہا پسند شاخ

بھ مدت کے لیے اقتدار حاصل کر لیا تھا پھر ترک یمن پر قابض ہو گئے۔ انجام کار موجودہ حکمران خاندان
بر اقتدار آیا اس کے اقتدار کی بنیاد موجودہ فرمانروا کے دادا نے رکھی تھی۔ یہ اُس زیدی امام
نسل سے تھا جو عراق سے آیا تھا۔ طویل مدت تک امام صرف روحانی اقتدار کے مالک رہے
۱۳۳ھ / ۱۹۱۷ء میں ترک عرب سے دست کش ہو گئے تو امام نے دنیوی اقتدار پر
ضہ کر لیا[1] گویا موجودہ یمنی حکومت کو کل چالیس سال گزرے ہیں۔ دولتِ عربیہ سعودیہ اور افغانستان
طرح یمنی بھی اپنے دستور و قوانین میں اسلامی فقہ کے پیرو ہیں۔

زیدی فرقہ امام زیدؒ کا پیرو ہے جو امام زین العابدینؒ کے فرزند ارجمند تھے، زیدیوں کا دعویٰ
ہے کہ امام زین العابدین نے بنی امیہ کے خلاف جنگ نہ کی اس لیے وہ امامت کے حق دار نہ
ہے اور ان کا فرزند زیدؒ امام قرار پایا جو اموی فوجوں سے لڑتا ہوا شہید ہوا۔ زیدؒ نے دینیات
تعلیم اپنے عہد کے ممتاز معتزلی علماء سے پائی تھی اور اسلام کے اہم اصول کی تعلیم وہ خود
ی دیتا رہا۔ زیدی لوگ عبادات و معاملات میں امام شافعیؒ کی فقہ کے پیرو ہیں اس اعتبار سے
ہ شیعوں کا ایسا طبقہ ہیں جو سنیوں سے بہت قریب ہیں۔ عام شیعوں کے خلاف اُن کا یہ بھی
قیدہ ہے کہ امامت کا سلسلہ قائم نہیں رہا۔

یمن کے لوگ اپنے مذہبی ذوق و شوق کی بنا پر علم کے شیدائی ہیں اور انھیں اپنی زبان
بھی فخر ہے۔ اس وجہ سے وہ اجنبیوں کو قابلِ اعتماد نہیں سمجھتے۔ اُن کا مسلک یہ رہا کہ تدریجاً قدم
آگے بڑھائیں، استعماری طاقتوں کا آلۂ کار بن جانے سے انھیں ہمیشہ بہت خوف رہا۔

قدیم یمنی تہذیب کو سازگار آب و ہوا اور تجارت کی وجہ سے بہت فروغ حاصل ہوا تھا۔
ب وہ باقی نہیں رہی۔ ملک کے طبعی اور انسانی وسائل اُس وقت بروئے کار آئیں گے جب
نھیں اجنبی اقدامات سے محفوظ ہونے کا یقین ہو جائے گا اور ملک میں دورِ حاضر کی ایجادات

---

[1] واقعہ یہ ہے کہ ترکوں نے موجودہ حکمران کے والد امام یحییٰ حمید الدین کو زیدیوں پر پورا اقتدار ۱۹۱۱ء میں دے دیا تھا۔
البتہ ترکوں کی دست کشی کے بعد امام یحییٰ پورے یمن کے حدود میں خود مختار بن گیا۔

نیز جمہوری اصول کو رواج دیا جا سکے گا۔

جو لوگ یمن سے خلیج فارس تک ساحلی علاقوں میں رہتے ہیں، وہ بھی مسلمان عرب ہیں،
میں اکثریت سنیوں کی ہے، کچھ شیعہ بھی ہیں۔ اُن پر چھوٹے چھوٹے امیر اور سلطان حکومت کر
ہیں اور یہ سب انگریزوں کے زیر اثر ہیں۔ اس خطے میں تہذیب یا ترقی یافتہ ثقافت کا چند
نہیں ملتا، اس لیے کہ وہاں افلاس، جہالت اور تعصب کا دور دورہ ہے اور یہی چیزیں ا
طاقتوں کے زیر اثر فروغ پاتی ہیں۔ البتہ کویت اور بحرین میں علوم کا احیاء شروع ہو گیا ہے،
لیے کہ تیل کی رائلٹی کے باعث دولت عام ہو گئی ہے، عمدہ سکول قائم ہو چکے ہیں اور ا
کا سلسلہ موجودہ رفتار پر قائم رہا تو عمومی اصلاحات کو ناگزیر سمجھنا چاہیے۔ اس علاقے میں سُنّ
اور شیعوں کے علاوہ خارجیوں کا بھی ایک فرقہ موجود ہے جس کا مرکز عُمان ہے۔ یہ فرقہ حضر
کے زمانے میں قائم ہوا تھا۔ اُن کے ساتھیوں میں سے ایک گروہ اس لیے الگ ہو گیا
حضرت علیؓ نے امیر معاویہؓ کے ساتھ تنازع میں قرآن کے بجائے آدمیوں کو ثالث مان لیا
حضرت علیؓ نے خارجیوں کو شکست دے کر منتشر کر دیا تھا، لیکن آپ ایک خارجی ہی کے ہا
سے مہلک طور پر زخمی ہوئے اور شہادت پائی، یہ فرقہ ہر اقتدار کے خلاف جنگ کرتا رہا اور
تک موجود ہے، سمجھا جاتا ہے کہ خارجیوں میں سے دو شخص بھاگ کر عُمان پہنچے اور اُنھ
نے اس فرقہ کی بنیاد رکھ دی۔

خارجیوں کا عقیدہ یہ ہے کہ امامت نہ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاف کا ذاتی ح
ہے اور نہ ابتدائی دور کے مہاجرین یا انصار بطورِ خود اس کے دعوے دار ہو سکتے ہیں۔ اما
کا فیصلہ میراث کی بنا پر نہیں، بلکہ انتخاب کی بنا پر ہوتا ہے، حکومت اسلامی قانون کے مط
قائم ہونی چاہیے۔ اگر امام سُنّت کی پیروی نہ کرے تو مسلمانوں کا فرض ہے کہ اُس کے خلاف ا
کھڑے ہوں۔ وہ اس بات کو بھی گوارا کر سکتے ہیں کہ کوئی امام یا حاکم نہ ہو لیکن یہ گوارا نہیں کر سکت
کہ امام سُنّت کے خلاف جائے۔ خارجی یہ بھی کہتے ہیں کہ گناہ کبیرہ کا ارتکاب کفر ہے۔ وہ حضرت علیؓ کی امامت کے

منکر ہیں کہ انھوں نے ثالثی قبول کی اور حضرت عثمانؓ کی امامت کے اس لیے منکر ہیں کہ انھوں نے اپنے اقتدار کا غلط استعمال کیا

خارجیوں میں ایک معتدل خیال کا فرقہ بھی ہے جسے عبادی کہتے ہیں۔ اُن کا عقیدہ یہ ہے مسلمانوں سے اختلاف کرنے والے کافر ہیں، مشرک نہیں اور وہ لوگ بدستور مسلمانوں کی جمعیت شامل رہتے ہیں۔ اُن کے ساتھ شادیاں بھی ہو سکتی ہیں، وہ میراث بھی پا سکتے ہیں اور ن چیزیں البتہ بھی کی جا سکتی ہیں۔ عبادیوں کے نزدیک ایمان میں عمل بھی شامل ہے، جو س گناہِ کبیرہ کا مرتکب ہوتا ہے وہ موحد رہتا ہے، مومن نہیں رہتا۔ وہ نکاح، طلاق اور رث میں اسلامی فقہ کے پابند ہیں لیکن جنگ، قبائلی اتحاد اور تجارت میں دانش مندوں سے ے اور مشورہ لیتے ہیں۔

جزیرے کے عرب مسلمان ایک دوسرے کے ساتھ انتہائی رواداری کا برتاؤ کرتے شلاً عمان میں سُنّی، شیعہ اور خارجی بلا امتیاز مساجد کے اندر نماز پڑھتے ہیں اور یمن میں امام ی زیدیوں اور شیعوں دونوں کو نماز پڑھایا کرتے تھے اور اُن کے درمیان کوئی تمیز روا نہ رکھتے ے۔ ان اختلافات کو فروعی حیثیت دی جاتی ہے۔ ویسے جمعیت، عادات و رسوم اور طریق فکر وہ متحد ہیں۔ قبائل کے درمیان پہلے سے جو طور طریقے چلے آرہے ہیں، وہ اتحاد قائم رکھنے ے لیے بدرجہا زیادہ مؤثر ہیں اور فرقہ وار اختلافات کو چنداں اہمیت نہیں دی جاتی۔

انت لیوانت میں وہ تمام عرب ملک شامل ہیں جو جزیرۃ العرب کے شمال میں واقع ہیں۔ (صرف عراق مستثنیٰ ہے) یعنی شام اُردن فلسطین اور لبنان، ان خطّوں کے عرب ے رنگ گروہ ہیں۔ ان میں اکثریت سنّیوں کی ہے، البتہ لبنان کی حالت مختلف ہے، یہاں ایرانی ین کی طرح رنگ رنگ کے عقیدوں اور فرقوں کا امتزاج ہے جو مشرقِ اوسط میں پائے تے ہیں۔

ظاہر ہے کہ یہ عقیدہ صحیح اسلامی عقیدہ نہیں اور یہی وجہ ہے کہ مسلمان خارجیوں کے جمہوری رجحانات کی وجہ سے نہیں مسلم بزرگوں کے بارے میں غلط اعتقادات کی وجہ سے ان کے خلاف ہوئے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے چند ہی سال بعد عربوں نے لیوانت کو مسخر کر
تھا۔ یہ حیرت انگیز کامیابی نئے مذہب کے جوش و حمیت کا نتیجہ تھی جس نے اُن کے قلو
کو اعتماد و یقین سے لبریز کر دیا تھا۔ ایران اور بیزنطین کی حکومتیں باہمی رزم و پیکار کے باعث
بدحال ہو چکی تھیں۔ چونکہ لیوانت کی پوری آبادی عموماً عرب تھی، اس لیے اُن لوگوں نے ا
فوجوں کو اجنبی نہ سمجھا، بلکہ اپنے بھائی بند سمجھ کر اُن کا خیر مقدم کیا۔ مسیحیوں کے لیے
اجنبی نہ تھا، اس لیے کہ اسلام نے حضرت مسیح علیہ السلام کے مشن کو بھی برحق قرار دیا تھ
اس امر پر بھی زور دیا تھا کہ حضرت مسیح علیہ السلام کی تعلیم کی پیروی کی جائے۔ قرآن مجید کا ارش
ہے:

وَلَتَجِدَنَّ أَقْرَبَهُمْ مَّوَدَّةً لِّلَّذِينَ	اور ایمان والوں کی دوستی میں سب سے زیادہ قریب ا
آمَنُوا الَّذِينَ قَالُوا إِنَّا نَصَارَىٰ	لوگوں کو پاؤ گے جو کہتے ہیں ہم نصاریٰ ہیں کیونکہ ان میں پادری
ذَٰلِكَ بِأَنَّ مِنْهُمْ قِسِّيسِينَ وَ	رہبان، عالم اور تارک الدنیا فقیر ہیں اور اس لیے
رُهْبَانًا وَأَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُونَ	کہ ان میں گھمنڈ اور خود پرستی نہیں۔

(مائدۃ: ۸۲)

حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد قریباً ایک سو سال تک بنو امیہ دمشق سے فرمانر
کرتے رہے اور انھوں نے خلافت کو بادشاہت کا لباس پہنا دیا جو ابتدائی دور میں قطع
ناپید تھا یعنی اُس وقت جب جزیرۃ العرب حکومت کا مرکز تھا، پھر خلافت عباسیوں کے ہاتھ
بغداد میں منتقل ہو گئی اور پانسو سال تک بغداد ہی خلافت کا مرکز رہا۔ اس دور میں لیوانت
یکے بعد دیگرے مختلف خاندان برسر اقتدار رہے، مثلاً ایوبی، مملوک اور ترک، ۱۳۲۹ء
تا ۱۹۲۰ء میں مغربی طاقتیں لیوانت پر مسلط ہو گئیں اور یہ تسلط دوسری جنگ عظیم کے اختت
تک قائم رہا۔

لیوانت کی اکثریت سُنّی ہے۔ وہ لوگ اسلامی اصول کے متعلق تمام عقائد میں متحد ہ

...وں کے باشندے عموماً امام ابو حنیفہؒ کی فقہ کے پابند ہیں اور اسی فقہ کی تعبیرات کو درست
...ھتے ہیں، دیہاتی آبادی عموماً امام شافعیؒ کی فقہ کی پیرو ہے، لیکن اِن دونوں فقہی دبستانوں
... اختلاف کی حیثیت ایسی ہے کہ اکثر مسلمانوں کو بھی شاید ہی اس کا احساس ہوتا ہو کہ چاروں
...بانِ فقہ میں سے وہ کس کے پیرو ہیں۔ وہ صرف سُنّی کہلانے پر مطمئن ہیں۔ مذہبی عدالتوں میں
...بی عموماً فریقینِ مقدمہ کے عقیدے کے مطابق فیصلے صادر کرتے ہیں عام عدالتوں میں بلالحاظ
...ب وملّت عام ملکی قانون کے مطابق فیصلے ہوتے ہیں۔

شام میں پارلیمانی جمہوری حکومت قائم ہے[1] اور دمشق اس کا دارالحکومت ہے، بنو امیہ
...ے زمانے سے یہی دارالحکومت چلا آتا ہے، دمشق کی جامع مسجد آج بھی جامعہ اموی کہلاتی
...ے، گویا اس خاندان کی یاد تازہ کرتی ہے جس نے یہ مسجد بنائی تھی اہلِ شام اپنے زبردست قومی
...ذبے، مذہبی حمیت تجارتی ہنرمندی، عقل ودانش اور شوقِ علم میں خاص شہرت کے مالک
... دمشق کی یونیورسٹی میں ادب، علوم، طب، دواسازی اور قانون کے شعبے موجود ہیں
...ب کی یونیورسٹی میں انجینئرنگ کی تعلیم دی جاتی ہے اور سلمیہ کی یونیورسٹی میں جو حما کے قریب
...ہے زراعت کی تربیت کا انتظام ہے۔

سلمیہ میں ایک اسماعیلی فرقہ رہتا ہے جس کی تعداد تیس ہزار ہوگی۔ یہ لوگ آغا خاں
... اپنا امام سمجھتے ہیں ابتدائی دور سے یہ مقام اسماعیلیوں کا بہت بڑا مرکز چلا آتا ہے
...ر اب بھی اس فرقے کے نزدیک یہ بہت اہم ہے، لیکن آغا خاں اسے صدر مقام
...ی حیثیت میں استعمال نہیں کرتا۔

جبل دروز میں دروزی فرقے کے اکتیس ہزار آدمی آباد ہیں، ان میں اور لبنان کے
دروزیوں میں بہ اعتبارِ عقیدہ کوئی فرق نہیں۔ لاذقیہ میں نصیری رہتے ہیں جن کی تعداد تین لاکھ

---

[1] یہ بیان اُس وقت کا ہے جب شام اور مصر کا اتحاد نہیں ہوا تھا، اب شام اور مصر مل کر جمہوریہ متحدہ عرب بن گئے ہیں۔

چھپّن ہزار ہے، یہ ایک وقت میں شیعوں کی ایک انتہا پسند شاخ تھے، لیکن اب ان کا
زیادہ معتدل ہوگیا ہے۔

اسماعیلی فرقہ اپنے ائمہ کا سلسلہ شیعوں کے چھٹے امام (امام جعفر صادق) کے فرز
حضرت اسمٰعیل سے ملاتا ہے۔ اُن کا عقیدہ یہ ہے کہ قرآن واقعی خدا کی طرف سے
لیکن اُس کی تعبیر وہ اپنے طریقے کے مطابق کرتے ہیں، جو دُروزیوں کے عقیدے کے
تمثیلی ہے، نہ خفی بلکہ اُن کے رہنماؤں کے استدلال کے مطابق فلسفیانہ ہے۔ قر
بعد اُن کے نزدیک دوسرا درجہ اخوانِ صفا کا ہے۔ یہ ایک دُعا ہے جسے وہ ہر نماز میں
ہیں، اپنے امام کو معصوم مانتے ہیں۔ بہت سے مبلّغ اسے امداد دیتے ہیں۔ رجا بجا یہی
ہم عقیدہ لوگوں کے رُوبرُو مذہب کی توضیح کرتے ہیں اور اُنھیں نماز پڑھاتے ہیں۔
لوگ اسلام کے پانچوں ارکان کے پابند ہیں، لیکن نمازیں مراقبے نیز روزے اور
خاص زور دیتے ہیں۔ یہی عقیدہ معتزلہ کا ہے۔ اسمٰعیلی بھی معتزلہ کی طرح خدا کو ایسی صف
سے بالا سمجھتے ہیں جن میں یقین کی بنا پر محدودیت پیدا ہو جائے۔

دُروزی، فاطمی خلیفۃ الحاکم بامر اللہ (وفات ۴۱۱ھ ۔ ۱۰۲۰ء) کے عہد
اسماعیلیوں سے الگ ہوئے۔ انھوں نے اعلان کر دیا کہ حاکم بامر اللہ پر امامت ختم ہوگ
باقی اسماعیلیوں کے نزدیک امامت بدستور قائم ہے، اس وقت سے دروزیوں اور
اسماعیلیوں میں اختلافات کی خلیج بڑھتی رہی ہے۔ دُروزیوں نے اپنے عقائد میں یونانی
اور ہندوستانی فلسفے، نیز تصوّف کی آمیزش کر لی۔ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ خدا اسی طرح ام
کی شکل اختیار کر لیتا ہے جس طرح اُس نے پیغمبروں کی شکل اختیار کی۔ امام معصوم ہو
تخلیق مختلف دوروں میں ہوئی۔ موت کے بعد روحیں پھر دوسرے جسموں میں لوٹائی جاتی ہیں
اور قانون ہر نبی کے ماتحت بدل جاتا ہے۔ وہ قرآن مجید کو وحی الٰہی مانتے ہیں، لیکن انھ
نے بطور خود اس کی تفسیر کر رکھی ہے جو انھوں نے عام روایات کے مطابق اپنے امام

ُسنی. وہ عام اسلامی عبادات میں سے اکثر کو نظر انداز کر دیتے ہیں، البتہ محبت اور راست بازی
ات زور دیتے ہیں۔ یہ واقعہ بڑا دلچسپ ہے کہ ایک مرتبہ نوجوان دُروزیوں کی ایک
ات امریکہ گئی اور ایک دُروزی عالم سے انھوں نے پوچھا "مذہب کو سمجھنے کے لیے
تاب کا مطالعہ کریں"؟ عالم نے جواب دیا: "قرآن مجید پڑھو جو اسلام کا حقیقی سرچشمہ ہے"۔
ایک اور فرقہ بھی شام میں پایا جاتا ہے جسے اُس کے بانی محمد ابن نُصیر کے انتساب
نُصیری کہا جاتا ہے، یہ شخص ابتدا میں گیارھویں شیعی امام (حضرت حسن عسکری) کا پیرو تھا
آگے چل کر اُس نے امام سے اختلاف کیا اور اعلان کر دیا کہ امام خدا کا اوتار ہوتا ہے نصیریوں
نزدیک امامت کا سلسلہ اب تک جاری ہے، وہ تمام اسلامی عبادات ادا کرتے ہیں
عام طور پر کہا جاتا ہے کہ ان باتوں کو انھوں نے اپنے حقیقی عقائد کے لیے ایک پردہ بنا
ہے۔ اُن کے حقیقی عقائد اسلام کے صریح خلاف ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اُن کا عقیدۂ تثلیث
ی ہے۔ تثلیث یہ ہے کہ روحِ خدا حضرت علیؓ ہیں اُس روح کا جسم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
اور شریعت کے مبلغ حضرت سلمان فارسیؓ ہیں۔

اِن میں سے بہت سے فرقوں نے حال میں اپنے معتقدات کا تنقیدی مطالعہ شروع
دیا ہے اور وہ اپنے ہم عقیدہ لوگوں کی روحانی زندگی کے متعلق خاصے اضطراب کا اظہار کر
ہے ہیں۔ آثار سے ظاہر ہو رہا ہے کہ اس قسم کے مطالعے سے فرقوں کے اختلافات دور ہو
ئیں گے۔ قاہرہ میں چند سال پیشتر ایک جمعیت کی بنیاد پڑی تھی جس کا مدعا یہ تھا کہ مختلف فرقوں کے
میان مصالحت کرا دی جائے۔ امید ہے کہ اس جمعیت کی کوششیں بار آور ہوں گی سنیوں
ر شیعوں کے درمیان جو اختلافات پیش آئے، وہ مذہبی نہیں سیاسی تھے، بنیادی طور پر یہ سب
ِقے مسلمان تھے، اور اُمید ہے کہ دورِ زوال میں تعصب اور نسلی عداوت کی جو معیبتیں پیدا ہوئیں
ہ دُور ہو جائیں گی اور ان میں اتحاد و مصالحت کا رجحان زیادہ استحکام اختیار کر لے گا۔
اُردن اور فلسطین کے مسلمان سُنّی ہیں، اُن کا عقیدہ اور عبادات و اعمال وہی ہیں جو شامی مسلمانوں

کے ہیں، خاندانی رشتہ داریوں کے علاوہ عادات و رسوم کی یکسانی کا رشتہ بھی ان کے درمیان
ہے۔ عرب کے بدوؤں کی طرح یہاں کے بدو بھی قبائلی عادات و رسوم کی پیروی کرتے
انھیں مذہب کے متعلق زیادہ معلومات نہیں، البتہ جو چیزیں انھیں یاد کرادی گئیں، وہ یاد ہیں
وہ اُن کا مطلب شاید ہی سمجھتے ہوں۔ انھیں صحرائی علاقے سے جو کچھ مل جاتا ہے، اس پر
اوقات بسر کرتے ہیں۔ اُن کے لیے سب سے بڑا مسئلہ پانی کا ہے۔

فلسطین کے عرب اُن زائروں، سیاحوں اور پناہ گیروں کی اولاد ہیں جو ارضِ مقدس
ہوئے جہاں قبۂ صخرا اور مسجدِ اقصیٰ واقع ہیں۔ ان مقامات کو مسلمان کعبہ سے دوسرے
پر مقدس مانتے ہیں۔ ایوبیوں اور مملوکوں کے عہد میں فلسطین نے خوش حالی کا انتہائی د
کر لیا تھا اور بے شمار درس گاہیں قائم ہو گئی تھیں۔ ان درس گاہوں کے باقیات اب تک
ہیں۔ ایک زمانے میں یہ درس گاہیں مسجدِ اقصیٰ کو گھیرے ہوئے تھیں۔ اب اِن کے
فولادی دروازے رہ گئے ہیں۔ پہلی جنگِ عظیم سے پیشتر عثمانی سلطنت کے گورنر نے
اسلام کے ہر حصّے سے مسلمانوں کو دعوت دی تھی تاکہ یروشلم میں بھی ازہر جیسی یونیورسٹی قائم
جائے۔ ترک وہاں سے نکل گئے تو یہ منصوبہ بھی ختم ہو گیا۔ پہلی جنگِ عظیم کے بعد حکمداری
دور میں بہت سے سکول اور کالج قائم ہوئے، جن سے ملک کی ثقافتی سطح بلند ہوئی، لیکن
تعلیم کا خرچ محدود تھا لہٰذا فنی یا صنعتی تعلیم کا دائرہ محدود رہا۔ ان علوم کی تکمیل کے لیے طلبا
کو مجبوراً قاہرہ، بیروت یا مغربی ممالک میں جانا پڑتا۔ دینیات کے طلبا، الازہر جاتے جو قاہرہ
کی شہرۂ آفاق یونیورسٹی ہے۔

عراق

دوسری صدی ہجری (آٹھویں صدی عیسوی) میں خلافت کا مرکز بغداد میں منتقل ہو گیا
اس مقام پر دنیا کے ایک ممتاز ترین ثقافتی مرکز کی بنیاد پڑ گئی۔ یہی مقام تھا جہاں اسلامی
ثقافت میں قدیم یونانی ثقافت نیز ایرانی، ہندوستانی اور چینی ثقافتوں کی آمیزش ہوئی۔ ثقافتی
تعامل کی اسی ہیجان خیز فضا میں اسلامی دینیات، اسلامی فلسفے، اسلامی لسانیات، اسلامی ا

اسلامی کیمیا، ریاضیات، طب، فنِ تعمیر اور ہیئت کی بنا ڈالی گئی۔ فروغ پذیر اسلامی ثقافت
برکت سے بغداد مسلسل پانسو سال تک پوری دنیا کے لیے علم کا مینار بنا رہا۔ اسی مقام پر
دو یونیورسٹیاں قائم ہوئیں، جو تاریخِ تعلیم کی سب سے بڑی یونیورسٹیاں تھیں۔ مذہب کے
مطالعے سے علم کی تمام شاخیں پیدا ہوئیں اور مذہب کی خدمت میں انھوں نے نشو و نما
حاصل کی۔

عباسی دور میں اسلامی ثقافت مشرق کی ثقافت بن گئی جس میں علوم، ہندسی اور فنِ تعمیر پر
بہت زور دیا جاتا تھا۔ تاہم ان دوائر میں اور مذہب میں کوئی تضاد محسوس نہیں کیا جاتا تھا۔ اس
کی وجہ یہ ہے کہ تمام اساتذہ مذہبی علوم میں کمال کے علاوہ مختلف علمی دائروں میں بھی مہارت تامہ کے
مالک ہوتے تھے۔ یہی زمانہ ہے جس میں مسلم ثقافت نے ایسے فنون کو نشو و نما دی، اگرچہ ان
کے فروغ کا رجحان مسلم ثقافت کا نتیجہ نہ تھا، جو صرف فارغ البال و دولت مند طبقے کی وجہ سے
ہوتے رہتے ہیں۔ جیسا کہ مغرب کی مثال سے ہم پر واضح ہے۔ مسلمانوں نے موسیقی کے مطالعے
میں انہماک پیدا کیا۔ داستان گوئی کو فروغ دیا۔ نثر و نظم کو درجۂ کمال تک پہنچانے کے لیے
بڑی کوششیں کیں۔ ایسے کھیلوں سے بھی وہ لطف اندوز ہوتے تھے، جو چین سے آتے
تھے۔ چونکہ مذہب رہبانیت کا متقاضی نہ تھا، اس لیے ایسی راحت جوئیوں کو برداشت کیا
جاتا تھا۔ اس امر پر تعجب نہ ہونا چاہیے کہ الجاحظ جیسے مذہبی آدمی نے موسیقی، شراب نوشی
اور مزاح کے متعلق بحثیں کیں۔

مذہبی تحقیق کے دائرے میں ایسے سوالات اٹھائے گئے جو پہلے کبھی نہیں اٹھے تھے
اور لوگ مختلف معاملات کو عقلی تجربے کے بغیر مانتے چلے آرہے تھے۔ مثلاً ذاتِ باری تعالیٰ
قرآن مجید کی حقیقی حیثیت، عالمِ عقبیٰ، جزا و سزا، قضا و قدر وغیرہ کے مباحث۔ واقعہ یہ ہے
کہ ماوراے طبیعت جو کچھ بھی تھا، اس پر سرگرم بحثیں ہر جگہ ہوتی تھیں۔

مذہب کے زیرِ سایہ ان بے پناہ ذہنی سرگرمیوں کو ساتویں صدی ہجری (تیرھویں

صدی عیسوی میں تاتاری یورشوں نے تباہی خیز انجام پر پہنچایا۔ بغداد برباد ہو گیا۔ کتب خا
جلا دیے گئے۔ لوگ موت کے گھاٹ اتار دیے گئے۔ خلافت بغداد سے قاہرہ میں منتقل
عراق کی عظمت و شوکت اس طرح چھنی کہ پھر اس کی بحالی کی کوئی صورت پیدا نہ ہو سکی۔ عثمانی سلا
کے عہد میں عراق کی ثقافت پستی کی آخری منزل پر پہنچ گئی۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد سے وہا
کا عمل شروع ہوا ہے۔ اب وہاں ایک یونیورسٹی قائم ہو گئی ہے جس میں علوم و ادب کے
موجود ہیں۔ نجف الشرف اور کربلائے معلیٰ میں شیعوں کے لیے اور بغداد میں سنیوں کے
لیے ازہر جیسی دینی درس گاہیں کھل گئی ہیں۔

عراق کی آبادی میں اب شیعوں اور سنیوں کی تعداد قریباً برابر ہے۔ بیشتر شیعہ جنوبی ع
میں اور بیشتر سنی شمالی عراق میں رہتے ہیں۔ حکومت کی طرف سے پوری کوشش کی جا
ہے کہ کم از کم نئی نسل فرقہ وار اختلاف سے الگ رہے۔

آج کا عراق گزشتہ دور کے عراق سے بہت پیچھے ہے۔ جن نوجوانوں نے موجودہ
کی درس گاہوں میں اعلیٰ تعلیم پائی ہے اور جو تکمیل علوم کے لیے یورپ یا امریکہ میں گئے ہیں ا
دورِ حاضر کے علوم سے دلچسپی ہے اور انھوں نے موجودہ زمانے کا سائنٹیفک نقطۂ
قبول کر لیا ہے۔ جن لوگوں نے پھر مذہبی مدرسوں میں تعلیم پائی ہے، وہ ابھی تک عموماً پرا
مذہبی تصورات میں گم ہیں۔ دونوں دائروں سے گہری شناسائی رکھنے والا کوئی فاضل مفکر ابھی تک
بروئے کار نہیں آیا جس کی کوششوں سے نئی ذہنی فضاؤں کے دروازے اس طرح کھل جا
جس طرح عباسیوں کے عہدِ عروج میں کھل گئے تھے۔

اسلامی ثقافت میں بنیادی مسئلہ یہ ہے جو سیاسی اور مجلسی احوال و ظروف ثقافت کے نشو
کے لیے لازم ہیں، وہ موجود نہیں۔ یہ حالت تنہا عراق تک محدود نہیں، ساری اسلامی دنیا ا
مسئلے سے دوچار ہے۔ اجنبی تسلط کے دور میں مجلسی بے حفاظتی پیدا ہوئی۔ عرب کی سرزمی
چھوٹی حکومتوں میں بٹ گئی تو اجنبیوں کا دباؤ پڑنے لگا اور حکومتیں بھی ایسی جن میں سے بیشت

دیاں دس لاکھ سے پچاس لاکھ تک ہیں جب تک یہ حالات قائم ہیں اسلامی ثقافت کے لیے اس
ح پھولنے پھلنے کا کوئی امکان نہیں جس طرح یہ عباسیوں کے عہد میں پھولی پھلی تھی۔

عربوں نے مصر پر پہلی صدی ہجری کے اوائل ہی میں حملہ کر دیا تھا۔ آہستہ آہستہ مصر کو عربی
صر بنانے اور وہاں اسلام پھیلانے کا کام شروع ہوا، یہاں تک کہ ملک کی زبان عربی بن
ی اور مسیحی اقلیت میں رہ گئے۔ مصر کی اسلامی ثقافت بھی باقی اسلامی دنیا کی ثقافت جیسی ہی
ی۔ قریباً ایک سو سال تک مصر بنو امیہ کے ماتحت رہا پھر حکومت عباسیوں کو مل گئی۔ پانچویں
چھٹی صدی ہجری (گیارہویں اور بارہویں صدی عیسوی) میں فاطمی مصر پر قابض رہے۔ پھر ان
جگہ ایوبیوں نے لے لی۔ ان کے بعد مملوک برسر اقتدار آئے، مملوکوں سے عنانِ حکومت عثمانی
ں نے چھین لی۔ ترکوں کی حکومت دسویں صدی ہجری (سولھویں صدی عیسوی) میں قائم ہوئی
شتہ ڈیڑھ سو سال سے زمانہ حال تک مغربی طاقتیں مصر پر مسلط رہیں۔

فاطمیوں کے عہدِ حکومت میں مصر کے اندر شیعیت پھیل گئی تھی اور دروزی فرقہ
رضِ وجود میں آیا تھا۔ جو ایوبی سُنّی تھے انھوں نے دروزیوں کو مصر سے نکال کر شام و لبنان
پہنچا دیا جہاں وہ اب تک موجود ہیں۔ ایوبیوں کے عہد سے اب تک مصر سُنّی چلا آتا
ہے۔

فاطمیوں کے عہد کا نہایت اہم واقعہ یہ تھا کہ ۳۶۲ھ (۹۷۲ء) میں جامعہ ازہر (قاہرہ)
م ہوا۔ یہ دنیا کی سب سے پرانی یونیورسٹی ہے، اس نے محض عرب ممالک میں نہیں، بلکہ غیر
بی دنیا کی اسلامی تہذیب میں بھی فیصلہ کن کردار ادا کیا ہے۔ صدیوں تک یہ یونیورسٹی دینی تعلیم
ایک اہم مرکز بنی رہی۔ پوری اسلامی دنیا سے طلبا یہاں آتے تھے جنھیں قاضی یا فقیہ یا عالم
بننے کی آرزو ہوتی اور وہ ایک دوسرے سے ملتے تھے۔ جمعہ کے دن مسجد جامع میں نماز ہوتی
ے اور خطبہ دیا جاتا ہے، جیسے ریڈیو کے ذریعے سے دور دور تک پہنچایا جاتا ہے۔ ازہر
ں تعلیم کا طریقہ یہ تھا کہ طالب علم اپنے رجحان اور درجہ تعلیم کی بنا پر استاذ منتخب کر لیتے، وقت کا

تعین نہیں ہوتا تھا۔ وہ جب تک چاہتے تعلیم پاتے رہتے یہاں تک کہ حصولِ سند کے تیار ہوجاتے۔ حال میں یونیورسٹی کو دو حصوں میں بانٹ دیا گیا ہے۔ ایک عام حصہ ہے جس پرانے طریقے کے مطابق تعلیم دی جاتی ہے۔ دوسرے شعبے میں مختلف علوم کے شعبے تج دیے گئے ہیں مثلاً شعبہ الٰہیات، شعبہ فقہ، شعبہ زبان عربی۔ پھر ہر شعبے کے ساتھ ابتدائی او مدارس وابستہ ہیں۔ ایک خاص شعبہ ہے جس میں طلبا کو مقررہ نصاب کے مطابق دورِ حاضر کے اور علوم پڑھائے جاتے ہیں۔ سالانہ امتحان ہوتے ہیں۔ یہ بھی ضروری ہے کہ ہر طالب علم کسی معاملے میں درجہ تخصیص حاصل کرے اور اس کے متعلق مفصل مقالہ لکھے۔ اس کے بعد ڈگری ملتی ہے۔ بعض اساتذہ مغربی ممالک میں تعلیم پاکر آتے ہیں مثلاً موجودہ شیخ الازہر جس فرانسیسی یونیورسٹی کی اعلیٰ ڈگری حاصل کی۔ آج کل بھی ازہر میں بیرونی ممالک کے کئی ہزار طال موجود ہیں۔

اگرچہ مصر کی آبادی بحیثیت عمومی سُنّی ہے اور زیادہ تر لوگ حنفی فقہ کے پابند ہیں تا یں چاروں مسلمہ فقہی دبستانوں کی تعلیم دی جاتی ہے اور مذہبی عدالتوں میں مقدمات کے فیصل مدعا علیہ کے فقہی مسلک کی بنا پر صادر ہوتے ہیں۔ عثمانی حکمرانوں کے زمانے میں اسلامی ثقاف نو مصر کے اندر زوال پذیر ہوئی، اس لیے کہ حکمرانوں کا عقیدہ یہ تھا کہ فلسفے، جغرافیہ، ریاضی او علوم کے باعث مذہب سے بے تعلقی پیدا ہوگئی۔ گزشتہ صدی کے آغاز میں ایک جدید تح ابھری جس کا مقصد یہ تھا کہ مصریوں کو عثمانی سلطنت سے آزادی حاصل کرنے پر ابھارا جائے سویز کے افتتاح کے باعث مغرب کے ساتھ روابط پیدا ہوئے۔ اس زمانے میں ہمسای ملکوں سے میل جول کا سلسلہ جاری ہوا نیز مصر مغربی ثقافت کے داخلے کے لیے ذریعہ بن گ یہ تداخل حدود سے متجاوز نہ ہوا اس لیے کہ اہل ملک اپنی ثقافت کی اسلامی اور عربی خصوصیت کو بہر حال باقی رکھنے کے خواہاں تھے

گزشتہ صدی میں دو ایسے عظیم الشان اشخاص نمودار ہوئے جنھوں نے اسلامی ثقافت کا

۔ ایک جمال الدین افغانی (وفات ۱۳۱۵ھ، ۱۸۹۷ء) دوسرا محمد عبدہ (وفات ۱۳۲۳ھ
ء) سید جمال الدین اسلامی دنیا کے جس حصّے میں پہنچے انھوں نے مذہبی شعور کو خوابِ غفلت
کا دیا۔ انھوں نے فلسفے کی اسلامی میراث اور مغربی ثقافت کے فشار کی طرف توجہ دلائی
ن کے فکر و نظر میں سیاسی مسائل کو خاص اہمیت حاصل تھی۔ شیخ محمد عبدہٗ سید جمال الدین
کے شاگرد تھے۔ وہ سید ہی کے نقشِ قدم پر چلے۔ پہلے انھیں سیاسیات سے دل چسپی رہی
ی توجہ ثقافتی اُمور کی طرف پلٹ گئی۔

شیخ محمد عبدہ واقعی ایک غیر معمولی دل و دماغ کے فرد تھے۔ ان کی صلاحیتیں زندگی کے
وں پر حاوی تھیں اور ان کی سرگرمیوں کا اثر اسلامی دنیا کے بہت سے ملکوں پر پڑا۔ انھوں
روحانی لحاظ سے بھی اسلام کا احیاء کیا۔ اس کے بنیادی اصول کھول کر بیان کر دیے اور
ں دورِ حاضر کی اصطلاحات میں پیش کر دیا۔ اہلِ مغرب کی طرف سے اسلام پر جو اعتراضات کیے
ے تھے، شیخ نے ان سب کو رد کرتے ہوئے ثابت کر دیا کہ اسلام اور عقلِ سلیم میں کوئی
ہیں، بلکہ اسلام کے نزدیک عقل خدا پر ایمان کی کلید ہے۔ لکچروں میں شیخ عبدہ نے وہ
ب استعمال کیا جو تزئینی تکلفات سے بالکل پاک تھا۔ اس طرح ایک نیا ادبی اسلوبِ نگارش
یر ہوا جسے اس وقت سے اخبار نویس اور مقالہ نگار برابر اختیار کیے رہے۔ شیخ نے
مادبی مخطوطات کی طباعت و اشاعت کا اہتمام کیا اور بعض کو ازہر یونیورسٹی کے علمی حلقوں
اری کر دیا۔ مجلسی دائرے میں بھی شیخ کے کارنامے خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں، مثلاً پہلے لوگ
غیر منظم طریق پر صدقات و زکوٰۃ دیتے تھے۔ شیخ نے لوگوں کو اس امر پر آمادہ کیا کہ ایسی
منظم طریق پر صرف کی جائیں تاکہ ان سے جماعت زیادہ فائدہ اٹھا سکے۔ سیاسیات میں شیخ
جمہوری نظام کی وکالت فرمائی۔ اس صلاحیت و عظمت کا دوسرا آدمی اب تک بروئے کار
ں آسکا۔

مصر کی ثقافتی زندگی میں ایک اور عامل بھی کارفرما ہوا۔ یہ مصری یونیورسٹی کی تاسیس تھی

جو پہلی جنگِ عظیم سے کچھ مدت پیشتر عمل میں آئی۔ اب اس یونیورسٹی میں طب، دواسازی، انجینئ
زراعت، تجارت، قانون اور ادب کے شعبے قائم ہیں۔ تعلیم کا شوق اس یونیورسٹی کی وجہ سے
بڑھ گیا ہے کہ بعد ازاں ایک یونیورسٹی سکندریہ میں قائم کر دی گئی اور ایک عین شمس (قاہرہ) میں۔
یونیورسٹیوں کے قیام کا نتیجہ یہ نکلا کہ مغربی ثقافت کا سوتا عربی ثقافت کی ندی میں شامل ہو گیا
نہ اس کی مزاحمت ہوئی اور نہ اس پر احتجاج کی نوبت آئی۔ اب مصر میں دو طرفہ کشش کا سلسلہ
ہے۔ ایک طرف جامعہ ازہر اور اس سے متعلقہ اداروں کا پرانا نظام ہے۔ دوسری طرف
کا سائنٹفک طریقہ ہے جو عام تعلیم سے پیدا ہوا۔ تاہم ان دونوں کے درمیان اتنا عمدہ توازن
ہے کہ کوئی ایک دوسرے کو تباہ کرنے کے درپے نہیں۔ اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ مذہب
سیکڑوں سال میں مصریوں کے قلوب کے اندر مضبوطی سے جڑیں پکڑ لی ہیں اور اب وہ
کسی اندیشے کے بغیر مذہبی اور دنیوی بنیادوں پر پہلو بہ پہلو جاری ہے۔ بظاہر امید نہیں
مصر ان دونوں بنیادوں میں سے کسی ایک کو ترک کرے گا۔ البتہ امید ہے کہ یہ دونوں بنیادیں
زیادہ قریب آتے آتے ایک بنیاد بن جائیں گی اور وہی مصری ثقافت کی بنیاد ہو گی۔[1]

مغرب کے بعض فضلا اس بات کا ماتم کرتے ہیں کہ مسلمانوں خصوصاً مصریوں نے اصول
اسلام میں آزاد تعبیر و اجتہاد کا دروازہ بند کر دیا ہے۔ اجتہاد کو اس وجہ سے روکنا لازم ہو گیا کہ
کو تمام مسلم ملکوں میں (بہ اعتبار علم) قیادت کا منصب حاصل تھا اگرچہ وہ بعض دوسرے ملکوں
سے آبادی اور رقبے میں چھوٹا تھا، نیز اسے بھی بعض دوسرے ملکوں کی طرح استحصال کا شکار
بنا لیا گیا تھا۔ ان وجوہ سے ضروری تھا کہ اہلِ مصر کی توجہ تمام تر استعمار کے چنگل سے نجات حاصل
کرنے، نیز اپنی اور قریبی ہمسایوں کی حفاظت میں ہر قوت لگا دینے پر جمی رہتی۔ ایسے موقع

[1] فاضل مقالہ نگار نے جو کچھ لکھا ہے سراسر تکلف پر مبنی ہے۔ سمجھ میں نہ آیا کہ تقسیم کس بنا پر ضروری سمجھی گئی۔ اسلام زندگی
کے تمام شعبوں پر حاوی ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام نے جتنے اوامر و نواہی دیے ہیں ان کی پوری پابندی کی
جائے اور جن امور و معاملات میں کوئی واضح چیز موجود نہیں ان میں اسلام کے اصولی و اساسی مقاصد و مسائل پیشِ نظر رکھے جائیں۔

ؔاد کا دروازہ کھول دیا جاتا تو یقیناً قوم میں تفرقہ پیدا ہو جاتا اور اس سے صرف استعماری قوتیں فائدہ اٹھا سکتی تھیں۔ اسلام کو دو خطرے پیش آئے، مغرب کی طرف سے مسیحیوں کا خطرہ اور رق کی طرف سے لامذہبوں کا خطرہ، اسلام نے دونوں کا مقابلہ کیا لیکن سکوت کے ساتھ۔ حفاظت کے ساتھ سیدھے سادھے عقائد ہزار درجہ بہتر تھے بہ نسبت اس کے کہ عقائد قل کی میزان میں تولا جاتا لیکن ملک میں انتشار اور بے نظمی پیدا ہو جاتی۔ اجتہاد بہ ہر حال یر ہے اور جب اسلامی ممالک ان فتنوں سے محفوظ ہو جائیں گے جو انھیں احاطہ کیے ہوئے ہ اور امن و سکون نصیب ہو گا تو یقیناً اجتہاد سے کام لیا جائے گا۔[۱]

جب سے لوگوں نے آزادی حاصل کی ہے، قوم پروری کی وضع و ہیئت سراسر بدل گئی ہے لے قومی تحریکات میں مذہب کو الگ رکھنا پڑتا تھا تاکہ کہیں عیسائیوں اور مسلمانوں میں کش مکش نہ دا ہو جائے اور مذہبی تحریکوں میں عرب قوم پروری کو خارج رکھا جاتا تھا، نئی قوم پروری میں ؤں چیزیں متحد ہو گئی ہیں ان میں ہم آہنگی آ گئی ہے۔ نہ اس میں دنیا دارانہ رکھ رکھاؤ ہے اور نہ ہب کی سختی اور بے لوچ پن۔ یہ داخلی ہم آہنگی مصر کی اس خواہش کی بنیاد ہے کہ مغرب اور رق کے درمیان قوم پروری کے سلسلے میں جو کش مکش جاری ہے، اس میں غیر جانب دار رہے مصر میں کسی کی طرف داری کا رجحان ہو سکتا ہے تو وہ ملک میں جہاں اب تک مذہب سے لک جاری ہے۔ مغرب کی مخالفت کی ایک اور وجہ بھی ہے اور وہ یہ کہ مغربی طاقتوں نے لوں کے قومی مقاصد کے سلسلے میں مخالفانہ روش اختیار کر لی خصوصاً فلسطین اور شمالی ریقہ کے سلسلے میں[۲]

۱۔ اقبال مرحوم نے مثنوی میں فرمایا ہے:

اجتہاد اندر زمانِ انحطاط　　قوم را برہم ہمی پیچد بساط

۲۔ شمالی افریقہ سے یہاں خصوصیت کے ساتھ مراد الجزائر ہے، جہاں فرانس نے ظلم و ستم کا طوفان بپا کر رکھا ہے۔ تونسیہ بتوں سے نکل گیا، مراکش بھی بڑی حد تک نکل چکا ہے۔ الجزائر ابھی تک آگ اور خون کے کھیل کی جولاں گاہ ہے۔

شمالی افریقہ

(شمالی افریقہ کے متعلق تمام معلومات اس مواد پر مبنی ہیں جو شیخ محمد الفاضل تونسی نے مرتب کیا تھا)

مسلمانوں نے ۲۲ھ (۶۴۲ء) میں شمالی افریقہ[1] پر حملہ کیا، اس سے پیشتر عمروؓ
مصر پر پوری طرح قابض ہو چکے تھے۔ بعد ازاں نہایت موثر حملہ چالیس سال گزر جانے
کے عہدِ حکومت میں ہوا جب کہ تونس کے قریب قیرواں میں مسلمان عربوں کے لیے ایک
قائم کر دی گئی تھی۔ یہ پیش قدمی آہستہ آہستہ مغربی جانب جاری رہی، یہاں تک کے
کا ساحل آگیا اور بربر جو رومیوں اور ونڈالوں کے باقیات تھے، بہت بڑی تعداد
اسلام ہو گئے۔ انھیں بہت جلد حملہ آوروں کے برابر شہری درجہ حاصل ہو گیا اور وہ
افواج میں بھرتی ہونے لگے۔ بربروں کی امداد ہی کی بدولت اموی فوجیں مراکش
کی تسخیر کے لیے بڑھیں۔

قیرواں "مغرب" کا دارالحکومت بن گیا، جسے آج کل شمالی افریقہ کہا جاتا ہے
پانچ علاقے شامل تھے، اوّل طرابلس الغرب[2]، دوم تونیسیہ، سوم الجزائر، چہارم المغرب

---

[1] شمالی افریقہ میں طرابلس، تونیسیہ، الجزائر اور مراکش شامل تھے جیسا کہ مقالہ نگار نے خود آگے چل کر
حقیقت یہ ہے کہ مصر سے آگے مغربی جانب کا علاقہ زمانۂ قدیم میں افریقیہ کہلاتا تھا یہی نام آگے چل کر تھوڑ
تبدیلی سے پورے برّ اعظم کے لیے مخصوص ہو گیا چنانچہ ابتدائی دور کی اسلامی تاریخوں میں مغرب کی جانب اس
کہا گیا ہے۔

[2] جس ملک کو آج کل لیبیا کہا جاتا ہے اس کے دو بڑے حصے ہیں ایک سائرانیکا اور دوسرا ٹریپولیتانیا
مشرقی جانب کا حصہ ہے اور ٹریپولیتانیا مغربی جانب کا۔ ٹریپولیتانیا کو عرب طرابلس کہنے لگے اور اسی نام کا
ساحلِ بحر پر واقع ہے۔ پچاس سال پیشتر تک پورے لیبیا کا نام طرابلس تھا اور اسے طرابلس المغرب اس
تھے کہ ایک طرابلس شام میں بھی تھا اور دونوں میں کوئی امتیاز قائم رکھنا ضروری تھا، اطالویوں نے ۱۲ء
میں اس پر قبضہ جما لیا تھا تو پرانے رومی نام اختیار کر لیے یہی وجہ ہے کہ آج کل طرابلس کو لیبیا اور اس کے حصے
سائرانیکا اور ٹریپولیتانیا کہتے ہیں۔

(مراکش)، پنجم اندلسیہ[1] قیرواں ہی سے اشاعتِ اسلام اور ترویج زبانِ عربی کی کوششیں بربروں میں جاری رہیں۔ ۱۰۰ھ (۷۱۸ء) میں ایک تبلیغی وفد وہاں مقرر کر دیا گیا جو عام طور پر دس عالموں کا وفد کہلاتا ہے، اسی وفد کی کوششوں سے بربروں کے بیشتر قبیلے داخل دائرۂ اسلام ہوئے اور انھوں نے عربی زبان کو اپنا لیا۔ دوسری صدی ہجری میں یہ کیفیت پیدا ہو گئی تھی کہ بہت سے بربری دینی مباحث میں حصہ لینے لگے تھے اور انھوں نے عربی زبان کی ادبیات کے متعلق کتابیں لکھنی شروع کر دی تھیں۔

خارجی حضرت علیؓ اور امیر معاویہؓ کے خلاف لڑائیوں میں شکست کھا کر بکھر گئے تو انھوں نے "المغرب" کا رُخ کیا، لیکن اموی حکمرانوں نے انھیں مختلف دائروں میں محدود رکھنے کے لیے کامیاب کوششیں کیں، چنانچہ وہ مغرب اور افریقہ کے بعض خطوں میں مقیم ہو گئے جہاں خاص قسم کے مجلسی اور سیاسی انداز کی انجمنیں قائم ہوئیں۔ شمالی افریقہ کے لوگ سنیت کے پابند ہوئے اور انھوں نے مالکی فقہ کو قبول کر لیا اس لیے کہ اُن کے ہاں سے زیادہ تر طلبا دینی تعلیم کے لیے مدینۂ منورہ جاتے تھے، جہاں مالکی فقہ کو غلبہ حاصل تھا۔ تیسری صدی ہجری کے اختتام پر وہ سنیت اور مالکیت میں اور زیادہ پختہ ہو گئے اور انھوں نے مصر کے فاطمی حکمران خاندان کی سخت مخالفت سے اپنی پختگی پر مہرِ تصدیق لگا دی۔ فاطمیوں کی شیعی سرگرمیوں کی مزاحمت کا مرکز قیروان اور تونس ہی تھے، جہاں زیادہ تر مالکی علما مقیم ہو گئے تھے۔ چھٹی صدی ہجری (بارھویں صدی عیسوی) میں المغرب کے اندر محمد ابن تومرت کا ظہور ہوا جو مہدی کے لقب سے مشہور ہے، یعنی وہ امام جس کی آمد کا ذکر مختلف دینی کتابوں میں آ چکا تھا۔ در اصل وہ ایک مصلح تھا۔ اور اُس نے ایک نئی

---

[1] اندلیسیہ یعنی اندلس ہسپانیہ کا جنوبی علاقہ ہے جس کی وجہ سے عرب پورے ہسپانیہ کو اندلس کہتے رہے اس حصے میں ونڈال قبیلہ مدت تک حکمران رہا اور ان کی وجہ سے علاقے کا نام ونڈالوسیا پڑ گیا اسی نام نے عربوں کی زبان پر آ کر اندلس کی شکل اختیار کر لی جس کی دل کشی کسی تشریح کی محتاج نہیں۔

سلطنت اس غرض سے قائم کی کہ دینی اور مجلسی اصلاح کو پایۂ تکمیل تک پہنچائے یہ نئی حکو
تھوڑی دیر کے لیے "المغرب" کے تمام علاقوں پر حاوی رہی، اس کے بعد چار حکمراں خاند
بعد دیگرے وجود میں آئے، اگرچہ وہ سیاسی اقتدار حاصل کرنے کے لیے جدوجہد کر ر
تھے، لیکن وہ محمد ابنِ تومرت کی روحانی قیادت سے علیحدگی کا دعویٰ نہ کر سکے۔

نویں صدی ہجری (پندرھویں صدی عیسوی) کے اختتام پر اندلس میں عربوں کی ح
کا خاتمہ ہو گیا اور وہاں کے مسلم گروہوں نے "المغرب" میں پناہ لی، اہل ہسپانیہ نے شمالی اف
بعض حصوں پر بھی قبضہ کر لیا تھا، یہاں تک کہ عثمانی ترک پہنچ گئے اور ہسپانویوں کو نکال کر انھو
نے الجزائر، طرابلس اور تونیسیہ کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ مراکش میں وہی سلطان حکمر
رہے جو اپنا سلسلۂ نسب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچاتے تھے ماضی قریب میں فر
اور اٹلی نے شمالی افریقہ میں اقتدار حاصل کر لیا اور چند سال پیشتر تک وہ برسرِ اقتدار ر
اب لیبیا، تونیسیہ اور مراکش نے اپنی حکومتیں قائم کر لی ہیں، صرف الجزائر باقی رہ گیا ہے
فرانسیسی اقتدار سے نجات حاصل کرنے کے لیے جدوجہد کر رہا ہے

ہمارے زمانے میں شمالی افریقہ کی آبادی اُن عربوں اور بربروں پر مشتمل ہے جو آپ
میں شادیاں کرتے رہے۔ عام زبان عربی ہے اگرچہ مختلف مقامات کی بولیوں میں اختلاف ہے
اس اختلاف کو جغرافیائی حالات کا نتیجہ سمجھنا چاہیے۔ زبان اور عادات و رسوم میں بربرد ں
اثر واضح ہے، خصوصاً اُن بربروں کا جو اطلس کے پہاڑی علاقوں یا مراکش میں رہتے ہیں
تونیسیہ میں یہ اثر بالکل برائے نام ہے اور وہاں بربروں کی آبادی ایک فی صد سے بھی کم
ہے، کم و بیش بیس لاکھ بربر مراکش میں، دس لاکھ الجزائر میں اور قریباً پچاس ہزار لیبیا میں
ہیں۔ شمالی افریقہ کے باشندے مسلمان ہیں۔ البتہ پندرہ لاکھ کے قریب عیسائی اور یہودی ہی
ان میں دس لاکھ الجزائر[1] میں رہتے ہیں۔

[1] واضح رہے کہ یہ زیادہ تر فرانسیسی آباد کار ہیں جو اچھی زمینیں حاصل کر کے الجزائر میں مقیم ہو گئے یا وہ
باقی صفحہ ۵۹

یہاں کے زیادہ تر مسلمان سُنّی اور عقائد کے اعتبار سے اشعری ہیں۔ وہ عملاً مالکی فقہ
پابند ہیں۔ مراکش میں سب کے سب مالکی ہیں، الجزائر اور تونیسیہ میں کچھ حنفی بھی پائے جاتے
یہ وہی لوگ ہیں جن کے اسلاف عثمانی ترکوں کی فوج کے ساتھ شمالی افریقہ میں مقیم ہوئے
۔ یہ زیادہ تر ان شہروں میں رہتے ہیں جہاں فوجی چھاؤنیاں تھیں۔ الجزائر تونیسیہ اور لیبیا میں
ایک لاکھ کے قریب خارجی ہیں۔ ان کا تعلق عبادی فرقے سے ہے۔ اُن کا مرکز عزدائیہ ہے
انھوں نے درس گاہیں قائم کر رکھی ہیں، اُن کی اپنی شرعی عدالتیں ہیں جہاں تمام مقدمات
کے شرعی اصول کے مطابق طے ہوتے ہیں۔

سُنّیوں میں صوفیہ کے مختلف سلسلے جاری ہیں، وہ سب اپنا رشتہ مشہور صوفی بزرگ
ت جنید (وفات ۲۹۸ھ ۔ ۹۱۰ء) سے ملاتے ہیں۔ ان میں سے تین سلسلے بہت
ور ہیں یعنی قادری، شاذلی اور تیجانی پھر ان کی بہت سی شاخیں ہیں۔ یہ سلسلے تکیوں یا خانقاہو
ذریعے سے اپنا کام جاری رکھتے ہیں یعنی ان تکیوں یا خانقاہوں میں منظم جماعتیں رہتی ہیں
وف کی تعلیمی اور عملی خدمت انجام دیتی ہیں مغرب میں اس قسم کی سات سو سے زائد خانقاہیں
۔ موجودہ صدی میں ان سلسلوں کا اثر یقیناً کم ہو گیا ہے، بہ ایں ہمہ اب بھی الجزائر اور لیبیا میں
اہم خانقاہیں ہیں جن کا دائرہ اثر وسطی افریقہ تک پہنچتا ہے۔ سنوسیوں کا سلسلہ ۱۲۵۴ھ
۱۸۳۸ء) میں بہ مقام مکہ معظمہ شروع ہوا تھا۔ اس پر وہابی تحریک کا بھی کسی قدر اثر پڑا۔ یہ لوگ اپنا
لہ شاذلی سلسلے سے ملاتے ہیں، ان کے یہاں گانے، رقص اور تمباکو کشی کی ممانعت ہے
اس بات کو بھی پسند نہیں کرتے کہ رہبانیت کو انتہا تک پہنچایا جائے۔ سنوسیوں نے
اعی زندگی بسر کرنے کے لیے خانقاہوں کے قیام پر بہت زور دیا۔ خانقاہوں کا ہر فرد کسی نہ
مفید جماعتی کام میں لگ جاتا، مثلاً کھیتی باڑی، درس و تدریس یا تجارت، اس طرح مختلف افراد

بقیہ صفحہ ۳۵۸: تاجر اور دکاندار ہیں جو کاروبار کے سلسلے میں وہاں پہنچ گئے۔ ان میں سے ملک کا اصل باشندہ
ی نہیں۔

کی سرگرمیوں سے خانقاہ کے لیے ضرورت کی چیزیں مہیا ہوتی رہتیں۔ سنوسی درویش قو...
کے استعمال کو بری نظروں سے دیکھتے ہیں۔ وہ اصل سنّی اصول کے پابند ہیں اور مالکی فق...
پیرا ہیں۔ قرآن و حدیث پر اعتماد کرتے ہیں، اجماع اور اجتہاد کو قبول نہیں کرتے۔

وہابیوں کی طرح سنوسیوں کا سلسلہ بھی اصلاحِ مذہب سے شروع ہوا تھا اور ایک ام...
سلطنت اُس نے قائم کر لی۔ چونکہ وہ وہابیوں سے قریب تر ہیں، اس لیے اُنھیں حجاز میں بھی
مرکز قائم کر لینے کی اجازت دے دی گئی۔ شمالی افریقہ میں اطالویوں نے دوسری جنگِ عظیم
پیشتر سنوسی خانقاہوں کو بڑے اہتمام سے تباہ کیا۔ اب سنوسی سلسلہ لیبیا میں موجود ہے
موجودہ فرمانروائے لیبیا اس روحانی تحریک کا پیشوا ہے۔

شمالی افریقہ میں تعلیم کے دو ذریعے ہیں: ایک دینی درس گاہیں جو مسجدوں اور خانقاہوں
ساتھ وابستہ ہیں، دوسرے عام سکول جو حکومتوں نے قائم کر رکھے ہیں۔ پچاس سال پیشتر ...
نے اپنے سکولوں میں لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے یکساں تعلیم کی اجازت دے دی تھی، ...
ریاضی، طبیعیات، جغرافیہ اور فرانسیسی زبان پڑھائی جاتی تھی، عام تعلیم کا یہ طریقہ شمالی افریقہ کے
تمام ممالک نے کم و بیش اختیار کر لیا۔ پہلے ان سکولوں میں عربی زبان اور اسلام کی تعلیم کا انتظام
بہت معمولی تھا۔ جب مختلف ملکوں میں قومی حکومتوں نے نشو و ارتقا پایا تو ان چیزوں کی تعلیم
بہت زور دیا گیا، شمالی افریقہ میں اعلیٰ ٹکنیکل تعلیم اور فنی تربیت کے مواقع ابھی تک نا پید ہیں
اس وجہ سے ڈاکٹر، قانون داں اور انجینیر باہر کے ملکوں میں خصوصاً فرانس جاتے ہیں، تاکہ
تربیت حاصل کریں۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس غیر ملکی تعلیم نے شمالی افریقہ کی ثقافت پر بہت بڑا اثر
ڈالا، خصوصاً الجزائر اور تونیسیہ میں۔ الجزائر براہِ راست فرانس کے زیرِ اقتدار ہے، لہٰذا سرکاری
درس گاہوں میں اسلامی اور عربی تعلیم کی طرف توجہ کی کوئی گنجائش نہ تھی؛ البتہ تین سرکاری درس گاہیں
موجود ہیں جہاں ججوں اور قانون دانوں کو شریعت کی تعلیم دی جاتی ہے، لیکن ان درس گاہوں میں
داخل ہونے والوں کی تعداد محدود رہتی ہے، اس لیے کہ صرف اتنے ہی طالب علموں کو تربیت دی...

...ی ہے، جتنی آسامیاں خالی ہونے کا امکان ہو۔

مذہبی درس گاہوں میں قرآن، فقہ اور عربی زبان کی تعلیم دی جاتی ہے۔ یہ درس گاہیں شہروں
...دیہات دونوں جگہ خاصی زوال پذیر نظر آتی ہیں، اس لیے کہ دورِ حاضر کے سکول بہت پھیل گئے
...یہاں تک کہ صحرائی علاقے اور صوفیوں کی خانقاہیں بھی ان سے خالی نہیں رہیں۔ تونیسیہ کے
...ملے میں مراکش کے اندر ایسی خانقاہیں اور درس گاہیں بہت زیادہ ہیں۔ الجزائر کے باشندوں
...نے اسلامی تعلیم کا خاص اہتمام کیا اور جابجا ایسے غیر سرکاری ادارے قائم کر دیے جو موجودہ زمانے
...کے تقاضوں کو پورا کرتے تھے۔ یہ ادارے زیادہ تر شہروں اور دیہات میں موجود ہیں۔ مسلم علمار
...جمعیت ان سکولوں اور درس گاہوں کی اشاعت میں بہت سرگرم ہے اور الجزائر کے تین سو
...ی سکولوں میں سے قریباً ایک سو تیس اس جمعیت کی تحویل میں ہیں۔

یہ امر خاص طور پر قابلِ ذکر ہے کہ شمالی افریقہ کی مسجدیں محض عبادت ہی کی جگہیں نہیں
...ان کے ساتھ عام درس گاہیں بھی ہیں جن میں لوگوں کو مذہبی تعلیم دی جاتی ہے جو علما نمازیں
...لی امام کی خدمت انجام دیتے ہیں وہی تعلیم کے ذمہ دار ہیں اور اوقاف سے اُنھیں باقاعدہ
...ایں ملتی ہیں الجزائر اور تونیسیہ میں انھیں تنخواہیں سرکاری خزانوں سے دی جاتی ہیں اس لیے کہ وہاں مذہبی اوقاف سے حاصل
...نے والا سرمایہ بہت محدود ہے لیبیا میں پہلے ان درسگاہوں میں تعلیم دی جاتی تھی جو بڑی مسجدوں کے ساتھ وابستہ تھیں
...ن کے مصارف اطالوی حکمران ادا کرتے تھے، اب بھی لیبیا میں سنوسیوں کی تین بڑی خانقاہیں
...ں اور ان کے ساتھ پچاس سے زیادہ چھوٹی خانقاہیں بتائی جاتی ہیں۔ ان میں لوگوں کو مذہبی
...علم دے کر اسلامی ثقافت کے قیام و اشاعت کے لیے تیار کیا جاتا ہے۔

مذہب کی تعلیم کا انتظام مراکش میں فاس کی یونیورسٹی اور تطوان کی مسجدِ جامع میں موجود ہے
...ونیسیہ میں ایسی تعلیم کا انتظام جامعہ زیتونہ اور اُس سے وابستہ درس گاہوں میں کیا گیا ہے۔
لیبیا میں اعلیٰ مسجدی تعلیم کے لیے جامعہ بنغازی مرکز بن گئی ہے۔ ان یونیورسٹیوں میں جو

تعلیم دی جاتی ہے، وہ خالص اسلامی ہے، اس کے لیے زبان عربی استعمال ہوتی ہے۔ اس میں نئی قومیت کا عنصر صاف نظر آتا ہے، مراکش کے جنوب میں ایک اور مسجد جامع ہے جس کا تعلق فاس کی یونیورسٹی سے ہے، اسے ابن یوسف کی مسجد کہتے ہیں۔ تونیسیہ کی جامعہ زیتونہ کے ماتحت بیس شاخیں ہیں جو ملک بھر میں پھیلی ہوئی ہیں ان دو یونیورسٹیوں میں جو تعلیم دی جاتی ہے اس میں ثانوی درجے کی ریاضی، ادبیات اور طبعی علوم بھی شامل ہیں۔ جب طالب علم ان مرحلوں کو طے کر لیتا ہے تو پھر اسے فقہ اور ادب میں تخصیص کا درجہ حاصل کرنے کے لیے تیار کیا جاتا ہے۔ جامعہ زیتونہ میں فقہ، الٰہیات، لسانیات، ادبیات اور قرآن کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اعلیٰ مذہبی تعلیم پانے والے طلبہ کی تعداد دو ہزار سے کم نہ ہوگی۔ ان میں سے پندرہ سو صرف تونیسیہ میں ہیں، جامعۂ زیتونہ اور جامعۂ فاس کے ساتھ ایسے کتب خانے ہیں جن میں اسلام کے متعلق بہت سے قیمتی مخطوطات موجود ہیں،

افریقہ کے باقی حصّے افریقہ میں اسلام کی پیش قدمی کے تین دور ہیں۔ چار صدیوں میں اسلام شمالی افریقہ اور سوڈان میں پھیلا۔ چوتھی صدی سے پانچویں صدی کے وسط تک لیبیا کے عیسائیوں، سواحلیوں اور ساحل زنجبار کے باشندوں نے اسلام قبول کر لیا۔ تیسرا دور ۱۱۶۰ھ (۱۷۴۷ء) سے موجودہ صدی کے آغاز تک آتا ہے۔ اس زمانے میں صوفیہ کے سلسلوں نے کیتھولک اور پروٹسٹنٹ مسیحی مشنریوں کے مقابلے میں اشاعتِ اسلام کا فرض انجام دیا۔

پانچویں صدی ہجری (گیارھویں صدی عیسوی) میں جن لوگوں نے اسلام کی اشاعت میں انتہائی سرگرمی دکھائی وہ اُن وحشی قبائل سے متعلق تھے جنھوں نے ایک صوفی شیخ کی کوشش سے اسلام قبول کیا تھا۔ اس شیخ نے سینی گال کے ساحل کے قریب ایک جزیرے پر خانقاہ قائم کر لی تھی، جو صرف جائے قیام، درسگاہ اور مسجد پر مشتمل تھی۔ اس شیخ کے مریدوں میں سے بعض لوگ مرابطین کہلاتے تھے انھوں نے مراکش پر حملہ کر دیا اور مرابطین کی سلطنت قائم کی۔

مریدوں کا ایک اور گروہ برّاعظم کے اندر گھس گیا اور غانہ (گھانا) کی سلطنت پر قبضہ کر لیا جو دریائے سینی گال اور دریائے نائیجر کے درمیان ہے۔ غانہ کے تمام باشندے اسلام کے حلقہ بگوش بن گئے۔ پھر اسلام ان قبائل میں پہنچا جو دریائے نائیجر کے بالائی کنارے پر آباد تھے۔ اسی صدی ہجری میں اسلام ٹمبکٹو پہنچ گیا اور صحرائی لوگ بھی اس کے حلقہ بگوش بن گئے دو صدی کے اندر یہ نائیجریا پہنچا۔ مشرقی افریقہ میں اسلام اُن تاجروں نے پھیلایا جو لباسا اور زنجبار میں تقسیم ہو گئے تھے۔ بعد ازاں اس کے اثرات یوگنڈا اور کانگو تک جا پہنچے۔ گیارھویں صدی ہجری (سترھویں صدی عیسوی) میں اسلام ہندوستانی مسلمانوں کی کوششوں سے جنوب کی طرف بڑھا اور نٹال نیز صوبہ کیپ[1] تک چلا گیا اور ایک حد تک ٹرانسوال اور روڈیشیا میں بھی پھیلا، گویا اسلام برّاعظم افریقہ میں تین راستوں سے داخل ہوا۔ تاجروں کے ذریعے سے جو مصر، مغرب اور زنجبار سے تعلق رکھتے تھے۔ صوفی سلسلوں کے ذریعے سے نیز فاس، زیتونہ اور قاہرہ کی دینی درسگاہوں کے تعلیم یافتہ طلبہ کے ذریعے سے تیسرا ذریعہ یہ ہے کہ مسلم تاجروں اور مذہبی رہنماؤں نے افریقی عورتوں سے شادیاں کر لیں۔

بارھویں اور تیرھویں صدی ہجری (اٹھارھویں اور انیسویں صدی عیسوی) میں افریقہ کے اندر تصوف کے ساتھ بڑی دلچسپی کا اظہار کیا جاتا رہا۔ یہی وجہ ہے کہ قادری اور شاذلی طریقے وہاں از سرِ نو زندہ ہوئے اور دو نئے طریقوں کی بنیاد پڑی ایک تیجانی اور دوسرا سنوسی۔ قادری طریقے کے پیروؤں نے افریقہ میں اسلام کی اشاعت کے متعلق سب سے بڑھ کر سرگرمی دکھائی۔ انھوں نے تعلیم اور تجارت کو اشاعتِ مذہب کا ذریعہ بنایا۔ وہ لوگ بڑے روادار تھے، اور یہ رواداری اُنھیں بانیِ طریقہ سے میراث میں ملی تھی یعنی حضرت شیخ عبد القادر جیلانیؒ۔ یہ شیخ ممدوحؒ چھٹی صدی ہجری (بارھویں صدی عیسوی) میں حضرت مسیح علیہ السلام کے لیے انتہائی احترام کے باعث مشہور تھے اور آپ اکثر کہا کرتے تھے۔ ہم صرف اپنے لیے دعا نہیں کرتے بلکہ ہر

[1] CAPE PROVINCE جنوبی افریقہ کا انتہائی جنوبی صوبہ جس کا مرکز کیپ آف گڈ ہوپ یا راس امید ہے۔

اُس وجود کے لیے کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی رحمت سے خلق ہوا۔ قادریوں نے افریقہ میں
کے ساتھ خانقاہیں قائم کیں، بلکہ دیہات میں بھی سکول قائم کر دیئے جہاں کوئی خانقاہ نہ تھی،
اپنے بہترین طلبہ فاس، زیتونہ اور قاہرہ کی اعلیٰ دینی درس گاہوں میں بھیجتے تھے تاکہ وہ بہتر
تربیت پائیں اور لوٹیں تو اعلیٰ درجہ کے مذہبی رہنما اور مبلّغ ہوں۔

شاذلی طریقہ مغرب میں سب سے پہلا صوفی طریقہ تھا، اس کا مرکز مراکش میں تھا اور اس
کے پیرو اپنے قائدوں کا حکم انتہائی سرگرمی سے مانتے تھے خواہ وہ گھر پر رہتے یا تبلیغ کے لیے باہر بھیجے جاتے تھے
کی بنیاد فاس (مراکش) میں پڑی اور اس پر ابھی دو سو سال کی مدت بھی پوری نہیں ہوئی یہ طریقہ سوڈان میں خوب پھیلا سنوسی طریقے
بحث ہو چکی ہے، یہ سوڈان مغربی مصر اور جھیل چاڈ[1] کے آس پاس وسطی افریقہ میں پھیلا۔

تصوّف کے یہ طریقے بہ ظاہر ایک دوسرے سے بہت ملتے جلتے تھے۔ رسول
صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت اور شیفتگی ان کی روحِ رواں تھی۔ مذہبی فرائض کے وہ بہت
سے پابند تھے، شرعی قوانین پر چلتے اور اپنے بزرگوں کا احترام کرتے۔ تاہم بعض فروع
میں مختلف تھے۔ ہر طریقے کے اپنے اوضاع تھے۔ بعض ایک ایک سو دانوں کی تسبیح پر
کرتے، دوسرے صرف بارہ دانوں کی تسبیح استعمال کرتے۔ سنوسی دوسروں کے ساتھ
پڑھ لیتے اور اکٹھے بیٹھ کر ذکر کر لیتے لیکن تیجانی علیحدگی کو ترجیح دیتے۔

افریقہ کے لوگوں میں اشاعتِ اسلام کے لیے صوفیہ کی کامیابی کے کئی وجوہ ہیں
اسلام یُسر اور سادگی کا مذہب ہے، جو شخص اس میں داخل ہوا اس سے صرف یہ مطالبہ کیا جاتا
ہے کہ کلمۂ شہادت پڑھے اور مذہبی فرائض ادا کرتا رہے جنھیں ادا کرنا ہرگز مشکل نہیں پھر اسلام
کا ایک اجتماعی کردار ہے جو گروہ کے لیے وجہِ تقویت بنتا ہے۔ مثلاً آدمیوں کو بھائی بھائی
بنا دیتا ہے، اُن میں کوئی امتیاز باقی نہیں رہتا، سفر تجارت اور روزی پیدا کرنے میں بڑی سہولتیں
مل جاتی ہیں پھر صوفیوں کے طور طریقوں میں بعض چیزیں ایسی ہیں جو افریقی قبائل کے اپنے بھی

[1] [illegible] فرانسیسی سوڈان کی جھیل ہے جو نائیجریا کے شمالی و مشرقی گوشے کے نزدیک واقع ہے۔

شدہ طور طریقوں سے ملتی جلتی ہیں۔ مثلاً وہ روزانہ شیخ کے گرد جمع ہو کر ذکر کرتے ہیں، نیز
انی قوتوں اور اجتماعی زندگی پر ان کا پختہ عقیدہ ہے۔
بلاشبہ اہل افریقہ میں اسلام ان کے سابقہ رسم و رواج کے اثرات سے محفوظ نہ رہ سکتا تھا
یہ درست ہے کہ اسلام اپنی اصل شکل میں اُن تک نہیں پہنچا، تاہم اِس دینِ حق کے قبول کر
نے سے اُن پر واضح اثرات پڑے، اسلام کی وجہ سے اُن میں توحید پھیلی، اور کفر بالکل ختم ہو گیا
پہلے روحوں کی پرستش کرتے تھے اور اس غرض سے کسی جانور یا غیر جاندار شئے کا بُت بنا
بطور نشان رکھ لیتے تھے۔ افریقہ میں اشاعتِ اسلام سے تعلیم کو تقویت پہنچی، اس لیے کہ ہر خانقاہ
ساتھ ایک درس گاہ ضرور قائم ہو گئی جس میں قرآن مجید کے علاوہ لکھنا پڑھنا سکھایا جاتا تھا،
ام نے کافروں میں اعلیٰ درجے کی اخلاقی قدریں رائج کیں۔ اُنھوں نے زناکاری اور شراب نوشی
سے روک دیا۔ لطافت و پاکیزگی کو رواج دیا۔ وہ پانچ وقت نماز کے لیے وضو کرتے ہیں
باعث نماز پڑھی جاتی ہے۔ اس سے اُن میں تعاون کی روح پیدا ہوئی۔ کھیتی باڑی اُن
پیشہ ہے جس کے لیے تعاون حد درجہ مفید ہے۔
افریقہ میں ایسے لوگ بھی نمودار ہوئے جنھوں نے مہدی ہونے کا دعویٰ کیا، یعنی ایسا
دجس کے متعلق بتایا گیا ہے کہ وہ آئے گا تو ظلم کو مٹا دے گا اور دنیا کو عدل سے بھر دے
اس قسم کا ایک مدعی ۱۲۴۴ھ (۱۸۲۸ء) میں سینیگال کے اندر نمودار ہوا۔ اُس نے ایک
لابی تحریک جاری کر دی جو ناکام رہی اور وہ مارا گیا۔ مشہور ترین مہدی سوداں میں ۱۳۰۰ھ
۱۸۸۰ء) میں نمودار ہوا اور مصر کے خلاف زبردست تحریک کھڑی کر دی، مصری فوج کے
تھ متعدد لڑائیاں ہوئیں جن میں کامیابی کے باعث اُس کا اثر رسوخ بہت بڑھ گیا اور وہ
دان کا فرماں روا بن گیا۔ تین سال بعد اُس نے وفات پائی تو مریدوں میں سے ایک شخص اُس
جانشین بنا۔ وہ مصر پر حملے میں ناکام رہا، ملک کے اندر اُس کے خلاف بغاوت ہو گئی۔
۱۳۱۶ھ (۱۸۹۸ء) میں لارڈ کچنر نے اُسے شکست فاش دی۔ اسی زمانے میں ایک

مہدی صومالیہ میں نمودار ہوا۔ اُس کی ابتدا بھی صوفیانہ توجہات سے ہوئی آخر اُس نے
کا دعویٰ کر دیا اور اُس کے اپنے قبیلے میں اثر و رسوخ بہت بڑھ گیا۔ پہلی جنگِ عظیم
خاتمے پر اطالویوں نے صومالیہ سے اس کا اثر ختم کیا۔ اُس نے ۱۳۳۹ھ / ۱۹۲۰ء
وفات پائی۔[1]

اب افریقہ میں یہ رجحان زوروں پر ہے کہ اسلام کو اجنبی بدعات سے پاک کر
یہ جذبہ ان طلبہ میں پیدا ہوا ہے جو قاہرہ یا شمالی افریقہ کی دوسری درس گاہوں میں تعلیم پا
وہ اصلاحی تحریکات کے متعلق نئے خیالات و افکار لے کر اپنے وطنوں کو لوٹتے ہیں
نے روشن خیال مسلمانوں سے سنے۔ وہ نوجوان جب دیکھتے ہیں کہ مصر یا عرب کے
ممالک میں صوفیہ کی سرگرمیاں اپنی اصل حیثیت کھو بیٹھی ہیں تو ان کے دل میں کوئی شبہ
رہتا کہ یہی حالت دنیائے اسلام کے دوسرے حصوں میں بھی ضرور پیش آئے گی
علاوہ مسلمانوں میں تعلیم کا ذوق پیدا کرنے کا جذبہ بھی پایا جاتا ہے۔ لاریب دین کو
بدعات سے پاک کرنے کی صورت اس کے سوا کچھ نہیں کہ اسلام کے اصل سرچشمہ
طرف غور کیا جائے، یعنی کتاب و سنت کا مطالعہ کیا جائے اور غور و تدبر سے انھیں

---

[1] یہاں یہ بتا دینا چاہیے کہ مقالہ نگار کی بعض تصریحات نظرِ ثانی کی محتاج ہیں، سینیگال
مہدی کے متعلق زیادہ معلومات پیشِ نظر نہیں، لیکن سید محمد احمد جو مہدیِ سوڈان مانے جاتے ہیں
ہی نیک اور بزرگ آدمی تھے۔ جس حد تک میں معلوم کر سکا ہوں انھوں نے کبھی مہدویت کا د
نہ کیا، البتہ مختلف لوگوں نے انھیں مہدی قرار دے دیا۔ میرے نزدیک یہ لفظ اصطلاحی معنوں میں
لغوی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ صومالی مہدی سے اشارہ غالباً ملا محمد کی طرف ہے اس لیے
میں انھیں کی وفات ہوئی، انگریز انھیں دیوانہ ملا کہا کرتے تھے۔ وہ بھی اپنے کو اجنبی تسلط سے نجات دلانے کے
لڑتے رہے ان کی لڑائیاں زیادہ تر انگریزوں سے ہوئیں۔ اگرچہ انھوں نے وفات اطالوی صومالی لینڈ میں پائی ممکن
دوسرے شخص کی طرف اشارہ ہو جس کے متعلق علم نہیں۔

صوفیہ کا انحصار زیادہ تر القا پر ہوتا ہے۔ اگرچہ پڑھے لکھے آدمی قرآن مجید پر غور کریں گے
ان کی باتوں کی خود بخود اصلاح ہو جائے گی۔

جو کچھ بیان ہو چکا ہے، اس سے بالکل واضح ہے کہ جب دنیائے اسلام میں تعلیم
عام تھی اور تہذیب فروغ پر تھی تو اسلامی ثقافت کے مذہبی پہلو بہت روشن تھے
مذہب میں ضعف پیدا ہوا اور وہ استادہ ہو گئی تو مذہب کو بھی نقصان پہنچا۔ مثلاً عباسیوں
میں اسلامی ثقافت تیزی سے ترقی کر رہی تھی اور مذہبی عبادتوں کی تعبیر زمانے کے
درجہ فکر و نظر کے مطابق کی جاتی تھی جب تنزل شروع ہوا تو مسلمان عبارتوں کی
پابند ہو گئے اور اسلام کے اصول و فروع میں اجتہاد کا دروازہ بند کر دیا گیا۔

اسلامی ثقافت پر ماحول کے ثقافتی، مجلسی اور سیاسی حالات کا بھی اثر پڑا۔ اس دعوت
بھی اثر پڑا جس سے مسلمان دوچار ہو گئے تھے۔ یہی دعوت مقابلہ تھی جس نے مسلمانوں
غور و فکر کے لیے آمادہ کیا اور وہ اسے ایسی صورت میں پیش کر سکے جو اجنبی تصرفات
ل پاک تھی چونکہ ثقافتی، مجلسی اور سیاسی حالات سازگار تھے اور مذہب کو دعوتِ مقابلہ
بلقہ پڑا تھا اس لیے عراق اور مصر میں اسلامی ثقافت بلند سطح پر جا پہنچی جن قبائل
بال بہت قدیم رنگ میں گزر رہی تھیں یعنی وہ تہذیب سے الگ تھلگ تھے اور
مذہب کو کسی دعوتِ مقابلہ سے سابقہ نہ تھا، وہاں اسلام کچھ ترقی نہ کر سکا بلکہ ساکن

صوفیہ کے سلسلے افریقہ کے ان پڑھ قبائل ہی میں رائج ہوئے، اس لیے کہ ان پڑھ
پنے مذہب کو سمجھنے کے لیے ملا دوسروں پر بھروسہ کرتے ہیں۔ اس کے برعکس
لکھے مسلمانوں کی کوششیں یہ ہوں گی کہ خود قرآن پڑھیں اور اس سرچشمے سے اسلام
ں۔ ان پڑھ ناخواندہ آدمیوں کا رجحان یہ ہوتا ہے کہ مذہب ان کے سامنے ایسے
پیش ہو جو ان کے قوائے مفکرہ کے لیے سازگار ہو۔ یہی وجہ ہے کہ پڑھے لکھے مسلمان

اس طریق پر قانع نہیں۔ وہ صوفیہ کی تمام ایجاد کردہ بدعات کو ناپسند کرتے ہیں مثلاً پیر
اور مرشدوں کا حد سے زیادہ احترام۔ ان کے مقبروں پر جاکر دعائیں مانگنا، مذہبی رہنما
کو اپنے اور خدا کے درمیان واسطہ بنانا یا حد اعتدال سے متجاوز رہبانیت۔ چونکہ
مسلمان تہذیب کی رفتار کا ساتھ دینے سے قاصر تھے اور ان میں ناخواندگی عام تھی تو پڑھے
لکھے لوگ صرف تھوڑی تعداد میں پائے جاتے تھے ان کا خیال یہ تھا کہ مذہب ہی
کچھ ہے اور اسی پر ان کی حالت کا مدار ہے لیکن مذہب تو تہذیب کا صرف ایک عامل
اس سلسلے میں اور بھی موثر عوامل ہیں مثلاً تعلیم، سائنٹفک طریق پر غور و فکر، قانون ساز
سیاسیات مجلسی اور اقتصادی ادارے اور ایسی دوسری چیزیں۔ اگر مسلمان زیادہ
واقفیت پسندانہ نقطہ نگاہ سے اپنی پس ماندگی کے اسباب پر غور کرتے تو انھیں معلوم
جاتا کہ مذہب ہرگز ان کی پس ماندگی کا ذمہ دار نہیں۔ مغرب کے بعض عالموں نے بھی
غلطی کا ارتکاب کیا۔ وہ بھی مسلمانوں کی پس ماندگی کو ان کے مذہب سے منسوب کرتے
رہے۔ اگر حقیقت یہی ہوتی تو مسلمان ہر دور اور ہر مقام پر پس ماندہ ہی ہوتے مگر حقیقت
اس کے خلاف ہے۔ اسلامی ثقافت کی جو کیفیت دورِ عروج میں تھی، وہ دورِ زوال
بالکل مختلف تھی۔ اسی طرح جو لوگ کہتے ہیں کہ زمانہ حال میں اسلام کو دورِ حاضر کے انداز
مطابق ان مسلمانوں نے پیش کیا جو رسمی لحاظ سے عالم نہ تھے، انھیں یہ حقیقت بھی پیش
رکھنی چاہیے کہ صرف یہی لوگ تھے جنھوں نے ایک حد تک علم حاصل کیا تھا۔
سامجو فضلا اب اسلامی ثقافت کا مطالعہ کر رہے ہیں، وہ بتاتے ہیں کہ دورِ حاضر کے ا
عربی معاشرے پر اثر انداز ہونے والے عوامل یہ ہیں۔

لہ جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے، مقالہ نگار کے ذہن میں مذہب کا مفہوم صحیح نہیں۔ مذہب اپنے اصل
میں پوری انسانی زندگی پر حاوی ہے، ریاست، اقتصادیات یا خدمت و روابط عوام کا کون سا دائرہ ہے جو
مذہبی قدروں پر عمل کیے بغیر صحیح اور متوازن حیثیت پیدا ہو سکتی ہے یا قائم رہ سکتی ہے!

۱۔اہل مغرب کے افکار جو تعلیم اور اہل مغرب کے ساتھ زیادہ ربط ضبط کی وجہ سے معاشرے میں داخل ہوئے۔
۲۔اشتراکی تصورات جو دنیا بھر میں پھیلے ہوئے ہیں۔
۳۔کمیونسٹ (شمالی) اصول جو مذہب کے لیے بہ حیثیت عمومی دعوت مقابلہ ہیں۔
۴۔یونیورسٹی یعنی اعلیٰ تعلیم کا پھیلاؤ۔
۵۔اعلیٰ تعلیم کی غرض سے مسلم خواتین کا داخلہ یونیورسٹیوں میں۔
۶۔یونیورسٹیوں میں قدیم و جدید فلسفے کی تعلیم۔
۷۔دور حاضر کی اسلامی تحریکات جن کا اثر خاصا پڑا۔
ان عوامل کی کارفرمائی کا نتیجہ یہ ہوا کہ عربی دنیا کی اسلامی ثقافت میں مندرجہ ذیل رجحانات ہوئے:
۱۔ایک نئی تحریک جس کا مدعا یہ ہے کہ مذہب کی قدروں کا جائزہ از سر نو لیا جائے۔
۲۔اسلام کے بنیادی اصول سے تعلق رکھنے والے مباحث پر غور و خوض کے لیے سائنسی تحقیق کے ذرائع کا استعمال۔
۳۔شریعت کا از سر نو مطالعہ تاکہ سول قانون سے اس کا تعلق واضح ہو جائے۔
۴۔صوفیہ کے سلسلوں کی شکست شروع ہو گئی۔
۵۔مختلف اسلامی فرقوں کے درمیان مصالحت بڑی تیزی سے جاری ہے۔
۶۔اسلام کو ہر اجنبی فکر سے پاک کرنے کی کوشش۔
۷۔مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان مذہبی جھگڑے ختم ہو رہے ہیں۔
۸۔قرآن مجید کو مختلف زبانوں میں ترجمہ کرنے کا شوق بڑھ رہا ہے۔
۹۔فتوے جاری کرنے کا دستور گھٹ رہا ہے۔
۱۰۔مذہب کو اس کے حدود میں رکھنے کے لیے ابتدائی قدم اٹھایا جا رہا ہے تاکہ

تہذیب کو بے مزاحمت اختیار کیا جا سکے

سب سے آخر میں یہی یاد رکھنا چاہیے کہ اگرچہ عرب اور افریقہ کے بعض ملکوں کے م
آزادی حاصل کر چکے ہیں لیکن جب تک تمام آزاد نہ ہو جائیں تحفظ، امن اور خوشحالی کا آگا دور ن
ہی نہیں ہو سکتا اور اسلامی ثقافت کے نشو و ارتقا کے لیے یہ دور ضروری ہے مسلمان ا
وقت خدا اور انسان کے درمیان تعلق پر غور کریں گے۔ اسی وقت وہ نئے افکار اور علم کی
میں مذہب کو سمجھنے کے لیے متوجہ ہوں گے۔ اس کے بعد ہی اسلامی ثقافت کے
فروغ و ترقی کی امید رکھی جا سکتی ہے۔

[سا]تواں باب

اسلامی ثقافت ترک خطوں میں

(استاذ حسن بصری قنطائی)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ترک بلقانات سے بحیرۂ چین کے ساحل تک پھیلے ہوئے ہیں۔ ترکی کے علاوہ وہ یونان [یو]سلافیا، البانیا، رومانیا، بلغاریا اور قبرص میں بھی موجود ہیں۔ سویٹ روس میں ترک مسلمانوں کی بہت [بڑ]ی تعداد قفقاز، آذربائیجان اور دریائے والگا کے طاس میں پائی جاتی ہے، مثلاً ترکمان، [تا]ق، ازبک، تاجیک اور کرغز۔ شمالی عراق، ایران، افغانستان، پاکستان، ہندوستان، سنکیانگ [ک]وریہ، منگولیا اور چین میں بھی ترک بجا بجا آباد ہیں۔ یہ تمام مسلمان اور ہموما گرشنی ہیں اور وہ جمہوریۂ [ترک]یہ کو اپنی ثقافت کا مرکز سمجھتے ہیں۔ بہ حیثیت مجموعی ترک مسلمانوں کی تعداد ساڑھے سات کروڑ [ک]ے قریب ہوگی گویا یہ دنیا بھر کے مسلمانوں کا ⅕ سے کسی قدر کم حصہ ہیں۔

ترک اقوام عالم میں سے قدیم ترین قوم ہیں اور یہ لوگ وسیع خطوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ [اسل]ام کے حلقہ بگوش بننے سے پیشتر ان کی مختلف آبادیوں نے مختلف مذاہب اختیار کر [ر]کھے تھے، مثلاً کچھ لوگ شامنی مذہب[1] کے معتقد تھے، بعض مانی، زرتشت کنفوشیس [او]ر بدھ کے پیرو رہے۔ شامنی مذہب اور بدھ مت ان میں زیادہ ہر دلعزیز رہا، لیکن خاص طور

---

[1] شامنی کے لفظی معنی یورال اور الطائی کے علاقے کی زبان میں "پروہت" یا "مذہبی پیشوا" [ہیں]۔ شامنی مذہب" کا عقیدہ یہ ہے کہ بدروحیں انسان کے لیے مصیبتیں پیدا کرتی ہیں اور انہیں دور کرنے [کی] قدرت پروہتوں کو حاصل ہے۔

پر قابلِ توجہ امر یہ ہے کہ مذہب کے بارے میں اُن کے درمیان باہمی رزم و پیکار کبھی نہ ہوئی
بعض نسلیں بہت متعصب ہیں، جیسے سلافی نسل لیکن ان کے برعکس ترک مذہبی معاملات
میں ہمیشہ سے رواداری چلے آتے ہیں، البتہ یہ ایک حقیقت ہے کہ سابقہ مذاہب نے ترکوں
کو کبھی مطمئن نہ کیا اور اِسی وجہ سے وہ برابر مذہب تبدیل کرتے رہے، بہ حیثیت قوم
غلامی کے کبھی قائل نہ ہوئے۔ دوستوں کے ساتھ وفاداری ان کا خاص وصف ہے
بزرگوں کی بہت عزت کرتے ہیں۔ غیروں سے ان کا برتاؤ انصاف پر مبنی ہوتا ہے، بچوں
ساتھ انتہائی شفقت و محبت سے پیش آتے ہیں۔ ان کے سینے انسانیت کے اعلیٰ
مقاصد و عزائم سے معمور تھے، لہٰذا وہ اِن پرانے مذہبوں کے محدود دائروں میں مطمئن
نہ رہ سکتے تھے اور کسی ایسے مذہب کی تلاش میں تھے جو اُن کی کشادہ دلی اور فراخ حوصلگی
کے لیے سازگار ہوتا۔

وہ کسی ایسے مذہب کو دل سے پسند نہیں کر سکتے تھے جو عقل و دانش کی مذمت
افسانوں اور اوہام پر اُس کا انحصار ہوتا اور وہ عمل و سرگرمی کے بجائے کاہلی اور تن آسانی کو
دیتا، انسان کو انسان کا غلام بناتا یا فطرت کو دیوتا قرار دے کر اُس کی پوجا پر مجبور کرتا،
کسی ایسے مذہب کے آرزومند تھے جو پوری انسانیت کو اپنے حلقے میں لے لیتا۔ انسان
کو انتہائی اخلاقی و روحانی بلندیوں پر پہنچا دیتا اور ثابت قدمی کے ساتھ سیدھے راستے کی
طرف لے جاتا یعنی جو انسان کو دنیا اور آخرت دونوں کی راحتوں اور آسودگیوں پر پہنچا دینے
والا ہوتا۔ اسلام قبول کرنے سے پیشتر وہ جن مذاہب کے پابند تھے، اُن کے باب میں شاید
اس لیے بھی ایک دوسرے سے لڑتے جھگڑتے نہ تھے کہ اُن مذاہب پر اُنھیں زیادہ
یقین و وثوق نہ تھا، اسلام نے ترکوں کو تمام چیزیں دے دیں، جن کے وہ آرزومند تھے۔
جب یہ مذہبِ حق اُن کے سامنے پیش ہوا تو وہ جوق در جوق اور گروہ در گروہ اس میں شامل
ہو گئے اور آج تک اُس کے ثابت قدم پیرو نیز زبردست محافظ چلے آتے ہیں۔

جب ترکوں نے اپنا آبائی وطن چھوڑا اور نئی آسائش گاہوں کی تلاش میں ادھر اُدھر
ے تو انھوں نے بے شمار حکومتیں قائم کیں اور متعدد سلطنتوں کی بنیادیں ڈالیں، انھوں
بہت سی سرزمینوں پر حملے کیے اور خود اُن پر بھی حملے ہوئے، لیکن فتح یا شکست دونوں
ں میں وہ اپنے سرداروں کے وفادار رہے اور دونوں حالتوں میں انھوں نے اپنی
روایات اور ثقافت سے تمسک اختیار کیے رکھا، ترکستانی سرزمینوں میں بے باک
ار رہے ہیں۔ انھوں نے ہمیشہ بہادری اور جواں مردی کا ثبوت دیا ہے۔ فتح و شکست
ں میں حلم و بردباری سے کام لیتے رہے ہیں۔ دوستوں کے وفادار، دشمنوں کے لیے
رجہ خوفناک لیکن مفتوحوں کے ساتھ انھوں نے ہمیشہ کشادہ دلی کا برتاؤ کیا۔ وہ اپنے
ب، اپنے نصب العین اور اپنے وطن کے لیے زیادہ سے زیادہ غیرت مندی کا ثبوت
کرتے رہے، ساتھ ہی دوسروں کے حقوق و عقائد کا احترام بھی ہمیشہ جاری رکھا۔ انھوں
اپنے وطن کی حفاظت کے لیے ہمیشہ جانیں لڑائیں اور کسی دوست کی امداد میں بھی اپنی
یاں قربان کرتے وقت ہرگز تامل نہ کیا۔ یہ ہمیشہ سے ترکوں کے اوصاف و خصائص
آ رہے ہیں اور آج بھی یہی اوصاف و خصائص اُن میں درخشاں نظر آتے ہیں۔ اِن کی شہادتیں
دری سمجھی جائیں تو زمانۂ قدیم کی داستانیں سنیے، صلیبی جنگوں کی کہانیاں ملاحظہ فرمایئے
، عالم گیر جنگ میں دردانیال کے دفاع کی سرگزشت ملاحظہ کیجیے۔ ترکوں کی طویل تاریخ
بے روشن واقعات سے بھری پڑی ہے۔

بہت سے مصنفوں نے ترکوں کی مدح و ستائش کی ہے۔ تیسری صدی ہجری کے
ل میں ایک عرب مصنف جاحظ لکھتا ہے:

ترک یا تو گلہ بانی کرتے ہیں یا تانبے پیتل کے برتن بناتے ہیں، مویشیوں کا
علاج کرتے ہیں اور وہ فن کار ہیں وہ اتنے ماہر ہوتے ہیں کہ انھیں کسی امداد
کی ضرورت نہیں پڑتی۔ خوشامد، ریاکاری، چغلی، شرانگیزی اور جاسوسی سے

اُنھیں کوئی سروکار نہیں، وہ شان و شکوہ اور نمائش کا کوئی خیال نہیں کرتے
اُنھیں اپنے وطن سے محبت ہے، آزادی اور خود مختاری پر جان دیتے
ہیں۔

ایک اور عرب مصنّف یزید ابنِ مزید کہتا ہے:
تُرک گھوڑے پر سوار ہوتا ہے تو اُس کے لیے بوجھ نہیں بنتا۔ جس زمین
پر چلتا ہے اُس کے لیے بھی بار کبھی نہ ہوگا۔ ہمارے سوار سامنے کی چیز
بھی نہیں دیکھتے، ترک پیچھے کی چیزوں سے بھی خبردار ہوتا ہے۔ وہ ہمیں اپنا
شکار سمجھتا ہے۔ اپنے گھوڑے کو غزال اور اپنے آپ کو شیر قرار
دیتا ہے۔

سمامہ ابنِ اشرس کہتا ہے:
تُرک خود نہیں ڈرتا، دوسروں کو ڈراتا ہے۔ وہ ہمیشہ ایسے کاموں میں ہاتھ
ڈالتا ہے جو اس کی طاقت سے باہر ہوں۔ جب تک تھک نہ جائے سوتا
نہیں۔ سوتا ہے تو اس انداز میں گویا اُس کی ایک آنکھ کھلی رہتی ہے۔

مشہور صوفی شاعر مولانا روم فرماتے ہیں:
تُرک کی حفاظت کسان کو اس قابل بنا دیتی ہے کہ وہ اجنبیوں کو خراج ادا کرنے
پر مجبور نہیں ہوتا۔

حدیث میں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے ترکوں کا ذکر ہوا ہے
فرمایا:
اگر تم ترکوں سے نہیں لڑو گے تو قیامت نہیں آئے گی۔
ایک اور موقع پر فرمایا:
جب تک ترک حملہ نہ کریں، اُن سے نہ لڑو۔

اسی ارشاد کی تعمیل میں خلیفۂ ثانی حضرت عمرؓ نے اسلامی فوج کے سالارِ اعظم کو حکم دے
کہ ایران پر قبضہ ہو چکا ہے اب شاہِ ایران کا تعاقب نہ کیا جائے جس نے ترک ہمایوں کے
پناہ لے لی ہے۔ مسلمانوں نے ان حدیثوں کی پابندی کی اور ترکوں کے ساتھ خوش گوار
ت کی پالیسی قائم رکھی۔ یہ پالیسی اُن کے قبولِ اسلام سے پیشتر بھی جاری رہی اور قبولِ
م کے بعد بھی۔ ترک جارحانہ اقدام سے احتراز کی پالیسی کا احترام کرتے رہے جب اُن
ام کی حقیقت منکشف ہوئی تو اسے اپنے دل کی آرزوؤں کی تسکین کا ذریعہ پایا اور
ن ہو گئے۔

اسلام نے ترکوں کو غلط عقیدوں اور اوہام پرستیوں سے بچالیا، اُن کے کردار کو تقویت
ی اور انسانیت کے سچے حقائق انھیں سکھا دیے — یوں ترک اسلام کے مخلص ترین
ی بن گئے۔ وہ اپنی درس گاہوں، عالموں اور پیرانِ طریقت کے ذریعے سے اسلام کی
ت و برتری اور توسیع و اشاعت کے لیے برابر کوشاں رہے، اُن کی زندگیاں اپنے
ب کے ایسے نمونے پیش کرتی تھیں جو دل موہ لیتے تھے اور انھوں نے پُرامن وسائل
کام لے کر اسلام کو دُور دور تک پھیلایا۔ ترکوں نے بزورِ شمشیر جو فتوحات حاصل کیں وہ فوجی
تصادی مقاصد کے لیے تھیں۔ یہ غرض نہ تھی کہ غیر مسلموں کو جبراً اسلام میں داخل کریں۔ یقیناً
ں نے اسلام کی حفاظت کے لیے تلوار استعمال کی نہ کہ توسیع و اشاعت کے لیے اور
ی جب ضرورت پیش آگئی تو اس کے لیے کوشش کا کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا اور ضرورت
تو اپنی جانیں بھی قربان کر دیں۔ اسلامی ملکوں کی شاہراہیں اور پگڈنڈیاں اُن بہادروں کی
ل سے پٹی پڑی ہیں جنھوں نے اسلام کی حفاظت میں جانیں دی ہیں۔ اگر ترک اسلام کی
ت کے لیے سپر بن کر نہ کھڑے ہو جاتے تو یورپ کے بددیانت اور متعصب حملہ آور اسلام
پیچھے دھکیلتے دھکیلتے صحرائے عرب میں پہنچا دیتے۔

ہجرت سے تین سو سال بعد شرقِ اوسط کی اسلامی دنیا میں امور و معاملات کی باگ ڈور

عربوں کے بجائے ترکوں کے ہاتھ میں آگئی تھی لیکن انھوں نے کبھی محافظِ اسلام کا لقب
اختیار نہ کیا۔ وہ اسلام کے پابند رہے، اُسے اپنا لیا، اُس کی حفاظت کی کما حقہٗ اپنی گھر میں
اور احترام کو کمال پہ پہنچا دیا، لیکن یہ دعویٰ کبھی نہ کیا کہ وہ اسلام کے محافظ ہیں۔ اُن کے
احساسات اور تاثرات کا اندازہ سلطان محمود غزنوی کے واقعے سے ہو سکتا ہے جب وہ
مرض الموت میں مبتلا تھا اُس کے درباریوں نے اظہارِ رنج و غم کرتے ہوئے کہا: "آج
جب آپ ہمارے ساتھ نہ ہوں گے تو اسلام کی حفاظت کون کرے گا۔" سلطان نے بڑی
سے تردید کرتے ہوئے کہا: "میں کون ہوں جو اسلام کی حفاظت کا دعویٰ کر سکتا ہوں؟ خدا
قادر و توانا، اسلام کا محافظ ہے۔"

پھر جب سلطان سلیم نے خلافت کا منصب سنبھالا (۹۱۸ھ، ۱۵۱۲ء) تو امام
خطبہ پڑھتے وقت یہ بھی کہا کہ سلطان حرمین شریفین یعنی مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کا مالک
سلطان نے یہ سنتے ہی امام کو روک دیا اور کہا: "کہیے میں حرمین شریفین کا خادم ہوں" چنا
یہ خطاب خلافت کے خاتمے تک قائم رہا۔ بے شک اسلام کا محافظ رہتی دنیا تک صرف
ہے جیسا کہ قرآنِ مجید میں فرمایا گیا ہے:

إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ بلاشبہ خود ہم نے قرآن (جو سراپا نصیحت ہے) اتارا او

(الحجر: ۹) بلاشبہ ہم ہی اُس کے نگہبان ہیں۔

اسلام اور ترکوں کی وحدت کمال کے اس درجے پر پہنچ گئی تھی کہ اہلِ مغرب عموماً ترک کو م
کا مترادف سمجھتے تھے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ عثمانی ترکوں کو یورپ میں اور شرقِ اوسط میں جو برتر
اور عظمت حاصل ہوئی تھی، وہ اسلام کے ساتھ گہری وابستگی ہی کا نتیجہ تھی۔ اسلام
سے پہلے ایک ایسا روحانی رشتہ قائم کرتا ہے جسے کوئی مادی طاقت توڑ نہیں سکتی۔ اگرچہ
تبلیغ کے لیے کوئی کوشش نہ کی گئی تاہم اسلام ترکوں میں برابر پھیلتا رہا۔ اُن کے غیر م
ہمسایوں اور اہلِ یورپ کی طرف سے جو دھمکیاں دی گئیں، جو یورشیں کی گئیں اور جن

انسانوں کا ارتکاب ہوا، وہ ہرگز اثر انداز نہ ہو سکیں۔ اسلام ہر شے کو اپنے اندر جذب کر لیتا اور خود جذب نہیں ہوتا جو شخص اسلام اختیار کرتا ہے وہ اسے چھوڑتا نہیں اور چھوڑ سکتا ہیں جب کوئی مذہب کسی قوم میں پھیل جاتا ہے اور اُس کی جڑیں جم جاتی ہیں تو سمجھ لیتا ہے کہ وہ مذہب قوم کے مقاصد و عزائم اور روحانی ضرورتوں کو ہر لحاظ سے پورا کرتا ہے معاملہ ترکوں کو پیش آیا۔

اسلام کو عربی تہذیب اور ثقافت کی پیداوار قرار دینا سراسر گمراہ کن ہے اسلام نہ عربوں ملکیت ہے، نہ ترکوں کی اور نہ کسی دوسری قوم کی۔ یہ اللہ تعالیٰ کی استوار کی ہوئی ایک نہ ہے جس کے مخاطب روئے زمین پر بسنے والے تمام انسان ہیں۔ قرآنِ مجید کا د ہے:

تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلَّآ اَسْمَآءً مَّیْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّآ زَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ اِنِ حُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اهُ ذٰلِكَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ نَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ ٥

(یوسف: ۴۰)

تم خدا کے سوا جن ہستیوں کی بندگی کرتے ہو اُن کی حقیقت اس کے سوا کیا ہے کہ چند نام ہیں جو تم نے اور تمہارے باپ دادوں نے رکھ لیے ہیں، اللہ نے ان کے لیے کوئی سند نہیں اتاری، حکومت تو اللہ ہی کے لیے ہے۔ اُس کا فرمان یہ ہے کہ اسی کی بندگی کرو اور کسی کی نہ کرو، یہی سیدھا دین ہے، لیکن اکثر آدمی ایسے ہیں جو نہیں جانتے۔

نْ یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ یْكُمْ جَمِیْعَا نِ الَّذِیْ لَهٗ مُلْكُ سَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ یٖ وَیُمِیْتُ

(اعراف: ۱۵۸)

اے پیغمبر کہو، اے افرادِ نسلِ انسانی میں تم سب کی طرف خدا کا بھیجا ہوا آیا ہوں، وہ خدا کہ آسمانوں اور زمین کی ساری بادشاہت اُسی کے لیے ہے کوئی معبود نہیں، مگر اسی کی ایک ذات، وہی جلاتا ہے وہی مارتا ہے۔

اسلام کا آفتاب سب سے پہلے عرب کے افق پر چمکا، لیکن جن کے قلوب
عظمت پرور اور حیات بخش کرنوں کے لیے سب سے زیادہ کشادہ تھے، وہ ترک
باشندے تھے۔ ترکوں پر جب اسلام کی حقیقت واضح ہو گئی تو انھوں نے اسے
اور اُس کے سچے محافظ و نگہبان بن گئے۔ بارہ صدیوں سے حفاظت و نگہبانی کا
جاری ہے، اسلام ہی اُن کا سچا اور حقیقی مذہب ہے اور ترکوں کو اس کے ساتھ
مخلصانہ محبت ہے جیسی کہ حق و صداقت کے ساتھ تمام قوموں کو ہونی چاہیے۔

اسلامی ثقافت میں ترکی اثر کا نشو و ارتقا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کے گیارھویں سال
سے تشریف لے گئے تو اسلامی عساکر چار خلفاء
زمانے میں مشرق کی طرف بڑھتے رہے، یہاں تک کہ
ہراول دستے دریائے جیحوں کو عبور کر کے ترکستان میں داخل ہو گئے۔ اسلام نے
زندگی یک قلم بدل ڈالی تھی۔ وہ پہلے کی طرح صحرائی اور بدوی نہیں رہے تھے،
پاس ایک نیا اور عالم گیر دین تھا۔ اُن کے عزائم نئی فضاؤں کی تلاش میں تھے۔ اُن
نئے مقاصد کی روشنی سے معمور تھے، یہ مقاصد و عزائم ویسے ہی تھے جو ترکوں
سے نشو و نما پا رہے تھے، لہٰذا جلد سے جلد ترکوں میں قبولِ اسلام کی تحریک
ہو گئی۔

امیر معاویہؓ کی خلافت کے زمانے میں ترکوں اور مسلمانوں کے تعلقات
گئے امیر معاویہؓ ہی نے وہ فوج بھیجی تھی جس نے دریائے جیحوں کو عبور کیا اور وہ
افغانستان کو مسخر کرتی ہوئی ہندوستان تک جا پہنچی۔ ۸۶ھ (۷۰۵ء) میں امیر
مسلم نے بخارا، سمرقند، اور ارد گرد کے علاقے فتح کر لیے۔ اس کا نتیجہ مغربی دنیا
بہت بابرکت ثابت ہوا۔ سمرقند ہی میں عربوں نے کاغذ سازی کی صنعت سیکھی، پھر
ہسپانیہ اور یورپ میں پہنچا دیا۔ مفتوحہ علاقے اُس صوبے میں شامل کر لیے گئے

نہر رکھا گیا، دو صدیاں گزر گئیں تو ماورار النہر کے حاکموں نے خود مختاری کا اعلان کر
مانی سلطنت کی بنیاد رکھی جس کی سرحدیں دریائے جیحوں سے شروع ہو کر مشرقی جانب غیر
اقوں تک جاتی تھیں۔ اُس زمانے میں غیر مسلم ترک مسلمان ترکوں پر حملے کر رہے تھے
ں کے عہد میں اسلام وسطی ایشیا میں پھیل گیا، اس لیے کہ وہاں بدھ مت اور
مذہب کا دور دورہ تھا اور یہ دونوں اسلام کے مقابلے میں ٹھہر نہیں سکتے تھے،
لہذا اسلام نے برتری کا درجہ حاصل کر لیا اور ترک اِس دینِ حق کے مخلص اور وفادار
لیے۔ ماورار النہر میں بغداد سے ایک صدی پیشتر بہت سی درس گاہیں قائم کر
ں، حالانکہ بغداد سامانیوں کی خود مختاری کے زمانے میں خلافت کا مرکز تھا۔ ان ہی
ہوں کے اندر تعلیم پائے ہوئے ترکوں نے اسلامی تاریخ میں اعلیٰ ترین منصب
لیے۔

ترکوں میں اسلام قبول کرنے کا سلسلہ پہلی صدی ہجری میں شروع ہوا پھر اس میں بڑی
قوت پیدا ہو گئی اور عوام بہ تعدادِ کثیر مسلمان ہونے لگے، چند سال میں تمام ترکوں
لام قبول کر لیا۔ ملتِ اسلامیہ میں ترکوں کا اثر و رسوخ ابتدا ہی سے نمایاں تھا۔
میہ خاندان کی سلطنت کا کاروبار بگڑا اور لوگوں پہ سختیاں ہونے لگیں تو خراسان
ب ترک ہی نے اُس کا تختہ اُلٹ دینے کا اہتمام کیا۔ یہ ابو مسلم خراسانی تھا دوسری
ہجری میں عباسی خلیفہ منصور کے ماتحت ترک اسلامی افواج میں بھرتی ہونے لگے۔
ہ بڑے اچھے سپاہی تھے اس لیے دوسروں کے مقابلے میں انھیں ترجیح دی جاتی

عباسی خلیفہ معتصم (وفات ۲۲۷ھ۔ ۸۴۱ء) کے عہد میں ترکوں کا اثر بہت بڑھ
ں لیے کہ خلیفہ کو عربوں اور ایرانیوں کی وفاداری پہ بھروسا نہیں رہا تھا اور اُسے
یسی محافظ فوج کی ضرورت تھی جس پہ وہ اعتماد کر سکتا۔ آہستہ آہستہ اُس نے

ستر ہزار ترکوں کو فوج میں بھرتی کر لیا۔ اتنی بڑی فوج کو بغداد میں رکھنے سے شہر
بے اطمینانی پیدا ہوئی، لہٰذا خلیفہ نے فوج کے لیے ایک نیا مرکز تعمیر کرنے کا حکم
دیا، نیا شہر اتنا خوبصورت تھا کہ عربوں نے اُس کا نام سّرمن رآ رکھا جائے جس کا م
ہے جو اسے دیکھتا ہے خوشی سے لبریز ہو جاتا ہے۔ یہی نام عوام کی زبان پہنچ
"سامرہ" بن گیا۔

جو ترک ابتدا میں سپاہی بن کر آئے تھے، وقت گزرنے پر اُن میں سے بعض
نظم و نسق کے مناصب پر بھی مامور ہو گئے۔ اس طرح انھوں نے اتنی قوت حا
کہ جب چاہتے خلیفہ کو تخت سے اُتار دیتے۔ اُنھوں نے محض بغداد ہی میں مختا
کا درجہ حاصل نہ کیا، بلکہ یہ بندوبست بھی کر لیا کہ بیزنطینیوں سے جو علاقے حا
وہ ترک سرداروں کے حوالے کر دیے جاتے تاکہ وہ سرحدوں کی حفاظت بھی
اور مغرب کی جانب پیش قدمی کا سلسلہ بھی جاری رکھیں۔ چونکہ وہ لوگ فوج اور
میں اعلیٰ اختیارات کے مالک بن گئے تھے، اس لیے انھوں نے مغرب کی طرف
کی نقلِ وطن کے زیادہ سہل راستے پیدا کر لیے ان کے مقابلے میں شمالی جانب
راستے خاصے مشکل اور دشوار گزار تھے۔ اب انھوں نے تیزی سے مغرب کی
حرکت شروع کر دی یعنی وہ آذربائیجان، اناطولیہ اور شام ہوتے ہوئے بیزنطی
کی طرف بڑھتے رہے۔ جس علاقے کو ہم آج کل شرقِ اوسط کہتے ہیں اس میں تر
قبیلوں کی ایک لامتناہی رَو جاری ہو گئی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ ترکستان اور چینی
کے درمیان وسطی ایشیا میں ترکوں کی آبادی کے لامتناہی سرچشمے اُبل رہے
جو لوگ پہلے آئے تھے وہ آگے بڑھتے گئے پیچھے آنے والے پہلوؤں کی جگہ
رہے۔ اس طرح مغرب کی جانب پیش قدمی جاری رہی اور ترک ایک طرف بلقان
گزرتے ہوئے ویانا، دوسری طرف حجاز، مصر اور مغرب اقصیٰ میں پہنچ گئے۔

قبولِ اسلام نے ترکوں کے خصائص و محاسن کو جِلا دے دی جن کی وجہ سے اُن
اریخ کا مطالعہ حد درجہ دِل کش بن گیا۔ جن نئی سرزمینوں میں وہ آباد ہوئے وہاں انھوں
حکومتیں بھی قائم کیں اور سلطنتوں کی بنیاد بھی رکھی اور بہت سے غیر ترک ممالک کے
حکمران بھی مہیا کیے۔ خلفاے راشدین کے عہدِ مبارک کے بعد تیرہ صدیوں میں
اوں چھوٹی بڑی حکومتیں اور بادشاہیاں شرقِ اوسط کے اندر وجود پذیر ہوئیں اور
ید ہو گئیں۔ ترکوں کو ان میں سے اکثر کے ساتھ گہرا تعلق رہا۔ جب تک مختلف ترک
لطنتوں کے کارناموں کا جائزہ نہ لے لیا جائے اسلامی ثقافت میں ترکوں کے
ے کا صحیح اندازہ نہیں ہو سکے گا۔

سلطنتیں سلجوق ایک طاقت ور قبیلے کا سردار تھا۔ یہ قبیلہ قبولِ اسلام کے
کے بعد اپنے سردار کی معیت میں سمرقند اور بخارا کے آس پاس
ہو گیا تھا۔ سلجوق کے پوتے طغرل نے پانچویں صدی ہجری کے نصفِ اوّل
یا ۱۰۴۰ء) میں سلطنت کی بنیاد رکھی اور یہ سلطنت افغانستان سے بحیرہ روم تک
ل گئی، آگے چل کر یہ مختلف حکومتوں میں بٹ گئی تھی ۔ ان ہی حکومتوں میں سے ایک
تھی جس کا دار الحکومت قونیہ تھا۔ یہ مقام اب تک موجود ہے۔ یہاں عثمانی سلطنت
ئم ہوئی تو قونیہ بھی اُس میں شامل ہو گیا۔ سلجوقیوں کا حد درجہ اہم کارنامہ یہ ہے کہ جب
جوں کا اثر بڑھ رہا تھا تو ان لوگوں (سلجوقیوں) نے سنیت کے اصول و مقاصد کو بڑی
یت پہنچائی۔ سلجوقیوں ہی کے ایک عظیم القدر فوجی سالار اور شہنشاہ الپ ارسلان
نے بیزنطینی شہنشاہ دیوجانس[۱] کو شکست دی اور اناطولیہ کے دروازے ترکوں
ی آبادکاری کے لیے کھول دیے۔

۱۔ ۱۰۷۱ء یہ لڑائی ملازکرد میں ہوئی تھی۔ الپ ارسلان کی فوج دیوجانس کی فوج کے مقابلے میں
ست کم تھی لیکن وہ کامیاب ہوا اور دیوجانس کو اسیر کر لیا اس نے دیوجانس سے اچھا سلوک کیا۔

سلجوقی سلطان علوم وفنون اور ادب دانشار کے بڑے سرپرست تھے اور مختلف طریقوں سے علمار کی قدر و منزلت کے ثبوت فراہم کرتے رہتے تھے۔ آج بھی ایسی عمارتیں اور فن کے نمونے موجود ہیں جن سے واضح ہو سکتا ہے کہ سلجوقیوں کے ماتحت فنونِ لطیفہ اور فن کتنے اعلیٰ پیمانے پر پہنچ گئے تھے۔ حکمرانوں کی حیثیت میں سلجوقی آبائی روایات پر سختی سے کاربند رہے۔ عوام کے ساتھ تعلقات میں اُن کا طریقہ سراسر جمہوری تھا اور عوامی شکایات کو سننے کے لیے وہ ہمیشہ تیار رہتے تھے۔ وہ اسلام کے سچے پیرو تھے، ہم عدل وانصاف کے لیے کوشاں رہتے اور رعایا پر محاصل کا ناقابلِ برداشت بوجھ ڈالنا اُنھیں کبھی گوارا نہ ہوا۔ وہ قابل اور دانش مند افراد کو اپنے اردگرد جمع کر لینے کا خاص ملکہ رکھتے تھے۔ الپ ارسلان اور اُس کے فرزند ملک شاہ نے مشہور نظام الملک (م ۴۹۰ھ، ۱۰۹۶ء) کو اپنا وزیر اعظم بنایا۔ اُسی نے بغداد کی مشہور یونیورسٹی نظامیہ کی بنیاد رکھی تھی، جو اپنے اساتذہ کے کمالِ علم کی وجہ سے شہرۂ آفاق رہی۔ نظام الملک نے اسلام کے بہت بڑے صوفی اور فلسفی امام غزالی کو بھی نظامیہ میں استاذ مقرر کیا اور عمر خیام کے لیے بھی ماہانہ وظیفہ تجویز کر دیا تھا، جس کی وجہ سے وہ شعر اور ادب کی خدمت کے لیے آزاد ہو گیا۔

سلجوقیوں ہی کے زمانے میں ترکوں نے اسلامی قیادت کی باگ ڈور عربوں سے چھین لی۔ سلجوقیوں ہی کا ایک سلطان تھا جو مشہور صوفی شاعر مولانا روم کو مونیہ لایا تھا۔ سلجوقیوں ہی کے زمانے میں ایک دوسرا عظیم المنزلت صوفی احمد لیسوی (وفات ۵۶۲ھ، ۱۱۶۶ء) تھا اور اُس نے لوگوں کی تعلیم و تربیت فرمائی۔ ان دو ممتاز اہلِ علم و فضل کا اثر اب تک باقی ہے۔ سلجوقی ترکوں کے زمانے میں جہاں جہاں حکومت کا دائرہ پہنچا، اسلام کو خوب فروغ حاصل ہوا۔

مصر میں ترکوں کا پہلا حکمران خاندان طولونی تھا جس کی بنیاد احمد بن طولون نے

۲۵۵ھ (۸۶۸ء) میں رکھی تھی۔ یہ حکومت اگرچہ صرف سینتیس ۳۷ سال قائم رہی تاہم اپنے
فلاحی کاموں کے لیے بڑی مشہور تھی اور قاہرہ میں طولون کی بنائی ہوئی خوب صورت
مسجد اب تک اس کے عہدِ حکومت کا ایک نمایاں نمونہ پیش کر رہی ہے۔ طولونیوں کے
بعد مصر میں از سرِ نو عباسی حکومت قائم ہوگئی پھر ایک ترک حکمران اختیارات کا مالک
بن گیا اور ایک نئے خاندانِ حکومت کی بنیاد پڑی جو اخشیدی کہلایا۔ یہ خاندان ۳۲۳ھ
سے ۳۵۹ھ تک (۹۳۴ء، ۹۶۹ء) قائم رہا، پھر فاطمیوں نے کاروبارِ حکومت
سنبھال لیا، اخشید فرغانہ کے حکمرانوں کا خطاب تھا اور فرغانہ دریائے جیحوں کے پار
مشہور ترکی شہر ہے۔ اخشیدی خاندان کے بانی کا والد فرغانہ سے بغداد پہنچا تھا تاکہ خلیفہ
کی خدمت انجام دے اور اسے دمشق کا گورنر مقرر کیا گیا تھا۔ شیعہ فاطمی خاندان
ڈھائی سو سال سے بھی زیادہ مدت تک حکمران رہا۔ اس کے بعد پھر ایک ترک حکمران مصر
میں برسرِ کار آگیا۔ یہ صلاح الدین ابن ایوب تھا جس سے ایوبی حکمرانوں کا آغاز ہوا۔ یہ خاندان
۵۶۵ھ سے ۶۵۰ھ تک (۱۱۶۹ء، ۱۲۵۲ء) قائم رہا، اس کی حکومت کا دائرہ
دریائے نیل سے دریائے فرات تک پھیلا ہوا تھا۔ البتہ صلیبیوں نے جن مقامات کی
حلقہ بندیاں کر رکھی تھیں وہ اس حکومت سے باہر تھے۔ ۵۸۳ھ (۱۱۸۷ء) میں صلاح الدین
نے یروشلم کو فتح کر لیا تو صرف صور کا قلعہ صلیبیوں کے قبضے میں رہ گیا۔ یورپ نے تیسری
صلیبی مہم شروع کر دی اور انتہائی کوشش کی کہ یہ علاقے مسیحیوں کے ہاتھ سے نہ چھنیں
انگلستان کا بادشاہ رچرڈ اول اور فرانس کا بادشاہ فلپ اگسٹس دونوں اس مہم میں شریک
تھے، یہ ۵۸۶ھ (۱۱۹۰ء) کا واقعہ ہے لیکن دو سال کے رزم و پیکار کے بعد صلح پر
معاملہ طے ہوا اور صلاح الدین نے اپنے کسی حق کو بھی نقصان پہنچنے نہ دیا۔ صلاح الدین
نے ۵۸۹ھ (۱۱۹۳ء) میں وفات پائی اور اپنے پیچھے کارناموں کی ایک عظیم الشان
دستاویز چھوڑ گیا جسے مسیحی مورخ بھی بہادری کی داستانوں میں بے مثال قرار دیتے

رہے، اگرچہ سلطان صلاح الدین کا زیادہ وقت صلیبیوں کے خلاف لڑائیوں میں گزرا
اُس نے اپنی سلطنت میں سنیّت کو تقویت پہنچائی اور مصر کے باشندوں کو از سرِ نو
کا پابند بنا دیا جو فاطمیوں کے زیرِ اثر شیعیت کی طرف مائل ہو گئے تھے۔

جس زمانے میں سلجوقی اپنی سلطنت کی توسیع میں مصروف تھے، اُسی زمانے میں
اور ترک سالار احمد غازی دانش مند نے (وفات ۴۷۷ھ / ۱۰۸۴ء) قیساریہ کے
قریب کپیڈوسیا[1] میں ایک نئی بادشاہی قائم کر دی۔ دانش مند خاندان کے حکمرانوں
صلیبیوں کے خلاف فتوحات میں درجۂ امتیاز حاصل کر لیا اور وہ اشاعتِ اسلام کے
لیے برابر کوششیں کرتے رہے۔ ایک صدی سے کسی قدر کم مدت تک آزاد رہ
کے بعد ان کے علاقے سلجوقی سلطنت میں شامل ہو گئے اور یہاں کے باشندے
اور یورپی ترکی میں پھیل گئے۔ اس کا ثبوت یوں ملتا ہے کہ دانش مند نام کے بہت
ترکی گاؤں جا بجا موجود ہیں۔

سلجوقیوں کے زمانے میں چھوٹے چھوٹے حکمران خاندان بھی بہت تھے۔ یہ لوگ
اتابک کہلاتے تھے، یعنی وہ سلجوقی سردار جنھوں نے نائبوں کی حیثیت میں مستقل حکمرانی
کی بنیاد رکھی۔ دمشق، عراق، اناطولیہ، آذربائیجان اور لرستان (ایران) کے اتابک حکمران
متعدد اتابکوں میں سے صرف چند ہیں۔ ان میں سے بعض کی حکومتیں ایک سو سال تک
باقی رہیں اور بعض کی چار سو سال تک آزاد حکمران خاندانوں میں سب سے بڑھ کر تاریخ
خوارزم کا خاندان تھا، جس کی حکومت ایک زمانے میں ایران، خراسان، افغانستان، ماورا
اور غزنہ تک پھیلی ہوئی تھی گویا یہ حکومت ہندوستان کی سرحد سے سلجوقی سلطنت کی سرحد
تک جاتی تھی۔ خوارزم کا خاندانِ حکومت ۴۷۰ھ سے ۶۲۹ھ (۱۰۷۷ء - ۱۲۱۲ء

[1] Cappadocia عام طور پر اسے کپاڈوسیا لکھا جاتا ہے۔ یہ اناطولیہ یا ایشیائے کوچک کے ایک حصے کا پرانا نام تھا جس کی مشرقی سرحد شام سے ملی ہوئی تھی۔

سرگرم کار رہا اور یہ چنگیز خاں کے تاتاری سیل کی یورش میں تباہ ہوا۔ اسی خاندان کی ایک شاخ
۶۱۲ھ سے ۸۰۰ھ تک (۱۲۱۵ء ۔ ۱۳۹۸ء) میں حکمران رہی۔
عثمانی سلطنت برزوق قبیلے اور "کی" قبیلے کے اخلاف نے پیدا کی تھی، یہ ترکوں کے
ترین قبیلوں میں سے تھا جو کچھ مدت تک ایران میں رہا، پانچویں صدی ہجری (گیارھویں
عیسوی) میں انھوں نے مغربی جانب نقل مکان شروع کر دی۔ دو صدی بعد ان پہ تاتاریوں
کا دباؤ پڑا اور یہ اپنے سردار سلیمان شاہ کی سرکردگی میں مزید مغربی جانب چلے گئے
تھا کہ حلب کے قریب سلجوقیوں کے علاقے میں آباد ہو جائیں، ۶۲۶ھ (۱۲۲۸ء)
ن دریائے فرات کو عبور کرتے ہوئے ڈوب گیا اور قبیلے نے سلیمان کے بیٹے ارطغرل
دگی میں سلجوقیوں سے اناطولیہ میں آباد ہونے کی اجازت لے لی۔ یہ لوگ اپنے
طن کی طرف جا رہے تھے کہ ایک جگہ راستے میں دو فریقوں کو جنگ کرتے دیکھا۔
خاصہ یہ تھا کہ ہمیشہ کمزور کی مدد کرتے چنانچہ اس جنگ میں بھی انھوں نے اس فریق
کی جو شکست کھاتا ہوا معلوم ہوتا تھا اور اسے فتح دلادی۔ اتفاق یہ کہ یہ فریق خود
سلطان تھا۔ وہ اتنا خوش ہوا کہ ارطغرل کے قبیلے کو بروصہ کے قریب بہتر زمینیں دے
بزنطینی سرحد پر واقع تھیں ارطغرل نے اپنی جاگیر کی حدیں بڑھالیں۔
یہ ترکی سلطنت کا آغاز تھا جو آگے چل کر سلجوقیوں کے ہاتھ سے اسلام کی قیادت
چھیننے اور چھ صدیوں تک اس اعلیٰ منصب پر فائز رہنے والی تھی۔ پانسو سال کے
ع میں اس سلطنت نے اپنی رعایا کے لیے امن و تحفظ کا بندوبست کیا اور یہ سلطنت
عظموں میں پھیلی ہوئی تھی۔ سلطنت کی دور افتادہ حدود پر کثیر الافراد فوجوں کے درمیان
ڑائیاں ہوتی تھیں لیکن سلطنت کے اندر رہنے والے افراد خواہ وہ مسلمان تھے یا
ترک یا غیر ترک، اپنا کاروبار امن و حفاظت سے کرتے رہتے تھے۔
عثمانی نام عثمان بے سے لیا گیا جو ارطغرل کا فرزند تھا اور ۶۹۹ھ سے ۷۲۷ھ

۱۲۹۹ء سے ۱۳۲۶ء تک حکمران رہا، لیکن عثمانی سلطنت کی بنیادیں اورخان بے
مستحکم کیں، اُس نے آس پاس کے بہت سے شہر فتح کر لیے۔ پھر دردانیال کو فتح کر کے
بلقان کے بہت بڑے حصے پر قابض ہو گیا۔ اُسی کے عہد میں نئی چری فوج کی بنیاد رکھی
گئی۔ اُسی کے عہد میں نئی سلطنت کا انتظامی ڈھانچا تیار ہوا۔ نئی چری فوج سلطان کی خا
محافظ فوج تھی۔ اس میں مسیحی نوجوان بھرتی کیے جاتے تھے۔ اُن کے لیے خاص حقوق مع
کر دیے گئے تھے۔ سرکاری خرچ سے تعلیم دی جاتی اور حکمران سے کامل وفاداری اُن
دلوں میں جما دی جاتی۔

اورخان کے جانشین بھی اپنے اس عظیم الشان بزرگ کی طرح بڑے دانش مند او
دور اندیش تھے، ابتدائی دور کے عثمانی سلطان بڑے مخلص مسلمان اور اعلیٰ درجے کے سا
تھے۔ ان میں یہ صلاحیت تھی کہ اپنے گرد و پیش قابل اور عالم آدمیوں کو جمع کر لیتے تھے
عظیم الشان سلطنت کے قیام میں کامیابی کی بڑی وجہ یہی تھی۔ ان لوگوں کو ڈپلومیسی میں
کمال حاصل تھا اور اپنی انتظامی صلاحیتوں کی بنا پر ایک زبردست فوج اور اعلیٰ درجے کا
نظام سلطنت بھی انھوں نے تیار کر لیا جس میں آدمیوں کو ضرورت کے مطابق تربیت دی
جاتی تھی اور انھیں موزوں عہدوں پر مامور کیا جاتا تھا۔ یہ سلطان علوم و فنون اور ادب کے
سرگرم سرپرست تھے، اہل علم کی قدر کرتے تھے، علماء کے ساتھ احترام سے پیش آتے
اور اکثر امور میں اُن سے مشورے لیتے۔ ان کے گرد و پیش پرانی وضع کی بہت سی پادشاہیاں
تھیں، لیکن یہ سلطان حکمران کی صلاحیت میں اپنے ہمسروں سے منزلوں آگے تھے اور یہی
وجہ ہے کہ زود یا بدیر طوعاً یا کرہاً وہ سب کے سب عثمانی جھنڈے کے نیچے آ گئے
ہر عثمانی سلطان کے ماتحت نئی سلطنت کی حدیں، مشرق میں اناطولیہ کی طرف اور
مغرب میں یورپ کے اندر پھیل گئیں۔ پاپاؤں نے اُن کے خلاف مذہب کی بنا پر عیسائیوں کو
منظم کر دیا تاہم عثمانی حکمرانوں کی فتوحات جزیرہ نمائے بلقان میں برابر جاری رہیں یہاں تک

یہ جزیرہ نما عثمانی علاقہ بن گیا صرف قسطنطنیہ اس سے مستثنیٰ تھا اور یہ سلطنت دریائے فرات سے دردانیال تک پھیلی ہوئی تھی۔

تیمور نے ۸۰۵ھ (۱۴۰۲ء) میں اناطولیہ پر حملہ کیا بجوانمرد بایزید یورپ سے تیزی کے ساتھ مقابلے کے لیے آیا۔ اُسے عام طور پر یلدرم کہتے تھے یعنی برقِ خاطف اس لیے کہ وہ بجلی کی سی تیزی سے دشمن پر یورش کر کے کاری ضربیں لگاتا تھا، انقرہ (انگورا) کے میدان میں لڑائی ہوئی۔ بایزید کے بعض افسروں کی غداری کے باعث اس نے شکست کھائی اور قید ہو گیا۔ اسی رنج و غم میں اُس کی وفات ہوئی۔ اس المناک واقعے نے نئی عثمانی سلطنت کی بنیاد ہلا دی اور بیزنطینیوں کو کم از کم پچاس سال کی مزید مہلت مل گئی۔ کچھ مدت تک بے سود خانہ جنگی جاری رہی پھر سلطان محمد اوّل نے خاندان کی سابقہ قوت بحال کی، اُس کے بیٹے سلطان مراد ثانی کو ہنیاڈ[۱] سالارِ ولاشیا[۲] کی یورشوں کے خلاف ملک کی حفاظت کے لیے لڑنا پڑا۔ ۸۴۸ھ (۱۴۴۴ء) میں ورنا[۳] کے مقام پر سلطان مراد نے مسیحیوں کو شکستِ فاش دی۔ پھر ترک دو سال تک یورپی حملوں سے مقابلۃً محفوظ رہے اور چودھویں صدی ہجری کے آغاز تک انھیں پھر کسی ایسے جتھے سے لڑائی کا سابقہ نہ پڑا جو مذہب کی بنا پر مذہبی مجاہد کی حیثیت میں جنگ کے لیے تیار ہوا ہو۔

۸۵۷ھ (۱۴۵۳ء) میں سلطان محمد ثانی نے قسطنطنیہ فتح کیا یہ سلطان فاتح کے لقب سے مشہور ہے پھر بہت سے مسیحی اور یہودی آباد ہونے کے لیے وہاں چلے آئے سلطان فاتح نے آرتھوڈکس یونانی پادریوں کے بطریق اعلیٰ کا عہدہ بحال کر دیا اور اُسے ایسے حقوق ادا کر دیے جنھیں آگے چل کر ترکوں کے خلاف استعمال کیا جاتا رہا۔ محمد فاتح نے سرویا، بوسنیا اور بلقان کے آس پاس کے علاقوں کو سلطنت میں شامل

[۱] Hunyad. [۲] Wallachia. [۳] Varna یہ شہر بلغاریا میں ہے اور بحیرۂ اسود کے کنارے واقع ہے۔

کر لیا۔ اناطولیا میں آزاد ریاستیں قائم تھیں، اُنھیں ختم کر کے پورے علاقے کو براہِ راست سلطنت کے تابع لے لیا۔ اُس کے عہد میں انتظامی ڈھانچا بہت بہتر بنا دیا گیا جو تبدیلیوں کے ساتھ تین سو سال تک جاری رہا۔ فاتح علم و فضل کا بہت قدردان تھا، اُس نے بہت سے تعلیمی اداروں کے لیے اوقاف کا انتظام کیا۔ وہ خود بھی بہت عالم اور آٹھ زبانیں جانتا تھا۔ اُس نے بہت سے مشہور عالموں اور فن کاروں کو بلا کر استنبول میں آباد کیا تاکہ احیاے علوم کا کام شروع کرے۔

غرض عثمانی اثر تدریجاً توسیع پذیر رہا۔ سلطان سلیم نے سنہ ۹۱۸ھ اور ۹۲۶ھ (۱۵۱۲ء اور سنہ ۱۵۲۰ء) کے درمیان آٹھ سال کی مدت میں پہلے کردستان فتح کیا پھر جنوب کی طرف بڑھا تاکہ عرب کو حرمین شریفین اور مصر کے ساتھ اپنی سلطنت میں لے آئے، آخری عباسی خلیفہ مصر ہی میں مقیم تھا سلطان سلیم خلیفہ کو استنبول لے آیا اور خلیفہ کا لقب خود لے لیا پھر یہ لقب اس کے وارثوں کے پاس رہا۔

سلیم کے فرزند سلیمانِ اعظم نے بلغراد اور روڈز فتح کر لیے۔ سنہ ۹۳۳ھ (۱۵۲۶ء) میں شاہِ ہنگری کے خلاف فیصلہ کن فتح حاصل کی۔ ہنگری ڈیڑھ سو سال سے زائد عرصے تک ترکی سلطنت کا ایک صوبہ رہا، لیکن آپ دیکھیں کہ اس کے مجلسی اور قومی نظام کو کوئی گزند نہ پہنچایا گیا۔ سلیمان کی فوج نے ویانا کا محاصرہ کر لیا اور آرچ ڈیوک فرڈیننڈ کو خراج ادا کرنے پر مجبور کر دیا۔ خیر الدین باربروسا، پیالے اور دراغوت سلطان کے مشہور امیر البحر تھے، اُنھوں نے ہسپانیوں کو بیبیا سے نکالا، پوپ، "شہنشاہِ مقدس" اور وینس کے متحدہ بیڑے کو شکست دی اور بحیرۂ روم کو ترکی جھیل بنا دیا۔ اُس زمانے کے مشہور بحری سالار ڈریک[1] اور ڈوریا[2] بحیرۂ روم کی کسی بندرگاہ سے باہر نکلنے کی جرأت نہ کر سکتے تھے۔

---

[1] Drake. [2] Doria. اس شخص کو اُس عہد کا مشہور مسیحی ماہر بحریات سمجھا جاتا تھا۔ اُس نے باربروسا کے مقابلے میں ہمیشہ شکست کھائی۔

زمانے میں بڑے مشہور افراد پیدا ہوئے مثلاً شہنشاہ چارلس پنجم، ملکہ ایلزبتھ، پوپ لوئی دہم
بیز کولمبس اور ریلے، لیکن کوئی شخص سلیمان کے پایے کو نہ پہنچ سکا۔ اس عہد میں عثمانی
سلطنت عروج کی انتہائی بلندیوں تک پہنچ گئی۔ وہ فرات سے جبل طارق تک اور بوڈاپسٹ
سے مصر کے جنوب تک پھیلی ہوئی تھی۔

سلیمان کے فرزند سلیم ثانی کے عہد میں سلطنت عثمانیہ کا زوال شروع ہو چکا تھا،
ن اس کا احساس عام طور پر نہ کیا جا سکا۔ آسٹریا کے ڈان گیووانی نے ترکوں کو شکست
دے کر اُن کی بحری برتری پر سخت ضرب لگائی۔ اگرچہ اس زمانے میں ترکی افواج نے
س اور کریٹ فتح کر لیے، آسٹریا کو شکست دی، بغداد کو مسخر کر لیا، لیکن یہ کامیابیاں سلطنت
کے زوال کو نہ روک سکیں۔ سان گاتھرڈ[۱] کے مقام پر ۱۰۷۵ھ (۱۶۶۴ء) کی شکست یورپ
سے ترکوں کے اخراج کی جانب پہلا قدم تھا۔ یہ سلسلہ برابر جاری رہا۔ ۱۰۹۸ھ (۱۶۸۶ء)
ترک ہنگری سے نکل گئے اور ۱۱۳۱ھ (۱۷۱۸ء) میں انھیں دریائے ڈینوب کے
والاشیا[۲] میں دھکیل دیا گیا۔

سلطنت اپنے حدود کے اندر بھی روبہ زوال تھی۔ ینی چری فوج جو دو سال سے
وفرمانبرداری کا نمونہ چلی آتی تھی، اب قابو سے باہر ہو گئی اور اُس میں بغاوت و سرکشی
کے عناصر بڑے نمایاں ہو گئے۔ اُن کی بارکیں ہلڑ اور ہنگامے کا مرکز بن گئیں۔ کوئی ایسی قومی

---

۱ ـ St. Gotthard [illegible] ۱۶۶۴ء یہ کوہ ایلپس کا ایک درہ ہے جہاں ترکوں نے
ساٹھ ہزار جرمنوں اور فرانسیسیوں کے خلاف جنگ کی تھی۔ ترکی جرنیل احمد کوپریلی پاشا تھا۔ پہلے ایک جماعت
نے عیسائیوں کو دست بدست جنگ کی دعوت دی، پھر عام لڑائی ہوئی جس میں ترکوں نے شکست کھائی
آٹھ ہزار کھیت رہے۔ ۲ ـ Wallachia یہ قدیم رومانیہ کا جنوبی صوبہ تھا۔ دریائے ڈینوب اس کی
جنوبی سرحد ہے۔ یہ سمجھ میں نہ آیا کہ مصنف نے اس سلسلے میں دریائے ڈینوب کا ذکر کیوں کیا۔ سمجھنا یہ چاہیے کہ
ترک ہنگری سے باہر نکل گئے اور رومانیہ کے جنوبی حصے میں پہنچ گئے۔

فوج موجود نہ تھی جس پر بھروسا کیا جاتا۔ سلطنت کے دور افتادہ حصوں میں جو گورنر تھے وہ حالات سے بے خبر اور بعض حالتوں میں رشوت خور تھے۔ وزیروں اور بلند رتبہ وفادار نے زوال کو روکنا چاہا۔ انھوں نے فوجی اور انتظامی ڈھانچے میں اصلاحات تجو لیکن جو کارکن اقتدار حاصل کر چکے تھے، انھوں نے اصلاحات کی مخالفت کی ناشناس لوگ اُن کے پشت پناہ بن گئے۔ سنہ ۱۲۴۲ھ (۱۸۲۶ء) میں اصلاح و ترقی پہلا قدم اُٹھایا گیا یعنی سلطان محمود ثانی نے ینی چری کو برخاست کر دیا، لیکن یہ اصلا سلطنت کو پارہ پارہ ہونے سے روک نہ سکی۔ یونان نے سنہ ۱۲۴۴ھ (۱۸۲۸ء) آزادی حاصل کر لی۔ سنہ ۱۲۷۱ھ۔ سنہ ۱۲۷۲ھ (۱۸۵۴ء۔ ۱۸۵۵ء) میں جنگ ہوئی جس میں انگلستان و فرانس نے سلطنتِ عثمانیہ کو امداد دی۔ اس وجہ سے زو پیش قدمی عارضی طور پر رک گئی۔ سنہ ۱۲۸۳ھ (۱۸۶۶ء) میں رومانیا خود مختار سال بعد سرویا نے آزادی حاصل کر لی، تاہم سلطنت سنہ ۱۲۹۵ھ (۱۸۷۸ء) تک محفوظ رہی اسی سال روس کے ساتھ جنگ ہوئی اس موقع پر ترکی سلطنت قبرص اس خیال سے انگلستان کے حوالے کر دیا کہ آئندہ اُس کی طرف سے امدا رہے گی۔ سنہ ۱۳۰۱ھ (۱۸۸۲ء) میں انگلستان مصر پر قابض ہو گیا۔

اصلاح کی کوششیں بہ دستور جاری رہیں۔ سنہ ۱۳۲۶ھ (۱۹۰۸ء) میں دستو منظور ہوا اور سلطان عبدالحمید ثانی کو تخت سے اتار دیا گیا۔ اٹلی نے لیبیا میں ترکی پر حملہ کر دیا گیا۔ بلقان ریاستوں نے خود ترکی کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا۔ ان تمام نے سلطنتِ عثمانیہ کا شیرازہ جلد از جلد بکھر جانے کا سازوسامان بہم پہنچا دیا۔ ان سے دوچار ہونے کے بعد ترکوں نے دنیا پر آشکارا کر دیا کہ وہ اپنے اسلاف کی غیرت سے بدستور بہرہ مند ہیں۔ انگریزوں اور فرانسیسیوں کے متحدہ بیڑے پیش قدمی کو روکنے میں جو کامیابی حاصل کی اُس کے لیے پوری دنیا نے تحسین و آ

ردانیال کی جنگ میں ترکوں کے چار لاکھ آدمی کام آئے۔ جو قوم کا بہترین سرمایہ
ستارکہ کے بعد اتحادیوں کی فوج نے ترکی پر قبضہ کرلیا۔ انگلستان نے یونانیوں کو
کے اناطولیہ پر چڑھائی کرادی۔ اس موقع پہ پوری ترک قوم شب بھر میں اپنے وطن
ت کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔ مرد، عورتیں، بچے اور بوڑھے سبھی اس میں شریک تھے
کمال اتاترک کی سالاری میں جو فوج منظم ہوئی اُس نے حملہ آوروں کو شکستوں
ں دے کر سمندر میں دھکیل دیا بعد ازاں ترک اپنے تباہ شدہ وطن کی تعمیرِ جدید
ہوئے۔ ۱۳۴۱ھ / ۱۹۲۲ء میں سلطنت ختم کردی گئی۔ دو سال بعد منصبِ خلافت
ادیا گیا، اس لیے کہ فیصلہ یہ تھا کہ خلافت خود اصولاً جمہوری حکومت کے پاس ہے
تِ عثمانیہ کے ملبے سے نئی اور طاقتور ترکی دولت پیدا ہوئی۔ یہ ترکی جمہوریت تھی۔
ترک جب اسلام کے حلقہ بگوش بنے، اُن کی لمبی سرگزشت پر نگاہِ بازگشت ڈالی
تو صاف روشن ہو جاتا ہے کہ اُنھوں نے اسلام کے لیے بڑے کارنامے انجام
اسلامی دنیا عربوں اور دوسرے مسلمانوں کے ہاتھوں میں بے روح ہو چکی تھی ترکوں
س کی رگوں میں زندگی کا نیا خون دوڑا دیا۔ ترکوں کو فلسفے اور معقولات سے خاص
ب تھی، انھوں نے اسلام کی صحیح تعبیرات اور متصوفانہ تصورات کے دائروں میں عظیم القدر
و فضلاء پیدا کیے۔ صدیوں سے انھوں نے اسلام کو ایک زندہ قوت کی حیثیت میں قائم
بنا اولین فرض دے لیا ہے اور وہ اسے یورپ اور رُوس کے حملوں سے برابر
نے رہے۔ اگر ترک نہ ہوتے تو عرب کی سرزمین بہت پہلے کمیونسٹوں کی استعماری
ت کا جزو بن جاتی۔ اسلام خدا کا دین ہے یہ نہ عربی ہے اور نہ ترکی، صدیوں سے
اس دینِ پاک کی خدمت انجام دیتے رہے اس لیے کہ یہ خدا کا دین تھا اور انھوں
ضرورت کے وقت بڑی سے بڑی قربانیوں سے بھی تامل نہ کیا۔

لام کے بنیادی اصول

اِنَّ الدِّیْنَ (آلِ عمران) بلا شبہ اصل دین اللہ کے

عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ (آل عمران : ۱۹) نزدیک "اسلام" ہے

اسلام میں ایمان کی گیارہ شرطیں پورا کرنا ضروری ہے، جن کے لیے اللہ تعالیٰ نے کتاب پاک میں قطعی حکم دے دیا ہے لہذا ایک مسلمان کے لیے مومن بننے کی غرض سے ان واجبات کو پورا کرنا لازم ہے۔ دنیا کے تمام مسلمان ان واجبات پر پابند ہیں اور ان میں خفیف سے اختلاف بھی ممکن نہیں سُنّی وشیعہ اور بعض دوسرے اسلامی فرقوں کے جو اختلافات نظر آتے ہیں اُن کا تعلق بنیادی اصول سے نہیں معمولی فروع تک محدود ہے۔

اسلام کی بنیاد واساس کلمۂ شہادت ہے یعنی اشھد ان لا الہ الا اللہ و ان محمدا عبدہ و رسولہ (میں گواہی دیتا ہوں اور تصدیق کرتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں گواہی دیتا ہوں اور تصدیق کرتا ہوں کہ محمد اللہ کے بندے اور رسول ہیں) بہ الفاظِ دیگر اسلام کا جوہر اور نچوڑ یہ ہے کہ اللہ کے ایک ہونے کا (توحید) ایمان ہو اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سچا اور آخری پیغمبر مانا جائے۔

ایمان کی چھ شرطیں یہ ہیں: اللہ کے وجود اور یکتائی پر ایمان، اللہ کے فرشتوں پر ایمان یعنی وہ خدا کی مخلوق جو اُس کے احکام بجالاتی ہے، اللہ کی نازل کی ہوئی کتابوں پر ایمان، جن میں تورات، زبور، انجیل اور قرآن مجید شامل ہیں، اللہ کے رسولوں پر ایمان، یوم حساب پر ایمان، جس میں انسانوں کو نیک یا بد اعمال کی جزا یا سزا ملے گی قضا و قدر پر ایمان یعنی یہ ماننا کہ فرد کا معاملہ یقینی طور پر اللہ کے ہاتھ میں ہے، لیکن ہر فرد کو اپنی عقلِ سلیم استعمال کرنی چاہیے اور وہ اپنی روش کا خود ذمہ دار ہوگا۔ ان چھ باتوں کو پیشِ نظر رکھا جائے تو واضح ہو جائے گا کہ یہود و نصاریٰ نہ تو اللہ تعالیٰ کی توحید کے قائل ہیں اور نہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا کا سچا اور آخری نبی مانتے ہیں اس وجہ سے وہ مسلمانوں سے الگ ہو گئے ہیں تثلیث اسلامی اصول کے سراسر خلاف

ایمان کے ان چھ واجبات کے علاوہ پانچ اور چیزیں ضروری ہیں جنھیں اسلام کے واجبات یا ارکان قرار دیا جاتا ہے یعنی کلمۂ شہادت زبان سے ادا کرنا اور اُس کے مفہوم کی تصدیق دل سے کرنا، پانچ وقت مقررہ طریق کے مطابق نماز ادا کرنا، رمضان کے روزے رکھنا، صحت اجازت دے، زادِ راہ پاس ہو اور سفر میں خطرات نہ ہوں تو مکہ معظمہ کا حج، زکوٰۃ یعنی منقولہ جائیداد و دولت کا ۱/۴۰ حصہ ہر سال خیرات میں دینا، یہ چیزیں اسلام کے بنیادی اصولی حقائق کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ترک اُس وقت سے ان چیزوں کے پابند چلے آتے ہیں جب سے وسطی ایشیا میں انھوں نے اسلام قبول کیا تھا۔ وہ سُنّی ہیں اور فقہی دبستانوں میں سے حنفی فقہ کے پابند ہیں۔ اس کتاب کے دوسرے ابواب میں قرآن مجید سے وہ آیات نقل کر دی گئیں ہیں جنھیں اسلامی عقائد کی بنیاد و اساس قرار دیا جاتا ہے۔ یہاں میں چند صحیح حدیثیں یعنی رسول اللہ صلعم کے ارشادات پیش کرتا ہوں جو مسلمانوں میں ایمان و عمل کے لیے نورِ ہدایت مانے جاتے ہیں:

۱۔ تمام انسانوں کی حیثیت وہی ہے جو کنگھی کے دندانوں کی ہوتی ہے یعنی سب برابر ہیں، صرف عبادت یعنی اللہ تعالیٰ کے احکام کی فرمانبرداری سے وہ ایک دوسرے پر ترجیح حاصل کرتے ہیں۔

۲۔ جو کچھ تم اپنے لیے پسند کرتے ہو وہی پورے عالمِ انسانیت کے لیے پسند کرو۔

۳۔ عقل مند وہ ہے جو دوسروں کو پیش آنے والے واقعات سے سبق حاصل کرتا ہے اور غیر دانش مند وہ ہے جو اپنے آپ کو پیش آنے والے واقعے کی بنا پر دوسروں کے لیے مثال بنتا ہے۔

۴۔ میری تعریف میں مبالغہ نہ کرو جیسا کہ نصاریٰ نے مسیح ابن مریم کی تعریف میں کیا۔ میں خدا کا ایک بندہ ہوں، لہٰذا مجھے خدا کا بندہ اور اُس کا رسول مانو۔

۵۔ جب تک تم ایک دوسرے سے محبت نہ رکھو گے سچے مومن نہیں بن سکتے، میں تمھیں بتاؤں کہ ایک دوسرے سے محبت کیوں کر رکھنی چاہیے؟ ایک دوسرے کو سلام کرو، اُن کے ساتھ محبت و احترام کا برتاؤ کرو۔ میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے کہ تم اس وقت تک بہشت میں داخل نہ ہو سکو گے جب تک ایک دوسرے کے ساتھ محبت اور رحم کا برتاؤ نہ کرو گے۔ رحم کا مطلب یہ نہیں کہ اُسے محدود اور شخصی معاملہ سمجھو۔ رحم کا مطلب یہ ہے کہ یہ عام ہو اور سب کے لیے ہو۔ ایک دوسرے کا ہاتھ بٹاؤ، ایک دوسرے سے ہمدردی رکھو اور خدا کی ہر مخلوق کے ساتھ شفقت کا برتاؤ کرو۔

۶۔ اگر کوئی شخص اللہ کی رحمت سے تمھاری کوششوں کی بدولت صراط مستقیم پر چلنے لگے تو سورج چڑھنے اور ڈوبنے کے درمیان یہ سب سے زیادہ بابرکت کام ہے۔

۷۔ جن چیزوں سے تمھارے دل میں شکوک پیدا ہوں، اُنھیں چھوڑ دو اور اُن چیزوں کو اختیار کرو جن سے شکوک پیدا نہ ہوں۔

۸۔ مسلمان کے ایمان کی ایک خوبی یہ ہے کہ وہ اُن تمام چیزوں کو چھوڑ دیتا ہے جو اُس کے لیے بے کار ہیں۔

۹۔ وہ شخص کتنا خوش نصیب ہے جو لمبی زندگی پائے اور اس کی روش، اُس کے عمل اور اُس کی عبادت بہت ہی اچھی ہو۔

۱۰۔ خدا کے بندو! ایک دوسرے سے نفرت نہ کرو، کینہ نہ رکھو، دوستوں یا رشتہ داروں سے تعلقات نہ توڑو۔ ایک دوسرے سے منہ نہ موڑو، ایک دوسرے سے حسد نہ رکھو۔ جان بوجھ کر جنسوں کی قیمیں نہ بڑھاؤ، کسی کو دھوکا نہ دو۔ اللہ کے حکم کے مطابق بھائی بھائی بن جاؤ۔ کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں کہ وہ اپنے کسی دینی بھائی کے ساتھ تین روز سے زیادہ بات چیت ترک کیے رہے۔

۱۱۔ سچا مومن وہ ہے جو دوسروں کے ساتھ مل جل کر رہے اور دوسروں کے لیے اس کے ساتھ مل جل کر رہنا سہل ہو۔ جو شخص دوسروں کے ساتھ مل جل کر نہیں رہتا یا دوسروں کے ساتھ اس کا مل جل کر رہنا سہل نہیں اس سے بھلائی کی کیا اُمید رکھی جا سکتی ہے؟

رسول اللہ صلعم کے ارشادات میں سے صرف چند موٹی موٹی باتیں ہیں جنھیں دنیا کے مسلمان عمل و ایمان کے لیے رہنمائی کی روشنی قرار دیتے ہیں۔

[...]لی میں تصوف تصوف نے شروع ہی سے اسلام میں اور خصوصی طور پر بزرگوں میں ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔ تصوف کا جوہر یہ ہے کہ اللہ اور [ا]ن کے رسولِ پاک صلعم سے محبت رکھی جائے۔ اسی محبت سے طبعی طور پر انسان کے [د]ل میں خاندان کے ساتھ، قوم کے ساتھ اور عالمِ انسانیت کے ساتھ محبت پیدا ہوتی ہے۔ تصوف کی غرض و غایت یہ ہے کہ اس محبت کو مستحکم کیا جائے، یعنی مرید کو وہ [ط]ریقے سکھائے جائیں جن سے وہ اپنے اعمال میں پاکیزگی پیدا کر سکتا ہے اور [ا]س طرح اس کا کردار ہر آلائش سے پاک ہوتا ہے۔ پھر اس کی روح انتہائی بلندیوں [پر] پہنچ جاتی ہے۔ یہ درجات روحانی معلموں کی مسلسل نگرانی میں حاصل ہوتے ہیں [ی]ہی معلم سچے صوفی ہیں جو اسلامی حدود و فرامین کی پیروی کرتے ہیں۔ تصوف کا اصل

سرچشمہ قرآن وسنت یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات واعمال ہیں۔ صوفی کے لیے یا ایک مرید کے لیے جو صوفی بننے کا خواہاں ہے، ضروری ہے کہ کسی مذہبی یا شیخ سے وابستگی پیدا کرے اور اُس کی نگرانی ورہنمائی میں مجاہدہ کرتا ہے۔ جو شیخ قلوب کی رہنمائی کے کام کو سمجھتا ہے اُسے اپنے فن میں کامل اور تمام ضروری حقائق سے آگاہ ہونا چاہیے۔ اُس کی تعلیم دو شکلیں اختیار کرتی ہے: اوّل وہ تعلیم جس کا کسی خاص مضمون سے ہو اور اُس سے مطلوب علم حاصل ہو جائے۔ دوسری روشنی جو اُس علم کو درجۂ کمال پر پہنچاتی ہے۔ یہ چیز مشورے، توجہ یا خاص کام کے یا محض ایک نظر سے حاصل ہو جاتی ہے۔ بعض لوگ اسے ایک قسم کی اشراقیت دیں گے۔ شیخ وہ ہے جسے کسی بزرگ یا مذہبی رہنما کی طرف سے تعلیم واشراق کی ملی ہو، صوفی اور مرید شیخ کے ساتھ وابستہ ہو کر ایک طریقہ بن جاتے ہیں۔ اصل ایسے بہت سے طریقے رائج ہیں، بعض اوقات اُن کی سرگرمیاں ایک تکیہ میں مرکز ہو جاتی ہیں یعنی وہ سب کے سب اپنے رہنے سہنے کے لیے ایک مقام تجویز کر ہیں۔ ایسے مسلمان بھی بہت ہیں جو شیخ کی رہنمائی کے بغیر ہی خاص مذہبی اعمال انجام دیتے ہیں، اُنھیں عابد یا درویش کہا جاتا ہے، صوفی نہیں کہا جاتا[1]۔

تمام نمازوں، دعاؤں اور عبادتوں میں اللہ کا نام بار بار آتا ہے، لہٰذا اسلام تمام عبادتوں کے لیے ذکر کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کے لغوی معنی ہیں اور نام لینا اور عام طور پر یہ تمام مقررہ عبادتوں کے لیے استعمال ہوتا ہے مثلاً نماز روزہ، حج، زکوٰۃ اور ادائے کلمۂ شہادت، قرآن پڑھنا اور سنانا بھی ذکر ہی ہے۔ تصوف میں ذکر کا مطلب یہ بھی ہے کہ زبان سے اللہ کا نام بار بار لیا جائے یا خاموش رہ کر یہ سلسلہ جاری رکھا جائے۔ شیخ اس غرض سے بعض دعائیں اور مناجاتیں تجویز کر دیتا

[1] مصنف نے جو کچھ بیان کیا ہے اس کا تعلق صرف ترکی سے ہے،

۔ فرض نمازوں کے علاوہ لفظی نمازیں ادا کرنے کے لیے کہہ دیتا ہے ۔ یہ چیزیں
کے طریقِ تعلیم پر موقوف ہیں۔ اس قسم کی نمازوں کو عام طور پر نوافل کہا جاتا ہے یعنی
نمازیں جو اپنے شوق سے ادا کی جائیں۔ رسول اللہ صلعم ۔نے ایک قدسی حدیث[1]
فرمایا:

اللہ تعالیٰ کہتا ہے، اے میرے بندو، نوافل کے ذریعے سے میرا قرب
حاصل کیا جا سکتا ہے ۔ انجام کار میں اپنے بندے سے محبت کرنے
لگتا ہوں اور جب محبت کرنے لگتا ہوں تو میں ایک لحاظ سے اُس
کے کان، اُس کی آنکھیں اُس کے ہاتھ، اُس کے پاؤں اور اُس کی زبان
بن جاتا ہوں، وہ مجھ سے سنتا ہے، مجھ سے دیکھتا ہے، مجھ سے پکڑتا
ہے، مجھ سے چلتا ہے، مجھ سے بولتا ہے ۔

اس حدیث قدسی کے مطابق مسلسل نفل عبادت کے ذریعے سے انسان فرشتے
سکتے ہیں۔ وہ اپنی جماعت اور قوم، بلکہ پوری دنیا میں خاص روحانی قوت کا درجہ
ل کر لیتے ہیں۔ گویا وہ اعلیٰ اور مزکی اخلاق کے نمونے ثابت ہوتے ہیں۔

قرآن مجید میں بہت سی آیات ہیں نیز بہت سی احادیث ہیں جن سے واضح ہوتا
، کہ اسلامی تصوف کی ابتدا اسلام کے ساتھ ہی ہوئی کسی شیخ سے وابستگی پیدا کرنا اور
ے اپنا رہنما ماننا قرآن مجید کی ایسی آیات پر مبنی ہے ۔

مثلاً یہ:

يَاۤ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا	اے ایمان والو، خدا کے خوف سے بے پرواہ ہو جاؤ، اور چاہیے
اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا	کہ سچوں کے ساتھی بنو اپنے وہ ہیں جو ایمان میں، قول اور عمد ے

[1] مصنف کے نزدیک قدسی حدیث وہ ہے جس میں رسول اللہ صلعم نے اللہ تعالیٰ کی منشا کو اپنے
ں میں بیان فرمایا۔

مَعَ الصّٰدِقِیْنَ ○ (توبہ : ۱۱۹) کے ہیں اور سچائی سے الگ نہیں ہوتے۔)

۲۔ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِیْرًا ○ اے ایمان والو، یاد کرو اللہ کی بہت سی یاد (اس کا نام زبان سے بار بار دہراؤ اور دلوں میں رکھو۔) (احزاب : ۴۱)

۳۔ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَىِٕنُّ الْقُلُوْبُ یاد رکھو یہ اللہ ہی کا ذکر ہے جس سے دلوں کو (قرار) ملتا ہے۔ (رعد : ۲۸)

۴۔ فَوَیْلٌ لِّلْقٰسِیَةِ قُلُوْبُهُمْ مِّنْ ذِكْرِ اللّٰهِ اُولٰٓىِٕكَ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ○ سو خرابی ہے ان کو جن کے دل سخت ہیں ... وہ پڑے پھرتے ہیں بھٹکتے۔ (زمر آیت ۲۲) صریح۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو حدیثیں ارشاد فرمائیں اُن میں یہ بھی ہیں:

۱۔ ایمان کا سب سے اونچا درجہ یہ ہے کہ تم جان لو اللہ یقینی طور پر ہمیشہ تمھارے ساتھ ہے۔

۲۔ ہر چیز کے لیے صیقل ہے، دلوں کے لیے صیقل اللہ کا ذکر ہے۔

۳۔ اللہ کے نزدیک اُن انسانوں کا درجہ سب سے بلند ہے جو کثرت سے اللہ کا ذکر کرتے ہیں۔

۴۔ جو لوگ کثرت سے اللہ کا ذکر کرتے ہیں وہ اپنے آپ کو ریا اور فتنے سے بچا لیتے ہیں۔

تمام مذہبی طریقوں میں نصب العین یہ ہے کہ انسان رسول اللہ صلعم کی رضا و خوشنودی حاصل کرے جب انسان اس نصب العین کے لیے سفر شروع کرتا ہے سب سے پہلے اُسے اپنے ساتھ یعنی اپنے جسم اور قلب کے ساتھ جد و جہد پیش آتی ہے، قرآن مجید میں ہے:

وَالَّذِیْنَ جَاھَدُوْا فِیْنَا لَنَھْدِیَنَّھُمْ سُبُلَنَا وَاِنَّ اللّٰہَ لَمَعَ الْمُحْسِنِیْنَ ۝

اور جنھوں نے محنت کی ہمارے لیے ہم سجھا دیں گے اُن کو اپنی راہیں اور بلا شبہ اللہ نیکی کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

(عنکبوت : ۶۹)

ہمارے رسولِ پاک صلعم نے واضح فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے تعلق میں اپنے فرائض [کو] طریق پر بجالانے والے یعنی نیکی کرنے والے لوگ وہ ہیں جو اللہ کی عبادت اس [طرح] کرتے ہیں گویا وہ اُسے دیکھ رہے ہیں اگر یہ درجہ حاصل نہ ہو تو یہ ضرور ہو کہ اللہ انھیں [دیکھ] رہا ہے۔

صاف ظاہر ہے کہ تمام محنت اور تمام جد و جہد صرف اللہ کے لیے ہونی چاہیے۔ ایسا [کرنے سے] اللہ تعالیٰ مومن کو خاص بصیرت عطا کرتا ہے۔ یہ بصیرت اُن چیزوں کے متعلق روشنی پہنچاتی ہے جو اسے معلوم نہیں ہوتیں۔

تصوف کے پیرو کے نزدیک اللہ تعالیٰ کی رضا کے نصب العین تک پہنچنے کے [لی]ے مجاہدہ کرنے والوں کو سات مرحلے پیش آتے ہیں، پہلے مرحلے میں انسان کی مادی [فط]رت کو غلبہ حاصل ہوتا ہے اس میں انسانی نفس برائی کی طرف ابھارتا ہے۔ اس [مر]حلے کا ذکر قرآن مجید میں سورہ یوسف میں کیا گیا ہے۔

اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَۃٌ بِالسُّوْٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّیْ ط

بلاشبہ آدمی کا نفس برائی کے لیے بڑا ہی ابھارنے والا ہے، اس کے غلبے سے بچنا آسان نہیں مگر اس حال میں کہ میرا پروردگار رحم کرے۔

(یوسف: ۵۳)

اس مرحلے کی برائیوں کو بعض اوقات غرور، حرص، نفس پرستی، حسد، غصے، نفرت وغیرہ سے تعبیر کیا جاتا ہے گویا انسان حواس کے حیوانی لذائذ کی طرف رغبت رکھتا ہے، جو [قا]لب کو پستی کی جانب کھینچے لیے جاتے ہیں۔ یہ مرحلہ برائیوں کا محور اور بری عادتوں کا سرچشمہ ہے، ہر مذہبی طریقے کے شیخ اپنے پیروؤں کو ان برائیوں کے خلاف جد و جہد

پر آمادہ کرتے ہیں تاکہ آہستہ آہستہ تمام برائیاں محو ہو جائیں۔

دوسرے مرحلے میں نفسِ انسانی اپنی سابقہ نابینائی کی تاریکی سے نکل کر
روشنی دیکھنے کے لیے بیدار ہو جاتا ہے۔ پہلے وہ خدا کے پُر اسرار مقاصد سے
بے بہرہ تھا اور ذاتی امید و بیم کے چکروں میں پھنسا ہوا تھا، اب اُس کا نفس بد
کی مذمّت کے لیے تیار ہوتا ہے۔ جب اُس سے کوئی برائی سرزد ہوتی ہے تو
ملامت کرتا ہے۔ اس ملامت سے متنبہ ہو کر وہ فوراً برائی سے تائب ہو جاتا ہے۔ سو
قیامۃ کی دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ نے برائیوں پر ملامت کرنے والے نفس کی قسم کھا
اور سورہ ابراہیم کی بائیسویں آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اپنے آپ کو ملامت کرو۔
اور برائی پر ملامت نفس کے اس مرحلے میں انسان فسق و فجور اور بدعملی کے پرانے را
سے الگ ہو جاتا ہے، اگر یہاں سے نفس کی ترقی قائم نہ رہے تو پھر یہ پہلے مرحلے کی
عود کر جاتا ہے اور اصلاح و درستی حد درجہ مشکل ہو جاتی ہے۔

تیسرا مرحلہ تقدس کی طرف پہلا قدم ہوتا ہے۔ اس مرحلے میں خدا اپنی رحمت
سچائی، انسانی قلب پر منکشف کرتا ہے۔ جیساکہ قرآن مجید کی سورہ شمس کی ساتویں
آٹھویں آیت میں بتایا گیا ہے:

وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا

اور قسم ہے نفس کی جیساکہ اس کو ٹھیک بنایا پھر اُسے برائیوں اور پرہیزگاری کی سمجھ دی۔

قرآن مجید میں الہام کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ الہام کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعا
اپنی رحمت سے دل میں کوئی چیز ڈال دے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس سے مراد علم ہے
جو عمل کی دعوت دیتا ہے، اگرچہ یہ علم ہم نے استنباط اور مشاہدے کی بنا پر حاصل نہیں
کیا ہوتا اس مرحلے میں نفس گناہ کو ترک کر دیتا ہے لیکن اُسے فراموش نہیں کرتا، اس کی

لہ ولا اقسم بالنفس اللوامہ ٢ہ ولوموا انفسکم

س کی مثال یوں سمجھیے کہ سگریٹ پینے کا عادی تمباکو کشی چھوڑ دینے کے باوجود اپنے
کو اس خواہش سے آزاد نہیں پاتا۔

اب چوتھا مرحلہ آتا ہے، انسان یہاں پہنچتا ہے تو مادی خواہش بھی باقی نہیں رہتی
ن کے لیے اس میں صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے اور وہ بلند درجات پہ پہنچ سکتا ہے،
اپنے آپ کو بالکل اللہ کی رضا اور خوشنودی کے حوالے کر دیتا ہے۔ اس مرحلے
نفس کاملاً مغلوب ہو جاتا ہے اور مزکّی روح نہ سرکشی کرتی ہے اور نہ اسے کوئی شکایت
ی رہتی ہے۔ اللہ اپنی رحمت سے جو روشنی عطا کرتا ہے، نفس اپنے آپ کو اس
کے مطابق بنا لیتا ہے اور اللہ کی رضا سے موافقت پیدا کر لیتا ہے۔ اب اُسے سکون
اصل ہو جاتا ہے، جسے مذہبی طور سے ایقان کہنا چاہیے۔

ارشاد ہوتا ہے:

یَهْدِیْٓ اِلَیْهِ مَنْ اَنَابَ ۚ اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَتَطْمَئِنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللّٰهِ ۗ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ ۞	اور جو اللہ کی طرف رجوع ہوتا ہے تو اُسے اپنی طرف بڑھنے کی راہ دکھا دیتا ہے۔ (جو اُس کی طرف رجوع ہوئے) وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے اور ان کے دل اللہ کے ذکر سے مطمئن ہو گئے اور یاد رکھو یہ اللہ ہی کا ذکر ہے جس سے دلوں کو چین اور قرار ملتا ہے۔
(الرعد: ۲۷-۲۸)	

اس مرحلے پر نفس بری عادتوں سے آزاد ہو کر اچھی عادتوں سے مشرف ہوتا ہے، تشویش
مذبذب اور شک کی حالت باقی نہیں رہتی۔

پانچویں مرحلے میں نفس کی یہ کیفیت ہوتی ہے اُسے کچھ بھی پیش آ جائے کبھی شکایت
نہیں کرتا۔ اللہ تعالیٰ کے سوا وہ ہر چیز سے بے پروا ہو جاتا ہے اور جو کچھ اللہ تعالیٰ کی
طرف سے اس کے لیے آتا ہے وہ اچھا ہو یا برا، اذیت کا باعث ہو یا برکت کا، اسے اللہ
کی طرف سے سمجھتا ہے، مشہور ترک صوفی شاعر نے ایک رباعی میں اس حالت کی تصویر

خوب کھینچی ہے:

اے خدا جو کچھ تیری طرف سے آتا ہے، وہ میرے لیے بہرحال اچھا ہے
پھول برسیں یا کانٹوں سے سابقہ پڑے۔
عزت کا خلعت عطا ہو یا موت کا کفن
تیرا لطف و کرم بھی خوش گوار ہے، تیرے دیے ہوئے آزار پر بھی خوش ہوں۔

اگر نفس پانچویں مرحلے میں درجۂ کمال و رسوخ حاصل کر لے تو وہ ترقی کر کے چھٹے مرحلے میں پہنچ جاتا ہے، گویا عین خدا کی رضا اُسے حاصل ہو جاتی ہے۔ اس مرحلے کا ذکر قرآن مجید کی سورہ فجر میں یوں آیا ہے۔

يٰۤاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِیْۤ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً فَادْخُلِیْ فِیْ عِبٰدِیْ وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ

اے وہ نفس جس نے چین پکڑ لیا، چل اپنے رب کی طرف تو اُس سے راضی ہو وہ تجھ سے راضی ہو پھر شامل ہو میرے بندوں میں اور داخل ہو میری بہشت میں۔

(الفجر: ۲۷۔۳۰)

پروفیسر اربری نے ان آیات کا ترجمہ یوں کیا ہے:

اے اطمینان پائی ہوئی روح، اپنے مالک و آقا کی طرف لوٹ،
خود بھی خوب خوش اور مالک کے لیے بھی رضا کا پیکر،
تو میرے خدمت گزاروں میں داخل ہو جا،
اور میری بہشت میں جگہ لے لے۔

ساتویں مرحلے میں وہ لوگ پہنچتے ہیں جن کی ترقی کا سلسلہ جاری رہتا ہے، وہ اپنے انا، اپنی نمود و نمائش اور ہر قسم کے دعوے پیچھے چھوڑ جاتے ہیں، تاکہ ہر طرح کا درجۂ کمال حاصل کر لیں۔ اُنھیں پیغمبروں کی میراث سے حصہ مل جاتا ہے، ذاتِ باری تعالیٰ کے متعلق اُنھیں علم حاصل ہوتا ہے اور وہ حقیقت سے آشنا ہو جاتے ہیں۔ یہ روحانی ترقی

آخری منزل ہے۔

یہ سات مرحلے یا منزلیں تعلیم و تربیت اور نظم و ترتیب کا ایسا نظام ہیں جو تمام اسلامی
...یقوں میں مشترک طور پر رائج ہے۔ اُن میں اختلاف محض عملی جزیات تک محدود ہے۔
...ا بعض طریقوں میں ذکر خفی پر زور دیا جاتا ہے، خواہ ایک آدمی ذکر کر رہا ہو یا بہت سے
...ایک حلقے میں بیٹھ کر ذکر کریں۔ دوسرے طریقوں میں ذکر جہر، موسیقی اور وجد و رقص
...بھی دستور ہے۔ پیروانِ تصوف کے بیان کے مطابق رسول اللہ صلعم نے حضرت
...بکرؓ کو ذکر خفی سکھایا اور حضرت علیؓ کو ذکر جہر کی تعلیم دی، یہی وجہ ہے کہ نقش بندی
...یقے میں جو حضرت ابوبکرؓ کے واسطے سے رسول اللہ صلعم تک پہنچتا ہے، ذکر خفی رائج
ہے اور جو طریقے حضرت علیؓ کے واسطے سے رسول اللہ صلعم تک پہنچتے ہیں، اُن میں
جہر کا دستور ہے۔

ذکر جہر میں بڑا جوش، سرگرمی اور محویت پیدا ہو جاتی ہے، پہلے وہ لوگ شیخ کی ہدایت
کے مطابق بلند آواز سے ذکر شروع کرتے ہیں، پھر کھڑے ہو جاتے ہیں اور ایک دوسرے
ہاتھ پکڑ کر ایک حلقے میں گھومنے لگتے ہیں، ساتھ ساتھ آگے پیچھے دائیں بائیں جھکتے
...ی رہتے ہیں۔ یہ حرکت بلا انقطاع ہم آہنگی کے ساتھ جاری رہتی ہے، خوش آواز
...دیے گاتے ہیں اس طرح جوش انگیز سرگرمی میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ بعض طریقوں میں
...ن موقع پر طنبوری بجاتے ہیں۔ مولوی طریقے میں نے نوازی کا دستور ہے، ترکی کے
...ہروں اور قصبوں میں مختلف صوفی طریقوں کے بہت سے تکیے ہیں۔ ان میں بعض ذکر جہر
...کا رہند ہیں اور بعض ذکر خفی پر اصرار کرتے ہیں۔ استنبول میں شعبانی طریقے کے شیخ احمد
نے موجودہ صدی کے آغاز میں اپنے مریدوں کو تاکید کر دی کہ ذکر کے لیے کبھی جمع نہ ہوں
...د سب الگ الگ خلوت میں بیٹھ کر ذکر کریں، زیادہ تر قرآن مجید پڑھا جائے یا رسول اللہ
...صلعم کی نعتیں اور آپ کے اصحاب کے مناقب دہرائے جائیں، صوفیوں کے طریقوں

میں اس قسم کے ردّوبدل کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔

مشرقی سرزمین کے ترکوں میں صوفیت کا زیادہ رواج خواجہ احمد یسوی، (وفات ۵۶۲ھ
۱۱۶۶ء) سے ہوا۔ وہ ترکستان کے باشندے تھے اور یسوی کی نسبت اُنھوں نے اُ
شہر سے لی جہاں وہ تعلیم و تربیت دیتے تھے۔[1] جب آپ نے علم و فضل اور ذکر و فکر میں
بہت شہرت حاصل کر لی تو وقت کے فرماں روا نے آپ سے درخواست کی کہ وطنیت
کی نسبت سے شہر کی عزت بڑھائیں۔ جس شیخ کے ماتحت آپ نے تعلیم و تربیت پائی
تھی اُس کی وفات پر آپ بخارا چلے گئے[2] اور اپنے زمانے کے سب سے زیادہ مشہور
شیخ بن گئے۔ بہت سے بزرگ جو آگے چل کر مشہور ہوئے، احمد یسوی ہی سے فیض یافتہ
تھے، شیخ احمد کا اثر صرف ترکوں کے مشرقی علاقوں تک محدود نہ تھا، بلکہ یہ اثر اناطولیہ کے
علاوہ عثمانی سلطنت کے یورپی علاقوں میں بھی پھیل گیا تھا، گیارھویں صدی ہجری (سترھویں
صدی عیسوی) کے مشہور ترک سیاح اولیا شبلی کا سفرنامہ چھ جلدوں میں شائع ہوا۔
وہ چھٹی جلد میں بہت سے پیرانِ طریقت کا ذکر کرتا ہے، جن کا سلسلہ خواجہ احمد یسوی
سے ملتا تھا اور کہتا تھا کہ ایک تکیے میں دو سو آدمیوں کی گنجائش تھی۔

ترکوں میں اور بھی بہت سے پیرانِ طریقت تھے جو چنگیز خاں کی یورش کے وقت
وطن چھوڑ کر نکل گئے اور انھیں ملکوں میں آباد ہو گئے جہاں ترک رہتے تھے، اس طرح
ترکوں کی ہر آبادی میں صوفیوں کے طریقے رائج ہو گئے اور ہر آبادی میں ایک سے زیادہ
تکیے پائے جاتے تھے۔

عثمانی سلطنت کی افواج جس طرف جاتیں، علمار اور مشائخ بھی اُن کے ساتھ جاتے

[1] یسی شیخ کا مولد تھا، وہیں آپ تعلیم دیتے رہے، اسی جگہ آپ کا مزار ہے، اس وجہ سے یسوی
مشہور ہوئے۔ [2] مقالہ نگار نے خواجہ احمد یسوی کے مرشد کا نام نہیں بتایا، اولیار کے تذکروں سے
معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے مرشد کا نام شیخ یوسف ہمدانی تھا۔

اہل فوج کو اسلامی احکام کی تعلیم دیتے، مشائخ اُن کی روحانی تربیت کا بندوبست
تے۔ اس طرح پوری سلطنت میں صوفیوں کے طریقے اور تکیے قائم ہو گئے۔

خواجہ احمد یسوی کے علاوہ ترکی کی طویل تاریخ میں سیکڑوں مشہور صوفی گزرے
مولانا جلال الدین رومی (وفات ۶۷۲ھ، ۱۲۷۳ء) اسلام کے بہت بڑے
روں اور شاعروں میں سے تھے۔ مولانا ہی نے مولوی طریقے کی بنیاد رکھی۔ مولانا
یدائش بلخ میں ہوئی تھی۔ اُن کا تعلق خوارزم کے ایک ترک خاندان سے تھا، اُن
والد بھی بہت بڑے عالم تھے اور سلطان العلماء کے لقب سے یاد کیے
تے تھے۔ باپ بیٹا دونوں ترکِ وطن کر کے پہلے حجاز گئے، پھر دمشق کا رخ کیا۔ آخرکار
قی سلطان کی دعوت پر قونیہ میں مقیم ہو گئے۔ قونیہ ہی میں باپ کی وفات پر بیٹے نے
ر درس سنبھالی اور اپنے علم و فضل کی بنا پر بڑی شہرت پائی۔ جب تصوف کا شوق
ہوا تو درس و تدریس چھوڑ کر مولانا نے اسی سمندر میں غوطہ لگانے کا فیصلہ کر لیا۔ پھر
ی کی ترتیب شروع ہوئی جو سرزمین مشرق کا بہترین شاہکار ہے۔ اس کتاب
یس ہزار شعر ہیں۔ مولانا نے اس کے علاوہ بھی کچھ کتابیں لکھی ہیں مثنوی اور یہ کتابیں
پاکستان، ایران اور افغانستان میں وسیع پیمانے پر پڑھی جاتی ہیں۔ وفات کے بعد
نا قونیہ ہی میں دفن ہوئے اور ان کا مقبرہ ایک قومی یادگار بن گیا جس کے لیے ترکی
امت سے دوسرے ملکوں سے زائروں کا ایک تانتا بندھا رہتا ہے، مولانا
رسی کے دن قونیہ میں بڑے احترام سے مجلسیں منعقد ہوتی ہیں۔ انقرہ اور استنبول
ریڈیو اسٹیشنوں سے خاص پروگرام نشر کیے جاتے ہیں، جن میں مولانا کے سوانح حیات
پ کی تعلیمات سے بحث کی جاتی ہے۔

مولانا جلال الدین رومی کی تصانیف میں کہانیاں ہیں، وقائع ہیں، اخلاقی تنبیہات
تصوف کے دقیق نکتے ہیں۔ یہ چیزیں اکثر اشعار کی شکل میں یا استعاروں میں پیش کی

جاتی ہیں۔ مولانا نے سب کچھ فارسی میں لکھا تھا، اُن کی تصانیف کے ترجمے ترکی اور بہت دوسری زبانوں میں بھی ہو گئے ہیں۔ یہاں مولانا کے چند اشعار بطورِ نمونہ پیش کیے جاتے ہیں :

اے عشق تو ہماری تمام بیماریوں کا علاج ہے۔
جس میں عشق کی آگ موجود نہ ہو بہتر ہے وہ نیست ہو جائے۔
تو پتھر ہو یا چٹان یا سنگِ مرمر جب ایک پختہ کار اور کامل الفضل معلّم کے ہاتھ پہنچے گا جس کی روح زندہ ہے تو بیش قیمت ہیرا بن جائے گا۔
جب تمھارا رجحان خارزار اور ریگ زار کی طرف ہے تو وہاں سے تمھیں پھول کو ملِ جائیں گے ؟

ہر رونے کا انجام بے شبہ ہنسی ہے، بابرکت ہے وہ آدمی جس کی نظر انجام پر ہے۔
"مولانا" ایک لقب ہے جو اعلیٰ پائے کے مشائخ کو دیا جاتا ہے۔ اس کے معنی ہیں ہمارا سردار، ہمارا آقا اور ہمارا بزرگ۔ مولانا جلال الدین رومی واقعی اس لقب کے مستحق تھے، اس لیے نہیں کہ وہ بہت بڑے فلسفی تھے۔ فلسفے کو تو انھوں نے ٹھکرا دیا تھا۔ اس لیے مستحق تھے کہ انھیں روحانی بصیرت حاصل تھی۔ مولانا مثنوی میں فرماتے ہیں: فلسفی ہمیشہ افکار و آلام میں گرفتار رہتا ہے، ان سے اوپر کچھ نہیں دیکھتا جا اس سے کہو اپنا سر دیوار سے پھوڑ لے۔ فلسفی شیطان کا بھی منکر ہے لیکن ساتھ وہ شیطان کا دست پروردہ بھی بنا رہتا ہے۔ اسی طرح مولانا فرماتے ہیں عقل جو فلسفے کا سرچشمہ ہے اپنے استدلال کے حدود سے باہر نہیں جا سکتی اور محبتِ باری تعالیٰ کی لذتیں عقل کی دسترس سے باہر ہیں۔ عقل عشق پر نکتہ چینی کرتی ہوئی اس گدھے کی طرح معذور ہو گئی ہے جو کیچڑ میں پھنس گیا ہو۔ صرف عشق ہی عشق کی حقیقت بیان کر سکتا ہے۔

مولانا جلال الدین رومی کے پیروؤں نے مولوی طریقہ جاری کیا جس کا مرکز قونیہ ہے۔ اس طریقے کا نظم و نسق اُس رئیس کے ہاتھ میں ہوتا تھا جسے سلطنتِ عثمانیہ زمانے میں سلطان مقرر کرتے تھے اور وہی عہدے سے ہٹاتے تھے۔ ترکی میں ت سے مولوی طریقے کے تکیے بن گئے تھے، بلکہ ہنگری اور ہندوستان جیسے دور افتادہ قے میں بھی یہ طریقہ پہنچ گیا تھا۔ ترکی میں سلجوقی اور عثمانی سلطنت کے بلند پایہ عہدے ولانا روم کا خاص احترام کرتے تھے اور ہر عہد میں پڑھے لکھے آدمیوں کی بہت تعداد مثنوی ضرور پڑھتی رہی۔ سلطان محمود ثانی نے ینی چری فوج کو برخواست کر دیا تو ہی تصوف کے بکتاشی طریقے کو بھی منسوخ کر دیا، جو ینی چری میں بہت ہر دل عزیز اُس وقت بہت سے بکتاشی پیروؤں نے مولوی طریقے کے تکیوں میں داخل ہو جانیں بچالیں، نتیجہ یہ نکلا کہ مولوی طریقہ اپنی ابتدائی حیثیت زائل کر بیٹھا، بلکہ اس ں اوقات شیعیت کی پیروی کا الزام بھی لگتا رہا۔ حالانکہ یہ الزام اُن بکتاشیوں کی رمیوں کا نتیجہ تھا جنھوں نے مولوی طریقے کا بھیس اختیار کر لیا تھا خود مولویوں متعلق شیعیت کا الزام قطعاً درست نہیں مانا جا سکتا۔ اُن میں سے تو ہر فرد صبح کو تے ہی پڑھا کرتا تھا کہ اللہ تعالیٰ میرا خدا ہے، اسلام میرا مذہب ہے، محمد رسول اللہ ے نبی ہیں، قرآن میری کتاب ہے، ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ اور علیؓ امام ہیں۔ اس ظاہر ہوتا ہے کہ مولوی طریقے کے آدمیوں میں خلفاء راشدین کا کتنا احترام تھا۔

ترکی میں جمہوری حکومت قائم ہوئی تو صوفیوں کے تمام تکیے حکم خاص کے یعے سے بند کر دیے گئے۔ اُس وقت سے ملک میں تصوف کا کوئی طریقہ باقی نہیں

ایک مرتبہ مولانا جلال الدین رومی سے پوچھا گیا کہ آپ کے تکیے کا خاص ذکر کیا ہے؟ دل نے فرمایا:

ہمارا ذکر اللہ، اللہ، اللہ کے سوا کچھ نہیں، اس لیے کہ ہم اللہ کے بندے ہیں۔ ہم اللہ کی طرف سے آئے ہیں، ہم اللہ کی طرف جائیں گے میرے والد ہمیشہ اللہ، اللہ، اللہ سنتے تھے، اللہ کا ذکر کرتے تھے اور اللہ کا نام لیتے تھے۔ خدائے قدیم تمام انبیا، اور بزرگوں کے سامنے مختلف ناموں سے نمایاں ہوتا رہا ہے۔ ہم مسلمانوں کے لیے اُس نے اسم اللہ کے ساتھ ظہور کیا جس میں تمام اسمار اور تمام صفات شامل ہیں۔

مولوی طریقے کے پیروؤں کے نزدیک مولانا نے اپنے اُن جدو رقص پر زور دیا تھا تاکہ جذبات ابھریں اور وجد کی حالت طاری ہو جائے۔ مولانا وجد و رقص کو سالکوں کے لیے روشنی اور زیب و زینت قرار دیتے لیکن کہتے تھے جن لوگوں کو محبت ہے اُن لوگوں کے لیے تو یہ جائز ہے اور جو لوگ مذہب کے منکر ہیں ان لوگوں کے لیے یہ ہرگز جائز نہیں۔ اس طریقے کے لوگ وجد و رقص کے ثبوت میں یہ دلیل دیا کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض لوگوں کو رقص کرتے دیکھا اور منع نہ کیا۔ مثلاً ایک موقع پر حضرت جعفرؓ ابن ابی طالب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے۔ حضورؐ نے ان سے معانقہ کیا اور پیشانی کا بوسہ لیتے ہوئے فرمایا کہ پیدائش اور کردار میں تم مجھ سے ملتے جلتے ہو۔ حضرت جعفرؓ نے یہ سنا تو مسرت و شادمانی کے عالم میں نادانستہ رقص کرنا شروع کر دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خوشی کے اس مظاہرے کو غیر مناسب قرار نہ دیا۔ ایک اور دلیل جس پر ان صوفیوں کا انحصار ہے یہ ہے کہ ایک مرتبہ حبشی مسلمان رقص کر رہے تھے اور گا بجا رہے تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجرۂ مبارک سے اُنھیں دیکھا اور منع نہ فرمایا۔

مولوی طریقے کے لوگ کہتے ہیں کہ رقص اور مسرت و شادمانی ہر زندہ وجود میں مشترک ہے۔ جانور بھی خوشی میں آتے ہیں تو اچھلتے کودتے ہیں۔ آدمی کا درجہ ان میں سب سے بلند ہے۔ اُس میں بھی فطری رجحان موجود ہے کہ ہم آہنگ حرکتیں

ناؤ وہ اس حالت میں جب سرور انگیز گانے سنتا ہے۔ خدا کے پرستار یعنی درویش جب
در شادمانی سے بےخود ہوتے ہیں تو اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور رقص کی حالت میں ایک
وضع کی ہم آہنگ حرکتیں کرتے ہیں جب یہ حرکتیں خلوصِ قلب سے کی جائیں تو جذبِ
خودی کی حالت طاری ہو جاتی ہے۔

رقص کے آغاز میں نعت پڑھی جاتی ہے جس کے ابتدائی مصرعے کا مفہوم یہ
: "اے اللہ کے محبوب آپ خالقِ مطلق کے سچے فرستادہ ہیں" یہ نعتیہ کلام فضا میں
نا ہے تو سر جھک جاتے، آنکھیں بند کر لی جاتیں اور روح ترنم کی دنیا میں پہنچ جاتی،
کے بعد سب سے بڑا نے نواز جو چیز مناسب سمجھتا، بجاتا، پھر ایک تمہیدی گانا
جاتا جب طنبوری کی الاپ شروع ہوتی تو درویش کھڑے ہو جاتے اور طنبوری کی
ایک حلقہ بنا کر گھومنے لگتے۔ پھر رقص شروع ہو جاتا۔

اہل طریقہ کے نزدیک حلقہ بنا کر رقص کرنا شعلہ جوالہ کی حیثیت رکھتا ہے اور اسے کائنات
ان سمجھنا چاہیے۔ آدھا حلقہ قوسِ ہبوط سمجھا جاتا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ تمام
اپنے مبدا سے کس طرح نکل کر دور پہنچیں۔ انسان سب سے آخر میں بنایا گیا تھا
یہ سب سے نیچے رہا۔ حلقے کا نصف ثانی قوسِ صعود کہلاتا ہے، اس میں یہ بتایا جاتا
مخلوق کس طرح دوبارہ اپنے مبدا کی طرف جاتی ہے۔ انسان سب سے نیچے تھا
وہ درجہ بدرجہ ترقی کرتے ہوئے اپنے پہلے سرچشمے پر پہنچ گیا۔ قرآن مجید کہتا ہے
سب کی طرف لوٹو گے، قوسِ ہبوط میں ہبوط کا مطلب ہے اللہ تعالیٰ سے نیچے کی
آنا اور صعود کا مطلب نیچے سے اللہ تعالیٰ کی طرف جانا۔ رقص کی بنیاد انسان کی
اہش تھی کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف صعود کا سلسلہ برابر جاری رکھے۔

ہم نے مولوی طریقے کے متعلق اس لیے تفصیل سے بحث کی کہ اس کی
شست و تنظیم میں صوفی طریقوں کی بہت سی ضروری باتیں آگئی ہیں۔ ایک اور طریقہ

بکتاشیوں کا تھا جو بہت بڑا طریقہ مانا جاتا تھا لیکن جمہوری حکومت نے اس پر پا
لگا دی۔ اس طریقے نے نئی چیزوں کے ساتھ انتساب کی بنا پر بہت اثر و رسوخ حاص
کیا تھا۔ اس کا بانی حاجی بکتاش ولی تھا جو خراسان میں پیدا ہوا اور [illegible] در
میں اناطولیہ پہنچ گیا۔ اناطولیہ ہی میں اس نے اپنے طریقے کی بنیاد رکھی۔ حاجی بکت
کا وطن شیخ احمد یسوی کے ایک خلیفہ سے وابستہ تھا۔ بہت سے لوگ اس کے
کی زیارت کے لیے جاتے ہیں، وہاں نمازیں پڑھتے ہیں قرآن کی تلاوت کرتے
پیر سے مدد مانگتے ہیں۔

ایک اور طریقہ جس کے پیرو ترکی میں بہت زیادہ تھے اور جو انڈونیشیا تک
گیا ہے نقش بندی طریقہ ہے۔ اس کی بنیاد خواجہ بہاؤ الدین نقشبندی نے رکھی
جن کا مولد بخارا تھا اور وہیں خواجہ صاحب کی زندگی کا بیشتر حصہ گزرا۔ وہیں آ
۷۹۰ھ مطابق ۱۳۸۸ء میں وفات پائی۔ خواجہ صاحب کے بہت سے مرید
چونکہ آپ نے خواجہ احمد یسوی کے ایک خلیفہ سے بھی تربیت پائی تھی، اس و
نقش بندی طریقے کو عموماً یسوی طریقے کی ایک شاخ سمجھا جاتا ہے۔

باشندگانِ ترکی درجنوں دوسرے طریقہ ہائے تصوف سے بھی بخوبی آگاہ ہیں
یہاں ان سب پر تفصیلی بحث کی گنجائش نہیں۔ ترکوں کے درمیان ان کی تعلیمات کا اثر
وسیع رہا۔ اب تمام طریقوں کے تکیے حکماً بند ہو چکے ہیں اور کوئی بھی اپنے خاص
طریقوں کی پیروی نہیں کرتا۔ یہ بھی تسلیم کر لینا چاہیے کہ ان طریقوں میں جو خلوص اور پا
بالکل آغاز میں پائی جاتی تھی وہ مدت سے ناپید ہو چکی تھی تاہم تصوف کا اثر کا
نہیں ہوا۔ ہر شخص جس طرح چاہے دعا کر سکتا ہے، اور تنہائی میں جس ذکر کو پسند کر

۱ہ جیسا کہ مترجم کو علم ہے یہ بات صحیح نہیں۔ خواجہ بہاؤ الدین نقشبندی نے زیادہ تر فیض امیر کلال اور خواجہ محمد بابا سماسی سے
کیا۔ غالباً ان میں سے کوئی بھی شیخ احمد یسوی کے سلسلے سے وابستہ نہ تھا۔

بیتا ہے۔ مقصودِ حقیقی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام اور رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم
کی پیروی کی جائے۔ آج ترکی کے اندر شیعہ سُنّی کے درمیان کبھی کوئی جھگڑا
ا، قرآن کے ظاہری الفاظ کے مطابق اُس کی تعبیر یا متصوّفانہ تعبیر میں بھی ہر شخص
۔ جسے جو طریقہ پسند آئے اختیار کر سکتا ہے۔

کا نظامِ حکومت

ترکی کی مجلس ملیہ کبیر کے تمام ارکان چنے جاتے
ہیں، اُن میں سے ننانوے فی صد مسلمان تُرک ہیں
ب دینوی معاملات کے متعلق قانون بناتے ہیں اور تعزیرات مقرر کرتے ہیں،
مطابق عمل کیا جاتا ہے عقائد، عبادات اور اخلاق کے متعلق شریعت کے احکام
رائج ہیں اور ہر شخص اُن کی پابندی کرتا ہے۔ تُرکی میں اسلامی امور و معاملات کے
کاری اور آئینی اختیارات کا مرکز ناظمِ امورِ مذہبی ہے اور اُس کے ساتھ حکومت
ل سے مفتی مقرر کر دیے گئے ہیں۔ چونکہ اسلام میں پادریوں اور پروہتوں جیسا کوئی
وجود نہیں اس لیے ہر شخص جسے مذہبی معاملات کے متعلق پوری معلومات حاصل
مسئلے کے متعلق بتا دیتا ہے کہ اُس کی صورت کیا ہے۔

ترکی کی قومی پالیسی نسل کے انتساب سے پاک ہے اسلام نے مسلمانوں
لر دیا ہے کہ صرف اپنی نسل کا خیال رکھیں اور دوسری نسلوں کو نفرت حقارت کی
سے دیکھیں۔ قرآن مجید میں بہت سی آیات میں اور رسول کریم کی بہت سی احادیث میں نسل پرستی
لعنت کی گئی ہے ابتدا ہی سے اسلام کی غرض و غایت یہ تھی کہ انسانوں اور
کے درمیان اخوت اور برادری کے رشتے قائم کر دے۔ حقیقی اسلامی حکومت
لیے بنیادی شرطیں یہ ہیں کہ باہم مشورہ کیا جائے۔ علم، صلاحیت، انصاف، ذمہ داری
امور میں کوئی خلل نہ آئے۔ قرآن مجید میں ان امور کا ذکر متعدد مقامات پر
ہے :

۱۔ وَالَّذِیْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّہِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاَمْرُہُمْ شُوْرٰی بَیْنَہُمْ (شوریٰ: ۳۸)

اور جنھوں نے اپنے رب کا حکم مانا اور نماز قائم کی اور کام آپس میں مشورے سے کرتے ہیں۔

۲۔ ثُمَّ جَعَلْنٰکَ عَلٰی شَرِیْعَۃٍ مِّنَ الْاَمْرِ فَاتَّبِعْہَا وَلَا تَتَّبِعْ اَہْوَاءَ الَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ (جاثیہ ۱۸)

اے پیغمبر! ہم نے تجھ کو دینی کام کے ایک راستے پر لگا دیا سو تو اسی پر چل اور نادانوں کی پیروی نہ کر۔

۳۔ اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُکُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓی اَہْلِہَا وَاِذَا حَکَمْتُمْ بَیْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْکُمُوْا بِالْعَدْلِ (النساء: ۵۸)

خدا تمھیں حکم دیتا ہے کہ جس کی امانت ہو وہ اس کے حوالے کر دو اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو چاہیے کہ انصاف سے کرو۔

۴۔ یٰٓاَیُّہَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ لِلّٰہِ شُہَدَآءَ بِالْقِسْطِ وَلَا یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓی اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا ہُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی وَاتَّقُوا اللّٰہَ اِنَّ اللّٰہَ خَبِیْرٌ بِمَا تَعْمَلُوْنَ (مائدہ: ۸)

اے ایمان والو ایسے ہو جاؤ کہ خدا کی سچائی دینے میں مضبوطی سے قائم رہنے والے اور انصاف کے لیے گواہی دینے والے ہو اور دیکھو ایسا کبھی نہ ہو کہ کسی گروہ کی دشمنی تمھیں اس بات کے لیے ابھار دے کہ (اس کے ساتھ انصاف نہ کرو (ہر حال میں) انصاف کرو کہ یہی تقویٰ سے لگتی ہوئی بات ہے اور اللہ سے ڈرو کہ تم جو کچھ کرتے ہو وہ اس کی خبر رکھنے والا ہے۔

اسلام کے نزدیک یہ حکومت کے واجبات ہیں۔ ترکوں نے بہت سی زمینیں فتح کیں بڑی بڑی سلطنتوں کی بنیادیں رکھیں، اس لیے بار بار یہ سوال پیدا ہوا کہ ان کے نزدیک جہاد کا کیا مقام ہے؟ ان کے لیے بھی جہاد وہی حیثیت رکھتا ہے جو اسے عام مسلمانوں کے متعلق ہی حاصل ہے، ایک اعتبار سے یہ نفس کے خلاف جنگ ہے، یعنی انسان اپنی بری خواہشات کو زور و قوت سے دبائے۔ قرآن مجید کی بہت سی آیات نیز احادیث اس کی گواہ ہیں یہ جہاد بہت اہم ہے باقی رہا مختلف قوموں سے رزم و پیکار کا مسئلہ تو اسلام

رف دفاع کے آخری ذریعے کے طور پر قبول کرتا ہے اور صرف دفاع کے لیے حکمران
تلف اوقات میں اپنے دنیاوی مقاصد کے لیے لڑائیاں لڑتے رہے، لیکن اسلام نے
ن کے سلسلے میں دفاع کے سوا کسی جنگ کو جائز قرار نہیں دیا۔ اسلام کی اشاعت کے
سلسلے میں کہیں جبر یا اکراہ کی ضرورت پیش نہ آئی اس مقدس مذہب کی حیثیت یہ ہے گویا کوئی شخص تازہ ہوا میں سانس لے۔
یے خدا نے عقل سلیم عطا کی ہے وہ بہرحال اس کا خیر مقدم کرے گا صلیبی جنگوں کے زمانے میں بہت سے مسیحیوں نے رضا و رغبت
سے اسلام قبول کیا ترکی کے باشندے اپنے مذہب کی حفاظت کے لیے جانیں لڑا
ں گئے لیکن صالح مسلمان ہونے کی حیثیت میں وہ کسی کو اسلام قبول کر لینے پر مجبور
یں کر سکتے۔

جمہوری حکومت کے ماتحت تعلیم کے مصارف حکومت برداشت کر رہی ہے۔
لک میں ابتدائی مدارس بھی ہیں اور ثانوی مدارس بھی، جن میں عام دنیوی تعلیم دی جاتی ہے
ذہبی تعلیم اختیاری ہے۔ انقرہ یونیورسٹی میں ایک شعبہ دینیات کا بھی ہے اور استنبول
ی یونیورسٹی میں اسلامی علوم کے لیے ایک مستقل انسٹی ٹیوٹ قائم ہے، ان مرکزوں میں
سلامی تاریخ اور ادب کے متعلق تعلیم اور تحقیقات کے سلسلے جاری ہیں۔ مستند مذہبی
عالم بھی اسلام کی تعلیم دیتے ہیں مثلاً مفتی جو اسلامی قانون کے مطابق مختلف امور کے
تعلق فتوے صادر کرتے ہیں، امام جو مسجدوں میں نماز پڑھاتے ہیں، خطیب جو جمعہ کی نماز
یں یا خاص اوقات میں خطبے دیتے ہیں ایسے لوگ بھی ہیں جو امامت اور خطابت دونوں
کے منصب سنبھالے بیٹھے ہیں یعنی وہ نماز بھی پڑھاتے ہیں خطبہ بھی دیتے ہیں اور
دینی تعلیم کا بندوبست بھی کر لیتے ہیں۔ آج کل ترکی کے سترہ صوبوں میں درس گاہیں موجود
یں جن میں امام اور خطیب تعلیم پاتے ہیں۔ ان درس گاہوں کا مدعا یہی ہے کہ ذمہ داریاں
سنبھالنے والے لوگ مستند ہوں۔

ناظم امور مذہبی کے زیر اہتمام اسلام کے متعلق بہت سی کتابیں شائع ہوئی ہیں

اور یہ عہدے دار ترکی میں اسلامی اُمور کی عمومی نگرانی کا ذمہ دار ہے۔ حکومت اگلا قدم یہ اٹھائے گی کہ اپنی اشاعتی سرگرمیوں کا دائرہ وسیع تر کر دے گی خصوصاً اسلام کے متعلق چھوٹی چھوٹی اور کم قیمت کتابیں نہایت سادہ زبان میں شائع کرے گی جنھیں عام لوگ بے تکلف پڑھ سکیں۔ ساتھ ہی اماموں اور خطیبوں کو تعلیم و تربیت دینے والی درس گاہوں کی تعداد بڑھا دے گی اور ان میں طلبار کے لیے اقامت کا بھی بندوبست کر دے گی تاکہ دور دور سے لوگ آکر باطمینان تعلیم پا سکیں۔ یہ بھی مناسب ہوگا کہ مذہبی تعلیم کے لیے جگہ جگہ لکچروں کا انتظام کر دیا جائے اور اس مذہبی تعلیم پر خاص توجہ کی جائے جس میں ثقافتی مضمون کا بھی خاص خیال رکھا گیا ہو۔

عثمانی سلطانوں کے زمانے میں شرعی امور کے لیے ایک وزیر مقرر ہوتا تھا جسے شیخ الاسلام کہتے تھے اور ایک وزیر اوقاف کے لیے ہوتا تھا جب جمہوری حکومت قائم ہوئی تو مجلس ملیہ کبیر نے شریعت و اوقاف دونوں کی نگرانی وزیر شریعت کے حوالے کر دی آگے چل کر مذہبی طریقے منسوخ کر دیے گئے تو شریعت کے متعلق تمام معاملات ناظم امور مذہبی کی تحویل میں دے دیے گئے اور اوقاف کے متعلق تمام معاملات ناظم اوقاف کے سپرد کر دیے گئے۔ دونوں ناظموں (ناظم امورِ مذہبی اور ناظم امور اوقاف) کا تعلق وزیر اعظم کے دفتر سے ہے۔ وقف یا کسی ایسے مستقل عطیے کا انتظام جس کی آمدنی مذہبی یا عوامی کاموں کے لیے مخصوص کر دی جائے، اللہ کی خوشنودی کا باعث ہے۔ تمام اسلامی ملکوں میں ابتدا ہی سے اوقاف چلے آتے ہیں۔ ترکی علاقوں کے اوقاف نے خدمت انسانیت، اشاعت علوم، نیز ثقافت و فنون میں بڑا اہم کردار ادا کیا ہے۔ زیادہ تر علمار انھیں اداروں میں تعلیم و تربیت پاتے تھے جن کے مصارف اوقاف سے پورے ہوتے تھے، بڑی بڑی یادگاریں اور مسجدیں بھی اوقاف ہی کی آمدنی سے بنیں، جن کی ستائش آج ہر شخص کی زبان پر ہے۔ ترکی کے اوقاف مختلف لوگوں کی خدا پرستی

...نتیجہ تھے۔ یہ عوام کی بہبودی کے لیے قائم کیے گئے تھے اور آج بھی ترک مسلمانوں کی ...سانی ہمدردی کے زندہ نشانوں کی حیثیت میں قائم ہیں۔

اوقاف بہت سے مقاصد کے لیے قائم ہوئے۔ مثلاً آبی وسائل کی تعمیر و حفاظت کے لیے، چشموں اور کنوؤں کی تعمیر کے لیے، سڑکوں اور پلوں کی تعمیر کے لیے۔ بعض ...قاف کا مدعا یہ تھا کہ غریبوں اور محتاجوں کو پکا پکایا کھانا ملتا رہے۔ بعض لوگوں نے ...ن غرض سے باقاعدہ مہمان خانوں کا انتظام کر دیا یا بیوہ عورتوں کے لیے خاص مکان ...دیے گئے۔ مختلف اوقاف درس گاہوں، کتب خانوں، مسجدوں، تکیوں اور قبرستانوں ...ن تعمیر و نگرانی کے لیے قائم ہوئے۔ بعض لوگوں نے کھلے میدانوں میں ادائے نماز ...کے لیے جگہیں تعمیر کرا دیں۔ اوقاف سے سرائیں بھی بن گئیں جن میں آدمیوں اور جانوروں ...کے ٹھہرنے کا انتظام تھا۔ ان کے علاوہ دوا خانے، ہسپتال، حمام، یا لبِ شارع ...ئبانِ اوقاف ہی سے تعمیر ہوئے۔ بعض لوگوں نے ایسے مرکزوں کا انتظام کر دیا ...ہاں سے غریبوں کو روٹی مفت ملتی تھی۔ یتیم لڑکیوں کے لیے سامانِ جہیز مہیا کرنے ...ن غرض سے بھی اوقاف قائم ہوئے۔ ان کے علاوہ اوقاف کے مقاصد یہ تھے، قیدیوں ...دیوالیہ تاجروں کے قرضے ادا کرنا، بوڑھوں کے لیے لباس مہیا کرنا، دیہاتیوں کے ...اجباتِ مالی ادا کرنے میں ہاتھ بٹانا، تجارتی گلڈ قائم کرنا، منڈیوں کے لیے زمین مہیا ...رنا، سمندروں کے کنارے پر روشنی کے مینار بنانا، یتیموں، بیواؤں اور محتاجوں کی ...ست گیری کرنا، سکولوں میں تعلیم پانے والے غریب بچوں کی ضرورتوں کا خیال رکھنا ...وارث مردوں کے کفن دفن کا انتظام کرنا، غریب خاندانوں کے لیے تعطیل کے موقع ...تحفے مہیا کرنا، بچوں کے لیے کھیل کے میدان مہیا کرنا، پرندوں کے لیے چاول کا ...نتظام کرنا، آبی جانوروں کے لیے غذا بہم پہنچانا۔ بعض اوقاف صرف فوج اور بحریات کی امداد کے لیے قائم کیے گئے تھے۔

یہ اوقاف ہی کی برکت تھی کہ ترکی میں بہت سی یادگاریں بن گئیں اور بہت سے تعلیمی ادارے قائم ہو گئے۔ ترکی میں ہر شخص کی یہ کوشش ہوتی تھی کہ کوئی نہ کوئی چیز وقف کے طور پر چھوڑ جائے خواہ کوئی دولت مند ہو یا غریب۔ دولت مندوں یا اعلیٰ سرکاری منصب پانے والوں کے نزدیک یہ ایک اہم مجلسی فرض تھا کہ اپنے شہر میں ایک مسجد تعمیر کریں اُس کے ساتھ ایک درس گاہ قائم کریں یا وقف کے طور پر کوئی جائیداد شہر کے لیے چھوڑ جائیں۔ غریب آدمی بھی اس سلسلے میں اپنی بساط کے مطابق ادائے فرض کے لیے کوشاں رہتے تھے۔ وہ لوگ مسجدوں کی تعمیر کے خرچ کا بار تو نہیں اُٹھا سکتے تھے لیکن اتنا ضرور کر دیتے تھے کہ کسی مسجد میں حدیث کی تعلیم کا بندوبست کر کے اُس کے لیے کوئی چیز چھوڑ جاتے۔ ایک مرتبہ ایک بیوہ عورت نے پانی نکالنے کا نیا ڈول اور رسا مہیا کرنے کے لیے وقف کا بندوبست کر دیا۔ ایک اور خاتون نے تھوڑی سی جائداد وقف کر دی تاکہ اُن لُولے لنگڑے پرندوں کی حفاظت کی جائے جو اپنی ٹانگیں توڑ لیتے ہیں۔ یہ اوقاف مستقل طور پر قائم کیے گئے تھے اور وقف کرنے والوں نے اُن کے انتظام کا بندوبست کر دیا تھا۔ محکمہ امورِ مذہبی سب کا نگران تھا۔

جب پے در پے جنگیں شروع ہو گئیں اور ترکوں کے ہاتھ سے علاقے نکلنے لگے تو اوقاف کی آمدنی بھی گھٹ گئی۔ ایسے حالات میں اوقاف کی دیکھ بھال ٹھیک ٹھیک ممکن نہ رہی۔ اس وجہ سے بعض مسجدوں یا دوسری یادگاری عمارتوں کی مرمت نہ ہو سکی۔ ترکی جمہوری حکومت نے یہ تسلیم کر لیا ہے کہ اوقاف ملک کی قومی دولت کا نہایت اہم حصہ ہیں لہٰذا اُن کے نظم و نسق پر خاص توجہ مبذول کی جا رہی ہے۔ ایک بینک صرف اسی غرض سے قائم کیا جا رہا ہے جس میں اوقاف کی آمدنی جمع ہو اور اُسے تاریخی مسجدوں یا دوسری عالیشان عمارتوں کی نگرانی یا دیکھ بھال کے لیے صرف کیا جائے

اوقاف کے ماتحت انجینیروں اور فن کاروں کا ایک عملہ مقرر کر دیا گیا ہے جو تاریخی قومی
[ں] کو غیر مناسب ماحول سے نجات دلا کر سابقہ عظمت و شان کی بحالی کے لیے کوشاں
۔ دولت مند آدمی آج کل زیادہ تر اوقاف درسگاہوں خیراتی اداروں یا نشانِ احمر
[ریڈ] کراس) کے لیے قائم کر رہے ہیں۔

[ترکی] علاقوں کی [موجودہ] کیفیت

پچاس سال پیشتر تک ترکی علاقوں میں مذہبی تعلیم کا وہی طریقہ رائج تھا جس پر صدیوں سے عمل چلا آ رہا ہے۔ بہت سے شہروں میں صوفیوں کے تکیے تھے اور ہر مقام پر مدرسے قائم تھے،
[جن م]یں صرف مذہبی تعلیم دی جاتی تھی۔ ان مدرسوں میں وہی نمونہ پیشِ نظر تھا جس میں زمانۂ قدیم
[سے] کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی، یعنی مختلف چیزیں حفظ کر لینے پر زور دیا جاتا تھا اور انھیں
[دہرا]نے کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ ان مدرسوں میں جو معلم ملازم تھے، وہی تھے جنھیں مختلف
[س]ندیں دے دیتے تھے۔ بہترین معلم وہ سمجھے جاتے تھے جو استنبول، بغداد یا
[قاہر]ہ کی یونیورسٹیوں میں تعلیم پا آتے تھے موجودہ صدی کے آغاز پر سلطنتِ عثمانیہ میں
[ا]ن ترک علاقوں میں جو روس کے ماتحت چلے گئے تھے، تحریکِ اصلاح جاری ہوئی،
[لیکن] افسوس کہ پے درپے جنگوں ترکی کی شکستوں اور روس میں کیمونزم کے ظہور کے
[باع]ث یہ اصلاحات بروئے کار نہ آ سکیں۔

[ترکی] سلطنتِ عثمانیہ کی شکست اور تباہی کے بعد مصطفیٰ کمال اتاترک کے زیرِ قیادت
ترکی میں جمہوری حکومت قائم ہوئی۔ اتاترک نے ترکوں کی قومی فوج کے سالار
[کی ح]یثیت میں حملہ آور یونانیوں کو بُری طرح شکست دے کر پسپا کر دیا تھا نیا دستور
[غیر] مذہبی بنیادوں پر قائم ہوا۔ سلسلہ ہائے تصوف اور تکیوں کو نئی حکومت نے منسوخ
[کر] دیا۔ بہت سے سلسلے ایسے تھے جو سلجوقی اور عثمانی سلطنت کے دورِ عروج میں نہایت
[اہ]م کارنامے انجام دے چکے تھے، اُن کی وجہ سے ترکی سرزمین میں ایک ہزار سال تک

علوم و فنون اور ادبیات کو تقویت پہنچی تھی اور وہ پڑھے لکھے آدمیوں کی مذہبی ضرورتیں پوری کرتے رہے تھے، لیکن اُن کی روح مر چکی تھی، اور وہ بگڑ کر صرف ناکارہ آدمیوں کے ہاتھ میں تھے، مذہبی سلسلے اپنے شاندار ماضی کو ختم کر کے محض بے جان پیکر رہ گئے تھے انھیں ختم کر دینا ہی مناسب تھا۔

لیکن یہ فرض کر لینا سراسر غلط اور بے بنیاد ہے کہ ان سلسلوں کی بندش کے باعث ترکی میں اسلام کے ساتھ عشق و شیفتگی معرضِ زوال میں آگئی۔ اُن عقائد کی جگہ جو سراسر اوہام پر مبنی تھے اور بے معنی تعصب کے سوا اُن میں کوئی چیز نہ تھی، ترکی کے باشندوں میں مخلصانہ اور حقیقی اسلامی ایمان کا احیا ہو رہا ہے۔ قریباً ہر مسجد میں قرآنِ مجید کا درس دیا جاتا ہے، تمام ابتدائی اور ثانوی سکولوں میں اسلام کی تعلیم دی جاتی ہے اماموں اور خطیبوں کی تربیت کے لیے خاص درس گاہیں مقرر کر دی گئیں ہیں۔ انقرہ کی [illegible] میں مذہبی تعلیم کا سلسلہ جاری ہے۔ ناظمِ امورِ مذہبی کے علاوہ عام پبلشر اسلام [illegible] متعلق کتابیں شائع کر رہے ہیں۔ حال ہی میں قرآنِ مجید کی تین تفسیریں چھپی ہیں۔ ایک تفسیر نو جلدوں میں شائع ہوئی ہے۔ مختلف سورتوں کی تفسیریں اور احادیث کی شرحیں منظرِ عام پر آ چکی ہیں۔ متعدد ماہانہ اور ہفتہ وار رسائل جاری ہیں، جن میں اسلامی عقائد و اعمال کے متعلق مضامین لکھے جاتے ہیں جو لوگ یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ اسلام کے متعلق پہلی سی حمیت نہیں رہی یا ترک مذہب سے اور خدا سے بیگانہ ہو سکتے ہیں انھیں چاہیے کہ ترکی آئیں اور دیکھیں کہ مسجدیں کس طرح نمازیوں سے معمور ہیں۔ نئی مسجدیں بن رہی ہیں اور یہ چیزیں اسلام کے ساتھ ترکوں کی محبت و شیفتگی کی روشن شہادتیں ہیں۔

جزیرہ نمائے بلقان جزیرہ نمائے بلقان میں اتنے مختلف مذہب مختلف قومیں مختلف زبانیں اور مختلف ثقافتیں موجود ہیں کہ یہ خطہ دنیا کا سب سے پریشان کن خطہ بن گیا ہے۔ وہاں اسلام پہلے پہل عربوں کے ذریعے سے

چا تھا۔ اس وقت تک سلطنتِ عثمانیہ قائم ہی نہ ہوئی تھی پھر بلغاریا، رومانیا، یوگوسلافیا، ان، البانیا پانسو سال سے زیادہ عرصے تک سلطنتِ عثمانیہ کے اجزار رہے۔

بلغاریا ۱۲۹۴ھ (۱۸۷۸ء) میں داخلی طور پر آزاد ریاست بنا تھا۔ ۱۳۲۶ھ (۱۹۰۸ء) میں اس نے ایک مستقل حکومت کی حیثیت حاصل کر لی لیکن آزاد ہو جانے کے بعد بھی اسلامی معاملات کی دیکھ بھال کے لیے ایک مفتی ترکی کی طرف سے مقرر ہوتا تھا اور بلغاروی مسلمانوں کی ایک تنظیم اس مفتی کو مدد دیتی تھی، بڑے بڑے شہروں میں جداگانہ مفتی تھے اور کونسلیں بنی ہوئی تھیں ان کے ہاتھ میں مذہبی تعلیم کا انتظام تھا۔ یہ لوگ مذہبی تعلیم کے لیے سرمایہ فراہم کرتے تھے اور اس غرض سے مختلف سکولوں اور مدرسوں میں ترکی معلّم ملازم رکھے گئے تھے۔ اسی طرح وہ لوگ مفتیوں، اماموں اور خطیبوں کی تربیت کا بھی انتظام خود کرتے تھے۔ اس طرح علوم و السنہ، ادب و فنون کی تعلیم جاری تھی۔ انھیں درس گاہوں میں اعلیٰ تعلیم پائے ہوئے لوگ تھے جنھوں نے کمیونسٹوں کی مخالفت میں جدوجہد کی اس لیے کمیونسٹوں نے پہنچتے ہی تمام سکول بند کر دیے اور ایسے مفتی مقرر کیے جو اُن کے زیرِ اثر تھے۔ بہت سے مسلم مجبور ہو کر ترکِ وطن کر گئے اور انھوں نے بلغاریا سے بھاگ کر اپنی جانیں بچائیں۔ تاہم آج بھی بلغاریا کے اندر آٹھ لاکھ سے زیادہ ترک موجود ہیں جو کمیونسٹیوں کے زیرِ اقتدار زندگیاں گزار رہے ہیں۔

رومانیا میں بھی بلغاریا ہی کی طرح مسلمان موجود تھے، لیکن اُن میں سے صرف پچاس ہزار باقی رہ گئے ہیں جو نقلِ وطن کر کے ترکی نہیں آئے۔ ان کے علاوہ ایک لاکھ بیس ہزار مسیحی ترک بھی رومانیا میں کمیونسٹوں کے زیرِ اقتدار موجود ہیں۔

یوگوسلافیا میں بیس لاکھ سے کم مسلمان نہ ہوں گے۔ اُن کی حالت بلغاریا کے مسلمانوں سے زیادہ بہتر نہیں، تاہم انھیں اپنے مدرسے جاری رکھنے کی اجازت حاصل ہے۔

جو کمیونسٹوں کے مدرسوں سے فروتر نہیں، اگرچہ یوگوسلافیا کمیونسٹوں کی قومی دولت
اور وہاں ان کی درس گاہوں کے لیے زیادہ سے زیادہ سازگار مواقع موجود ہیں۔

البانیا ۱۳۲۹ھ (۱۹۱۱ء) سے آزاد چلا آتا ہے، لیکن اس چھوٹے سے
علاقے میں مسلسل بغاوتیں اور خانہ جنگیاں جاری رہیں۔ وہاں کے باشندے اُن
کی اولاد ہیں جو چار سو سال پیشتر اناطولیہ سے اُٹھ کر یہاں آباد ہو گئے تھے، پورے
کی آبادی دس لاکھ ہو گی، ان میں سے قریباً سات لاکھ مسلمان ہیں جو ایک سخت گیر کمیونسٹ
نظام کے ماتحت رہتے ہیں، اُن کے مدرسے اور تکیے بند کر دیے گئے ہیں اور
عقائد کا اظہار ممنوع قرار دے دیا گیا ہے۔

یونان میں اسّی ہزار مسلمان ترک ہیں جن پر نہایت منظم اور شیطانی ظلم ہو رہا
کریٹ یا جزائرِ بحیرۂ ایجہ یا مغربی تھریس کے سوا یونان کے دوسرے حصوں میں جو
آباد تھے اُنھیں جبراً نکال دیا گیا یا تباہ کر دیا گیا ہے۔ مغربی تھریس میں اب تک
مدرسے موجود ہیں تاہم اُن میں ایسے معلم رکھے جاتے ہیں جو کچھ تعلیم نہیں دے سکتے
ترکی سے اچھے پڑھے لکھے معلم منگوانے کی اجازت نہیں۔ اس کے برعکس ترکی میں
سکولوں کو پوری آزادی حاصل ہے کہ وہ اپنے بچوں کے لیے یونان سے استاد منگ
یونان میں بڑی سرگرمی سے کوششیں جاری ہیں کہ مسلمانوں کا درجۂ تعلیم محدود رہے
آزادانہ تجارتی مواقع سے فائدہ نہ اُٹھا سکیں۔ جس حد تک اہلِ اقتدار کے امکان
ہو ترکی کے مسلمانوں سے تعلقات قائم کرنے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ یونان میں مسلما
پر اتنا ظلم و جور ہو رہا ہے کہ اُس کی کوئی مثال دنیا میں نہیں ملتی، البتہ سویٹ روس کو مستثن
رکھنا چاہیے۔

قبرص

قبرص پر مسلمانوں نے پہلے پہل ۲۶ھ (۶۴۸ء) میں قبضہ کیا تھا۔ کچھ مدت
کے بعد اس جزیرے پر متعدد بادشاہ حکمران رہے، لیکن یونانیوں کے قبضے میں

...بھی بندرہا۔ سلطان سلیم ثانی نے ۹۷۸ھ (۱۵۷۰ء) میں اس جزیرے کو فتح کر لیا
...تھا اور ۱۲۹۵ھ (۱۸۷۸ء) تک یہ سلطنتِ عثمانیہ کا جزو رہا۔ یہاں تک کہ اسے روس
...کے خلاف برطانوی اعانت حاصل کرنے کے معاوضے میں انگلستان کے حوالے
...کر دیا گیا۔ اس وقت جزیرے کی آبادی ایک لاکھ دس ہزار تھی اور آج پانچ لاکھ کے
...قریب بھگ ہے، جس میں سے ایک لاکھ مسلمان ترک ہیں، جب وہاں برطانوی اقتدار پہنچا
...بہت سے قبرصی باشندے ترکی چلے آئے اور آج ان قبرصیوں کی اولاد تین لاکھ کے
...قریب ہے۔ اس دوران میں یونانیوں کی بہت بڑی تعداد نقل وطن کر کے قبرص چلی گئی
...اور یونان اس جزیرے کے الحاق کا مطالبہ کر رہا ہے، حالانکہ یہ ترکی کی سرحد سے
...صرف چالیس میل کے فاصلے پر ہے اور ترکی دفاع کے لیے اسے انتہائی اہمیت
...حاصل ہے۔ قبرص کے مسلمان بھی ایک مفتی کے تابع ہیں، جس کا انتخاب ہوتا رہتا ہے
...مذہبی اور عام سکولوں میں مذہبی تعلیم دی جاتی ہے۔ کتابیں اور رسالے بھی شائع ہوتے
...رہتے ہیں۔ قبرص کے مسلمان آزادانہ ترکی آتے جاتے ہیں۔

روس سویٹ رُوس میں اسلام کی داستان بیان کرتے وقت نرم سے نرم الفاظ میں کہا جا
سکتا ہے کہ یہ بڑی ہی المناک ہے۔ زار دوں کی حکومت کے ماتحت بھی فضا
...بڑی ہی خراب تھی۔ کمیونزم کے ماتحت عام حالات بدتر ہو گئے، اس لیے کہ روسی
...کمیونسٹ ہوں یا غیر کمیونسٹ اسلام کو وہ ہمیشہ نفرت کی نگاہ سے دیکھتے رہے، کمیونسٹوں
...کو علم ہے کہ اسلام کمیونزم کے پھیلنے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے اور وہ اپنے
...دائرۂ حکومت میں مسلمانوں کے خلاف تمام خوفناک تدبیریں اختیار کر رہے ہیں جو انسانی
...دماغ سوچ سکتا ہے۔

موجودہ صورتِ حال کو سمجھنے کے لیے پہلے یہ خیال ترک کر دینا چاہیے کہ روس
کی سویٹ یونین واقعی کوئی متحدہ قوم ہے۔ برطانیہ اور فرانس کی طرح روس بھی

صدیوں سے ایک سامراجی اور استعماری طاقت چلا آتا ہے، برطانیہ اور فرانس ــــ ہالینڈ کو بھی شامل سمجھنا چاہیے ــــــ زیادہ تر اقتصادی وجوہ سے استعمار کے حامی بنے، لیکن رُوس اس لیے علاقوں کا خواہاں تھا کہ فتح و تسخیر کی حرص کے لیے تسکین کا سامان بہم پہنچے اور وہ دنیا بھر کو زیر اقتدار لے آئے۔ یورپی ملکوں نے سمندر پار نو آبادیاں قائم کر لیں۔ رُوس نے ہمسایہ ملکوں پر قبضہ جمانا شروع کیا جس طرح برطانیہ، فرانس اور ہالینڈ کی ریاستوں میں رہنے والے لوگوں کے لیے حکمران اجنبی ہیں۔ اسی طرح روس جن علاقوں پر قابض ہوا، اُن کے باشندوں کے لیے روسی اجنبی ہیں۔ یورپی ملک تو نو آبادیوں کو آزادی دیتے چلے جا رہے ہیں۔ لیکن روس اپنی گرفت مضبوط کرتا چلا جا رہا ہے اور اُس کا دائرۂ حکومت پھیل رہا ہے۔

سویٹ یونین میں اسلام کی کہانی کا خلاصہ یہ ہے کہ روسی ظلم و جور کے خلاف چار سو سال سے جد و جہد چلی آتی ہے، جس طرح ظلم بے پناہ رہا اُسی طرح مزاحمت بھی کسی نوع کا جھکاؤ قبول نہ کر سکی خوفناک آئی وان کے عہدِ حکومت سے ملکہ کیتھرائن کی مسند نشینی تک مسلمانوں کو جبراً روسی بنا دینے کا پروگرام جاری رہا، ان کی مسجدیں اور مدرسے بند کر دیے گئے۔ مسلمان گھروں کے دروازے بند کر کے خلوت میں نماز پڑھ لیتے اور خُفیہ خُفیہ اموات کے سلسلے میں اسلامی رسمیں ادا کر لیتے۔ اُن کے معلم بخارا، استنبول اور قاہرہ کی درس گاہوں میں تعلیم پاتے اور وطن واپس آ کر خُفیہ خُفیہ اپنے ہم مذہبوں کو اسلام کی تعلیم دیتے۔ ملکہ کیتھرائن نے کچھ مسجدوں اور مدرسوں کی اجازت دے دی اور ایک مذہبی ٹریبونل بنا دیا جس کا رئیس روسی حکومت کا آلۂ کار ہوتا۔ وہ اسلامی علوم و اعمال سے قطعاً بے بہرہ ہوتا۔ ان حالات میں مسلمانوں کو تھوڑی سی سہولت ملی اور مسجدوں، نیز مدرسوں کی تعداد میں اضافہ ہو گیا تاہم تُرکی زبان اور ادب کی سخت ممانعت تھی۔ وہ کتابیں اور رسالے ملک میں

آ سکتے تھے جن میں ترکی رعایا کے متعلق معلومات درج ہوتیں۔ انقلابِ روس سے
سال پیشتر مسلمانوں کے متعلق رویّہ خاصا روادارانہ ہوگیا تھا۔ ان حالات سے فائدہ
مسلمانوں نے حکومت سے ایک فرمان حاصل کیا جس کے مطابق اُنھیں ابتدائی
سے کھولنے کی اجازت مل گئی۔ ان میں مذہبی تعلیم دی جاتی تھی، نیز ترکی زبان، ادب،
ریخ پڑھائی جاسکتی تھی۔ اُوفا، قازان، اورنبرگ اور ٹرؤسکی میں اعلیٰ تعلیم کے
مشہور مدرسے قائم ہوئے۔ کریمیا، قازان، تاشقند اور باکو میں نشر و اشاعت
مرکز بھی بن گئے۔

یہ اجازت بھی مل گئی کہ استنبول سے کتابیں، رسالے اور اخبار منگوا لیے جائیں
ن کے بدلے میں اپنے یہاں کی مطبوعات بھیج دی جائیں۔ تعلیم یافتہ آدمیوں کو
ت مل گئی کہ روس اور استنبول کے اسلامی مراکز میں آزادانہ آجا سکیں۔ ان حالات
روسی مسلمانوں میں قومی اور مذہبی بیداری پیدا کر دی۔ روس میں رہنے والے
کچھ مدت سے تجارت و صنعت و حرفت میں حصّہ لینے لگے تھے اب وہ علوم و فنون
دائروں میں بھی اتر آئے۔ اُنھوں نے ایسے تھیٹر بھی قائم کر لیے جن میں ترکی مصنفوں
ڈرامے پیش کیے جاتے تھے۔ پرانا طریقۂ تعلیم بدل دیا گیا اور رُوس میں جتنی بھی
ف ترکی بولیاں تھیں جنھیں استنبول کی زبان سے قریب تر لانے کی کوششیں
رع ہوگئیں، اس لیے کہ استنبول کی زبان الفاظ، تراکیب اور لب و لہجہ کے
بار سے معیاری حیثیت رکھتی تھی۔ مسلم تاجروں اور بڑے بڑے مالکانِ اراضی
ہ چندے دے کر نئے مدرسے قائم کیے اور نئی مسجدیں بنا دیں، یہاں تک
لک میں کل مسجدوں کی تعداد چالیس ہزار تک پہنچ گئی۔ بلاشبہ روسیوں کو یہ ترقیاں
تی نہ تھیں۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ مسلمانوں میں اتحاد و یگانگی پیدا ہو چکی ہے۔ اسی
لے میں پہلی جنگِ عظیم شروع ہوگئی اور مسلمانوں کی آزار رسانی سے اس لیے

دست کش ہونا پڑا کہ انھیں فوج میں بھرتی کرنا منظور تھا۔

جب کمیونسٹوں کو روس میں اقتدار حاصل ہوگیا تو وہ اُن سرزمینوں پر چڑھ دوڑے جہاں مسلمان ترک رہتے تھے۔ بعض علاقے خود مختاری کا اعلان کر چکے تھے، وہاں مسلمانوں نے کمیونسٹوں کے تصرف کی مخالفت میں کوشش کا کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھا لیکن انجام کار مسخر ہو گئے۔ کمیونسٹوں نے ترکی زبان کی تعلیم کا سلسلہ ختم کر دیا اور درس گاہوں کا انتظام سنبھال لیا۔ آج کل صرف ایک مذہبی درس گاہ باقی ہے اور وہ بخارا میں ہے۔ یہاں پورے سویٹ یونین سے صرف اسّی طالب علم تعلیم پانے آتے ہیں۔ جن مذہبی رہنماؤں کو روس بھیجا گیا یا گولی سے اُڑا دیا گیا اُن کی تعداد اسّی ہزار سے اوپر ہے۔ اب وہاں صرف درجن مسجدیں رہ گئی ہیں اور اُن سے بھاری ٹیکس وصول کیا جاتا ہے، مذہب کے مسلمانوں کو راشن کارڈ نہیں دیے جاتے۔ یہ معلوم کرنا غیر ممکن ہے کہ سویٹ یونین میں مسلمانوں کی کل تعداد کتنی ہے۔ اندازہ یہ ہے کہ وہ دو کروڑ اور پانچ کروڑ کے درمیان ہو گے۔ وسطی ایشیا سے پنتالیس لاکھ کے قریب مسلمان بھاگ آئے اور وہ آج کل ہمسایہ ممالک میں رہتے ہیں۔ کچھ معلوم نہیں کہ کتنے مسلمانوں کو سائبیریا جلاوطن کیا گیا۔ آہنی پردے کے پیچھے اسلام کی حالت انتہائی پریشان رہی ہے اور یہ صورتِ حال غالباً ہسپانیہ میں اُس وقت پیدا ہوئی تھی جب ایک محکمہ بظاہر استیصالِ الحاد کے لیے قائم کیا گیا تھا لیکن حقیقت میں وہ تعذیب کا ایک شکنجہ تھا جس میں بے بس مسلمانوں کو بے دردی سے کسا جاتا تھا۔

ایران، عراق اور افغانستان

عراق میں قریباً دس لاکھ ترک ہیں یہ زیادہ تر شمالی و مغربی علاقوں اور بغداد میں رہتے ہیں، ان میں سے بیشتر سُنّی ہیں اور حنفی فقہ کے پابند ہیں تھوڑے سے شیعہ بھی ہیں۔

ایران میں ترکوں کی آبادی ساٹھ لاکھ ہے ان میں ایرانی آذربائیجان کے وہ لوگ بھی شامل ہیں جو ترکی بولی بولتے ہیں۔ ان میں سُنّی بھی ہیں شیعہ بھی ——— سنیوں کی اکثریت

ی فقہ کی پابند ہے۔

افغانستان صدیوں تک ایشیا کے مختلف حصوں کی طرف جانے والے راستوں کا
رہا۔ اس کی آبادی افغانوں، ایرانیوں، ترکوں، منگولوں، تاتاریوں اور ہندوستانیوں
ل ہے۔ یہ لوگ آپس میں شادیاں کرتے رہے اور اب ایک قوم بن گئے ہیں۔ یہ آزاد
اور اسلام سے انھیں گہری وابستگی ہے۔ ملک کی آبادی عام طور پر سُنّی ہے اور وہ حنفی
ی پابند ہے۔ تھوڑے سے شیعہ بھی ہیں پرانے زمانے کے دینی مدرسے اور صوفیوں کے
ے اب تک قائم ہیں لیکن نئے نمونے کی درس گاہیں بھی کھل رہی ہیں اور افغانستان ترقی
ے نئے دور کی طرف بڑھتا چلا جا رہا ہے۔

ین اور سنکیانگ

اندازہ کیا گیا ہے کہ چینی مسلمانوں میں ترکی النسل لوگوں کی تعداد
دس لاکھ سے اوپر ہے لیکن صحیح اور قطعی معلومات حاصل کرنا
ن نہیں۔ سنکیانگ کی مسلمان ترک آبادی کے متعلق عام اندازہ تیس لاکھ سے
ں لاکھ تک ہے۔ وہ سب سُنّی ہیں اور ترکی کے ساتھ اُن کا تعلق برابر قائم رہا ہے اُن
ے اہم مدرسے کاشغر، ختن اور طرفان میں ہیں۔ سنکیانگ میں صوفیوں کے تکیوں کو بھی بہت
یت حاصل رہی۔ آج کل اُن پر دیسی ہی پابندی عائد کر دی گئی ہے جن سے سوویٹ روس
ے مسلمانوں کو سابقہ پڑا اور اُن کی افسوس ناک حالت کے متعلق اطلاعات اُن لوگوں سے
ں رہی ہیں جو پناہ گیروں کی حیثیت میں پاکستان پہنچے۔

سلامی ثقافت آج کیوں پس ماندہ ہے؟

مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ اسلام ایسا مذہب ہے جو معیار و مقاصد
کے لحاظ سے بہترین ہے۔ اُس نے اپنے پیروؤں کو
اعلیٰ اخلاقی اصول دیے اور ایسی روحانی زندگی کے بسر
رنے کا سروسامان بہم پہنچایا جو اس دنیا میں اور آئندہ دنیا میں امن و راحت کا ضامن ہے
شخص اسلام کی تاریخ کا مطالعہ کر چکا ہے، جانتا ہے کہ قرونِ وسطیٰ میں اسلامی تہذیب

کا دور اور دورِ درخشاں تھا جب علوم و فنون فروغ پر تھے اور مذہب نے اسلامی دنیا میں روح پیدا کر رکھی تھی لیکن جس شخص کو آج اسلام سے پہلی مرتبہ تعارف کا موقع ملے وہ یہ کہے گا کہ اسلامی ثقافت آج کیوں پس ماندہ ہے اور یہ سوال کرنے میں وہ حق بجانب پاکستان کے شہرۂ آفاق، فلسفی اور محبِ وطن شاعر اقبالؒ نے اس کا عام جواب دیتے ہوئے کہا تھا، اس میں اسلام کا کوئی قصور نہیں صرف مسلمانوں کے طریقِ عمل کا قصور ہے میں کوئی شبہ نہیں کہ اسلام زوال و انحطاط کا ذمہ دار نہیں ہو سکتا۔ معلوم ہے مسلمانوں ماتحت ثقافت نے فروغ بھی پایا اور یہ زوال پذیر بھی ہوئی اور یہ حقیقت ہے کہ آج مسلمان قومیں پس ماندہ ہیں، اربابِ فکر و نظر کو اس حقیقت کا اعتراف ہے اور وہ اصلاح کے لیئے کوشاں ہیں۔ اس پس ماندگی کے اسباب متعدد ہیں، جن میں سے بعض کا تعلق مسلمانوں سے ہے بعض اسلامی دنیا کے اقتصادی، سیاسی اور تاریخی حالات سے تعلق رکھتے ہیں"۔

پس ماندگی کا سب سے پہلا سبب یہ ہے کہ مسلمانوں نے اسلام کے احکام اور اصول و ضوابط کو پسِ پشت ڈال دیا اور اُن کی نافرمانی شروع کر دی اسلام مختلف ممالک میں پھیلا تو جو لوگ ابتدا میں اس کے پیرو بنے تھے وہ عموماً اس کی تعلیمات اور عملی احکام پوری طرح سمجھتے تھے۔ دوسرے لوگ جنھوں نے اسلام قبول کیا دراصل پورے مسلمان نہ تھے اور اُنھوں نے اپنے عقیدے اس میں شامل کر لیے جو سچائی اور صداقت سے بالکل دور تھے بدقسمتی سے چھوٹے چھوٹے فرقے اور گروہ پیدا ہوتے گئے جو اسلامیت کے دعویدار تھے، لیکن حقیقت میں اُنھیں اسلام سے کوئی ربط نہ تھا ان میں سے بعض اب بھی موجود ہیں تمام اسباب نے مل کر مُسلم ثقافت کے زوال کو تیز کر دیا۔

مغربی تہذیب اسلامی دنیا میں اُن متکبر تاجروں کے ذریعے سے متعارف ہوئی جن کی پشتبانی کے لیے استعماری طاقتیں موجود تھیں اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سرزمینِ مشرق کے لوگ

بٹ کر اپنی دنیا میں بیٹھ گئے پارسا مسلمانوں کا نیا عقیدہ یہ ہے کہ ہر شخص صنعت کار
کے مہیا کردہ سامانِ راحت و آسائش سے محروم رہ کر بھی بلند مرتبہ انسان ہو سکتا ہے
یہ خوب کہا تھا کہ "مغربی تہذیب ایک ایسا دائرہ ہے جس کا قطر برابر پھیلتا جاتا ہے لیکن
گہرائی یا بلندی ہے ہی نہیں"۔ ایک سچے مسلمان کے نزدیک حقیقی دولت مادی دولت
بلکہ روحانی اور اخلاقی اقدار کی دولت ہے۔ مغربی تہذیب میں بھی روحانی اقدار ہیں
صرف اہلِ وطن کے لیے ہیں، برآمد ہونے والی جنس نہیں۔ مغربی دنیا نے مادی سامان
نیانہ برتاؤ برآمد کیا اور چند ایثار دوست مسیحی پادریوں کا طرزِ عمل وحشیانہ برتاؤ کی تیزی
کر سکتا تھا۔

جب راس اُمید کا راستہ دریافت ہو چکا تو اسلامی دنیا کے ہاتھ سے تجارت کے پُرانے
چھن گئے یہ ایک بہت بڑی ضرب تھی اس سے پیشتر سرزمینِ مشرق کا پورا تجارتی
قافلوں کے ذریعے سے آتا جاتا تھا، اور راستے کی تمام آبادیوں کے لیے کچھ نہ کچھ
کا موقع مل جاتا تھا۔ یہ خوش حالی پیدا کرنے والی تجارتی سرگرمیاں اتنا سرمایہ فراہم
تھیں کہ مختلف درس گاہوں اور مسجدوں کے لیے اوقاف کا بندوبست ہو جاتا تھا
یہ تجارت ختم ہوئی شہر، دیہات بن گئے یا بالکل ناپید ہو گئے، درس گاہیں بند ہو گئیں،
اور فن کار امداد سے محروم رہ گئے۔ اس سے تھوڑی دیر بعد اہلِ یورپ نے تمام سمندروں
کر لیا اور وہ اقتصادی زندگی میں مالکی و مختاری کے درجے پر پہنچ گئے۔ یہ حیثیت
دردوسری جنگِ عظیم کے بعد ختم ہونی شروع ہوئی۔

استعمار کے ظہور نے سادہ لوح اور تساہل دوست مشرق کو اپنے پھندے میں جکڑا
جب مشرق کی آنکھ کھلی تو معلوم ہوا کہ حملہ آور کی گرفت بُری طرح مستحکم ہو چکی ہے۔ مغربی
اِن کے خلاف جدوجہد کے علاوہ کمیونزم سے بھی کشمکش کی نوبت آ گئی جو ہمارے
نے کی پیداوار ہے۔ اس جدوجہد میں ترکوں نے پیش قدمی کی۔ استعمار اور سامراج کے

خلاف شدید جنگ لڑی اور حملہ آور دل کا جوا سب سے پہلے اتار کر پھینک دیا اسلامی دنیا کے سامنے ایک قابلِ تقلید مثال پیش کی۔ مغربی اخباروں میں اسلام اور ترکی کے خلاف جس عداوت کا اظہار کیا جاتا ہے، اس کا ایک سبب یہ بھی ہے۔ یہ حقیقت ہے، اگرچہ تعجب انگیز معلوم ہو کہ مغربی استعمار کے ماتحت اسلام برقرار رہا، اس لیے کہ استعماری طاقتوں نے امن و نظم قائم کر دیا تھا، نسلی اور قبائلی کشمکش روک دی تھیں جو جاری رہتیں تو مشرق کی طاقت کا خون چوس جاتیں۔

مغرب میں صنعت کاری کا ظہور ہوا تو پورے مشرق نے اسے حقارت سے ٹھکرا دیا۔ مسلمان بھی اہلِ مشرق میں شامل تھے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ انھیں اہلِ مغرب سے ویسے ہی نفرت تھی، دوسری وجہ یہ تھی کہ انھیں اپنی صنعت کاری پر فخر و ناز تھا۔ انھی طور طریقوں سے وابستہ رہنا انھیں پسندیدہ معلوم ہوا۔ مسلمان اپنے طور طریقوں سے ایسی وابستگی پیدا کر چکے تھے کہ غیر مومنوں کی طرف سے جو چیز آتی اس سے بھاگتے۔ ابتدا میں یہ سب کچھ تعصّب کا نتیجہ نہ تھا، بلکہ اپنے فنون کے ساتھ وابستگی اور ان پر فخر کا نتیجہ تھا۔ ناواقف آدمیوں کے ہاتھوں میں اس چیز نے اور ہی صورت اختیار کر لی اور یہ خود ان کے لیے باعثِ مضرت بن گئی مثال کے طور پر چھاپہ اپنے آغاز سے قریباً ڈیڑھ سو سال تک ترکی میں نہ پہنچ سکا، اس لیے کہ وہ لوگ اس کے مخالف تھے جو فنِ کتابت کو محفوظ رکھنا چاہتے تھے اور انھیں اندیشہ تھا کہ چھاپہ رائج ہو گیا تو خوش نویسوں کے لیے کوئی کام باقی نہ رہے گا۔

پس ماندگی کا دوسرا سبب یہ تھا کہ مسلمانوں نے احیائے علوم سے غفلت برتی۔ مسلم علماء نے احیاءِ علوم کا فرض احسن طریق پر ادا کیا تھا۔ جب اسلامی تہذیب اوج کمال پر پہنچی ہوئی تھی ان علماء نے قدیم یونان کی تصانیف کا ترجمہ کیا، ان کی شرحیں لکھیں، ان پر بحثیں کیں اور مختلف صورتوں میں انھیں اپنا لیا۔ یورپ مدت مدید تک ان تصانیف

روش کیسے بیٹھار ہا یورپ میں احیار علوم کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ تعلیم کو پادریوں کے قبضے
آزاد کرالیا گیا اور اس چیز پر اُن کا اجارہ نہ رہا۔ دوسرے طبقوں نے تعلیم کا بیڑا اُٹھایا تو نئے
اندنئی تحقیقات کے راستے کُھل گئے اور یورپ کے لیے ترقی کے ایسے وسائل
ہو گئے جن سے مسلمان محروم رہے۔ یہ انتہائی افسوس کا مقام ہے کہ مسلمانوں نے
ر علوم کے اس پہلو کا صحیح اندازہ نہ کیا حقیقت یہ ہے کہ اگر مسلمان خلوص اور سچائی
ے ساتھ اپنے مذہب کے پابند رہتے تو اُنھیں احیار علوم کی کوئی ضرورت پیش
تی۔

ترکی میں مسلمانوں نے جدید علوم سے اس لیے غفلت برتی کہ اُنھیں اپنے شاندار
ی پر فخر تھا اور اُن کا حال بھی ماضی سے کم شاندار نہ تھا، نیز اُنھیں مغرب کی ہر چیز سے
رت تھی اور یہ نفرت اُس زمانے سے اُن کے دلوں میں بیٹھی ہوئی تھی جب صلیبی جنگوں
ے جا بجا تباہی و بربادی پھیلائی تھی۔ جدید علوم سے ترکوں کی نفرت کا ایک سبب یہ
ی تھا کہ علمار جہالت اور تعصّب میں مبتلا ہو گئے اور اُنھوں نے مسلمانوں کو پس ماندہ
لھا۔

وجُودہ صُورتِ حال آج اسلامی دنیا میں اور مغرب کے ساتھ اُس کے تعلقات
میں غیر مشتبہ طور پر تبدیلی آگئی ہے۔ زمانۂ ماضی میں بہت
سے مغربی اہل قلم اسلام کا مذاق اُڑاتے رہے اور اُسے کم حیثیت بتاتے رہے۔ آج مغربی
فضلار میں بہت سے منصف مزاج اور ذہنی اعتبار سے دیانت کیش فضلار موجود ہیں جو
تعصب یا پہلے سے قائم شُدہ تصورات سے آزاد ہو کر اسلام کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں۔
غرب کے تعلق میں مسلمانوں کی روش بھی بدل رہی ہے۔ اُن پر واضح ہو چکا ہے کہ وہ اہلِ مغرب
سے مختلف اُمور میں پیچھے ہیں اور اُنھیں بہت کچھ سیکھنے کی ضرورت ہے، خصوصاً فنی
دائروں میں۔ اس طرح مشرق و مغرب کے درمیان بہتر مفاہمت کے امکانات خاصے

اچھے نظر آتے ہیں۔

مسلمانوں کی روش اپنے متعلق اور اپنے مذہب کے متعلق بھی بدل رہی ہے گزشتہ پچاس سال سے نوجوان مسلمان مغرب کی یونیورسٹیوں میں تعلیم پاکر نئے علوم اور زندگی کے متعلق نئے تصورات لے کر واپس آرہے ہیں۔ اگرچہ بعض تشکک اور بدعقیدگی کے زہر سے متاثر ہو کر آتے ہیں اسلام کے ساتھ وابستگی کم ہو تو کسی دوسرے مذہب کے ساتھ وابستگی قطعاً ناممکن ہے لیکن اکثریت ایسے مذہب سے زیادہ گہری دلچسپی ساتھ لے کر آتی ہے۔ وہ لوگ اپنے مذہب کی طرف نمائشی پابندی پر مطمئن نہیں ہو سکتے بلکہ اس سے ایسی روحانی اور اخلاقی رہنمائی کے طلب گار ہیں جو دورِ حاضر کی تہذیب سے متضاد نہ ہو۔

موجودہ صدی کے آغاز تک ایک تعلیم یافتہ مسلمان کو مطلوب روحانی زندگی سلسلوں میں مل جاتی تھی لیکن یہ مذہبی سلسلے اور دوسرے مذہبی ادارے بھی بگڑ گئے صرف ظاہری پابندی تک۔ ان کا سلسلہ محدود ہو گیا اور یہ چیز تعلیم یافتہ طبقے کو مطمئن نہیں کر سکتی تھی۔ کچھ مدت کے لیے تعلیم یافتہ لوگوں کے تعلقات اسلام سے پہلے جیسے پختہ نہ رہے لیکن یہ حالت جلد ختم ہو گئی۔ اب ردِ عمل جاری ہو چکا ہے۔ اسلام کے متعلق حال میں اعلیٰ پائے کی کتابیں شائع ہوئی ہیں جن کے مخاطب تعلیم یافتہ لوگ ہیں یہ اس امر کی شہادت ہے کہ مذہب کو از سرِ نو فروغ پا رہی ہے۔ اعلیٰ مذہبی درس گاہوں میں تعلیم کی حیثیت بھی برابر بہتر ہو رہی ہے اور وہاں ایسے معلم موجود ہیں جو مشرق و مغرب دونوں جگہ تربیت حاصل کر چکے ہیں۔ یہ سب اس حقیقت کے ثبوت ہیں کہ آج ترکی میں اسلام تعلیم یافتہ لوگوں کی گہری وابستگی کا مرکز بن گیا ہے۔ عموماً کہا جاتا ہے کہ اسلام دقیانوسی لوگوں میں پھیلا، نہ کہ پڑھے لکھے لوگوں میں یہ درست ہے اور مسلمان مدت سے اس طریقے کو جانتے ہیں جس کے مطابق غیر تعلیم یافتہ لوگوں نے اسلام کو سمجھا اور ایمان سیکھا۔ آج اسلام کو تعلیم یافتہ لوگوں کے روبرو پیش کی

افریقہ ترکی اور دوسرے اسلامی ملکوں میں زیر تجویز ہے۔ ساتھ ہی بے خوف تردید یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ اسلام دنیا کے تمام تعلیم یافتہ لوگوں میں بھی برابر پھیلے گا۔

آٹھواں باب

اسلامی ثقافت پاکستان و ہند میں

(مولوی مظہر الدین صاحب صدیقی)

جنوبی ہند کے ساتھ عربوں کے تجارتی تعلقات ظہورِ اسلام سے بھی بہت پہلے ہو چکے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد سمندر کے راستے تجارتی مال لے جانے کے ساتھ تبلیغی سرگرمیاں شروع ہو گئیں۔ عرب پہلے پہل ملیبار کے ساحل آباد ہوئے۔ یہ ہجرت سے کوئی پچاس سال بعد کا واقعہ ہے یعنی ساتویں صدی عیسوی آخری دور میں۔ اس وقت جنوبی ہند میں مذہبی کشمکش بھی بپا تھیں اور سیاسی اعتبار سے بھی وہاں کے حالات میں استحکام و پائیداری نظر نہیں آتی تھی۔ اسلام نے اپنے عقائد بدیہی سادگی اور اصول و کلیات کی درخشانی کے باعث ہندوؤں کے دل پر زبردست اثر ڈالا۔ اور ابتدائی پچیس سال کے اندر بہت سے لوگ حلقہ بگوشِ اسلام ہو گئے ان میں ملیبار کا حکمران بھی شامل تھا۔

اگرچہ بحری تجارت بدستور جاری رہی لیکن ہندوستان میں اسلام زیادہ تر خشکی کے راستے یعنی ایران و وسطِ ایشیا سے پہنچا۔ بنو امیہ کے زمانے میں عربوں کو پہلی مرتبہ ہندوستان پر حملہ کرنا پڑا۔ اس لیے کہ سندھ کے راج میں وہ جہاز لوٹے گئے تھے جن پر مسلمان تاجروں کے بال بچے اور دربارِ خلافت کے لیے حاکم سیلون کے تحائف سوار تھے اور سندھ کے راجہ نے اس افسوس ناک واقعے کی تلافی سے صاف انکار کر دیا تھا۔

پاکستان و ہند میں اسلامی ثقافت کے ظہور و فروغ پر بحث کے سلسلے میں سہو

ہے کہ ہم ہندوستان کی تاریخ کو چار ادوار میں تقسیم کریں:

۱۔ مغلوں سے پیشتر کا دور۔

۲۔ مغلوں کی دو صد سالہ حکمرانی کا دور۔

۳۔ اسلامی حکومت کا شیرازہ بکھرنے کا دور۔

۴۔ گزشتہ ایک صدی کی مدت جس میں انگریزوں کی حکمرانی اور پاکستان کی تخلیق شامل ہیں۔

مغلوں سے پیشتر کا دور

(مسلمانوں کی آمد سے ۹۳۳ھ۔ ۱۵۲۶ء تک)

ہندوستان پر مسلمانوں کا پہلا حملہ جس کے وجوہ اختصار کے ساتھ اوپر بیان ہو چکے
ہیں خلیفہ ولید بن عبدالملک (۸۶ھ۔ ۹۶ھ، ۷۰۵ء۔ ۷۱۵ء) کے
ہوا جس نے محمد بن قاسم کو سندھ کی مہم پر بھیجا۔ اُس وقت پنجاب کا خاصا بڑا حصہ
میں شامل تھا۔ وہاں ایک برہمن خاندان کی حکومت تھی، لیکن عام لوگ بدھ مت
تھے۔ برہمن حکمرانوں نے بدھوں کے مذہبی، مجلسی اور اقتصادی حقوق پر سخت
ں لگا رکھی تھیں۔ اس کا ثبوت یوں ملتا ہے کہ محمد بن قاسم کی کامیابی کے بعد بدھوں
خواہش کی تھی، ہمیں مندروں میں معمول کے مطابق عبادت کی اجازت دے
یئے۔ محمد بن قاسم نے بدھوں، ہندوؤں اور تمام غیر مسلم طبقوں سے فراخ دلی
کیا۔ ہندو وزیر اور پولیس کے افسر بدستور سرکاری ملازم رہے، لیکن دربارِ خلافت
مد بن قاسم کو جلد واپس بلا لیا۔ اُس کے چلے جانے کے بعد ہندو جاگیرداروں نے
تِ خلافت کے خلاف بغاوت کر دی۔

پہلے عباسی خلیفہ نے ایک فوج اس غرض سے سندھ بھیجی کہ بنو امیہ کے زمانے

میں جو گورنر مقرر ہوا تھا اُسے باہر نکال دیا جائے۔ دوسرے عباسی خلیفہ کو پھر ایک مہم
پڑی۔ اسی مہم نے اُس چھاؤنی کی بنیاد رکھی جو تاریخ میں منصورہ کے نام سے مشہور
ہے۔ خلیفہ مامون الرشید عباسی (۱۹۸ھ۔ ۲۱۸ھ، ۸۱۳ء۔ ۸۳۳ء) کے
زمانے میں بہت سے عرب خاندان وطن چھوڑ کر سندھ میں آ بسے اور یہاں ایک
عرب نوآبادی کی بنیاد پڑ گئی۔ جب عباسیوں کی قوت پر زوال آیا تو سندھ پر گرفت
باقی نہ رہ سکی۔ اس وجہ سے چھوٹے چھوٹے سرداروں نے جا بجا اپنی حکومتیں
کر لیں۔ وہ لوگ عباسی خلیفہ کو محض اپنا روحانی سردار تسلیم کرتے تھے۔ اُس زمانے
میں حکومتِ سندھ کے دو بڑے مرکز تھے، ایک ملتان دوسرا منصورہ۔

اسلامی ہند کی تاریخ کا اصل آغاز سلطان محمود غزنوی سے ہوتا ہے
افغانستان کی ایک چھوٹی سی ترک سلطنت کا حکمران تھا۔ یہ سلطنت سامانیوں کی
حکومت کا شیرازہ بکھر جانے پر آزاد و خود مختار ہوئی تھی۔ محمود نے اپنے عہد
(۳۸۸ھ۔ ۴۲۱ھ، ۹۹۸ء۔ ۱۰۳۰ء) میں ہندوستان پر متعدد حملے کیے
میں قرامطی اسماعیلیوں نے خاصا اثر و رسوخ پیدا کر لیا تھا، اور اُن کی ایک حکومت
بھی قائم ہو گئی تھی، محمود نے عبدالرزاق کے ماتحت ایک تنخواہ دار فوج سندھ
بھیجی جو ترکوں اور ہندوؤں پر مشتمل تھی، اس فوج نے سندھ میں عربی اقتدار کو بالکل
ختم کر دیا۔ آگے چل کر پنجاب بھی غزنی سلطنت میں شامل ہو گیا اور غزنہ کے
سے اس پر حکومت ہوتی تھی۔

غزنویوں کی قوت میں ضعف کے آثار نمودار ہوئے تو غوری برسرِ اقتدار آگئے
اُنھوں نے پہلے غزنہ پر قبضہ کیا، پھر غزنویوں کے آخری مرکز یعنی لاہور کو بھی مسخر
یہی خاندانِ حکومت ہے جس نے شمالی ہندوستان میں اسلامی حکومت کی مستقل بنیاد
استوار کیں۔ شہاب الدین محمد غوری نے ۵۸۸ھ، ۱۱۹۲ء میں ہندو راجپوتوں

[ط]اقت پر تباہ کن ضرب لگائی۔ شہاب الدین کے ترک غلاموں نے جو فوجوں کے سالار [تھے] فتح و تسخیر کا کام جاری رکھا اور بنارس و بنگال کی تسخیر سے اسلامی حکومت کی سرحد [ہندو]ستان کے مشرقی ساحل تک پہنچا دی۔ شہاب الدین کی وفات پر اُس کے ایک [ترک] غلام قطب الدین ایبک نے ہندوستان کے تمام مقبوضات سنبھال لیے۔ وہی [ہندو]ستان کا پہلا مسلمان بادشاہ تھا۔ حکمرانوں کا جو خاندان تاریخ ہند میں غلاموں کا [خاند]ان کہلاتا ہے، اُس کی بنیاد ایبک ہی نے رکھی تھی۔

خاندانِ غلاماں کا دورِ اقتدار ختم ہوا تو ۶۹۹ھ۔ ۱۲۹۰ء میں خلجی ترک برسرِ اقتدار [آ]ئے۔ خلجیوں کے عہد میں ترکوں اور غیر ترکوں کا امتیاز مٹ گیا اور ہندوستان میں [رہ]نے والے تمام مسلمانوں کے لیے اقتدار و اختیار حاصل کرنے کے دروازے [کھ]ل گئے خواہ وہ یہاں کے غیر مسلموں میں سے مسلمان ہوے تھے یا باہر سے آئے [تھ]ے۔ خلجیوں کے عہد میں اسلامی اقتدار کا دائرہ پھیلتے پھیلتے دکن میں بھی دُور تک پہنچ [گیا] لیکن دکن میں اسلامی سلطنت نے انتہائی وسعت تغلقوں کے عہد میں حاصل کی [جو] ۷۲۰ھ۔ ۸۱۵ھ (۱۳۲۰ء۔ ۱۴۱۲ء) تک حکمران رہے۔ اُن کی فتوحات [ہ]ندوستان کے انتہائی جنوبی گوشے تک پہنچ گئیں۔ تغلقوں ہی کے زمانے میں [تی]مور نے ۸۰۱ھ (۱۳۹۸ء) میں شمالی ہند پر حملہ کیا اور ایسی افراتفری پیدا کر دی [کہ دہ]لی کی مرکزی قوت حد درجہ کمزور ہو گئی۔ تغلقوں کے بعد کچھ مدت تک سید حکمران رہے پھر انکی جگہ لودھی [برسر]کار آ گئے۔ یہ لوگ پٹھان تھے انہی سے بابر نے حکومت چھینی اور آخری لودھی بادشاہ کو ۹۳۲ھ [۱۵۲۶ء] میں بمقام پانی پت شکستِ فاش دی، پانی پت کی لڑائی تاریخ ہند کی بہت مشہور لڑائی ہے۔

سندھ میں اسلامی ثقافت کو عرب حکمرانوں سے زیادہ تقویت نہ پہنچی، اس لیے کہ سلطنت کا مرکز بنوامیہ کے زمانے میں دمشق اور عباسیوں کے زمانے میں بغداد [ر]ہا اور یہ مرکز سندھ سے اتنے فاصلے پر تھے کہ عرب حکمرانوں کو دُور افتادہ صوبوں پر

توجہ کا زیادہ موقع مل ہی نہیں سکتا تھا۔ عربیت کے خاص اثرات اُن چھاؤنیوں تک محدود رہے جو محمد بن قاسم کی واپسی کے بعد اس غرض سے قائم کی گئی تھیں کہ مقامات پر رعب داب قائم رہے۔ جو عرب قبیلے سندھ میں آباد ہوئے، اُنھوں نے یقیناً زبان پر کچھ نہ کچھ اثر چھوڑا، لیکن ہمیں اُس کے متعلق کچھ معلوم نہیں۔ جب مصر میں فاطمی کی حکومت قائم ہوگئی تو اسماعیلی مبلغ سندھ میں آنے جانے لگے اور یہاں انھوں نے اپنے خاص حلقے پیدا کر لیئے۔ ان اسماعیلیوں کے ایک خاندان نے جو غالباً اُس نسل سے تھا جو شام کے دروزی تھے، موجودہ ٹھٹّہ کے قریب ایک حکومت قائم کر لی تھی۔ بعدازاں اسمٰعیلیوں کو ملتان میں قدم جمانے کا موقع مل گیا، جو مدت سے سُنّی حکومت کے ماتحت چلا آیا تھا۔ چنانچہ ملتان یا اسمٰعیلی اثرات کے دوسرے مراکز میں جمعے کے دن خطبہ پڑھا جاتا تھا تو اُس میں فاطمی حکمرانوں ہی کا نام لیا جاتا۔ اس عہد میں بہت سے سندھی مسلمانوں نے علم وفضل میں درجۂ شہرت حاصل کیا۔ اُن کا اثر عراق تک پہنچ گیا جہاں کے لوگوں کی رائے اُن کے متعلق بہت اچھی تھی۔ سندھ کے قاضی حدیثوں میں مہارت کے متعلق بھی خاصی شہرت کے مالک تھے۔ فقہی لحاظ سے سندھ میں امام اعظم کا نظام جاری ہوا۔ دو سندھی شاعروں نے بھی خاصی ناموری حاصل کی۔ سندھ کے عرب شعراء عموماً دونوں زبانوں یعنی سندھی اور عربی میں شعر کہتے تھے۔ بعض سندھیوں کے اشعار پوری عربی سلطنت میں شائع ہوئے اور مشہور عرب شاعر اپنے قصیدے سندھی گورنروں کے پاس بھیجتے رہتے تھے۔

عربوں کی حکومت کے دوران میں سندھ کے اندر سرکاری یا تجارتی مقاصد کے لیے عربی زبان استعمال ہوتی تھی۔ تعلیم یافتہ طبقہ عربی یا سندھی دونوں زبانیں استعمال کرتا تھا، لیکن عام لوگ مادری بولی ہی میں بات چیت کرتے تھے۔ جب اجنبی قوت

برسر کار آئی تو عربی کے ساتھ فارسی نے بھی سندھ میں مستقل طور پر قدم جما لیے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ موجودہ سندھی کا رسم الخط عربی ہو گیا اور اب اس میں پچاس فی صد الفاظ عربی اور فارسی کے ہیں۔ اس زمانے کے سیاحوں نے اپنے بیانات میں درس گاہوں کا ذکر کہیں نہیں کیا، لہٰذا سمجھا گیا کہ سندھ میں کوئی باقاعدہ نظام تعلیم رائج نہ تھا۔ البتہ مسجدیں تعلیم کا مرکز بنی رہیں اور یہی کیفیت اسلامی دنیا کے دوسرے حصوں کی تھی۔ اُوچ اُس عہد میں تعلیمی سرگرمیوں کا خاصا مرکز تھا۔ یہ ۶۱۴ھ (۱۲۱۷ء) میں مسخر ہوا تو بیان کیا جاتا ہے کہ سندھی علما کی ایک بڑی جماعت کو بھی فاتح اپنے ساتھ دہلی لے گیا۔

مغلوں سے پیشتر دہلی کے بادشاہ مطلق العنان حکمران تھے۔ اُن میں سے بعض نے شریعت کی مخالفت میں بھی تامل نہ کیا، اس لیے کہ شریعت مطلق العنانی پر پابندی لگاتی تھی۔ اُن میں سے اکثر ایسے تھے جو مذہبی احکام کا پورا احترام کرتے تھے اور بعض بہ سلسلہ احترام معقول حدود سے بھی تجاوز کر گئے تھے، مثلاً فیروز تغلق۔ عباسی خلفاء کے ساتھ تعلقات کا معاملہ مختلف حکمرانوں کے رجحانات پر موقوف رہا۔ جب عباسی خلیفوں کی طاقت محض برائے نام رہ گئی تھی تو ہندوستان کے حکمران اُس زمانے میں بھی خلفاء کے وفادار رہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ سکوں پر خلیفہ کا نام ثبت ہوتا تھا اور جمعہ کی نماز میں خلیفہ ہی کا نام لیا جاتا تھا۔

مغلوں سے پیشتر حکمرانوں نے عموماً دو مذہبی محکمے قائم کر رکھے تھے، جن میں سے ہر ایک کا رئیس بہت بلند پایہ آدمی مقرر ہوتا اور اُسے بادشاہ براہِ راست اختیارات سونپتا۔ ایک محکمے کے ماتحت مسجدوں کا انتظام، اوقاف کی نگرانی، درس گاہوں اور صوفیوں کی خانقاہوں کے لیے مالی امداد وغیرہ کے مسائل تھے۔ دوسرا محکمہ قضاء و عدل کا تھا، جس میں جج یا قاضی اسلامی شریعت کے مطابق سب کچھ کرتے تھے اور کوئی شخص اُن کے کاروبار میں دخل دینے کا مجاز نہ تھا۔

صوفیہ کو عموماً علما پر ترجیح دی جاتی تھی، اس لیے کہ وہ سیاسیات سے الگ تھلگ رہتے تھے۔ دو مشہور بزرگ پانچویں صدی ہجری (گیارھویں صدی عیسوی) میں ہندوستان آئے، ایک سید سالار مسعود غازی دوسرے شیخ اسمٰعیل اور انھوں نے ہزاروں لوگوں کو اسلام کا حلقہ بگوش بنا لیا، حالانکہ اُس وقت تک ہندوستان میں اسلامی حکومت قائم نہیں ہوئی تھی۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتی غوریوں کی حکومت قائم ہونے سے کچھ مدت پیشتر ہندوستان تشریف لائے تھے اور وہاں اُنھوں نے تصوف کے چشتی سلسلے کی بنیاد رکھ دی، جو آج بھی پاکستان و ہند کا سب سے زیادہ ہر دلعزیز سلسلہ تصوف ہے۔ خواجہ صاحب کا مزار اجمیر میں ہے، جہاں ہر سال لاکھوں مسلمان اور بہت سے ہندو زیارت کے لیے جاتے ہیں۔

سہروردی سلسلے کی بنیاد بھی اسی زمانے میں پڑی۔ اس میں اور چشتیہ سلسلے میں کچھ سا اختلاف تھا، اس لیے کہ سہروردی سلسلہ شریعت کی پابندی پر زیادہ زور دیتا تھا اور گانا سننے یا رقص و وجد کرنے سے بھی اختلاف تھا۔ دوسرے سلسلوں نے ایسی باتوں کی اجازت دے رکھی تھی۔ دو اور سلسلے ایسے ہیں جنھوں نے مغلوں سے پیشتر کے دور میں ہندوستان کے اندر وسیع اثر و رسوخ حاصل کر لیا تھا۔ ایک قادری دوسرا نقشبندی۔

ہندویت پر اسلام کا اثر پڑا تو ہندوؤں میں تیسری صدی ہجری سے چھٹی صدی ہجری تک (نویں صدی عیسوی سے بارھویں صدی عیسوی تک) اصلاحی تحریکیں جاری ہوئیں۔ یہ تحریکیں شنکر اچاریہ، مانو رج اور اُن کے پیروؤں سے منسوب ہیں۔ اُن کا ظہور پہلے جنوب میں ہوا، جہاں ہندومت کو اسلام کے ساتھ ربط و ضبط کا اوّلین موقع پیش آیا۔ یہ ربط۔

---

[1] لیکن ہندوستان میں نقش بندی سلسلے کی خاص اہمیت حضرت شیخ احمد سرہندی سے شروع ہوئی، وہی تھے جنھوں نے حضرت خواجہ باقی باللہ سے روحانی فیض حاصل کرنے کے بعد اس سلسلے کو سب سے زیادہ وسعت و شہرت دی۔

سلمانوں کی وجہ سے پیدا ہوا جو سیاحوں اور تاجروں کی حیثیت میں ہندوستان آتے رہے،
انکہ اس وقت تک جنوبی ہند مسخر نہیں ہوا تھا۔ شمالی ہند میں یہ اصلاحی تحریکیں بہت بعد میں
یں۔ ہندویت پر اسلام کا ابتدائی اثر زیادہ تر صوفیہ کی ریاضتوں اور مجاہدوں سے پڑا۔ نیز
لمانوں کی روزانہ زندگی کے اعمال و احوال اس سلسلے میں موثر ہوئے۔

مغلوں کا دورِ عروج و اقبال

(۹۳۳ھ - ۱۱۱۹ھ، ۱۵۲۶ء - ۱۷۰۷ء)

مغلوں کے دور کا آغاز پانی پت کی لڑائی (۹۳۳ھ، ۱۵۲۶ء) سے ہوتا ہے جس
بابر نے لودھیوں پر فیصلہ کُن فتح حاصل کی اور اس طرح دہلی میں تخت حکومت بچھا لینے کا
قع پیدا کر لیا۔ بابر نسلاً ترک اور تیموریوں کی اولاد میں سے تھا۔ اسے اپنے نسب پر بڑا فخر
ادہ فارسی اور ترکی دونوں زبانیں بولتا تھا، لیکن چونکہ مغل ہندوستان آنے سے پیشتر ایرانی
افت سے بہت متاثر ہو چکے تھے، اس لیے زیادہ تر وہ فارسی ہی استعمال کرتے تھے۔
راسی کو ادبی زبان کے طور پر مانتے تھے۔ بہت سے عالم اور شاعر بھی خراسان یا آس پاس
ے خطوں سے اُٹھ کر ہندوستان میں آباد ہو گئے تھے، اس طرح مغلوں کا دربار نہایت زبردست
بی اور ثقافتی سرگرمیوں کا مرکز بن گیا تھا۔

بابر نے ۹۳۷ھ (۱۵۳۰ء) میں وفات پائی اور اُس کا بیٹا ہمایوں جانشین ہوا۔
بڑا خوش ذوق تھا۔ ہیئت اور ریاضی سے اسے بڑی دل چسپی تھی۔ اُسی نے سب سے
پہلے ہندوستان میں سکولوں اور کالجوں کی بنیاد رکھی، لیکن اس کا دورِ حکومت افراتفری
بں گزر گیا۔ پٹھانوں نے اسے ہندوستان چھوڑ کر باہر نکلنے پر مجبور کر دیا اور اس نے کم و بیش
پندرہ سال ایران و افغانستان میں بسر کیے۔ بعد ازاں وہ لوٹا اور ایرانی بادشاہ کی مدد سے اُس
نے شمالی ہندوستان کو دوبارہ فتح کر لیا۔

مغلوں کی اصل تاریخ کا آغاز ۹۶۳ھ (۱۵۵۵ء) سے ہوتا ہے جب ہمایوں کا بیٹا اکبر تخت نشین ہوا۔ وہ ابھی لڑکپن ہی کے دور میں تھا کہ اس کے ایرانی اتالیق بیرم خاں نے مغل سلطنت کی بنیادیں استوار کر دیں۔ اکبر نے اپنی صلاحیت کی بنا پر انتظامی تجربہ رکھنے والے ہندوؤں کو اپنے ساتھ وابستہ کر لیا اور اُن میں سے ایک نے مغلوں کے لیے ایسا انتظام مالگزاری تیار کر دیا جو عمومی ترمیمات کے بعد انگریزی حکومت کے زمانے میں بھی جاری رہا۔ گیارھویں صدی ہجری (سترھویں صدی عیسوی) میں جو علاقے اکبر کے زیرِ حکمران تھے، اُن کا انتظام دنیا بھر میں بہترین تھا اور ثقافتی مقاصد کے لیے اس پیمانے پر کام ہو رہا تھا کہ اس کی کوئی مثال پہلے موجود نہ تھی۔

اکبر کم و بیش پچاس سال حکمران رہا۔ پھر اس کی جگہ جہانگیر بادشاہ بنا (۱۰۱۴ھ/۱۶۰۵ء – ۱۶۲۷ء) بادشاہ ہوا۔ پھر عنانِ حکومت اورنگ زیب کے ہاتھ آئی جو مغلوں میں آخری بڑا بادشاہ تھا۔ اس کی وفات ۱۱۱۸ھ (۱۷۰۷ء) میں ہوئی۔ اگرچہ مغلیہ سلطنت اس کے بعد بھی قائم رہی، لیکن یہ زوال و انتشار کا طویل دور تھا جو ۱۲۷۴ھ (۱۸۵۷ء) تک ممتد ہوا۔

مغلوں کے ماتحت ہندوستان میں اسلامی سلطنت کی بنیادیں مستحکم ہوئیں۔ اگرچہ دکن میں بعض تازہ فتوحات بھی ہوئیں، لیکن مغلوں کی طاقت کا بڑا مرکز شمالی ہند میں رہا، وہ وسط ایشیا کے ان علاقوں سے آئے تھے جو ترکی و ایران کی ثقافت کے دائرے میں آتے تھے۔ اس وجہ سے مغلوں نے بہت سے ایرانی اثرات قبول کر لیے تھے۔ بابر نے اپنے لیے بادشاہ کا لقب اختیار کیا۔ یہ ایرانی حکمران کا لقب تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ چند ترک قبیلوں کا جمہوری سردار نہیں رہا تھا، بلکہ مطلق العنان تاجدار بن گیا تھا مغلوں کی قوت اور اقتدار کا ڈھانچا مسلح امرا پر مبنی تھا جن میں مختلف عناصر شامل تھے مثلاً اوّل ماوراالنہر سے نورالدین (جہاں سمرقند و بخارا مدت سے عربی اسلامی ثقافت کے مرکز چلے آ رہے تھے

ایرانی امرا جو اس لیے مفتوح ملک میں چلے آئے تھے کہ بلند عہدوں اور منصبوں پر پہنچیں
وہ افغان اور ترک اُمرا جو پہلے سے ہندوستان میں موجود تھے لیکن اقتدار اعلیٰ سے اُنھیں
ہونا پڑا تھا۔ مغلوں کی اپنی تعداد بہت تھوڑی تھی لیکن اُنھوں نے ضبط و نظم قائم رکھا
ت سے ایران اور وسط ایشیا سے نو واردوں کا سیل برابر آتا رہا۔ یہاں تک کہ باہر سے
ئے ہوئے مسلم امرا ہندوستانی بن گئے۔ اس کے بعد اجنبیوں کو اچھا نہیں سمجھا جاتا
۔

مسلم امرا کا نظام جاگیرداری پر مبنی تھا۔ ہر امیر درمیانے اور نچلے طبقے کے مسلمانوں
بھرتی کر لیتا۔ عموماً وہی لوگ بھرتی کیے جاتے جو امیر کے ہم قوم ہوتے۔ افغان کبھی
ی ایرانی شیعہ امیر کی فوج میں بھرتی نہ ہوتے۔ اس طرح ہندوستان کی مسلم اقلیت کے
ملف طبقوں میں فرقہ واری اور علیحدگی کے رجحانات تقویت پاتے رہے۔ یہی
ک تھے جن پر مغلوں کی قوت کا انحصار تھا۔ اس مخلوط آبادی پر مغل بادشاہ مطلق العنان
لق پر حکومت کرتا تھا۔ وہ کسی قانون کا پابند نہ تھا، صرف شریعت کی پابندی ایک
ت تک قبول کی جاتی تھی تاہم شریعت کو حقیقی معنی میں بروئے کار آنے کا موقع کبھی نہ
۔ شاہنشاہ جب اپنے امرا سے ناراض ہوتا تو اُنھیں موت کے گھاٹ اُتار سکتا تھا۔
ن کی جائیدادیں ضبط کر سکتا تھا۔ ظاہر ہے کہ شریعت کے ماتحت یہ سب کچھ ممکن نہ
تھا۔ گویا مغلوں کی حکومت قطعاً اسلامی حکومت نہ تھی اصلاً یہ ایرانی مطلق العنانی تھی
د اس میں تاتاریوں اور ترکوں کی بعض انتظامی خصوصیتیں شامل کر لی گئی تھیں۔

مغلوں کے عہد کا نظم و نسق عباسی حکومت کے نمونے پر تیار کیا گیا تھا۔ البتہ اس میں
ہندوستان کی خاص ضرورتوں کے پیش نظر کچھ ترمیمات کر لی گئی تھیں۔ شاہنشاہ ہی
سلطنت کا دینی اور روحانی رئیس تھا۔ وہ اپنا ایک وزیر اعظم مقرر کر لیتا جس کا ہاتھ
مختلف سیکرٹری بٹاتے، لیکن وزرا کی کابینہ قطعاً موجود نہ تھی۔ مذہبی امور کے نگرانِ اعلیٰ

کو بہت اہم درجہ حاصل تھا۔ وہی اسلامی شریعت کا محافظ تھا۔ وہی عالموں، مدرسوں
کالجوں کے لیے وظیفے مقرر کرتا، زمینیں بطور معافی دیتا اور محتاجوں کی امداد بھی اس
فرائض میں شامل تھی۔ صدر الصدور محکمہ قضا کا سب سے اعلیٰ افسر تھا، وہ قاضیوں
مفتیوں کے کاروبار کی نگرانی کرتا جن کے روبرو ہندوؤں اور مسلمانوں کے دیوا
فوجداری مقدمات پیش ہوتے۔ ان سب کے فیصلے چاروں فقہی دبستانوں میں سے کسی
کے مطابق ہوتے۔

مغل دربار کی سرپرستی میں ادب و شعر کو بڑا فروغ حاصل ہوا۔ مغل حکمرانوں میں
بعض خود علم میں ممتاز درجے پر فائز تھے، مثلاً بابر اور جہانگیر اور ان کے درباریوں
اونچے درجے کے فضلا شامل تھے، نیز ان کے پاس عالیشان کتب خانے
مغلوں کے ماتحت فارسی شاعری کمال کے اعلیٰ درجے پر پہنچ گئی اور ہندوں
ایسے مشہور شاعر پیدا ہوئے جو ایران کے بہترین شاعروں کا مقابلہ کر سکتے تھے
نے ہندوستان کی زبانوں پر مستقل اثر چھوڑا۔ اسی اثر کے ماتحت اردو زبان پیدا
جو پاکستان و ہند کی بڑی زبانوں میں سے ایک ہے، اس زمانے میں مورخوں نے
کتابیں تصنیف کیں وہ دورِ حاضر کے اہلِ علم کے لیے بیش بہا معلومات کا سرچشمہ
مغل شاہنشاہوں کی سرپرستی میں ہندوستانی زبانوں کی بہت سی کتابوں کے تر
فارسی میں ہوئے۔ ان میں سے رامائن اور مہابھارت کے ترجمے خاص طور پر قابلِ ذکر
جو اکبر کے عہد میں کیے گئے۔ مذہب کے ساتھ اکبر کی دلچسپی اس درجہ وسیع تھی کہ
نے بائبل تک کا ترجمہ فارسی میں کرایا تھا اور یہ بائبل کا سب سے پہلا فارسی
ترجمہ تھا۔

مغلوں کا دور اس وجہ سے بطورِ خاص قابلِ توجہ ہے کہ اس میں اسلام کے ا
کئی نئی مذہبی تحریکیں پیدا ہوئیں جب ہندوؤں کے مذہبی خیالات نیا رنگ اختیار

تھے تو مسلمانوں کو بھی ہندویوں اور روشنائی تحریکوں نے خواب غفلت سے بیدار
محمد جونپوری (جو بعد میں مہدی کے لقب سے مشہور ہوئے) ۸۴۷ھ (۱۴۴۳ء)
پیدا ہوئے اور انھوں نے مہدی موعود ہونے کا دعویٰ کیا۔

اس تحریک کے پیرو ایک برادری کی شکل میں منظم ہو گئے تھے جن کے تمام ارکان
جیسے حقوق حاصل تھے۔ اسی زمانے میں روشنائی تحریک بروئے کار آئی۔ اگرچہ
یوں نے بڑے جنگ جو گروہ پیدا کر دیے تھے اور ان کے لیڈر روحانی و دنیوی اقتدار کے
دار تھے، تاہم مسلمانوں کے مذہبی افکار پر انھوں نے کوئی قابلِ توجہ اثر نہ چھوڑا
ی فرقے کے لوگ اب بھی ہندوستان و پاکستان میں بہ طور ایک غیر معروف اقلیت کے
ہیں[1]۔

اس سے بدرجہا زیادہ اہم اثرات اُس مذہبی بحث و نزاع سے پیدا ہوئے جس
دار خود اکبر نیز اُس کے چند درباری تھے۔ اکبر کی رائے یہ تھی کہ ہندوؤں کے ساتھ
ے مجلسی تعلقات پیدا کرنے کی ضرورت ہے، اس لیے کہ ہندوستان میں مغلوں
ومت تنہا مسلم اقلیت کے بل پر قائم نہیں رہ سکتی۔ لازم ہے کہ ہمیں ہندوؤں کی
سرگرم امداد حاصل ہو۔ اس رائے کا نتیجہ یہ نکلا کہ اکبر نے ہندوؤں کی بعض رسمیں اختیار

۱۔ محمد جونپوری کے متعلق محققین کا فیصلہ یہ ہے کہ وہ صرف مہدی ہونے کا دعوے دار تھا اور لفظ مہدی لغوی معنی
میں استعمال کیا گیا تھا البتہ پیروؤں اور معتقدوں نے اسے اصطلاحی معنی میں قبول کر کے سید موصوف کو
مہدی موعود بنا دیا۔ ہمارے زمانے میں نواب بہادر یار جنگ مرحوم کا تعلق بھی مہدیوں ہی سے تھا۔ روشنائی
تحریک کا بانی شیخ بایزید انصاری تھا جو پیر روشن کے لقب سے مشہور ہوا اور مخالف اُسے پیر تاریک کہتے
تھے۔ وہ قندھار کے قریب ایک گاؤں کانی کرم کا باشندہ تھا۔ بہ سلسلہ تجارت ہندوستان آیا۔ خاصی مدت جالندھر میں گزار کر
اپنے خاص معتقدات کی اشاعت کی۔ سید علی ترمذی بونیر جو پیر بابا کے نام سے مشہور ہیں نیز اخوند درویزہ کے خلیفہ اخوند
نے شیخ بایزید کے خلاف زبردست جہاد کیا۔

کرلیں اور غیر مسلموں کو جزیے سے آزاد کردیا۔ راسخ العقیدہ مسلمان اپنی جگہ مضبوطی
قائم رہے اور اکبر کی نئی پالیسی نے وہ مذہبی کش مکش پیدا کردی جس کے اثرات ا
بعد بھی ختم نہ ہوئے۔

۹۸۳ھ (۱۵۷۵ء) کے آس پاس اکبر نے مذہبی مباحث سے غیر معمو
یعنی شروع کی۔ یہ زیادہ تر اُن درباریوں سے بات چیت کا ثمرہ تھا جو آزاد خیال
اکبر نے ایک خاص ایوان بنوایا جس میں ہر فکر و نظر کے علما مذہبی بحثیں کرتے تھے
بحثیں سنیوں اور شیعوں کے اختلافات یا مختلف فقہی دبستانوں تک محدود نہ
تھیں۔ کچھ مدت بعد مذہب کے مبانی بھی زیر بحث آنے لگے اور اکبر کے دل میں مذ
کی مروجہ حالت کے متعلق بے اطمینانی پیدا ہو گئی۔ اس کے بعد اُس نے دوسر
کے لوگوں کو بھی بحث میں بلانا شروع کردیا یہاں تک کہ گوا سے دو مسیحی پادر
پہنچ گئے۔ ان میں سے ایک کا نام ایکاوایوا[1] اور دوسرے کا مونسرات[2] تھا۔ وہ
اکبر کو متاثر کرنے میں ناکام رہے۔ آہستہ آہستہ اکبر نے خود مذہبی قیادت سنبھال
اُس نے ایک فرمان جاری کیا جس کی رُو سے مذہبی معاملات میں وہ سب سے بڑا
بن گیا۔ ساتھ ہی دعویٰ کردیا کہ میں جو کچھ کہوں وہ بہر حال واجب التسلیم ہے۔ بالآ
ایک نیا مذہب پیش کردیا جو اسلام ہندویت اور مسیحیت کے عناصر سے مرکب تھا۔ اس
مذہب کے رُو سے پیروؤں کے لیے ضروری تھا کہ شہنشاہ کے روبرو سجدہ کریں[3]۔ مسلما

---

[1] aquaviva. [2] Monserrate. [3] سجدہ کرنے کی رسم دراصل ہندوؤ
سے شروع ہوئی جن کے نزدیک راجاؤں اور حکمرانوں کو سجدہ لازم تھا۔ اکبر نے اسے منع نہ کیا پھر آہستہ آہستہ
نے بھی دیکھا دیکھی یہی طریقہ اختیار کرلیا، یہاں تک کہ حضرت مجدد الف ثانی کو جہانگیر کے دربار میں سجدے
مخالفت کرتے ہوئے قید ہونا پڑا۔ شاہ جہاں کے عہد میں سجدہ ممنوع ہوا۔ اس طرح درشن کا طریقہ بھی صرف
ہندوؤں کے لیے اختیار کیا گیا تھا جن کے نزدیک حکمران کی زیارت کیے بغیر نہانا اور کچھ کھانا جائز نہ تھا چ

باقی صفحہ ۲۲۵ پر

ختنہ کی ممانعت کر دی، گائے کے گوشت کا استعمال روک دیا گیا۔ ڈاڑھیاں بڑھانے کے خلاف تحریک جاری کر دی۔ اُس کے اٹھارہ درباری اس مذہب کے پیرو بن گئے الگ تھلگ رہے۔ اس ساری سرگرمی کا نتیجہ یہ نکلا کہ علماء اکبر سے ناراض ہو گئے۔

اکبر کا مذہب اُس کے ساتھ ہی ختم ہو گیا لیکن اُس کے بعض افکار کی گونج آئندہ نسلوں میں بھی سُنی جاتی رہی۔ شاہجہان کا بیٹا دارا شکوہ اپنی زندگی کے ابتدائی دنوں میں صوفیہ کی کشادہ دلی اور بے تعصبی سے بہت متاثر ہوا تھا۔ اس کے خلاف علماء اپنے افکار و عقائد پر پختگی سے قائم تھے۔ آگے چل کر دارا شکوہ کو ہندو مذہب کے ساتھ دلچسپی بڑھ گئی۔ اُسی کے ایماء پر ہندوؤں کی متعدد کتابوں کا ترجمہ فارسی زبان میں ہوا وہ خود بھی مذہب کے متعلق خاص کتابوں کا مصنّف تھا۔ اُن میں سے ایک کتاب صوفیہ اور اُن کے پیروں کے حالات پر مشتمل ہے[1]۔

ایک رسالہ اُس نے مرتب کیا جس میں ہندوؤں کی کتابوں سے وحدۃ الوجود کی تمام اصطلاحات کی کیفیت واضح کی اور صوفیہ کی کتابوں سے اُن کے مترادفات درج کیے۔ صوفیہ ہی کے زیر اثر اُس نے اسلام اور ہندویت کے درمیانی مصالحت کی کوشش کی، اگرچہ بہت سے صوفی عملاً اسلام پر پختگی سے قائم تھے، لیکن اُن میں وحدۃ الوجود کے افکار کی طرف رجحان بڑھ رہا تھا اور یہ افکار ہندوستانی قلب کے لیے بڑے خوش گوار تھے۔ صوفیہ کے علم الٰہیات نے اسلام اور ہندویت کے درمیان ایک مشترک بنیاد مہیا کر دی۔

بقیہ صفحہ ۴۴۴: منگلوں نے اپنے قلعوں میں خاص مجرے بنائے جن میں صبح کے وقت بیٹھ کر درشن دیا کرتے تھے۔

حاشیہ صفحہ ھذا:۔

[1] یہ دارا شکوہ کی کتاب سفینۃ الاولیا کا ذکر ہے

شاہجہان کے بعد اورنگ زیب تخت نشیں ہوا۔ اس پر شیخ احمدؒ سرہندی کے مذہبی افکار کا بہت اثر پڑا تھا۔ شیخ موصوف نے اسلام کو اصل شکل میں بحال کرنے کے لیے بڑا زبردست کام کیا اور صوفیہ نے اسلام سے جہاں جہاں انحراف کیا تھا، اس کی سختی سے تردید کی۔ شیخ احمد کے فرزند ارجمند اورنگ زیب کے ساتھ گہرے تعلقات رکھتے تھے۔ جو ردِ عمل شیخ احمدؒ سے شروع ہوا تھا، اسی نے اورنگ زیب کے دل میں یہ احساس پیدا کیا کہ حنفی فقہ کے متفرق عناصر کو مدون ہو جانا چاہیے، جو مفتیوں کے شرعی فیصلوں پر مشتمل تھے۔ اسلام کے قضائی پہلو کے متعلق یہ اہتمام علما اور صوفیوں اور آزاد خیال مسلمانوں کے خلاف واضح ردِ عمل تھا، اسلامی قانون کے متعلق جن کی روشِ مجلسی اور مذہبی نظم کے روابط کو ڈھیلا کرنے کا موجب بن گئی تھی

شیخ احمدؒ سرہندی کے افکار و تعلیمات کو تاریخِ اسلام میں خاص اہمیت حاصل اس لیے کہ ہندوستانی مسلمانوں کے افکار پر ان کا مستقل اثر پڑا۔ شیخ احمدؒ جنھیں مجدد الف ثانی کہا جاتا ہے ۹۷۱ھ (۱۵۶۴ء) میں بمقام سرہند پیدا ہوئے۔ وہ اپنی مذہبی تعلیم پوری کر کے سہروردی اور چشتی سلسلوں میں داخل ہو گئے۔ پھر انھوں نے نقش بندی سلسلے میں بیعت کی۔ انھیں بہت جلد احساس ہو گیا کہ ان کے معاصرین صوفیہ ہوں یا علما روحانی تنزل کا شکار ہو چکے ہیں۔ صوفیہ ابنِ عربی کے فلسفے کے زیرِ اثر وحدۃ الوجود کے قائل ہو گئے تھے اور ایسا طریقہ اختیار کر لیا تھا جس میں خدا اور انسان کے درمیان فرق باقی نہیں رہتا۔ علما فروع پر زیادہ زور دینے لگے تھے۔ اس طرح اسلامی قانون کے ماتحت چھوٹی چھوٹی باتوں پر لامتناہی جھگڑے شروع ہو گئے۔ شیخ احمدؒ کے نزدیک دونوں گروہ اسلام کے متعلق اخلاقی حمیت کھو چکے تھے۔

شیخ احمد علما کے مقابلے میں صوفیہ کو زیادہ خطرناک سمجھتے تھے، اس لیے

مذہب کے تمام احکام خالق ومخلوق کے درمیان امتیاز پر مبنی ہیں۔ اگر تخلیق بے اصل ہے
خدا کے سوا کسی کا وجود نہیں جیسا کہ ابنِ عربی کا خیال ہے تو ظاہر ہے کہ مذہب اور شریعت
کوئی ضرورت نہیں رہتی۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ زندگی اور وجود بھی کوئی خاص اہمیت نہیں
تے۔ اس پر تعجب نہ ہونا چاہیے کہ صوفیہ نے فنا فی اللہ میں پناہ لی اور دنیاوی معاملات
اُن لوگوں پر چھوڑ دیا جو دنیادار تھے۔ اس بنا پر شیخ احمدؒ نے ابنِ عربی کے فلسفے کی
یدکی اور فرمایا عرفان کے رُو سے خدا اور مخلوق کی وحدت فریبِ نظر ہے۔ یہ
فہ صوفیہ کے وجودی افکار کے خلاف تھا جو ابنِ عربی سے لیے گئے تھے اور ہندوؤں
کتابوں میں سے بھی خاصے عناصر اُن میں شامل تھے۔ وحدۃ الوجود کے مقابلے میں
خ احمدؒ نے اپنی تصریحات کے لیے وحدۃ الشہود کی اصطلاح وضع کی۔

شیخ احمدؒ کی تحریرات نے معتقدین کا وسیع حلقہ پیدا کیا۔ اُن میں وہ لوگ بھی تھے
ن کا تعلق دربار سے تھا اور وہ بھی فوج میں او نچے عہدوں پر مامور تھے۔ جہانگیر نے کچھ
تک شیخ احمدؒ کے ہمہ گیر اثر کو سختی سے روکنے کی کوشش کی لیکن انجام کار اسے
خ سے مصالحت کرنی پڑی۔ چنانچہ فیصلہ ہوگیا کہ بادشاہ کے سامنے سجدہ اور گائے
ے گوشت کی ممانعت فوراً روک دی جائے۔ بعدازاں جہانگیر شیخ احمد کا مخلص
معتقد بن گیا۔

مغلوں کے ماتحت تعلیم نجی انتظامات پر مبنی تھی۔ خود شہنشاہ اور اُن کے اُمرا
لیم کی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ اس سلسلے میں وہ زمینیں بہ طور معافی دیتے۔ مسجدوں
ے لیے روپے کا انتظام کرتے۔ خانقاہوں کو مالی امداد دیتے جو مذہبی تعلیم کی اقامت
ہیں تھیں۔ اسی طرح مختلف علما اور بزرگوں کی خدمت میں رقمیں پیش کرتے۔ مسجدوں
کے ساتھ لازماً ابتدائی درس گاہیں قائم ہوتیں۔ جہانگیر نے ایک فرمان جاری کیا تھا کہ جو دولت مند
دمی یا سیاح بے اولاد وفات پائے گا، اس کی جائداد بحقِ سرکار ضبط ہوگی اور ایسی جائداد

کو درس گاہوں اور خانقاہوں کی درستی کے لیے استعمال کیا جائے گا۔ شاہجہان نے
ایک عظیم الشان دار العلوم قائم کیا۔ اورنگ زیب نے بے شمار کالج اور اسکول بنوائے
لکھنؤ میں ایک علمی مرکز کے نشوو ارتقا کے لیے وسیع جاگیر اور مالی امداد کا بندوبست
کیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ تعلیم نسواں مغلوں میں صرف دولت مند اور علمی خاندانوں تک
محدود نہ تھی۔ شاہی خاندان کی خواتین ضرور تعلیم پاتی تھیں۔ ان میں سے بعض نے اپنی
تصانیف کی اعلیٰ ادبی حیثیت کے باعث شہرت حاصل کی۔

بابر اپنے ساتھ بزنطینی فنِ تعمیر لایا تھا۔ تیموری سلطنت کے دورِ انتشار میں
ترکوں کی مختلف شاخوں نے یونانی ریاستوں اور جزیرہ نمائے بلقان سے تعلقات
پیدا کر لیے تھے۔ سنان جو البانیا کا مشہور ماہر تعمیر تھا سلطنتِ عثمانیہ میں بہت بلند
مانا جاتا تھا، اس کے شاگرد تیموریوں کی سلطنت میں پہنچ گئے۔ بابر نے یہاں کے
ان ہندوستانی معماروں سے کام لیا جو پتھر تراش تراش کر عمارتیں بناتے تھے۔ اکبر نے
ایرانی فنِ تعمیر سے وابستگی جاری رکھی۔ یہ وابستگی اُسے ماں باپ سے ورثے میں
ملی تھی جو کچھ مدت ایران میں رہ چکے تھے۔ راجپوت کماریوں سے شادیاں ہوئیں تو
فنِ تعمیر کی روایات اکبر کے لیے باعثِ کشش بن گئیں چنانچہ قلعہ آگرہ کا جہانگیری محل،
اس کے مجوزہ دار الحکومت فتح پور سیکری کی بہت سی عمارتوں میں ایرانی اور ہندوستانی
فنِ تعمیر کے امتزاج کی واضح مثالیں ملتی ہیں کہا جاتا ہے کہ مشرقِ بعید سے بھی کاریگر
مغلوں کے دربار میں پہنچ گئے تھے اور جو لوگ حج کے لیے یا تجارت کے لیے جاتے
تھے اُنھوں نے انڈونیشیا کے تعمیری نمونوں سے بھی آگاہی حاصل کر لی تھی۔ یہ
مغلوں کے زمانے میں موجود تھے، اس لیے یہ غیر اغلب نہیں کہ ہندوستانی اور
انڈونیشی بدھوں کے باقیات کی چھاپ مغلوں کے فنِ تعمیر پر لگی ہو۔

مغلوں نے جو محل اور قلعے تعمیر کیے ان میں ہندوستانی اور اسلامی نمونوں کی

رش ہوئی ہے لیکن مسجدیں اور مقبرے، نقشے اور تعمیر دونوں کے لحاظ سے زیادہ تر اسلامی
ہے۔ ان کے گنبد اور محرابیں تو مخصوص خدوخال ہیں مغل شاہنشاہوں میں اسلامی فنِ تعمیر کے
بار سے شاہجہان کو ممتاز ترین درجہ حاصل ہے۔ تاج محل جو اس کی بیگم کا مقبرہ ہے
لی کے لال قلعے کا دیوانِ خاص مغل فنِ تعمیر کے بہترین کارنامے ہیں۔ شاہجہان نے
رات میں سنگِ مرمر بہ کثرت استعمال کیا، نیز چھتوں اور دیواروں کی آرائش کے لیے
ف رنگوں کی جالیاں استعمال کیں۔

مغلوں کے ماتحت خطاطی اور خوش نویسی کی بھی بڑی حوصلہ افزائی ہوئی۔ بہت
ے مشہور خطاط دربار کے ساتھ وابستہ تھے۔ مصوروں کے ساتھ بھی بڑا اچھا سلوک ہوتا
ا جب بابر نے ہندوستان فتح کیا تو ایران کے مصور بہزاد کی ہر دلعزیزی اوجِ کمال پر پہنچی
ی تھی مختصر تصویریں بنانے میں اس نے جو نمونہ پیش کر دیا تھا، مغل مصوروں نے اسی
عیار سمجھ لیا۔ ہمایوں جبری جلاوطنی سے واپس آیا تو مغل امرا نے ایرانی نمونے کی
ویروں کو اپنا نصب العین بنا لیا۔ اس طرح بہزاد اور اس کا دبستان ہندوستانی مسلمانوں
ے لیے نمونہ بن گئے۔

مختصر تصویروں میں انفرادیت پر بہت زور دیا جاتا ہے، مجامع کا کچھ خیال نہیں رکھا
تا اور نہ اس بات کی ضرورت رہتی ہے کہ مختلف تصویروں کی شکلوں کا باہمی تعلق نمایاں
یا جائے۔ ایسی تصویروں میں صرف ایک شکل کی تفصیلات پیشِ نظر رہتی ہیں چونکہ یہ فن چنگیز خاں
ر تیمور کے درباروں میں پیدا ہوا تھا، اس لیے ان تصویروں میں لمبا شکار اور لڑائیوں
کے منظر پیش کیے گئے ہیں تاہم ان میں جوانمردی اور رومانیت کے مناظر بھی ہوتے
یں مثلاً نوجوان مرد اور عورتیں مل جل کر باغوں میں چہل قدمی کر رہی ہیں۔ شاہی درباروں میں
مایت شاندار طریق پر اجتماعات کے مناظر دکھائے جاتے ہیں۔ تقدس، پرہیزگاری،

ا اس سے مراد فرنگی محل کا مرکز ہے جو طویل مدت تک ہندوستان میں اسلامی علوم کا سرچشمہ بنا رہا۔

پارسائی اور تصوف کے مناظر کی بھی کوئی کمی نہیں۔ بادشاہ اور فقیر دو مختلف مرکز تھے
اور گرد فرد گھومتا رہتا تھا جو آج سلطان تھا وہ کل درویش بن سکتا تھا یہی وجہ ہے
ایسے مناظر پیش کیے جاتے تھے جیسے گھنے جنگل یا دُور افتادہ غار میں کوئی
رہتا ہو یا درویش معجز نما طریق پر خونخوار درندوں پر اس طرح مسلط ہو گیا جیسے وہ بھیڑ
بچے ہیں یا درویش جذب و جوش میں مصروفِ رقص و وجد ہو۔ ماورائے طبعی منظر دکھا
ہوتے تھے تو جنوں، بھوتوں، پریوں اور چڑیلوں کی شکلیں دکھائی جاتی تھیں۔

دورِ انحلال

(۱۱۱۹ھ سے ۱۲۷۴ھ تک ۱۷۰۷ء سے ۱۸۵۷ء)

اورنگ زیب کی وفات کے بعد مغل سلطنت پر تیزی سے زوال آگیا۔ مختلف
گورنر نیم خود مختار بن گئے اور مغلوں کی حکومت سمٹ کر دہلی اور اُس سے متصل علاقوں
محدود رہ گئی۔ صوبائی گورنروں کے درمیان رزم و پیکار نے افراتفری پیدا کر ہی دی تھی
آگے چل کر دکن کے اندر مرہٹوں کے ظہور نے اس افراتفری میں مزید اضافہ کیا۔ مر
صوبہ بمبئی کے جنگجو ہندو تھے۔ سیواجی نام ایک قابل ہندو کے ماتحت انھوں
ساحل کے ساتھ ساتھ ایک چھوٹی سی سلطنت قائم کرلی۔ اورنگ زیب کی وفات
بعد جو بدنظمی پیدا ہوئی اُس میں مرہٹوں کی سلطنت کا رقبہ بڑھ گیا۔ جیسے جیسے پے در پے
مرہٹہ حکمران برابر بڑھاتے رہے، یہاں تک یہ دکن میں ایک زبردست سلطنت کی حیثیت
اختیار کر گئی اور خطرہ پیدا ہو گیا کہ متحارب مسلمان سالاروں اور برائے نام حکمران یعنی
شاہنشاہ کو بھی کھا جائے گی۔ افغانی حملہ آور احمد شاہ ابدالی نے ۱۱۷۵ھ (۱۷۶۱ء)
میں مرہٹوں کی قوت تباہ کر ڈالی[1]۔

---

[1] یہ بالکل درست ہے کہ پانی پت کی تیسری لڑائی میں احمد شاہ ابدالی نے مرہٹوں پر کاری ضرب لگائی

باقی ص ۴۵۱

اس اثنا میں پرتگیزوں، ولندیزوں اور فرانسیسیوں کے ساتھ انگریز بھی تاجروں کی حیثیت
دوستان آچکے تھے اور انھوں نے مغل شاہنشاہ سے تجارتی مراعات حاصل کرلی
مغلوں کا اقتدار زوال پذیر ہوا تو فرنگیوں کے کارخانوں نے مستحکم نوآبادیوں کی صورت
لی۔ انھوں نے استحکامات اس غرض سے کیے تھے کہ جو بدنظمی اور افراتفری پھیلی ہوئی
میں اپنے تجارتی مفادات کی حفاظت کرسکیں۔ ۱۱۷۱ھ (۱۷۵۷ء) میں جنگ
کے بعد انگریزوں نے بنگال پر قبضہ کرلیا۔ اس وقت سے ہندوستان میں انگریزوں
حیثیت اختیار کرلی اور وہ بھی ان مقامی قوتوں میں شامل ہوگئے جن میں سے ہر ایک
تدار حاصل کرنے کے لیے جدوجہد کررہی تھی۔ غدر ۱۲۷۴ھ (۱۸۵۷ء) میں
کے باقیات دہلی کے آخری مغل بادشاہ کے ماتحت جمع ہوگئے تھے، لیکن
نے شکستِ فاش کھائی اور برطانوی حکومت کا پاؤں ہندوستان میں جم گیا۔ اس وقت
انڈیا کمپنی کی جگہ برطانوی پارلیمنٹ نے لے لی اور ہندوستان برطانوی تاج کا
تریں گوہر بن گیا۔

اورنگ زیب کی وفات کے بعد مغل سلطنت میں انحلال اور انتشار کا عمل تیزی سے
ہا، لیکن اس دور کے جو اسلامی ادبی ذخیرے ہمارے سامنے آئے ہیں اُن میں
دیر کا کوئی احساس نہ تھا جو مسلمانوں کے تعاقب میں بڑھی چلی آرہی تھی تعلیم کے
طریقے بہ دستور جاری تھے۔ مروجہ علوم کی تربیت پہلے کی طرح ہورہی تھی، اس لیے
شہنشاہوں نے علما کے واسطے وسیع معافیوں کا انتظام کر رکھا تھا۔ ایک
ل امر یہ ہے کہ اسی زمانے میں اردو زبان پیدا ہوئی اور اردو ادب کی تخلیق عمل میں

۱؎ اس سے پیشتر بارہ تیرہ سال تک مسلمانوں پر بھی ضربیں لگا تارہا تھا۔ ہندوستان میں اسلامی زوال کے بہت
سے اسباب ہیں۔ مثلاً تخت نشینی کے لیے جنگیں، امرا کی خودغرضیاں، صوبیداروں کی کشمکش، لیکن ان اسباب میں نادرشاہ
اور احمد شاہ ابدالی کے حملوں کا بھی خاص حصہ ہے۔

آئی جس نے فارسی ادب کے پہلو بہ پہلو جگہ حاصل کرلی۔ یہ نئی زبان ہندی، عربی اور فارسی کا مرکب ہے۔ اس کی صرف و نحو سنسکرت پر مبنی ہے البتہ الفاظ زیادہ تر عربی فارسی کے ہیں۔ برایں ہمہ فارسی کی برتری آخری مغل شاہنشاہ کے دور تک قائم رہی جب اردو کا بہترین شاعر غالب اپنی فارسی نظم پر فخر کرتا تھا اور اردو کو اپنے لیے باعثِ ننگ قرار دیتا تھا۔[1]

اگرچہ یہ انتشار و انحلال کا دور تھا لیکن اس انحطاط میں بھی ایک اعلیٰ پایے کا مفکر پیدا ہوا۔ یہ شاہ ولی اللہ تھے (وفات ۱۱۷۶ھ، ۱۷۶۲ء) جنھیں بعض لوگ غزالی اور ابن رشد سے بھی افضل قرار دیتے ہیں شاہ ولی اللہ نے اسلامی افکار کے نشو و ارتقا پر دیرپا اثر چھوڑا۔ پاکستان کا تصور سیاسی اور ذہنی لحاظ سے انھیں نے پیدا کیا۔ ان کے فکری اور عملی سرگرمیوں سے جو لہریں اٹھیں وہی آگے چل کر مسلمانوں کو آزادی کی جدوجہد میں لگانے والی تھیں۔ اپنے معاصرین میں سے تنہا وہی تھے جنھیں احساس تھا کہ اسلامی ثقافت دورِ زوال و انحلال سے گزر رہی ہے اور بدلے ہوئے حالات کے مقابلے کے لیے ذہنوں کو بدلے بغیر چارہ نہیں شاہ صاحب نے بہت جلد محسوس کرلیا کہ بادشاہوں اور تاجداروں کا دور گزر چکا، اب عوام و جمہور کا دور سامنے نظر آرہا ہے۔ انھیں یہ احساس بھی تھا کہ مسلمان حکمرانوں اور امیروں کی عیش رانی کے باعث اسلامی معاشرہ اقتصادی اعتبار سے تباہ ہوچکا ہے۔ شاہ صاحب کی تحریرات میں بادشاہی کی مخالفت اور اشتراکیت کی جانب رجحانات کے غیر مبہم اشارے ملتے ہیں۔

شاہ صاحب کا پہلا علمی کام یہ تھا کہ آپ نے قرآن مجید کا ترجمہ فارسی زبان میں کیا۔

---

[1] اشارہ مرزا غالب کے مشہور فارسی قطعہ کی طرف ہے:

فارسی بیں تا بہ بینی نقش ہائے رنگ رنگ — بگزر از مجموعۂ اردو کہ بیرنگ من است

راست می گویم من و از راست سر نتواں کشید — ہرچہ در گفتار فخر تست آں ننگ من است

کے ساتھ تفسیر لکھی۔ اس وقت تک عام تعلیم یافتہ لوگ اپنی زبان میں قرآن مجید نہیں پڑھ سکتے تھے۔ یہ ترجمہ بڑی جسارت کا کام تھا اس لیے کہ شاہ ولی اللہ کے زمانے میں لوگ کی قدامت پسندی پر جمے ہوئے تھے، علماء نے عوام کو برانگیختہ کر دیا تھا اور عوام کا غضب پوری قوت سے شاہ صاحب پر نازل ہوا۔ قرآن مجید کے ترجمے کے بعد نے اصولِ تفسیر لکھے۔ یہ قرآن مجید کے تحقیقی مطالعے کی پہلی کوشش تھی۔ قرآن مجید ترجمے کے بعد شاہ صاحب نے احادیث کے علمی مطالعے کو عام کرنے کی کوشش اور امام مالکؒ کی شہرہ آفاق کتاب موطا امام مالک کی دو شرحیں لکھیں۔ موطا کو شرح لیے اسی وجہ سے منتخب فرمایا کہ یہی کتاب اس عالی شان عمارت میں بنیاد کی حیثیت رکھتی جو آگے چل کر مجموعہ ہائے احادیث کی شکل میں بن گئیں شاہ صاحب کا مقصد یہ تھا کہ یث کے وسیع ذخیرے کو زیادہ سے زیادہ سادہ رنگ میں پیش کر دیا جائے اور یہ کوشش کی جائے کہ اسلامی قانون کے سلسلے میں مسلمہ فقہی دبستانوں کے درمیان جو اختلافات وہ کم سے کم رہ جائیں۔ چونکہ امام مالکؒ نے صرف ان احادیث کو موطا میں لیا تھا جن کا

شاہ صاحب نے قرآن کا ایسا ترجمہ فرمایا کہ بیشتر حصے عام لوگوں کے لیے کسی تفسیر کے محتاج نہ رہے لیکن انھوں تفسیر کوئی نہ لکھی۔ البتہ کہیں کہیں مزید توضیح مطالب کے لیے فوائد رقم فرمائے نیز اصول تفسیر لکھے۔ شاہ صاحب پیشتر بھی قرآن مجید کے فارسی ترجمے اور تفسیریں موجود تھیں ۔ یہ اشارہ شاہ صاحب کی کتاب فوز الکبیر کی طرف جو اصول تفسیر کی ایک نہایت عمدہ کتاب ہے، ساتھ ہی شاہ صاحب نے مختلف قرآنی آیات کی وہ تفسیر یک جا کر تھی جو صحیح و مشہور احادیث اور صحابہ کرام کے مستند اقوال پر مشتمل تھی، اس کتاب کا نام فتح الخبیر ہے، یہ کہنا صحیح کہ اصول تفسیر میں شاہ صاحب سے پیشتر کچھ نہ لکھا گیا تھا، اس فن میں بھی متعدد کتابیں موجود تھیں، لیکن فوز الکبیر کے باوجود نادر کتاب ہے۔ یہ اشارہ شاہ صاحب کی دو کتابوں کی طرف ہے جن میں سے ایک کا نام مصفی رح موطا ہے یہ فارسی زبان میں ہے اور دوسری کا نام مسویٰ شرح موطا ہے یہ مصفی کے مقابلے میں مختصر ہے اور عربی ان میں ہے۔

تعلق قانونی معاملات سے تھا، اس لیے سمجھا جا سکتا ہے کہ شاہ ولی اللہؒ صرف مستند قانونی احادیث ہی میں محدود رہنا چاہتے تھے اور باقی احادیث کو ان کے نزدیک ثانوی حیثیت حاصل تھی۔

فقہ کے دائرے میں شاہ صاحب کا خاص کارنامہ یہ تھا کہ مسلمہ فقہی دبستانوں کے اندر جو اختلافات یا نزاعات تھیں، اُن میں مطابقت و موافقت کے پہلو پیش کر دیے۔ چنانچہ انھوں نے اپنے رسالے "انصاف فی بیان سبب الاختلاف" میں واضح کر دیا کہ مفروضہ اختلافات حقیقی نہیں نمائشی ہیں اور یہ حقیقت ہر اُس شخص پر واضح ہو سکتی ہے جو ان معاملات کو اصل سرچشمہ قانون یعنی احادیث کی بنا پر طے کرے گا۔ احادیث کو اسلامی قانون کا سرچشمہ قرار دے کر نہ انھوں نے محض فقہی استخراج کے مسلمہ طریقے سے علیحدگی اختیار کی بلکہ علم حدیث کے لیے ایک زبردست تحریک بھی پیدا کر دی اور اس نئے دبستان کا راستہ بتا دیا جو اہل حدیث کا طریقہ کہلاتا ہے یعنی وہ دبستان جو فقہ کو چھوڑ کر اسلامی قانون کے مطابق ہر معاملے کے لیے احادیث کی رہنمائی تلاش کرتا ہے۔

ساتھ ہی شاہ ولی اللہ نے تصوف کے دو حریف سلسلوں میں مصالحت کی کوشش کی ایک وجودی (وحدۃ الوجود) سلسلہ جو عربی کے اثر سے پیدا ہوا، دوسرا سلسلہ جو شیخ احمدؒ سرہندی کے پیرووں پر مشتمل تھا۔[1] وجودی سلسلہ خالق و مخلوق کی وحدت کا قائل تھا۔ دوسرے سلسلے کا نقطہ نگاہ وہی تھا جو عام طور پر مانا جاتا تھا یعنی خالق و مخلوق الگ الگ ہیں۔[2] شاہ ولی اللہ نے واضح کیا کہ ان میں فرق فروعی ہے اور گہری نظر سے دیکھا جائے تو دونوں میں مشترک پہلو زیادہ ہیں۔ ظاہر ہے کہ شاہ صاحب مختلف دبستانوں اور سلسلوں کے تفرقے سے بہت پریشان تھے خواہ ان کا تعلق فقہ سے تھا یا تصوف سے یا ان فرقہ وار

---

[1] جیساکہ پہلے بتایا جا چکا ہے وحدت الوجود کے مقابلے میں شیخ احمد سرہندیؒ نے وحدت الشہود کی تعبیر پیش کی تھی، اس لیے "وجودی" کے مقابلے میں ان کے نقطہ نظر کو "شہودی" کہا جاتا ہے۔

[2] عوام کی تعبیرات اس سلسلے میں معتبر نہیں مانی جا سکتیں لیکن ابن عربی کے مسئلہ وحدت الوجود کی شرح جو فاضل مضمون نگار نے یہاں اور اس سے پیشتر فرمائی نظر ثانی کی محتاج ہے اہل علم و نظر کی تعبیر اس سے مختلف ہے۔

...اعات سے جو مسلمانوں کے معاشرے کے لیے مصیبت کا باعث بن چکی تھیں۔ وہ اس
...اش میں تھے کہ اتحاد و یک جہتی کا کوئی ایسا گر مل جائے جو مسلمانوں کو اُن کے اصل مقصد اور
...صب العین کی راہ پر لگا دے یعنی وہ مومنوں کی ایک ایسی جماعت بن جائیں جو روحانی مقاصد
...کے وحدت کے جذبے سے معمور ہو۔

یہی جذبہ اتحاد تھا جس کے زیر اثر شاہ صاحب نے اسلام کے سیاسی نظریے
...کے متعلق ایک کتاب لکھی[1] اور شیعہ فرقے کے دعاوی کو رد کر دیا۔ اس کتاب کی اہمیت
...اصل پہلو یہ ہے کہ شاہ صاحب کے نزدیک اسلام ذاتی و انفرادی وفاداری پر زور نہیں
...تا۔ یہ ایک تحریک ہے جس میں مقاصد کے ساتھ وفاداری کو فیصلہ کن عامل مانا جاتا ہے
...اس نکتے پر زور دینے کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ شیعہ حضرات نے ابتدا ہی سے
...ب کو ذاتی و انفرادی شکل دے دی تھی اور حضرت علیؓ کے خاندان سے وفاداری
...زور دینے کا مطلب یہی تھا۔ اس کا منطقی نتیجہ یہی ہو سکتا تھا کہ اسلامی ملّت و جماعت
...کے تمام دوسرے اجزا کی مذمت کی جاتی جن کا عقیدہ یہ تھا کہ رسول پاک صلعم کی جانشینی
...پ کے خاندان ہی کا حق نہیں۔

گویا شاہ ولی اللہ کی اس نہایت اہم تصنیف میں نظریہ مذہب فطری کے
...یم موجود تھے جنھیں آگے چل کر سر سید احمد خاں نے نشو و نما دی اس میں انقلابی اشتراکیت
...کے مبادی پائے جاتے تھے جن سے مولانا عبید اللہ سندھی نے کام لیا۔ مولانا عبید اللہ
...ہ ولی اللہ کے انتھک شارح تھے اور پاکستان کی تحریک کے وقت ایک بڑے انقلابی
...ر تھے۔ اس کتاب میں شاہ صاحب نے پہلی مرتبہ اسلام کا انقلابی تصور پیش کیا ہے۔
...ستے ہیں ابتدائی زمانے کی مجلسی تنظیم مجلسی زندگی کے چھوٹے چھوٹے گروہوں سے
...روع ہوتی ہے اور تہذیب تک نشو و ارتقا میں اسے چار منزلوں سے گزرنا پڑتا
...ہے۔ پہلے دور میں انسان حیوانی زندگی سے اوپر اٹھ کر بنیادی ضرورتیں پوری کرنے کے

[1] اشارہ شاہ صاحب کی مشہور کتاب "ازالۃ الخفا" کی طرف ہے۔

لیے اوزار کا استعمال کرتا ہے۔ جب ابتدائی اقتصادی ضرورتوں کو پورا کرنے میں مہار
پیدا کر لیتا ہے تو مجلسی تنظیم کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے۔ اس میں دیہات اور منڈیا
وجود پذیر ہوتی ہیں۔ تیسرا دور شہری زندگی کا ہے جس کے لیے مجلسی تنظیم کا اعلیٰ د
درکار ہوتا ہے۔ اسی دور میں قانون، نظم اور حکومت پیدا ہوتی ہیں جن کے ذریعے
مجلسی تنظیم کی حفاظت کے لیے اخلاقی اور قانونی تحفظات سے کام لیا جاتا
یوں اخلاق رسوم کی جگہ لے لیتے ہیں۔ آزاد شہروں اور چھوٹی سلطنتوں کے نشو
سے سرحدی کش مکش، شہری رقابتیں اور لڑائیاں شروع ہو جاتی ہیں یہ حالات تنظ
ترقی کے چوتھے دور کو ناگزیر بنا دیتے ہیں۔ اس میں بین الاقوامی قانون نشوو ارتقا
ہے۔ اور بین الاقوامی ادارات کے ذریعے سے مشکلات کا حل نکالا جاتا ہے۔

چوتھے دور ہی میں مذہب کو اولیت حاصل ہوتی ہے اس لیے کہ شہروں
دولت مند طبقوں کی فراوانی مال و ثروت اور وسیع فرصت کے باعث شہری زند
لوگوں کو ترغیبات کا تختۂ مشق بنا دیتی ہے۔ جب مجلسی بیماریاں بڑھتی ہیں اور نچ
طبقوں سے ناجائز فائدہ اٹھانے کا سلسلہ وسیع ہوتا ہے تو مذہبی اخلاق کی ضرور
تسلیم کی جاتی ہے اور مذہبی تعزیرات جاری ہوتی ہیں۔ شاہ ولی اللہ کے نزدیک اس
کا ظہور انسانی ارتقا کے چوتھے دور میں اس وقت ہوا جب رومی اور ایرانی تہذیبوں
عالم انسانیت کی طبعی مساوات کو کچل کر رکھ دیا تھا اور دولت مندوں کے ہاتھوں غر
طبقوں کی لوٹ کھسوٹ کا سلسلہ انسانوں کی بہت بڑی تعداد کے لیے ناقابلِ برداش
بن چکا تھا۔ رسول اللہ صلعم کی حیاتِ طیبہ کا اصل مدعا یہ تھا کہ رومی اور ایرانی اوضاع جی
کو تباہ کر کے ان کی جگہ ایک عادل مجلسی و اقتصادی نظام جاری کر دیا جائے۔

غرض شاہ ولی اللہ کا تصورِ اسلام شخصیتوں پر نہیں بلکہ مقاصد پر مبنی ہے۔ ان
تحریرات میں اسلام نے ایک مجلسی و مذہبی تحریک کی شکل اختیار کر لی جو انسان کی فلا

...یات کی پیداوار تھی۔ ساتھ ہی ان کے تصورات میں عالم گیری اور آفاقیت کا رنگ پایا
...ہے، جو ایسے آدمی کے لیے یقیناً حیرت انگیز سمجھنا چاہیے جسے ان کا سا زمانہ اور ان کا
...ول میسر تھا۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ اسلام کے حلال و حرام اور مباحات و ممنوعات
...ثالیں دوسرے معاشروں کے لیے ہیں اوامر و نواہی میں ملتی ہیں، اس لیے کہ انسان
...لاقی حس تمام مذہبوں اور معاشروں میں یکساں رہی ہے، یہ بھی فرماتے ہیں کہ اسلام
...نیز یہ کہ تعزیری قوانین عربوں کے قبائلی معاشرے کی ضروریات سے پیدا ہوئے اور یہ عربوں
... قومی جذبات پر مبنی ہیں، وہ اس عام غلط فہمی کی تردید کرتے ہیں کہ مذہبی قوانین کو انسان
...ضرورت سے کوئی علاقہ نہیں۔ اس کے برعکس مذہبی اور اخلاقی معلم کو طبیعت کے
...برابر قرار دیتے ہیں، جو اپنے مریضوں کی غذا پر اس لیے پابندیاں لگا دیتا ہے کہ ان کی بیماریوں
...ج کرے۔

شاہ ولی اللہ کا سیاسی اور ذہنی نقطہ نگاہ اس تحریک کی شکل میں بار آور ہوا ہے جسے
...سے وہابی تحریک کہا جاتا ہے۔ اس تحریک کے رئیس سید احمد بریلوی تھے (شہادت
...ء، ۱۸۳۱ء) جو ولی اللہی خاندان کے مرید تھے، لیکن بہت جلد روحانی اور سیاسی
...ت کا درجہ حاصل کر لیا۔ سید صاحب نے شمالی ہند کا دورہ کیا اور بہت سے مسلمان اُن کی
...کھنچ آئے۔ شاہ ولی اللہ کے خاندان کے افراد بھی سید صاحب کے ساتھ تھے۔ پھر
...صاحب مکہ معظمہ گئے لیکن وہاں وہابیوں سے کوئی ربط ضبط پیدا نہ کر سکے، اس لیے کہ اس
...نے میں مکہ معظمہ کے دروازے وہابیوں پر بند تھے۔ سید صاحب نے ان رسوم کے
...لے میں بھی کوئی دقیقہ سعی اٹھا نہ رکھا جو مسلمانوں میں عام طور پر پھیلی ہوئی تھی مثلاً پیر پرستی
...ور دوسری رسوم جن کی تائید کے لیے کوئی مذہبی جزیہ موجود نہ تھا۔ اس زمانے میں
...اب سکھوں کے ماتحت تھا جنھوں نے مسلمانوں کے لیے زندگی اجیرن بنا رکھی تھی، سید احمد
...ر شاہ اسماعیل نے (جو شاہ ولی اللہ کے خاندان کے ممتاز فرد تھے) شمالی ہند کے مسلمانوں

میں سکھوں کا تختہ الٹ دینے کا زبردست جذبہ پیدا کر دیا جو مسلمانوں کو دبا رہے تھے
کے مذہب میں مداخلت کر رہے تھے۔ ابتدا میں پشاور اور ملحقہ اضلاع کے قبائیلو
مدد سے سید صاحب نے عارضی طور پر کامیابیاں بھی حاصل کر لیں اور بعد از ای قبا
ہی نے غداری کی جماعت میں چھوٹے چھوٹے مذہبی اور فقہی اختلافات پر جھگڑے
ہو گئے۔ اس میں تحریک کو سخت نقصان پہنچا۔ سید صاحب اور ان کے پیرووں نے
۱۸۳۱ء میں شہادت پائی[1]، لیکن یہ تحریک ہندوستان کے دوسرے حصوں میں پھیل گ
خصوصاً بنگال میں جہاں انگریزوں کے ساتھ تصادم کی نوبت بھی آئی[2]۔ اگرچہ اسے قوت
اور اقتصادی دباؤ کے ماتحت ختم کر دیا گیا۔ تاہم اس کی یاد مدت تک دلوں میں تازہ ر
غدر میں مسلمانوں کی تحریک آزادی کو انگریزوں نے آخری مرتبہ ناکام بنا دیا تو شکست
جماعت کے بچے کھچے اجزا نے شاہ ولی اللہ کی تحریک کو از سر نو زندہ کرنے کی کوشش
اور آزادیٔ اسلام کے لیے نئی تحریک کی داغ بیل ڈال دی یعنی انھوں نے دیوبند میں ایک
مذہبی و تعلیمی ادارے کی بنیاد رکھی، جس سے بہتیرے ممتاز مذہبی رہنما پیدا ہوئے اور اب

---

[1] سید صاحب کی تحریک، اس کے مقاصد اور کارکردگی کے متعلق جو کچھ تحریر فرمایا گیا ہے وہ نظر ثانی کا محتاج ہے
کا اصل نصب العین ہندوستان کو اجنبی تسلط سے پاک کرنا تھا اور وہ سکھوں سے کہیں زیادہ انگریزوں کے تسلط کو مسلمانو
مستقبل کے لیے خطرناک سمجھتے تھے جیسا کہ ان کی واضح اور روشن تحریرات سے ثابت ہوتا ہے۔ سکھوں سے اس لیے
ہوا کہ سید صاحب نے مختلف مصلحتوں کی بنا پر سرحد کو مرکز جہاد بنایا اس میں سکھ سب سے پہلے آ گئے۔ بلاشبہ سکھ مسلم
پر ظلم کر رہے تھے لیکن انگریزوں کی روش اصولاً کم بری نہ تھی۔ [2] یہ غالباً تیتو میر یعنی میاں نثار علی کے واقعے کی طرف اشارہ
اس کی تفصیل پیش کرنی چاہیے تھی تیتو میر حق ناشناس ہندو زمینداروں کے ظلم و جور کا فریادی تھا۔ انگریزوں نے زیادہ
اور جب وہ خود ظلم و جور کے انسداد کے لیے اٹھا تو انگریزی قوت نے اسے تباہ کرنے پر تل گئے اور تباہ کر دیا۔ یہ واقعہ
معنی میں سید صاحب کی تحریک کا حصہ نہ تھا۔ البتہ یہ درست ہے کہ تیتو میر سید صاحب کا مرید و معتقد تھا۔ اس سے بھی یہی ثابت
ہے کہ سید صاحب انگریزوں کو مسلمانوں کا سخت دشمن سمجھتے تھے۔

ہندوستان میں لشتم پشتم زندگی کے دن گزار رہا ہے، دیوبند دراصل آزادی کی نئی تحریک کے لیے تیار کرنے کا مقام تھا۔ تعلیمی سرگرمیوں کو اس اصل مقصد کے مقابلے میں ثانوی حقیقت تھی۔ آگے چل کر یہ درس گاہ راسخ العقیدہ مسلمانوں کا مرکز بھی بن گئی اور یہاں سے ایسے لیڈر بھی اُٹھے جنھوں نے انگریزوں سے اقتدار چھیننے کے لیے ہندوؤں کا ساتھ دیا العقیدہ مسلمان انگریز دشمنی میں اس درجہ مستحکم تھے کہ وہ ابتدا میں مسلم لیگ کی سیاست ساتھ ہم آہنگ نہ ہو سکے جس پر انگریزوں کی حمایت کا شبہ کیا جاتا تھا، تاہم ہندوؤں نہ داری کے بڑھتے ہوئے خطرے کے پیشِ نظر مذہبی رہنماؤں کے جس گروہ نے بڑھ کر تحریک پاکستان کی حمایت کی اسے غیر معتدبہ نہیں کہا جا سکتا۔
شاہ ولی اللہ کا دبستان اپنے ابتدائی موقف کے سراسر برعکس مذہبی قدامت پسندی رف جھکتا گیا ــــــ زیادہ تر اس لیے کہ وہ مغربیت کا مخالف تھا ــــــ لم کا وہ عام قدامت پسند مسلمانوں کا جزو بن گیا۔ عین اس موقع پر مغربیت کے حامی انوں کا ایک گروہ سر سید احمد خاں کی قیادت میں منظم ہو رہا تھا۔

برطانوی دور اور تقسیم

۱۲۷۴ھ / ۱۸۵۷ء سے آخر تک

برطانوی حکومت کے ابتدائی دور میں ہندوستان کے مسلمانوں کو اقتصادی، تعلیمی، سیاسی اعتبار سے سخت نقصان پہنچا۔ نئے حاکم اُنھیں شبہ کی نظروں سے دیکھتے تھے نودان کے ذہنوں میں اپنی سیاسی، علمی اور ثقافتی برتری اس مضبوطی سے جاگزیں تھی۔ بدلے ہوئے حالات کو قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھے، مسلمانوں کو تو سیاسی اقتصادی لیمی دائروں میں نقصان پہنچا، ہندوؤں نے اُس کے مقابلے میں ہمہ گیر فوائد حاصل یے، کیونکہ انھوں نے حقیقت پسندی کے نقطۂ نگاہ سے نئے نظام کو قبول کر لیا تھا

اور وہ ہر غلط اور بے بنیاد احساسِ فخر سے بالکل آزاد تھے۔ انگریزوں نے بھی مسلمانوں
مقابلے میں ہندوؤں کی سرپرستی کی۔

انگریزوں سے مسلمانوں کے تعاون کا نیا دور سر سید احمد خاں سے شروع ہو
مدرستہ العلوم علی گڑھ کے بانی تھے یہ مدرستہ العلوم اب یونیورسٹی کے درجے تک پہنچ چکا
اور مسلم یونیورسٹی کے نام سے موسوم ہے۔ اس کے بعد مغربی تعلیم کے حصول اور مغ
کے قبول میں مسلمانوں کی تعداد برابر بڑھتی چلی گئی باوجودیکہ اُن قدامت پسند مسلمانوں
اس کی سخت مخالفت کی جو دورِ حاضر کی ہر چیز کو لعنت سمجھتے تھے۔ اُس وقت تک
اقتصادی اعتبار سے بہت مستحکم ہو چکے تھے، تعلیمی اعتبار سے وہ مسلمانوں کے مق
میں بہت آگے نکل چکے تھے۔ لہٰذا اُنھوں نے قدامت پسند مسلم طبقوں کی ہمدردی
امداد حاصل کرنے میں کوتاہی نہ کی، غرض یہ تھی کہ برطانیہ کے خلاف سیاسی جدوجہد
سلسلے میں اُن کی حمایت سے فائدہ اُٹھایا جائے اور اس طرح اپنے لیے سیاسی ا
کا راستہ صاف کیا جائے[1]۔ لیکن مسلمانوں کی بہت بڑی اکثریت سر سید کے زیرِ قیادت
ہندوؤں کے اصل مقاصد کے متعلق گوناگوں شبہات میں مبتلا تھی خصوصاً اس بنا پر ک

[1] یہاں فاضل مضمون نگار کو تھوڑی سی غلط فہمی ہوئی ہے۔ مسلم علماء کی ایک جماعت سر سیدؒ سے بہت پہلے انگریزی اقتدار کی دشمن
آ تی تھی اس کے زیادہ تر افراد سید احمد شہید بریلوی کی جماعت سے تعلق رکھتے تھے۔ معلوم ہے کہ وہ لوگ سید صاحب کی جماعت کے
باقیات کو مسلسل مالی امداد بھی دیتے تھے جو ہندوستان کی سرحد پر بیٹھے تھے اور وقتاً فوقتاً لڑنے والے آدمی بھی وہاں بھیج
تھے۔ ان لوگوں کی جھڑپیں برابر انگریزوں سے ہوتی رہتی تھیں۔ سالہا سال تک انگریز ایسے مسلمانوں کے خلاف مق
چلا چلا کر انھیں کالا پانی بھیجتے رہے کانگریس میں جو مسلمان سرگرمی سے شریک ہوئے وہ عموماً قدامت پرست نہ تھے
سر بدر الدین طیب جی اور ان کا خاندان نواب سید محمد آزاد۔ بلا شبہ علماء کی بھی ایک بڑی جماعت کانگریس کی حامی تھی جنھیں فاضل
غالباً قدامت پسندوں میں شامل کریں گے اس لیے کہ وہ انگریزی اقتدار کے مخالف اور آزادی کے حامی تھے نہ اس
کہ وہ قدامت پسند تھے۔

ہندوؤں کے نقطۂ نگاہ میں فرقہ وار رنگ پیدا ہو چکا تھا اور وہ اپنا پرانا دورِ اقتدار تازہ کرنے کے خواہاں نظر آتے تھے۔[1] سرسید ان ہی وجوہ کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے انڈین نیشنل کانگرس میں مسلمانوں کی شرکت کے خلاف تھے اور کانگرس برطانیہ کے ماتحت ہوم رول کے لیے جدوجہد کر رہی تھی۔[2]

پہلے طرابلس پر اٹلی نے حملہ کیا، پھر بلقانی ریاستوں نے ترکی کے خلاف لڑائی شروع کر دی، بالآخر پہلی جنگ عظیم کے بعد ترکی سلطنت کے حصے بخرے کر دینے کا خطرہ سامنے آ گیا۔ ان واقعات نے انگریزوں اور مسلمانوں کے درمیان تعاون کے اُس تصوّر پر سخت ضرب لگائی جس کا نقشہ سرسید احمد خاں نے تیار کیا تھا۔ ترکوں اور عربوں کے متعلق برطانیہ کی روش سے مسلمانوں کے احساسات اس درجہ مجروح ہو چکے تھے کہ وہ اپنی سیاسی جماعت مسلم لیگ سے بھی روز افزوں تعداد میں الگ ہو کر ہندو نیشنل کانگرس میں شامل ہوتے گئے۔ مسلمانوں کی حمایت اور اُن کی قربانیوں کی بدولت انڈین نیشنل کانگرس نہایت طاقت ور سیاسی جماعت بن گئی اور انجام کار اُس نے صوبائی خود مختاری حاصل کر لی۔[3] ۱۹۳۷ء میں کانگرس نے ہندوستان کے گیارہ صوبوں میں سے سات میں اپنی وزارتیں

---

[1] جس دور کے حالات بیان کیے جا رہے ہیں اُس دور میں کانگرس نے وہ سرگرمیاں شروع نہیں کی تھیں جو انگریزی اقتدار سے نجات حاصل کرنے کے لیے بحیثیت جماعت اختیار کی گئیں۔ [2] یہاں سوراج کہنا چاہیے تھا۔ ہوم رول ایک مستقل تحریک تھی جو پہلی جنگ عظیم کے دوران میں مسز اینی بسنٹ اور بال گنگا دھر تلک نے شروع کی تھی اور دوسرے ہندو اور مسلمان اس کے حامی بن گئے تھے۔ سرسید کے زمانے میں ایسی کسی تحریک کا وجود نظر نہیں آتا، البتہ سرسید مختلف وجوہ سے کانگرس میں شرکت کے مخالف تھے، ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اگر خود مختاری مل گئی تو مسلمانوں کے مقابلے میں ہندو کی تعداد زیادہ ہو گی۔ ایک وجہ یہ تھی کہ مسلمان جوشیلی قوم ہیں، جب کسی شے کے خلاف ہو جاتے ہیں تو مخالفت میں انتہائی مظاہرے پر اتر آتے ہیں۔ سرسید کی رائے تھی کہ غدر میں تباہی کے بعد مسلمانوں کے لیے تعمیرِ نو کا بندوبست کیا جا رہا ہے اگر اس موقع پر اشتعال دلا دیا گیا تو جو کام ہو چکا ہے وہ بھی ختم ہی ہو جائے گا۔ [3] صوبائی خود مختاری صرف کانگرس نے نہیں، تمام جماعتوں نے مل کر حاصل کی۔ ان میں برابر مسلم لیگ، مسلم کانفرنس، خلافت جیسی جماعتیں شامل تھیں۔

بنائیں، لیکن کانگرسی اقتدار کے مختصر سے دور میں اُس کے حامی مسلمانوں کی آنکھوں سے
پردے اُٹھ گئے، نیز اس نے اسلامی ثقافت کو تباہ کرنے اور اپنی جداگانہ قومیت کو
مستحکم بنانے کی جو کوششیں کیں، ان سے بیزار ہو کر مسلمانوں نے مُسلم لیگ کی حمایت
شروع کر دی۔ جب مسلمانوں پر واضح ہو گیا کہ اقلیت کے حقوق پر اکثریت کی دراز دستی
کے سلسلے میں آئینی تحفظات زبردست فرقہ پرست ہندو قوت کے مقابلے میں کچھ
فائدہ نہیں پہنچا سکتے، تو وہ پاکستان کے سرگرم حامی بن گئے جس کا مدعا یہ تھا کہ مسلمانوں
کے لیے ہندوستان کے شمال مشرق اور شمال مغرب کے واضح اکثریت والے
علاقوں میں اسلامی وطن کا بندوبست ہو جائے۔ پاکستان کے ابتدائی تصور سے اُس
کی تکمیل تک راستہ بے شمار مشکلات سے پٹا ہوا نظر آتا تھا تاہم اصل مطالبے کی
حقانیت ایسے پختہ مبانی پر قائم تھی کہ جب برطانیہ ہندوستان سے دست بردار ہو
وہ ہندوؤں کی مخالفت اور اپنی نارضامندی کے باوجود پاکستان قبول کر لینے پر مجبور
گیا اور یہ نیا ملک ۱۴۔ اگست ۱۹۴۷ء، ۱۳۶۶ھ) کو حقیقتِ ثابتہ بن گیا۔

مغربی قومیں دو سو سال پیشتر ہندوستان کے اُفق پر نمودار ہوئیں تو وہ اپنے ساتھ
ایک نئی قوت لائی تھیں جس سے ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کو سابقہ پڑا۔ ہندو اسلامی
توحید سے پہلے ہی متاثر تھے، اُسی کے نتیجے میں سکھ دھرم ایسی زبردست تحریکیں پیدا
ہوئیں جس کا مقصد یہ تھا ہندوؤں اور مسلمانوں کو اکٹھا کر دیا جائے۔ اسلامی اثرات میں
اب مسیحیت اور مغرب کے اثرات کا اضافہ ہو گیا۔ اس سے ہندوؤں میں برہمو سماج کی
تحریک پیدا ہوئی جس کے بانی رام موہن رائے[1] تھے۔ ہندوؤں کی طرح مسلمانوں نے

[1] جس حد تک واقعات کا تعلق ہے رام موہن رائے کی تحریک مغربی اثر کا نہیں صرف اسلامی توحید کے اثر کا نتیجہ تھی۔ رام موہن رائے نے پٹنہ میں جس استاد سے تعلیم پائی تھی اُس کی صحبت میں قرآن مجید پڑھا اور وہ اسلام کی توحید سے بہت متاثر ہوا۔ یہی توحید اصل میں برہمو سماج کی بنیاد بنی۔ آگے چل کر مختلف مذاہب میں مصالحت کے پہلو شامل کر لیے گئے۔

...ں اس نئی قوت کا اثر محسوس کیا۔ مسلمانوں میں رام موہن رائے کا مثنیٰ سر سید احمد خاں
...یے[۱]۔ جس طرح رام موہن رائے نے کلکتہ میں ایک ہندو کالج بنایا تھا اسی طرح سر سید
...مد خاں نے بہ مقام علی گڑھ ۱۲۹۲ھ (۱۸۷۵ء) میں اسلامی دار العلوم کی بنیاد رکھی
...ی دار العلوم نے پاکستان کے لیے جدوجہد کی تحریک میں نہایت اہم کردار ادا کیا۔ ان
...وں اداروں میں آزاد خیالی کی ابتدا ہو گئی تھی۔ پھر رام موہن رائے کی طرح سر سید بھی مسیحی
...ریوں اور مصنفوں سے مناظروں میں الجھ گئے اور آہستہ آہستہ ایک فطری مذہب کا
...ودار تعا، ہوا جس کی بنا پر قدامت پسند مسلمانوں کے لیڈروں نے یہ الزام لگایا کہ
...سید خدا کی جگہ فطرت کی پوجا کرتے ہیں۔ سر سید نے علی گڑھ میں ممتاز قابلیت کے
...ملاء کا ایک گروہ جمع کر لیا تھا جو اسلام کے خلاف صرف پادریوں کے حملوں ہی کا
...ب نہیں دیتے تھے، بلکہ قدامت پسند مسلمانوں کے نقطۂ نگاہ کو بھی بدلنے کے لیے
...شاں رہتے تھے، جس کی وجہ سے عیسائیوں کو اسلام پر حملوں کا موقع ملتا تھا۔

سر سیدؒ کی نہایت اہم تصنیف وہ خطبات ہیں جو انھوں نے سر ولیم میور کی
...اب کے جواب میں مرتب کیے تھے[۲]۔ وہ پہلے خطبے میں فرماتے ہیں کہ بعض فضلاء نے
...ہب کو طبیعت کے مشابہ قرار دیا ہے جو کسی شئے کو خود نہ امرت بتاتا ہے اور نہ
...ر ہلاہل ٹھہراتا ہے، بلکہ نسخہ لکھتے وقت دواؤں کے ان اثرات و خواص کو پیش نظر
...ھتا ہے جو قدرت نے پہلے سے ان میں رکھ دی ہیں۔ سر سیدؒ افسوس فرماتے ہیں کہ
...ہ ولی اللہ نے یہ نقطۂ نگاہ رد کر دیا لیکن مجھے اس مثال کی حقانیت پر پورا یقین ہے۔

---

[۱] ...سر سید احمد خاںؒ کو رام موہن رائے کا مثنیٰ قرار دینا موزوں طریق بیان نہیں اور محض اتنی مشابہت کافی نہیں کہ سر سید نے ...رام موہن رائے کی طرح ایک درس گاہ بنائی تھی۔ [۲] سر ولیم میور کی کتاب حیات محمد صلعم (Life of Mahommed) شائع ہوئی تو اس نے بہت شہرت پائی۔ سر سیدؒ نے اس کے جواب میں بڑی محنت سے خطبات احمدیہ ...ب کی تھی جو بارہ خطبوں پر مشتمل ہے۔

میری رائے یہ ہے کہ اسلام کی اصطلاح اس مجموعۂ احکام کے لیے استعمال نہ ہونی چاہیے جنھیں اب مسلمانوں نے مذہبی احکام مان رکھا ہے وہ مجموعہ من حیث المجموع حقیقی مذہبِ اسلام کہلانے کا مستحق نہیں، اصل اسلام اُن واضح اور مخصوص احکام پر مشتمل ہے جنھیں شارع علیہ اسلام نے صاف بیان فرمایا ہے اور اُن کی تعبیر میں کسی کو بھی اختلاف نہیں۔ یہ احکام دو قسم کے ہیں ایک وہ جو اصل احکام ہیں اور انھیں مذہب کی رُوح اور جان سمجھنا چاہیے اور قانون کے عین مطابق ہیں۔ دوسرے وہ جو اُن اصل احکام کی حفاظت اور اُن کے بقا و قیام کے لیے ہیں۔

چھٹے خطبے میں سر سیدؒ نے حدیث کے متعلق اپنے موقف کی وضاحت کی وہ فرماتے ہیں کہ صحیح حدیث کی تین قسمیں ہیں، اوّل وہ جو قرآن کے عین مطابق ہیں، دوم وہ جو قرآنی آیات کی توضیح و تشریح کرتی ہیں تیسری وہ جو ایسے احکام پر مشتمل ہیں کہ اُن کا کوئی ذکر قرآن مجید میں نہیں۔ سر سیدؒ کہتے ہیں کہ آخری قسم کے متعلق خود رسول اللہ صلعم کا ارشاد موجود ہے کہ قرآنِ مجید کے سوا میری کسی بات کو خدا کی طرف سے نہ سمجھا جائے۔ آپ کا ارشاد ہے کہ وحی صرف وہ ہے جس کا تعلق تبلیغِ رسالت سے ہے، مثلاً اخلاقی اصول یا بہشت و دوزخ کے متعلق بیانات۔ مبادا سمجھ لیا جائے کہ سر سیدؒ نے احادیث کو یک قلم مسترد کر دیا یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ رسول اللہ صلعم کی عاداتِ شریف یا مجلسی احوال کے متعلق جو حدیثیں ہیں، اُن کی خوب چھان بین کرنی چاہیے۔ اسی طرح ان احادیث کے بارے میں چھان بین کی تاکید کی، جو ملکی سیاست اور انتظامِ مدن سے تعلق رکھتی ہیں۔ سر سیدؒ کہتے ہیں کہ ہمیں صرف ان احادیث کو وحی سمجھنا چاہیئے جن کی نسبت یہ سمجھنے کے لیے کافی دلیل اور ثبوت موجود ہو۔

سر سیدؒ نے اس بات پر بھی زور دیا کہ مسلمانوں کو نیا علمِ کلام تیار کرنا چاہیے تاکہ مغربی تہذیب سے پیدا ہونے والے دہریانہ رجحان کا مقابلہ کیا جا سکے سنہ ۱۲۹۲ھ

۱۸۸۰ء میں سرسیدؒ نے قرآن مجید کی تفسیر لکھی اور اس میں اسلام کے متعلق قواعد و ضوابط کے مجموعے کی حیثیت میں جو تصور چلا آرہا تھا اُسے رد کر دیا۔ اس لیے کہ وہ علمی چھان بین کے سامنے نہیں سکتا۔ سرسیدؒ کا دعویٰ یہ تھا کہ علم کے کسی دائرے میں کتنی ہی نئی چیزیں پیدا ہو جائیں لیکن قرآن مجید کے ایک شوشے کو بھی جھٹلا نہیں سکتیں۔ اس تفسیر نے قدامت پسند طبقے میں ت ردِ عمل پیدا کیا اور انھوں نے اس کے جواب میں نئی تفسیریں لکھیں۔

سرسید نے مسیحی مبلغوں سے بھی مناظرے کیے تھے۔ اس سلسلے میں انھیں بائبل کی لکھنے کا خیال آیا، اس میں وہ کہتے ہیں کہ بہت سے علماے دین مثلاً امام بخاری کی رائے کہ یہودیوں اور عیسائیوں کے ہاتھوں عہد نامہ قدیم یا عہد نامہ جدید کی جو تحریف ہوئی اس کا یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ ان کی کتابوں کی عبارتیں بدل دی گئیں۔ اس پر بھی قدامت پسند حلقے میں وغضب کا طوفان برپا ہوا۔ وہ لوگ اس عقیدے پر پختگی سے قائم تھے کہ بائبل کی عبارتوں بدلی ہوئی ہے۔ وہ سرسید کے اس وجہ سے بھی مخالف تھے کہ موصوف ثابت کرنے کی کوشش کر رہے تھے کہ حقیقی مسیحیت حقیقی اسلام سے زیادہ مختلف نہیں، مسلمانوں کے مسیحی مشنریوں نے بھی سرسیدؒ کی اس تفسیر کو پسند نہ کیا، کیوں کہ اس تعبیر کے مطابق عقیدۂ تثلیث رخ ہوتا تھا اور مسیحیوں پر یہ الزام لگتا تھا کہ انھوں نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نہ کیا۔

اس طرح سرسیدؒ نے مسلمانوں میں حدیث کے رد کا رجحان پیدا کر دیا اور ایسے دین پر دیا جو خالصتہً قرآن مجید پر مبنی ہو۔ اس رجحان کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایک دبستانِ فکر پیدا ہو گیا جو کے سوا دین کے ہر سرچشمے سے انکاری ہے۔ شاہ ولی اللہ نے مسلمانوں کی توجہ حدیث طرف منعطف کرائی تھی اور فرمایا تھا کہ فقہی فیصلوں کے مقابلے میں حدیث اسلامی قانون حقیقی سرچشمہ ہے، سرسید نے ایک قدم آگے بڑھ کر مسلمانوں کو براہِ راست قرآن مجید پر پہنچا دیا۔ سرسیدؒ نے مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان مفاہمت کے لیے بھی بڑا

کام کیا، مثلاً مضامین لکھے جن میں یہ ثابت کیا جاتا تھا کہ مسلمان عیسائیوں کا طعام کھا سکتے ہیں اور مجلسی معاملات میں اُن کے ساتھ تعاون کر سکتے ہیں۔ ایسے معاملات کے متعلق سرسید کا اُس وقت پر بحث کرنا بڑی مردانگی اور جرارت کا کام تھا جب مغرب کی سیاسی برتری کے باعث مسلمانوں کا جذبۂ فخر بہت بُری طرح مجروح تھا۔

اگرچہ سرسید راسخ العقیدہ مسلمانوں کو اپنا ہم نوا نہ بنا سکے لیکن انھوں نے وہ رجحان پیدا کر دیا جس سے سید امیر علی جیسے آزاد خیال آدمی بروے کار آے۔ سید امیر علی بھی اپنی کتاب "سپرٹ آف اسلام" (روح اسلام) میں اس قسم کے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ یہ امر قابل توجہ کا محتاج ہے کہ سید موصوف اپنے آپ کو نئے زمانے کا معتزلی قرار دیتے ہیں جن کا عقیدہ تھا کہ وحی اور عقل میں کوئی تصادم یا کش مکش نہیں۔

سرسید کے رفیقوں میں ایک ممتاز فرد مولانا شبلی تھے، جو مشہور مؤرخ گزرے ہیں۔ انھوں نے سیرت النبیؐ کے نام سے عالمانہ کتاب لکھی اور اسی طرح دوسرے مذہبی رہنماؤں کے حالات مرتب کیے مثلاً حضرت عمرؓ، امام ابو حنیفہؒ اور امام غزالی ——— اس طرح شاندار ماضی کے متعلق مسلمانانِ ہند کے احساس کو بیدار کیا۔ مولانا شبلی نے لکھنؤ میں دارالعلوم ندوہ کی بنا رکھی، جسے ایک حریف تعلیمی ادارہ سمجھنا چاہیئے[1] اس لیے کہ مولانا شبلی کے احساس کے مطابق سرسید مسلمانوں کو اصل مذہبی نقطۂ نگاہ سے بہت دور لے جا رہے تھے نیز اس لیے کہ مولانا شبلی کا خیال تھا، مسلمانوں کو عام تعلیم کے ساتھ ساتھ مذہبی تعلیم بھی دینی چاہیے۔ ندوہ میں انگریزی زبان کے علاوہ دورِ حاضرہ کے اور مضامین بھی پڑھائے جاتے تھے۔ لیکن یہ دیوبند کا مقابلہ نہ کر سکا جس کی بنیاد شاہ ولی اللہ کے معتقدین پہلے رکھ چکے تھے۔ دیوبند

[1] ندوہ کو علی گڑھ کالج کا حریف بتانا صحیح نہیں۔ علی گڑھ کالج کا مقصد صرف یہ تھا کہ مسلمانوں کو انگریزی تعلیم دے کر ملک کے نظم و نسق میں حصہ لینے کے قابل بنائے اور اسی پر مسلمانوں کا مستقبل موقوف تھا۔ ندوہ کا مقصد یہ تھا کہ ایسے عالم پیدا کرے جو دورِ حاضر کے تقاضوں سے پوری طرح آگاہ ہوں۔

مقابلے میں یہ کم قدامت پسند تھا، اس لیے کہ اس کے نصاب میں ایک حد تک سیکولر رنگ
تھا۔

شبلی کے رفیقوں میں مولانا ابوالکلام آزاد بھی شامل تھے جو بہت جلد ایک مشہور اور
بہت اہلِ قلم بن گئے۔ مولانا آزاد عربی اور فارسی کے فاضلِ اجل تھے۔ اور انھوں نے اردو
نہایت پُرتکلف اور مرصع اسلوبِ تحریر اختیار کیا۔ وہ کلکتہ میں دو ہفتہ وار اخباروں کے
رہے۔ پہلی جنگِ عظیم سے پیشتر یہ وہ زمانہ تھا جب بلقان میں لڑائیاں ہو رہی تھیں اور
نے طرابلس پر حملہ کیا تھا۔ ترکی کے خلاف یورپی حکومتوں کی روش کے باعث فضا مغربیت
مخالفت سے لبریز تھی۔ مسیحی طاقتوں نے ایسے طریقے اختیار کر رکھے تھے جن
ظاہر ہوتا تھا کہ وہ ترکی کی مخالفت کو صلیبیوں جیسے جوش و خروش کا رنگ دے رہے
لہٰذا یہ بالکل طبعی امر تھا کہ ہندوستان کے مسلمان اہلِ مغرب کی حمایت کے طور طریقوں سے
لگے جو سرسید اور اُن کے ساتھیوں کی تحریرات سے تیار ہوئے تھے۔ علی گڑھ بھی، جو
ں کی آزاد خیالی کا مرکز تھا، وقت کے مذہبی جوش و حمیت سے الگ نہ رہ سکا، مولانا

انے ابتدا میں "الہلال" نکالا تھا جو لائی ۱۹۱۲ء سے نومبر ۱۹۱۴ء تک جاری رہا اور جنگِ عظیم کے متعلق بعض مضامین
کے سلسلے میں دو ہزار کی ضمانت ضبط ہونے کے باعث بند ہو گیا اس لیے کہ آئندہ دس ہزار کی ضمانت طلب ہوئی تھی۔ پھر
۱۹۱۵ء میں مولانا نے "الہلال" کی جگہ "البلاغ" نکالا جو اپریل ۱۹۱۶ء میں اسی وجہ سے بند ہو گیا کہ مولانا کو صوبہ بنگال سے اخراج کا
اور وہ رانچی چلے گئے جہاں انھیں نظر بند کر دیا گیا۔ فاضل مقالہ نگار نے جس انداز میں لکھا اس سے یا تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مولانا بیک وقت
اخباروں کے ایڈیٹر تھے یا یہ ظاہر ہوتا ہے کہ دونوں اخبار پہلی جنگِ عظیم سے پیشتر نکل چکے تھے حالانکہ یہ دونوں باتیں صحیح
نا یہ بھی عرض کر دینا چاہیے کہ فاضل مقالہ نگار نے طرابلس پر اٹلی کے حملے کو دو جگہ پر جنگِ بلقان سے موخر رکھا ہے
لی کا حملہ زماناً مقدم تھا۔
ا کے لیے کوئی وجہ میری سمجھ میں نہیں آتی۔ مسلمانوں میں مذہبی حمیت یقیناً مولانا نے پیدا کی لیکن اگر اس کا استعمال کسی جگہ صحیح
س کی ذمہ داری مولانا پر کیوں عائد ہونی چاہیے؟

آزاد جو اپنی وفات سنہ ۱۳۷۷ھ (سنہ ۱۹۵۸ء) تک حکومتِ ہند کے وزیر رہے مسلمانوں کے اتحاد اسلام کے زبردست داعی بن گئے۔ مولانا کی ابتدائی تحریرات نے ہندوستان کے مسلمانوں پر گہرا اثر ڈالا۔ قرآن مجید کے مطالعے کا زبردست ذوق ان میں پیدا ہو گیا اور مولانا نے سب سے پہلے وہ سیاسی تصورات واضح کیے جو قرآن مجید پر مبنی تھے۔ آگے چل کر مسلمانوں میں غلبہ کے خلاف جو رجحان پیدا ہوئے یا اُن میں مذہبی ذکاوت کی جو حس رونما ہوئی جس کے اثر ہمیشہ خوش گوار نہ تھے، ان کی ذمہ داری بھی مولانا پر ہی تھی۔ اگرچہ مولانا نے آگے چل کر اتحاد کی دعوت چھوڑ دی اور وہ ہندوستانی قومیت اور سیکولر سیاسیات کے زبردست حامی ہو گئے لیکن اُن کی ابتدائی تحریرات مسلمانوں کو اس درجہ متاثر کر چکی تھیں کہ بعد ازاں وہ خود بھی اُس راستے سے اُنھیں ہٹا نہ سکے، جس پر اُنھیں چلانے کے لیے وہ خود بھی ذمہ دار تھے۔

مولانا آزاد کی آخری تصنیف قرآنِ مجید کی نامکمل تفسیر ہے جس میں اُن کا اسلوبِ تحریر درجۂ کمال تک پہنچ گیا، لیکن اُن کی سابقہ تحریرات کے برعکس یہ تفسیر اُن کی غیر ہر دل عزیزی میں اضافے کا موجب بن گئی کیوں کہ اُنھوں نے اسلام اور دوسرے مذاہب کے لیے مشترک بنیاد دریافت کرنے کی کوشش کی تھی۔ یہ امر اسلامی جذبات کے لیے باعثِ اذیت ثابت ہوا کیونکہ اس طرح اسلام کو دوسرے مذاہب کی سطح پر پہنچا دیا گیا تھا[1]۔

ڈاکٹر سر محمد اقبال (وفات سنہ ۱۳۵۷ھ / سنہ ۱۹۳۸ء) عہدِ حاضر کا واحد فلسفی تھا جو دنیائے اسلام

---

[1] ترجمان القرآن کو تفسیر کہنا تو غالباً مناسب نہ ہوگا، لیکن یہ امر تعجب انگیز ہے کہ اس میں اسلام اور دوسرے مذاہب کے درمیان اشتراک کا کوئی پہلو پیدا کیا گیا تھا۔ معاملہ صرف اتنا ہے کہ سورۂ فاتحہ کی تفسیر کے سلسلے میں انبیا و رسل کی دعوتوں کی بنیادی وحدت میں توحید کو نمایاں کیا گیا تھا جیسا کہ قرآن مجید نے خود واضح کیا ہے۔

پھر اس باب میں مولانا سے مشورہ بھی کیا گیا اور اُنھوں نے پوری توضیح فرما دی بلکہ ایک سوال کے جواب میں تصریح بھی فرما دی کہ شریعتِ اسلام کے آخری و قطعی ہونے کی تفصیل سورۂ احزاب کے ضمن میں واضح ہو رہی جو اس کا اصل موقع اور محل ہے۔

پیدا کیا۔ یہ عجیب بات ہے کہ مولانا آزاد جو مذہبی تعلیم کی پیداوار تھے سرگرم نیشلسٹ بن
اور اُن کا نقطۂ نگاہ سیکولر ہو گیا، اقبال جو مغربی تعلیم کی پیداوار تھے اتحادِ اسلام کے آتش
عی بنے اور اُنھوں نے ابتدائے اسلام کے مذہبی اور سیاسی اخلاق کی طرف مراجعت
عوت دی۔ اقبال کے اشعار مذہبی جذباتیت سے لبریز ہیں جو اس عہد کے اسلامی فکر
موصیت رہی۔ اُنھوں نے اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہے خصوصاً فارسی
ں لیے کہ وہ پوری اسلامی دنیا کو براہِ راست خطاب کرنا چاہتے تھے، اُن کی فارسی
ں میں "اسرارِ خودی" اور "رموزِ بے خودی" حد درجہ خیال انگیز ہیں۔ ان دونوں نظموں میں
دی کا نظریہ پیش کرتے ہیں جو اپنے آپ کو فنا کر دینے کے نظریے کے خلاف ردِ عمل
ے، اپنے آپ کو فنا کر دینے کا نظریہ غیر مسلموں کے مذہبی افکار کے زیرِ اثر مسلمان
یوں نے پیدا کیا تھا۔

معلوم ہوتا ہے کہ اقبال اسلامی ثقافت کے زوال کو نظریۂ فنائے نفس کے قوت رُبا
ے کا نتیجہ قرار دیتے تھے جس نے قوائے مادی کی تسخیر سے مسلمانوں میں نفرت پیدا
ی تھی۔ اقبال نے قرآن اور ابتدائی دور کی اسلامی تاریخ سے ثابت کیا کہ اسلام حفظِ خودی
ظریہ پیش کرتا ہے۔ یہ سکھاتا ہے کہ دنیاوی اقتدار حاصل کرنا چاہیے۔ اپنے آپ کو
اپنے سوا ہر شئے کو مسخر کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ فلسفیانہ فکر و نظر نے
ں کو انسانِ کامل کے نصب العین پر پہنچا دیا۔ یہ نصب العین بہ ظاہر نیٹشے کے
ے سے حاصل کیا گیا تھا لیکن اقبال نے اسے نئی شکل دے دی[۱] اور انسانِ کامل کو

[۱] اقبال نے رموزِ بیخودی میں ملتِ محمدیہ کی مکانی ۔۔۔۔ بے نہایتی پر بحث کرتے ہوئے فرمایا۔

عقدۂ قومیتِ مسلم کشود ! | از وطن آقائے ما ہجرت نمود
دشمناں بے دست و پا از ہیبتش | لرزہ بر تن از شکوہ فطرتش !
پس چرا از مسکن آبا گریخت ؟ | تو گماں داری کہ از اعدا گریخت ؟

بقیہ ص ۴۷۰

مردِ مومن سے تعبیر کیا۔ یہ مردِ مومن روحانی اور مادی دونوں قوتوں سے مسلح تھا۔ اقبال ما[illegible]
اور روحانیت کی آمیزش کا داعی تھا اور نیٹشے پر اس لیے نکتہ چینی کی کہ اُس کا سر پر[illegible]
کسی روحانی اور اخلاقی پابندی کا روادار نہ تھا۔ اقبال کے تصورِ حکومت میں بھی روحانیت
اور مادیت دونوں کا اتحاد پایا جاتا ہے، اسی بنا پر ہندی قومیت کے تصور اور حکومت
کے سیکولر فلسفے کی جو اُس کے ساتھ وابستہ تھا مخالفت کی۔

اقبال کا نظریہ یہ تھا کہ روح متحرک ہے، زمین میں گڑی ہوئی نہیں۔ اس وجہ سے ز[illegible]
کے روحانی نظریے کے نزدیک نیشنل ازم یعنی قومیت قابلِ رد ہے، اس لیے کہ
نیشنل ازم زمین سے وابستہ ہے لہٰذا اسلام کے اصولِ حرکت سے اسے کوئی منا[illegible]
نہیں، حالانکہ یہ اصول اسلامی تعلیمات کی بنیادی چیزوں میں شامل ہے۔ رسول اللہ صلعم
ہجرت کر کے مدینہ منورہ جانا اقبال کے نزدیک فطرتِ متحرک کا ثبوت ہے، اس کا
مطلب یہ ہے کہ اسلام جغرافیائی اور نسلی پابندیوں سے بالکل پاک و آزاد ہے[1]۔

نثر میں اقبال کی صرف ایک کتاب ہے، یعنی خطبات جن کا عنوان ہے "اسلا[illegible]

حاشیہ بقیہ ص ۴۶۹: قصہ گویاں حق ز ما پوشیدہ اند
معنیٔ ہجرت غلط فہمیدہ اند!

ہجرت آئینِ حیاتِ مسلم است
ایں ز اسبابِ ثباتِ مسلم است!

معنی او از تنک آبی رم است
ترکِ شبنم بہرِ تسخیرِ یم است

اس کے بعد فرماتے ہیں پھول کو چھوڑ اس لیے کہ گلستان تیرا مقصود ہے یہ دیکھو سورج آزاد چلتا ہے
اور عرصہ آفاق اُس کے پاؤں کے نیچے ہے، ندی بلنے سے کیا فائدہ جو بارش کی محتاج ہے، بے کنارہ سمندر ہو
جا اور تیری کوئی تھاہ نہیں ملنی چاہیے:

ہر کہ از قیدِ جہات آزاد شد
چوں فلک در شش جہت آباد شد

اسرار و رموز صفحات ۱۳۲-۱۳۱

[1] اقبال نے جو کچھ لیا قرآنی تعلیم سے یا کسی نکر میں جزوی مماثلت کی بنا پر اُسے اغیار کا خوشہ چیں قرار دینا ہرگز مناسب نہیں۔

مذہبی افکار کی تشکیلِ نو" اس کتاب سے پتا چل سکتا ہے کہ اقبال پر مغربی فلسفے نے
ا گہرا اثر ڈالا تھا۔ انھوں نے برگساں اور نٹشے سے "عقل کی مخالفت" لی جو عزم و ارادہ
ل پر ترجیح دیتے تھے اور اُن کا فلسفۂ خودی زیادہ تر میک ڈونگل کی نفسیات پر مبنی
ہے عشق کو عقل سے مقدم قرار دے کر اقبال مسلم صوفیوں کے نقشِ قدم پر چلا، حالانکہ
نے کو فنا کر دینے کے رجحان کے باعث اُس نے صوفیوں کی سخت مخالفت کی تھی۔
ان کو عقل سے بالاتر جگہ دے کر اقبال نے وحی کو درست ثابت کیا جس پر تمام مذاہب
نیاد ہے۔ بہ ایں ہمہ اقبال عقل کی سراسر مخالفت نہیں کرتا بلکہ برگساں کی عقل دشمنی پر
مبنی کرتا ہے۔ اقبال دراصل قلب و ذہن کے امتزاج کا حامی ہے۔

اقبال اس حقیقت سے ناواقف نہ تھا کہ اُس کے معاصر مسلمان اُسی ذہنی انقلاب
ے گزر رہے تھے جو دورِ اصلاحِ مسیحیت میں یورپ پر گزر چکا تھا۔ اس وجہ سے وہ
افکار و خیالات کا خیر مقدم کرتا تھا لیکن ساتھ ہی اُس نے متنبہ کر دیا کہ آزاد خیالی میں
ل و انتشار کا رجحان بھی موجود ہے۔ الکیچر ول میں اقبال نے مسلمانوں کو بتایا کہ جدت پسندی
ولبھر اُٹھ رہی ہے اس سے خبردار رہنا چاہیے:

"تاریخ کے تحقیقی مطالعے سے واضح ہوتا ہے کہ تحریکِ مسیحیت دراصل
ایک سیاسی تحریک تھی اور اس کا نچوڑ یہ نکلا کہ یورپ میں مسیحیت کے
ہمہ گیر اخلاق کی جگہ قومی اخلاق کے نظاموں نے لے لی۔"

اقبال نے قومیت کے خلاف جو کچھ کہا تھا خطبات میں اُس کی تعدیل کر دی چنانچہ
ہتا ہے: "مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خدا آہستہ آہستہ حقیقت ہم پر آشکارا کر رہا
ہے کہ اسلام نہ نیشنل ازم (قومیت) کا حامی ہے اور نہ امپریل ازم (استعمار) کا
ہ جمعیتِ اقوام کا حامی ہے۔"

بیان تعجب انگیز ہے اس لیے کہ اقبال کے اصل ماخذ سے بے دلیل اعراض کا مظہر ہے۔

اقبال نے پاکستان کی تحریک کے لیے نہ صرف ذہنی فضا تیار کی بلکہ اس کے لیے جدوجہد میں بھی ممتاز کردار ادا کیا۔ مسلمانوں میں وہ پہلا لیڈر تھا جس نے اس حقیقت کو سمجھا کہ دستوری تحفظات خواہ کسی پیمانے پر پہنچ جائیں، لیکن وہ ہندو فرقہ پرستی کے خطرے کی روک تھام کے لیے کوئی کام نہیں دے سکتے اور ہندو مسلم کے مسئلے کا واحد حل یہ ہے کہ ہندوستان کو دو حصوں میں بانٹ دیا جائے ایک میں مسلمانوں کی اکثریت ہو اور دوسرے میں ہندوؤں کی اکثریت — قائد اعظم محمد علی جناحؒ اس وقت تک نیشنلسٹ چلے آرہے تھے، وہ اقبال کی گفتگو سے اتنے متاثر ہوئے کہ پاکستان کو اپنا لیا اور نہایت اہم قومی مطالبہ بنا دیا۔

برطانوی حکومت کے آخری دور میں ہندوستان کے اندر ایک اور مذہبی مفکر نے امتیازی شہرت حاصل کی یعنی مولانا عبید اللہ سندھی، وہ ۱۲۸۹ھ (۱۸۷۲ء) میں سکھ گھرانے میں پیدا ہوئے۔ زندگی کے ابتدائی دور ہی میں اپنا وطن چھوڑ گئے اسلام قبول کر لیا۔ دیوبند میں تعلیم پائی۔ پھر انھیں کابل بھیجا گیا[1] جہاں انھوں نے انڈین نیشنل کانگریس کی شاخ قائم کی اور ان ہندوستانی مجاہدین آزادی سے تعلقات قائم رکھے جو جلا وطن ہو کر ماسکو اور برلن پہنچے ہوئے تھے۔ مولانا نے کچھ مدت روس میں گزاری پھر وہ ترکی چلے گئے جہاں انھوں نے ترکی انقلابیوں کے کام پر بہت پسندیدگی کا اظہار کیا۔ اس کے بعد زیادہ تر وقت مکہ معظمہ میں گزارا اور شاہ ولی اللہ کی کتابیں پڑھتے رہے۔ انڈین نیشنل کانگرس کے کہنے پر انھیں ہندوستان آنے کی اجازت ملی

[1] مولانا وطن سے اپنے ماموں کے پاس ڈیرہ اسمٰعیل خاں چلے گئے تھے۔ وہاں سے سندھ پہنچے اور وہیں مولانا تاج محمود کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا اور تعلیم پائی، دیوبند میں وہ اس وقت پہنچے تھے جب عمر کی چوبیس منزلیں طے ہو چکی تھیں۔ دیوبند سے فارغ ہو کر انھوں نے دہلی میں قرآن مجید کی تعلیم کے لیے ایک درس گاہ بنام نظارۃ المعارف قائم کی۔ جنگ عظیم چھڑی تو مولانا عبید اللہ حضرت شیخ الہند مرحوم کے ارشاد پر کابل گئے اور ۱۹۲۲ء تک وہاں رہے۔

ئی۔[1] اس وقت تک ہندوستان میں انگریزی قوت بحال تھی۔ مولانا کانگریسیوں میں ہر دل عزیزی حاصل نہ کر سکے، اس لیے کہ کانگرس گاندھی جی کے زیرِ اثر ہندوئیت کو زندہ کرنے کی کوشش میں تھی۔ مولانا کا عقیدہ یہ تھا کہ متعدد اقوام کا ملک تسلیم کرتے ہوئے آیندہ کا فیصلہ ہونا چاہیے اور ہر قوم کو زیادہ سے زیادہ ثقافتی، لسانی اور سیاسی آزادی دے دینی چاہیے۔ یہ تجویز انڈین نیشنل کانگرس کے عقیدۂ وحدتِ قومیت اور اُس کے مسلک مرکزیت کے خلاف تھی۔

مولانا عبید اللہ کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ آپ نے شاہ ولی اللہ کے فلسفے کو از سرِ نو رواج دیا۔ وہ شاہ صاحب کو اسلام کا سب سے بڑا مفکر سمجھتے تھے۔ انھیں زیادہ ہم نوا نہ مل سکے اور وہ متصادم قوتوں کے درمیان کشمکش میں رہے اور انھوں نے بہت سے متنازعہ اصول کو اکٹھا کرنے کی کوشش کی، وہ فطرۃً انقلابی تھے اور تعلیم و تربیت کے اعتبار سے راسخ العقیدہ مسلمان۔ علاوہ بریں وہ بین الاقوامی کمیونزم اور ترکوں کے سیکولرازم کے مداح تھے۔ ان سب کو انھوں نے شاہ ولی اللہ کے لائحہ انقلاب مذہبی کے ساتھ ملانے کی کوشش کی جو قرآن کی حقیقی تعلیمات پر مبنی تھا۔ اس انقلاب میں نصب العین وہ بین الاقوامی انقلابی جماعت تھی جو رسول اللہ صلعم نے منظم فرمائی تھی۔

پاکستان اور اسلامی حکومت

پاکستان، ہندوستان کے مسلمانوں نے بنایا تھا جن کا عقیدہ تھا کہ اسلامی تاریخ، تہذیب اور ثقافت کے پیشِ نظر انھیں ایک جداگانہ قوم کی شکل اختیار کرنی چاہیے۔ ہندوؤں کی طرف سے یہ اعتراض پیش ہوتا تھا کہ مذہب جداگانہ قومیت کی بنا نہیں بن سکتا۔ اس کے جواب میں

[1] مولانا ۱۹۲۳ء میں روس پہنچے اور کم و بیش ایک سال وہاں گزارا، پھر ترکی چلے گئے۔ وہاں تقریباً تین سال ٹھہرے رہے آخر میں اٹلی سے ہوتے ہوئے حجاز پہنچے۔ اُن کے دوستوں اور عقیدت مندوں نے بار بار واپسی کی اجازت کی کوشش کی۔ آخر کار یہی کوششیں بار آور ہوئیں۔ جس حد تک مجھے معلوم ہے کانگرس نے اس سلسلے میں کوئی مداخلت نہیں کی تھی البتہ اسے مولانا کی واپسی پر اعتراض قطعاً نہیں ہو سکتا تھا۔

مسلم لیگ یہی کہتی تھی کہ اسلام مذہب کے مروجہ لغوی معنی کے اعتبار سے مذہب
مذہب بھی ہے اور ایک مجلسی نظام بھی ہے، جس کی ثقافت بالکل جداگانہ ہے جن
لیڈروں نے پاکستان کی حمایت کی تھی، اس مفاہمت کی بنا پر کی تھی کہ پاکستان میں ایک
حکومت ہوگی جس میں اسلام کے مذہبی اور اقتصادی اصولوں پر عمل کیا جائے گا۔

مولانا مودودی کی جماعت نے ابتدا میں اس بنا پر پاکستان کی مخالفت کی تھی کہ مسلم
کی عنانِ قیادت جن لوگوں کے ہاتھ میں ہے، وہ اسلامی حکومت ترتیب دے ہی نہیں
اس لیے کہ وہ مجلسی اور سیاسی زندگی کے مغربی تصورات کو قبول کیے بیٹھے ہیں۔ پاکستان
تو مولانا مودودی کی جماعت بھی بعض قدامت پسند علماء کے ساتھ مل گئی اور ایک ایسی حکومت
لیے جدوجہد شروع کر دی، جسے حقیقی معنوں میں اسلامی کہا جا سکے۔ مودودی دبستان بھی اس
متعلق اس قدیم تصور سے متفق تھا کہ یہ ایک مجلسی نظام ہے جس کے تمام جزئیات و
طے ہو چکے ہیں اور مسلمانوں کو صرف انھیں معاملات کے متعلق قانون سازی کا حق حا
جن کا ذکر واضح طور پر قرآن اور حدیث میں نہیں آیا مسلم لیگ اور قائدِ اعظم محمد علی جناح بانیِ پا
کے بیانات سے پوری طرح واضح نہ ہوتا تھا کہ دنیائے حاضر میں اسلامی حکومت کے او
اور خصائص کیا ہیں۔ کبھی تو وہ خالص ایسے انداز میں بات کرتے جو مذہب و سیاست کو الگ
رکھنے کے حامیوں کا ہوتا ہے اور کبھی فرما دیتے کہ پاکستان مسلمانوں کو اسلامی اصول کے م
زندگی بسر کرنے کا موقع بہم پہنچانے کی غرض سے قائم کیا گیا ہے۔

۱۳۶۸ھ / مارچ ۱۹۴۹ء میں پاکستان کی دستور ساز اسمبلی نے "قرار دادِ مقاصد"
کی جس میں واضح کیا گیا کہ حکومت صرف خدا کے لیے ہے۔ پاکستان کا دستور ان جمہوری اصول
مطابق بنایا جائے گا جو اسلام نے پیش کیے ہیں۔ اس قرارداد میں وعدہ کیا گیا تھا کہ مسلمان کتا
کے مطابق زندگی بسر کرنے کے قابل ہو جائیں گے اور مذہبی اقلیتوں کو شہریت کے پورے
حقوق حاصل رہیں گے۔

حکومت کے اسلامی تصور کی مختلف تعبیریں اور تعریفیں کی گئی ہیں۔ ان سب میں موافقت پیدا
سہل نہیں۔ مذہبی طبقوں خصوصاً مولانا مودودی کے ساتھیوں کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ
مجلسی ڈھانچے کا صحیح تصور ہے جو اسلامی حکومت پیدا کرے گی، لیکن مذہب و سیاست
الگ رکھنے والے عناصر ان لوگوں کی تعبیر کے خلاف متعدد اعتراض پیش کرتے ہیں۔ وہ
ہیں کہ اسلامی حکومت ایسی حکومت ہو گی جس میں ملاؤں کو زیادہ سے زیادہ اقتدار حاصل
نی قدامت پسند مذہبی علماء اور شریعت کے قوانین کا اطلاق موجودہ زمانے کے حالات
ہو سکتا ہے اور ایسا قدم اُٹھاتے ہی ملک کا موجودہ اقتصادی نظام برباد ہو جائے گا
زمانے کے مالی اور بینک کاری کے اصول پر مبنی ہے۔ ایک اعتراض یہ بھی کیا جاتا
اسلامی حکومت میں غیر مسلم اقلیتوں کو ثانوی حیثیت حاصل رہے گی اور سیاسیات میں
ی پیدا ہو جائے گی۔ اس طرح ہمارا قانونی نظام حد درجہ پُرپیچ اور بے قابو ہو جائے گا
لیے کہ محض ہر مذہبی جماعت ہی کو نہیں بلکہ جماعت کے ہر فرقے کو اپنے قوانین کی پیروی
ت دینا لازم ہو گا۔

جب مولانا مودودی نے یہ اعلان کیا کہ کشمیر میں جو جنگ ہو رہی ہے، وہ جہاد نہیں،
لیے کہ ہندوستان کے خلاف جنگ کا باقاعدہ اعلان نہیں کیا گیا اور اُس کے ساتھ جتنے
ے ہو چکے ہیں اُن میں سے کوئی منسوخ نہیں ہوا تو اس اعلان سے مودودی جماعت
دائی ہر دلعزیزی گھٹ گئی۔ مسلمانوں کی ایک خاصی بڑی جماعت کی ہمدردی اُس وقت
دئی جب مولانا مودودی نے قرآن و حدیث سے سندیں پیش کر کے واضح کیا کہ اسلام
کی ارضی یا صنعتی املاک میں دخل کی اجازت نہیں دیتا، لہٰذا حکومت بڑے زمین داروں
ن نہیں لے سکتی اور مذہباً ایسے اقدام کے لیے کوئی وجہِ جواز موجود نہیں تو مولانا مودودی
مخالفوں نے اُن پر جاگیر داروں کی حمایت کا الزام لگایا، لیکن مولانا حد درجہ انفرادی
ہ دارانہ اقتصاد کے حامی رہے اور اُنھوں نے املاک کو قومی بنا لینے کے رجحانات کی

کی مخالفت کی اور ایسے رجحانات کو اسلامی اصول کے خلاف بتایا۔

اس اثنا میں کمیونسٹوں نے اسلام کے خلاف براہ راست حملے ترک کر دیے اور بہت سے اہل قلم کو اس امر پر آمادہ کر لیا تھا کہ وہ اشتراکی اور کمیونسٹ اصول کو قرآن و حدیث اور صحابہ کرامؓ کے عمل سے شہادتیں پیش کر کے درست ثابت کریں۔

اسلام کو موجودہ دور کے سیکولرازم سے جو کش مکش درپیش ہے، وہ بڑے اہم نتائج حامل ہو گی۔ ممکن ہے اُس سے کوئی نیا نظام پیدا ہو، پاکستان میں سیکولرازم کے لیے جاذبیت نہیں پائی جاتی، جو اس نے مغربی قلوب میں پیدا کر لی ہے اس لیے کہ یہاں سیکولرازم اندر سے پیدا نہیں ہوا بلکہ باہر سے آیا ہے نیز سیکولرازم کوئی بہت بڑا مفکر یا دبستانِ فکر بھی پیدا نہیں کر سکا جس کے سامنے واضح سیکولر فلسفہ ہو۔ گزشتہ ایک سو سال میں ملکی حکومت کا دور قائم رہا اور مذہبی طبقے اختیارات سے بالکل محروم رکھے گئے۔ اسلامی ... میں کوئی منظم کلیسائیت یا مذہبی نظام موجود نہ تھا جو لوگوں کے دل میں مذہبی پیشواؤں کا خوف پیدا کر سکتا۔ بلاشبہ تعلیم یافتہ اسلامی طبقوں میں قدامت پسندی اور ادعائیت کو بہت ناپسند کیا جاتا ہے، لیکن ایسی کوئی نفرت موجود نہیں جس نے یورپ میں پراٹسٹنٹوں کے انقلاب کے لیے کا دروازہ کھولا تھا، یہی وجہ ہے کہ سیکولرازم لوگوں کی جذباتی وفاداریوں پر قابو نہیں پا سکا۔

کہا جا سکتا ہے کہ پاکستان میں سیکولرازم کی حیثیت سلبی ہے جس کے ذریعے سے غالباً ملاؤں کے اقتدار اور فرقہ دار جھگڑوں سے نجات حاصل کی جا سکتی ہے، اس سے زیادہ اس کا کوئی مصرف نہیں جس ملک میں گزشتہ ایک سو سال کی اجنبی حکمرانی مجلسی مساوات کا تصور برباد کر چکی ہے اور جماعت بندی نہایت بری شکل اختیار کر چکی ہے، جہاں اجنبی نظام تعلیم نے تعلیم یافتہ گروہ اور عوام کے درمیان ایک وسیع خلیج پیدا کر دی ہے، وہاں لوگوں کی عام خواہش یہی ہے کہ چھنے ہوئے وقار اور زائل شدہ مساوات کو بحال کر لیں۔ اسلام اور کمیونزم دونوں کے پاس مثبت پروگرام ہیں اور دونوں عوام کو اپنی طرف کھینچ سکتے ہیں، لیکن سیکولرازم نہیں

ہو سکتا۔

بہ ایں ہمہ اسلام کے مستقبل کا راستہ مشکلات سے پٹا پڑا ہے جب تک مذہبی قائدین
ن وسطیٰ کے اسلوبِ فکر سے الگ نہ ہوں گے، کٹر پن اور قدامت پسندی نہ چھوڑیں گے
ھنا مشکل ہے کہ دورِ حاضر کے ترقی یافتہ طبقے اسلامی تصور کو کیوں کر قبول کر لیں گے۔ یہ
لش اُس وقت تک جاری رہے گی جب تک مذہبی اور سیکولر گروہ کسی ایسی مصالحت پر
نچ جائیں جس میں دونوں کے بہترین نقطہ ہائے نگاہ قبول کر لیے جائیں، لیکن اس میں وقت
ے گا اور لازم ہو گا کہ عام اسلامی تصور کو زیادہ سے زیادہ وسیع کرنے کے لیے مسلسل کوشش
جائے۔

ستان و ہند میں اسلام کی موجودہ کیفیت مشرقی پاکستان میں جہاں عام مسلمان مغربی پاکستان سے زیادہ مذہب کے پابند ہیں، اسلام کا اثر ہمیشہ زیادہ رہا۔ سید احمد بریلوی نے جو سیاسی اور مذہبی تحریک جاری کی تھی، وہ دوسرے
امات کے بجائے بنگال میں زیادہ دیر تک قائم رہی لیکن جب برطانوی حکومت کے پاؤں
گئے۔ بنگال کے مسلمانوں کو دوسرے مسلمانوں کے مقابلے میں اقتصادی اور تعلیمی اعتبار
سے زیادہ مصیبتیں پیش آئیں۔ ہندوؤں کا اثر و اقتدار بڑھتا گیا یہاں تک کہ وہ تعلیم، ثقافت،
رکاری ملازمتوں اور عزت مندانہ وسائلِ معاش کے عملاً اجارہ دار بن گئے۔ ہندوؤں نے
نگالی زبان میں بھی پرانے ہندو افسانے زیادہ سے زیادہ داخل کر دیے، یہاں تک کہ ادب
رفن ہندو افکار سے لبریز ہو گئے۔ جب مسلمانوں میں آج سے چالیس سال پیشتر سیاسی
یداری پیدا ہوئی تو انھوں نے زبان و ادب میں اسلامی رنگ پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اس
لسلے میں قاضی نذر اسلام جیسے ممتاز شاعر نے خاصی مدد دی اور اسلامی افکار کو رواج دیا
بہ ایں ہمہ یہ کوشش ادبی اور فنی رجحان میں فوری تبدیلی پیدا نہیں کر سکتی تھی، اس کے لیے
ایک آزاد پاکستان کی تخلیق کی ضرورت تھی جو بنگالی مسلمان کے شعور کو خواب سے جگاتا۔

مشرقی پاکستان میں آج لبرل اسلامی افکار کی ترقی اس وجہ سے رُکی ہوئی ہے کہ وہاں ہندوؤں کی ایک زبردست اقلیت موجود ہے، نیز کمیونسٹوں نے خفیہ غداروں کی ایک جماعت پیدا کر رکھی ہے اور قدامت پسند علمار بھی اس سلسلے میں مزاحمت کر رہے ہیں۔ یہ لوگ اسلام کے اُن تصورات پر جمے ہوئے ہیں جو قرونِ وسطیٰ میں قائم ہوئے تھے۔

ہندوستان کے مسلمان اس ابتدائی پریشان حالی اور مایوسی سے جو تقسیم کے بعد پیدا کر دی گئی تھی، آہستہ آہستہ اپنی پوزیشن بحال کر رہے ہیں اور ان میں خود اعتمادی پیدا ہو رہی ہے بلکہ بعض لوگوں کی رائے میں امکان ہے کہ ہندوستان کے مسلمان پہلے سے بھی زیادہ مذہبی زندگی کی طرف مائل ہو جائیں۔ بلاشبہ عوام کی مذہبی زندگی میں زیادہ سرگرمی پیدا ہو گئی ہے۔ ہندوستان کے مسلمانوں کا احساس یہ ہے کہ وہ اسلامی مقاصد کے لیے کام کی اہلیت کا ثبوت نہ دے سکے، اسی لیے تکلیفوں اور اذیتوں کا شکار ہوئے۔ ظلم و جور نے اُن میں نئی سرگرمی پیدا کر دی ہے، لیکن یہ امر افسوس ناک ہے کہ وہ اب تک ایک تنگ خیال اور قدامت پسندی کی گرفت میں ہیں۔

اُردو زبان کو ہندوستان میں علاقائی زبان تسلیم کرانے کے لیے جو جد و جہد کی گئی اس میں اب تک زیادہ کامیابی نہیں ہوئی۔ ایک وقت امید کی جا رہی تھی کہ شاید اُردو ہندوستان کی قومی زبان بن جائے لیکن یہ زبان اسلامی ثقافت کی پیداوار تھی، لہٰذا ہندوؤں نے گاندھی جی کی قیادت میں سنسکرت آمیز ہندی کو ہندوستان کی آئندہ قومی زبان بنانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس لیے بہت سے ہندوستانی مسلمان الگ ہو گئے اور اُنھوں نے پاکستان کی تحریک کو تقویت پہنچائی۔ ملک کی تقسیم سے اُردو کو طبعاً سخت نقصان پہنچا، لیکن شمالی ہند کے مسلمان اپنی زبان کو رواجِ عام دینے کے لیے بڑے سرگرم ہیں اور اس کے لیے کم از کم علاقائی درجہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ اردو اب بھی ہندوستانی اور پاکستانی مسلمانوں کے درمیان ایک مجلسی کڑی کی حیثیت رکھتی ہے۔ ہندوستان اور پاکستان میں مشاعرے ہوتے ہیں اور

دونوں ملکوں کے اردو شعراان میں حصہ لیتے ہیں۔

ہندوستان میں جو مختلف مذہبی تحریکیں ہیں اُن کا ذکر کرتے ہوئے مودودی دبستانِ فکر کے ہندوستانی مشن کا بھی ذکر ہونا چاہیے۔ یہ فریق تقسیم کے بعد ہندوستان میں بہت سرگرم رہا، حال میں اس کی سرگرمیوں سے حکومتِ ہند کے دل میں شبہات پیدا ہوئے اور چند گرفتاریاں عمل میں آئیں۔

مولانا الیاس مرحوم نے تقسیم سے پیشتر ایک تبلیغی جماعت قائم کی تھی۔ یہ اب تک ہندوستان میں سرگرمی سے کام کر رہی ہے، مولانا نے اپنی مثالی زندگی اور تبلیغ کے ذریعے سے بہت سے ہندوؤں کو مسلمان بنایا۔ آج کل اس کے پیرو اسلامی محاسن کی تبلیغ میں سرگرم ہیں، اور اس امر پر زور دیتے ہیں کہ نماز، روزہ اور دوسرے اسلامی احکام کی پابندی کی جائے۔ چھوٹے چھوٹے گروہ گھر گھر پھر کر لوگوں سے درخواست کرتے ہیں کہ خدا کو یاد کرو اور خلوصِ قلب سے نمازیں پڑھو۔ اس جماعت کے ایک بہت ہی بڑے رہنما مولانا ابوالحسن علی لکھنوی ہیں جو قابل مصنّف اور ندوہ کے ممتاز فرد ہیں۔ ندوہ وہی تعلیمی ادارہ ہے جس کی بنیاد مولانا شبلی نے رکھی تھی۔

مذہبی لیڈروں کا ایک چھوٹا سا گروہ مولانا اشرف علی تھانوی کو اپنا روحانی پیشوا اور مجددِ اسلام قرار دیتا ہے۔ مولانا موصوف تقسیم سے پیشتر مذہبی رہنماؤں میں خاص شہرت کے مالک تھے اور اُن میں تصوف کے رجحانات پائے جاتے تھے۔ یہ گروہ تصوّف کی حمایت کرتا ہے اور مودودی دبستانِ فکر کا اس وجہ سے مخالف ہے کہ دبستان کی روش تصوّف کے خلاف ہے۔

لکھنؤ کے فرنگی محل کی بنیاد مولانا قطب الدین نے اورنگ زیب کے زمانے میں رکھی تھی اور یہاں سے متعدد ممتاز علماء پیدا ہوئے، اب اس کا اثر کم ہو رہا ہے۔ دیوبند بہرحال لشتم پشتم گزارا کر رہا ہے۔ دیوبند کے بہت سے علما انڈین نیشنل کانگرس کے

زبردست حامی اور پاکستان کے شدید مخالف تھے، مولانا حسین احمد مدنی اس گروہ کے لیڈر تھے۔ وہ اب بھی زندہ ہیں[1] لیکن نہ کوئی سرگرمی دکھاتے ہیں اور نہ پہلے کی طرح ذی اثر ہیں۔ نے تقسیم کے بعد بعض ایسی کارروائیاں کیں جن کی وجہ سے اُن مسلمانوں کا بھی خاصا بڑا طبقہ کانگرس کا مخالف ہو گیا جو پاکستان کے خلاف ہندوستان کی قومی تحریک کے حامی تھے۔

جمعیت علمائے ہند ابتدا میں مذہبی لیڈروں کی ایک سیاسی جماعت تھی، یہ ہندوستانی نیشنل ازم کی حامی رہی۔ اب بھی مسلمانانِ ہند کی نہایت سرگرم مذہبی جماعت ہے۔ اب اس نے مسلمانوں کی اقتصادی بہبود و برتری کا ایک مستقل پروگرام پیش کیا ہے۔ حقیقت کا احساس ہے کہ مذہب کو اُسی صورت میں زندہ و پائندہ رکھا جا سکتا ہے جب وہ محکم اقتصادی بنیادوں پر قائم ہو۔ لیڈروں کے ذریعے سے اِس جماعت کو حکومت میں خاصا اثر حاصل ہے

اندازہ کیا گیا ہے کہ ہندوستان اور پاکستان کے قریباً دس فی صد مسلمان شیعہ ہیں، باقی سب سُنّی ہیں۔ پاکستان اور ہندوستان میں شیعوں اور سنیوں کے تعلقات بہ حیثیت مجموعی کبھی ناخوش گوار نہیں رہے۔ اُن کے درمیان شادیاں اُسی طرح ہوتی ہیں جیسے زمانے میں ہوا کرتی تھیں۔ سُنّی بھی حضرت علی کرم اللہ وجہ، حضرت امام حسینؓ کا ویسا ہی احترام کرتے ہیں جیسا شیعہ کرتے ہیں۔ سُنّیوں میں ایک گروہ ایسا بھی ہے جو حضرت علیؓ کو تمام صحابہ سے افضل مانتا ہے۔ اگرچہ وہ سب کا حدِ درجہ احترام کرتے ہیں۔ اکثر امور میں شیعوں اور سنیوں کے درمیان اتفاق ہے۔ نماز کے بعض پہلوؤں میں شیعہ اختلاف کرتے ہیں، مثلاً اُن کے نزدیک ظہرین (ظہر اور عصر) اور مغربین (مغرب اور عشاء) کو ملا لینا جائز ہے۔ اس کی

---

[1] اب جب کہ یہ کتاب آپ کے ہاتھوں میں ہے مولانا حسین احمد مدنی وفات پا چکے ہیں۔

سنیوں کے بعض فقہا نے بھی کی ہے۔ شیعوں نے حدیثوں کی جانچ کے لیے اپنے معیار قائم کر رکھے ہیں۔ ان کے نزدیک وہ حدیثیں زیادہ صحیح ہیں، جو حضرت علیؓ... یا اُن کے اخلاف اور پیروؤں سے مروی ہوں۔

...... اسلام نے دو مذہبی جشن مقرر کیے، ایک عید الفطر جو رمضان کے اختتام پر آتی ہے اور دوسری عید الاضحیٰ جو یوم حج کے ایک دن بعد ادا کی جاتی ہے۔ ایک کو چھوٹی عید اور دوسری کو بڑی عید کہا جاتا ہے۔ اگرچہ مسلمانوں کی ایک خاص تعداد روزے نہیں رکھتی، لیکن رائے عامہ اس مہینے کے تقدس کا اہتمام زور سے کرتی ہے، یہاں تک کہ اگر برسر عام کچھ کھایا پیا جائے یا تمباکو نوشی کی جائے تو سب لوگ اس کی سخت مذمت کرتے ہیں اور بعض علاقوں میں (مثلاً شمالی و مغربی سرحدی علاقے اور پاکستان کا قبائلی علاقہ) معاملہ جسمانی تشدد کا موجب بھی بن سکتا ہے۔ رمضان شریف کے بعد جو عید آتی ہے اُس میں نماز پڑھی جاتی ہے اور بڑی دھوم دھام سے یہ تقریب منائی جاتی ہے۔ جو عید یوم حج کے بعد آتی ہے اُس میں جانور بھی قربان کیے جاتے ہیں۔ حال میں پاکستان کے اندر اس امر پر بحث شروع ہو گئی تھی اور یہ تجویز پیش کی گئی تھی کہ جو روپیہ جانوروں کی قربانی میں صرف ہوتا ہے، وہ مجلسی اور رفاہی کاموں پر صرف کیا جائے، لیکن قدامت پسند گروہ پر یہ تجویز قطعاً اثر انداز نہ ہو سکی۔ ان دونوں عیدوں میں امیر غریب اچھے سے اچھا لباس پہنتے ہیں۔ دوست اور رشتہ دار ایک دوسرے سے گلے ملتے ہیں اور مبارک باد کہتے ہیں۔

مسلمان رسول اللہ صلعم کا یوم میلاد بھی مناتے ہیں، اگرچہ بظاہر یہ تقریب زیادہ پرانی نہیں۔ مذہب میں اس کے لیے کوئی ثبوت نہیں ملتا اور اسلام کے ابتدائی قرنوں میں یہ تقریب قطعاً منائی نہیں جاتی تھی، لیکن اب لوگ اس موقع پر عام جلسے بھی کرتے ہیں اور گھروں میں بھی اجتماعات ہوتے ہیں، جن میں نعتیہ کلام پڑھا جاتا ہے اور تقریروں میں رسولِ پاک صلعم کی حیاتِ طیبہ، سیرت اور اخلاق و عادات بیان کیے جاتے ہیں۔

سنیوں نے ایک اور تقریب بھی پیدا کر لی ہے یعنی رسول اللہ صلعم کے صحابہ کے یوم میلاد منائے جاتے ہیں۔ یہ غالباً شیعوں کی سرگرمیوں کا ردِ عمل ہے۔ بعض لوگ پیروں کو بھی مانتے ہیں جن میں سے بلند ترین مقام سید عبدالقادر جیلانی بغدادی کو حاصل ہے یہ پانچویں صدی ہجری (گیارھویں صدی عیسوی) کے مشہور ولی اللہ تھے۔ پیر صاحب کا یوم ماہِ ربیع الثانی کی گیارھویں تاریخ کو تھا۔ اس موقع پر کھانا پکوا کر ختم دلایا جاتا ہے، پھر عزیزوں، رشتہ داروں اور غریبوں میں تقسیم کر دیا۔

اسلامی احکام و اوامر کی ظاہری پابندی پر پہلے کی طرح زور نہیں دیا جاتا، لیکن مغربی ثقافت پیروں کے ساتھ عقیدت کے سلسلے پر کوئی قابلِ ذکر اثر نہیں ڈال سکی۔ اعلیٰ درجے کے تعلیم یافتہ لوگ بھی، جو مذہب کے بارے میں عام طور پر متشکک مانے جاتے ہیں، پیروں کے بڑے عقیدت مند ہیں اور ان سے جو کرامتیں منسوب کی جاتی ہیں، ان پر پختہ عقیدہ رکھتے ہیں۔ مانا جاتا ہے کہ پیر وفات کے بعد بھی بدستور ذی اثر رہتے ہیں۔ وہ بیماریاں دور کر دیتے ہیں، بلاؤں کو روک سکتے ہیں اور عقیدت مندوں کے لیے مالی خوش حالی اور ترقی کا سرچشمہ بن سکتے ہیں۔ یہ پیر پرستی زیادہ تر صوفیت کا نتیجہ سمجھی جاتی ہے۔ جن بڑے پیروں کے مقبروں کی طرف لوگوں کی بہت بڑی تعداد کھنچی چلی جاتی ہے، ان میں سے قابلِ ذکر یہ ہیں: شاہ عبداللطیف بھٹائی (بھٹ شاہ سندھ) داتا گنج بخش (لاہور) خواجہ معین الدین چشتی (اجمیر) حاجی وارث علی شاہ (دیوا اتر پردیش) یوسف شریف شاہ (حیدر آباد دکن) خواجہ نظام الدین اولیا (دہلی) اور بھی بہت سے مشہور نیز ہزاروں کم درجے کے پیر جا بجا موجود ہیں۔ یہ امر بے انتہا دلچسپ ہے کہ متشککین مذہب کے ظاہری احکام کو ہنسی میں اڑا دیتے ہیں، وہ پیروں کے ساتھ اس امید پر بڑی عقیدت کا اظہار کرتے ہیں کہ دنیاوی کاروبار میں بہت جلد اور تیزی سے کامیابی حاصل کر لیں گے۔

ہر پیر کے مقبرے پر سالانہ عرس ہوتا ہے۔ بعض اوقات عرس کے بعد میلہ ترتیب پاتا

ہے جس میں کئی رسمیں ادا کی جاتی ہیں، مثلاً مزاروں پر پھول چڑھائے جاتے ہیں قیمتی چادریں
لی جاتی ہیں چراغ جلائے جاتے ہیں۔ خاص طور پر دلچسپ پہلو یہ ہے کہ قوالیاں بھی ہوتی
ہیں جن میں پیشہ ور گویئے مزامیر کے ساتھ گانا سناتے ہیں۔ طوائفوں کو بھی لازماً خارج نہیں
کیا جاتا البتہ ایسی چیزیں گائی جانی لازم ہیں جو صوفیوں کے حلقے میں جائز سمجھی جاتی ہیں۔

لوگ مقبروں پر جاتے ہیں اور عام ضروریات کے سلسلے میں پیروں سے مدد
مانگتے ہیں بعض اوقات اپنی خواہشیں لکھ کر مقبرے کی دیواروں سے لٹکا دیتے ہیں اور بعض
لوگ قبروں کے سامنے سجدے کرتے ہیں لیکن راسخ العقیدہ مسلمان ان تمام رسوم کو غیر اسلامی
قرار دیتے ہیں اور اُن کی مذمت کرتے ہیں اور وہ عقیدت کو صرف فاتحہ خوانی تک محدود رکھتے
ہیں۔ جو لوگ راسخ العقیدہ ہونے میں بہت آگے بڑھے ہوئے ہیں وہ مقبروں پر جاتے ہی
نہیں اُن کا عقیدہ یہ ہے کہ جب آدمی کا انتقال ہو جاتا ہے تو زندوں سے اُس کا تعلق منقطع
ہو جاتا ہے ایسے لوگوں کو عام طور پر "وہابی" کہا جاتا ہے۔

مسجدوں میں اب نمازی زیادہ تعداد میں نہیں آتے۔ صرف غریب اور اَن پڑھ لوگ
پانچ وقت کی جماعت میں شریک ہوتے ہیں تعلیم یافتہ لوگوں میں سے جو نماز پڑھتے ہیں وہ
گھروں میں پڑھ لیتے ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ جو لوگ مسلمانوں میں پیش پیش ہیں اُن کی
دینی معلومات حد درجہ ناکافی ہیں۔ تعلیم یافتہ طبقے پرانے دلائل اور طریقِ خطابت کو بے لذت
بے کیف اور غیر مؤثر سمجھتے ہیں۔ خطبات جمعہ عام طور پر عربی میں دیے جاتے ہیں اور اُن
کی ایک خاص شکل ہوتی ہے جو صدیوں سے رائج چلی آتی ہے جو لوگ عربی زبان نہیں
جانتے، نیز دینی علوم سے ناواقف ہیں، اُن کے دل میں یہ خطبے سُن کر کیا جذبہ پیدا ہو
سکتا ہے۔ پیش امام اور مذہبی مبلّغ اُن مسائل کو زیرِ غور نہیں لاتے جو تعلیم یافتہ لوگوں کے
دلوں میں تشویش پیدا کرتے ہیں بلکہ اُنھیں ایسے مسائل کے وجود ہی کا احساس نہیں۔ اُن
کے نزدیک دنیا ابھی تک قرونِ وسطیٰ میں بیٹھی ہے۔

مسلمان نوجوان بھی تشکک کی طرف آرہے ہیں پیش اماموں اور خطیبوں سے اُنھیں رہنمائی کی کوئی روشنی نہیں مل سکتی۔ صرف دو عیدوں کے موقع پر لوگ زیادہ تعداد میں مسجدوں تک جاتے ہیں اور نماز ادا کرتے ہیں کئی مرتبہ یہ تجویز پیش ہو چکی ہے کہ مسجدوں کو مجلسی اور تعلیمی سرگرمیوں کے مرکز بنا دینا چاہییے، جس کا انتظام تعلیم یافتہ اور با قاعدہ تربیت یافتہ اماموں کے ہاتھ میں ہو، لیکن ابھی تک اس تجویز پر عمل نہیں ہوا، اس لیے کہ کوئی ایسی منظم جماعت موجود نہیں جو مسجدوں اور اُن کے محافظوں کی نگرانی کر سکے۔ بہ حالتِ موجودہ مسجدیں صرف نجی چندوں کے ذریعے سے قائم ہیں۔ مقامی لوگ پیش اماموں کو تنخواہ دیتے ہیں، عام طور پر تنخواہیں بہت کم ہوتی ہیں، یہاں تک کہ نچلے درجے کے مزدوروں سے بھی اُن کی تنخواہوں کا درجہ نیچے ہوتا ہے۔

تاہم مسجدوں میں ترقی کے بڑے ممکنات نظر آتے ہیں۔ مستقبل میں مجلسی اصلاح کا کوئی منصوبہ ان اداروں سے بے نیاز نہیں ہو سکتا جہاں نمازیں ادا کی جاتی ہیں۔ نمازوں اور تعلیم کو یکجا کیا جا سکتا ہے۔ اگر مسجدوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیا گیا تو یہ تعصب اور جہل پسندی کا مرکز بنی رہیں گی۔ حکومت غالباً اس لیے یہ مسئلہ چھیڑنے سے احتراز کرتی ہے کہ مبادا لوگ نکتہ چینی کریں۔ عام طور پر ایسے معاملات میں سرکاری مداخلت کو بے اعتمادی کی نظروں سے دیکھا جاتا ہے، لیکن ایسی تدبیریں ضرور سوچنی چاہئیں کہ مسجدوں کا سلسلہ تنظیم پا سکے اُن اماموں کو خاص تعلیم دی جائے جو مسجدوں کی دیکھ بھال کے ذمہ دار ہیں۔ اسلام کی قوت و پائندگی مجلسی اور اداری مقاصد سے پیدا ہوتی ہے۔ اسلام کا آغاز ایک مجلسی نظام کی حیثیت میں ہوا تھا۔ اُس کے سامنے معین مجلسی اور اقتصادی نظام تھا لیکن یہ حد درجہ انفرادی مذہب بن گیا۔ اب کہ لوگ مجلسی مساوات اور اقتصادی و سیاسی انصاف کے جذبے سے معمور ہیں، ایک ملک گیر ادارے کی اشد ضرورت ہے جو عوام کے مذہبی تقاضوں کو پورا کر سکے اور اصولِ اسلام کے سمجھنے میں اُن کا رہنما بن سکے۔

---

[1] موجودہ حکومت اس پر عمل درآمد کر رہی ہے اور امام مسجدوں کی تنخواہوں کا مسئلہ زیرِ غور ہے۔

ال باب

اسلامی ثقافت چین میں

(استاذ داؤد سی۔ ام۔ ٹنگ)

مورخین اب تک ہم رائے نہیں ہو سکے کہ چین میں اسلام کب آیا۔ تاریخ عرب میں اس
واقعے کا کوئی ذکر نہیں، چین کے وقائع میں صرف اس کی طرف مختصر اشارے ملتے ہیں۔
حکمران خاندان کی جو قدیم دستاویزیں تھیں اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ ینگ وئی[۱] کی
ی کے دوسرے سال (۳۱ھ، ۶۹۱ء) عرب سے ایک سفارت شاہی دربار
پہنچی اور وہ اپنے ساتھ تحائف بھی لائی۔ سفارت کے ترجمان نے بتایا کہ ہماری حکومت
ں سال پہلے قائم ہوئی تھی، بہرحال اس کا مطلب یہی سمجھا جا سکتا ہے کہ سفارت
ت عثمانؓ کی خلافت کے زمانے میں چین کے شاہی دربار میں پہنچی تھی چینی مسلمانوں کی
ں کے مطابق چین میں اسلام کی آمد کا یہ پہلا موقع تھا۔ سفارت کا رئیس سعید بن ابی
ص تھا جو رسول اللہ صلعم کا مشہور صحابی تھا اس کے ساتھ پندرہ آدمی تھے۔ جو بحر ہند اور
چین سے گزرتے ہوئے کونگ چاؤ[۲] پہنچے جو جنوبی چین کی مشہور بندرگاہ ہے، وہاں

---

[۱] zung-ملا ۔ مجھ میں نے انتہائی تلاش کی مگر سعید بن ابی وقاص نام کے صحابی کا سراغ نہ مل سکا۔ بدرالدین صاحب
جامعی نے "چینی مسلمان" کے نام سے ایک کتاب تصنیف فرمائی تھی جو ۱۹۳۵ء میں مطبع معارف اعظم گڑھ سے شائع
ہوئی اس میں مرقوم ہے کہ سعد بن ابی وقاص (فاتح ایران) وفد کے رئیس بن کر آئے تھے۔ میرے نزدیک یہ بیان
قابل اعتماد نہیں۔ [۲] Kwang-chau سنگاپور سے شمال کی طرف جائیں تو خلیج بنگال سے گزرتے ہی
بحرین گونگ چاؤ ملتا ہے جنوبی چین کی یہ مشہور بندرگاہ ہے۔

سے وہ خشکی میں سفر کرتے ہوئے چنگ آن گئے جو اس زمانے میں مرکزِ حکومت تھا اور شا
چین کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

شہنشاہ نے رسول اللہ صلعم کے دین کے متعلق بڑی تفتیش و تحقیق کی، پھر کہا کہ بنیادی
اچھا ہے یہ کنفیوشس کی تعلیمات سے ملتا جلتا ہے۔ ساتھ ہی کہا کہ دن میں پانچ وقت
پڑھنا اور رمضان کا ایک مہینہ روزے رکھنا مجھے اچھا معلوم نہیں ہوتا۔ اس لیے اس
اسلام قبول نہ کیا، لیکن سعید اور ان کے ساتھیوں کو پوری آزادی دے دی کہ وہ اپنے
کی اشاعت کریں اور چنگ آن میں پہلی مسجد کی تعمیر کا حکم دے کر اسلام سے متعلق اپنے خیر
کا ثبوت دیا۔ تاریخ اسلام کا یہ ایک نہایت اہم واقعہ ہے۔ اب تک موجودہ زمانے کے
سیان میں یہ مسجد واقع ہے۔ اس کی حالت اب بھی بہت اچھی ہے۔ بارہا اس کی مرمت
ہوئی ہے۔

بہت مدت بعد سعید بن رشیدہ ہو گیا اور اس کی صحت بگڑ گئی تو وطن واپس جانے کی اجازت
لے لی، لیکن بدقسمتی سے وہ راستے ہی میں وفات پا گیا اور اسے کونتک چاؤ میں دفن کیا گیا
اس کی قبر پر بطور یادگار مسجد بنائی گئی جو آج بھی باقی ہے۔ چین میں یہ دوسری تاریخی مسجد ہے
سعید کے بعض ساتھی چین ہی میں وفات پا گئے بعض واپس عرب چلے گئے۔ چینی اور غیر ملکی مورخوں
میں اس امر پر اختلاف ہے کہ سعید بن ابی وقاص نے چین میں وفات پائی یا عرب میں۔ اسلامی
چینی مورخوں کو یقین ہے کہ وہ کونتک چاؤ میں دفن ہے۔ ثبوت میں اس کی قبر دکھائی جاتی
عرب مورخ اس رائے پر جمے ہوئے ہیں کہ سعید نے مدینہ منورہ میں وفات پائی اور دفن
ہوا۔ جو چینی حاجی حج کے بعد مدینہ منورہ جاتے ہیں انھیں سعید کی قبر دکھائی جاتی ہے۔
بارے میں تا حال کوئی فیصلہ نہیں ہو سکا۔ صرف یہی کہا جا سکتا ہے کہ ان میں سے ا

ے Ma.o - Chang-an ، ۔ اسلام یہ مقام صوبہ شنسی میں دریائے ہونگ ہو کے کنارے واقع ہے اور عاملہ
کا نام پہلے چنگ آن تھا۔

ہے اور دوسری نقلی۔

چین میں مسلمانوں کا پہلا قافلہ سمندر کے راستے آیا۔ اُن لوگوں نے سعید اور اُس کے
ل کے طریقِ عمل کی پیروی کی جن کی وجہ سے چین میں اسلام کا سنگِ بنیاد رکھا گیا تھا۔
ں بہت سے عرب اور ایرانی لوگ تجارتی اور مذہبی اغراض سے چین پہنچے، یہ لوگ
لافت کے زمانے میں بھی آتے رہے اور عباسی خلافت کے زمانے بھی جو لوگ
لافت کے زمانے میں آئے، وہ چین میں سفید پوش تاشی کہلائے۔ عباسیوں کے
میں چین اور اسلامی سلطنت کے درمیان تعلقات زیادہ خوش گوار ہو گئے تو عباسیوں
بر بھی آئے اُنھیں 'سیاہ پوش تاشی' کہا جاتا تھا۔ امویوں اور عباسیوں نے پانچ
چین بھیجے، بعض میں صرف چند آدمی شامل تھے، بعض میں کم و بیش بیس آدمی رکھے
تھے۔ یہ اپنے ساتھ شاہی دربار کے لیے نہایت قیمتی تحفے بھی لائے تھے چینیوں
کی وفدوں کا بڑا خیر مقدم کیا اور خلفاء کے لیے قیمتی اور اعلیٰ درجے کے تحفے اُن کے
کیے۔ یہ اس امر کا بدیہی ثبوت ہے کہ چینی اور مسلمان حکمرانوں کے تعلقات برابر
رہے۔

ست ۱۸۴ھ / ۶۵۱ء سے ۸۰۰ء تک ڈیڑھ صدی میں عرب
کے کاروباری آدمیوں کا خاصا بڑا گروہ بحری راستے چین پہنچا۔ یہ لوگ پہلے پہل
چاؤ میں آباد ہوئے پھر ساحلی علاقے کے ساتھ ساتھ پھیلتے گئے۔ بڑے بڑے
میں اُنھوں نے مرکز بنا لیے اور اُن کا سلسلہ آبادکاری ہنگ چاؤ تک جا پہنچا۔ وہ

و سکتا ہے کہ دونوں نقلی ہوں۔ راقم الحروف نے مدینہ منورہ میں سعد نام کسی صحابی کی قبر نہ دیکھی جو دوسری قبروں کے مقابلے میں
ف ہوتی یا عام معروف قبروں میں شمار ہوتی اور میں نے مدینہ منورہ کی زیارت اس وقت کی تھی جب نجدیوں نے جنت البقیع
یا دوسرے قبے گرائے نہیں تھے گویا جب قبریں اسی حالت میں تھیں جس حالت میں پہلے سے چلی آ رہی تھیں۔ [illegible]
یہ شنگھائی کے جنوب میں ایک خلیج کے سرے پر واقع ہے اور چین کی مشہور بندرگاہ ہے۔

جہاں جاتے، چندہ جمع کرتے اور مسجدیں بنا دیتے۔ یہی مسجدیں اُن کے مذہبی مراکز تھیں۔ یہ وسیع بنائی گئیں اور اُن کی تعمیر میں خاصا اہتمام کیا گیا۔ یہ اس امر کا ثبوت ہے کہ بنانے والے تاجروں کی مالی حالت خاصی اچھی تھی۔ ان میں سے بہت سی مشہور تاریخی مسجدیں اب تک محفوظ ہیں لیکن بعض مقامات پر مسلمان باقی نہ رہے اور مسجدیں تاریخی کھنڈروں کی شکل میں رہ گئیں۔ اس عہد میں عرب اور ایران کے تاجروں کا خاصا بڑا گروہ چین کے جنوبی صوبوں میں آباد ہو گیا۔ بہت سے لوگوں نے چینی عورتوں سے شادیاں کر لیں۔ مذہب اور مراسم کے اختلافات کے باعث یہ لوگ ہر آبادی میں ایک الگ مقام پر اکٹھے رہتے تھے، جہاں اپنے مذہبی واجبات کو پورا کرنے کے علاوہ باقی مراسم و رواجات آزادانہ ادا کرتے تھے، مثلاً شادیاں، تجہیز و تکفین کی رسمیں وغیرہ۔ ان کی اپنی عدالتیں تھیں، جو نکاح، طلاق، میراث اور دوسرے معاملات کے متعلق اسلامی شریعت کے مطابق فیصلے کرتی تھیں۔ اس سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ اُس زمانے میں اسلام کو چین کے اندر کتنا اثر و اقتدار حاصل تھا۔

جو عرب اور ایرانی تاجر سمندر کے راستے چین پہنچے انھوں نے تجارت میں بڑی کامیابی حاصل کی یعنی یہ ہے کہ درآمد و برآمد کے اجارہ دار بن گئے۔ سنگ خاندان کے عہد تک (۹۶۰ء۔ ۱۲۷۹ء) ۳۴۹ھ۔ ۶۷۸ھ) کونگ چاؤ میں غیر ملکی آبادی کا ایک حلقہ قائم ہو چکا تھا۔ جہازوں کے لیے ناظم اعلیٰ کا عہدہ مقرر ہو گیا تھا، اس کا کام یہ تھا کہ بندرگاہ میں آنے جانے والی تمام جنسوں پر نظر رکھے، محصول وصول کرے اور دوسرے تجارتی معاملات کو دیکھے۔ یہ عہدہ ہمیشہ کسی مسلمان کو دیا جاتا۔ اس سے واضح ہو سکتا ہے کہ اُس وقت تک مسلمان تاجروں کی مجلسی حیثیت کتنی اچھی اور تعداد کتنی زیادہ تھی۔

اُدھر سمندر کے راستے آنے والے مسلمان جنوبی ساحل پر آباد ہو رہے تھے، اِدھر خشکی کے راستے اسلام شمال و مغرب کی جانب سے چین پہنچ گیا۔ کچھ مدت تک شمالی اور مغربی چین کے قبائل سرحدی فسادات کا باعث بنے رہے تھے، جب عربوں نے اُنھیں مسخر کر لیا تو

آہستہ آہستہ اسلام کے حلقہ بگوش بن گئے۔ سنگ خاندان کے دورِ حکومت میں شہنشاہ
سنگ کو ۱۳۸ھ (۷۵۵ء) میں بغاوت سے سابقہ پڑا اور وہ زیچوان؎ کے صوبے
میں پناہ لینے پر مجبور ہوا۔ اس حالت میں اُس نے شمالی و مغربی چین کے مسلمانوں سے مدد مانگی،
انھوں نے آٹھ ہزار سپاہی بھیج دیے۔ ان لوگوں کی بیش قیمت خدمات کے صلے میں
سنگ نے یہ پیش کش کی کہ یا تو وہ لوگ بیش قیمت تحفے لے کر اپنے وطن واپس
جائیں یا چین ہی میں آباد ہو جائیں۔ ان سپاہیوں نے آخری پیش کش قبول کر لی شہنشاہ
نے اُن میں سے ہر ایک کو کھیتی باڑی کے لیے عمدہ زمین دی اور آٹھ ہزار چینی دوشیزائیں
ان کے لیے مہیا کر دیں۔ ان لوگوں کو زمین اور گھر مل گئے تو امن و راحت سے زندگی گزارنے
لگے۔ شمالی اور مغربی چین میں مسلمانوں کے اولاً یہی نئے آبادکار تھے۔ چونکہ تعلقات خوشگوار
ہو گئے تھے، اس لیے بہت سے مسلمان کاروبار کی غرض سے چین پہنچے اور اُن میں سے
بڑی تعداد وہیں آباد ہو گئی۔ بعد ازاں ایرانی اور افغانی تاجر بھی شمال و مغرب کی طرف
سے چنگ سان آئے اور اس طرح خشکی کے راستے سے بھی چین اسلام سے متعارف
ہوا۔

چین میں اسلام کا عروج و زوال

ٹنگ خاندانِ حکومت (خاتمہ ۲۹۵ھ، ۹۰۷ء) اور سنگ خاندان
(۳۴۹ھ - ۶۶۸ھ، ۹۶۰ء - ۱۲۷۹ء) کے زمانے میں
ممالکِ غیر کے ساتھ تجارت بہت ترقی کر گئی۔ عرب اور ایران کے
تاجر چین سے ریشم، بعض فنی مصنوعات، چینی کے برتن اور دوسری جنسیں شرق اوسط اور
یورپ لے جاتے تھے اور باہر سے جڑی بوٹیاں، مسالے، موتی اور شرق اوسط کی
دوسری خاص مصنوعات چین لاتے تھے۔ بہت سی نفع بخش تجارتوں میں انھوں نے دلالی

؎ T Hsuang SZECHWAN شنسی کے جنوب مغرب میں یہ چین کا مشہور صوبہ ہے۔ چین
کا یانگسی کیانگ اس میں سے بھی گزرتا ہے۔

کا کاروبار سنبھال لیا۔ اس طرح تجارت ترقی کر گئی، ساتھ ساتھ وہ مذہب کی اشاعت بھی کر رہے۔ تجارت کی ترقی کے باعث شرقِ اوسط سے نئے نئے تاجر چین پہنچ کر توطن اختیار کرتے گئے اس طرح ملک کے جنوبی و مشرقی اور شمالی و مغربی حصوں میں جابجا مسلمانوں کی بہت سی آبادیاں قائم ہو گئیں۔ یہ آبادیاں چینی معاشرے میں ایک زبردست قوت بن گئیں چونکہ مسلمان بڑے اہتمام سے قانون کی پابندی کرتے تھے اور بڑے خوش نظم شہری نیز اُن کی مالی حالت اچھی تھی، اس وجہ سے چین کے لوگ انھیں احترام کی نظر سے دیکھتے اور اُن کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم رکھتے تھے۔ یہی اسباب تھے جن کی بنا پر انھیں حکومت کا اعتماد و تحفظ بھی حاصل ہو گیا۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ تنگ خاندان اور سُنگ خاندان کے زمانے میں حکمران طبقے کے اندر کوئی ایسا احساس نہ تھا جس میں کسی بیرونی قوم کی مخالفت کا شائبہ پایا جاتا ہو اس وجہ سے مسلمان تعداد میں بڑھتے اور اندرونِ ملک میں برابر پھیلتے رہے اس زمانے میں چینی اور اسلامی ثقافتیں ہم آہنگی اور رواداری کی بنا پر پہلو بہ پہلو زندگی بسر کرتی رہیں۔

یوان خاندان (تاتاری) کو خود اہلِ چین غیر ملکی حکمران خاندان سمجھتے تھے کیونکہ یہ خاندان چنگیز خاں سے شروع ہوا تھا جس کی تاتاری فوجوں نے چین، وسط ایشیا، ایران، عرب اور مشرقی یورپ کے بعض حصوں پر قبضہ کر لیا تھا جب یہ علاقے مختلف پادشاہوں میں تقسیم ہوئے تو قبلائی خاں چین اور منگولیا کا حکمران بن گیا اور اُس نے یوان خاندان کی بنیاد رکھی دوسرے علاقوں میں جو تاتاری حکومتیں تھیں اُن میں سے وسطی ایشیا کے حکمرانوں نے اسلام قبول کر لیا۔ تاتاریوں کے زیرِ اثر تمام علاقوں میں راستوں کا امن قائم تھا اور یہ لوگ بے تکلف آتے جاتے تھے۔ اس طرح مختلف باشندوں اور ثقافتوں کے درمیان میل جول قائم رہا۔ اہلِ چین وسط ایشیا سے ہی آتے رہے، عرب، ترک اور ایرانی چین پہنچتے رہے۔ اس دور سے بھی مسلم تاجر، طبیب، فضلا، ہیئت دان، نجومی، چین میں توطن پذیر ہوئے۔ تاتاری

...وں میں اعلیٰ درجے کے مسلمان ماہرین عسکریت بھی مشیروں، مددگاروں اور افسروں کی حیثیت میں
...یک تھے وہ بھی چین میں مقیم رہے، اگرچہ یوآن خاندان کا اصل وطن منگولیا تھا۔ مسلمان اپنے فوجی
و دیوانی عہدوں کی بدولت و قعت میں بہت بڑھ گئے، اس طرح انھیں اپنے مذہب کی
...عت میں بہت آسانیاں نظر آئیں۔ پروفیسر منگ سیو وُو چین کا مشہور مورخ اور استاذ تاریخ
...ے۔ وہ کہتا ہے کہ پیکن کے شاہی دربار میں تیس سے اوپر اعلیٰ اُمرا صرف مسلمان تھے اور
...یوں میں سے نو کی گورنری مسلمانوں کے قبضے میں تھی۔

شاہی دربار کے بلند پایہ ذمہ دار مسلمانوں میں سے سید اجل کو خاص امتیازی حیثیت
...مل تھی۔ وہ مختلف عہدوں سے ترقی کرتے کرتے اُس تاتاری فوج کا سپہ سالار بن گیا تھا
زیچوان کے لیے نامزد تھی ۱۲۷۲ء میں اُسے زیچوان کا گورنر بنا دیا گیا۔ دو
...ال کے بعد صوبہ یونّن کی گورنری اُس کے حوالے کی گئی۔ یہاں اُس کے شاندار دورِ حکومت
...ں چینی ثقافت کو بڑی تقویت پہنچی۔ لوگ تعلیم سے آشنا ہوئے، اُن کی کھیتی باڑی کے
...ریقے سدھر گئے اور اُن کے لیے آئینی حکومت کا بندوبست ہوا۔ سید موصوف نسلی
... اذہبی تعصب سے بالکل پاک تھا۔ وہ مذہب کی اشاعت میں جبر کا ہرگز قائل نہ تھا،
بلکہ اُس نے صوبہ یونّن میں کنفیوشیش کے نام پر کئی معابد بنوائے۔ آج وہاں جو مختلف
...قافتی نمونے نظر آتے ہیں، وہ اسی عظیم القدر گورنر کی کوششوں کا نتیجہ ہیں جس کا نام آج
...ھی باشندگانِ یونّن بڑے احترام سے لیتے ہیں۔ اگر مذہب کا اختلاف حائل نہ ہوتا تو
چینی لوگ بہت پہلے اپنے معابد میں اُس کی عبادت بھی شروع کر دیتے۔

ایران کا مشہور مورخ رشید الدین فضل اللہ اپنی ممتاز تاریخ جامع التواریخ میں ——
...س کی پہلی جلد تاتاریوں سے متعلق ہے یہ ہمیں بتاتے ہیں:
قبلائی خاں کے زمانے میں چین کے بارہ انتظامی حلقے تھے ہر حلقے میں

... Ting ...

ایک گورنر اور ایک نائب گورنر ہوتا تھا۔ بارہ گورنروں میں سے آٹھ مسلمان تھے باقی حلقوں میں مسلمان نائب گورنری کے عہدے پر مامور تھے۔

اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یوآن خاندان کے زمانے میں چین کے اندر مسلمانوں کے درجے اور اہمیت کا کیا حال تھا۔

یوآن خاندان کی حکومت قریباً نوے سال ۶۷۸ھ - ۷۷۰ھ (۱۲۷۹ء - ۱۳۶۸ء) قائم رہی پھر اس کا تختہ الٹ گیا اور منگ خاندان کی حکومت قائم ہوئی۔ یہ خاندان قریباً تین سو سال برسرِ حکومت رہا (۷۷۰ھ - ۱۰۵۴ھ / ۱۳۶۸ء - ۱۶۴۴ء) اس میں مسلمانوں نے چین کی اجتماعی اور قومی زندگی میں بڑا اہم کردار ادا کیا اور اسلام بالکل چین پر ایک ہر دل عزیز مذہب کی حیثیت حاصل کر گیا۔

منگ خاندان کے آغاز میں اسلام کو چین پہنچے ہوئے سات سو سال گزر چکے تھے۔ مسلمانوں کی جو کثیر تعداد چین میں آباد ہو گئی تھی، انھوں نے اسلام کی بنیادیں مضبوط کر دی تھیں، لیکن اس مدت میں ان کی اجنبی حیثیت قائم رہی۔ اُن کی اپنی زبان تھی، اپنے رسم و رواجات اور اپنے اوضاع و اطوار تھے۔ وہ مختلف حیثیتوں سے باشندگانِ چین کے ساتھ کامل ارتباط پیدا نہ کر سکے۔ منگ خاندان کے زمانے میں اجنبی اثر زائل ہو گیا۔ باہر سے آنے والوں کا سلسلہ کٹ گیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمان بھی آہستہ آہستہ اپنی اجنبی حیثیت کو بھول گئے اور وہ چین کے شہری بن گئے، حتیٰ کہ انھوں نے رہنے سہنے کے بھی وہ طریقے اختیار کر لیے جو چینیوں میں رائج تھے۔

چینی بن جانے کی ایک نہایت نمایاں مثال یہ ہے کہ مسلمانوں نے خاندانی نام چینیوں کے اختیار کر لیے۔ بہت سے مسلمانوں نے چینی عورتوں سے شادیاں کر لی تھیں اور ہر ایک اپنی بیوی کے خاندان میں شامل ہو گیا تھا۔ اکثر مسلمانوں نے ایسے چینی نام اختیار کیے جو بولنے میں ابتدائی ناموں سے قریب تر تھے۔ مثلاً خاندانی نام

ں "چین کے ایک مشہور خاندان کا نام تھا اور بہت سی تاریخی شخصیتیں ایسی بروئے کار آئیں جن
تعلق اس خاندان سے تھا، بہت سے مسلمانوں نے بھی "ما" کا خاندانی نام اختیار کر لیا، اس
ہے کہ اُن کے نام صرف میم سے شروع ہوتے تھے، نیز چینی زبان میں "ما" گھوڑے کو کہتے ہیں
مسلمانوں کو گھوڑے سے بھی بڑی محبت تھی بغرض شمالی وجنوبی چین میں اتنے مسلمانوں نے
"کا خاندانی نام اختیار کر لیا کہ مثل مشہور ہو گئی کہ دس مسلمانوں میں سے نو "ما" جن چینی مسلمانوں
کے نام محمد، مصطفیٰ، مراد، مسعود تھے اُنھوں نے، مائی اور مُو کے خاندانی نام اختیار کر لیے۔
ت سے مسلمان ایسے بھی تھے جنھیں اپنے ناموں سے ملتا جلتا کوئی خاندانی نام چین میں نہ مل
سکا۔ انھوں نے ایسے چینی حروف اختیار کر لیے جو اُن کے ناموں سے ملتے جلتے تھے، مثلاً
ؤد اور طاہر کے لیے "تا" حسن کے لیے "ہا" حسین کے لیے "ہو" جلال الدین شمس الدین
قمرالدین کے لیے "ثنگ" سعید اور سعد کے لیے "سائی" ناصر اور نجیب کے لیے "نا"
لم، صالح اور صبیح کے لیے "شا" عیسیٰ اور امین کے لیے "اُسے"

مسلمانوں کی غذا اور اُن کے لباس بھی چینی بن گئے، لیکن اس سلسلے میں ان چیزوں کا
ستعمال بہ دستور ممنوع رہا جو اسلام کے رُو سے حرام تھیں مثلاً سور کا گوشت یا شراب۔ چینی زبان
سلمانوں نے اپنالی۔ اُن کے بچے مقامی چینی بول چال میں بات چیت کرتے اور تعلیم میں چینی
تابیں پڑھتے۔ نسبتاً تھوڑے وقت میں چینی مسلمان سراپا چینی بن گئے۔ چند مذہبی خصائص
و مستثنیٰ کرتے ہوئے مسلمانوں اور عام چینیوں کے درمیان تمیز کا کوئی پہلو نہ تھا مسلمانوں کو
زت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ اُن کے خلاف کسی تعصب کا اظہار نہیں کیا جاتا تھا اور وہ مساوات
سے مستفیض تھے۔ کاروبار، زراعت اور سرکاری ملازمتوں کے یکساں مواقع انھیں حاصل تھے۔

منگ خاندان کا عہدِ حکومت چینی مسلمانوں کے لیے عروج کا سنہری دور تھا۔ طویل مدت
لک امن قائم رہا، ملک کو خوش حالی نصیب ہوئی۔ اس وجہ سے فنون اور ثقافت نے بڑی ترقی
ی مسلمان برابر اس ترقی میں حصہ دار رہے۔ ممتاز مسلمانوں نے منگ خاندان کی حکومت قائم

کرنے میں مددی تھی۔ یونگ لو (۱۴۰۳ء تا ۱۴۲۴ء بمطابق ۸۰۵ھ تا ۸۲۷ھ) کے عہد میں
ممتاز مسلمان مدبر چینگ ہو کو اس غرض سے سفیر بنا کر بھیجا گیا کہ وہ بحر الکاہل کے جنوبی ملکوں
ہندوستان، عرب اور مشرقی افریقہ کی حکومتوں کے ساتھ چین کے دوستانہ تعلقات قائم کرے
منگ خاندان کے زمانے میں مسلمانوں کو برابر اقتدار حاصل رہا۔ بعض مورخ اس حد تک آگے نکل
کہ اُنھوں نے کہا منگ خاندان دراصل مسلمان خاندان تھا۔ اس دعوے کا ایک ثبوت بھی ملتا
اور وہ یہ کہ خاندان کا بانی منگ تائی تسو مسلمان تھا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ تائی تسو کی بیوی ملکہ
مسلمان تھی اور اُس کے بہت سے ذمے دار افسر مسلمان تھے۔ تائی تسو نے تخت نشینی
بعد کبھی کسی چینی معبد میں جا کر عبادت نہ کی۔ شراب پینے کی ممانعت کر دی اور رسول اللہ صلعم
نعت میں ایک گیت تیار کیا، جواب تک نانکن کی مسجد جامع میں بہ شکل "کتابہ" موجود ہے۔ مو
نے اُس کا جو حلیہ بیان کیا ہے، اُس سے بھی یہی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ غالباً کسی ایرانی یا عر
کی اولاد تھا۔ بہر حال منگ خاندان کے زمانے میں مسلمانوں سے بڑا اچھا برتاؤ ہوتا تھا ا
چینیوں کے ساتھ ان کے تعلقات بہت خوش گوار تھے۔

اس کے بعد چنگ خاندان (مانچو) آیا جو ۱۶۴۴ء سے ۱۹۱۱ء (۱۰۵۴ھ سے ۱۳۲۹ھ) تک
تک حکمران رہا۔ یہ چین کا آخری شاہی خاندان تھا اور چینی نہ تھا بلکہ اجنبی اور غیر ملکی تھا۔ مانچوؤں کی
اقلیت چین پر مسلط ہو گئی تھی۔ اُنھوں نے قوت کے بل پر اقتدار قائم کیا اور آخری وقت تک
چینیوں، مسلمانوں، تاتاریوں اور تبتیوں کی اکثریت پر حکم چلاتے رہے۔ اُنھوں نے پھوٹ
ڈالو اور حکومت کرو کی ظالمانہ پالیسی پر عمل کرتے ہوئے ملک کے مختلف طبقوں کو ایک دوسرے
کے خلاف کھڑا کر دیا۔ اسی زمانے سے چینی مسلمانوں کا زوال شروع ہو گیا۔ چنگ خاندان کے
حکمرانوں کو پہلے ہی سے مسلمانوں کا اقتدار پسند نہ تھا۔ اب اُنھیں یہ خطرہ بھی پیدا ہو گیا کہ مسلمان کو

ل Young Lo ـ Cheng Ho
ـ Ming Tai Tsu

ی انقلاب پیدا کر کے پھر منگ خاندان کے لوگوں کو برسر اقتدار لے آئیں گے لہذا انھوں نے
ف تدبیریں اختیار کر کے مسلمانوں کے خلاف شدید جذبہ پیدا کر دیا۔ چینی مسلمانوں نے حکمرانوں
ان حرکتوں کا جواب بارہا تشدد سے دیا۔ چنانچہ وہ فوج کے ہاتھوں بری طرح برباد ہوتے
ہے چونکہ یہ فوجیں عموماً اہل چین پر مشتمل ہوتی تھیں اس لیے چینیوں اور مسلمانوں میں بھی دشمنی پیدا
ئی۔ حالات کا اندازہ اسی واقعے سے کر لیجیے کہ ۱۲۳۶ھ سے ۱۲۹۳ھ (۱۸۲۰ء سے ۱۸۷۶ء)
ب چار مرتبہ مسلمانوں نے بڑی زبردست بغاوتیں کیں ان میں جانی اور مالی نقصان بھی بڑا سخت ہوا
مسلمانوں میں روحانی اور نفسیاتی حیثیت سے جو رد عمل ہوا وہ بھی بڑا افسوس ناک تھا۔ مسلمانوں
ے دل میں سرکاری افسروں اور چینیوں کے خلاف شدید نفرت پیدا ہو گئی۔ انھوں نے اپنے
ں کو تاکید کر دی کہ کوئی چینی کتاب نہ پڑھو اور حکومت کے لیے کوئی کام نہ کرو۔ زندگی کے
لق انھوں نے ایک غیر اہم سا تصور پیدا کر لیا۔ حکومت سے الگ ہو گئے، سیاسیات سے
ہی چھوڑ دی صرف مذہب اُن کے لیے راحت و اطمینان کا سب سے بڑا سرچشمہ رہ گیا،
ں طرح وہ قومی سیاست کے دائرے سے نکل گئے اور چین میں مسلمانوں کی حالت جزر کی
ڑی منزل پر پہنچ گئی۔

مانچو خاندان کا تختہ الٹا اور چین میں جمہوری حکومت قائم ہوئی تو مسلمانوں کے لیے پھر
یک نیا دور شروع ہوا۔ جمہوریت کے بانی ڈاکٹر سن یاٹ سین نے تدبر اور اندیشے سے کام
لیتے ہوئے اعلان کیا تھا کہ جمہوریت کا تعلق پانچ نسلوں سے ہے ــــــــ ہن (چینی)
ن (مانچو)، منگ (منگول یعنی تاتاری)، ہوئی (مسلمان) اور سنگ (تبتی)۔ جمہوریت کے ان
پانچ اجزائے ترکیبی کے لیے مساوات کا اعلان کر دیا گیا۔ گویا یہ گروہ بہت بڑے خاندان کے
انچ بھائی تھے جن میں سے ہن یعنی چینیوں کو سب سے بڑے بھائی اور خاندان کے رئیس کی حیثیت حاصل تھی۔

جمہوریت میں مسلمانوں کو پھر پہلے کی سی اہمیت حاصل ہو گئی۔ مانچو ختم ہو چکے تھے،
جمہوریت رواداری کے مسلک پر قائم تھی، مسلمانوں کے دل میں پھر اعتماد کی روح پیدا ہوئی اور

انھوں نے ملکی معاملات میں سرگرمی سے حصہ لینا شروع کیا۔ انقلابی جنگوں کے علاوہ کمیونسٹوں کے خلاف جنگوں میں نیز چین اور جاپان کی جنگ میں مسلمانوں نے روپے سے بھی امداد دی اور اُن کے آدمی بھی فوجوں میں بھرتی ہوئے۔ اب جب کہ کمیونسٹ چین پر مسلّط ہو گئے ہیں، چین کے مسلمان اپنے چینی بھائیوں کے ساتھ مل کر آزادی کے لیے کوشاں ہیں۔ جب چین کمیونسٹوں کے قبضے میں آ گیا تو مسلمانوں کے بڑے بڑے لیڈر چیانگ کائی شک کی حکومت کے ساتھ جزیرہ تیوان (فارموسا) میں چلے گئے۔ انجمن اسلامیۂ چین بھی جو پانچ کروڑ چینی مسلمانوں کی روح آزادی کی جدوجہد جاری رکھنے کے لیے تیوان پہنچ گئی۔ جو کم نصیب مسلمان چین میں رہنے پر مجبور ہو وہ اب تک چند مستثنیات کے ساتھ چینی جمہوریت کے وفادار ہیں، اگرچہ کھلم کھلا کمیونسٹوں کی مخالفت نہیں کرتے۔ اس کے اسباب کا اندازہ مشکل نہیں۔ کمیونسٹ مذہب کے دشمن اور خالق کے وجود کے منکر ہیں۔ چینی مسلمانوں کو کمیونسٹوں کی فریب کاری اور جبر و تشدد کا ذاتی تجربہ ہو چکا ہے۔ وہ جب موقع پائیں گے تو یقیناً بغاوت کریں گے، البتہ اُن کی تعداد بہت کم ہے نیز اُن کے پاس آلات و اسلحہ نہیں۔ اس وجہ سے وہ ظالموں کے پنجے میں پھنس گئے ہیں۔ فی الحال چین کے کمیونسٹ امن کی پالیسی پر قائم ہیں اور انھوں نے مسلمانوں کے ساتھ اس غرض سے مصالحت کی پالیسی اختیار کر رکھی ہے کہ باقی اسلامی ملکوں کی دوستی اور ہمدردی حاصل کر لیں، لیکن اس قسم کی عیارانہ تدبیریں چینی مسلمانوں کو دھوکا نہیں دے سکتیں۔

مسلمان مسلمانانِ چین کی تعداد کے متعلق روایات مختلف ہیں۔ ۱۹۴۸ء میں چینی سال نامے میں جو چنکنگ میں چھپا تھا، بیان کیا گیا ہے کہ مسلمانوں کی کل تعداد چار کروڑ اکاسی لاکھ چار ہزار ہے۔ حکومت نے جو اندازہ کرایا، اُس میں تعداد پانچ کروڑ کے قریب بتائی گئی اور چینی مسلمان اسے صحیح اور قابلِ اعتماد اعداد و شمار قرار دیتے ہیں۔ غرض مسلمانوں کی آبادی پانچ کروڑ فرض کر لی جائے تو سمجھنا چاہیے کہ وہ چینی آبادی کا ۱/۹ حصہ ہیں۔ گویا چینی قوم کے پانچ نسلی اجزا میں وہ دوسرا بڑا جزو ہیں۔ اس لحاظ سے اجزا کی ترتیب یہ قرار پاتی ہے:

۱۔ہن یعنی چینی

۲۔ہوئی یعنی مسلمان

۳۔منگ یعنی منگول یا تاتار

۴۔سنگ یعنی تبتی

۵۔من یعنی مانچو

حال ہی میں کمیونسٹوں نے اعلان کیا ہے کہ مسلمانوں کی آبادی کل ایک کروڑ ہے۔ اسے
ں پروپیگنڈا سمجھنا چاہیے۔ مسلمانوں کی سب سے زیادہ آبادی شمال و مغرب اور شمال و مشرق
و ہے۔ اس کے بعد یونان، ہوپی اور شان تنگ آتے ہیں۔ جنوب مغرب میں یوقن اور
ران کے صوبوں میں آبادی زیادہ ہے۔ جنوب مشرق میں وادی ینگ سی کے ساتھ ساتھ
ہوائی کے صوبے میں مسلمانوں کی تعداد بڑھی ہوئی ہے۔ اگرچہ زمانہ سابق میں ساحلی صوبوں
ے اندر مسلمانوں کی تعداد سب سے زیادہ تھی، مثلاً کینگ سو، چی کیانگ، فوکین، کوانگ ٹنگ،
ں اب وہاں مسلمان بہت ہی کم تعداد میں رہ گئے ہیں۔ سابقہ آبادی کی حیثیت کا اندازہ
ت اس حقیقت سے ہو سکتا ہے کہ جب منگ خاندان نے نانکن کو مرکزِ حکومت بنایا تھا
ں شہر میں چھتیس مسجدیں تھیں۔ تازہ تحقیقات سے پتا چلا ہے کہ تیوان (فارموسا) میں بہت
ے سے مسلمان آباد تھے، لیکن اب اُن کی تعداد پانچ چھ ہزار سے زیادہ نہیں۔ یہ لوگ
وہ تر ماہی گیر ہیں اور جزیرے کے مغربی ساحل پر رہتے ہیں۔ ان کے آبا و اجداد بظاہر
ن سے آئے تھے۔ وہاں مسلمانوں میں کوئی اچھا لیڈر نہ تھا۔ پھر یہ جزیرہ چین سے الگ
ا اور جاپان نے وہاں اپنا اقتدار قائم کر لیا تھا۔ اس وجہ سے مسلمان وہاں دب گئے۔ اُن کی حالت
ا بھیڑوں کی سی تھی جو راستہ گم کر چکی ہوں اور گڈریے کا انتظار کر رہی ہوں۔ اُن
ں مذہبیت کا صرف یہ جوہر باقی ہے کہ سور کا گوشت نہیں کھاتے۔

ابتدائی زمانے میں مسلمان زیادہ تر دولت مند تاجر تھے۔ یون کے عہدِ حکومت میں وہ

بڑے عہدوں پر بھی فائز ہوئے۔ منگ کے زمانے میں بھی اُنھوں نے علمی اعتبار سے
بڑے عہدے حاصل کیے، شمال میں حمل و نقل کا پورا کاروبار اُن کے قبضے میں تھا۔ گدھوں
گھوڑوں اور اونٹوں کے قافلے اُن کے پاس تھے۔ "دریائے ینگ سی اور دریائے
کے ساتھ باان صوبوں میں جہاں نہریں تھیں اور چاول کی کاشت ہوتی تھی، وہاں جتنا غلہ
جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتا تھا، سب مسلمان لے جاتے تھے۔ اس کی شہادت
بھی مل سکتی ہے، اس لیے کہ ان علاقوں میں غلے کے تاجر ایرانیوں کی تجارتی اصلاحات
اور اعداد استعمال کرتے ہیں، اگرچہ آج کل کے تاجر مسلمان نہیں اور وہ ان اصطلاحات
لُغوی معنی ذہن نشین کیے بغیر اُنھیں استعمال کر رہے ہیں۔

مانچو خاندان کے دورِ حکومت میں تجارت و مالیات پر مسلمانوں کی گرفت باقی رہی
آج کل مسلمان جو کاروبار کرتے ہیں اُس کی کیفیت یہ ہے کہ جواہرات یا نادر فنی چیزیں فروخت
ہیں چمڑے کا کام اُن کے ہاتھ میں ہے۔ چائے خریدتے اور بیچتے ہیں، جانور خریدتے
اُنھیں پالتے ہیں کھیتی باڑی بھی کرتے ہیں اور چائے خانے بھی کھول رکھے ہیں قیمتی جواہر
یا موتی یا پُرانی بیش بہا چیزیں نیز خطاطی اور مصوری کے اعلیٰ نمونوں کا کاروبار کرنے
لیے خاص تربیت اور تجربہ ضروری ہے، اس لیے کہ یہ چیزیں دولت مند تاجروں یا بادشاہوں
کے ہاتھ بیچی جاتی ہیں۔ جب مانچو خاندان ختم ہوا تو پیکن اور چین کے دوسرے شہروں میں
بیش قیمت چیزوں کا پورا کاروبار مسلمانوں ہی کے ہاتھ میں تھا۔ آج بھی وہی سب سے آگے
حال ہی میں تیوان کی چینی حکومت نے مسلمان ماہرین اپنے پاس بلائے تھے تاکہ خزانے
جواہرات پرکھ دیں۔

چین کے شمال مغرب اور شمال مشرق میں مسلمان زیادہ تر سمور یا قیمتی جانوروں کی کھالیں
فروخت کرتے ہیں۔ یونّن میں اُنھوں نے چائے کے باغ لگا رکھے ہیں اور تبت، سنکیانگ
برما، تھائی لینڈ، نیپال اور بھوٹان سے ان کے کاروباری تعلقات ہیں۔ چائے گدھوں اور

لاد کر بڑے دشوار گزار راستوں سے آس پاس کے ملکوں میں بھیجی جاتی ہے۔ شمال مغرب جو ان واقع ہے، وہاں مویشی، بھیڑیں، گھوڑوں اور اونٹوں کی پرورش خوب ہو سکتی ہے۔ مسلمانوں کا وطن ہے اس لیے وہ جانور خوب پالتے ہیں۔ چونکہ مسلمانوں کے یہاں جانور طریقے پر ذبح کیے جاتے ہیں اس لیے ذبیحہ کا پورا کاروبار صرف شمال مغرب ہی میں دوسرے صوبوں میں بھی مسلمانوں نے سنبھال رکھا ہے، لیکن وہ سور نہیں پالتے۔

ان پیشوں کے علاوہ مسلمانوں نے پورے چین میں وسیع پیمانے پر ریسٹوران بھی قائم ہے ہیں۔ ان کا کھانا پکانے کا طریقہ چینیوں سے مختلف ہے، لہٰذا انھوں نے اپنے ہر ن پر خاص نشان بنا رکھے ہیں۔ بہت سے مسلمان کھیتی باڑی کرتے ہیں، شہروں میں مسلمان ں ہیں، ڈاکٹر، انجینیئر، قانون داں اور معلم بھی۔ صحافتی کام کرنے والوں کی تعداد بھی خاصی چونکہ مسلمان عموماً بہادر ہوتے ہیں، چھوٹے پیشے اختیار نہیں کرتے۔ مثلاً کوئی مسلمان ل بنے گا، نہ ناخن کاٹے گا، نہ مالش کرے گا۔" مسلمان لڑکیاں طوائف کا پیشہ اختیار ہیں۔ اگر کسی مسلمان لڑکی کے متعلق پتا چل جائے کہ وہ بری صحبت کا شکار ہو گئی ہے تو مسلمان جماعت اس کی شادی کا انتظام کر دیتی ہے۔ اس سے واضح ہے کہ مسلمان منظم ہیں اور ان میں تعاون کی روح کارفرما ہے۔

مسلمانوں کے مراسم

چینی مسلمانوں کے مراسم اہل چین، مانچوؤں، تاتاریوں اور تبتیوں سے بالکل مختلف ہیں اور اسے اسلام کی برکت سمجھنا چاہیے جو لوگ خدا کو نہیں مانتے ــــــ جیسے کنفیوشس یا تاؤ کے پیرو ــــــ یا جو بہت سے خداؤں کو مانتے ہیں، مثلاً بدھ مت کے پیرو، ان کے مراسم ں ہو سکتے جو اہل توحید کے ہیں۔ اسلامی قواعد و ضوابط کے مطابق سور کا گوشت، بعض غذائیں، مردہ جانور، خون یا اسلامی طریقے کے خلاف مارے ہوئے جانور کا گوشت ہے۔ مسلمانوں کے لیے لازم ہے کہ اس پر کاربند رہیں۔ ان حالات میں طبعی طور پر یہی ہو سکتا

تھا کہ مسلمانوں کے مراسم دوسروں سے الگ ہوں۔

بہت سی مشکلات کے حل کا طریقہ یہ سمجھا گیا کہ بڑے شہروں میں جہاں مسلمانوں کی آبادی معتد بہ تھی چینیوں اور مسلمانوں کے رہنے سہنے کے حلقے الگ الگ کر دیئے گئے۔ مسلمان جداگانہ حلقوں میں رہتے ہوں یا نہ رہتے ہوں، لیکن ان کے مکانوں کا اختلاف بہ آسانی معلوم ہو جاتا ہے۔ مثلاً چینیوں کا یہ طریقہ ہے کہ اپنے نوروز کی تقریب پر گھر کے دروازے کے دونوں جانب وہ دو دیوتا رکھ دیتے ہیں اور دروازے کی چوکھٹ پر پوسٹر لگا دیتے ہیں۔ اس کے برعکس مسلمانوں کے گھروں کے سامنے ایسی کوئی چیز نہ ملے گی۔ وہ گھروں کو اندر اور باہر سے بہت صاف اور ستھرا رکھتے ہیں اور اُن کی وضع و قطع بالکل طبعی ہوتی ہے۔ کسی چینی کے گھر چلے جاؤ، وہاں جگہ جگہ دیوتاؤں، آباو اجداد اور زمین و آسمان کے شاہنشاہوں کی مورتیاں ملیں گی۔ ان کے آس پاس برابر خوشبو سلگتی رہتی ہے۔ مسلمانوں کے گھروں میں ایسی کوئی چیز نظر نہ آئے گی۔ چینیوں نے چاروں موسموں کے لیے جشن تجویز کر رکھے ہیں اور ہر جشن کے موقع پر وہ خاص جڑی بوٹیوں میں سے کوئی چیز اپنے گھروں میں لٹکا لیتے ہیں۔ مسلمانوں کے گھر ایسی تمام چیزوں سے پاک رہتے ہیں۔ اکثر مسلمانوں کے گھروں میں غسل خانے ہوتے ہیں، تاکہ وضو یا غسل کر کے نماز ادا کر سکیں۔ چینیوں کے ہاں بہت کم غسل خانے ہوں گے، نیز وہ نہانے کے لیے عموماً لکڑی کے ٹب استعمال کرتے ہیں۔ زمانہ حال میں جو عمارتیں بنیں، اُن میں چینیوں نے بھی غسل خانے بنا لیے۔ اب مسلمان اور چینی کے گھر کا یہ فرق بہت کم ہو گیا ہے۔

چینی مسلمانوں کا لباس عام چینیوں کا سا ہوتا ہے۔ البتہ سنکیانگ کے بعض اور قبائل یا شمال و مغرب کے قازاق جداگانہ لباس استعمال کرتے ہیں۔ بایں ہمہ مسلمانوں اور غیر چینیوں کے لباس میں بھی کچھ نہ کچھ فرق ضرور ملے گا۔ شمال و مغرب میں مستورات باہر نکلتی ہیں تو چہرے پر نقاب ڈال لیتی ہیں اور بعض صوبوں میں عورتیں دستار باندھتی ہیں۔ شمالی و مغربی صو

یے مرد سفید رنگ کی ٹوپیاں پہنتے ہیں۔ اس کے برعکس سنکیانگ کے مردوں کو وہ ٹوپیاں
ند ہیں جو رنگ دار بھی ہوں اور ان پر بیل بوٹے بھی کڑھے ہوئے ہوں۔ وہاں بعض لوگ سفید
ں یا زرد ریشم کی پگڑیاں باندھتے ہیں۔ دوسرے صوبوں کے مسلمان جمعہ کی نماز کے لیے مسجدوں
ں جاتے ہیں تو سفید ٹوپیاں سر پر رکھ لیتے ہیں، مرد اور خصوصاً علما ریشم قطعاً نہیں پہنتے، اس
یے کہ ممنوع ہے۔ رسول اللہ صلعم نہیں چاہتے تھے کہ مسلمان مرد تن آسانی کے عادی بن
ئیں اور شجاعت اور مردانگی کھو بیٹھیں۔ البتہ عورتیں ریشمی کپڑے پہن سکتی ہیں۔ عام چینی اپنے
ں کو گلے کا کوئی زیور یا حمائل ضرور پہنا دیتے ہیں، تاکہ وہ شیطان کے اثر سے محفوظ رہیں۔
صرف وہم پرستی ہے۔ مسلمان ایسی وہم پرستی سے بالکل آزاد ہیں، ان کے بچے کچھ نہیں پہنتے
چینیوں میں عام طریقہ یہ ہے کہ ٹوپیوں کے ارد گرد ایک عبارت کاڑھ دی جاتی ہے جس میں
درازیِ عمر کی دعا ہوتی ہے اس کے برعکس مسلمانوں کی ٹوپیوں پر کلمہ شہادت کاڑھا جاتا ہے
سفید رنگ پاکیزگی اور نظافت کا نشان ہے، مسلمان عموماً سفید لباس پہنتے ہیں۔ رسول اللہ صلعم
و سبز رنگ پسند تھا اس لیے وہ سبز رنگ بھی استعمال کرتے ہیں۔ مانچوؤں کے زمانے
ں لوگوں نے لمبے بال رکھنے شروع کر دیے تھے، مسلمانوں نے کبھی اس رسم کی پیروی
کی اور عام چینی عورتوں کی طرح مسلمان عورتوں نے کبھی اپنے پاؤں کو لوہے یا لکڑی کے
سانچوں میں رکھ رکھ کر چھوٹا کرنے کا طریقہ اختیار نہ کیا، البتہ جو مسلمان اندرون چین میں رہتے
ہیں اور ان کی تعداد کم ہے، انھوں نے ضرور اپنے ہمسایوں کے طریق و رسم کی پیروی اختیار
کر لی۔

جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے، مسلمان سور کا گوشت نہیں کھاتے، مرے ہوئے
جانور کا گوشت استعمال نہیں کرتے۔ جو جانور مسلمان کے ہاتھوں ذبح نہ ہو، اُس کا گوشت نہیں
کھاتے، علاوہ بریں ان کے لیے خون یا دیوتاؤں کے چڑھاوے کا کھانا، سانپ یا
گوشت خور پرندوں، یا مچھلی کی شکل کے سؤر بحری جانوروں کا گوشت ممنوع ہے۔ نیز وہ

تمباکو کشی نہیں کرتے، شراب نہیں پیتے، مسکرات استعمال نہیں کرتے۔ ان تمام ممنوعات کا مقصد و مدعا یہ ہے کہ خاص بیماریوں سے محفوظ رہیں۔ ان کی صحتوں پر بُرا اثر نہ پڑے اور ان میں اچھی اور محبت بھری عادتیں نشو و نما پائیں۔ کھانے پینے کے متعلق ان واضح احکام کی وجہ سے مسلمان گھروں میں ہوں یا سفر میں، ہر چیز کے متعلق زیادہ سے زیادہ احتیاط کرتے ہیں۔ بلدیاتی مجالس کا قاعدہ تھا کہ جو گائیں اور بھیڑیں غذا کے لیے آتی تھیں، ہر مہینے ان کا ایک حصہ مسلمانوں کے لیے الگ کر دیا جاتا تا کہ وہ انھیں اپنے طور پر ذبح کر کے کھائیں) اگر مرغ یا بطخ کو ذبح کرنے کے لیے گھر میں کوئی موجود نہ ہو تو اسے مسجد میں پیش امام کے پاس بھیج دیتے ہیں اور وہ ذبح کر دیتا ہے۔

مسلمانوں کے کسی ہوٹل یا ریسٹوران میں چلے جاؤ، وہاں لحم خنزیر (سور کا گوشت) کا کوئی نشان نہ ہوگا۔ البتہ شراب ملتی ہے اس لیے کہ بہت سے غیر مسلم بھی وہاں ٹھہرنے یا کھانا کھانے کے لیے آتے ہیں۔ غیر مسلم شراب نوشوں کے لیے خاص گلاس ہوتے ہیں جو عام گلاسوں سے بالکل الگ رکھے جاتے ہیں۔ چونکہ چینی لوگ سور کے گوشت اور چربی کو بہت شوق سے کھاتے ہیں۔ اس لیے مسلمان یہ بھی گوارا نہیں کرتے کہ چینیوں کے ہاتھ کی پکی ہوئی کوئی چیز کھائیں خواہ روٹی یا پیسٹری ہی ہو۔ جہاں مسلمان خاصی تعداد میں آباد ہیں، انھوں نے کھانے پینے کے اپنے سٹور اور اپنے روٹی پکانے کے مرکز قائم کر رکھے ہیں۔ مسلم ہوٹلوں میں بناسپتی گھی استعمال کیا جاتا ہے۔ لہذا تمام تلی ہوئی چیزیں تازہ اور خوشبودار ہوتی ہیں۔ غیر مسلم بھی مسلمانوں کی پکائی ہوئی چیزیں پسند کرتے ہیں، کھانے کے بعد تلے ہوئے گلگلے عام طور پر بڑے شوق سے کھائے جاتے ہیں آٹے کے گلگلے تیار کر کے انھیں میٹھا نمکین بنا لیا جاتا ہے بعد ازاں بناسپتی گھی میں تل لیا جاتا ہے۔ یہ چیز گھروں میں بھی بکثرت استعمال ہوتی ہے۔ مثلاً مرے ہوئے عزیزوں کے ختم یا فاتحہ میں عبادت کے لیے دوست آ جائیں تو بعد عبادت یہی گلگلے ان کی خدمت میں پیش کیے جاتے ہیں۔ اس چیز کی اصلی معلوم

نہیں لیکن اس کا رواج عام ہے۔

یوتن میں یا شمالی و مغربی علاقوں میں سفر کی ضرورت پیش آجاتی تو مسلمان قافلے کی صورت میں مجتمع ہو جاتے۔ اس میں بہت سہولت رہتی۔ ایک دوسرے کو امداد مل جاتی، کھانا اکٹھا پکا لیتے۔ نماز اکٹھی ادا کر لیتے۔ لیکن خاص چین میں قافلے بنا کر سفر کرنے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ سفر سے پیشتر مسلمانوں میں خاص رسمیں ادا کرنے کا دستور قطعاً نہیں۔ مثلاً یہ کہ کوئی خاکہ کھینچ کر یا قرعہ ڈال کر سفر کے لیے مبارک دن کا فیصلہ کیا جائے۔ اکثر مسلمان کھانا پکانے کے برتن ساتھ لے لیتے ہیں۔ جب وہ کسی شہر میں پہنچتے ہیں تو پہلا کام یہ ہوتا ہے کہ مسجد کا پتا چلائیں تاکہ رات کو وہاں ٹھہر سکیں۔ مسجدوں میں نمازوں کے علاوہ مسافروں کے ٹھہرنے کا انتظام بھی ہوتا ہے اور ہر مسلمان وہاں ٹھہر سکتا ہے، خواہ وہ کوئی ہو اور کہیں سے آیا ہو۔ بروقت امداد اور برادرانہ تعاون سے مسافر کی بہت سی مشکلات دور ہو جاتی ہیں اور اسے بڑی تسلی رہتی ہے۔

چین میں دو قسم کے مسلمان رہتے ہیں، اول سنکیانگ کے دستار بند مسلمان، دوم اصل چینی مسلمان۔ سنکیانگ کے مسلمان ترکی بولتے ہیں ان میں سے اکثر کاشغر کی مقامی بولیاں بھی بولتے ہیں۔ چینی مسلمان طبقۂ عمال کی زبان (ماندرین[1]) یا مقامی بولیوں میں گفتگو کرتے ہیں، البتہ خطبوں میں عربی اور ایرانی دونوں زبانوں کے الفاظ بہ کثرت استعمال کرتے ہیں۔ غیر مسلموں کے لیے اس زبان میں خطبے کو سمجھنا مشکل ہے۔ بعض مسلمان ایک اور خفیہ بولی بھی استعمال کرتے ہیں یعنی جو چینی بولتے ہیں مگر لکھنا نہیں جانتے ہیں تو چینی الفاظ عربی رسم الخط میں لکھتے ہیں۔

رسول اللہ صلعم کا ارشاد ہے، اپنے بچوں کو سواری، تیر اندازی اور تیراکی سکھاؤ۔ زمانہ گزشتہ میں یہ تینوں فن فوجی تربیت کے لیے لازم تھے اور موجودہ زمانے میں بھی یہ ورزش یا کھیلوں کے طور پر رائج ہیں۔ شمالی و مغربی علاقے کے مسلمان سواری اور تیر اندازی

---

[1] Mandorin: چینی عمال کے نو طبقوں میں سے کسی ایک کا عامل۔

میں بڑے مشاق ہوتے ہیں اور ان کے ماحول کا تقاضا یہی ہے۔ بہت سے مسلمان ان فنون میں کمال حاصل کر لینے کی نیت سے رسالے میں بھرتی ہو گئے۔ چینی مسلمانوں کو تیراکی بھی بہت پسند ہے خصوصاً جہاں پانی میسر ہو۔ تکہ بازی پشتوں سے ان کا مرغوب کھیل چلا آرہا ہے۔

اسلام اور چین کے دوسرے مذاہب

خود چین کوئی مذہب پیدا نہ کر سکا کنفیوشش اور تاؤ سے جو چیزیں منسوب ہیں، وہ مذہب نہیں، بلکہ فلسفہ اور سیاست کے دبستان ہیں، چین کے اندر جو مذہب رائج ہیں، وہ ہیں بدھ مت، اسلام اور مسیحیت۔ یہ تینوں باہر سے آئے اور امن و آزادی کی فضا میں انہیں نشو و نما پانے کا موقع دے دیا گیا۔

کنفیوشش ایک بہت بڑا سیاست دان، بہت بڑا فلسفی اور بہت بڑا معلم تھا۔ اس نے کبھی یہ دعویٰ نہ کیا کہ جو تعلیمات وہ دنیا چاہتا ہے، خود اس کی دریافت کردہ ہیں۔ بلکہ کہتا ہے کہ میں جو افکار پیش کر رہا ہوں، یہ زمانہ گزشتہ کے نیک اور دانش مند فاضلوں کے افکار ہیں، وہ کہتا ہے:

میرا کام سکھانا ہے، ایجاد کرنا نہیں، مجھے گزرے ہوئے لوگوں پر اعتقاد و اعتماد ہے۔
کنفیوشش نے جو تعلیم دی، اس کا تعلق انسانوں کے باہمی روابط سے ہے۔

کائنات سے اس کا کوئی تعلق نہیں وہ کہتا ہے کہ انسانوں کے درمیان اچھے تعلقات پیدا کرنے کے لیے ہر انسان کو ذاتی اصلاح سے کام شروع کرنا چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے ایثار و قربانی، خوش اطواری، ذاتی تہذیب و شائستگی اور دوسروں کے تعلق میں اعتماد و مصالحت پر خاص زور دیا۔ وہ کہتا ہے کہ قوم اور حکمران کے وفادار رہو، یہی رشتہ ہے جو تمھیں مثالی زندگی کی طرف لے جائے گا۔ کنفیوشش کی تعلیم کا مکمل اخلاقی نظام ہے جو پانچ انسانی تعلقات پر مبنی ہے۔ یعنی

۱۔ ہر انسان کو دوسرے انسانوں کے اعمال کے لیے دیانتداری اور خلوص سے

...زہ تلاش کرنے چاہئیں۔

۲۔ ہر انسان کا فرض ہے کہ اپنے آپ کو سدھارے اور اپنے اوپر قابو پا سکے۔

۳۔ ہر انسان کو چاہیے کہ آبائی روایات کی حفاظت کرے اور انھیں آنے والی نسلوں
...سکھا دے۔

۴۔ ہر انسان کے لیے لازم ہے کہ نیکی کی حفاظت میں جان تک دے دے۔

۵۔ ہر انسان کو عدل و انصاف پر اہتمام سے قائم رہنا چاہیے اور کسی جانب بھی جھکاؤ
...ئز نہیں۔

کنفیوشس کے نزدیک آٹھ نیکیاں ہیں جن میں سب سے بلند مقام والدین کے ساتھ ...ن سلوک کے لیے رکھا گیا۔ اس کے بعد بتایا گیا ہے کہ چھوٹے بھائیوں کو بڑے بھائیوں ...ی اطاعت کرنی چاہیے۔ پھر یہ نیکیاں آتی ہیں: وفاداری، اخلاص، خوش اسلوبی، حسن اخلاق، ...داری اور احساس شرم، یہ تمام اصول اسلام کے عین مطابق ہیں، لیکن انھیں کافی نہیں سمجھا جا ...کتا، اس لیے کہ ان کا تعلق صرف اس دنیا سے ہے۔ اسلام اس سے آگے قدم بڑھا ...ر پوری کائنات کو زیر غور لاتا ہے۔ کنفیوشس نے مستقبل کے متعلق کسی سوال کا جواب ...ینے سے انکار کر دیا۔ وہ کہتا ہے: "جب تم زندگی کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تو موت کے متعلق تم کیا کہہ سکتے ہو۔" صاف ظاہر ہے کہ اس کے پاس فلسفہ اخلاق تھا، مذہب ہرگز ...ہ تھا۔

"تاؤ نے جو کچھ پیش کیا وہ بھی ابتدائی فلسفیانہ افکار اور سیاسی نظریات کا مجموعہ تھا۔ ...ذہب نہیں تھا۔ لاؤزے* کی کتاب "تاؤتی چنگ" میں سیاسی تعلقات کا بنیادی نظریہ ان الفاظ ...یں پیش کیا گیا ہے کہ "اعلیٰ درجہ کمال حاصل کرنے کے لیے فطرت کی پیروی کرو اور عدم مداخلت کے مسلک پر کاربند رہو۔" ہر شے کو اپنی راہ پر چلنے دو۔ انسانوں کے درمیان صحیح تعلقات پیدا کرنے کے لیے لازم ہے کہ ذاتی خواہشات کو دبایا جائے اور نفرت کو دل سے نکال

*...Tao Te Ching ... تاؤ ازم اسی ... کا مشہور فلسفی ہے ... Tsze ... بعض نے ... [illegible]

پھینکا جائے۔ نفرت سے نجات پانے کی شکل یہی ہے کہ ذاتی خواہش حذف ہو جائے۔ لا
کہتا ہے:

"مقابلے کو روکنے کے لیے نیکیوں کا احترام چھوڑ دو۔ چوری کو ختم کرنے کے لیے
کمیاب و نادر اشیا کی قیمتیں اڑا دو۔ پُرامن اور پُرسکون قلب ورکار ہے تو
خواہشات کو نشو و نما نہ پانے دو"

لاؤزو کا فلسفہ اسلام میں تصوف سے ملتا جلتا ہے۔ اسلام ذاتی خواہشات کو دبانے
اور دشمنی سے دست کش ہونے کے سلسلے میں اس کا ہم نوا ہے۔ دن میں پانچ مرتبہ نماز
ادا کرنے اور سال میں ایک مہینے کے روزے رکھنے کا مقصد یہی ہے کہ انسان اپنے نفس
کا تزکیہ کرے اور اپنے اوپر قابو پانے کے لیے خواہشات کو کم کرے۔

کنفیوشئس ازم اور تاؤازم دونوں نے مندر بنائے جن میں مورتیاں پوجی جاتی ہیں۔ بتوں
کی پوجا اسلام کے صریح خلاف ہے۔ اسلام صرف ایک خدا کو مانتا ہے جس کا کوئی شریک
نہیں اور اس جیسا کوئی نہیں لہٰذا اسلام کو ان دونوں سے کوئی تعلق نہیں۔ البتہ وہ کنفیوشئس اور
لاؤزو دونوں کی عزت کرتا ہے اور انھیں چین کے ہادی سمجھتا ہے قرآن مجید کا ارشاد ہے کہ
"ہم نے ہر قوم میں نبی بھیجے تاکہ لوگوں کو راہِ راست پر لائیں اور احکام الٰہی سکھائیں"۔ لاؤزو اور
کنفیوشئس رسول اللہ صلعم سے پہلے گزر چکے ہیں ہم کہہ سکتے ہیں کہ خدا نے انھیں اہلِ چین
کی ہدایت کے لیے بھیجا تھا۔

جب بدھ مت چین پہنچا تو اہلِ چین کے لیے اسے قبول کر لینا ہرگز مشکل نہ تھا۔ اس لیے
کہ بدھ کی بہت سی تعلیمات کنفیوشئس اور لاؤزو کی تعلیمات کے مطابق تھیں۔ حکمران طبقے کا
اعتماد اور اس کی سرپرستی نسلوں تک بدھ مت کو حاصل رہی۔ اوّل درجے کے علماء نے اس
مت کی بڑی بڑی کتابوں کا ترجمہ چینی زبان میں کیا۔ بدھ مت عوام میں پھیل گیا اور اس نے
چینی ادب و فنون پر اتنا گہرا اثر ڈالا کہ خاص اس دائرے میں مسیحیت یا اسلام میں سے کوئی

بھی اس کے برابر نہ پہنچ سکا۔ اسلام اور بدھ مت کے درمیان مناسبت کا کوئی بھی پہلو نہیں۔
اس لیے کہ بدھ مت تبے آزادی کے علاوہ بتوں اور تناسخ کا قائل ہے اور یہ عقیدے اسلام
کے سراسر خلاف ہیں[1]۔ مسلمانوں نے کنفیوشس اور لاؤزو کی کتابوں کا مطالعہ کیا لیکن بدھ مت
کی مسلمہ کتابوں کو ہاتھ تک نہ لگایا۔

مدت دراز تک چین کے مسلمانوں کا تعلق دوسرے مسلم ممالک سے منقطع رہا اور
ان پر کنفیوشزم یا بدھ مت کا اثر مختلف طریقوں پر پڑتا رہا۔ مثلاً مسلمان اپنی عبادت گاہ کو
"مسجد" نہیں "شہ" کہتے ہیں اور "شہ" بدھ مت میں مندر کے لیے ہے۔ چین میں جو مسجدیں
تعمیر ہوئیں، باہر سے دیکھا جائے تو وہ بالکل کنفیوشس کے یا بدھ مت کے مندروں
جیسی ہوتی ہیں، جن لوگوں کو مسجدوں کا انتظام سونپا گیا، وہ بدھوں کے پروہتوں اور
راہبوں کی سی حیثیت اختیار کر گئے۔ مسجدوں میں رہتے، زکوٰۃ و صدقات کی رقمیں وصول
کرتے اور مذہبی فرائض انجام دیتے۔ شادی یا مرگ پر ان عالموں کو بلایا جاتا، وہ اسی طرح
قرآن مجید کے کچھ حصے کی تلاوت کرتے جس طرح بدھ مت کے پروہت اپنے مذہب
کی کتابوں میں سے کچھ پڑھتے ہیں۔ بدھ مت میں زیادہ تر خاموشی اور گیان دھیان پر
زور دیا جاتا ہے۔ صوفیوں نے اس غرض سے مراقبہ اختیار کر لیا۔ خیال یہ ہے کہ اس طرح
آدمی میں کرامتیں دکھانے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے، جو لوگ یہ صلاحیت پیدا کر لیتے
مسلمان انھیں "مشائخ" کہہ کر پکارتے۔ عجب بات یہ ہے کہ مسلمانوں کے "مشائخوں" اور
راہبوں میں عموماً غیر معمولی صلاحیتوں کی نمائش کے سلسلے میں مقابلہ پیش آجاتا اور مسلمان اس
مقابلے میں اکثر کامیاب رہتے۔

چینی مسلمانوں کے کردار کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے
رواداری کو اپنا نصب العین بنالیا۔ اس طرح چین میں تمام مذاہب کے لیے راستہ ہموار ہو گیا۔

---

[1] تاہم تحقیق یہ ہے کہ مہاتما بدھ توحید کا قائل تھا خرابیاں بدھ کے پیروں نے پیدا کیں۔ SKIH

حال میں چین کے چار بڑے مذاہب ——— بدھ مت، کیتھولک مسیحیت، پراٹسٹنٹ مسیحیت اور اسلام ——— کے اکابر نے ایک جماعت کی بنیاد ڈالی ہے جس کا نام "مذہبی محبوں کی انجمن" رکھا گیا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ سب مل کر اور متحد ہو کر کمیونزم کے خلاف جنگ کریں۔

چینی مسلمانوں کی مذہبی تنظیم

مسجدیں چین میں روحانیت اور مجلسی و جماعتی سرگرمیوں کا مرکز ہیں۔ وہاں عبادت کی جاتی ہے۔ نمازیں پڑھی جاتی، قرآن مجید کی تلاوت ہوتی ہے، وہ لوگوں کے لیے ایک دوسرے سے ملنے کا مقام ہیں۔ وہاں تعلیم کا انتظام ہے۔ جنازے پڑھے جاتے ہیں مختلف اسلامی تقریبیں بھی ادا پاتی ہیں اور شرعی مقدمات بھی مسجدوں ہی میں طے ہوتے ہیں ابتدائی زمانے میں چین کے بعض حصوں میں عورتوں کے لیے الگ مسجدیں تھیں۔ ان میں صرف عورتیں مذہبی مقاصد کے لیے جمع ہوتی تھیں اور عورتیں ہی دینی تعلیم کے لیے مقرر ہوتی تھیں۔ اب زن و مرد ایک ہی مسجد میں نماز ادا کرتے ہیں، لیکن ادائے صلوٰۃ یا دوسرے مذہبی مراسم کے لیے کمرے الگ الگ ہوتے ہیں، جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے۔ ظاہری شکل و صورت میں مسجدیں کنفیوشیس کے پیروؤں یا بدھوں کے مندروں جیسی ہوتی ہیں اور بادشاہی کے زمانے میں چین کی خاص طرز تعمیر کے سوا کسی دوسری وضع کی اجازت نہیں دی جاتی تھی۔ چین کی مسجدوں میں وہ خوب صورت گنبد اور اونچے اونچے مینار نہیں مل سکتے جو دوسرے اسلامی ملکوں کی مسجدوں میں پائے جاتے ہیں۔ چین کی مسجدیں عموماً لکڑی سے بنتی ہیں۔ ان کے اندر پہنچیں تو آپ کو ایک بڑا ہال نظر آئے گا جہاں نماز ادا کی جاتی ہے یا جمعہ کے روز خطبے پڑھے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی متعدد کمرے ہوتے ہیں مثلاً "منتظم مسجد کا دفتر، کانفرنس کے لیے کمرے، غسل خانہ اور اموات کا کمرہ جس میں میتوں کو غسل دیا جاتا ہے۔

ے Religious Friends Association

... مسجد کے ساتھ اوقاف ہیں، جن میں سے بعض اوقاف کی سالانہ آمدنی اتنی ہوتی ہے کہ ... ٹکنیکل کالج کا خرچ پورا ہو سکتا ہے یا چھوٹی سی صنعت جاری ہو سکتی ہے، لیکن ... اں کہ کوئی مرکزی تنظیم مثلاً وزارتِ اوقاف موجود نہیں جو جمع و خرچ کی نگرانی کرے۔ ... اوقاف کے ذریعے سے اسلام کی ترقی کے لیے جو کچھ کیا جا سکتا ہے وہ نہیں ہو

مسجد میں سب سے بڑا مذہبی آدمی "اخوند" کہلاتا ہے جس کے معنی ہیں عالم یا عالمِ دین ... کی امداد کے لیے امام ہوتا ہے جو پانچ وقت نماز پڑھاتا ہے۔ خطیب جمعہ کے دن ... بہ دیتا ہے۔ خطبے عموماً مذہبی مسائل کے متعلق دیے جاتے ہیں کبھی کبھی اُن میں ... سی ذکر بھی آجاتا ہے۔ مختلف تقریبات خصوصاً نکاح کے موقع پر بھی خطیب ہی ... ے زیادہ تر کام لیا جاتا ہے۔ مؤذن کا فرض صرف یہ ہے کہ دن میں پانچ مرتبہ اوقاتِ نماز ... ان کہہ دے۔ بعض مسجدوں میں غیر مستند "اخوند" بھی ہوتے ہیں۔ یہ لوگ کسی قدر ... ی جانتے ہیں اور تھوڑی سی مذہبی تعلیم پائے ہوتے ہیں لیکن اتنی نہیں کہ حقیقی "اخوند" ... سکیں۔ اخوند قرآن مجید میں سے تلاوت کرتا ہے۔ نماز بھی پڑھا لیتا ہے اور اموات ... تجہیز و تکفین کا انتظام بھی اُسی کے ذریعے سے ہوتا ہے، علاوہ بریں وہ مسجد کی تعلیمی ... ر میوں کی نگرانی بھی کرتا ہے، مسجد کے املاک، اُن کا انتظام اور اُن کی آمدنی کی دیکھ ... ال ایک کمیٹی کے زیرِ اہتمام ہوتی ہے جس میں کم از کم تین اور زیادہ سے زیادہ سات ... ر رکھے جاتے ہیں۔ مسلمان ہر سال ان کا انتخاب کرتے ہیں اور یہ لوگ اپنی خدمت ... کے لیے کوئی تنخواہ نہیں لیتے۔

چین کے تمام مسلمان سُنّی ہیں اور حنفی فقہ کے پابند ہیں۔ یہ لوگ بعض امور میں دوسرے ... سلمانوں سے مختلف نظر آئیں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ ربط ضبط قائم رکھنے کے وسائل ... سے پریشان کُن تھے۔ اس لمبی مدتِ علیحدگی میں صرف تھوڑے سے اخوند یا علماء

چین میں رہ گئے۔ وہ چینی یا عربی زبان جانتے تھے۔ اپنے اپنے حلقے میں تعبیرات کے اختلاف نے مختلف گروہ پیدا کر دیے جمہوریت قائم ہوئی تو بحری راستے سے شرق اوسط پہنچنا ممکن ہو گیا چنانچہ بہت سے مسلمان فضلا حج کے لیے مکہ معظمہ پہنچے اور انھوں نے مصر و ترکی میں مختلف تعلیمی اداروں کا معائنہ کیا۔ جو کچھ وہاں دیکھا اُس سے بہت متاثر ہوئے بہت سی کتابیں ساتھ لائے جو بنیادی اسلامی اصول و مقاصد کے متعلق بہ غور مطالعے کی بنیاد بن گئیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اصلاح کے لیے زبردست مطالبہ شروع ہو گیا۔ مسلمان قوم دو حصوں میں بٹ گئی۔ ایک حصہ اصلاح کا حامی بن گیا اور اُسے "فرقہ نو" (اصلاح کا داعی) کہنے لگے، دوسرا حصہ ہر تبدیلی کا مخالف تھا، اُس کا نام "فرقہ قدیم" مشہور ہوا۔ ہر فریق ایک دوسرے کو شُبہ کی نظر سے دیکھتا تھا اور ایک دوسرے پر کفر کا الزام رکھتا تھا۔ ایسے حالات کا رونما ہونا یقیناً باعثِ شرم تھا۔

"فرقہ نو" محض چند بڑے بڑے شہروں تک محدود تھا، باقی چین پر ہر جگہ فرقہ قدیم چھایا ہوا تھا، وسائل حمل و نقل بہتر ہوئے تو زیادہ لوگ مکہ معظمہ پہنچنے لگے اور علماء اور اہل علم کو چینی مسلمانوں اور دوسرے مسلمانوں میں اختلاف کا احساس ہو گیا۔ اس سے "فرقہ نو" کو بڑی تقویت پہنچی۔ چین و جاپان کی جنگ سے بیشتر "فرقہ قدیم" طبعی موت مر گیا اور نصف صدی کا پیچیدہ مسئلہ خود بخود حل ہو گیا۔ قدیم و جدید کی کش مکش نے مسلمانوں کو دنیا کی نظر میں سرِ مشقِ تضحیک بنا دیا اور حد درجہ عجب بات یہ ہے کہ اختلاف کا تعلق اصول سے نہیں بلکہ نہایت معمولی فروع سے تھا۔ اگر ہم ان اختلافات میں سے بعض کا ذکر کر دیں تو روشن ہو جائے گا کہ اسلامی دنیا کے ساتھ روابط بحال ہونے کے ساتھ چینی مسلمان کس قسم کے مسائل سے دوچار رہے۔

پرانے زمانے سے رواج چلا آتا تھا کہ جب کوئی مسلمان مر جاتا تو اس کے گناہوں کے کفارے میں ایک قرآن دیا جاتا۔ لیکن فرقہ نو کہتا تھا کہ صرف نقد روپیہ دینا چاہیے۔ گناہ

...ت خدا کے ہاتھ میں ہے۔ نہ قرآن گناہ بخش سکتا ہے نہ روپیہ "فرقہ قدیم" چینی روایت کی پیروی
...تے ہوئے، سفید لباس پہنا کرتا تھا، "فرقہ نو" کہتا تھا کہ ماتم کے موقع پر خاص لباس پہننا ممنوع
...اسلام میں اس رسم کے لیے کوئی قاعدہ موجود نہیں۔ رمضان کے مہینے میں ستائیسویں تاریخ
...قہ قدیم" ایک سو نفل پڑھتا تھا، "فرقہ جدید" اس کا قائل نہ تھا۔ پہلے یہ دستور تھا کہ ختم اور
...کے بعد ختم پڑھنے والے کو روپیہ دیا جاتا۔ "فرقہ نو" اس کا مخالف تھا۔ "فرقہ نو" ہی نے نماز
...ہد التحیات میں اشہدان لا الٰہ کے وقت انگشت شہادت اٹھانا) کا طریقہ جاری کیا
...بات پر بھی زور دیا کہ قرآن مجید کی تلاوت اسی طریق پر ہونی چاہیے جس طریق پر دوسرے
...ملکوں میں ہوتی ہے۔ دیگر مرغ کے متعلق بھی کچھ اختلافات تھے۔ "فرقہ نو" اس بات
...دیتا تھا کہ حدیث کے رو سے کیکڑا کھانا جائز ہے، البتہ سیل یا دریائی بچھڑا کھانا جائز
ہے۔

ان جزوی اختلافات کے علاوہ صرف ایک گروہ ایسا تھا جسے چین میں خلل انگیز عنصر قرار
...تا تھا یعنی جہریہ کا گروہ جو بلند آواز سے ذکر کرتے تھے یہ دراصل صوفیوں کا ایک فرقہ تھا
...ایک حلقے میں جمع ہو جاتے ہیں اور ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر نہایت بلند آواز سے ذکر
...تے ہیں اپنے شیخ کی پیروی کرتے ہوئے جسموں کو دائیں بائیں جانب جھکاتے ہیں پاؤں
...آہستہ حرکت کرتے ہیں آنکھیں بند ہو جاتی ہیں چلتے چلتے ذکر کرتے ہوئے سر ہلاتے
...تے ہیں پھر تدریجاً ذکر تیز تر ہوتا جاتا ہے، جسمانی حرکات میں بھی تیزی آجاتی ہے، بالآخر زبان
...ایک لفظ رہ جاتا ہے ——— اللہ اللہ اللہ ——— یہ ذکر اتنی دیر تک کرتے ہیں کہ
...تھک جاتے ہیں بعض غش کھا کر گر جاتے ہیں جہریہ ہی کو دیکھ کر چینیوں نے اس فرقے
...مذہب کا نام "جنبش سر کا مذہب" رکھ لیا۔

اس فرقے کا صدر مقام اولاً صوبہ کانسو میں تھا اور اس فرقے کے شیخ کا منصب موروثی
سنہ ۱۳۳۸ھ / سنہ ۱۹۱۹ء کے بڑے زلزلے میں ان کا شیخ مارا گیا اور اس کے مرید سنکیانگ

شا منتنگ اور یونن میں منتقل ہوئے۔ مسلمان ان لوگوں کو دین سے ہٹا ہوا قرار دیتے تھے۔ اس لیے جہریہ فرقے اور عام مسلمانوں میں تعلقات بگڑ گئے۔ فسادات بھی وقتاً فوقتاً ہوئے جن میں جانی نقصان ہوئے۔ اس فرقے کے لوگ تقویٰ کے لیے بڑی کوشش کرتے ہیں لیکن بہت کم لوگ متقی پائے گئے اس کے علاوہ چین میں صوفیوں کے اور گروہ بھی ہیں اور ایسے مسلمان بھی ہیں جن کے رجحانات صوفیوں کی جانب ہیں۔

قیام جمہوریت کے بعد جن جماعتیں تھیں جنھوں نے مسلمانانِ چین کو اسلام کی خدمت کے لیے متحد کرنے کی سعی کی پہلی جماعت چین کی مسلم پروگریسو سوسائٹی[1] تھی جس کی بنیاد ۱۹۱۳ء میں بہ مقام پیکن رکھی گئی تھی۔ اخوند ونگ ہونان[2] اس کا بانی تھا جس نے ادائے حج کے بعد ترکی اور مصر کی بھی سیاحت کی تھی۔ اخوند موصوف دوسرے اسلامی ملکوں میں مسلمانوں کی ثقافتی ترقی کا عینی شاہد تھا چینی انقلاب نے مزید تازیانے کا کام دیا اور اس کے دل میں چینی مسلمانوں کی تعلیمی ضرورت کا گہرا احساس پیدا ہو گیا چنانچہ اس نے ایک قومی جماعت کی داغ بیل ڈال دی تاکہ مسلم افراد، اُن کے اقتصادی وسائل اور ان کی صلاحیتیں متحد یکجا ہو جائیں، اس طرح مسلمانوں کا درجہ معیشت اور ان کی تعلیمی سطح بلند ہو جائے۔ سب نے اس تجویز کا پرجوش خیر مقدم کیا۔ اخوند کا اولین مدعا یہ تھا کہ مسجدوں کی تعلیم گاہوں میں جو ابتدائی تعلیم دی جاتی ہے ان میں عربی زبان اور تفسیر کے لیے مزید انتظام کر دیا جائے۔ اگرچہ اخوند خالص مذہبی تعلیم کا خواہاں تھا مگر اس کی تحریک میں سیاسی دلچسپیاں بھی رونما ہو گئیں اور مسلمان متحد ہو کر ایک زبردست سیاسی قوت بن گئے۔ اس تحریک پر تین ہی سال گذرے تھے کہ یوان شی کائی[3] نے اسے اپنا آلہ کار بنا کر شاہنشاہی حاصل کرنے کی کوشش کی جب اس نے شکست کھائی تو انجمن بھی اس کے ساتھ ہی ختم ہو گئی۔

---

[1] Muslem Progressive Society

[2] Wang Hao Naw — [3] Yuan Shih Kai

۱۳۵۷ھ / ۱۹۳۸ء میں چین کے مسلمانوں نے انجمن مسلمانانِ چین کی بنیاد رکھی۔ یہ وہی زمانہ
جب چین و جاپان کے درمیان جنگ شروع ہوئی تھی اور مرکزی حکومت نے مسلح فوج کے
سلمان جرنیل کو حکم دیا تھا کہ ایک فوجی جماعت بناؤ جو مسلمانوں کو حکومت کی حمایت میں متحد کر
اور باہر کے اسلامی ممالک کی حمایت حاصل کی جا سکے۔ چین کی پوری تاریخ میں یہی ایک انجمن
جو حکومت کے ایما پر قائم ہوئی۔ اس کی پانسو شاخیں تھیں جنھوں نے مذہبی اور سیاسی سرگرمیوں
سلسلہ جاری کر دیا۔ زمانہ جنگ میں اس انجمن نے مسلمانوں کو متحدہ طور پر جاپان کے خلاف لڑایا
کے زیر اہتمام دو ہزار مسلمانوں نے فوجی اکیڈیمی میں تربیت پائی تاکہ فوج میں شریک ہو سکیں
ن نے چھوٹی چھوٹی کمیٹیاں بنا کر شمالی و مغربی علاقوں میں زخمی افسروں اور سپاہیوں کی طبی امداد
نظام کیا۔ تعلیمی دائرے کے کام کی کیفیت یہ ہے کہ انجمن نے مذہبی تحقیقات کے لیے
کمیٹی بنائی جس کا ایک اہم مقصد یہ تھا کہ قرآن کا ترجمہ چینی زبان میں کیا جائے۔ مذہبی کتابیں
رسالے شائع کیے جائیں۔ شمالی و مغربی علاقوں میں درس گاہیں قائم کی جائیں۔ اس انجمن نے وظیفے
دے کر ممتاز طلبہ کو اس قابل بنا دیا کہ وہ ترکی اور مصر کی درس گاہوں میں تعلیم پا سکیں۔ اس نے بعض
ف اوقات میں جنوبی و مشرقی ایشیا نیز شرقِ اوسط میں وفد بھیجے تاکہ دوستی اور مفاہمت
رشتے پیدا ہو جائیں اور ثقافت کے مبادلوں کی حوصلہ افزائی ہو۔ جب جمہوریہ چین میں دستوری
مت قائم ہوئی تو اس انجمن نے چین کی پانچ نسلوں میں سے مسلمانوں کی نمائندگی کا فرض
ام دیا۔

تیسری جماعت مسلمانانِ چین کی ادبی انجمن تھی جس کی بنیاد ۱۳۴۵ھ / ۱۹۲۶ء میں
ی جلال الدین ہاتہ چنگ نے بمقام شنگھائی رکھی تھی۔ حاجی موصوف ایک مشہور فاضل شخص
جو ہندوستان اور مصر میں تعلیم پا چکا تھا۔ اردو، فارسی عربی اور انگریزی بھی جانتا تھا۔ اس انجمن
ے مقاصد یہ تھے:

Jalaluddin Ha Teh-Cheng ؎ Chinese Muslim's Associati

۱۔ قرآن وحدیث کے عالمانہ مطالعے کی حوصلہ افزائی۔

۲۔ اسلامی تعلیم کی تحسین وتوسیع۔

۳۔ دوسرے ممالک کے مسلمانوں کے ساتھ مل کر ایسا بندوبست کرنا کہ ثقافتی مباد[illegible]

کا سلسلہ بہتر ہو جائے۔

۴۔ چینی مسلمانوں کی مجلسی وجماعتی حیثیت کو بہتر بنانا۔

سیاسیات سے یہ انجمن بالکل الگ تھلگ تھی۔ اس کا پہلا کام یہ تھا کہ قرآن مجید کا ترجم[illegible]

زبان میں شروع کر دیا۔ اس کی زبان ادبی تھی اور چینی محاورے بھی استعمال کیے گئے۔ افسوس کہ [illegible]

اور جاپان کے درمیان جنگ چھڑ جانے کے باعث یہ کام پورا نہ ہو سکا۔ پھر اس انجمن نے ایک

ماہوار رسالہ جاری کیا۔ جسے بعد ازاں سہ ماہی کر دیا گیا۔ تعلیمی پروگرام کے سلسلے میں عام مکتب

اور مدرسوں کا بھی انتظام کیا گیا۔ ایک نارمل سکول اور ایک ابتدائی سکول قائم ہوا۔ ایک کت[illegible]

اور اس کے ساتھ دار المطالعہ بنا۔ شنگھائی یونیورسٹی میں تعلیم پانے والے طلباء کی امداد کا س[illegible]

شروع ہو گیا جو طلبہ قابل تھے ان کے لیے وظیفوں کا انتظام کر دیا گیا۔

مذہبی معمولات رسول اللہ صلعم کی تعلیم کے مطابق اسلام پانچ اعمال صالحہ پہ قائم ہے جنھیں "ارکانِ اسلام" کہا جاتا ہے یعنی کلمہ شہادت، نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج

مسلمان مرد یا عورت کو زندگی میں کم از کم ایک مرتبہ ضرور "چنگ سنگ ین" اور "سو چنگ ین"

کہنا چاہیے۔

"چنگ سنگ ین" کلمہ توحید ہے یعنی لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ (نہیں کوئی خدا سوائے

اللہ کے اور محمد اللہ کے خاص رسول ہیں) "سو چنگ ین" کلمہ شہادت ہے یعنی اشہد ان

لا الٰہ الا اللہ واشہد ان محمد عبدہ ورسولہ (میں گواہی دیتا ہوں کہ کوئی خدا نہیں سوائے اللہ

کے جو یکتا ہے اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمدؐ اس کے بندے اور رسول ہیں) ابتدائی دور

میں چین کے مسلمان عربی جانتے تھے اور یہ کلمہ عربی میں پڑھ سکتے تھے۔ جب ان میں عربی کی

...یت نہ رہی تو اب بیس فی صد سے بھی کم مسلمان ایسے ملیں گے جو کلمے اصل صورت میں ادا کر
...تے ہوں۔ اب وہ چینی زبان میں ان کا مفہوم دہراتے ہیں بہت کم مسلمان ہیں جو عربی میں قرآن مجید
...سکتے ہیں۔

ابتدا میں چینی مسلمان نماز کے بڑے پابند تھے، لیکن زمانہ حال میں ملکی افراتفری، کسب معاش
...شکلات اور مادیت کے زیر اثر نماز با جماعت میں کمی آگئی۔ گھروں سے مسجدوں کا فاصلہ
...اس سلسلے میں اثر انداز ہوا۔ آج کل شہروں میں اور مضافات و دیہات میں رہنے والے
...مان پانچوں نمازیں پابندی سے مسجد میں جا کر پڑھتے ہیں، باقی مسلمان دو یا تین نمازیں مسجد
ادا کرتے ہیں ان کے سوا جتنی نمازیں ہیں وہ گھر میں پڑھ لیتے ہیں۔ ایسے لوگ بھی ہیں
...رف جمعہ کی نماز کے لیے مسجد میں پہنچتے ہیں، مسلمانوں کی سب سے بڑی تعداد عیدین
...موقع پر مسجدوں میں حاضر ہوتی ہے۔ بعض مسلمان ایسے بھی مل جائیں گے کہ مسجدوں
...جاتے ہی نہیں ماسوا اس وقت کے کہ کسی رشتہ دار کے تجہیز و تکفین کی ضرورت ہو،
...زے کی نماز پڑھتے ہی وہ لوگ رخصت ہو جاتے ہیں۔

رمضان کے مہینے میں پوری اسلامی دنیا کے مسلمانوں کا طریق زندگی بدل جاتا ہے چین
...بھی یہی حالت ہے، یہاں روزے رکھنے میں مسلمانوں کی کئی قسمیں ہیں۔ ایک گروہ پورے
...نے کے روزے رکھتا ہے، بعض لوگ وہ ہیں جو ابتدائی دس دن یا آخری دس دن کے روزے
...تے ہیں اور ایسے مسلمان بھی ہیں جو صرف "قدر" سے روزہ شروع کرتے ہیں یعنی ستائیسویں
...ے۔ اگر مہینا تیس دن کا ہو تو ان کے تین روزے پورے ہوتے ہیں اور انتیس دن کا ہو تو
...روزے۔ یہ طریقہ ہرگز درست نہیں، اس لیے کہ حکم پورے مہینے کے روزے رکھنے کا
...ے۔ البتہ دو یا تین روزے رکھنے سے بھی صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اصل میں اس شخص کو مذہب
...ے ساتھ دلبستگی موجود ہے۔ اُسے چاہیے کہ اگر رمضان میں کسی وجہ سے روزے نہ رکھ سکے
...بعد میں پورے کر لے۔

زکوٰۃ کا مفہوم یہ ہے کہ سال بھر کی پوری آمدنی میں سے اڑھائی فی صد رقم دی جائے
اُن لوگوں پر واجب ہے جو صاحبِ نصاب ہوں یعنی آمدنی اتنی ہو جس پر زکوٰۃ واجب ہو۔
چینی مسلمان دولت مند ہیں، لیکن زیادہ تر مسلمان غریب ہیں۔ بعض بہت زیادہ غریب ہیں گویا
دینے والے کم اور لینے والے زیادہ ہیں۔ ایسے لوگ بھی ہیں جن پر زکوٰۃ واجب ہے
لیکن مذہب سے انھیں کوئی دل بستگی نہیں یا وہ بخیل ہیں، لہٰذا وہ کچھ دیتے بھی ہیں تو صفر کے
برابر ہوتا ہے۔ اسلامی دنیا کے قریباً ہر ملک کی کیفیت یہی ہے۔ زکوٰۃ نظامِ اسلامی کا
ایسا جزو ہے جس سے اجتماعی تعاون کی روح تازہ ہوتی ہے۔ غریبوں اور امیروں کے
درمیان وسائل میں تعاون پیدا ہوتا ہے۔ معاشرے کی جڑیں مستحکم ہوتی ہیں اور کمیونزم
روک تھام کے لیے بہترین ذریعہ ہے لیکن افسوس کہ مذہبی راہنماؤں کو زکوٰۃ کی اہمیت
کا کوئی احساس نہیں اور اسلامی دنیا کے سیاسی لیڈر اسلامی تعلیمات خصوصاً زکوٰۃ سے کوئی
نہیں رکھتے۔ اب ہم پر کمیونزم کا دباؤ آپڑا ہے، لہٰذا ہمیں خوابِ غفلت سے بیدار ہونا چاہیے
اور زکوٰۃ کی اہمیت پر از سرِ نو غور کرنا چاہیے۔

مکہ معظمہ کا سفر اس قدر طویل اور گراں خرچ ہے کہ بہت کم چینی مسلمان حج کے لیے جانے
کے قابل نکلتے ہیں۔ دوسری جنگِ عظیم سے پیشتر ہر سال صرف دو یا تین ہزار آدمی جاتے
تھے، زیادہ تر لوگ شمال و مغرب اور یونان کے ہوتے تھے، بعض شنگھائی یا ہانگ کانگ
سے جہاز میں بیٹھ کر جدہ پہنچ جاتے، بعض خشکی کے راستے ہندوستان پہنچ جاتے اور وہاں
سے جہاز میں بیٹھ جاتے۔ جب چین میں کمیونسٹوں کی حکومت قائم ہوگئی اور یہ ملک آہنی پردے
میں چلا گیا تو مسلمانوں کے لیے ملک سے باہر جانے کی کوئی صورت نہ رہی۔ اس وجہ سے
گذشتہ چند سال میں بہت ہی کم لوگ حج کے لیے جا سکے۔ زیادہ وقت نہیں گزرا کہ آزاد چین
(تیوان یا فارموسا) سے ایک اسلامی کمیٹی مکہ معظمہ گئی تھی۔ سلطان سعود فرمانروائے دولتِ سعودیہ
نے سب سے پہلا سوال یہ کیا کہ چند سال سے چین کے مسلمان کس وجہ سے حج کے لیے

نہیں آ رہے؟ جب اُنھیں بتایا گیا کہ کمیونسٹ ادائے حج کی اجازت نہیں دیتے تو اُسے بڑا افسوس ہوا اور اُس نے دعا کی کہ اللہ تعالیٰ چین کے تمام مسلمان بھائیوں کو آزادی کی دولت عطا کرے۔ آج کل کوئی پندرہ ہزار چینی حاجی دولتِ سعودیہ میں پناہ گزیں ہیں یہ تمام لوگ کمیونسٹوں کے سخت دشمن ہیں۔ دولتِ سعودیہ اسلام کی پابندی میں تمام مسلمانوں کو ایک خاندان کے افراد سمجھتی ہے اور اُس نے پناہ گزینوں کو اجازت دے دی ہے کہ اطمینان سے رہیں اور اپنے گزارے کا بندوبست کریں۔

شادی بیاہ کے مراسم تمام اسلامی ممالک میں مقامی روایات کی بنا پر کسی قدر مختلف ہو سکتے ہیں لیکن اس بارے میں اسلام کے بنیادی اصول بہرحال مانے جاتے ہیں۔ مثلاً دولہا دلھن دونوں کا مسلمان ہونا ضروری ہے، دونوں کی رضامندی ضروری ہے، دو گواہوں کا ہونا ضروری ہے اور مہر کی رقم دولہا والوں کو ادا کرنی چاہیے۔ چینی مسلمان بہت بکھرے ہوئے ہیں اور ہر صوبے کے مسلمانوں نے اپنے یہاں کی رسمیں قبول کر لی ہیں۔ صرف شمالی و مغربی علاقوں کے مسلمان اسلامی اصول سے قریب تر رہے ہیں۔ چینی مسلمانوں کے رسومِ شادی یقیناً پُر پیچ ہوتے ہیں لیکن ان میں وہم پرستی کا کوئی دخل نہیں مثلاً دولہا دلھن کے زائچے تیار نہیں کیے جاتے۔ اخوند سے کہا جاتا ہے کہ وہ زناوی کے دن یا اس سے ایک دن پیشتر عربی میں خطبہ پڑھ کر نکاح کرا دے۔ اگر دولہا دلھن میں سے کوئی ایک مسلمان نہ ہو تو اخوند شادی سے ایک دو روز پیشتر اُسے دائرہ اسلام میں داخل کر لیتا ہے۔ اس طرح مذہبی تفریق مٹ جاتی ہے۔ مہر کی رقم کے بارے میں چنداں اہتمام نہیں کیا جاتا تھا اور سمجھا جاتا تھا کہ اس طرح شادی کاروباری حیثیت اختیار کر لیتی ہے اب دلھن کو پارچے جواہرات، زیور یا نقد روپیہ لازماً دیا جاتا ہے اور اسے محض ایک نشان محبت و احترام سمجھا جاتا ہے۔ چینی مسلمان محبت کی بنا پر شادیاں کرتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ مقابلتاً ترقی پسند ہیں۔ دوسرے اسلامی ملکوں میں بھی یہی طریقہ رائج ہونا چاہیے

اس طرح بھاری رقم کابین کی وجہ سے شادیوں میں وقت کا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔

چینی مسلمانوں میں شادیوں کے پرانے مراسم اب فرسودہ سمجھے جاتے ہیں۔ البتہ دیہات کے غریب تا حال اُن پر کاربند ہیں۔ ان مراسم کے مطابق والدین شادیوں کے سلسلے میں ہر معاملے کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ نیا طریقہ یہ اختیار کیا گیا ہے کہ اسلامی تعلیمات کی پابندی میں دولہا اور دلہن دونوں کی رضامندی حاصل کی جاتی ہے۔ یہ طریقہ معقول بھی ہے اور ترقی پسندانہ بھی۔ پھر اس میں وقت کی بھی کوئی قید نہیں۔ اس کے قواعد وضوابط تیرہ سو سال پیشتر بنے تھے اور اب تک اُن پر بے تکلف عمل ہو رہا ہے اس سلسلے میں فریقین خصوصاً لڑکی کی رضامندی پر زور دینے کا مطلب یہ ہے کہ اسلام نے جہاں مردوں کے حقوق کا خیال رکھا ہے وہاں عورتوں کے حقوق کی حفاظت میں بھی کوتاہی نہیں کی۔

منگنی اور بیاہ کی رسمیں مسلمانوں میں بھی ویسی ہی ہیں جیسی وہاں کے غیر مسلموں میں رائج ہیں البتہ مسلمان اس موقع پر مذہبی طریقوں کا خاص خیال رکھتے ہیں اور چینیوں کی طرح نہ گانا ہوتا ہے نہ گھنٹے بجائے جاتے ہیں اور نہ پٹاخے چھوڑے جاتے ہیں۔ ان چیزوں کو وہ لغو سمجھتے ہیں نکاح کی رسم ایک دن پیشتر یا عام رسم سے کچھ دیر پہلے ادا کی جاتی ہے۔ آج کل شادیاں مسجدوں میں ہوتی ہیں اور لوگ بینڈ بجواتے ہیں، بینڈ میں کوئی ایسے گانے نہیں گائے جاتے جو دیوتاؤں کی پرستش پر مبنی ہوں۔

چین کے آئین میں تعدد ازدواج کی اجازت نہیں۔ مسلمان اس کے پابند ہیں۔ البتہ شہری صوبوں کے متعلق یقین سے یہ بات نہیں کہی جا سکتی۔ ملک میں کوئی ایسی اسلامی عدالت نہیں جس میں طلاق، گود لینے یا میراث کے مقدمات پیش ہو سکیں۔ دوسرے اسلامی ملکوں میں ایسی عدالتیں موجود ہیں۔ چین میں یہ تمام مسائل عام عدالتوں ہی کے روبرو پیش ہوتے ہیں

چینی مسلمان میت کے سلسلے میں اسلامی رسوم کی پابندی کرتے ہیں، مگر ماتم میں اور لباس میں وہ چیزیں اختیار کرتے ہیں جو کنفیوشس کے پیروؤں میں رائج ہیں اور ماحول کی

نیت پیش نظر رکھتے ہوئے یہی مناسب نظر آتا ہے۔ جب بیمار آدمی زندگی کے آخری
دن میں پہنچتا ہے اور اس پر نزع کی حالت طاری ہوتی ہے تو خاندان کے لوگ ضبط کے
ساتھ اس کے پاس بیٹھے رہتے ہیں۔ کوئی بھی ایسے جذبات کا اظہار نہیں کرتا جو آخری وقت
میں مرنے والے کے ایمان پر برا اثر ڈالیں۔ وہ برابر پاس بیٹھے ہوئے کلمہ پڑھتے رہتے
ہیں۔ اس طرح بیمار آدمی کی توجہ اس ایمانی بنیاد ہی پر مرکوز رہتی ہے۔ اس حالت میں وہ
اپنے مالک کے پاس پہنچ جاتا ہے۔

جان نکلتے ہی میت کا منہ اور آنکھیں بند کر دی جاتی ہیں۔ اس کے ہاتھ پاؤں سیدھے
کر دیے جاتے ہیں اور چہرہ سوتی تولیے سے ڈھانک دیا جاتا ہے۔ پھر اہل خاندان اور
عزیز ماتم شروع کرتے ہیں، لیکن زور زور سے کوئی نہیں روتا اور نہ کوئی ایسی بات کہتا ہے
جو خالق و مالک کے خلاف ہو۔ میت کو کمرے سے نکال کر ایک خاص چارپائی پر جو صرف
میت کے لیے بنی ہوتی ہے، ڈال دیا جاتا ہے۔ بعد ازاں عزیزوں، رشتہ داروں اور
ہمسایوں کو اطلاع دی جاتی ہے۔

میت کے کپڑے اتار کر سفید کپڑے میں اسے لپیٹ دیا جاتا ہے اور خوشبو
لگا دی جاتی ہے۔ تجربہ کار رشتے دار چھوٹی بڑی تفصیلات کا خاص خیال رکھتے ہیں۔
ضروری سمجھا جاتا ہے کہ میت کو چوبیس گھنٹے کے اندر اندر دفن کر دیا جائے۔ اور کسی بھی حالت
میں تین روز سے زائد نہ رکھا جائے۔ فوراً قبر کی کھدائی شروع ہو جاتی ہے اور کفن دفن کی ضروری
چیزیں فراہم کر لی جاتی ہیں پھر غسل دیا جاتا ہے، مرد کو مرد غسل دیتے ہیں اور عورت کو عورتیں۔
غسل سے پیشتر بخور دان ہاتھ میں لیے میت کے ارد گرد سات چکر لگائے جاتے ہیں۔ غسل
میں پہلے میت کی طہارت کرتے ہیں پھر سر، چہرہ، کندھے، کمر وغیرہ دھوتے ہیں۔ اوپر کا
حصہ پہلے نیچے کا حصہ بعد، دایاں پہلے، بایاں بعد، سامنے کا حصہ پہلے، پیچھے کا حصہ بعد۔
پانی تین مرتبہ بہایا جاتا ہے، ایک آدمی دھوتا ہے، دوسرا پانی ڈالتا ہے تیسرا کروٹ بدلتا ہے

پھر کسی نرم کپڑے سے جسم آہستہ آہستہ پونچھ کر کفنایا جاتا ہے۔ کفن کے تین جزو ہوتے ہیں، ایک زیر جامہ، پھر ایک چھوٹی چادر پھر ایک بڑی چادر، مردوں کے لیے سرپوش ہوتا ہے، عورتوں کے لیے سرپوش کے ساتھ نقاب بھی ہوتا ہے۔ خاص خوشبوؤں میں بسا ہوا پوڈر ماتھے، ناک، منہ، ہاتھوں، پاؤں، گھٹنوں وغیرہ پر مل دیتے ہیں، تاکہ میت کا جسم محفوظ رہے پھر میت کو تابوت میں رکھا جاتا ہے، اوپر ایک کمبل ڈال دیا جاتا ہے۔ اس طرح اُسے ایک بڑے ایوان یا صحن میں رکھتے ہیں اور نمازِ جنازہ ادا کی جاتی ہے، آج کل پورے چین کے مسلمان امیر ہوں یا غریب، جنازے کی نماز مسجدوں میں پڑھتے ہیں، نماز جنازہ کی شکل یہ ہے کہ مرد قطاروں میں کھڑے ہو جاتے ہیں، اخوند یا پیش امام بنتا ہے۔ وہ جنازہ پڑھاتا ہے اور مقتدی صرف تھوڑے تھوڑے وقفے سے تکبیریں کہتے ہیں، بعد ازاں سلام پھیر کر دعا مانگتے ہیں۔ نمازِ جنازہ بے حد ضروری ہے۔ اگر کسی شخص کو نماز کے بغیر دفن کر دیا جائے تو محض اہلِ خاندان ہی نہیں اُس علاقے کے تمام مسلمان موردِ الزام ٹھہریں گے۔

نمازِ جنازہ کے بعد چار آدمی کندھوں پر تابوت اٹھا لیتے ہیں اور قبرستان کی جانب جاتے ہیں، ہر چار منٹ کے بعد میت اُٹھانے والے بدلتے رہتے ہیں۔ سب لوگ میت کے پیچھے چلتے رہتے ہیں۔ نہ گانا ہوتا ہے اور نہ بات چیت کرنا اور سب یہ سوچتے ہیں کہ جس طرح ہمارا یہ بھائی اپنی زندگی کے دن پورے کر گیا ہم سب کے دن بھی کسی وقت پورے ہو جائیں گے۔

قبرستان میں پہنچ کر میت کے گھر والے قبر کا معائنہ کرتے ہیں اور خوشبوؤں میں بسا ہوا پوڈر اُس کے چاروں کونوں میں چھڑک دیتے ہیں پھر میت کو تابوت سے نکال کر تین یا چار آدمی قبر میں اتارتے ہیں۔ میت کا سر شمال کی جانب ہوتا ہے اور چہرہ اوپر کی طرف۔ نیز چہرہ کفن سے باہر نکال دیا جاتا ہے تاکہ میت اُٹھے تو چہرہ ٹھیک

... کی جانب ہو۔ لحد کو پتھر یا موٹے تختے سے بند کر دیتے ہیں اور پر مٹی ڈالتے ہیں۔ اس اثنا
... خوند قرآن مجید کے پہلے پارے کی تلاوت کرتا ہے پھر اخوند اور سب لوگ ہاتھ اٹھا
... بت کے لیے دعا کرتے ہیں۔ لوحِ قبر یا دوسرے متعلقات ہر خاندان کے اپنے صواب دید
... مرِ ہیں۔ مذہبی طریقہ یہ ہے کہ قبر کی زیادہ آرائش نہ کی جائے۔

تدفین کے بعد خاندان کے لوگ ماتم جاری رکھتے ہیں۔ وہ وقتاً فوقتاً قبر کی زیارت
... تے ہیں۔ اخوند یا مذہبی رہنما بھی اس سلسلے میں بلائے جاتے ہیں تاکہ میت کے
... دعا کریں۔ دعائیں دفن کرنے کے دن کے علاوہ ساتویں دن، نیز دوسرے تیسرے
... ساتویں ہفتے میں کرنے کا دستور ہے۔ بعض لوگ ساتویں، چالیسویں اور سوویں دن
... علاوہ پہلی برسی اور دوسری برسی کی پابندی کرتے ہیں۔ بہترین طریقہ یہ ہے کہ ہر شخص
... کے دن اپنے متوفی رشتے داروں کے لیے دعا کرے اور قرآنِ مجید پڑھے اگر اخوند اور
... رے علما کو اس سلسلے میں بلایا جائے تو ان کے لیے کھانے کا انتظام کیا جاتا ہے
... خ کاغذ میں روپے لپیٹ کر اخوند کو دیے جاتے ہیں اور میت کی طرف سے غریبوں میں
... م کیے جاتے ہیں۔ چینی مسلمانوں میں نمازِ جنازہ کو بہت اہم سمجھا جاتا ہے اس لیے کہ اس
... تعلق میت کی دائمی راحت سے ہے۔ اس موقع پر تمام لوگ شریک ہوتے ہیں یہاں تک
... غیر مسلم بھی مسجد میں پہنچ جاتے ہیں، تاکہ جس حد تک ممکن ہو ماتم زدہ خاندان کا ہاتھ بٹائیں۔
... لمانوں کے طریقِ دعا، نمازِ جنازہ اور دوسرے مراسم کو دیکھتے ہیں تو مذہبِ اسلام کی عظمت
... ے متاثر ہوتے ہیں اور یہ واضح ہو جاتا ہے کہ مسلمانوں میں باہم کتنا ربط و ضبط ہے۔ شادیوں
... ے سلسلے میں چینی مسلمانوں نے مقامی رسوم کے مطابق اپنے طریق بھی بدل لیے ہیں لیکن
... ت کے سلسلے میں ہر چیز عین اسلامی طریقے کے مطابق کی جاتی ہے اور اس میں تغیر کا کوئی
... ن نہیں ملتا۔

چینیوں میں تین اہم جشن ہیں، ایک وہ جشن جو ماہِ رمضان کے خاتمے پر ہوتا ہے، دوسرا

وہ جشن جو یوم حج کے دوسرے دن ہوتا ہے۔ تیسرا رسول اللہ صلعم کے یوم میلاد کا جشن
پہلے جشن کو عید الفطر کہتے ہیں۔ ساری اسلامی دنیا میں اسے چھوٹی عید قرار دیا جاتا ہے
دوسرا جشن عید الاضحیٰ کا ہے جسے عید قربان بھی کہتے ہیں۔ اس لیے کہ اس موقع پر نماز کے
بعد اس غرض سے قربانیاں کی جاتی ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ کی قربانی کی یاد
تازہ ہو جائے اور یہ یاد کر لیا جائے کہ ان پاک بندوں نے خدا کا حکم کس طرح خوشی خوشی
تھا۔ طریقہ یہ ہے کہ پانچ آدمی ایک اونٹ میں حصہ دار ہوتے ہیں تین ایک گائے میں
بھیڑ یا دنبہ ایک ہی شخص کے نام پر قربان کیا جاتا ہے۔ قربانی کا گوشت غریبوں اور
رشتہ داروں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ صرف تھوڑا سا حصہ قربانی کرنے والا اپنے لیے رکھ لیتا
ہے۔ چینی مسلمان عید رمضان کو زیادہ شان و شوکت سے مناتے ہیں اور عید قربان اس کے
مقابلے میں چھوٹے پیمانے پر منائی جاتی ہے۔

رسول اللہ صلعم کا یوم میلاد قمری مہینے کے مطابق ہوتا ہے۔ یعنی ہر تین سال میں ایک
مہینے کا فرق پڑتا رہتا ہے۔ لہٰذا یہ تقریب کسی بھی موسم میں آسکتی ہے۔ اس روز ہر مسلمان
نہایت عمدہ لباس پہنتا ہے اور مسجد میں آکر قرآن خوانی میں شریک ہو جاتا ہے۔ اخوند کی
پیشوائی میں نعتیں پڑھی جاتی ہیں۔ پھر اخوند رسول اللہ صلعم کی سیرت اور تعلیم مقدس کے متعلق
تقریر کرتا ہے۔ تقریب کے اختتام پر بچوں اور جوانوں میں مٹھائی تقسیم کی جاتی ہے۔ بعض
مسجدوں میں دعوتوں کا انتظام ہوتا ہے۔ زمانۂ حال میں مسلمانوں نے اس امر کا خاص اہتمام
شروع کر دیا کہ یوم میلاد کے خطبے ریڈیو سے نشر کرائے اور ہوائی جہاز کرائے پر لے
کر سیرت کے متعلق چھوٹے چھوٹے رسالے جا بجا تقسیم کیے۔ ایک تقریب حضرت فاطمہؓ کی
یادگار میں بھی منائی جاتی ہے۔ یہ صرف مستورات کے لیے ہے۔

چینی مسلمانوں کی تعلیم اور ثقافت

چین میں جو مذہبی تعلیم پہلے رائج تھی وہ قرون وسطیٰ کے اس نمونے پر مبنی تھی جو عربوں اور

ہمارے یہاں اونٹ میں دس اور گائے میں سات حصہ دار ہو سکتے ہیں (مترجم)

...نیوں میں رائج تھا جن لوگوں نے اس طریقے میں مہارت حاصل کر رکھی تھی وہ لکچرد بنتے طلبہ اپنے طبعی رجحان کے مطابق جس علم میں مہارت حاصل کرنا چاہتے اُسے اختیار لیتے۔ چین میں صرف تین مرکز تھے جن میں اس نوع کی خاص درس گاہیں قائم تھیں اور صرف ...ے اخوند تمام مضامین کا درس دیتا تھا نہ تعلیم کا کوئی پروگرام تھا، نہ معیار اور نہ یہ مقرر تھا ہر طالب علم کو کتنی مدت درس گاہ میں صرف کرنی چاہیے۔ ہر شے صرف اخوند کی مرضی پر منحصر ہوتی۔ اس نظام تعلیم میں بعض زبردست خامیاں تھیں۔ جو کتابیں پڑھائی جاتی تھیں، وہ ...ت پرانی ہو چکی تھیں۔ عربی کی تعلیم ناکافی تھی۔ چینی زبان کی تعلیم دی ہی نہ جاتی تھی۔ طالب علم ...بی پڑھ لیتے تھے، لیکن وہ اس میں بات چیت نہ کر سکتے تھے۔ پھر مذہبی نصاب کے لیے کسی ...م تعلیمی پس منظر کا کوئی انتظام نہ تھا۔ ندآزادی سے فائدہ اٹھا کر طلبہ عموماً بری عادتیں اختیار ...لیتے تھے۔

چین میں جمہوریت قائم ہوئی تو وقت کے تقاضے پیش نظر رکھتے ہوئے دینی تعلیم کے لیے متعدد نئے سکول قائم کیے گئے جن میں سے بہترین اسکول تین تھے، اول پیکنگ کا ...نگ نائی[1] نارمل سکول، دوم شنگھائی کا اسلام نارمل سکول، سوم کن منگ کا منگ تہ[2] ...ئی سکول۔ جب چین وجاپان کی جنگ شروع ہوئی تو بدقسمتی سے پیکنگ اور شنگھائی کی ...درس گاہوں کو اندرون ملک میں منتقل کرنا پڑا۔ اگرچہ امید تھی کہ جنگ کے بعد انھیں ...از سر نو جاری کیا جاسکے گا، لیکن جب سے کیمونسٹ چین پر قابض ہوئے ہیں، اس بارے ...میں کوئی خبر نہیں مل سکی۔

چین وجاپان کی جنگ سے پیشتر ان تین درسگاہوں سے اٹھائیس طلبہ کو اعلیٰ تعلیم کے لیے ازہر (قاہرہ) بھیجا گیا۔ ایک ہزار سال کی مدت میں یہ پہلا موقع تھا کہ چین سے طلبہ ازہر پہنچے۔

---

[1] Ming Teh [2] Cheng Tai

جمہوریت کے زمانے میں مسلمانوں نے ایک ہزار سے زیادہ پرائمری سکول قائم کیے
متعدد مشہور ہائی سکول بھی جاری ہو گئے۔ کالجوں اور یونیورسٹیوں کی تاسیس کے لیے سرمایہ
تھا لیکن پیکنگ یونیورسٹی میں عربی زبان اور اسلام کے لیے خاص تعلیم کا بندوبست کر دیا گیا تھا
اسی طرح سنٹرل یونیورسٹی، یونن یونیورسٹی اور چنگ سن یونیورسٹی میں انتظام ہو گیا۔ بہ حالت موجودہ
جزیرہ تیوان میں تیوان یونیورسٹی اور شن چی یونیورسٹی میں اسی طرح خاص مذہبی تعلیم کا انتظام ہے۔[1]

[1] اس سلسلے میں ان معلومات کا خلاصہ درج کر دینا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے جو بدرالدین صاحب جامعی نے اپنی کتاب میں دی ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ چینی مسلمان ابتدا ہی اس لیے قرآن مجید کے ترجمے سے گریزاں رہے کہ اسے بدعت سمجھتے تھے۔ ۱۹۲۷ء میں ایک غیر مسلم نے جس کا نام لی۔ تی۔ چنگ تھا، جاپانی زبان سے قرآن مجید کا ترجمہ چینی میں کر کے چھاپ دیا۔ اس پر مسلمانوں نے شور مچایا کہ غیر مسلم نے ترجمہ کیوں کیا؟ لیکن ظاہر ہے کہ یہ کام وہ خود نہیں کر سکتے تھے اس کے لیے دوسروں کو طعنہ دینا بالکل بے جا تھا۔ پھر مسلمانوں نے پیکنگ میں ایک انجمن قائم کی اور ایک فاضل مسلمان کے زیر نگرانی قرآن کا ترجمہ مکمل کیا جو ۱۹۳۲ء سے چھپنا شروع ہوا۔ ۱۹۳۱ء میں ایک اور ترجمہ جی۔ زدمی نے شنگھائی سے شائع کیا اس کے لیے ہاردون نامی ایک یہودی نے بڑی مالی امداد دی تھی یہ بہت بڑا تاجر اور دین دار تھا اور ۱۹۳۱ء میں دس کروڑ ڈالر چھوڑ کر مرا۔ جی زدمی بھی غیر مسلم تھا۔

اس کے علاوہ مندرجہ ذیل نامکمل ترجموں کا بھی ذکر کیا ہے۔

۱۔ مسلم علمی ادارے کی طرف سے قسط وار ترجمہ ایک رسالے میں چھپنا شروع ہوا (از جنوری ۱۹۲۶ء)

۲۔ ماؤ چوہ مترجم نے قسط وار ترجمہ ایک رسالے "بہی اسلام" میں چھاپنا شروع کیا۔ تاریخ درج نہیں۔

۳۔ یانگ چیون شیون پیکنگ۔ صرف ایک پارہ شائع ہوا۔

۴۔ لی یوزنیک مترجم نے ترجمے اور تفسیر کا صرف نمونہ چھاپا۔ تاریخ معلوم نہیں۔

۵۔ ینگ ہونگ کس مترجم نے جنوری ۱۹۳۱ء سے قسط وار ترجمہ اور تفسیر کی اشاعت "نظارۃ اسلام" میں شروع کی۔

علاوہ بریں بدرالدین صاحب نے چینی مسلمانوں کے کم و بیش اکیس رسالوں کی فہرست دی ہے جن میں سے بعض ماہوار چھپتے تھے بعض سہ ماہی، بعض مہینے میں دو بار اور بعض مہینے میں تین بار۔

غرض قیام جمہوریت سے چین و جاپان کی جنگ تک تیس سال کی مدت میں چینی مسلمانوں نے ثقافتی ترقی کے لیے وہ سب کچھ کیا جو اُن کے بس میں تھا۔ رسالے اور اخبار جاری کیے گئے جن کی حیثیت مذہبی اور سیاسی تھی، لیکن ابھی تک ایسی قومی مطبوعات کی ضرورت باقی ہے جو چین کے تمام مسلمانوں تک پہنچ سکیں۔ چین و جاپان کی جنگ کے بعد انجمن اسلامیہ چین نے یہ اجازت لی کہ ہر ہفتے کم از کم ایک لکچر ضرور اسلامیات کے متعلق نشر کیا جا سکے تاکہ اسلام کی آواز وسیع تر حلقے میں پہنچ سکے۔ بڑے بڑے فضلا ان پروگراموں میں حصہ لیتے ہیں اور عوام نے اس پر بڑی پسندیدگی کا اظہار کیا۔ جو تقریریں ریڈیو پر نشر ہوتی ہیں وہ پمفلٹوں کی شکل میں چھاپ کر بھی وسیع پیمانے پر تقسیم کی جاتی ہیں۔ تیوان کے مرکزی ریڈیو پہ بھی یہ سلسلہ بڑی مدت تک جاری ہے۔

اسلام کو چین میں آئے ہوئے ایک ہزار سال سے زیادہ مدت گزر چکی تھی، لیکن قرآن اور حدیث کا کوئی چینی ترجمہ موجود نہ تھا اور نہ چینی زبان میں ایسی کتابیں موجود تھیں جن میں اسلامی فلسفے، اسلامی تاریخ، اسلامی سائنس اور اسلامی ادبیات کی تفصیلات موجود ہوتیں۔ جنگ سے کچھ مدت پیشتر ادبی اور تاریخی معلومات مہیا کرنے کا کام شروع ہوا، لیکن جنگ نے اس کام میں خلل پیدا کر دیا۔ تاہم چینی زبان میں قرآن مجید کا نیا ترجمہ ابھی ابھی تیوان میں چھپ چکا ہے۔ تیوان کے تعلیمی بیورو نے عرب، ایران، اور ٹرکی کے مشہور عالموں کو دعوت دی ہے کہ وہ عالمی ادبی مجلس[1] کے ممبر بن جائیں جس کا مدعا یہ ہے کہ عربی، فارسی اور ترکی زبان کی اہم کتابوں کا ترجمہ چینی میں کیا جائے۔ یہ ایک نہایت اہم واقعہ ہے۔

چینی مسلمانوں کی اکثریت اُن عربوں، ایرانیوں یا ترکوں کے اخلاف پر مشتمل ہے جنھوں نے چین پہنچ کر اہلِ چین سے شادیوں کے تعلقات پیدا کر لیے اور وہ چینی رسموں کے پابند ہو گئے۔ اس طرح دونوں ثقافتیں مل جُل گئیں۔ اس کا اندازہ دونوں حلقوں کی ثقافتوں کا

[1] World Literature Committee.

جائزہ لینے سے ہو سکتا ہے۔ اس سلسلے میں یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ چین نے ثقافت میں کون کون سے دلچسپ پہلو پیدا کیے۔ منگ خاندان کے دورِ حکومت میں مسلمانوں نے گلدان پیالے اور دوسری چیزیں بنانی شروع کیں جن میں نہایت عمدہ رنگ استعمال کیے جاتے تھے ان میں نہایت نازک اور سبک عربی و ایرانی وضع کے بیل بوٹے بنائے جاتے تھے یا قرآن مجید کی آیات اور احادیث بڑی خوش اسلوبی سے لکھی جاتی تھیں۔ یہ چیزیں آج چین کے قومی خزانوں کی زینت ہیں۔ یہ عجائب خانے میں مل سکتی ہیں یا ان دولت مندوں کے گھروں میں جو ایسی قیمتی چیزیں فراہم کرتے رہتے ہیں۔

چینی فن کاروں نے اسلامیت کے زیرِ اثر فنِ خطاطی کی بھی بڑی خدمت انجام دی پہلے چینی وضع کا ایک خاکہ تیار کرتے پھر اسلامی عقائد یا امثال یا نظموں سے اسے آراستہ کر دیتے۔ دور سے دیکھیں تو معلوم ہو کہ چینی حروف میں شیر پائندہ باد لکھا ہوا ہے لیکن غور سے ملاحظہ فرمائیں گے تو آپ کو عربی کے جملے ملیں گے۔ خطاطی نے ایک کمال یہ پیدا کیا کہ عربی چینی رسم الخط میں لکھے گئے۔ بظاہر وہ چینی تحریر معلوم ہوگی لیکن اسے پڑھ وہی سکتا ہے جو عربی جانتا ہو۔ مسلمان فن کاروں نے ثقافتی و مصوری میں بھی بڑی شاندار خدمات انجام دیں وہ صرف گلدستوں یا صراحیوں پر پھول وغیرہ بناتے تھے۔ پہاڑوں، دریاؤں، پرندوں یا جانوروں کی شبیہ نہیں بناتے تھے۔ اس طرح انھوں نے چینی اور عربی نقاشی کو ملا کر فن میں ایک نیا اضافہ کر دیا جو چینی ثقافت میں ان مسلمانوں کی یاد تازہ کرتا ہے جنھوں نے چین میں توطن اختیار کر لیا تھا۔

دسواں باب

اسلام انڈونیشیا میں

(استاذ حسین محی الدین انگرندت)

اسلام کے پہنچنے سے پہلے انڈونیشیا نے صدیوں تک ہندوؤں اور بدھوں کی ثقافتوں
قبول کیے رکھا تھا۔ ان کی وجہ سے جزائر کی ثقافت پر گہرا اثر پڑا۔ آج انڈونیشیا ان ملکوں میں سے
ہے جہاں دنیا کی سب سے بڑی اسلامی آبادی موجود ہے یعنی سات کروڑ سے زائد ...ان جزائر
میں اسلام کے پہنچنے کی سب سے پہلی اطلاع ہمیں مارکوپولو کے بیان میں ملتی ہے۔ چین میں
قبلائی خاں کے ماتحت سالہا سال بہ طور ملازم گزار چکنے کے بعد مارکوپولو نے سنہ ۱۲۹۲ء (۶۹۲ھ)
میں بر راہ بحر اوینس کی جانب معاودت کی تو راستے میں پرلاک[1] بھی ٹھہرا جو جزیرہ سماٹرا کے شمالی
ساحل پر واقع تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ اس شہر کے بسنے والے لوگوں کو "مسلمان"[2] تاجروں نے
حلقہ گوش اسلام بنالیا۔ مارکوپولو کے بیان کے مطابق آس پاس کی ریاستوں کے باشندے وحشی
اور لامذہب تھے۔ سماٹرا میں مارکوپولو نے پانچ مہینے اس انتظار میں گزار دیے کہ ساز گار ہوائیں
چلنے لگیں اسے اپنی اور ساتھیوں کی حفاظت کے لیے ایک مستحکم حصار بنانا پڑا اس لیے کہ
آس پاس کے باشندے آدم خور تھے۔ اس مشہور عالم سیاح نے دو مقاموں کا ذکر کیا ہے،
ایک کا نام وہ "سمارا"[3] بتاتا ہے اور دوسرے کا "بسما"[4]۔ اب یہ ثابت ہو چکا ہے کہ پہلا

---

[1] Perlak [2] یہاں "Saracens" استعمال ہوا ہے جو دراصل مستشرقین اہل مغرب کی بگڑی ہوئی شکل ہے
...یہ لفظ ابتدا میں یورپ کے لوگ مسلمانوں کے لیے استعمال کرتے رہے۔ یہاں تک کہ سید امیر علی نے اپنی تاریخ اسلام کا نام

[3] Basma [4] Samara A Short History of the Saracenes Pese[illegible]

مقام "سمدرا" تھا اور دوسرا "پاسی"؛ یہ دو قصبے ہیں جن کے بیچ میں سے دریائے پاسی گزرتا ہے اور یہ پرلاک کے شمال میں تھوڑی دور واقع ہیں۔

اس علاقے کے پہلے سلطان کی قبر اب سمدرا کے قریب دریافت ہو چکی ہے۔ اس کی لوح پر جو کچھ کندہ تھا اس میں سے مندرجہ حصہ پڑھا گیا: "الملقب سلطان ملک الصالح، وفات ۶۹۶ھ (۱۲۹۷ء)۔ ایک مقامی روایت مظہر ہے کہ سمدرا کا پہلا سلطان کافر تھا۔ اس نے ۶۶۹ھ (۱۲۷۰ء) اور ۶۷۴ھ (۱۲۷۵ء) کے درمیان اسلام قبول کر کے الملک الصالح کا لقب اختیار کیا۔ اگر واقعی مارکوپولو نے سمدرا کو "سمارا" لکھا تو انڈونیشیا میں غالباً پہلی اسلامی سلطنت تھی جسے ساتویں صدی ہجری کے اواخر میں مارکوپولو نے دیکھا۔ سمدرا کی سلطنت زیادہ بڑی ہو گئی، لیکن اس اثر و نفوذ کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اسی کے نام پر پورے جزیرے کا نام "سماٹرا" مشہور ہوا۔

مراکش کا شہرۂ آفاق سیاح ابن بطوطہ (وفات ۷۷۹ھ ۱۳۷۷ء) چین جاتے ہوئے ۷۴۶ھ (۱۳۴۵ء) میں سمدرا پہنچا۔ اس زمانے میں سلطان الملک الظاہر حکمران تھا جو الملک الصالح (مارکوپولو کے عہد کا سلطان) کا پوتا تھا۔ ابن بطوطہ لکھتا ہے کہ وہاں اسلام کا دور دورہ ہوئے ایک صدی گزر چکی ہے، بادشاہ بڑا پارسا، متقی، حلیم اور مذہبی حمیت کا پیکر ہے، اپنی رعایا کی طرح وہ بھی شافعی فقہ کا پیرو ہے۔ وہ علمائے دین کی مجلس منعقد کراتا ہے، ان سے مذہبی معاملات کے متعلق مذاکرے کرتا رہتا ہے۔ اس کی مجلس میں قرآن مجید کی تلاوت ہوتی ہے۔ جمعہ کے دن ادائے نماز کے لیے پیدل مسجد میں جاتا ہے اور اندرون ملک میں جو کافر بستے ہیں، ان سے وقتاً فوقتاً جہاد کی نوبت آجاتی ہے۔ ابن بطوطہ کی موجودگی میں بادشاہ کے ایک فرزند کی شادی ہوئی تھی۔ اس کی جو تفصیلات بیان کی ہیں ان سے دل پر یہ اثر پڑتا ہے کہ سمدرا کے شاہی دربار کی شان و شوکت خاصی بلند تھی۔

ا؎ Samudra ۲؎ Pase

جزیرہ سماٹرا میں سورابایا کے قریب جرسک نام ایک گاؤں ہے وہاں سے ایک لوح
جس پر کوفی رسم الخط میں عربی کی ایک عبارت مرقوم ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس
ایک عورت دفن ہوئی تھی جس کی وفات ۴۷۵ھ (۱۰۸۲ء) یا ۴۹۵ھ (۱۱۰۲ء)
اس بارے میں تیقن کے ساتھ کچھ نہ کہہ سکنے کی وجہ یہ ہے کہ دوسرا ہندسہ سات
جا سکتا ہے اور نو بھی۔ غرض کسی بھی سال کو درست ماننا چاہیئے، تسلیم کرنا پڑے گا
نیشیا میں مسلمانوں کے ورود کا بالکل ابتدائی دور ہے۔ ساتھ ساتھ یہ شبہ بھی ظاہر کیا
کہ آیا یہ لوح اسی جگہ سے متعلق تھی یا کسی دوسری جگہ سے آئی تھی اور اس شبہ کی تائید
دلائل پیش کیے جاتے ہیں۔ جرسک میں ایک قبر ملک ابراہیم کی بھی ہے۔ جو
ن سے آیا تھا ——— لوح کی تحریر سے ٹھیک واضح نہیں ہوتا ——— اس
۸۲۲ھ (۱۴۱۹ء) میں ہوئی۔ پاسی کے نزدیک ایک قبرستان میں سنگ مرمر
قبرہ ہے اس کی لوح پر شجرہ نسب درج ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ
باسی خلیفہ المستنصر کی اولاد میں سے تھا المستنصر نے ۶۲۳ھ۔ ۶۴۰ھ
(۱۲۲۶ء۔ ۱۲۴۲ء) تک حکومت کی۔ بہرحال یہاں عباسی شہزادوں کی اولاد میں سے تھا
یورش بغداد کے وقت قتل عام سے بچ کر نکل گئے تھے (۶۵۶ھ، ۱۲۵۸ء)
فات ۸۸۰ھ (۱۴۷۵ء) میں ہوئی۔

صدی ہجری اور غالباً ۸۵۵ھ (۱۴۵۱ء) میں چین کا ایک بلند پایہ عہدہ دار
م کے سلسلے میں توبان، جرسک اور سرب آیا تھا۔ یہ مقامات جاوا کے شمالی ساحل
۔ اس کے ساتھ ماہوان نام ایک چینی مسلمان بھی تھا وہ لکھتا ہے کہ آبادی
نوں پر مشتمل ہے جو مغربی جانب سے ترک وطن کر کے آئے ہیں۔ ان کے
لوں نے اسلام قبول کر لیا ہے۔ دیسی باشندے بھی ہیں جو اب تک کفر

پرقائم ہیں وہ بھوت پریت پر اعتقاد رکھتے ہیں۔ اوپر قبروں کی الواح کا جو ذکر آچکا ہے، نیز ماہوان[1] نے اختصار سے جو کچھ لکھا ہے اس کے سوا جزیرۂ جاوا میں ابتدائی اسلامی آبادی کے متعلق معلومات کا کوئی ذریعہ نہیں۔

سمدرا پاسی کی سلطنت غالباً اس وجہ سے کمزور ہو گئی کہ شمالی سماترا میں مقابلے پر اور سلطنتیں پیدا ہو گئی تھیں۔ پرتگیزیوں نے ۹۲۸ھ (۱۵۲۱ء) میں سمدرا پاسی پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد پاسی کا ایک فرد ——— پرتگیز مورخین نے اس کا نام فلاتہان[2] بتایا ہے ——— مکہ معظمہ چلا گیا اور وہاں دو تین سال تک تعلیم پاتا رہا۔ پھر وطن لوٹا تو اس پر واضح ہو گیا کہ پرتگیزیوں کے زیر تصرف اشاعتِ اسلام کے لیے فضا سازگار نہیں رہی، لہٰذا وہ پاسی سے نکلا اور دیمک[3] چلا گیا جو جزیرہ جاوا کے شمالی ساحل پر واقع ہے۔ یہ مقام جزیرہ جاوا کی پہلی اسلامی سلطنت کا دارالحکومت تھا جس کی بنیاد ادن پاتہ[4] نے رکھی تھی (وفات ۹۲۴ھ ۱۵۱۸ء)۔

فلاتہان دیمک پہنچا تو خاندانِ حکومت کا تیسرا سلطان حکمران تھا جس کا نام پنگران ترنگانا[5] مدتِ حکومت ۹۲۸ھ - ۹۵۳ھ، ۱۵۲۱ء - ۱۵۴۶ء تھا۔ سلطان نے فلاتہان کا خیر مقدم بڑی اچھی طرح کیا۔ اس کا سبب محض یہ نہ تھا کہ وہ بہت بڑا عالم تھا اور اس نے مکہ معظمہ میں تعلیم پائی تھی، ایک سبب یہ بھی تھا کہ عام بیانات کے مطابق اس کا نسبی تعلق خاندانِ رسالت سے تھا۔ سلطان نے اپنی ایک بہن کی شادی اس سے کر دی اور وہ اشاعتِ اسلام کی غرض سے مغربی جانب روانہ ہو گیا۔ اس نے فوج جمع کر کے بن تن[6] پر قبضہ کر لیا اور ۹۳۳ھ (۱۵۲۶ء کے اواخر یا ۱۵۲۷ء کے اوائل) میں جاوا کی مغربی بندرگاہ سنڈا کلپا[7] کو مسخر کر کے اس کا نام جیاکرتا ——— اب جکارتا ——— رکھا۔ بیاکارتا بھی

---

[1] MAHVAN [2] FALATEHAN [3] DEMAK [4] PATAH

[5] PANGERAN TRENGGANA [6] BANTEN غالباً یہ وہی مقام ہے جسے بن تم (BANTAM) کہتے ہیں۔ [7] SNDAKALPA

زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں "فتح مبین" یعنی واضح اور روشن فتح۔ یہ نام اُس نے قرآن مجید سے لیا۔

معاصر مورخوں نے سُونن گننگ جاوٹی اور پیر جو جاتی کی پہاڑی پر دفن ہے اکو غلط تھا بتایا ہے اور یہ پیر اُن نو پیروں میں سے ایک ہے جنھوں نے جاوا کی آبادی کو حلقہ بگوش اسلام بنایا۔ ان نو پیروں میں سے بیشتر یا تو اُس مقام سے منسوب ہیں جہاں وہ رہتے تھے یا اُس مقام سے منسوب ہیں جہاں وہ دفن ہوئے اور اُن کا ساتھ سُوسُو ہونن۔ جس کا خلاصہ سُنن ہے ــــــ شامل کر دیا گیا اس لفظ کے معنی ہیں واجب الاکرام، شایانِ احترام یا مولانا۔ ظاہر ہے کہ یہ غیر معمولی لقب اس شخص کے نہایت احترام و اکرام کا ثبوت ہے۔ ان پیروں کے متعلق جو روایات عام طور پر رائج ہیں، انھیں اگر مسلمہ تاریخی حقائق سے ملا کر غور کیا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ ابتدائی دور میں اسلام کے کون سے اصول اہلِ انڈونیشیا کو سکھائے جاتے تھے۔

ان میں سے ایک پیر سنن کالی جاگا[۱] کے متعلق بتایا گیا ہے کہ اُس نے اپنے تقویٰ اور پرہیزگاری کو چھپانے میں کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھی تھی۔ دنیا پر وہ یہ ظاہر کرنا چاہتا تھا کہ اُس کی زندگی اچھی حالت میں نہیں گزری۔ اسلام کی اشاعت کے لیے اُس نے پتلیوں کے تماشے کا بندوبست کیا اور ہندوؤں کی رزمیہ داستانوں یعنی رامائن اور مہابھارت سے مختلف کردار لے لیے۔ ساز بھی بجتے تھے یعنی ڈھول، بنسریاں، دوتارے اور گانا بھی ہوتا تھا۔ سنن کالی جاگا کو ان کھیلوں میں کمال حاصل تھا جو ہندوؤں کی رزمیہ داستانوں پر مبنی تھے۔ کھیل ہو چکتا تو وہ کہتا مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں، میں کوئی پیسہ نہ لوں گا صرف میرے ساتھ ایک مرتبہ کلمہ توحید پڑھ لو جاؤ۔ اس طرح عام روایات کے متعلق اُس نے وسیع پیمانے پر اسلام پھیلایا۔

کہا جاتا ہے کہ جب دیمک میں مسجد بننے لگی تو پیروں کے لیے بھی اس میں حصہ لینا

---

[۱] Sunan Kali Djaga   [۲] Sunan Gunung Djadi

ضروری تھا اور پیروں نے سنن کالی جاگا کے ذمے یہ خدمت لگادی کہ لکڑی کا ایک بہت
ستون مسجد کے لیے فراہم کر دے۔ چنانچہ اُس نے آخری وقت میں لکڑی کے چھوٹے چھوٹے
ٹکڑے اکٹھے کر کے عالی شان ستون تیار کر دیا۔ یہ اب تک اُس مسجد میں موجود ہے چار
میں سے اوپر جو ایک تختہ لگا ہوا ہے وہ ستون کے سرے پر نہیں پہنچتا۔ وہاں اب بھی
معلوم ہوتا ہے کہ لکڑی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں سے مشابہ کچھ چیزیں موجود ہیں اس
آگے چل کر اتنا مقدس سمجھ لیا گیا کہ عقیدہ پیدا ہو گیا کہ اگر عید الاضحیٰ کی سات نمازیں یہاں
پڑھی جائیں تو وہ مکہ معظمہ میں حج کے برابر ہو جاتی ہیں[1]۔ یہ عقیدہ غالباً جاوا کے نو پیروں کی
کی وجہ سے پیدا ہوا جنھیں غیر معمولی طور پر مقدس سمجھا جاتا ہے۔

ان پیروں سے کرامتیں بھی منسوب ہیں اور انھیں کرامتیں نہیں بلکہ معجزے کہا جاتا
جو صرف رسولوں سے سرزد ہو سکتے ہیں۔

جاوی زبان میں دو اسلامی دستاویزیں محفوظ ہیں جن سے دسویں صدی ہجری (ا
صدی عیسوی) کے اسلامی افکار کا کچھ پتا چل سکتا ہے۔ ان میں سے ایک سنن بونگ
کی کتاب ہے جو سنہ ۸۹۰ھ سے سنہ ۹۳۲ھ (۱۴۸۵ء سے ۱۵۲۵ء) تک سرگرم عمل رہا۔ یہ کتاب
ان ملحدانہ صوفیانہ افکار کے رد میں لکھی گئی تھی، جیسے جو کچھ ہے وہ خدا ہے اور جو نہیں وہ
خدا ہے۔ اسے خدا کی انتہائی تنزیہ قرار دیا جاتا تھا۔ سنن بونگ کا استدلال یہ تھا
خدا اس قسم کی توضیحات سے بہت بالا ہے، وہ اعلیٰ الاعلیٰ ہے، غیر مادی ہے، ازلی
اور ابدی ہے۔ اس مختصر سے اشارے سے واضح ہو جاتا ہے کہ جاوا میں اسلام کے
دور ہی میں سے راسخ العقیدہ مسلمانوں کا تصور بھی موجود تھا اور الحاد و وجودیت بھی پائے
جانے لگے۔

دسویں صدی کی دوسری اسلامی دستاویز کے مصنف کا حال معلوم نہیں، اس لیے

[1] سے ماہر بنگلہ عقیدہ سے بہ دیا ہے سلہ B OrAAK

دست آویز کے ابتدائی صفحے بھی غائب ہیں اور آخری صفحے بھی۔ یہ ایسی دستاویز ہے جسے جاوی زبان میں پرم بون[1] کہتے ہیں یعنی جنتر منتر، دعاؤں جھاڑ پھونک، قیافہ شناسی، تعبیر خواب، بعض نشانات کی بنا پر پیش گوئیوں یا اس قسم کی دوسری باتوں کا مجموعہ ہو۔ اس دستاویز میں مذہب کے متعلق زیادہ تر باتیں ہیں۔ البتہ آخر میں ایک صفحہ ایسا ہے جس میں نامبارک جسمانی حرکات کا ذکر ہے۔ مذہبی امور اصلاً اخلاقیات سے متعلق ہیں۔ مثلاً یہ بتایا گیا ہے کہ نماز کے لیے طہارت اور وضو سے بیشتر قصد و نیت کا پورا اہتمام کرنا چاہیے۔ تصوف پر تبصرہ کرتے ہوئے صحیح عقیدے اور صحیح تعبیرات پر بہت زور دیا گیا ہے اور ان کے خلاف جابجا متنبہ کیا گیا ہے۔ اس سے خیال ہوتا ہے کہ یہ دستاویز بھی وجودیوں ہی کے خلاف مرتب ہوئی تھی۔ اس میں مولانا شیخ ابراہیم اور ان کے مواعظ کا بھی ذکر ہے۔ اس سے مراد غالباً ملک ابراہیم ہے جس کا انتقال ۸۲۲ھ (۱۴۱۹ء) میں ہوا اور اس کی قبر گرسک میں ہے۔

ایک مشہور روایت ہے جو دسویں صدی کی ان دستاویزوں کی متصوفانہ فضا سے مناسبت رکھتی ہے اور وہ یہ کہ جاوا کے پیروں نے بالاتفاق اپنے رفیق سہ سیتی جنار[2] کی مذمت کی جو خفیہ علم سکھاتا تھا، جمعہ کی نماز سے غفلت برتتا تھا اور کہتا تھا کہ میں اور خدا ایک ہیں۔ سہ سیتی جنار کا یہ دعویٰ ویسا ہی ہے جیسا بغداد کے مشہور صوفی منصور حلاج نے انا الحق کا دعویٰ کیا تھا۔ حلاج کو ۳۰۹ھ (۹۲۲ء) میں بمقام بغداد سولی دے دی گئی لیکن جس تصوف کی اس نے تعلیم دی تھی اسے مریدوں نے خوب پھیلایا اور اس تصوف نے ایرانی شاعری میں بڑے برگ و بار پیدا کیے۔ سہ سیتی جنار اور حلاج کے تصوف میں جو نمایاں مشابہت پائی جاتی ہے غالباً اسے بجائے خود اس بات کا ثبوت نہ سمجھا جائے گا کہ جاوا میں اسلام ایران کے راستے پہنچا لیکن اس شہادت کا یہ بڑا نمایاں پہلو

---

[1] Prim Bon [2] Seh Sitlo Dejenar

ہے کہ جاوا میں جو اسلام پہنچا وہ ایران کے راستے مغربی ہندوستان پھر سماٹرا ہوتا ہوا پہنچا۔ مثلاً محرم کی دسویں تاریخ کو ـــــــ جس روز شیعہ امام حسینؓ کی شہادت مانتے ہیں ـــــــ جاوا کے بہت سے خاندان ایک خاص کھانا تیار کراتے ہیں۔ اس کا نام انھوں نے بُوبُر سُوراؔ رکھا ہے۔ سُورا اصل میں لفظ عاشورہ ہے یعنی محرم کی دسویں، یہ لفظ ایران سے (یہ) پہنچا۔ ماہِ محرم کو بھی جاوی زبان میں سُورا (عاشورہ) کہتے ہیں۔ شمالی سماٹرا میں ایک مقام اُچے ہے، جہاں شیعہ اثرات کی کچھ یادگاریں بھی ملتی ہیں۔ مثلاً ماہِ محرم کو وہ لوگ ماہ حسن حسین کہتے ہیں۔ وسطی سماٹرا کے مغربی ساحل پر منگ کبوؔ ایک مقام ہے جہاں ماہِ محرم کو "ماہ تعزیہ" کہتے ہیں۔ یہ اُس رسم کی طرف اشارہ ہے جو شیعہ حضرات امام حسینؓ کے یوم شہادت پر اُن کے مقبرے کی تمثال کے طور پر نکالتے ہیں اور بازاروں میں پھرا کر اُسے یعنی تعزیے کو دریا میں یا پانی کے کسی دوسرے ذخیرے میں ڈال دیتے ہیں۔ روایت یہ ہے کہ اسلام سب سے پہلے منگ کباؤ میں جاری ہوا تھا اور اس کا ذمے دار شطاری سلسلے کا ایک صوفی تھا۔ یہ سلسلہ اب بھی ہندوستان اور انڈونیشیا میں موجود ہے۔ ایران کے راستے اسلام کے جاوا پہنچنے کی ایک معقول شہادت یہ بھی ہے کہ جب قرآن پڑھانے کے سلسلے میں عربی رسم الخط سکھایا جاتا ہے تو حروف کی تشریح کے لیے عربی نہیں، ایرانی نام استعمال کیے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی ایرانی اثر کی مزید شہادتیں بہ آسانی دیکھی جا سکتی ہیں۔

ہندوستان کے مغربی ساحل سے تعلق کا ثبوت ان الواح سے بھی مل سکتا ہے جو شمالی سماٹرا میں پائی جاتی ہیں۔ ملک ابراہیم کی قبر پر جو لوح لگی ہوئی ہے کھمبائت (گجرات) سے آئی تھی جہاں اس قسم کی الواح کھدکر بنوائی جاتی تھیں اور اُن پر کوئی عبارت کندہ کرالی جاتی تھی۔ اس تعلق کی دوسری زبردست شہادت یہ ہے کہ انڈونیشیا کے مسلمان شافعی ہیں اور ہندوستان کے مغربی ساحل پر ملیبار کے مسلمان بھی شافعی ہیں۔ ان شہادتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے مؤرخوں نے یہ نظریہ تسلیم

MINANG KABAV ATJAEH BUBUR SURA

لیا ہے کہ اسلام ایران نیز ہندوستان کے مغربی ساحل کے راستے انڈونیشیا پہنچا۔

جب اسلام انڈونیشیا پہنچ گیا تو ان مسلمان تاجروں کی سرگرمیوں سے جا بجا پھیلا چھوٹ نے مختلف مقامات کی عورتوں سے شادیاں کرلی تھیں اور وہ عارضی طور پر یا مستقل طور پر یہاں مقیم ہو گئے تھے۔ شادی سے پہلے عورتوں کو داخلِ حلقۂ اسلام کر لیا جاتا تھا۔ ساتھ ہی عورت کا پورا خاندان اسلام قبول کر لیتا تھا۔ یہ ایک ایسا عمل ہے جو دنیا کے بہت سے دوسرے حصوں میں بھی پایا جاتا ہے، جہاں اسلام پوری طرح شائع نہیں ہوا۔ نئے اسلامی کنبوں کے بننے سے طبعاً بچوں کے لیے اور جوانوں کے لیے اسلامی تعلیم کی ضرورت پڑ گئی۔ شروع میں مذہبی تعلیم کا جو انتظام کیا گیا تھا وہ اب بھی خاص حد تک بلا تغیر و تبدل جاری ہے یا اس میں بہت کم تغیر ہوا ہے۔ یہی نظامِ تعلیم اور شادیاں جزائر انڈونیشیا میں اشاعتِ اسلام کا پُرامن وسیلہ تھیں۔

بالکل ابتدائی دور میں قرآن کی عبارت پڑھائی جاتی ہے۔ آج کل ایک چھوٹا سا قاعدہ بھی تیار ہو چکا ہے، جس میں عربی کے حروف لکھے ہوتے ہیں۔ نہ انھیں جوڑا جاتا ہے، نہ ان پر اعراب لگائے جاتے ہیں۔ عام طور پر اس قاعدے میں سورۂ فاتحہ اور تیسویں پارے کی تمام سورتیں بھی شامل ہوتی ہیں۔ چھوٹی سورتیں پہلے، بڑی سورتیں بعد میں۔ ممتاز خاندان کے بچوں کو ایک معلم گھر آکر پڑھاتا ہے جسے "گرو" کہتے ہیں۔ عام خاندانوں کے بچے یا تو گرو کے گھر جا کر پڑھتے ہیں یا عبادت کی جگہوں میں تعلیم پاتے ہیں۔ مقاماتِ عبادت کو وسطی جاوا کی جاوی زبان میں "لنگ" کہا جاتا ہے۔ مغربی جاوا کی سورالی زبان میں "تج داگ" کہتے ہیں۔ ملائی زبان میں ان کا نام "سوڑا" ہے اور ملائی زبان انڈونیشیا کی زبان سے زیادہ ملتی جلتی ہے۔ ساٹ جو مغربی سماٹرا کی زبان میں ان کے لیے "میون سا" کا لفظ ہے جو عربی کے لفظ "مدرسہ" سے بگڑا ہوا ہے۔

یہ مقامات پانچ وقت کی باجماعت نماز، مذہبی اجتماعات اور مذہبی تعلیم کے لیے استعمال

ملہ TADJUG سہ SURAU سہ MEUNSAH

کیے جاتے ہیں جمعہ کی نماز وہاں نہیں پڑھی جاتی، اس لیے کہ وہ مسجد کے تقاضے پورے نہیں کرتے۔

جب طالب علم ابتدائی قاعدے جان لیتا ہے تو پھر قرآن پڑھنے میں لگ جاتا ہے۔ بالآخر اس کے والدین احباب کی ایک دعوت کا انتظام کرتے ہیں جسے "سلامتن"[۱] کہا جاتا ہے اور اس میں بچہ قرآن پڑھ کر اپنی صلاحیت کا ثبوت بہم پہنچاتا ہے، سلامتن کو ایک گونہ مذہبی رنگ دے دیا گیا ہے۔ ابتدائی مذہبی تعلیم میں اور چیزیں بھی شامل ہوتی ہیں مثلاً مسائل طہارت نماز ادا کرنے کے طریقے، روزہ رکھنے کے لیے مقصد و نیت کا اہتمام۔ رمضان کے مہینے میں ہر افطار کے وقت دوسرے دن کا روزہ رکھنے کی نیت ضروری ہے، ان مقاصد کے لیے بھی چھوٹی چھوٹی کتابیں بنی ہوئی ہیں، جن میں سے بعض میں تصویریں ہوتی ہیں تاکہ طہارت اور نماز کے معاملات کو بچہ بخوبی ذہن نشین کرلے، ایسی کتابوں کو مجموعہ ارکان کہا جاتا ہے۔ ملایا میں یہ کتابیں عربی رسم الخط میں اور انڈونیشیا میں لاطینی رسم الخط میں چھپتی ہیں۔ عربی جملوں کا ترجمہ بھی ساتھ ہوتا ہے، جن مردوں اور عورتوں کو بچپن میں دینی تعلیم پانے کا موقع نہیں ملتا یا وہ کچھ سیکھ کر بھول گئے، ان کے لیے بھی تعلیم کا انتظام ہے۔ عورتوں کے لیے عورتیں عموماً صبح کے وقت تعلیم کے مواقع مہیا کرتی ہیں۔ مردوں کو کام کاج کے بعد شام کے وقت تعلیم دی جاتی ہے۔

جو لوگ اسلام کا گہرا مطالعہ کرنا چاہیں، انھیں کسی ایسے دینی مدرسے میں جانا پڑتا ہے جہاں رہ کر تعلیم پا سکتے ہیں۔ ان مدرسوں کو "پسن ترائن"[۲] کہتے ہیں۔ ان درس گاہوں میں وسیع پیمانے پر تعلیم دی جاتی ہے اور اسلامی دینیات سے تعلق رکھنے والی تمام شاخوں کے متعلق ضروری کتابیں پڑھائی جاتی ہیں خصوصاً تین چیزوں کے متعلق یعنی فقہ، عقائد اور تصوف ان کے علاوہ فن تجوید، صرف و نحو، تفسیر اور حدیث بھی پڑھائی جاتی ہے۔ بعض طلبہ مشہور معلموں

---

۱ SLAMETAN ۲ PESANTRIN

ے تعلیم پانے کے شوق میں ایک درس گاہ سے دوسری درس گاہ میں چلے جاتے ہیں۔ بعض اعلیٰ
لعے کے لیے مکہ معظمہ یا قاہرہ پہنچ جاتے ہیں۔ سماٹرا میں ایسی درس گاہوں کو "مدرسے" کہا جاتا
ے۔ یہ ملائی نام ہے جو عربی زبان سے آیا۔ جاوا میں یہ نام اُن درس گاہوں کے لیے استعمال
نا ہے جن میں دینیات کے علاوہ عام مضامین بھی موجودہ زمانے کے اصول کے مطابق پڑھائے
تے ہیں۔

جو کتابیں اس سلسلے میں پڑھائی جاتی ہیں، اُن میں سب سے زیادہ عام مروّج "سفینۃ النجات"
ہے جو سالم بن سُمیر الحضرمی نے مرتب کی (وفات بمقام جکارتا ۱۲۷۱ھ، ۱۸۵۴ء)۔
میں اسلام کے ارکانِ خمسہ کے متعلق تمام معلومات نہایت اختصار سے جمع کر دی گئی ہیں، اس
اب کے چار مختلف ایڈیشن ہیں، ایک خالص عربی ایڈیشن ہے جس کے ساتھ کوئی ترجمہ نہیں اور
ی ایڈیشن ایسے ہیں جن میں عربی متن کے ساتھ ترجمے بھی ہیں۔ ایک ترجمہ ملائی زبان میں ہے، دوسرا
ی زبان میں اور تیسرا سنڈانی زبان میں۔ حدیث، فقہ اور مسائلِ قضا، نیز روزے، نکاح اور
اِث کے متعلق مفصل معلومات ملائی طالب علموں کو درس گاہوں میں مل جاتی ہے۔ الٰہیات اور اصولِ
کے لیے السنوسی کی مستند کتاب موجود ہے جس کے ساتھ ملائی زبان میں بین السطور ترجمہ بھی چھپا ہوا
ہے نیز فقہ شافعی کی دوسری کتابیں ملتی ہیں اور بعض کتابوں میں حنفی فقہ کے مسائل بھی درج ہیں تصوف
لے مطالعے کے لیے امام غزالی کی کتابوں کے ترجمے ملائی زبان میں ہو چکے ہیں۔ زمانۂ حال میں
بھی درس گاہوں کی تعداد بہت بڑھ گئی ہے۔ ابتدائی درس گاہوں میں بھی دینی تعلیم جاری ہو
ئی ہے اور دورِ حاضر کے اصول پر بھی مدرسے قائم کیے گئے ہیں، اس وجہ سے اسلام کے
تعلق انڈونیشیا میں کتابوں کی اشاعت پر بہت اچھا اثر پڑا ہے چنانچہ بہت سی کتابیں لاطینی
سم الخط میں شائع ہوئیں، بعض کے ساتھ عربی میں متن چھاپے گئے۔ بعض کے محض متن چھپے۔
نڈونیشی زبان میں قرآن کے نئے ترجمے شائع ہو چکے ہیں اور متنِ قرآن کے بھی نئے ایڈیشن
لبع ہوئے ہیں۔ ساتھ ساتھ ایک مرقع چھاپ دیا گیا ہے جس میں قرآن بصحیح طریق پر پڑھنے کے

اصول بیان کیے گئے ہیں۔ سُنڈانی زبان میں اسلام سے متعلق ایسی کتابیں بھی ہیں جن میں متن کے ساتھ بین السطور ترجمہ ہے اور بغیر ترجمے کے بھی چھپی ہیں۔ سُنڈانی درس گاہوں میں عام طور پر تعلیم جاوی زبان کے ذریعے دی جاتی ہے، اس لیے کہ جو معلم میسر آتے ہیں، اُنھوں نے جاوی زبان میں تعلیم پائی تھی لیکن اب مادری زبان کے استعمال پر زیادہ زور دیا جا رہا ہے۔ انڈونیشیا کے علمائے دین نے دینی کتابوں کے تراجم یا نصاب کی نئی کتابوں کی ترتیب کے ذریعے سے اسلام کی اشاعت پر نمایاں اثر ڈالا ہے۔

شریعت کسی قوم کے مذہب کا جائزہ لیتے وقت محض یہ نہ دیکھنا چاہیے کہ اُسے مذہبی امور کا کس قدر علم ہے اور وہ کس حد تک اس کی پابندی کرتی ہے۔ بلکہ قوم کے مزاج اور مذہب کے تعلق میں اس کے جذبات کو بھی پیشِ نظر رکھنا چاہیے۔ جاوی لوگ پابندانِ مذہب کو "سفید لوگ" کہتے ہیں یعنی وہ جن کے دامن ہر آلائش سے پاک ہیں۔ جو مذہبی امور کی پابندی نہیں کرتے اگرچہ وہ مسلمان ہیں اُنھیں عام طور پر "سُرخ لوگ" کہا جاتا ہے۔ پابندانِ مذہب یعنی اسلام کے متعلق علم اور اسلامی اصول کے مطابق عمل والوں کی تعداد بڑھ رہی ہے، اس لیے کہ مذہبی تعلیم کا دائرہ وسیع ہو رہا ہے اور سیاسی اسلامی پارٹیوں کی سرگرمیاں تیز ہو رہی ہیں۔ ساتھ ہی بین الاقوامی معاملات میں اسلام کی اہمیت روبہ ترقی ہے، پڑھے لکھے لوگ اسی سیاسی اہمیت کی بنا پر اسلام کی جانب کھنچے چلے آ رہے ہیں۔

اس کتاب کے ابتدائی ابواب میں بتایا جا چکا ہے کہ اسلام کے پانچ بنیادی اصول یا ارکان ہیں جن پر شریعت مبنی ہے یعنی کلمۂ شہادت، نماز، زکوٰۃ، روزہ اور حج۔ انڈونیشیا میں نماز کو سب سے زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔ پانچوں مقررہ اوقات میں مسجدیں اور "لنگر" نمازیوں سے بھرے ہوئے نظر آئیں گے۔ جمعہ کی نماز مسجدوں میں اس پیمانے پر ادا کی جاتی ہے کہ اُن میں آدمی سما نہیں سکتے۔ عید الفطر میں اجتماع اور بھی زیادہ ہوتا ہے یہ اس حقیقت کا ثبوت ہے کہ انڈونیشیا کے لوگوں کو نماز کا بہت زیادہ احساس ہے اور آبادی کے اضافے

کے ساتھ نئی مسجدیں بھی بن رہی ہیں۔

انڈونیشیا میں جو مسجدیں بن رہی ہیں، اُن کا نمونہ خاص ہے۔ چھتوں کی وہ تہیں نہیں ہوتی ہیں، مگر کہیں مینار ہوگا تو مسجد سے بالکل الگ اُونچے بُرج کی طرح بنایا جائے گا۔ اب جو مسجدیں بن رہی ہیں اُن میں نیا فنِ تعمیر پیشِ نظر رکھا جاتا ہے اور اس پر مغربی اسلامی ملکوں کی مساجد کا اسلوبِ تعمیر اثرانداز ہوا ہے۔ انڈونیشیا کی مسجدوں میں پانچ وقت پہلے نقارے کے ذریعے سے نماز کے وقت کا اعلان کیا جاتا ہے۔ پھر مسجد کی چھت پر کھڑا ہوکر مؤذن اذان دیتا ہے۔

اہلِ انڈونیشیا میں سے اکثر لوگ خواہ وہ مذہب کے متعلق خاص معلومات رکھتے ہوں یا نہ رکھتے ہوں، نماز کے سلسلے میں نیّت کی اہمیت سے پوری طرح آگاہ ہیں۔ اُنھیں پورا احساس ہوتا ہے کہ خدا کے سامنے عجز و انکسار سے حاضر ہونے اور اخلاص سے عبادت کرنے کی اہمیت کیا ہے۔ عجز و انکسار خود جسم کی حرکات سے بھی نمایاں ہوتا ہے۔ مثلاً رکوع و سجود جو نماز کے اجزا ہیں۔ جب باجماعت نماز ادا کی جائے تو عجز و اخلاص کا اثر اور بھی بڑھ جاتا ہے۔

لمبوک[1]، بالی سے آگے ایک جزیرہ ہے، یہاں کے لوگوں میں ایک فرقہ ہے جو کہتا ہے دن میں صرف تین مرتبہ نماز ادا کرنی چاہیے۔ وہ لوگ اکثر رسوم میں شرعی قانون کے علاوہ "عادت" کو بھی پیشِ نظر رکھتے ہیں، "عادت" جسے ان کے رواج کا درجہ دینا چاہیے، یہ ہے کہ مثلاً کوئی عورت اس زمین کی وارث نہیں بن سکتی جہاں چاول کاشت کیے جاتے ہیں۔ حالانکہ شرعِ اسلامی میں اس وراثت سے عورت کو محروم رکھنے کی کوئی وجہ نہیں۔

انڈونیشیا میں زکوٰۃ کا بھی خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ رمضان کے اختتام پر عید الفطر کی تقریب میں غریبوں کو زکوٰۃ دی جاتی ہے۔ شریعت کے مطابق اس موقع پر چاول بھی دینے چاہئیں لیکن چاولوں کے علاوہ روپیہ بھی دیا جاتا ہے[2]۔ زکوٰۃ دینے والا ملک کی جنس ——— انڈونیشیا

[1] Lombok. [2] بظاہر مقالہ نگار نے یہاں زکوٰۃ اور فطرانہ کو خلط ملط کر دیا ہے حالانکہ یہ دونوں الگ چیزیں ہیں۔

کے تعلق میں چاول خرید لیتا ہے اور اپنے خاندان کے ہر فرد کے حصے کا حساب کر کے زکوٰۃ کے طو[ر]
مذہبی معلم کے حوالے کر دیتا ہے۔ مذہبی معلم عموماً وہی ہوتا ہے جو زکوٰۃ دینے والوں کے بچوں [کو]
تعلیم دیتا ہے۔ آج کل بڑے شہروں میں کمیٹیاں بن گئی ہیں جو تمام خاندان کے اکابر کو اطلاعات [دے]
دیتی ہیں کہ زکوٰۃ کا روپیہ کمیٹیوں کے حوالے کیا جائے جو اُسے غریبوں میں تقسیم کرنے کی ذمہ د[ار]
ہوں گی۔ شریعت کے مطابق جن لوگوں کو زکوٰۃ دی جا سکتی ہے، اُن میں زکوٰۃ فراہم کرنے
لوگوں کے علاوہ غریب اور مسکین شامل ہیں۔ مذہبی معلموں کو بھی اسی ضمن میں رکھا جاتا ہے، اس
لیے کہ اُن کے پاس معاش کا اور کوئی ذریعہ نہیں ہوتا۔ زکوٰۃ کے باقی حق دار انڈونیشیا میں آج
ہیں ہی نہیں۔[1]

رمضان کے روزے زیادہ تر دین دار لوگ رکھتے ہیں۔ باقی شروع کر لیتے ہیں لیکن چند [دن]
کے بعد ترک کر دیتے ہیں۔ اس کے مختلف وجوہ ہو سکتے ہیں۔ بعض لوگ جسمانی اور ذہ[نی]
اعتبار سے زیادہ مشقت برداشت ہی نہیں کر سکتے یا سمجھ لیتا چاہیے کہ لوگوں میں وہ عزم نہیں
[ج]و روزوں کے لیے ضروری ہے۔ بعض لوگ صرف پہلا روزہ رکھتے ہیں۔ اہل جاوا استہزا کے
طور پر کہتے ہیں کہ یہ لوگ "بیدُگ" کے مانند روزے رکھتے ہیں۔ "بیدُگ" اُس نقارے کو کہتے
ہیں جس کی صرف ایک جانب منڈھی ہوتی ہے۔ بعض لوگ پہلے دن کے علاوہ آخری دن کا بھی
روزہ رکھتے ہیں۔ اُن کے متعلق مثل مشہور ہے کہ یہ لوگ "کندنگ" کی طرح روزہ رکھتے ہیں،

[1] سورہ توبہ میں زکوٰۃ کے آٹھ مصرف بیان ہوئے ہیں یعنی فقیر، مسکین، زکوٰۃ وصول کرنے والے لوگ، وہ لوگ جن کے دل میں کلمہ حق کی الفت پیدا کرنی منظور ہو، وہ لوگ جنھیں رقمیں دے کر غلامی سے چھڑایا جائے۔ مقروضوں کے قرض کی ادائیگی۔ فی سبیل اللہ یعنی جہاد کے سلسلے میں اور ان مسافروں کی امداد جن کے پاس گھر پہنچنے کا خرچ موجود نہ ہو۔ مقالہ نگار کا مطلب یہ ہے کہ زکوٰۃ وصول کرنے والے موجود ہیں اور وہ غریب اور مسکین بھی ہیں جن میں زکوٰۃ تقسیم ہونی چاہیے، باقی اصناف انڈونیشیا میں موجود نہیں۔

"کندنگ"[۵] اُس ڈھول کو کہتے ہیں جس کی دونوں طرفیں منڈھی ہوتی ہیں اور بیچ سے خالی ہوتا ہے۔ بعض روزے رکھتے ہی نہیں۔ بعض لوگ پہلے دن، مہینے کے بیچ کے دن اور آخری دن کے روزے رکھتے ہیں۔ رمضان کے مہینے میں ہر شام کو مسجدوں اور لنگروں اور بعض گھروں میں تراویح اور تلاوتِ قرآن کے لیے اجتماعات ہوتے ہیں۔ بعض اجتماعات میں وہ لوگ بھی شریک ہو جاتے ہیں جو روزے نہیں رکھتے۔

امام شافعیؒ کے مطابق قرآن مجید کا نزول رمضان کے آخر دس دنوں کی طاق راتوں میں سے کسی ایک رات میں ہوا یعنی اکیسویں، تئیسویں، پچیسویں، ستائیسویں یا انتیسویں۔ انھیں بہت مقدس مانا جاتا ہے اور لوگ ان راتوں میں نفل پڑھتے ہیں، ذکر کرتے ہیں، قرآن مجید کی تلاوت ہوتی ہے، اور غریبوں میں صدقے تقسیم کیے جاتے ہیں جو لوگ مسجد یا لنگر کے نزدیک رہتے ہیں وہ کھانا پکا کر بھیج دیتے ہیں، زمانہ گذشتہ میں یہ راتیں منانے کے لیے ایک خاص رواج پڑ گیا تھا یعنی آتش بازی چھوڑی جاتی تھی اور چینی لالٹینیں روشن کی جاتی تھیں، عید الفطر کی نماز کے بعد لوگ نئے لباس پہن کر رشتہ داروں اور دوستوں سے ملنے کے لیے جاتے ہیں۔ انڈونیشیا میں یہ دن جشنِ عام کے طور پر منایا جاتا ہے۔ بعض لوگ اپنے رشتہ داروں کی قبروں پر بھی جاتے ہیں۔

انڈونیشیا سے جو لوگ حج کے لیے مکہ معظمہ جاتے ہیں اُن کی تعداد کو سامنے رکھ کر اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ان جزائر کے باشندوں کو اسلام کے ساتھ کس درجہ وابستگی ہے، ۱۳۴۹ھ (سنہ ۱۹۳۰ء) میں تینتیس ہزار حاجی فقط انڈونیشیا سے گئے جب کہ سمندر پار سے جانے والے حاجیوں کی کل تعداد پچاسی ہزار تھی۔ عام شہری لوگ سالہا سال تک تھوڑی تھوڑی رقمیں بچا بچا کر رکھتے ہیں اور اس مذہبی فرض کو بجا لاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اُن کے دل میں حج کے لیے بڑا ہی پکا عزم ہونا چاہیے۔ بعض واقعات ایسے بھی پیش

۵۔ Kendung

آئے کہ کوئی شخص حج کے لیے جانا چاہتا تھا، جا نہ سکا اور انتقال کر گیا، اس کے حج بدل کے طور پر دوسرے شخص کو خرچ دے کر بھیجا جاتا ہے۔ موجودہ حکومت کے ماتحت وزارت امور مذہبی امور حج کی بھی نگران ہے۔ حکومت سے ہر سال بیرونی کرنسی کی ایک خاص مقدار مل جاتی ہے جس میں دس بارہ ہزار حاجی بآسانی سفر کر سکتے ہیں، چنانچہ ملک کے مختلف حصوں میں یہ رقم تقسیم کر دی جاتی ہے اور اسی کے مطابق حاجیوں کو جانے کی اجازت مل جاتی ہے۔ جتنے لوگوں کو اجازت ملتی ہے ان سے بدرجہا زیادہ درخواستیں دیتے ہیں حکومت جہاز کرایے پر لے لیتی ہے اور پورے سفر کی نگرانی کرتی ہے۔

شریعت کا تعلق محض ارکان سے نہیں یعنی نماز، زکوٰۃ، روزہ اور حج بلکہ اس میں دوسرے معاملات بھی شامل ہیں مثلاً قانونِ نکاح، قانونِ وراثت، معاملات، سیاسی سرگرمی وغیرہ، ان دائروں میں "عادت" یعنی رواج کا زیادہ دخل ہے جو ابتدا سے چلا آتا ہے اور شرعی قانون کے مطابق نہ ہونے کے باوجود جاری ہے۔

فقہ کی کتابوں میں کہا گیا ہے کہ شادی کی تصدیق مساجد میں ہونی چاہیے، لیکن اس پر عمل نہیں کیا جاتا۔ ممتاز گھرانوں کی شادیاں، دلھن کے والد یا رشتہ دار گھروں میں ہی کر لیتے ہیں عام لوگ شادیوں کے لیے اس افسر کے دفتر میں پہنچتے ہیں جو ان امور کی نگرانی کے لیے مقرر ہے۔ رواج یہ ہے کہ شادی کا فیصلہ ہو جانے کے بعد دولھا طلاق کا مشروط اعلان کرتا ہے، یعنی وہ کہہ دیتا ہے کہ اگر فلاں فلاں شرطوں کی خلاف ورزی ہوئی تو طلاق واقع ہو جائے گی۔ شرطوں میں وہ تمام چیزیں شامل کی جا سکتی ہیں جو اسلامی مجوزات کے خلاف نہ ہوں۔ جکارتا میں عموماً یہ شرطیں ہوتی ہیں: شوہر بیوی کو مسلسل چھ ماہ چھوڑے رکھے یا تین مہینے تک اس کے لیے نان و نفقہ کا انتظام نہ کرے یا اسے زدوکوب کرے یا چھ مہینے تک اس پر ملتفت نہ ہو ان میں سے کوئی بھی چیز واقع ہو جائے تو طلاق نافذ ہو جاتی ہے طلاق کو روکنے کے لیے شرطیں بہرحال پوری کی جاتی ہیں۔ ایک شرط یہ ہے کہ دلھن صورتِ حال کو منظور کرنے کے لیے تیار نہ ہو اور متعلقہ

حکام کے پاس معاملہ پہنچادے۔ دلھن کی شکایت کو حق بجانب سمجھا جاتا ہے۔

اہل جاوا کی روایت کے مطابق طلاق کا مشروط اعلان ایک سلطان نے جاری کیا تھا۔ اُس کے سپاہی ایک مہم پر چلے گئے اور مدت تک واپس نہ ہوئے، جب آئے تو دیکھا کہ اُن کی بیویوں نے دوسرے مردوں سے شادیاں کرلی ہیں۔ قاضی اس بنا پر پہلے نکاح فسخ کرچکے تھے کہ شوہر بیویوں کو چھوڑکر چلے گئے تھے اور انھوں نے نان ونفقہ کا بھی انتظام نہیں کیا تھا۔ لہٰذا اُس وقت سے ایک شرط یہ بڑھادی گئی کہ اگر فرمانروا کے حکم کے مطابق شوہر کو کسی کام پر جانا پڑے اور اُس میں دیر لگ جائے تو طلاق واقع نہ ہوگی۔ دورِ حاضر کے مشہور عالم سید محمد رشید رضا نے جو محمد عبدہٗ کے شاگرد تھے ایک فتویٰ دیا کہ طلاق کا مشروط اعلان ایک ناواجب بدعت ہے، لیکن جو علماء جاوا کے حالات سے آگاہ ہیں، اُنھوں نے اس رواج کی حمایت کی ہے اور اُن کے نزدیک آئینی بےحفاظتی سے محفوظ رہنے کا یہی ذریعہ ہے۔

جب ایجاب وقبول ہوجاتا ہے جیسا کہ جاوا میں دستور ہے تو ایک رواج یہ بھی ہے کہ نکاح فسخ کرتے وقت میاں بیوی اُس جایداد کو جو دونوں نے مشترکہ طور پر حاصل کی برابر برابر تقسیم کرلیتے ہیں یا شوہر کو دو حصے ملتے ہیں اور بیوی کو ایک حصہ ——— حصول کا معاملہ ملک کے مختلف حصوں میں مختلف ہے۔ نکاح کے وقت جو سامان آتا ہے، وہ شوہر یا بیوی دونوں کا مشترکہ قبضے میں رہتا ہے۔ بیوی یا شوہر کا انتقال ہوجائے تو ملکیت متوفی کے مالکوں کی طرف منتقل ہوتی ہے۔ جاوا میں سید عثمان ایک بہت بڑا فاضل گزرا ہے، اُسے عادت یا رواج کے سلسلے میں اچھی چیزوں کا خاص خیال تھا۔ اُس نے مذکورۂ بالا معاملے میں رواج کو شرعی قانون کے مطابق بنادیا، یعنی صرف شادی کے ذریعے سے مال اسباب اکٹھا کرنے کے بجائے میاں بیوی کی حصہ داری تسلیم کرلی گئی۔

قانونِ میراث کے سلسلے میں ایک رواج مذہبی قانون کے خلاف ہے، یعنی

متوفی کے بیٹے اور بیٹیاں، میراث میں برابر حصہ پاتے ہیں۔ اگر بھائیوں اور بہنوں کے تعلقات خوش گوار ہوں تو وہ کسی قاضی کے پاس جا کر پوچھ لیتے ہیں کہ مذہبی قانون کے مطابق جایداد کیوں کر تقسیم ہونی چاہیے۔ انھیں بتا دیا جاتا ہے کہ بیٹوں کو بیٹیوں سے دوگنا ملنا چاہیے چنانچہ اسی طرح جایداد تقسیم ہو جاتی ہے۔ پھر بیٹے بہ طورِ خود اپنے حصے میں سے بہنوں کو اتنا دے دیتے ہیں کہ وہ نصف حصے کی مالک بن جاتی ہیں۔ اس طرح مذہبی قانون اور رواج دونوں کو پورا کر لیا جاتا ہے۔

وارثوں میں جھگڑے کو روکنے، ساتھ ہی عدل و انصاف کے مقاصد پورے کرنے کے لیے بعض اوقات جایداد وارثوں میں بہ طورِ ہبہ تقسیم کی جاتی ہے۔ ایک طریقہ یہ ہے کہ جایداد کو ٹرسٹ بنا دیا جاتا ہے جو اُسی وقت ٹوٹتا ہے جب ٹرسٹ بنانے والے کی وفات ہو جائے اور مختلف فریقوں سے رضامندی کی تحریری دست آویزیں لے لی جاتی ہیں۔ ان تمام طریقوں کا مدعا یہ ہے کہ شرعی قانون کی خلاف ورزی نہ ہو اور رواج کے ذریعے سے انصاف کی جو حس پیدا ہو چکی ہے اُس کی تسکین بھی ہوتی رہے۔

لیکن ایسے رواج بھی ہیں جو قطعی طور پر شریعت کے خلاف ہیں، مثلاً جزیرہ لم بوک میں تین نمازیں پڑھنے والے لوگ اُن زمینوں کی میراث میں عورتوں کا حق تسلیم نہیں کرتے جن میں چاول بوئے جاتے ہیں، حالانکہ یہ سراسر خلافِ شریعت ہے۔ بعض ماہی گیر کشتیاں بیٹوں کو ورثے میں دے دیتے ہیں اور گھر بیٹیوں کے حوالے کر دیتے ہیں بعض مقامات پر میراث اُس وقت تک تقسیم نہیں ہوتی جب تک متوفی کی بیوی زندہ ہو، وہ چاہے تو اپنے گھر میں رہ سکتی ہے۔ منَنگ کباؤ میں بہ سلسلہ میراث شرعی قانون کی پیروی نہیں کی جاتی۔ اس لیے وہاں کے قانونِ رشتہ میں ماں کے رشتے کو مرکزیت حاصل ہے اور آدمی جو جایداد فراہم کرتا ہے، وہ اُس کی موت کے بعد اُن رشتے داروں

تی ہے جو ماں کی جانب سے قریبی ہو۔

اہل جاوا میں شادی کے لیے مبارک مہینے، مبارک دن اور مبارک ساعت کو
اہمیت حاصل ہے۔ یہ بھی ضروری ہے کہ نکاح نیک ساعت میں ہو۔ یہ بھی ضروری
ہے کہ شادی کی رسم مبارک وقت میں انجام پائے۔ جو سنہ سلطان اگنگ نے ۱۰۴۳ھ
(۱۶۳۳ء) میں جاری کیا وہ جاوی ہندوؤں کے ساکا سنہ پر مبنی تھا اور وہی پورے جلوا
میں رائج ہے۔ اس سنہ کے مطابق ۱۳۷۷ھ (آغاز جولائی ۱۹۵۷ء) جاوی اسلامی
۱۸۹۰ء کے مطابق ہے۔ یہ نظام بڑا پیچیدہ ہے اور یہ ہشت سالہ دور پر مبنی
ہے جس میں تین سال لوند کے آتے ہیں اور دن اتنے ہوتے ہیں جو سات اور پانچ پر
بے تقسیم ہو سکیں اس نظام کے مطابق ہر سال کی ابتدا سات دن یا پانچ دن کے
ہفتے میں ایک ہی دن ہوتی ہے، چونکہ سنہ قمری سال سے بہت آگے ہے اس لیے
میں ایک سو بیس سال کی تصحیح ہو لی جا ہیے۔ بعض مہینوں کو نئی سرگرمیاں شروع کرنے
کے لیے قطعاً ناسازگار اور بعض کو عام طور پر سازگار سمجھا جاتا ہے۔ مثلاً شوال کے مہینے
کو کتابوں میں شادیوں کے لیے اچھا مانا جاتا ہے، لیکن جاوا میں جاوی سنہ کے مطابق
اسے اچھا نہیں مانا جاتا۔ آج کل اس قسم کے تصورات سے انحراف بڑھ رہا ہے۔

بنیادی مذہبی عقائد

اسلام کے بنیادی عقائد چھ ہیں یعنی خدا پر ایمان، فرشتوں پر ایمان، خدا کی اتاری ہوئی کتابوں پر ایمان، خدا کے بھیجے
ہوئے پیغمبروں پر ایمان، یوم آخر پر ایمان، اور قدر خیر و شر پر ایمان۔ یہ چیزیں تمام مسلمانوں
کو سکھائی جاتی ہیں۔ لیکن جن کی تعلیم معمولی ہوتی ہے وہ ان عقائد کے متعلق صرف سطحی علم
رکھتے ہیں۔

پہلے عقیدے یعنی خدا پر ایمان کے متعلق صرف بیس صفات کی تعلیم دی جاتی ہے
خدا ہے وہ ازل سے ہے ابد تک رہے گا۔ وہ یکتا و یگانہ ہے وغیرہ اسی طرح

خدا کے ننانوے نام اسمائے حسنیٰ بتا دیے جاتے ہیں بہرحال بیں صفات اور ننانوے ناموں میں سے کچھ یاد رہ جاتے ہیں، مثلاً خدا رحمٰن و رحیم ہے، یہ نام غالباً اس لیے اور بنے ہیں کہ اس کے ساتھ عبد کا اضافہ کرکے لوگوں کے نام رکھ دیے جاتے ہیں، لیکن ان کے اصل معنوں کا صحیح اندازہ نہیں کیا جاتا۔ غیر مسلم لوگ عموماً خدا کے اسلامی تصور کا صرف ایک ہی پہلو پیش کرتے ہیں یعنی ایک حکمران موجود ہے جو انسان کی پہنچ سے بہت دور ہے اور جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ قرآن مجید میں ایک سے زیادہ مرتبہ اس مضمون کی آیات آئی ہیں کہ خدا جسے چاہتا ہے بخشتا ہے، جسے چاہتا ہے سزا دیتا ہے، لیکن قرآن مجید میں یہ بھی تو آیا ہے کہ خدا بڑا غفار ہے، وہ بندے کی توبہ قبول کرلیتا ہے۔ وہ جلیل و رحیم اور کریم ہے، انڈونیشیا کے مسلمان اسلامی تصور باری تعالیٰ کے ان پہلوؤں سے خوب واقف ہیں اور ان میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو کسی سلسلہ صوفیہ سے تعلق نہیں رکھتے اسلام سے پیشتر بھی اہل جاوا نظر نہ آنے والی مخلوق پر عقیدہ رکھتے اور ان سے نیکی یا بدی کی قوتیں منسوب کرتے تھے اسلام نے انھیں فرشتوں، ابلیس اور جنوں کا عقیدہ دیا۔ جاویوں میں ایک عقیدہ یہ ہے کہ گاؤں کی حفاظت کرنے والی روح کسی درخت میں رہتی ہے۔ سنڈانیوں میں دیوی سری کے متعلق ایک عقیدہ رائج ہے جسے چاول کے چھلکے کا پیکر سمجھا جاتا ہے اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے کسی بھی فعل سے دریغ نہیں کیا جاتا اور جن چیزوں سے روکا جا سکے ان سے اجتناب کیا جاتا ہے، تاکہ چاول کی فصل اعلیٰ پیمانے پر ہو جاویوں اور سنڈانیوں میں یہ عقیدہ رائج ہے کہ کسی پرانے خنجر یا تلوار یا نیزے میں اچھی یا بُری قوت رہتی ہے۔

خدا کی اتاری ہوئی کتابوں پر ایمان عام لوگوں کے لیے صرف اتنی اہمیت رکھتا ہے کہ وہ قرآن کو خدا کی کتاب مانیں۔ ہر آدمی جانتا ہے کہ قرآن میں سورتیں اور آیتیں ہیں اور یہ تیس یکساں پاروں میں منقسم ہے یہ بھی سب کو معلوم ہے کہ قرآن کا نصف کس جگہ ہے۔ جب بچہ قرآن پڑھتے پڑھتے نصف پر پہنچتا ہے تو والدین زردے کی ایک تاب بھر کر چند اور کھانوں کے

ساتھ معلّم کے پاس بھیجتے ہیں۔ جو قرآن مجید پہلے ہندوستان میں چھپتے تھے اور اب پاکستان یا انڈونیشیا میں چھپتے ہیں، اُن میں قرآن کا جو لفظ عین وسط میں آتا ہے وہ سورہ کہف کی انیسویں آیت میں ہے اسے یا تو کالی چھاپتے تھے یا سُرخ۔

چوتھا عقیدہ یہ ہے کہ خدا کے بھیجے ہوئے رسولوں پر ایمان لایا جائے اور اس کا مطلب بھی یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لایا جائے۔ لیکن عام مسلمانوں کو اُن پچیس پیغمبروں کے ناموں میں سے متعدد معلوم ہیں جن کا ذکر قرآن میں آیا ہے محض اس لیے نہیں کہ یہ نام اسمائے معرفہ کے طور پر استعمال کرتے ہیں، اس لیے بھی کہ ان پیغمبروں کے کم و بیش مکمل سوانح ملائی زبان اور عربی رسم الخط میں ملتے ہیں۔ آج کل یہ حالات انڈونیشیا کی زبان اور لاطینی حروف میں، نیز جاوی زبان اور جاوی حروف میں بھی ملتے ہیں۔ انڈونیشیا کے مسلمانوں کو رسول اللہ صلعم کی ذات بابرکات کے ساتھ جو گہری محبت اور وابستگی ہے اس کا اظہار یوم میلاد کی تقریب میں ہوتا ہے۔ یہ تقریب ربیع الاوّل کی بارھویں تاریخ کو شروع ہوتی ہے۔ پھر مہینے کے آخر تک اسے منانے کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ یہ تقریب اس درجہ اہم ہے کہ پورے مہینے کا نام مولود مشہور ہو گیا۔ اس سے پیشتر اور اس کے بعد کے مہینوں کو بھی جاوی لوگ ماہ مولود کا بڑا بھائی اور ماہ مولود کا چھوٹا بھائی کہتے ہیں۔ روایات کے مطابق رسول اللہ صلعم کی پیدائش پیر کے دن ہوئی تھی جب جاوی اسلامی سنہ جاری ہوا تو ربیع الاوّل کی بارھویں تاریخ پیر ہی کے دن تھی۔ یہ دن بڑی دھوم دھام سے منایا جاتا ہے۔ بلکہ یہ تقریب اسلام کے دو مشہور جشنوں عید الفطر اور عید الاضحیٰ کے برابر پہنچ گئی۔ سورہ کارتا اور جوگجا کارتا میں اس تقریب کا آغاز مہینے کی چھٹی تاریخ سے ہو جاتا ہے۔ پہلے ایک میلہ ہوتا ہے جس کا افتتاح مسجد کے صحن میں ڈھول بجا کر کیا جاتا ہے۔ خود رسول اللہ صلعم کی ولادت کے سلسلے میں یہ طریقہ ہے کہ سیرت کی مستند مشہور کتابوں میں سے پڑھ کر حالات سنائے جاتے ہیں خواہ وہ نظم میں ہوں خواہ نثر میں۔ بیچ میں نعتیں پڑھی جاتی ہیں۔ ان میں خطیب اور حاضرین دونوں شریک ہوتے ہیں۔

اس تقریب کے ساتھ بعض ایسے عمل بھی وابستہ ہیں جو اس عقیدے کا ثبوت ہیں رسول اللہ صلعم کا یوم میلاد منانے سے خاص برکات حاصل ہوتی ہے ماتجہ میں نعتیں پڑھنے کے وقت نعت خواں سیاہ دھاگے میں گانٹھیں لگاتے جاتے ہیں اور یہ دھاگے تعویذوں کے طور پر بچوں کی گردنوں میں ڈال دیتے ہیں۔ مغربی جاوا میں دھاگے میں گرہیں لگانے کا کام اس وقت انجام پاتا ہے جب نعتیں پڑھ کر دعا کی جاتی ہے۔ مغربی جاوا میں یہ دستور بھی ہے کہ دعا کے بعد کہتے ہیں: اے ہمارے رب تو ہماری یہ دعا اپنے لطف و نوازش سے قبول کر لے، جب قبول کا لفظ ادا کیا جاتا ہے تو تم کار اس تقریب کے چاولوں میں سے ایک ایک مٹھی اٹھا لیتے ہیں۔ انھیں دھوپ میں خشک کیا جاتا ہے اور جب خاص برکت کی ضرورت پڑے تو انھیں استعمال کیا جاتا ہے، مثلاً کسی لمبے سفر پر جانا منظور ہو۔ مغربی جاوا کے لوگ وہی کام اس وقت شروع کیا کرتے تھے جب نعتیں پڑھی جاتی تھیں۔ ان کے نزدیک اس طرح کام میں رسول اللہ صلعم کی برکات شامل ہو جاتی تھیں مثلاً ماہی گیری کے لیے نیا جال بنانے کا سلسلہ ایسے ہی موقع پر شروع کیا جاتا تھا۔

نعت خوانی محض یوم میلاد نبی پر نہیں بلکہ دوسری تقریبوں پر بھی ہوتی ہے مثلاً والدین کی برسی کے موقع پر یا بچے کے عقیقے کے موقع پر یا ختنہ سے ایک رات پہلے یا شادی سے ایک رات پہلے ——— بعض اوقات صرف خیر و عافیت کی دعائیں کافی سمجھی جاتی ہیں اور وسطی جاوا میں خیر و عافیت کے لیے جو دعوتیں کی جاتی ہیں ——— سلامتن، ان میں لوگ کھانے کو تمام دوسری چیزوں سے زیادہ اہم سمجھتے ہیں جری بُون میں میلاد کی تقریب کے لیے لوگ نزدیک و دور سے آتے ہیں اور ان کا ایک مقصد یہ بھی ہوتا ہے کہ سنن گننگ جاتی کے مزار کی زیارت کریں جو جاوا کے نو پیروں میں سے ایک ہے۔ یہ مزار جاوا کی ایک چوٹی پر ہے اور صرف جری بون کے سلطان وہاں جا سکتے ہیں اس موقع پر ان کاموں کی بھی زیارت کرائی

جاتی ہے جو ان نو پیروں نے جبہ ثم پہاڑ پر اجتماع کے وقت کھانے کے لیے استعمال کی تھیں۔
یہ دیگ یہاں سنن گنگ جاتی کے غلاف میں سے قدیم ترین شامع کے پاس محفوظ ہیں اور لوگ برکت
کے لیے اُن میں روپیے ڈال دیتے ہیں۔

کسن جاتی ۱؎ ٹندرن ٹی نام ایک گاؤں میں ایک مسجد ہے جہاں ایک چھوٹی سی صندوقچی میں
رسول اللہ صلعم کا موئے مبارک رکھا ہے، یہ صندوقچی ایک چھوٹی چارپائی پر رکھی ہوئی ہے۔
یہ چھوٹی چارپائی ایک بڑی چارپائی پر دھری ہے روایت یہ ہے کہ رسول اللہ صلعم ایک مرتبہ یہاں
تشریف لائے تو یہ موئے مبارک اس لیے چھوڑ گئے کہ انڈونیشیا آیندہ ایک اچھا اسلامی
ملک رہے ۲؎۔

پانچواں عقیدہ یہ ہے کہ یوم حشر پر ایمان لایا جائے۔ اس عقیدے کے ساتھ اہل انڈونیشیا
میں ایک اور عقیدہ بھی پھیلا ہوا ہے کہ میدان حشر میں لوگ جمع ہوں گے تو ہر شخص کو سواری کے
لیے وہ جانور ملے گا جو اُس نے عید الاضحیٰ میں قربان کیا تھا جو لوگ مر چکے ہیں اُن کی یاد مختلف اوقات
میں تازہ کی جاتی ہے تیسرے دن، ساتویں دن، چالیسویں دن، سویں دن، ہزارویں دن۔ ساتھ
ساتھ رسمی بھی منائی جاتی ہے۔ شعبان کا مہینا روحوں کی یاد کا مہینا سمجھا جاتا ہے۔ اُس میں مرے
ہوئے لوگوں کے لیے کھانا پکایا جاتا ہے۔ لوگ قبرستان جاتے ہیں، اپنے عزیزوں کی قبریں صاف
کرتے ہیں اور بعض اوقات وہیں کھانا تقسیم ہوتا ہے۔

تقدیر خیر و شر کا عقیدہ اسلام کا چھٹا اور آخری عقیدہ ہے۔ اس عقیدے کا اظہار ماہ شعبان
کی درمیانی شب (۱۴۔ اور ۱۵۔ کی درمیانی شب) میں ہوتا ہے، جسے سال کی بہت نہایت اہم
راتوں میں شمار کیا جاتا ہے، اسلامی دنیا کے دوسرے ملکوں کی طرح انڈونیشیا والے بھی یہی
عقیدہ رکھتے ہیں کہ اس رات اللہ تعالیٰ آیندہ سال کے لیے تمام انسانوں کی تقدیروں کا فیصلہ

۱؎ Jelun ۲؎ Tjereme Kasua ظاہر ہے کہ یہ سراسر
بے بنیاد قصہ ہے۔

کر دیتا ہے اور اسی رات ہر شخص کے نیک و بد کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ کم از کم سنداییوں کا عقیدہ
ہے۔ نیک اور پارسا لوگ اس رات خاص نماز پڑھتے ہیں جیسے صلوٰۃِ تسبیح کہا جاتا ہے۔ ...
خدا سے بخشش اور مصیبتوں کے مقابلے میں حفاظت کے لیے دعا مانگتے ہیں۔ جب کسی شخص کو نا...
حالات سے سابقہ پڑتا ہے تو وہ اسے عموماً تقدیر ہی سے منسوب کرتا ہے۔

اسلام کے ان بنیادی عقائد اور اُن کے نتائج سے انحراف کی کوئی مثال انڈونیشیا ...
نہیں ملتی، حالانکہ ان ہی اختلافات کی بنا پر فرقوں کی بنیادیں پڑیں۔ انڈونیشیا میں فرقہ وار اختلا...
پیدا نہیں ہوئے۔ یہاں صرف ایک چھوٹا سا گروہ ہے جو پانچ کے بجائے تین نمازوں کا ...
ہے۔ ایک اور فرقہ، فرقہ احمدیہ ہندوستان سے انڈونیشیا پہنچا۔ یہ دوسری جنگِ عظیم سے ...
کا واقعہ ہے۔ اس فرقے کا ایک نمائندہ یہاں موجود تھا اور اُس نے بعض افراد کو اپنا ہم نوا بنا...
ہے لیکن عام لوگ اس سے الگ تھلگ رہے۔

تصوّف

تصوف خصوصاً وجودی تصوف کے لیے انڈونیشیا کی روحانی اور جذباتی ...
ابتدا ہی سے ایک زرخیز خطہ بنی رہی۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ اہلِ انڈو... کی ...
کا مزاج ہی خاص تھا، دوسرے یہ کہ ان لوگوں پر ہندویت اور بدھ مت کا خاصا اثر پڑ چکا ...
یہ بھی حقیقت ہے کہ انڈونیشیا کا تعارف اسلام سے ہندوستانیوں نے کرایا۔ یہ بتایا ہی جا...
ہے کہ اسلام کے آغاز ہی میں تصوف کا اثر بہت بڑھ گیا تھا۔ جب سنن بننگ نے تصوف ...
کی مخالفت کی اور جاوا کے لوگ پھر خدا اور انسان کے درمیان تمیز کے سلسلے میں بحث کے ...
لیے مجبور ہوئے۔

شمالی سماٹرا میں بھی دسویں صدی ہجری نیز گیارھویں صدی ہجری کے نصفِ اوّل ...
(سولھویں اور سترھویں صدی عیسوی) حمزہ فنصوری اور شمس الدین (وفات ۱۰۴۰ھ ۱۶۳۰ء)
نے اسی قسم کا تصوف پھیلایا تھا۔ یہ دونوں بزرگ مشہور وجودی صوفی ابنِ عربی کے پیرو تھے۔ ...
درحقیقت قادری سلسلۂ تصوف سے وابستہ تھا اگرچہ وہ ۱۵۰ چتے آپ کو شدومد سے ابنِ عربی کا ...

بنا تھا۔ اُس نے وسیع پیمانے پر جاوا اور سماٹرا کا دورہ کیا اور اپنے متصوفانہ تصورات مختلف
ں میں جا بجا پھیلائے۔ شمس الدین کو آچے کے سب سے بڑے سلطان کی سرپرستی حاصل تھی،
سے تھوڑی دیر بعد گجرات (ہندوستان) کا ایک فاضل نورالدین راندیری انڈونیشیا پہنچا اور
نے سلطان کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ جن لوگوں نے ملحدانہ تصوف کی اشاعت کی ہے
محاسبہ کیا جائے۔ اُس زمانے میں اور بھی بہت سے مشہور صوفی تھے جنھیں انڈونیشیا
یڈا اثر و رسوخ حاصل تھا۔ اُن میں سے بعض عرب میں تعلیم پا کر آئے تھے۔

تصوّف کے جو سلسلے انڈونیشیا میں رائج ہوئے وہ یہ ہیں: قادری، رفاعی، نقشبندی،
ی، قشاشی، شطاری، شاذلی، خلوتی، تیجانی۔ قادری سلسلے کے پیرووں کی تعداد زیادہ
لیکن اس سلسلے کے بانی کا احترام سب سے زیادہ ہوتا ہے۔ جن لوگوں کو موروثی عہدے
قاب حاصل ہیں اُن کی سندوں کی ابتدائی سطروں میں خدا، رسول اور اولیاء کی برکات
ذکر تے ہوئے شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کا نام خاص طور پر لیا جاتا ہے۔ انڈونیشیا کی زبان میں
ی صوفیوں کو فولادی خنجر والے کہا جاتا ہے اس لیے کہ ان لوگوں پر ذکر کے بعد وجد کی
ت طاری ہو جاتی ہے اور وہ اپنے شیخ کے حلقے میں رقص کرتے ہیں تو اسی حالت میں لوہے
خنجر سے اپنے سینے اور کندھے پر زخم لگا لیتے ہیں۔ اگر کوئی زخم ہو جاتا تو شیخ بانی سلسلہ
م لیتے ہوئے لعاب دہن اُس پر لگا دیتے اور زخم اچھا ہو جاتا۔ قدیم زمانے کے حصے
اپنے آپ کو زخم لگانے والے ہتھیار مسجد کی ایک بیرونی عمارت میں رکھے ہوئے ہیں
ختنہ کی تقریبات میں ان ہتھیاروں کو کھیلوں کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ غیر مسلم باشندگان
میں بھی اپنے آپ کو زخم لگانے کا طریقہ جاری ہے۔

سمانی سلسلے کے لوگ بڑی بلند آواز سے ذکر کرتے ہیں۔ جکارتا میں سمانی سلسلے کے
شیخ محمد سمانی کی سیرت بڑی مقبول ہے۔ اسے حاجی محمد ناصر نے ایک ہجو بنا پیر کی
نی کے طور پر مرتب کیا اور اس کی کرامتوں کا بھی ذکر تفصیل سے کیا۔ یہ زیادہ طویل نہیں

اور اس کے مختلف حصے سلامتن کی دعوتوں میں بہ آسانی بلند آواز سے پڑھے جاتے ہیں۔ اس سیرت کا پڑھنا اور سننا دونوں نیکی کا کام متصور ہوتے ہیں اور اس سے واقعی مومن پر اچھا اثر پڑتا ہے۔ باقی سلسلوں کے بانیوں کے حالات بھی ملتے ہیں مثلاً شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے حالات ملائی اور جاوی دونوں زبانوں میں پڑھے جا سکتے ہیں۔ سمجھا جاتا ہے کہ جاوا میں جو سلسلۂ تصوف سب سے پہلے پہنچا وہ شطاری سلسلہ تھا۔ اس میں حقیقت کی سات منزلیں قرار دی ہیں۔ پہلی منزل میں صرف خدا تھا اور کچھ نہ تھا۔ ساتویں یا آخری منزل انسان یا انسانِ کامل کی منزل ہے رسول اللہ صلعم کو اصلاً انسانِ کامل مانا جاتا ہے۔ ان ہی کے ذریعے سے الٰہی قوتیں عالم ناسوت میں منتقل ہوئیں جس طرح روشنی آئینے کے ذریعے سے منتقل ہوتی ہے عقیدہ یہ ہے کہ انسانی روحیں ان قوتوں سے کم و بیش فیض یاب ہیں۔ جاوی صوفی ذکر و مراقبے کا آغاز اس عقیدے سے کرتے ہیں کہ انسان کے اندر انسانِ کامل کے جوہر موجود ہیں اور اُسے اپنے نصب العین کے مطابق زندگی بسر کرنی چاہیے۔ ان ہی اذکار کے ساتھ خدا اور انسان کا تعلق واضح کیا جاتا ہے۔ یہ تعلق خادم اور آقا کا ہے۔

اب بھی الحادی صوفیوں کے افکار انڈونیشیا کے مختلف حلقوں میں موجود ہیں اگرچہ راسخ العقیدہ صوفیوں کے حلقے خاصا اثر رکھتے ہیں اور اگرچہ امام غزالی جیسے راسخ العقیدہ صوفی عالم کا اثر بہت زیادہ ہے جس نے تصوف کے بنیادی اصول مدوّن کیے۔ انڈونیشیا میں تصوف کا اثر اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ بہت سے لوگوں کے نام سلسلہ ہائے تصوف کے نام پر بہ غرض برکات رکھے گئے البتہ ان کے تلفظ میں تبدیلی ہوگی مثلاً غزالی کو انڈونیشیا کی زبان میں گجالی یا گوجالی کہتے ہیں۔

امام غزالی کی تصانیف ملائی زبان میں ترجمہ ہو کر دو سو سال سے انڈونیشیا میں رائج ہیں اور اب ان تصانیف کے ترجمے انڈونیشیا کی زبانوں میں بھی ہو چکے ہیں۔ امام موصوف کے تصوف میں اخلاقی رجحانات بہت قوی ہیں۔ انڈونیشیا کے اسلام میں بھی یہی پہلو نمایاں ہے۔

امام غزالی کی تصانیف مذہبی درس گاہوں میں پڑھائی جاتی تھیں اس وجہ سے اخلاقیات سے متعلق بہت سی عربی اصطلاحات عام ہوگئیں مثلاً ریا، غرور، صبر، شکر، یہ بھی عام طور پر معلوم ہے کہ مسلمان کو شبہ کی ہر چیز سے بچنا چاہیے اگرچہ وہ مباح ہو۔ عربی زبان کی یہ اصطلاحات انڈونیشیا کی زبان میں منتقل ہوئیں تو بعض حالتوں میں شکل بدل گئی بعض حالتوں میں معنی تبدیل ہو گئے مثلاً جاوی زبان میں عُجب (خود پرستی) اور ریا کو ملا کر مختصر کر لیا گیا اور ایک نیا لفظ "جبریا" ایجاد کیا جس کے معنی ہیں خدا کے تعلق میں انسان کا اپنے آپ کو بڑا سمجھنا۔

اصلاحی رجحانات

مصر میں اسلامیت کا جو احیاء ہوا اور جو اصلاحات عمل میں آئیں، اس سے انڈونیشیا غیر متاثر نہیں رہ سکتا تھا۔ انڈونیشیا کے نوجوان جامعہ ازہر قاہرہ میں تعلیم کے لیے جاتے رہے۔ انھوں نے شیخ محمد عبدہٗ اور ان کے تلامذہ خصوصاً سید محمد رشید رضا کی تعلیمات سے واقفیت حاصل کی۔ وہ اپنے ملک میں واپس آئے تو ان جدید افکار کا بھی تھوڑا بہت اثر ساتھ لائے جو انھوں نے مصر میں بہ دوران طالب علمی سیکھے تھے۔ جو عرب انڈونیشیا میں مقیم تھے، وہ بھی اصلاحی تحریکات سے متاثر ہوئے ان تحریکات کا علم انھیں مصلحین کے اخباروں سے ہوتا رہا جو انڈونیشیا پہنچے تھے۔ مصر کی اصلاحات کے عام اثر کے علاوہ خود نئے دور کے عام تصورات کا بھی اثر پڑا۔ ہندوستان میں احیاء اسلامیت کا کام مصر سے پیشتر شروع ہو چکا تھا، اگرچہ ہندوستان کی صدائیں مصر میں اصلاحات کے بعد جاوا پہنچیں۔ اس لیے کہ ہندوستانیوں نے اپنے افکار کے اظہار کے لیے انگریزی زبان کا پیرایہ اختیار کیا تھا[1]۔

سنہ ۱۳۲۳ھ ۱۹۰۵ء میں انڈونیشیا کے عربوں نے بہ مقام جکارتا ایک انجمن بہبود کی بنیاد رکھی اس کا مقصد یہ تھا کہ ایسی اصلاحی درس گاہیں قائم کی جائیں جن میں نئے اصول کے مطابق تعلیم

---

[1] مطلب یہ ہے کہ انڈونیشیا کے لوگ خصوصاً عرب، عربی تو بے تکلف پڑھ لیتے تھے، اس لیے مصر میں تحریکات سے جلد متاثر ہوئے۔ انگریزی نہیں جانتے تھے اسی وجہ سے ہندوستانی تحریکات کا علم انھیں اس وقت ہوا جب ان تحریکات کے متعلق معلومات عربی میں شائع ہوئیں۔

دی جاسکے، عام تعلیم بھی اور مذہبی بھی۔ اس انجمن کا کام عربوں کے علاوہ اہل انڈونیشیا اور ان کے بچوں تک محدود تھا۔ مکہ معظمہ سے ایک سوڈانی عالم احمد بن محمد سرکتی الانصاری (وفات: ۱۳۶۳ھ/۱۹۴۳ء) کو لایا گیا۔ اس کے افکار بڑے انتہا پسندانہ تھے جب یہ مسئلہ سامنے آیا کہ ایک غیر سید مرد اور سیدہ عورت کی شادی ممنوع ہونی چاہیے تو شیخ احمد نے اس کے خلاف ایک پمفلٹ شائع کیا۔ سیدوں کے لیے "شریف" کا لقب استعمال ہوتا تھا، شیخ احمد نے اس کی بھی مخالفت کی اور کہا کہ شریف کے معنی اچھے آدمی کے ہیں اور یہ اسی طرح کا لقب ہے جیسا کہ انگریزی میں "مسٹر" ہے[1]۔ ان پمفلٹوں کی وجہ سے انجمن میں پھوٹ پڑ گئی، اس لیے کہ کئی سید بھی اس کے ممبر تھے۔ شیخ احمد نے غیر سید اصحاب کی امداد سے ایک نئی انجمن ترتیب دی، اس انجمن نے جاوا کے متعدد مقامات پر عربوں اور انڈونیشیوں کے لیے درس گاہیں قائم کیں ۱۳۳۱ھ (۱۹۱۹ء) میں کیائی حاجی احمد دحلان (وفات: ۱۳۴۲ھ/۱۹۲۳ء) نے ایک مجلسی و اجتماعی اور مذہبی جمعیت قائم کی جسے "محمدیہ" کہتے تھے۔ یہ انھیں اصول پر قائم ہوئی تھی، جن پر مصلحین مصر کار فرما رہے تھے۔ اس جمعیت نے قرآن و حدیث کو اسلام کا منبع قرار دیا، ساتھ ہی فیصلہ کیا کہ ان تعبیرات میں دور حاضر کے تقاضے پیش نظر رہنے چاہئیں۔ قرآن و حدیث کے سوا کسی کے اعلان یا عمل کو مستند نہ مانا جاتا تھا۔ اس جمعیت کے کارفرماؤں اور کارکنوں نے کیتھولک اور پروٹسٹنٹ مشنری طریق عمل سامنے رکھا اور اسلامی اصول کے مطابق درس گاہیں قائم کیں، لیکن ان کی عام حیثیت ان درس گاہوں جیسی تھی جو انڈونیشیا کی ولندیزی حکومت نے اپنے پبلک سکولوں میں اختیار کی تھی، اسلامی درس گاہیں جب امداد اقوام کا استحقاق پیدا کر لیتیں تو حکومت کی طرف سے ان کے لیے امداد مقرر ہو جاتی۔ کیتھولک اور پروٹسٹنٹ مشنوں کی طرح "محمدیہ"

---

[1] سادات کا ناراض ہونا الگ بات ہے تاہم یہ ظاہر بات ہے کہ اسلام میں سیدہ اور غیر سید کا نکاح بلکہ ہر مسلمان مرد اور عورت کا نکاح بلا امتیاز نسل و خاندان بالکل جائز ہے۔ صرف یہ ضروری ہے کہ کوئی شرعی مانع موجود نہ ہو۔ اسی طرح سیدوں کو بالتخصیص شریف کہنے کی بھی کوئی شرعی دلیل موجود نہیں۔

تے دارالیتامی، دارالمساکین بھی بنائے۔ جابجا طبابت کے مرکزوں کا بھی انتظام کیا اور ایک بڑا ہسپتال بھی جکارتا میں کھولا۔ علاوہ بریں مشاق مبلغ تیار کیے، ان میں عورتیں بھی تھیں اور مرد بھی، عورتوں کے لیے ایک خاص شاخ قائم کی جس کا نام ام المومنینؓ کے اسم پاک پر" عائشہ" رکھا۔ اس انجمن کی کوششوں سے عورتوں کے لیے جکارتا اور گاروت میں خاص مسجدیں بن گئیں نیز ایک اور مسجد میں ایک حصہ عورتوں کے لیے الگ کر دیا گیا، "عائشہ" کی سرگرمیوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ جن مسجدوں میں عورتوں کے لیے جداگانہ انتظامات موجود نہ تھے، ان میں بھی عیدین اور نماز جمعہ کے لیے بڑی تعداد میں جانے لگیں۔

مذہبی دائرے میں لوگوں نے جو رسمیں یونہی اختیار کر لی تھیں اور ان کے لیے کوئی شرعی دلیل موجود نہ تھی، مصلحین نے ان سے اختلاف کیا۔ مثلاً شیخ احمد سرکتی کے پیرووں نے اس طریقے کو غلط اور قابل اعتراض بتایا کہ قبر میں مٹی ڈال دینے کے بعد میت سے کہا جائے کہ فرشتے سوال کریں تو ان کے جواب یوں دینا۔ تقریب سعید میلاد میں رسول اللہ صلعم کا اسم مبارک زبان پر آنے پر کھڑا ہونے پر انھوں نے اعتراض کیا اور اسے بدعت بتایا۔ جمعیت "محمدیہ" نے تکفین و تدفین کی ان تمام رسموں سے اختلاف کیا، جو رائج تھیں اور انھیں فضول بتایا۔ صرف ان رسموں کو قائم رہنے دیا جو شریعت کے رو سے واجب تھیں۔ مثلاً انڈونیشیا والے میت کے لیے وقتاً فوقتاً کھانا پکا کر ــــ سلامتی ــــ تقسیم کرتے تھے، اسے بالکل غیر مناسب بتایا۔

جمعیت محمدیہ کی اصلاحی سرگرمیوں کے خلاف سورابایا میں ایک نئی انجمن ۱۳۴۵ھ (۱۹۲۶ء) میں قائم ہوئی جس کا نام "نہضۃ العلماء" رکھا گیا۔ (اختصار کے طور پر اسے "ان یو" کہتے ہیں) اس انجمن نے فقہ کے مسلمہ چار دبستانوں میں سے کسی ایک کی پیروی کو تقویت پہنچانے کی کوشش کی۔ یہ لوگ قرآن و حدیث کے علاوہ اجماع اور قیاس کو بھی مانتے۔ جب ۱۳۷۲ھ (۱۹۵۲ء) میں اس جماعت کا اجلاس ہوا تو یہ انڈونیشیا کی سب سے بڑی پارٹی ــــ

مسجومی ــــــ سے الگ ہوگئی اور اسلامی اصول پر ایک نئی سیاسی پارٹی بنائی جس کا نام "پارتائی نہضۃ العلماء"[1] رکھا۔ اس پارٹی کا مقصد ونصب العین یہ ہے کہ چار دبستان اسے فقہ میں سے کسی ایک کے مطابق شریعت کی پیروی ہو اور معاشرے میں اسلامی قانون کی پابندی کو تقویت پہنچائی جائے۔

پارلیمنٹ میں بہت سی سیاسی پارٹیوں کی نمائندگی ہے۔ ان کے بنیادی مقاصد و اصول سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ اسلامی پارٹیاں ہیں اگرچہ ان کے پروگرام میں بہت سے ایسے نکات بھی شامل ہیں جنھیں اسلام سے کوئی تعلق نہیں "مسجومی" پارٹی ۱۳۶۴ھ (۱۹۴۵ء) میں بہ مقام جکارتا بنی تھی۔ یہ نام عربی کے چند الفاظ کا خلاصہ ہے جن کا مطلب یہ ہے "مجلس مسلمانان انڈونیشیا" اس میں افراد کے علاوہ بعض پارٹیاں بھی شامل ہیں جنھوں نے بطور خود سیاسی سرگرمیوں کا کوئی بندوبست نہیں کیا، مثلاً "محمدیہ"۔ اس مجلس کے مقاصد یہ ہیں۔

۱۔ ملک کی حاکمیت کا تحفظ۔

۲۔ مذہب اسلام کا تحفظ

۳۔ حکمرانی کے معاملات میں اسلامی اصول پر عمل۔

قدیم ترین سیاسی جماعت "پارتائی سریکت اسلام انڈونیشیا"[2] (پی، ایس، آئی، آئی) ہے جو ۱۳۲۹ھ (۱۹۱۱ء) میں حاجی سمنہودی نے بنائی جو سدلو کا ایک تاجر تھا (وفات ۱۳۷۵ھ/۱۹۵۶ء)۔ ایک اسلامی تجارتی انجمن (اسلامک ٹریڈنگ آرگنائزیشن[3]) قائم کی تھی یہ مسلمانوں کی مجلسی و اقتصادی انجمن تھی، ایک سال بعد یہ سیاسی انجمن بن گئی اور سریکت اسلام کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس نے بہت جلد ہر دلعزیزی حاصل کر لی اور ملک بھر میں اس کی

---

[1] Partai Nahdlatul UlaMa N. U

[2] Partai Sarikat Islam P. S. I. I.

[3] Islamic Trading Organisation

شاخیں پھیل گئیں، پہلے یہ سب مقامی انجمنیں متصور ہوتی تھیں، پھر ان سب کو متحد کر لیا گیا، اس کا نصب العین یہ ہے کہ تمام مسلمانوں کو متحد کرے نیز جزائر میں جو دوسرے گروہ آباد ہیں، ان سے مسلمانوں کے تعلقات خوشگوار بنائے۔

۱۳۴۸ھ (۱۹۳۰ء) میں بہ مقام منگ کباؤ اسلامی تعلیم کی غرض سے ایک اسلامی انجمن بنام "اسلامک لیگ آرگنائزیشن"[1] کی بنیاد رکھی ابتدا میں اس کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کی عام تعلیم اور دینی تعلیم کی حالت بہتر بنائی جائے نیز غریبوں کی امداد کی جائے۔ پندرہ سال بعد یہ سیاسی انجمن بن گئی اور اس کا نام پارٹائی اسلام (پی، ای، آر، ٹی، آئی) قرار پایا۔ (پی، ای، آر، ٹی، آئی، تین انڈونیشی اور عربی الفاظ کا مظہر ہے جس کے معنی ہیں جمعیۃ تعلیم اسلام[2])۔ اس جماعت کا اصل مقصد یہ تھا کہ عبادات اور تمام دوسرے معاملات میں امام شافعیؒ کی فقہ کو نافذ کرائے اور اسلامی عقائد و ارکان کے متعلق تعبیر کے سلسلے میں اشعری و ماتریدی کی تعلیمات پیش نظر رکھے —— یہی تعلیمات سنیوں کی دینیات کا مبنیٰ ہیں۔

ایک اور جماعت کے بھی یہی مقاصد ہیں جس کا نام پارٹائی پولیٹک طریقت اسلام[3] (پی، پی، ٹی، آئی) ہے۔ یہ بھی منگ کباؤ ہی میں ۱۳۶۴ھ (۱۹۴۵ء) میں قائم ہوئی تھی۔ اس کا مقصد بھی شافعیؒ فقہ اور اشعری و ماتریدی تعلیمات کا قیام ہے، نیز اس کے نزدیک صوفیہ کے سلسلوں میں سے کسی ایک کو اختیار کر لینا ضروری ہے۔ اس کی اسلامی خصوصیت اس امر سے ظاہر ہے کہ یہ خدا کے قانون کو جمہوریہ انڈونیشیا کا قانون بنانا چاہتی ہے اور خدا سے خوف، آپس میں محبت، اس سے اُمید اور اس سے حیا، اس کا بنیادی اصول ہے، یہ انجمن بین الاقوامی معاملات میں انسانیت کے لیے امن کی خواہاں ہے اور پورے مجمع انسانیت کو مہدیؑ موعود کی آمد کے

۱- Islamic League Organisation Pe.rl
۲- Organisation For Islamic education
۳- Partai Politik Tharikat Islam T D

لیے تیار کرنا چاہتی ہے اس لیے کہ مہدیؑ کے ظہور کا وقت قریب آگیا ہے۔

اتجہ کی جمعیتہ العلماء (پی، یو، ایس ۲۰ سے) کو پارلیمنٹ میں نمائندگی حاصل نہیں، لیکن وہ سیاسیات میں بڑی سرگرمی دکھا رہی ہے۔ یہ ۱۳۵۸ھ (۱۹۳۹ء) میں محمدیہ کی اصلاحی تحریک کے خلاف عام مسلمانوں کے عقائد کی حفاظت کے لیے بنی تھی۔ اس کے ممبر آزادی کی جنگ میں بھی لڑے۔ جب جنگ میں کامیابی حاصل ہوئی تو یہ انڈونیشی جمہوریت سے برگشتہ ہو گئے اور اس سے تعلقات منقطع کر لینے کی کوشش کی۔

ایک اور جماعت "دارالاسلام" ہے۔ اس کی سرگزشت بھی اتجہ کی جمعیت العلماء کے مشابہ ہے۔ یہ انڈونیشیا کو راسخ العقیدہ مسلمانوں کے نقطہ نگاہ سے مملکت اسلام بنانے کی خواہاں ہے۔ اس کا لیڈر اور اس کے قریبی رفیق ابتدا میں سرکت اسلام کے ممبر تھے۔ وہ بھی آزادی کی جنگ میں شریک ہوئے لیکن جب کامیابی حاصل ہوئی تو جمہوریہ انڈونیشیا سے برگشتہ ہو گئے۔

انڈونیشیا میں اسلام کی خصوصیات

انڈونیشیا میں سرگزشتِ اسلام کے اس سرسری مطالعے سے واضح ہے کہ ابتدا میں تصوف نے اہلِ ملک کو اپنی طرف متوجہ کیا اور تصوف دونوں قسم کا تھا یعنی صحیح اسلامی تصوف بھی اور اتحادی تصوف بھی۔ اس کے متعدد اسباب تھے۔ لیکن بنیادی سبب اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ انڈونیشیا کے باشندوں کی طبیعت کو تصوف سے خاص مناسبت ہے۔ اگرچہ صحیح تصوف مختلف سلسلوں کے صوفیہ کی وجہ سے بہت پھیلا تاہم اتحادی اور وجودی تصوف بھی باقی رہا۔ آج کل ایک سیاسی پارٹی بھی تصوف ہی کے اصول پر چلتی ہے۔ جن لوگوں کو صوفیہ کے کسی سلسلے سے تعلق نہیں اس لیے کہ وہ اونچے درجے کے لکھے پڑھے لوگ ہیں، وہ بھی آج کل باطنی زندگی ہی کے مطالعے اور نظم و تربیت میں سرگرم عمل ہیں۔

یہ امر بھی پیشِ نظر رکھنا چاہیے کہ جہاں رواج ——— عادت ——— شرعی قانون سے
...رف ہے اور دونوں میں توافق پیدا کرنے کی کوئی صورت نہیں ملتی، وہاں رواج پر عمل کیا جاتا ہے
...ا اسے مذہبی جذبات کے لیے باعث نیک، نہیں سمجھا جاتا اور نہ یہ نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ اس طرح
...بی واجبات یا اسلام کے مقتضا کی مخلصانہ پابندی نہیں ہوئی۔ انڈونیشیا میں رواج برابر شرعی قانون
...لے ساتھ ساتھ رہا ہے۔

جیساکہ بتایا جاچکا ہے، انڈونیشیا میں جو اصلاحی رجحانات ہیں، ان کو محض مصریوں سے
...ں بلکہ ہندوستان، پاکستان اور دوسرے اسلامی ملکوں سے بھی تقویت پہنچتی رہی ہے۔ ان کے
وہ دینی تعلیم کے مقامی ادارے بھی ہیں جو دورِ حاضر کی فضا میں سانس لیتے ہیں۔ تاہم یہ کہہ دینا چاہیے
...لاحی تحریکات کو عام مسلمانوں کی طرف سے مقابلہ درپیش ہے اور یہ لوگ اپنے معاملات میں بہت
...تہ ہیں۔ جو لوگ حج کے لیے کہ معظمہ جاتے ہیں، وہ اس پختگی کے لیے کوئی نہ کوئی دستاویز لے
...تے ہیں اور مقامی تعلیمی ادارے بھی ان کے موید ہیں۔

———o———

گیارھواں باب

اسلام میں اتحاد اور تنوع

(محمد راسخ سعیدی)

پچاس کروڑ سے زاید مسلمانوں کی جمعیت اسلام کے صراط مستقیم پر گامزن رہنے کی خواہاں ہے، اُن کے درمیان رائے کے اختلاف و تنوع کے متعلق کوئی شخص تحکّم کے ساتھ کچھ کہنے کا دعویدار نہیں ہو سکتا۔ مراکش اور بلقان سے چین اور انڈونیشیا تک جو اسلامی آبادیاں پھیلی ہوئی ہیں، اُن میں عملی اختلافات و تنوع کے متعلق صرف تاثرات و آرا معرض تحریر میں لائے جا سکتے ہیں۔ البتہ اسلام کی بنیادی وحدت کے متعلق زیادہ سے زیادہ وضاحت کے ساتھ کہنا ممکن ہے؛ اس لیے کہ اسلامی سرچشموں، ایمان کے بنیادی اصول اور مومنوں پر جو واجبات عائد ہیں، اُن کے خاص تقاضوں کے متعلق اسلامی دنیا عام طور پر ایک آہنگ ہے۔

ماخذ اسلام اس پر عام اتفاق ہے کہ اسلامی سرچشمے یا ماخذ قرآن و سنت ہیں نیز اُن کی بنا پر قیاس ہے، اُن میں سے تقدم قرآن کو حاصل ہے جو چیزیں قرآن میں پوری طرح واضح نہ ہوں، اُن کے لیے سنت سے روشنی تلاش کی جا سکتی ہے، جو اسلام کا دوسرا سرچشمہ ہے جب پیش نظر معاملے کے متعلق مزید توضیح مطلوب ہو تو تیسرا سرچشمہ یہ ہے کہ قرآن و سنت کے مقاصد پیش نظر رکھتے ہوئے وہ اصحاب قیاس و استدلال سے کام لیں جو اپنے خاص علم و تجربہ کی بنا پر اس امر کے اہل مانے جا چکے ہیں۔

قرآن کا معجز نما نزول اس کتاب کے ابتدائی مقالوں میں زیر غور آ چکا ہے۔ یہ آخری آسمانی ہدایت ہے، خدا کا وہ کلام ہے جو اس کے رسول پاک صلعم کے ذریعے سے دنیا

بھر کے انسانوں کی رہنمائی کے لیے نازل ہوا خواہ وہ کہیں رہتے ہوں، کسی نسل سے ہوں، اُن کا رنگ کوئی ہو، اُن کی قومیت کچھ ہو۔ رسول اللہ صلعم کی وفات کے بعد دو سال کے اندر اندر قرآن کتابی شکل میں مرتب ہو گیا۔ اور چودہ صدیوں سے اسلام کا اول سرچشمہ چلا آتا ہے۔ اس میں کسی کے لیے چون و چرا کی گنجائش نہیں اور اس میں قطعاً کوئی رد و بدل نہیں ہوا۔ یہ کتاب عربی زبان میں نازل ہوئی تھی لہٰذا اسے سمجھنے کے لیے عربی کا علم ضروری ہے اور یہ امر پوری اسلامی دنیا میں اتحادی، ثقافتی عنصر چلا آتا ہے۔ سب جانتے ہیں کہ مختلف ملکوں کے مسلمان قرآن مجید عربی زبان میں پڑھتے ہیں اگرچہ بہت سے لوگ اس کے معنی نہیں سمجھتے۔ ان پڑھ لوگوں کا خیال ہے کہ قرآن مجید کے الفاظ صحیح پڑھ لینا ہی کافی ہے اور محض انھیں دہراتے رہنے سے خدا کی برکات اُن پر نازل ہوں گی اور اُن کی روحوں کے لیے نجات کا دروازہ کھل جائے گا اگرچہ وہ اس کے معنی نہ سمجھتے ہوں۔ بعض لوگ قرآن مجید کی آیات کو خطرات اور بیماری کے لیے تعویذوں کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ نصف صدی پیشتر تک سب راسخ العقیدہ مسلمانوں کی رائے یہ تھی کہ قرآن مجید کا ترجمہ کسی دوسری زبان میں کرنا ممنوع ہے انھیں اندیشہ تھا کہ تراجم اصل عربی متن کی جگہ لے لیں گے اور مختلف زبانوں میں ترجمہ کلامِ الٰہی میں فہم و تعبیر کا اختلاف پیدا کر دے گا۔ یہ بالکل درست ہے کہ قرآن مجید کا ترجمہ اس کے بہت اعلیٰ عربی اسلوب کی وجہ سے غیر ممکن نہیں تو صد درجہ مشکل ضرور ہے۔ کسی دوسری زبان میں اس کے ترجمے سے اصل کا حسن اور زورِ بیان قائم نہیں رہ سکتا لیکن مختلف مقامات کی زبانوں میں ترجمہ اس لیے ضروری تھا کہ لوگ اس کتاب کے مطالب سمجھ لیں جسے اسلام کا اولین سرچشمہ ہونے کا شرف حاصل ہے۔ آج قرآن مجید کے تراجم دنیا کی متعدد زبانوں میں موجود ہیں۔

بعض اوقات لوگ کہتے ہیں کہ اگر قرآن مجید تمام انسانوں کے لیے راہِ ہدایت ہے تو یہ عربی زبان میں کیوں نازل ہوا؟ اس کا کوئی قطعی جواب نہیں دیا جا سکتا۔ اس لیے کہ اگر قرآن مجید کسی دوسری زبان میں ہوتا ——— مثلاً انگریزی زبان میں ——— تو یہ سوال پھر بھی

باقی رہتا کہ کیوں وہ خاص زبان اس کے لیے انتخاب کی گئی؟ لہٰذا ہمیں اس واقع پر قانع ہو جانا چاہیے کہ قرآن مجید عربی زبان میں نازل ہوا خواہ اُس کی وجہ کوئی ہو۔

اسلام کا دوسرا چشمہ سنت ہے۔ رسول اللہ صلعم کی حیاتِ مبارک میں مسلمانوں کو کسی مسئلے کے متعلق قرآن مجید سے واضح جواب نہیں ملتا تھا تو وہ آپؐ کی خدمت میں پہنچتے اور رہنمائی کی درخواست کرتے۔ مثال کے طور پر ایک مرتبہ ایک آدمی رسول اللہ صلعم کی خدمت میں آیا اور عرض کی کہ آیا میں اپنی والدۂ مرحومہ کی طرف سے حج کر سکتا ہوں؟ رسول اللہ صلعم نے جواب دیا کہ ہاں، یہ مناسب ہوگا، اس لیے کہ حج تیری والدہ کے ذمے قرض ہے اور بیٹے کے لیے ضروری ہے کہ وہ قرض ادا کرے۔ مرضِ وفات میں رسول اللہ صلعم کو احساس تھا کہ آپ خود رہنمائی کے لیے موجود نہ ہوں گے، لہٰذا فرمایا کہ امت اُس وقت تک گمراہ نہ ہوگی جب تک ہدایت کی اُن دو چیزوں کو مضبوطی سے تھامے رہے گی جو میں اپنے پیچھے چھوڑے جا رہا ہوں، یعنی قرآن جو اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے اور خود میرا عملی نمونہ یعنی سنت۔ قرآنِ مجید کا ارشاد ہے:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَن كَانَ يَرْجُو اللَّهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ وَذَكَرَ اللَّهَ كَثِيرًا ۝

تمہارے لیے مفید تھی سیکھنی رسول اللہ کی چال، اُس کے لیے جو امید رکھتا ہے اللہ کی اور پچھلے دن کی اور یاد کرتا ہے اللہ کو بہت سا۔

(احزاب ۳۳: ۲۱)

سنت رسول اللہ صلعم کے افعال، ارشادات اور تصدیقات کا مجموعہ ہے۔ افعال اعمال میں ایسی چیزیں شامل ہیں کہ مثلاً آپ نماز کس طرح پڑھتے تھے، وضو کس طرح کرتے تھے، غسل کیوں کر فرماتے تھے۔ آپؐ کے ارشادات بھی ہمارے لیے محفوظ کر دیے گئے مثلاً آپؐ نے فرمایا کہ میں اعلیٰ اخلاق کی تکمیل کے لیے آیا ہوں۔ تصدیق سے مراد یہ ہے کہ جب کوئی عمل رسول اللہ صلعم کے سامنے کیا گیا یا کوئی بات آپؐ کی موجودگی میں کہی گئی تو آپ

...لیے اُن پر اعتراض نہ کیا۔ اس طرح ایسے تمام افعال اور اقوال کی صحت مسلّم ہوگی۔ یہ آخری معیار
...ی معاشرے کے اُن رسوم کے لیے زیادہ تر استعمال کیا گیا جو روح اسلام کے منافی نہ تھا۔
...لاً رسول اللہ نے ایک مرتبہ دیکھا کہ ایک آدمی تلوار ہاتھ میں لے کر رقص کر رہا ہے۔ آپؐ
...تلہ اسے اور اُس پر خوشی کا اظہار کیا۔ بعد کے فقہا نے یہ مسئلہ پیدا کر لیا کہ تلوار لے کر ناچنے
...اجازت ہے۔ یہ معیار مختلف اسلامی ملکوں کے رواجات و قوانین کے لیے استعمال ہوا،
...ہی وہ رواج قائم رہے جو اسلامی شریعت کی روح کے منافی نہ تھے مثلاً شادی وغیرہ کے
...رسم۔

سنت یعنی روایات کی تدوین رسول اللہ صلعم سے قریباً ڈیڑھ صدی بعد شروع ہوئی
...ب حضرت امام مالکؒ بن انس نے اسلامی فقہ کے متعلق روایات کا مجموعہ تیار کیا۔ روایات
...ترتیب امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ کے ہاتھوں تیسری صدی ہجری (نویں صدی عیسوی) ایک
...ال پر پہنچی اور آج مسلمان ان ہی دو کتابوں کو روایات کے صحیح ترین مجموعے سمجھتے ہیں۔ ان
محدثوں نے وہ شرطیں متعین کیں جن کی بنا پر روایات کی صحت کا فیصلہ ہو سکتا تھا۔ یہ شرطیں اُن
...اوں سے متعلق تھیں جن کے ذریعے سے روایات پہنچی تھیں۔ مثلاً یہ کہ راویوں کے لیے ضروری
...ہے، اُن کا اخلاقی کردار اچھا ہو، متقی ہوں، دیانت دار ہوں، اُن کی قوتِ فیصلہ درست ہو، اُن
حافظہ بہت اچھا ہو، اور ان راویوں کے سلسلے نسلاً بعد نسل ٹھیک جڑے چلے آ رہے ہوں
...لی نسل کے راوی صحابہ تھے، دوسری نسل کے تابعین اور تیسری نسل کے تبع تابعین، جو
...وایت تابعین سے چلی امام بخاری کے نزدیک وہ قابلِ قبول نہ تھی، اس لیے کہ اُس میں اور
...سول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں ایک نسل کا خلا تھا۔

یہ بتا دینا چاہیے کہ صحت روایت کی یہ شرطیں صحت مضمون سے متعلق نہ تھیں، اس
...یے کہ اُس زمانے میں داخلی انتقاد یہ یا جرح و تعدیل موجود ہی نہ تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ
...میں روایات کے ان دو صحیح مجموعوں میں ایسی روایتیں بھی ملتی ہیں جنھیں ہم اب تک سمجھ نہیں

مسکے، مثلاً قربِ قیامت کے نشان رسول اللہ صلعم کی وفات اور احادیث کی ترتیب میں اڑھائی صدی کے بعد نے مسلمانوں میں بہت سے اختلافات پیدا کر دیے جو ہمارے زمانے تک چلے آ رہے ہیں۔ اقتدار کے لیے خانہ جنگی شروع ہوئی تو اس میں بعض غیر مذہبی عناصر اپنے بعض سیاسی مقاصد کے لیے حدیثیں وضع کر لینے میں بھی تامل نہ کرتے رہے۔ راویوں کے متعلق صحیح فیصلہ مشکل ہو گیا، اس لیے کہ سیاسی منازعتیں بعض اوقات غیر جانب دار رائے قائم کرنے میں مشکلات کا باعث ہو جاتی تھیں جس طرح احادیث مرتب ہوئیں اور ہم تک پہنچیں اس کا سرسری خاکہ پیشِ نظر رکھ لینے سے یہ سمجھ لینا سہل ہو جاتا ہے کہ آج اسلامی ملکوں میں روایات کے متعلق جو مختلف روشیں پائی جاتی ہیں ان کا سبب کیا تھا۔

قرآنِ مجید چودہ سو سال پیشتر نازل ہوا تھا، یہی کیفیت رسول اللہ صلعم کے متعلق روایات کی تھی جو صحرائی معاشرے میں زندگی بسر کرتے رہے۔ یہ چیزیں ہر اس مسئلے کے لیے واضح ہدایت کا سرچشمہ نہیں بن سکتی تھیں جو صدیوں بعد پیدا ہوتا، خصوصاً دورِ حاضر کے پُر پیچ معاشرے میں۔ یہ حقیقت خود رسول اللہ صلعم نے تسلیم فرمائی تھی ایک مرتبہ آپ نے ایک صحابی کو حاکم بنا کر یمن بھیجا تو اس سے پوچھا کہ نئے عہدے میں کن اصول پر عمل کرو گے؟ صحابی نے

لے یہاں اتنا عرض کر دینا چاہیے کہ روایات کی ترتیب اڑھائی سو سال بعد شروع نہیں ہوئی تھی بلکہ اس سے بہت پہلے شروع ہو گئی تھی، اور اب تو ایسے مجموعے سامنے آ گئے ہیں جو بخاری اور مسلم سے بہت پہلے مرتب ہو گئے تھے پھر یہ بھی معلوم ہے کہ امام مالکؒ کی موطاء، امام شافعی کی کتاب الام اور امام احمد بن حنبل کی المسند حدیث ہی کی کتابیں تھیں۔ بلاشبہ بعض لوگ فریق بازی کے جوش میں غلط روایتیں پیش کرتے رہے لیکن اہلِ تحقیق نے ان سب کو الگ کر دیا اور اگر کوئی چیز ایسی رہ بھی گئی ہو جس کا بظاہر بہت کم امکان ہے تو مسلمہ اصول کی بنا پر بہ دلائل اُسے الگ کیا جا سکتا ہے۔ بہت کم لوگ ہیں جنھیں اندازہ ہو سکتا ہے کہ روایات کے سلسلے میں تاریخ کا کتنا بڑا اور کس درجہ عظیم الشان ذخیرہ فراہم کر دیا گیا ہے۔ کوئی دوسری زبان یا کوئی دوسری قوم اس ذخیرے جیسی کسی چیز کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔

جواب دیا: میں سب سے پہلے قرآن مجید کی تعلیمات پیش نظر رکھوں گا۔ رسول اللہ صلعم نے پوچھا: اگر قرآن میں خاص رہنمائی نہ ملی تو کیا کرو گے؟ صحابی نے جواب دیا: میں اس غرض سے سنت نبوی پیش نظر رکھوں گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پھر پوچھا اگر سنت میں بھی مطلوب چیز نہ ملی تو پھر کیا کرو گے؟ صحابی نے جواب دیا اس صورت میں اپنی رائے پر عمل کروں گا۔ رسول اللہ صلعم یہ سن کر بہت خوش ہوئے اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے۔ اس نے رسول اللہ صلعم کے بھیجے ہوئے شخص کی رہنمائی کی۔ اس طرح اسلام میں تیسری بنیاد قائم ہو گئی یعنی قیاس ہمیں قرآن مجید میں بہت سی آیات ملتی ہیں جن میں استدلال یا غور و فکر یا علم کا ذکر ہے یعنی وہ آیات جن میں اپنے آباؤ اجداد کی روایات پر آنکھیں بند کر کے عمل کرنے کے بجائے اپنے فہم و دانش سے کام لینے کی تاکید ہے۔ قرآن مجید منکروں کے متعلق کہتا ہے:

بَلْ قَالُوْٓا اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ	بلکہ کہتے ہیں ہم نے پایا اپنے باپ دادوں کو ایک
وَّاِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّهْتَدُوْنَ ۝	راہ پر اور ہم اُن ہی کے قدموں پر ہیں راہ پائے
(زخرف: ۲۲)	ہوئے۔

ان فی خلق السموٰت والارض و	بالشبہ آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے میں اور رات دن
اختلاف الیل والنہار والفلک	کے ایک کے بعد ایک آتے رہنے میں اور جہازوں میں جو انسانوں
التی تجری فی البحر بما ینفع الناس	کی کارآمدی کے لیے سمندر میں چلتا ہے اور پانی جسے اللہ تعالیٰ
وما انزل اللہ من السماء من ماءٍ	آسمانوں سے برساتا ہے اور اس سے زمین مرنے کے
فاحیا بہ الارض بعد موتہا و	بعد پھر جی اٹھتی ہے اور اس بات میں کہ ہر قسم کے
بث فیہا من کل دابۃ وتصریف	جانور زمین کے پھیلاؤ میں پھیلے ہوئے ہیں اور ہواؤں کی
الریاح والسحاب المسخر بین	مختلف رخ پھیرنے میں اور بادلوں میں جو آسمان و زمین
السماء والارض لاٰیٰت لقوم	کے درمیان بندھے ہوئے ہیں عقل رکھنے والے لوگوں
یعقلون ۝ (البقرہ ۲: ۱۶۴)	کے لیے بڑی ہی نشانیاں ہیں۔

ایک آیت میں تو یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ منکر ایک دوسرے سے کہیں گے ۔
لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِيْٓ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ (ملک : ۱۰) اگر ہم اپنے کانوں اور عقل سے کام لیتے تو دوزخ والوں میں نہ ہوتے ۔

ابتدا میں استدلال کے لیے قیاس کا لفظ استعمال کیا گیا تھا جس کے معنی پیمانے کے ہیں مطلب یہ تھا کہ ایک چیز کا مقابلہ دوسری چیز سے کرتے ہوئے غور کیا جائے یعنی تمثیلی استدلال ۔ اسلامی شریعت کے تیسرے سرچشمے کی حیثیت میں اس کا مطلب یہ تھا کہ قرآن اور سنت کی روشنی میں دلائل کی بنا پر عمل کے لیے مناسب راستہ طے کیا جائے ۔ بعض لوگ ایک چوتھا سرچشمہ بھی بتاتے ہیں یعنی اجماع یا بہ الفاظ دیگر کسی خاص معاملے کے متعلق قابل اور ذی رائے اصحاب کا اتفاق ۔ یہ چیز امام شافعیؒ نے پیش کی تھی جو ایک دبستان فقہ کے بانی ہیں بعض اصحاب نے اجماع کا غلط مطلب سمجھا ہے اور اسے محض رائے عامہ کا مترادف قرار دیتے ہیں ۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر رائے عامہ کسی عمل کی موید ہے تو اُسے اسلامی عمل سمجھ کر قبول کر لینا چاہیے ۔ اسلامی فقہا کے نزدیک اجماع کا مطلب یہ ہے کہ مسلمہ مذہبی رہنما کسی معاملے کے متعلق ایک وقت اور ایک مقام میں ہم رائے ہو جائیں ۔ ایسا کوئی ذریعہ دریافت نہیں کیا گیا جس کی بنا پر تمام مسلمانوں کا اتفاق حاصل کیا جا سکے ، خواہ وہ کہیں بھی رہتے ہوں ، حقیقی اجماع صرف پہلے دو خلیفوں کے عہد میں ممکن تھا تیسرے خلیفہ کے عہد کا ابتدائی حصہ بھی اُسی میں شامل کر لینا چاہیے ، اب اجماع کا مطلب یہ ہے کہ قرآن مجید کی بعض آیات کی تعبیر میں ایک گونہ اتفاق بعض مقامات پر ہو چکا ہے ۔ اسلام کے بنیادی سرچشمے کی حیثیت میں تیسرا مقام قیاس کا ہے نہ کہ اجماع کا —— غرض اسلام کے مسلمہ سرچشمے تین ہیں ۔ قرآن ، سنت اور قیاس ۔

جیسا کہ بتایا جا چکا ہے اسلام کے ان تین سرچشموں کے متعلق بعض اختلاف بھی ہیں بعض لوگ کہتے ہیں کہ صرف کتاب و سنت اسلام کی محکم بنیاد ہمارے سامنے پیش کر سکتے

ہیں۔ اُن کی اس روش کو بہ آسانی غلط قرار دیا جا سکتا ہے، اس لیے کہ سب کو اعتراف ہوگا۔ آج دنیا کے جو مسائل ہیں، وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد کے مسائل سے بالکل مختلف ہیں اور اگر قیاس کو خارج کر دیا جائے تو اسلام عملی اعتبار سے ایک حد تک معطل ہو جائے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام تحرکی مذہب ہے، قرآن، سنت اور قیاس اُس کے سرچشمے ہیں۔ بعض لوگ قیاس اور اجتہاد میں تمیز نہیں کرتے، لیکن اگر اجتہاد کو شخصی ترجیح کے معنی میں استعمال کیا جائے تو ظاہر ہے کہ اُس کی حیثیت بدل جائے گی۔ اگر اسے قرآن و سنت کے مضمرات کے تعلق میں محتاط استدلال کے طور پر استعمال کیا جائے تو یہ محض استدلال ہو گا۔ اجتہاد کو اگر کھلا چھوڑ دیا جائے تو یہ بھی ممکن ہے کہ بنیادی افکار مثلاً صحیح و غلط اور خیر و شر کے متعلق اختلاف پیدا ہو جائے۔ اسلام میں اتحاد و تنوع کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اسلامی شریعت کے ان سرچشموں کو ٹھیک ٹھیک ذہن نشین کر لیا جائے یعنی قرآن و سنت اور استدلال کا مناسب استعمال۔

اسلامی عقیدہ اسلام کا اتحاد ایمان کی چھ صفتوں کے قبول سے واضح ہے جنھیں بنیادی عقیدے قرار دیا جاتا ہے یعنی خدا پر ایمان، فرشتوں پر ایمان، خدا کی اُتاری ہوئی کتابوں پر ایمان، پیغمبروں پر ایمان، یوم حساب پر ایمان اور انسان کی بھلی یا بری تقدیر پر ایمان۔ ان عقیدوں پر تمام مسلمان متفق ہیں۔

قرآن مجید خدا کے وجود کا ثبوت اس طرح دیتا ہے کہ اُس کی پیدا کی ہوئی کائنات کے نظم و جمال پر غور کیا جائے۔ کائنات کی ہم آہنگی سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اسے رحمٰن و رحیم خدا نے بنایا اور وہی انسانوں کا خالق ہے۔ توحید اُس کی حد درجہ ممتاز صفت ہے، جیسا کہ سورۂ اخلاص سے واضح ہے۔

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۝ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ ۝ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۝

تو کہہ وہ اللہ ایک ہے، اللہ بے نیاز ہے، نہ کسی کو جنا نہ کسی سے جنا گیا اور نہ اُس کے جوڑ میں کا کوئی ہے۔

علاوہ بریں تمام اچھی صفات خدا کے لیے ہیں؛ وہ رحمٰن ہے، رحیم ہے، اکبر ہے، اعلیٰ ہے، شفیق ہے۔ بعض روایات میں اللہ تعالیٰ کے ننانوے نام مذکور ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اس عدد کو کثرت کا مترادف مانا جائے۔ مسلمان خدا کے ناموں میں سے اس نام کو انتخاب کر سکتا ہے جو پیش نظر حالات کے اعتبار سے از روئے نفسیات موزوں معلوم ہو۔ اسلامی دنیا میں عموماً اسی پر عمل ہے۔

الٰہیات کی کتابوں میں بتایا گیا ہے کہ بیس صفات ایسی ہیں جو چار حصوں میں منقسم ہیں۔ پہلا حصہ بنیادی صفاتِ وجود پر مشتمل ہے۔ دوسرے حصے میں پانچ سلبی صفات بیان کی گئی ہیں یعنی وہ خدا جس کی نہ کوئی ابتدا ہے، نہ کوئی انتہا، نہ اُسے مادی اشیاء سے کوئی مناسبت ہے نہ وہ اپنے وجود کے لیے کسی کا محتاج ہوا اور نہ کوئی اس کا شریک ہے۔ تیسرے حصے میں سات مطلق صفات آتی ہیں یعنی قدرت، ارادہ، علم، حیات اور دیکھنے، سننے، بولنے کی صلاحیت۔ چوتھے حصے میں وہ صفات آتی ہیں جو تیسرے حصے کی صفات سے ملتی جلتی ہیں اور انھیں تیسرے حصے کی صفات کے اسم فاعل کی شکل میں پیش کیا گیا ہے یعنی اللہ تعالیٰ صاحبِ قدرت ہے، صاحبِ ارادہ ہے، صاحبِ علم ہے، حی و قائم ہے، سمیع ہے، بصیر ہے، کلیم ہے۔ علماء الٰہیات اس امر پر زور دیتے ہیں کہ خدا کی صفات اُس کی ذات سے الگ نہیں۔ صفات کی یہ تقسیم ذاتی رائے کی بنا پر کر لی گئی ہے اور واضح نہیں بہت سے لوگ انھیں ایمان کا ایک اہم عنصر مانتے ہیں۔ یہ صفات کا جو سلسلہ قائم کیا گیا ہے صاف ظاہر ہے کہ یونانی فلسفے کے ردِ عمل کا ایک مصنوعی عکس ہے۔ یہ سلسلہ قرآن و حدیث میں اس طرح نہیں ملتا اور اس کی بنا پر لوگوں نے غیر مناسب قیاس آرائیاں کیں۔ زیادہ مناسب یہی ہے کہ کائنات پر غور و فکر کے ذریعے سے خدا کی ہستی کو ذہن نشین کیا جائے جیسا کہ قرآن مجید میں بتایا ہے۔ باقی رہا یہ امر کہ مسلمانوں میں خدا کی حیثیت کے متعلق اختلافِ رائے ہے، مثلاً یہ کہ وہ انسانوں سے ملتا جلتا ہے یا نہیں یا عام لوگ اُسے قرونِ وسطیٰ کے مطلق العنان بادشاہ سے مشابہ

اور دیتے ہیں تو یہ چیز تعلیم کے مختلف نمونوں سے پیدا ہوئی۔ اسے اسلام کے مبانی میں شامل نہیں کیا جا سکتا۔

فرشتے مخلوق ہیں جو خدا سے قدیر اور اس کے رسولوں کے درمیان ایلچی کی خدمت انجام دیتے ہیں۔ آسمانی پیغامات اور وحی رسولوں کے پاس لاتے ہیں۔ روایات میں دوزخ اور بہشت کے نگہبان فرشتوں کا ذکر بھی آیا ہے۔ بعض فرشتے مردوں سے ایمان و اعمال کے متعلق سوال کرتے ہیں۔ بعض انسانوں کے اعمال لکھتے ہیں۔ ایک فرشتہ ہے جو قیامت کے دن صور پھونکے گا اور اس سے تمام انسان جاگ اٹھیں گے۔ عام لوگ اس قسم کی روایات کو لفظی معنی میں حمل کرتے ہیں تعلیم یافتہ اور پڑھے لکھے لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ تمثیلی باتیں ہیں اور ان کی ایسی تعبیرات ہیں جو ایک حد تک عقل کے مطابق ہوتی ہیں۔

قرآنِ مجید اسلام کی کتاب مقدس ہے، اس میں تین اور کتابوں کا ذکر ہے جو اس سے پہلے نازل ہو چکی تھیں ـــــــ کتاب داؤدؑ (زبور) کتابِ موسیٰؑ (تورات) کتابِ عیسیٰؑ (انجیل) اس کا مطلب یہ نہیں کہ اور کتابیں نازل نہیں ہوئیں۔ صرف یہ مطلب ہے کہ ہم یقینی طور پر نہیں کہہ سکتے، اور کون کون سی کتابیں نازل ہوئیں، زیادہ تر لوگوں کا عقیدہ یہ ہے کہ ان تین کتابوں اور قرآنِ مجید کے سوا اور کوئی کتاب آسمان سے نہیں اتریؔ

قرآنِ مجید میں پچیس پیغمبروں کے نام آئے ہیں جن میں حضرت آدمؑ بھی شامل ہیں۔ مسلمان ان پیغمبروں

لہ بے شک عوام کا عقیدہ یہی ہے اس لیے کہ قرآن مجید میں جن کتابوں کا ذکر بالتصریح آیا، وہ یہی تین ہیں یعنی تورات زبور اور انجیل، تاہم یہ صحیح نہیں کہ قرآن مجید نے اصول پیش کر دیا ہے کہ ہم نے تمام قوموں میں ہادی بھیجے اور ایسے پیغمبر بھی ہیں جن کا ذکر قرآن مجید میں نہیں آیا کوئی وجہ نہیں کہ عقیدہ محض تین کتابوں تک محدود رہے، اگرچہ ہم یقین کے ساتھ نہ بتا سکیں کہ اور کون سی کتاب نازل ہوئی نیز خود قرآن مجید میں صحف ابراہیم کا بھی ذکر ہے۔ تورات بحالت موجودہ اتنی نہیں جو حضرت موسیٰؑ پر نازل ہوئی تھی بلکہ اس میں اور بہت سی کتابیں شامل ہو گئیں جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ صحف کی شکل میں مختلف نبیوں پر نازل ہوئیں۔

کے متعلق اطلاعات کے باب میں وہ قرآن پر اعتماد کرتے ہیں۔ اس لیے کہ قرآن کے سوا اور کوئی کتاب نہیں جو ہر شبہ سے پاک ہو۔ رسول اللہ صلعم کی سیرت طیبہ کے متعلق ہر شئے معلوم ہے اور کوئی شے مبہم نہیں چھوڑی گئی۔ روایات نے آپ کی سیرت بشریت کے رنگ میں پیش کی ہے، مثلاً آپ نے تجارت کی۔ شادی کی۔ آپ کے بچے پیدا ہوئے۔ پہلی بیوی اور بیٹے وفات پا گئے۔ گویا آپ کو وہ تمام تجربات و وقائع پیش آئے جو انسانوں کو پیش آتے رہتے ہیں۔ آپ کی زندگی میں کوئی چیز ماوراے طبیعت نہ تھی۔ البتہ عام انسانوں کے مقابلے میں یہ فرق ضرور تھا کہ آپ پر خدا کی وحی نازل ہوتی تھی۔ اگر سوال کیا جائے کہ دوسرے مذاہب کے معلّم مثلاً مہاتما بدھ یا کنفیوشش بھی پیغمبر تھے یا نہیں تھے، تو ہم اس کا کوئی واضح جواب نہیں دے سکتے۔ اس بارے میں قرآن مجید نے صرف یہ بتایا ہے:

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ مِنْهُمْ مَّنْ قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُمْ لَّمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ ۚ (مومن ۷۸)	اور ہم نے بھیجے ہیں بہت رسول تجھ سے پہلے، بعض ایسے ہیں وہ ہیں کہ سنایا ہم نے تجھ کو ان کا احوال اور بعض ہیں کہ نہیں سنایا۔

بعض لوگ یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ جن پیغمبروں کے متعلق خدا نے ذکر نہیں فرمایا، ان میں دوسرے مذاہب کے معلّم ربانی بھی شامل ہیں، لیکن دوسرے لوگ کہتے ہیں کہ ان مذاہب کے بنیادی اصول اور روح کا مطالعہ کر لینے کے بعد ہی طے کیا جا سکتا ہے کہ وہ روح و مغز کے اعتبار سے اسلام کے مطابق ہیں یا نہیں، اسی بنا پر یہ بتایا جا سکتا ہے کہ ان کے بانی پیغمبر تھے یا نہیں تھے۔

یوم حساب کا ذکر قرآن مجید کی متعدد آیات میں آیا ہے جب آسمان پھٹ جائے گا، ستارے باہم ٹکرا جائیں گے، پہاڑ دھنکی ہوئی روئی کی طرح ہو جائیں گے۔ زمین پر زلزلہ طاری ہو جائے گا۔ یہ یوم حساب ہوگا۔ اس روز تمام لوگوں کو جگایا جائے گا۔ ان کے اعمال تولے جائیں گے۔ جن کے اچھے اعمال کا وزن زیادہ ہوگا، وہ بہشت میں راحت و اطمینان کی زندگی بسر کریں گے اور جن کے اچھے اعمال کا وزن کم ہوگا وہ دوزخ میں جائیں گے جو آگ سے لبریز ہوگا۔ بہشت کا ذکر ایسے

حسین وجمیل انداز میں کیا گیا ہے کہ جو بھی قرآن مجید کے یہ حصے سنتا ہے اس کے دل پر گہرا اثر پڑتا ہے اس کے برعکس دوزخ کی تصویر نہایت خوفناک انداز میں کھینچی گئی ہے ۔ اگرچہ عام لوگ ان بیانات کا مطلب وہی سمجھتے ہیں جو لفظوں سے متبادر ہوتا ہے لیکن تعلیم یافتہ لوگوں کے نزدیک ایسے تمام بیانات کی حیثیت تمثیلی ہے جب بہشت و دوزخ کے بیانات پر ٹھنڈے دل سے غور کیا جائے تو یہ امر بہ آسانی ذہن نشین ہو جاتا ہے کہ ان میں لوگوں کو اچھے اعمال پر آمادہ کرنے کی کتنی زبردست قوت ہے ۔

اس کا چھٹا بنیادی عقیدہ انسانی تقدیر کی بھلائی یا برائی کا ہے ۔ لفظ تقدیر کے معانی کی نسبت بہت غلط فہمی پائی جاتی ہے ۔ تقدیر کے متعلق اس عقیدے کی بنا پر بہت سے لوگوں کی رائے یہ ہو گئی ہے کہ ہم چاہیں یا نہ چاہیں جو کچھ ہونا ہے خود بخود ہو تا رہے گا ۔ ظاہر ہے کہ یہ عقیدہ لوگوں کو ہر ترقی کی طرف سے غافل اور بے حس بنا دے گا ۔ عقیدہ تقدیر کا اصل مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا کو ایک منظم شکل میں پیدا کیا اور ہر شخص کو دنیا کی فطرت کے مطابق عمل پیرا رہنا چاہیے ۔ اس طرح تقدیر کا احساس رکھنے والا انسان ہر لحظہ اس کوشش میں رہے گا کہ جس عمل کو وہ اچھا سمجھتا ہے اُسے اختیار کرے ۔ ساتھ ہی اسے علم ہو گا کہ اگر احتیاطی تدابیر کے باوجود کوئی برائی ظہور میں آ گئی تو نہ اس پر متاسف ہو گا اور نہ اپنے آپ کو ملزم گردانا پڑے گا ۔ اس وقت وہ کہے گا کہ یہ خدا کی تقدیر تھی ۔ اس مطلب کی وضاحت حضرت عمرؓ نے فرمائی تھی ، جب انھوں نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ جب تک وبا ہے فلسطین نہیں جائیں گے ۔ ایک صحابی نے پوچھا : کیا آپ خدا کی تقدیر سے بچ نکلنا چاہتے ہیں ، آپ نے جواب دیا ، ہاں میں خدا کی ایک تقدیر سے خدا کی دوسری تقدیر کی طرف جا رہا ہوں ۔

اسلام کے ان چھ عقیدوں کے متعلق قطعاً کوئی اختلاف نہیں ، ہر مسلمان اللہ پر ، اُس کے فرشتوں پر ، اُس کی نازل کی ہوئی کتابوں پر ، اس کے رسولوں پر ، یوم حساب پر اور تقدیر پر ایمان رکھتا ہے البتہ تعبیرات میں اختلاف ہو سکتا ہے ، جیسا کہ اوپر ذکر کیا جا چکا ہے اور یہ اختلاف فی الاصل

مدارج تعلیم کے اختلاف کا نتیجہ ہے۔

ارکان اسلام اسلام کے بنیادی عقیدوں کی ایک عملی قدر و قیمت ہے جو روزمرہ کی زندگی میں نمایاں ہوتی ہے۔ اس کتاب میں جو دوسرے مقالے شامل ہیں، ان میں بطورِ مذہب اسلام کے عملی پہلوؤں یعنی اس کے تقاضوں، اس کی عبادات اور اس کے معاملات پر روشنی ڈالی گئی ہے جن چیزوں کو اسلام میں بہ طور عبادات فرض قرار دیا گیا ہے، انھیں حدیث کی رُو سے "ارکان" بتایا گیا ہے۔ معاملات اور معاشرے میں انسانوں کے متعلق واجبات کی ذمہ داریاں فقہ میں واضح کر دی گئی ہیں۔

حدیث کے مطابق اس کی پانچ بنیادیں ہیں۔ اوّل یہ اقرار کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد صلعم اُس کے رسول ہیں، دوم نماز، سوم زکوٰۃ، چہارم ماہ رمضان میں روزے، پنجم مکہ معظمہ تک کا سفر بہ غرضِ حج، یہ ان لوگوں پر واجب ہے جو سفر خرچ برداشت کر سکیں۔ ان پانچ ارکان میں سے پہلے کے متعلق اسلامی دنیا کے کسی حصے میں کوئی اختلاف نہیں۔ تمام مسلمان شہادت کے الفاظ سے آگاہ ہیں، یعنی اللہ پر ایمان اور رسول اللہ صلعم کی رسالت کا اعتراف۔ تمام مسلمان یہ کلمہ دہراتے رہتے ہیں۔

نماز دو قسم کی ہے، ایک فرض دوسری تطوع یعنی وہ نماز جو اپنی خوشی سے ادا کی جائے دن میں پانچ مرتبہ کی نماز فرض ہے۔ اسی طرح نماز جمعہ با جماعت ادا کرنے کے لیے مسجد میں پہنچنا چاہیے۔ یہ اندازہ کرنا مشکل ہے کہ لوگوں میں سے کتنی تعداد پانچ مرتبہ باقاعدہ نماز ادا کرتی ہے۔ اس لیے کہ عورتیں عموماً اپنے گھروں میں نماز پڑھ لیتی ہیں، مرد مسجدیں بھی چلے جاتے ہیں اور اگر کام کاج ہو تو کام کاج کی جگہ یا گھر میں نماز پڑھ لیتے ہیں۔ کوئی ایسا مذہبی رئیس موجود نہیں جو نمازوں کی ادائیگی کی نگرانی کرے۔ جمعہ کے دن مسجد میں نماز ادا کرنے والوں کا اندازہ کر لینا ممکن ہے۔ انڈونیشیا، ترکی، مصر، اور مغرب میں جمعہ کے دن لوگ بکثرت مسجدوں میں پہنچتے ہیں۔ یہی کیفیت ایران میں شیعہ حضرات کی ہے۔ سب سے کم تعداد چین اور سوویٹ یونین

یں نمازِ جمعہ کے لیے جمع ہوتی ہے۔

تطوع یا اختیاری نمازیں مختلف قسموں کی ہیں، مثلاً وہ نمازیں جو فرض نمازوں سے پہلے اور بعد میں پڑھی جاتی ہیں۔ عیدین کی نمازیں، ان میں سے پہلی ماہِ رمضان کے اختتام پر اور دوسری حج کے اختتام پر پڑھی جاتی ہے، ضرورت کے موقع پہ نمازیں۔ یہ نمازیں ہر شخص ہر جگہ، ہر وقت ضرورت کی بنا پر ادا کرسکتا ہے یعنی جب اُسے خدا کی خاص امداد درکار ہوتی ہے۔ میت کے لیے نمازِ جنازہ ضروری ہے، اور روح جسم کے مر جانے کے بعد بھی زندہ رہتی ہے۔ یہ نمازیں ہر وقت ادا کی جاسکتی ہیں اور مسلمان اپنے خدا کے ساتھ برابر تعلق جاری رکھتا ہے۔

مختلف ممالک میں ادائے نماز کے جو طریقے ہیں اُن میں تھوڑا سا تنوع ہے۔ یہ اختلافات کوئی اہمیت نہیں رکھتے اگرچہ وہ فقہی دبستانوں کی مختلف تعبیرات سے پیدا ہوئے۔ بعض لوگ نمازِ جمعہ کے بعد سنتیں ادا کرنے پر زور دیتے ہیں، دوسرے زور نہیں دیتے۔ قیام کی وضع و ہیئت میں بھی تھوڑا سا اختلاف ہے، مثلاً بعض ملکوں میں لوگ نماز کے لیے کھڑے ہوتے ہیں تو وہ اپنا دایاں ہاتھ بائیں کے اوپر رکھتے ہیں لیکن ہاتھ سینے کے نیچے کے حصے میں باندھتے ہیں۔ دوسرے لوگ جو مالکی فقہ کے پیرو ہیں یا شیعہ ہیں، اپنے ہاتھ چھوڑے رکھتے ہیں۔ اس قسم کے اختلافات کوئی اہمیت نہیں رکھتے اور یک آہنگی کا اندازہ اوقاتِ نماز یا نماز سے پہلے وضو یا نماز کے وقت کعبہ کی طرف منہ کرلینے سے ہوسکتا ہے۔

مسجدیں نماز، تعلیم اور خدمت کے مرکز ہیں اور انھیں اسلام کے امتیازی نشان قرار دیا جاتا ہے، اگرچہ ان کی وضع و ساخت ہر ملک میں جداگانہ ہے۔ ابتدا میں مسجد بہت سادہ تھی اور ہر جگہ کو مسلمان نماز کی خاص جگہ بنا سکتے تھے۔ رسول اللہ صلعم نے مدینے میں جو پہلی مسجد بنائی وہ بہت سادہ تھی۔ زمین کے ایک ٹکڑے پر چاروں طرف کچی دیواریں بنائی گئیں اور ان پر کھجوروں کی شاخوں کی چھت ڈال دی گئی تھی۔ اسلام جب دوسرے ملکوں میں پھیلا تو مسجدوں کے لیے اُن ملکوں کا اندازِ تعمیر اختیار کرلیا گیا مثلاً چین میں جو مسجدیں ہیں وہ مختلف

حیثیتوں میں چینیوں کی عبادت گاہوں سے مشابہ ہیں جن کی شکل مخروطی ہوتی ہے۔ انڈونیشیا میں مسجدیں دریاؤں اور ندیوں کے قریب بنائی جاتی ہیں تاکہ لوگ آسانی سے وضو کر سکیں عرب ممالک میں جو مسجدیں ہیں اُن کا ایک حصہ مسقف ہوتا ہے تاکہ موسم سرما میں استعمال ہو سکے اور ایک حصہ کھلا ہوتا ہے جہاں موسم گرما میں نماز ادا کی جاتی ہے زمانہ حال میں ترکی اور انڈونیشیا کے اندر زیادہ تر مسجدیں تعمیر ہوئیں۔

مسجدوں میں آذان کے لیے جو مینار بنائے جاتے ہیں اُن کی وضع قطع میں بھی بڑا اختلاف ہے۔ وہ مربع بھی ہو سکتے ہیں اور گول بھی جیسا کہ شام کے ساحلی علاقے میں ہیں اور ان میں زیادہ سے زیادہ تعمیری خوبیاں اور باریکیاں بھی رکھی جا سکتی ہیں جیسا کہ ہم مصر میں دیکھتے ہیں۔ ترکی میں مسجدوں کے مینارے بہت سبک اور پنسل کی وضع کے ہوتے ہیں۔ عراق اور ایران میں شیعی مسجدوں کے مینارے بہت سجائے جاتے ہیں۔ اور اُن میں رنگ برنگ کی ٹائل لگا دی جاتی ہیں۔ انڈونیشیا میں مینارے الگ بنائے جاتے ہیں۔ دیہات میں کسی اونچے درخت پہ اذان کے لیے ایک کرسی باندھ دیتے ہیں۔ چین میں حکومت نے مینار بنانے کی اجازت نہ دی۔ انڈونیشیا میں نماز کے لیے نقارہ بھی بجایا جاتا ہے۔

اس امر پہ عمومی اتفاق ہے کہ مسلمانوں کو زرعی پیداوار میں سے دسواں حصہ فصل کے ساتھ ہی بطور زکوٰۃ دے دینا چاہیے اور نقد دولت یا سونا اُس کے پاس ایک سال تک رہے (بشرطیکہ اُس کا وزن ۸۰ گرام ہو) تو اُس میں چالیسواں حصہ دے دینا چاہیے۔ مویشی میں بھی اسی طرح حصہ مقرر ہے۔

قرآن مجید میں بتا دیا گیا ہے کہ زکوٰۃ غریبوں، ضرورت مندوں، زکوٰۃ جمع کرنے والوں کے علاوہ نیز اُن لوگوں کے لیے ہے جن کے دلوں کی تالیف منظور ہو، علاوہ بریں غلاموں، مسافروں، قرض داروں اور راہِ خدا میں کام کرنے والوں کے لیے ہے۔ زکوٰۃ کے ماخذ اور مصارف دونوں پر عمومی اتفاق ہے، لیکن تقسیم کے طریقے میں اختلاف ہے، اس لیے کہ

یادہ تر اسلامی ملکوں میں سرکاری آدمی موجود نہیں جو زکوٰۃ جمع کریں اور نہ زکوٰۃ کے نظم و نسق کے
لیے کوئی سرکاری ادارہ موجود ہے۔ ترکی میں وزارتِ اوقاف موجود ہے، بعض عرب ملکوں میں بھی
سرکاری محکمے قائم ہیں جو مذہبی اوقاف کا بندوبست کرتے ہیں، لیکن زکوٰۃ خواہ اسباب میں ہو خواہ
روپے میں خود ہی افراد میں تقسیم کر دی جاتی ہے یا خیراتی اداروں کو دے دی جاتی ہے۔ عرب
میں اب تک جانور بطورِ زکوٰۃ دیے جاتے ہیں، اس لیے کہ وہاں سرکاری تحصیلدار موجود ہیں
لیکن مال اسباب اور سونے میں زکوٰۃ دینے کا دستور نہیں۔ انڈونیشیا میں لوگ زرعی پیداوار
میں سے زکوٰۃ کا حصہ الگ کر کے مذہبی آدمیوں کے حوالے کر دیتے ہیں، لیکن وہاں جانوروں
میں زکوٰۃ نہیں۔ مذہب کی رُو سے زکوٰۃ کا جو تناسب مقرر ہے، غالباً کسی بھی اسلامی ملک
میں اسے پورا نہیں کیا جاتا۔

حج اب بھی اسلامی دنیا میں اتحاد کے لیے —— بہت بڑی قوت ہے۔ ہر سال
دنیا بھر کے مسلمان خواہ وہ کسی رنگ یا کسی نسل کے ہوں، ارضِ مقدس میں فریضۂ حج ادا کرنے
کے لیے جمع ہوتے ہیں۔ چودہ سو سال گزر گئے لیکن حج کی اہمیت اب بھی بدستور قائم ہے
گرچہ حمل و نقل کے نئے وسائل نشو و ارتقا پا گئے ہیں۔ تمام دنیا کے مسلمان جن میں مذہبی
رہنما اور عوام سب شامل ہیں، مکہ معظمہ میں جمع ہو کر مبادلہ خیالات کرتے ہیں۔ عالمگیر اسلامی
برادری کی روح کو زندہ رکھنے کے لیے اس قسم کے شخصی روابط حد درجہ ضروری ہیں۔
حج کے سلسلے میں جن اعمال کا ذکر ہے ان کی تفصیلات میں بھی ضروری اختلاف ہے جو مختلف
فقہی دبستانوں کی وجہ سے پیدا ہوا، لیکن اُس کی کوئی اہمیت نہیں۔ موجودہ دور میں سفر کے
لیے بہت سی سہولتیں پیدا ہو گئی ہیں اس وجہ سے دور دور کے علاقوں کے مسلمانوں کے
لیے مکہ معظمہ پہنچنا نسبتاً آسان ہو گیا ہے۔ یوں مشرقِ بعید کے مسلمان ترک اور عرب
علاقوں کے مسلمان بھائیوں سے گہرا ربط ضبط پیدا کرنے کے اہل بن گئے ہیں۔ آج کل
حج کے لیے جو سب سے بڑی مشکل پیش آ رہی ہے وہ کرنسی کی پابندی سے متعلق

سے ہے، نیز اُن پابندیوں سے جو سوویٹ یونین اور چین نے عائد کر رکھی ہیں، البتہ حج کا خرچ فراہم کرنے کی مشکل پہلے سے موجود ہے، حج اسلام کا ایک نہایت اہم رُکن ہے۔ قرآن اور سنّت نے اسے عبادت قرار دیا ہے جو مسلمانوں کو خدا سے بھی قریب کر دیتی ہے اور ایک دوسرے سے بھی۔

اسلامی شریعت

جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں اسلامی ارکان میں عبادت بھی شامل ہے، معاملات بھی جنھیں روز مرّہ کی زندگی میں مسلمانوں کی ذمہ داریاں سمجھنا چاہیے اس سلسلے میں خاص مذہبی تقاضوں کو چار فقہی دبستانوں نے مدوّن کر دیا ہے جو اسلامی دنیا میں ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو زندگی بسر کر رہے ہیں۔ مالکی دبستان دوسری صدی ہجری میں قائم ہوا تھا۔ اس میں مدنی اعمال و روایات کو ترجیح دی جاتی ہے، جہاں رسول اللہ صلعم نے اپنی حیاتِ طیّبہ کے دس گیارہ سال بسر کیے۔ آج کل اس دبستان کے پیرو زیادہ تر شمالی افریقہ میں ملتے ہیں، نیز مصر کے بعض حصوں اور سوڈان میں دوسری صدی ہجری ہی میں امام ابوحنیفہؒ بغداد میں مقیم تھے اور وہ ریشم کی تجارت کرتے تھے، انھوں نے اسلامی قانون کی بنیاد صرف قرآن اور روایات پر رکھی۔ امام موصوف نے خود تو کوئی کتاب مرتّب نہ کی، لیکن شاگردوں نے آپ کی حریت پسندانہ تعلیمات کو خوب پھیلایا اور حنفی فقہ کی بنیاد پڑی جو ترکی، افغانستان، وسطِ ایشیا، پاکستان، ہندوستان اور مصر میں رائج ہے۔ امام ابوحنیفہ کے ایک شاگرد امام محمدؒ بن ادریس شافعی تھے۔ انھوں نے تیسری صدی میں شافعی دبستان کی بنیاد رکھی۔ امام موصوف بہت منتظم فقیہ تھے اور انھوں نے ضابطہ پر مبنی اور روایات کے بین بین راستہ اختیار کیا۔ شافعی دبستان کے پیرو جنوبی عرب، جنوبی ہند، تھائی لینڈ، ملایا، انڈونیشیا اور فلپائن میں ملتے ہیں۔ چوتھا فقہی دبستان بھی تیسری صدی ہجری ہی میں قائم ہوا۔ اس کے بانی امام احمدؒ بن حنبل تھے جو بغداد میں رہتے تھے۔ انھوں نے روایات پر زور دیا اور قیاس کے استعمال کو مناسب نہ سمجھا۔ حنبلی فقہ کے پیرو وسطِ عرب، شام اور

اسلامی فقہ پر عقل اور موجودہ عہد کے علوم کی روشنی میں از سرِ نو نظر ڈالی جائے۔ اسلام میں مذہبی اور غیر مذہبی (سکولر) کا کوئی امتیاز نہیں اور اسلامی دنیا کے ایک بڑے حصے نے حال ہی میں سیاسی آزادی حاصل کی ہے۔ اب وہ لوگ دنیا کے معاملات میں اہم کردار ادا کر رہے ہیں ان وجوہ سے اسلامی فقہ کا از سرِ نو جائزہ لینا اور بھی ضروری ہو گیا ہے۔

اسلامی قانون اور سرکاری قانون کے درمیان تعلق دورِ حاضر کا ایک اہم مسئلہ ہے ترکی میں قومی قانون بدیہی طور پر غیر مذہبی ہے اور اوقاف کا نظم و نسق بھی غیر مذہبی حاکموں کے زیر نگرانی ہے۔ مصر، پاکستان اور ہندوستان میں اسلامی اور قومی قانون کے تعلق کا مسئلہ عموماً زیر بحث رہتا ہے۔ انڈونیشیا میں اسی مسئلے کی بنا پر متعدد سیاسی پارٹیاں بن گئی ہیں۔ دوسرا اہم مسئلہ یہ ہے کہ اسلامی قانون اور ملک کے رواج کے درمیان تعلق کا فیصلہ کیا جائے، جیسا کہ چین اور انڈونیشیا کے تعلق میں ذکر کیا جا چکا ہے۔ اسلام جیسے جیسے باقی دنیا میں پھیلتا جائے گا یہ مسئلہ ناگزیر طور پر پیش نظر آتا رہے گا۔

اسلام میں فرقے

ابتدا ہی سے قرآن اور سنت اسلام کے بنیادی ماخذ رہے ہیں مسلمانوں نے ہمیشہ قرآن کو نورِ ہدایت سمجھا اور اسی طرح نماز، روزہ اور حج ادا کرتے رہے جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کیا تھا۔ اپنی زندگیوں کے تفصیلی معاملات میں مسلمانوں کا انحصار اس امر پر رہا کہ کتاب و سنت کے اصول پیش نظر رکھتے ہوئے، قیاس اور استدلال سے کام لیں۔ یہی امر مختلف دبستان ہائے فقہ مختلف رجحانات اور مختلف فرقوں کا موجب بنا جو اسلام میں پائے جاتے ہیں۔

حنفی دبستانِ فقہ کے پیرو عقل و رائے کی طرف رجحان رکھتے ہیں جیسا کہ معتزلہ میں پایا جاتا ہے[1]۔ شافعی دبستانِ فقہ کے پیرو اشعریوں کی معتدل الٰہیات کے مطابق چلتے ہیں۔ مالکی تقدیر کے قائل ہیں۔ حنبلی لفظی تعبیر کا رجحان رکھتے ہیں۔ یہ الٰہیاتی اور کلامی

[1] حنفی دبستانِ فقہ کو معتزلہ سے متشابہ قرار دینا زیادتی ہے۔ اس پر مفصل بحث کی ضرورت ہیں۔

رجحان ہیں، فرقہ وارانہ رجحانات سے الگ ہیں۔

اسلام میں دو بڑے فرقے ہیں، شیعہ اور سنّی۔ شیعوں میں تین بڑے گروہ ہیں۔ اثنا عشری یعنی بارہ اماموں کے ماننے والے۔ سبعی یعنی سات اماموں کے ماننے والے جنھیں اسمٰعیلی کہتے ہیں اور زیدی۔ اثنا عشریوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے اور وہ زیادہ تر عراق و ایران میں پائے جاتے ہیں۔ وہ بارہ اماموں کو مانتے ہیں۔ سبعی جنھیں بعض اوقات ہفت امامی کہتے ہیں حضرت اسمٰعیل کے دعویٔ امامت پر الگ ہوئے۔ جو اُن کے نزدیک ساتویں امام تھے۔ اس وجہ سے انھیں اسمٰعیلی بھی کہتے ہیں۔ ان میں بھی بہت سے فرقے ہیں اور سب سے زیادہ فرقہ وہ ہے جو آغا خاں کا پیرو ہے۔ یہ لوگ پاکستان، ایران ہندوستان، شام اور مشرقی افریقہ میں رہتے ہیں[1]۔ زیدی آج کل صرف یمن میں ہیں۔ یہ شیعوں کا سب سے چھوٹا گروہ ہے اور آہستہ آہستہ سنّیوں سے بہت قریب آگیا ہے۔

خارجی بھی جنھوں نے حضرت علیؓ کے خلاف بغاوت کی ابتدا میں شیعہ ہی تھے، لیکن وہ ایک حد تک سنّیوں کے افکار سے متاثر ہوئے۔ وہ عمان اور مسقط، نیز شمالی افریقہ میں پائے جاتے ہیں۔ شمالی افریقہ کے خارجی اباضی کہلاتے ہیں۔

نوّے فی صد سے زیادہ مسلمان سُنّی ہیں یعنی وہ سنت کے پیرو ہیں۔ سنّیوں میں اہمیت رکھنے والے فرقے یا تو وہابی ہیں جنھیں عرب کا ایک اصلاحی فرقہ قرار دینا چاہیے یا پاکستان کے قادیانی ہیں جنھیں عام طور پر مسلمانوں سے الگ سمجھا جاتا ہے اگرچہ لاہوری شاخ کے متعلق سب کی رائے ہمیشہ یہ نہیں رہی۔ سنّیوں میں مختلف رجحانات کے باعث نقطۂ نگاہ کا اختلاف ضرور پیدا ہوا، لیکن عقاید میں سب سے زیادہ وسیع درجۂ قبول اشعریت کو حاصل ہوا۔ معتزلہ کی عقلیت پسندی ایک موقع پر اتنی اہمیت اختیار کر گئی

---

[1] اسمٰعیلیوں کے دو بڑے گروہ ہیں۔ ایک آغا خانی دوسرے داؤدی۔ پاکستان و ہند میں دو نوں گروہوں کی آبادی موجود ہے۔

تھی کہ انھیں ایک مستقل فرقے کی حیثیت حاصل ہونے والی تھی، لیکن آج عقلیت کا نقطۂ نگاہ سنیوں کے درمیان متعدد رجحانات میں سے ایک رجحان ہے۔ راسخ العقیدہ مسلمانوں اور موجودہ زمانے کے مصلحین کے درمیان جو اختلافات پیدا ہوئے، انھوں نے فرقہ وار تقسیمات کی شکل اختیار نہ کی۔

صوفیہ کے متعدد سلسلوں کو جداگانہ فرقے نہیں سمجھنا چاہیے اس لیے کہ یہ لوگ بیک وقت اپنے آپ کو سُنی یا شیعہ نیز صوفی قرار دیتے ہیں۔ حکومت ترکی نے صوفیہ کے سلسلوں پر پابندی عاید کر دی ہے لیکن صوفیت وہاں کی اسلامی زندگی میں ایک قوی عامل کے طور پر بدستور جاری ہے۔ تعلیم یافتہ اور عوام دونوں مشہور اربابِ تصوّف کی تصانیف پڑھتے ہیں اور صوفیہ ہی کے نقشِ قدم پر چلتے ہیں۔ سلسلہ ہائے تصوّف افریقہ میں بھی ایک اہم عامل کی حیثیت میں جاری ہیں اگرچہ مصر میں اُن کا اثر روبہ زوال ہے۔ مصر کے تعلیم یافتہ لوگوں میں بھی صوفیہ کی تصانیف سے خاصی دلچسپی کا اظہار کیا جا رہا ہے۔ شیعوں میں بھی صوفیانہ رجحانات خاصے ہیں اور انھوں نے ایران و عراق نیز پاکستان و ہند کی عباداتی اور باطنی زندگی پر خاصا اثر ڈالا ہے۔ پاکستان و ہند کے اربابِ تصوّف ہندوؤں سے بھی ایک حد تک متاثر ہوئے لہٰذا اُن میں وقتاً فوقتاً وجودی رجحانات پائے جاتے رہے جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے تصوّف نے انڈونیشیا کے مسلمانوں کی زندگی میں اہم کردار ادا کیا۔ منظم سلسلوں کے ذریعے سے عام لوگوں نے فائدہ اُٹھایا اور پڑھے لکھے آدمیوں نے تصوّف سے نظم و ضبط اور مطالعہ و مراقبہ سیکھا۔ صرف چین کی اسلامی جماعت ایسی ہے جس میں صوفیت نے کسی بڑے عامل کی حیثیت میں حصّہ نہیں لیا۔

صوفیت پر یونانی، ایرانی اور ہندوستانی افکار کا بھی اثر پڑا، اس وجہ سے بعض اوقات تجاوز و تعصب کے مظاہرے بھی ہوئے جو حقیقی روحِ اسلام کے منافی تھے۔ بعض صوفیوں نے ارکانِ اسلام سے اختلاف کیا اور یہ بتاتے رہے کہ خدا کے ساتھ اتحاد اسلام کا اصل مقصد

ہے۔ وجودی عقیدے کا یہ اظہار سراسر الحاد ہے۔ باقی اہلِ تصوف امام غزالی کی تعلیمات کے پیرو رہے۔ انھوں نے اسلامی عبادات کو گہرے مذہبی احساس کے ساتھ اپنایا ایسے صوفی اسلامی دنیا کی مذہبی زندگی میں بیش قیمت اضافہ کرتے رہے ہیں اور آج بھی اُن کا یہ عمل خیر جاری ہے۔

اسلامی معمولات

مسلمانوں کو دعوت دی گئی ہے کہ وہ اپنی روزمرہ زندگی میں اسلام کے صراطِ مستقیم کی پیروی تمام تفصیلات میں کریں۔ قرآن مجید اور رسول اللہ صلعم کے اسوہ حسنہ اور حدیث کو اپنا رہنما بنائیں۔ مسلمان کی زندگی کو رسول اللہ صلعم کی تعلیمات اور اسوہ حسنہ کا عملی نمونہ ہونا چاہیے۔

جب مسلمان کے گھر بچہ پیدا ہوتا ہے تو بتایا گیا ہے کہ کوئی شخص اُس کے کان میں آہستہ آہستہ اذان کہے۔ اللہ اکبر ... لا الٰہ الا اللہ ... محمد رسول اللہ ... حی علی الصلوٰۃ ...... حی علی الفلاح ... اللہ اکبر۔

جب بچے کی عمر ایک ہفتے کی ہو جائے تو عقیقہ ہونا چاہیے ــــ لڑکی کے لیے ایک بھیڑ یا دنبہ ذبح کیا جائے لڑکے کے لیے دو ــــ گوشت عزیزوں میں تقسیم کر دینا چاہیے۔ ساتویں دن بچے کا نام رکھا جائے، نام اچھا ہونا چاہیے۔ لڑکے کا ختنہ بھی ضروری ہے۔ والدین کا فرض ہے کہ بچے کو بتائیں کہ نماز کس طرح پڑھنی چاہیے اور دس سال کی عمر تک اُسے نماز کے متعلق سب کچھ سیکھ لینا چاہیے اس میں وضو بھی شامل ہے۔

وضو نماز سے پیشتر کیا جاتا ہے، وضو کا طریقہ یہ ہے کہ منہ دھویا جائے، کہنیوں تک ہاتھ دھوئے جائیں، سر کا مسح کیا جائے اور ٹخنوں تک پاؤں دھوئے جائیں۔ اگر غلاظت لگ گئی ہے یا وظیفہ زوجیت ادا کیا ہے تو غسل واجب ہے، اگر پانی نہ مل سکے تو تیمم کر لینا چاہیے جو وضو اور غسل کا نشان ہے۔

مسلمانوں کے لیے ضروری ہے کہ دن میں پانچ مرتبہ نماز ادا کریں، صبح کے وقت طلوعِ آفتاب سے پیشتر دو رکعتیں، ظہر کے وقت چار رکعتیں، عصر کے وقت چار رکعتیں، مغرب کے وقت تین رکعتیں اور عشا کے وقت چار رکعتیں[1] کسی نماز میں پانچ منٹ سے زیادہ وقت نہیں لگتا۔ اگر سنن و نوافل بھی شامل کر لیے جائیں تو کچھ زیادہ وقت لگ جائے گا، چاہیے کہ نماز باجماعت ادا کی جائے۔ اگر کوئی شخص سفر میں ہو تو دو نمازیں یک وقت ادا کر سکتا ہے (ظہر و عصر اور مغرب و عشاء) اور چار رکعت کی نماز نصف رہ جائے گی یعنی دو رکعت (قصر) شیعہ اپنے ساتھ خاکِ کربلا کی چھوٹی سی ٹکیہ رکھتے ہیں، اسے زمین پر رکھ لیتے ہیں۔ سجدے کے وقت اُن کی پیشانی اس ٹکیہ پر ہوتی ہے[2]۔

جمعہ کی نماز تمام مسلمانوں کو مسجد میں ادا کرنی چاہیے اور امام کا خطبہ توجہ سے سننا چاہیے۔ معمول یہ ہے کہ عورتیں جمعہ کی نماز کے لیے یا تو مسجد میں ایک الگ جگہ پہنچ جاتی ہیں یا باجماعت نماز ادا نہیں کرتیں۔ دو بڑے مذہبی جشنوں کے موقع پر بھی ——— عید الفطر جو ماہِ رمضان کے اختتام پر ادا کی جاتی ہے اور عید الاضحیٰ یا عیدِ قربان جو حج کے اختتام پر ادا کی جاتی ہے۔ ——— مسلمانوں کو باجماعت نمازیں ادا کرنی چاہییں۔ بہتر یہ ہے کہ یہ نمازیں کھلے میدان میں ادا ہوں اور امام کا خاص خطبہ توجہ سے سُنا جائے۔ عید الفطر سے پیشتر غریبوں کے لیے[3] کھانے کا انتظام ضروری کر دینا چاہیے تا کہ اُس دن کوئی شخص بھوکا نہ رہے۔ عید الاضحیٰ ادا کر لینے کے بعد قربانی کی جاتی ہے خواہ ایک بھیڑ ہو یا گائے یا اونٹ اور گوشت ضرورت مندوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

جب کوئی شخص شادی کرنی چاہے تو اسے اجازت ہے کہ جس عورت سے شادی کرنا چاہتا ہے، اُسے دیکھ لے۔ لڑکی کے ولی ماں باپ ہوتے ہیں، لیکن یہ ضروری ہے کہ شادی سے پہلے لڑکی کی رضامندی حاصل کر لی جائے۔ اگر وہ بیوہ ہے تو اُس سے واضح اجازت

---

[1] یہاں صرف فرائض کا ذکر ہے، سنن اور نوافل ان کے علاوہ ہیں [2] یہ ضروری نہیں کہ خاکِ کربلا کی ٹکیہ ہی سامنے رکھی جائے، ہر وہ چیز رکھی جا سکتی ہے جو اوڑھنے پہننے اور کھانے کے کام نہ آتی ہو، خالی پیشانی پر بھی سجدہ جائز ہے۔ [3] یہ صدقۂ فطر کا ذکر ہے جسے عام طور پر فطرانہ کہتے ہیں۔

بنا ضروری ہے۔ اگر وہ باکرہ ہے تو اُس کی خاموشی کو اجازت سمجھنا چاہیے۔ دولھا کو چاہیے کہ
ین یا مہر دلھن کی خدمت میں پیش کرے۔ شادی کے معاہدے کے لیے دو مرد گواہ ضروری
ں شادی کے بعد جشن منانے کی اجازت ہے، لیکن اس میں زیادہ روپیہ خرچ نہ ہونا چاہیے۔
شوہر بیوی اور بچوں کے لیے نان و نفقہ بہم پہنچانے کا ذمہ دار ہے، طلاق کی اجازت
صرف اُس حالت میں ہے جب کوئی چارۂ کار باقی نہ رہے۔ اگر بیوی اور شوہر کے درمیان
ختلافات پیدا ہو جائیں تو دونوں کے رشتے داروں کو چاہیے کہ بیچ بچاؤ کرکے صلح کرا دیں۔
طلاق بڑا اہم قدم ہے۔ رسول اللہ صلعم کے الفاظ میں اس پر خدا کا تخت ہل جاتا ہے۔
لہٰذا اس میں تاخیر ضروری ہے۔ دو مرحلوں کے بعد تیسرا اور آخری مرحلہ آتا ہے جس پر طلاق پکی ہوتی
ہے۔ درمیانی مدت میں شوہر کو چاہیے کہ بیوی کے لیے گزارے کا بندوبست کردے۔ بیوی
ی شوہر کے بے رحمانہ سلوک یا جنسی کمزوری یا متعدی بیماری یا اس قسم کے دوسرے وجوہ
سے طلاق کی درخواست دے سکتی ہے یعنی جب متاہل زندگی اس کے لیے ناقابل برداشت
ہو جائے۔

تعدد ازدواج کی نہ ممانعت ہے اور نہ یہ ضروری ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ ایک ناگزیر
ائی ہے۔ اگر کوئی شخص لڑکے کا خواہاں ہو اور اُس کی بیوی سے صرف لڑکیاں پیدا ہوں تو وہ
دوسری شادی کر سکتا ہے، یہ مسئلہ ابھی تک مسلم فقہا کے درمیان زیر بحث ہے لیکن اس پر عمومی
اتفاق ہے اگر ہوس رانی کی تسکین کے لیے دوسری شادی کی ضرورت نہیں۔ شیعہ حضرات میں
متعہ یعنی عارضی نکاح کی بھی اجازت ہے جسے ایک دن کے بعد بھی ختم کیا جا سکتا ہے، البتہ کابین
ینا پڑتا ہے۱؎۔ سنیوں کے نزدیک متعہ کی اجازت ابتدا میں تھی لیکن بعد میں یہ اجازت منسوخ
ہو گئی۔ شیعہ کہتے ہیں کہ اجازت منسوخ نہیں ہوئی۔ لیکن جو لوگ متعہ کے جواز کے قائل ہیں وہ
ی موجودہ طریق عمل کے خلاف ہیں جس کی حیثیت فحش کاری سے زیادہ مختلف نہیں۔ زنا حرام
ہے۔ اگر پورا ثبوت مل جائے تو اسّی تازیانوں کی سزا ملنی چاہیے۔ مجرم شادی شدہ ہو تو اُسے

۱؎ متعہ کے بعد عورت کو دائمی نکاح کی طرح عدت بھی پوری کرنا ہوتی ہے۔

اونٹ، گائے، بھیڑ، بکری، گھوڑے وغیرہ حلال ہیں۔ بندر حرام ہے پنجوں والے درندے مثلاً ببر شیر، شیر، بھیڑیے اور ریچھ حرام ہیں، اس طرح تیز پنجوں والے پرندے باز شاہین وغیرہ حرام ہیں۔ جن چیزوں کو رسول اللہ صلعم نے مار دینے کا حکم دیا، مثلاً سانپ، چوہے، کوّے یہ حرام ہیں جن جانوروں کو مارنے سے منع کیا، مثلاً چیونٹیاں۔ شہد کی مکھیاں یہ ممنوع ہیں۔ جن جانوروں کو گندے سمجھا جاتا ہے اور مٹی کھا کر گزارا کرتے ہیں وہ بھی ممنوع ہیں۔ کھانے پینے کی چیزوں میں حلال وحرام کے متعلق اسلامی فقہ میں قرآن وحدیث کو رہنما بنایا گیا ہے۔

قرآن مجید کی آیات سے ظاہر ہے کہ تمام مشروبات حلال ہیں سوائے شراب کے۔ شراب اس لیے ممنوع ہے کہ اس میں نشہ ہے۔ اس معاملے میں قرآن مجید اس درجہ واضح ہے کہ دوسری تعبیر ہو ہی نہیں سکتی۔ شراب کی مقدار خواہ کتنی ہی کم ہو، لیکن یہ حرام ہے شراب سے مراد انگور کا رس ہے جس میں جوش آجائے۔ اس قسم کے دوسرے مشروبات کے متعلق مسلمان فقہا میں اختلاف ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ انگوروں کے سوا مختلف پھلوں مثلاً سیب یا کھجور کا رس پیا جا سکتا ہے۔ اُن کی رائے بعض ایسی روایات پر مبنی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کھجور کا رس ایک دو دن رکھ کر نوش فرمایا کرتے تھے۔

چوری مسلمانوں کے لیے حرام ہے اور اگر کوئی شخص دانستہ ایک خاص مقدار چوری کرے تو سزا یہ ہے کہ اُس کا ہاتھ کاٹ دیا جائے۔ مسلمان کے لیے جوا بھی جائز نہیں اور لاٹریوں میں شریک ہونا بھی ممنوع ہے۔ مسلمان کا فرض ہے کہ ناپ تول میں کسی کو دھوکا نہ دے۔ اپنا وعدہ نہ توڑے۔ قول سے نہ پھرے، سُود دینا اور لینا دونوں اُس کے لیے حرام ہیں۔ البتہ مقروض قرض دہندہ کو شکریے کے طور پر تحفہ دے سکتا ہے۔

جو کچھ یہاں واجبات وممنوعات کے سلسلے میں بیان کیا گیا ہے، یہ ایک سرسری خاکہ اُن قواعد کا ہے جو قرآن وحدیث میں موجود ہیں۔ اور ان ہی کے سانچے میں مسلمان کی

زندگی ڈھلنی چاہیے۔

اسلامی معاشرہ معاشرے میں اسلام کے کردار کو سمجھنے کے لیے سب سے پہلے یہ جان لینا چاہیے کہ اسلام ایک عالمی مذہب ہے جس میں تمام مسلمان باہم بھائی بھائی ہیں خواہ وہ کہیں رہتے ہوں، کسی نسل کسی رنگ اور کسی درجے کے ہوں۔ اس برادری اور اخوت کا مطلب یہ نہیں کہ اسلام نے دنیا کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا یعنی مسلم اور غیر مسلم۔ مسلمانوں کا فرض ہے کہ اُس وقت تک غیر مسلموں کے دوست رہیں جب تک اُن کی دوستانہ روش میں فرق نہ آئے یعنی جب تک وہ مسلمانوں پر حملہ نہ کریں۔ اسلام نے اپنی وحدت اور عالمی خصائص کو مختلف ثقافتوں کے درمیان زمانۂ قدیم میں قایم رکھا، مثلاً عرب، یونان، روم اور ایران کی ثقافتیں، بالکل یہی کیفیت بعد ازاں افریقہ، مصر، ترکی اور وسطِ ایشیا، چین، ہندوستان اور جنوبی افریقہ اور مغربی افریقہ کے درمیان پیش آئیں۔ اب اسلام کا سابقہ مغرب کی نئی ثقافت سے پڑا ہے تو دینِ حق کی عالمیت اور آفاقیت پھر ایک مرتبہ روشن ہو رہی ہے۔

اسلام اور دنیا کی مختلف ثقافتوں کے درمیان تعامل میں یہ حقیقت پیشِ نظر رکھنی چاہیے کہ اسلام میں کوئی بڑا النظام نہیں جس کی پابندی لازم ہو۔ یا اس کے ماتحت تبلیغی پروگرام بنائے جائیں۔ تعامل مسلمان افراد کی طرف سے ایک غیر ارادی حرکت ہے جو اسلام کے صراطِ مستقیم پر چلنا چاہتے ہیں۔ ان مسلمانوں کے لیے مذہبی اور غیر مذہبی کے درمیان کوئی امتیاز نہیں۔ وہ اپنی مجلسی اور اجتماعی زندگی میں اُن قواعد کی پیروی کے لیے کوشاں ہیں جو قرآن و سنت میں پیش ہوئے اور اسلامی فقہ میں اُن کی تعبیر متعین کی گئی۔ اسلام کے نزدیک موجودہ دنیا کی حیثیت عارضی ہے۔ اس کے بعد وہ دنیا آئے گی جو ہمیشہ قایم رہے گی اور وہ موجودہ سے بدرجہا بہتر ہو گی۔

وَلَلْآخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْأُولَىٰ — اور البتہ آخرت بہتر ہے تیرے لیے دنیا سے۔ (سورۂ ضحیٰ)

اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہمیں موجودہ دنیا کو نظر انداز کر دینا چاہیے حقیقت یہ ہے کہ قرآن نے اس دنیا سے غفلت برتنے کے خلاف انتباہ کیا ہے:

وَابْتَغِ فِيمَا آتَاكَ اللَّهُ الدَّارَ الْآخِرَةَ وَلَا تَنسَ نَصِيبَكَ مِنَ الدُّنْيَا وَأَحْسِن كَمَا أَحْسَنَ اللَّهُ إِلَيْكَ وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِي الْأَرْضِ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِينَ

اور جو کچھ تجھے اللہ نے دیا ہے اُس سے کما لے آخرت کا گھر اور دنیا سے اپنا حصہ نہ بھول اور بھلائی کر جیسے اللہ نے تجھ سے بھلائی کی اور ملک میں خرابی ڈالنے کی کوشش نہ کر، اللہ کو خرابی ڈالنے والے نہیں بھاتے۔

(قصص: ۷۷)

اسلام اس دنیا میں زندگی کی اہمیت کا اندازہ شناس ہے لیکن اس دنیا میں زندگی کا انجام و اختتام ماننے کے خلاف مسلمانوں کو متنبہ کرتا ہے۔ بہ الفاظ دیگر اخلاقی اور مذہبی اقتدار کو مادی اقدار سے برتر سمجھنا چاہیے۔

مجلسی اور اجتماعی انصاف کی اہمیت پر اسلام بار بار زور دیتا ہے۔ فریضۂ زکوٰۃ اسی کا ایک ذریعہ ہے اور مذہبی جشنوں پر کھانا یا گوشت تقسیم کرنے کی حیثیت بھی یہی ہے، جو ملک مدت سے اسلامی چلے آتے ہیں، وہاں ہر قسم کی ملی اور اجتماعی خدمات کے لیے اوقاف بھی اسی کا نتیجہ تھے۔ زکوٰۃ کے سلسلے میں جو تعلیم ہمیں دی گئی ہے اُس میں اس اصل پر ایک خاص زور دیا گیا ہے کہ دولت خدا کی دین ہے، انسان کا حق نہیں اور اس کے ساتھ اجتماعی واجبات وابستہ ہیں۔ روایات میں بتایا گیا ہے کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا: ملازموں اور غلاموں کو وہی کھلاؤ جو خود کھاتے ہو، وہی پہناؤ جو خود پہنتے ہو۔

اسلام کے نزدیک انسان کا درجہ نہ اُس کے اقوال پر منحصر ہے، نہ آبا واجداد پر، نہ ملت میں رتبے اور عہدے پر، بلکہ صرف اعمال پر موقوف ہے۔ قرآن مجید کا ارشاد ہے۔

۱۔ وَأَن لَّيْسَ لِلْإِنسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ (نجم: ۳۹) اور یہ کہ آدمی کو وہی ملتا ہے جو اُس نے کمایا۔

۲۔ اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ (الحجرات: ۱۳) تحقیق اللہ کے ہاں زیادہ عزت اسی کے لیے ہے جس کا تقوٰے زیادہ ہے۔

اسلام نے درجے میں جس فرق کو تسلیم کیا ہے، وہ مذہبی تقدس و بصیرت پر موقوف ہے یہ اعتراف حسنِ عمل کی بنیاد پر ہے کہ عہدے اور منصب کی بنا پر۔ اسلام میں پادریوں جیسا کوئی عہدہ نہیں، کوئی مخصوص مذہبی جماعت نہیں جس کے ہاتھ میں کسی دور کی مذہبی باگ ڈور ہو، علماء، مشائخ، ملا، امام، اخوند، مفتی، مجتہد، خطیب وغیرہ ویسے ہی انسان ہیں جیسے ملّتِ اسلامیہ کے دوسرے افراد ہیں۔ یہ لوگ خاص خدمات انجام دیتے ہیں اور ان کا احترام اسی قرآنی اصول کی بنا پر کیا جاتا ہے کہ تم میں سب سے زیادہ عزت اس کے لیے ہے جو تقویٰ میں سب سے بڑھا ہوا ہے۔

ظہورِ اسلام کے وقت غلامی رائج تھی، اسلام نے اسے ختم کر دینے کے لیے زمین ہموار کی۔ مثلاً غلاموں کے لیے یہ موقع پیدا کیا کہ اپنی قیمت دے کر آزادی حاصل کر لیں۔ زکوٰۃ کے مصارف میں سے غلاموں کو غلامی سے نجات دینا بھی شامل کیا۔ بعض گناہوں کے کفارے میں غلاموں کو آزاد کرنا رکھ دیا۔

عورتوں کو اصلاً مردوں کے ساتھ مساوات کا درجہ حاصل ہے۔ قرآن مجید کا ارشاد ہے:

۱۔ وَمَنْ یَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَکَرٍ اَوْ اُنْثٰی وَھُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِکَ یَدْخُلُوْنَ الْجَنَّۃَ (النساء: ۱۲۴) اور جو کوئی اچھے کام کرے گا، مرد ہو یا عورت، اور وہ ایمان بھی رکھتا ہوگا تو ایسے ہی لوگ ہیں جو جنت میں داخل ہوں گے۔

۲۔ لِلرِّجَالِ نَصِیْبٌ مِّمَّا اکْتَسَبُوْا وَلِلنِّسَآءِ نَصِیْبٌ مِّمَّا اکْتَسَبْنَ (نساء: ۳۲) مردوں نے اپنے عمل سے جو کچھ حاصل کیا، اس کے مطابق ان کا حصّہ ہے اور عورتوں نے اپنے عمل سے جو کچھ حاصل کیا، اس کے مطابق ان کا حصّہ ہے۔

تاہم اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ عمومی حیثیت میں مرد عورتوں پر فائق ہوتے ہیں لہذا انھیں عورتوں پر فائق رکھا گیا ہے۔ قرآن مجید کا ارشاد ہے:

اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ (نساء: ۳۴) مرد عورتوں کی زندگی کا بندوبست کرنے والے ہیں

دنیائے حاضر میں قوم پرستی کا ظہور ہوا تو اسلام کے ساتھ قوم پرستی کا تعلق بھی ایک مسئلہ بن گیا جس پر عموماً بحث ہوتی رہتی ہے۔ اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ اسلام عالمی مذہب ہے لہذا وہ قوم پرستی کا روادار نہیں ہو سکتا لیکن حقیقت یہ نہیں۔ عالمیت اور آفاقیت کی ابتدا قومی وفاداری سے ہوتی ہے اور قومیت کا مطلب محض یہ ہے کہ انسانوں کے ایک گروہ کو سیاسی جماعت کی حیثیت میں منظم کر لیا جائے، خواہ ان کے درمیان مذہبی اختلاف کی حیثیت کچھ ہو، اسلام اس وقت تک ایسی سیاسی تنظیم کو منع نہیں کرتا جب تک اسلامی تعلیم کے بنیادی اجزاء پر برا اثر نہ پڑے۔ قومیت لوگوں کو متحد بھی کر سکتی ہے اور ان کے درمیان تفرقہ بھی پیدا کر سکتی ہے لیکن جب اسلام کے ہمہ گیر اصول اس کے رہنما ہوں گے تو یہ اتحاد کی طرف لے جائے گی، تفرقے کی موجب کبھی نہ بنے گی۔ اس سلسلے میں یہ چیز بھی پیش نظر رکھ لینی چاہیے کہ سیاسی لحاظ سے خلافت کا مطالبہ موجودہ دور میں بھی بہت کم ہو گیا ہے۔ ہمارے زمانے میں پان اسلام ازم کا مطلب یہ نہیں کہ تمام مسلمانوں کے لیے ایک حکومت عالیہ کا بندوبست کیا جائے، یہ مسلمان قوموں کے درمیان تعاون کی تحریک ہے۔

جہاد کا مطلب یہ سمجھا جاتا ہے کہ مسلمانوں کو غیر مسلموں کے خلاف اس وقت تک جنگ جاری رکھنی چاہیے جب تک وہ اسلام قبول نہ کر لیں۔ یہ غلطی قرآن کی آیات کے مقام و محل کے بارے میں غلط فہمی سے پیدا ہوئی۔ نیز اس سے کہ وہ حالات نظر انداز کر دیے گئے جن میں یہ آیات نازل ہوئی تھیں جن آیتوں میں منکروں کے خلاف جنگ کی دعوت دی گئی تھی وہ اس زمانے میں نازل ہوئیں جب منکرین رسول اللہ صلعم کی تبلیغی سرگرمیوں

میں سراسر مشکلات پیدا کر رہے تھے۔ اگرچہ انھیں صلح کے موقعے دے دیے گئے تھے۔ اسلام میں جنگ اسی وقت جائز ہے جب یہ مذہب، جائداد اور عزت کی حفاظت کے لیے ہو۔ قرآن مجید کا ارشاد ہے:

وقاتلوا فی سبیل اللہ الذین یقاتلونکم ولا تعتدوا ان اللہ لا یحب المعتدین
(البقرہ ۲: ۱۹۰)

اور جو لوگ تم سے لڑائی لڑ رہے ہیں چاہیے کہ اللہ کی راہ میں تم بھی اُن سے لڑو، البتہ کسی قسم کی زیادتی نہ کرنی چاہیے اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

اسلام دوسرے مذاہب سے دشمنی کو پسندیدہ نہیں سمجھتا۔ اس نے مذہبی آزادی کا اعلان کیا اور دین میں جبر کی ممانعت کر دی۔ رسول اللہ صلعم اپنی حیاتِ طیبہ میں دوسرے مذاہب کے ہمسایوں یا یہودیوں یا عیسائیوں پر بہت مہربانی فرماتے تھے۔ آپ نے ایک یہودی خاتون (ام المومنین حضرت صفیہ) اور ایک مسیحی کنیز ماریہ قبطیہ سے نکاح کر لیا تھا جسے حاکم مصر نے آپ کے پاس بھیجا تھا جب حبشہ کے بادشاہ کا انتقال ہوا تو رسول اللہ صلعم نے اس کے لیے نمازِ جنازہ پڑھی اس لیے کہ اس نے اسلام کے ابتدائی دور میں پناہ لینے والے مسلمانوں کو امداد دی تھی[1]

مساجد اور مذہبی رہنماؤں کے ذریعے سے تعلیم کے جو مواقع مہیا ہوئے اُن سے اسلامی معاشرے پر بڑا اثر پڑا اور اشاعتِ اسلام میں بڑی مدد ملی، رسول اللہ صلعم نے تعلیم کو بڑی تقویت پہنچائی اور اپنے صحابیوں کو عرب میں جگہ جگہ معلم بنا کر متعین فرمایا۔ یہ حکم بھی دے دیا گیا تھا کہ اگر کوئی غریب مسلمان زرِ مہر کے عوض کسی خاتون کو قرآن کا ایک پارہ پڑھا دے

[1] شاہ حبشہ عام روایت کے مطابق مسلمان ہو چکا تھا، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ اسلام دوسرے مذاہب کے لوگوں سے سختی کے برتاؤ کا روادار ہے۔ قطعاً نہیں۔ اسلام زیادہ سے زیادہ نرمی اور ملائمت کا طریقہ غیر مذاہب کے لوگوں کے ساتھ پسند کرتا ہے بشرطیکہ وہ کھلی دشمنی شروع نہ کر دیں، دشمنی کی حالت میں مٹنے کا افسادہ لوازم میں شامل ہے۔

تو وہ اس سے شادی کر لے۔ تعلیم کا نظام بہت سادہ تھا، اس کے لیے نہ کوئی خاص منظم پروگرام تھا اور نہ کوئی اہتمام کیا جاتا تھا۔ جب کوئی شخص چاہتا، استاد کے پاس پہنچ جاتا اور جب تک چاہتا اس سے علم حاصل کرتا رہتا۔ پھر وہ دوسرے استاد یا استادوں کے پاس چلا جاتا یا خود معلّمی کا اجازت نامہ لے لیتا۔ خاندان میں ماں باپ بچوں کو تعلیم دیتے ہیں معلم کسی خاص پیشہ ور طبقے سے تعلق نہیں رکھتے تھے، بلکہ وہ پڑھاتے بھی تھے اور ساتھ ساتھ زمینداری یا تجارت یا سرکاری نوکری بھی کرتے تھے۔ یہ نظام اب تک اکثر اسلامی ملکوں میں جاری ہے۔

علاوہ بریں بہت سے ملکوں میں مسجدوں کے ساتھ مدرسے اور اعلیٰ تعلیم کی خاص خاص درس گاہیں بھی ہیں۔ قاہرہ کی یونیورسٹی جامعہ ازہر سب سے پرانی اسلامی یونیورسٹی ہے۔ یہ چوتھی صدی ہجری (دسویں صدی عیسوی) میں قائم ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ بھی اعلیٰ اسلامی تعلیم کے مرکز موجود ہیں، مثلاً مراکو میں بہ مقام فاس، تونس میں جامعہ زیتونہ، مدینہ، استنبول، انقرہ، بغداد، کربلا، طہران، لاہور، لکھنو، علی گڑھ، جامعہ عثمانیہ حیدر آباد، جکارتا (انڈونیشیا) ان میں سے بعض مرکزوں کو حکومت سے امداد ملتی ہے۔ بعض ملکوں میں سرکاری یونیورسٹیاں ایسی بنادی گئی ہیں جہاں اسلام کی تعلیم پائی جاسکتی ہے مثلاً تیوان (فارموسا)۔ تعلیم ابتدائی مراحل میں مقامی زبان کے ذریعے سے ہوتی ہے لیکن اعلیٰ تعلیم کے لیے عربی پر عبور ضروری ہے اور ریسرچ کرنی ہو تو ترکی اور فارسی زبان میں بھی مہارت حاصل کیے بغیر چارہ نہیں۔

امن و خوشحالی کے دور میں فنونِ لطیفہ اور موسیقی بھی فروغ پذیر رہے، البتہ ابتدائی دور میں ان کے لیے وقت صرف کرنے کا کوئی موقع نہ ملا۔ رسول اللہ صلعم نے اپنے عہد مبارک کی موسیقی کو ناپسند نہیں فرمایا، لیکن مصوّری کی ممانعت کر دی۔ اُس زمانے میں مصور عموماً انسانی شکلیں بناتے تھے جو بتوں کے نشان بن سکتی تھیں اور اندیشہ تھا کہ بت پرستی از سر نو نہ پھیل جائے۔ اس بنا پر بعض اہلِ فقہ نے یہ نتیجہ نکال لیا کہ اسلام

لہ اس جامعہ کو فاطمی عففار نے بنوایا تھا۔

مصوری اور موسیقی کے خلاف ہے، حالانکہ یہ درست نہیں صحیح نتیجہ یہ ہے کہ ہمیں ہر فن کے نتائج پر گہری نظر رکھنی چاہیے۔ فن برغرضِ فن سے اسلام نا آشنا ہے، جب تک کوئی فن مذہب اور اخلاق کی سربلندی کے لیے مفید ہو سکتا ہے، اس کی اجازت ہے، لیکن اگر کوئی فن بداخلاقی کی طرف لے جاتا ہو تو ممنوع ہے۔

نئے رجحانات جب معتزلہ کی تحریکِ عقلیت دبا دی گئی اور اسلامی دنیا کی سیاسی تنظیم کا شیرازہ بکھر گیا تو مسلمانوں کی روحِ حیات پر سخت ضرب لگی انھوں نے قرآن و حدیث کے مطالعے سے غفلت برتی، حالانکہ یہی دو چیزیں اسلام کا اصل ماخذ تھیں اور علماء کی تعلیمات کو سہارا بنا لیا۔ انھوں نے سمجھ لیا کہ اجتہاد ممنوع ہے اور انھیں چار فقہی دبستانوں میں سے کسی ایک کی پیروی پر قانع رہنا چاہیے۔ انھوں نے عقلِ سلیم سے فائدہ اٹھانے کے بجائے چار دبستانوں کو مکمل اور غیر متبدل مان لیا۔ تصوف کی طرف راغب ہو گئے اور اولیا کی غیر معمولی قوتوں کے معتقد بن گئے۔ خواہ وہ زندہ تھے یا وفات پا چکے تھے۔ اس طرح اولیا کے مقبروں کی پرستش شروع ہو گئی جو آج کل شمالی افریقہ سے انڈونیشیا تک تمام اسلامی ملکوں میں موجود ہے۔

عرب میں وہابیت کی تحریک پیر پرستی کے خلاف ردِ عمل تھی، لیکن اس تحریک میں دلائل کے بجائے قوت سے کام لیا گیا اور یہ عام اصلاح میں ناکام رہی۔ فرانسیسیوں کے مصر پر قبضے کے بعد بہت سے علمائے نے یورپ میں تعلیم پائی اور احیائے علوم کا ایک اور دور شروع ہوا جسے شیخ محمد عبدہ جیسے عظیم المنزلت عالم نے درجۂ کمال پر پہنچا دیا۔ شیخ موصوف اہلِ مصر کے لیے نئے افکار کا سرچشمہ بنے۔ قریباً اسی زمانے میں ہندوستان کے مسلمانوں کی راہنمائی سر سید احمد خاںؒ نے کی جو علی گڑھ یونیورسٹی کے بانی تھے۔ ہندوستان کے مسلمان بھی اپنی ثقافتی اہمیت اور حیاتِ ملی کے شعور سے بہرہ ور ہو گئے۔ گزشتہ نصف صدی میں حمل و نقل اور آمد و رفت کی سہولتوں کے باعث اسلامی دنیا کے باشندوں میں گہرا

تعلق پیدا ہو گیا۔ نیز انھوں نے باقی دنیا کی ثقافتوں سے آگاہی حاصل کر لی۔ اس طرح انھیں ضرورت محسوس ہوئی کہ قرونِ وسطیٰ کے مفکروں اور فقیہوں کے افکار کا جائزہ از سرِ نو لیں۔ یہی زمانہ ہے جس میں اسلامی دنیا کے بڑے حصے نے سیاسی آزادی حاصل کی اور لوگ زیادہ تر سیاسی اور بین الاقوامی مسائل میں منہمک رہے۔

آج مراکش، تیونس، شام و لبنان، ترکی، عراق، ایران، پاکستان، ہندوستان اور انڈونیشیا کے مسلمان اُن مسائل کے حل میں معروف ہیں جن کا تعلق ان کی نئی اور آزاد حکومتوں کے قیام سے ہے۔ ساتھ ہی الجزائر، افریقہ کے بڑے حصوں، سوویٹ یونین اور چین کے مسلمان سیاسی تصرفات کے خلاف جدوجہد کر رہے ہیں۔ یہ سیاسی مسائل اُس زمانے میں بروئے کار رہے جب اسلامی دنیا پر مغربی ثقافت کا دباؤ سب سے زیادہ نمایاں ہوا۔ آج اسلام کو سب سے بڑھ کر امن کی ضرورت ہے، تاکہ اسلامی افکار کے نشوو ارتقا کے لیے سازگار حالات مہیا ہیں۔ ابن خلدون کے وقت سے پانچ صدیاں گزر چکی ہیں اور اسلامی دنیا سے کوئی بڑا مفکر نہیں اٹھا۔ اب سب سے بڑھ کر امن اور ذہنی آزادی کی ضرورت ہے جس میں خدا پرست مفکر قرآن مجید کی تعبیر انسانی علوم کی ترقی کی روشنی میں کر سکیں، عبادات جیسی ہیں ویسی ہی رہیں گی۔ اصول و اساس میں تغیر ہو ہی نہیں سکتا، لیکن اسلام کے متعلق فہم و تعبیر ہمارے عہد کے لیے از سرِ نو منور ہو جائیں گے۔

آج اسلامی دنیا میں چار بڑے رجحانات ہیں ——— تھیٹ اسلام، اصلاح، صوفیت اور شیعیت ——— وسائل حمل و نقل اور تعلیم میں اضافہ ہر رجحان کے پیرووں کو دوسرے کا نقطۂ نگاہ بہتر طریق پر سمجھنے کا موقع بہم پہنچا رہا ہے۔ قاہرہ میں شیعہ اور سنی کے درمیان مصالحت اور بہتر فہم و تعبیرت کا کام بڑے اچھے پیمانے پر انجام پا رہا ہے۔ تھیٹ اسلام کے پیرو، پہلے جیسے رجعت پسند نہیں رہے، اور داعیانِ اصلاح کی ناروا داری کم ہو گئی ہے۔ صوفیوں کے سلسلوں کا اثر گھٹ رہا ہے، لیکن اُن کی عبادتوں، ریاضتوں اور طور طریقوں

کا مطالعہ اہلِ علم بڑی ہمدردی سے کر رہے ہیں۔ خصوصاً ترکی اور انڈونیشیا میں اسلامی افکار کے لیے نئی دلچسپی اور نئی حمیت کی بہت سی شہادتیں ملتی ہیں۔ بہت سی کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ بہت سے فضلا اسلامی کتابوں کے مطالعے میں مشغول ہیں، نئی مسجدیں تعمیر کی جا رہی ہیں۔

اسلام ابتدا میں ان تجارتی راستوں کے ساتھ ساتھ پھیلا تھا جو شمالی افریقہ سے ایران، وسطِ ایشیا، انڈونیشیا ہوتے ہوئے چین جاتے تھے، مسلمان تاجر ان راستوں پر جا بجا آباد ہوئے۔ انھوں نے شادیاں کر لیں، خاندان بن گئے، یہی خاندان نئی جماعتوں کا ہیولیٰ ثابت ہوئے۔ ثقافتی اختلافات کے باوجود ان لوگوں نے صدیوں تک اسلام کی وحدت برقرار رکھی۔ آج تجارتی راستے بہ آسانی ساری دنیا میں پھیل گئے ہیں۔ یہ ناگزیر ہے کہ پہلا عمل پھر دہرایا جائے اور اسلام ان نئے خطوں میں پہنچے، جہاں یہ پہلے متعارف نہیں ہوا۔

اسلام کے متعلق وحدت و تنوع کی اس بحث میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ اسلام کی بنیادی وحدت سے انحراف صرف اسی وقت واقع ہوا جب عام لوگ بے خبر تھے، یعنی اُن کی تعلیم کی سطح نیچی تھی۔ موجودہ نسل کا فرض ہے کہ اسلام کی بنیادی اجزاء کی تعلیم و تربیت کا بندوبست کرے اور اس کے گہرے مطالعے میں لگ جائے، صراطِ مستقیم اسلام کے متعلق اسی علم سے ایمان و عمل کا وہ اتحاد پیدا ہوگا جو قرآن و سنت میں عالمِ انسانیت کے سامنے پیش ہوا ہے۔

مطبوعات مکتبۂ فرینکلن۔ لاہور

مغرب کے موتی مشرق کے قدموں میں

افسانے

اندھا کنواں ترجمہ: ابن انشا ۵/۔

انوکھی کہانیاں ترجمہ: شاہد احمد دہلوی ۵/۔

بڑا دریچہ ترجمہ: ولی اشرف صبوحی

بچوں کے لئے نہایت دلچسپ بالتصویر کہانی ۳/۵۰

باپ کی نگری ترجمہ: سیدہ نسیم ہمدانی ۶/۔

حیرتناک کہانیاں ترجمہ: شاہد احمد دہلوی ۴/۔

خزانے کی تلاش ترجمہ: شبلی ایم کام

بچوں کے لئے ایک دلچسپ و بالتصویر کہانی ۲/۵۰

سورج کے ساتھ ساتھ ترجمہ: عشرت رحمانی۔ ملک ملک کی لوک کہانیاں ۶/۵۰

قصص الحمراء ترجمہ: پروفیسر سید وقار عظیم ۷/۵۰

لاکھوں کا شہر ترجمہ: ابن انشا ۶/۵۰

انسانیات

مستقبل کا انسان ترجمہ: سید قاسم محمود ۶/۔

تاریخ

انسائیکلوپیڈیا تاریخ عالم ترجمہ: مولانا غلام رسول مہر

جلد اول تاریخ اسلام ابتدا تا ۱۹۵۹ء

" دوم تاریخ عالم ابتدا تا عہد نپولین

" سوم " عہد نپولین کے آخر سے ۱۹۵۹ء تک ۱۲/۔

تاتاریوں کی یلغار ترجمہ: عزیز احمد۔ تاتاریوں کی دلچسپ

اور ولولہ انگیز تاریخ -/12

تاریخ بھی مزے کی چیز ہے ترجمہ
مولانا عبدالمجید سالک ۔ بچوں کے
لئے تاریخ کے متعلق معلومات ۔ 1/50

سو تاریخی واقعات مترجمہ و مرتبہ
مولانا غلام رسول مہر ۔ بڑوں اور
بچوں کے لئے سو اہم واقعات کا مختصر
مگر جامع مجموعہ -/7

عرب دنیا مترجمہ: ڈاکٹر محمود حسین
دنیائے عرب کی تاریخ از ابتدائے
اسلام تا زمانہ موجودہ -/12

صلیبی جنگیں ترجمہ: رئیس احمد جعفری
-/5

تعلیم و تعلم

آزاد تعلیم اور جمہوری نصب العین
ترجمہ: پروفیسر سید وقار عظیم -/3

بچے کی تعلیم میں گھر اور مدرسے کا تعاون
ترجمہ: مفضل محمد خاں -/8

تعلیم کے مقاصد ترجمہ: ڈاکٹر
سید عبداللہ 5/50

مدرسے کی زندگی میں بچے کی رہنمائی
ترجمہ: پروفیسر سید وقار عظیم 1/62

والدین اور معلمین ترجمہ: شاہد احمد
دہلوی (طبع دوم) 1/50

ثقافت

ثقافت کا مسئلہ مترجمہ: سید قاسم محمود
1/50

ڈراما

ایک حمام میں ترجمہ: عشرت رحمانی
(ایک لطیف معاشرتی طربیہ) -/2

سائنس

آنکھوں سے کام لیجئے ترجمہ: محمد سعید
بچوں کے لئے پر از معلومات کتاب
مصور ۔ 1/50

آواز کی کہانی ترجمہ: مسعود احمد خاں
آواز پر بچوں کے لئے ایک مفید کتاب
مصور 1/25

بچوں کے لئے سائنسی تحقیق کی راہیں
مترجمہ: محمد فاروق ۔ سائنسی تحقیق پر
بچوں کے لئے ایک کارآمد کتاب مصور 1/50

مکتبۂ فرینکلن لاہور

بنیادی سائنس کا سلسلہ

ترجمہ مولانا صلاح الدین احمد

انسانی مشین ۔ آواز ۔ پرندے
پھول، پھل اور بیج ۔ چاند، حرارت
روشنی ۔ زندہ اشیا ۔ ستاروں سے
آگے ۔ کشش ثقل ۔ کیڑوں کی
سماجی زندگی ۔ مٹی ۔ مشینیں ۔
مقناطیس ۔ موسم ۔ ہر کتاب کی قیمت ۱/۵۰

جوہری توانائی اور اس کا مستقبل
ترجمہ: پروفیسر محمود احمد خاں ۴/۵۰

حیوانی زندگی کا ماضی و حال
ترجمہ: ڈاکٹر نذیر احمد ۵/-

دنیا پر پہلی نظر ترجمہ: سیدہ نسیم ہمدانی
بچوں کے لئے ایک دلچسپ کتاب ۱/۵۰

زمین کی سرگزشت ترجمہ: سید علی ناصر
زیدی (بچوں کے لئے) ۴/-

سائنس باتوں باتوں میں
ترجمہ: سید علی ناصر زیدی ۔ بلا خرچ
اور آسان طریقوں پر بچوں کے لئے
مفید کتاب ۴/-

ستاروں کی دنیا ترجمہ: سید علی ناصر زیدی
علم ہیئت بچوں کے لئے ۵/-

سائنس کی حیرت انگیز باتیں
ترجمہ: علی ناصر زیدی ۲/۵۰

عجائبات کیمیا ترجمہ: محمد فاروق ۴/۵۰

میرے اندر کیا ہے ترجمہ: مولانا
غلام رسول مہر (بچوں کے لئے) ۱/۵۰

ریڈیو اور ٹیلی وژن ترجمہ:
ذوالفقار علی بخاری ۴/۵۰

سوانح عمری

ایڈیسن ترجمہ: محمد سعید ۳/۵۰

چند عظیم علمائے جراثیم ترجمہ:
پروفیسر عبدالمجید قریشی ۱۰/-

چنگیز خاں ترجمہ: عزیز احمد ۶/-

سقراط ترجمہ: آنسہ صبیحہ حسن ۲/۵۰

سو بڑے آدمی ترجمہ و مرتبہ: مولانا
عبدالمجید سالک ۵/-

غازیان تہذیب ترجمہ: سید ہاشمی
فرید آبادی ۔ ان لوگوں کے حالات
جنہوں نے انسانی تہذیب کو ترقی دی ۵/-

مکتبۂ فرینکلن لاہور

سوانح و تاریخ

مقبولِ عام سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

رحمۃ للعالمینؐ

مصنفہ

قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوری

سائز ۲۰×۲۶/۸

قیمت حصہ اوّل ۱۲ روپے ۴۰ پیسے، دوم ۶ روپے ۵۰ پیسے، سوم ۶ روپے ۵۰ پیسے

صفحات حصہ اوّل	دوم	سوم
۳۸۸	۴۷۸	۴۸۸

قاضی صاحب نے اپنی اس مشہور و معروف اور نہایت بلند پایہ تصنیف میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت کے تمام پہلوؤں پر انتہائی بالغ نظری سے روشنی ڈالی ہے۔ واقعات کی تحقیق اور اسناد کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔ سیرت کے علاوہ دوسرے اہم مذہبی مسائل پر بھی سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ قرآنِ کریم کا دوسرے آسمانی صحیفوں سے موازنہ اور غیر مسلموں کے اعتراضات کے جوابات وغیرہ نے کتاب کی افادی حیثیت میں غیر معتدبہ اضافہ کر دیا ہے۔

سیرت فاروقؓ پر مستند و معتمد کتاب

الفاروقؓ

مصنفہ:۔ شبلی نعمانی

سائز ۲۰×۳۰/۱۶ صفحات ۵۴۴

قیمت چار روپے ۵۰ پیسے

خلیفہ دوم حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی شہرۂ آفاق سوانح حیات جس میں عہدِ حاضر کے متلاشیانِ نظامِ حکومت کے لیے واضح، اٹل اور تجربہ شدہ قوانین کا ذخیرہ جمع ہے۔ اس کا مطالعہ تہذیب، تمدن اور معاشرت کے ہر تاریک پہلو کو روشن و منور کرے گا۔

شیخ غلام علی اینڈ سنز ناشران و تاجران کتب کشمیری بازار لاہور۔ کراچی۔ پشاور

تاریخ

انسائیکلوپیڈیا تاریخ عالم۔ ترجمہ :۔ مولانا غلام رسول مہر
جلد اوّل ۱۲/۰ جلد دوم ۱۲/۰ جلد سوم ۱۴/۰

تاریخ بھی مزے کی چیز ہے۔ ترجمہ :۔ عبدالمجید سالک ۱/۵۰ روپے

عرب دُنیا۔ ترجمہ :۔ ڈاکٹر محمود حسین ۱۲/۰ روپے

صلیبی جنگیں۔ ترجمہ :۔ سید رئیس احمد جعفری ۵/۰ روپے

سو تاریخی واقعات ترجمہ :۔ مولانا غلام رسول مہر ۷/۰ روپے

حیوانی زندگی کا ماضی و حال ترجمہ :۔ ڈاکٹر نذیر احمد ۵/۰ روپے

تاتاریوں کی یلغار۔ ترجمہ :۔ عزیز احمد ۱۲/۰ روپے

قدیم علوم اور جدید تہذیب ترجمہ :۔ سید ہاشمی فرید آبادی ۱/۰ روپے

سوانح عمری

سلطان صلاح الدّین ایوّبی۔ ترجمہ :۔ پروفیسر محمد یوسف عباسی ۱۷/۵۰ روپے

آئن سٹائن کی کہانی۔ ترجمہ :۔ سید رئیس احمد جعفری ۴/۰ روپے

چنگیز خاں۔ ترجمہ :۔ عزیز احمد ۴/۰ روپے

سقراط ۔ ترجمہ :۔ آنسہ صبیحہ حسن ۲/۵۰ روپے

غریب لڑکے جو نامور ہوئے۔ ترجمہ مولانا عبدالمجید سالک ۴/۰ روپے

لڑکیاں جو نامور ہوئیں۔ ترجمہ :۔ اختر عزیز احمد ۵/۰ روپے

نور محل۔ (طبع دوم) ترجمہ :۔ شبلی بی کام و حبیب اشعر دہلوی ۷/۵۰ روپے

سلیمان عالیشان۔ ترجمہ :۔ اختر عزیز احمد ۸/۵۰ روپے
سو بڑے آدمی۔ ترجمہ :۔ عبدالمجید سالک ۵/۰ روپے
ایڈیسن۔ ترجمہ :۔ محمد سعید ۳/۵۰ روپے
چند عظیم علمائے جراثیم۔ ترجمہ :۔ عبدالمجید قریشی ۱۰/۰ روپے
غازیان تہذیب۔ ترجمہ :۔ سیّد ہاشمی فرید آبادی ۵/۰ روپے
مشہور موجد اور ان کی ایجادیں۔ ترجمہ :۔ ابوالحسن نغمی ۲/۷۵ روپے

سائنس

مشہور مہماتِ سائنس۔ ترجمہ :۔ محمد فاروق ۴/۵۰ روپے
موسم کی کہانی۔ ترجمہ :۔ بشیر احمد ساجد ۴/۵۰ روپے
آنکھوں سے کام لیجیے۔ ترجمہ :۔ محمد سعید ۱/۵۰ روپے
آواز کی کہانی۔ ترجمہ :۔ مسعود احمد خان ۱/۲۵ روپے
بچوں کے لیے سائنسی تحقیق کی نئی راہیں۔ ترجمہ :۔ محمد فاروق ۲/۵۰ روپے
تمہارا جسم کیونکر کام کرتا ہے۔ ترجمہ : خلیق ابراہیم خلیق ۴/۵۰ روپے
ریڈیو اور ٹیلی ویژن۔ ترجمہ :۔ ذوالفقار علی بخاری ۴/۵۰ روپے
عجائباتِ کیمیا۔ ترجمہ :۔ محمد فاروق ۴/۵۰ روپے
سائنس کے نئے افق۔ ترجمہ :۔ سید علی ناصر زیدی ۵/۰ روپے
سمندروں کی دنیا۔ ترجمہ :۔ ڈاکٹر نذیر احمد ۴/۵۰ روپے
کیمیا کے رومان۔ ترجمہ :۔ پروفیسر حمید عسکری ۵/۰ روپے
جوہری توانائی اور اس کا مستقبل۔ ترجمہ :۔ پروفیسر محمود احمد خاں ۴/۵۰ روپے

دُنیا پر پہلی نظر۔ ترجمہ:۔ سیدہ نسیم ہمدانی ۱/۵۰ روپے
زمین کی سرگزشت۔ ترجمہ:۔ سید علی ناصر زیدی ۴/۰ روپے
سائنس باتوں باتوں میں۔ " " ۴/۰ روپے
ستاروں کی دُنیا۔ " " ۵/۰ روپے
سائنس کی حیرت انگیز باتیں۔ " " ۲/۵۰ روپے
مصنوعی سیارچہ۔ " " ۲/۵۰ روپے
سائنس کے تجربات۔ ترجمہ:۔ ڈاکٹر عبدالسلام خورشید ۵/۰ روپے
خلا میں سفر کی پہلی کتاب۔ ترجمہ:۔ مولانا غلام رسول مہر ۲/۵۰ روپے

بُنیادی سائنس کا سلسلہ

انسانی مشین۔ آواز۔ پرندے۔ پھول، پھل اور بیج۔ چاند۔ حرارت۔ روشنی۔ زندہ اشیاء۔ ستاروں سے آگے۔ کشش ثقل۔ کیڑوں کی سماجی زندگی۔ مٹی۔ مشینیں۔ مقناطیس۔ موسم۔ ترجمہ:۔ مولانا صلاح الدین احمد۔ ہر کتاب کی قیمت ۱/۵۰ روپے

فنّی معلومات

بجلی کی پہلی کتاب۔ ترجمہ:۔ سید علی ناصر زیدی ۲/۵۰ روپے
ٹیلیفون کیسے کام کرتا ہے۔ ترجمہ:۔ خلیق ابراہیم خلیق ۱/۲۵ روپے
طیاروں کی پہلی کتاب۔ ترجمہ:۔ مولانا غلام رسول مہر ۲/۵۰ روپے
موٹروں کی پہلی کتاب۔ " " ۲/۵۰ روپے

معاشیات

عظماء کے معاشی نظریات۔ ترجمہ:۔ ڈاکٹر ایس ایم اختر ۶/۰ روپے
آبادی کا مسئلہ۔ ترجمہ:۔ شبلی ایم کام ۱/۵۰ روپے
خوراک مسئلہ۔ 〃 〃 〃 ۱/۵۰ روپے

والدین اور اساتذہ کی رہنما کتابیں

آپ کے بچے کی وراثت۔ ترجمہ:۔ شاہد احمد دہلوی ۱/۰ روپے
بچوں کی بدتمیزیاں۔ 〃 〃 〃 ۱/- روپے
بچوں کے کھیل۔ 〃 〃 〃 ۱/۵۰ روپے
بچے کی اخلاقی قدریں۔ 〃 〃 〃 ۱/۵۰ روپے
کامیاب باپ۔ 〃 〃 〃 ۱/۵۰ روپے
معاشرتی زندگی میں بچوں کی رہنمائی۔ 〃 〃 ۱/۵۰ روپے
والدین اور معلمین۔ 〃 〃 〃 ۱/۵۰ روپے

طب اور صحت

بچہ اور اس کی دیکھ بھال۔ ترجمہ:۔ ڈاکٹر محمد عبد القوی لقمان ۶/۵۰ روپے
آپ کے بچے کی صحت۔ ترجمہ:۔ شاہد احمد دہلوی ۱/۶۲ روپے
میرے اندر کیا ہے؟ ترجمہ غلام رسول مہر ۱/۵۰ روپے
بیماری کے جذباتی اور نفسیاتی پہلو۔ ترجمہ سید وقار عظیم ۱/۶۲ روپے

فلسفہ

داستانِ فلسفہ۔ ترجمہ: سید عابد علی عابد

جلد اوّل ۸/۰ جلد دوم ۸/۰ روپے

ناقابلِ تسخیر ذہنِ انسانی۔ ترجمہ: محمد صفدر میر ۲/۵۰ روپے

فلسفے کی نئی تشکیل۔ ترجمہ: انتظار حسین ۲/- روپے

فلسفے کا نیا آہنگ۔ ترجمہ: بشیر احمد ڈار ۳/۵۰ روپے

مشرق و مغرب کو ملنا ہی پڑے گا۔ ترجمہ: سید ہاشمی فرید آبادی ۱/۷۵ روپے

آدمی کی انسانیت۔ ترجمہ: مولانا محمد بخش مسلم ۷/۵۰ روپے

فنونِ لطیفہ

شاہکار تصاویر۔ ترجمہ و مرتبہ: سید امتیاز علی تاج ۷/۵۰ روپے

علم سیاست

اقوام متحدہ۔ ترجمہ: فضل حق قریشی ۴/ روپے

امریکہ کا سیاسی نظام ترجمہ: مولانا صلاح الدین احمد ۳/۵۰ روپے

جغرافیہ اور سیاحت

عرب اور اہل عرب۔ ترجمہ: غلام رسول مہر ۶/- روپے

نیویارک سے پیرس تک پہلی پرواز۔ ترجمہ: گروپ کیپٹن فیاض محمود ۲/۵۰

یہ ہے شمالی افریقہ ترجمہ :۔ سید عابد علی عابد ۲/۵۰ روپے

تعلیم و تعلّم

آزاد تعلیم اور جمہوری نصب العین ۔ ترجمہ :۔ وقار عظیم ۳/۰ روپے
بچے کی تعلیم میں گھر اور مدرسے کا تعاون ۔ترجمہ :۔ فضل محمد ملہان ۸/۰ روپے

ناول ، افسانے ، ڈرامے

انجان راہی ۔ ترجمہ :۔ شان الحق حقی ۳/۵۰ روپے
بادبان ۔ ترجمہ :۔ سید قاسم محمود ۶/۰ روپے
بشر ہے کیا کہیے ۔ ترجمہ :۔ سید عابد علی عابد ۶/۵۰ روپے
پہلا خون ۔ ترجمہ :۔ غلام حسین ۲/۵۰ روپے
چنگیز خاں کے سنہرے شاہین ۔ ترجمہ :۔ اشفاق احمد ۶/۰ روپے
دھوپ چھاؤں ۔ ترجمہ :۔ ولی اشرف صبوحی ۷/۰ روپے
زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے ۔ترجمہ :۔ رئیس احمد جعفری ۳/۵۰ روپے
شہر پناہ ۔ ترجمہ :۔ ابن انشا ۳/۵۰ روپے
گھاس کا سمندر ۔ ترجمہ :۔ سید قاسم محمود ۱/۵۰ روپے
قیامت کی رات ۔ ترجمہ :۔ سید عابد علی عابد ۷/۰ روپے
مفرور ۔ ترجمہ :۔ رئیس احمد جعفری ۴/۰ روپے
ننھی پہیلیاں ۔ ترجمہ :۔ حجاب امتیاز علی ۵/۵۰ روپے
نئے پرانے ۔ ترجمہ محمد یوسف عباسی ۴/۰ روپے

اسلام — صراطِ مستقیم

172

تالیف : کینتھ ڈبلیو مورگن
ترجمہ : مولانا غلام رسول مہر

مقالہ نگار

ڈاکٹر محمد عبداللہ دراز (مصر) — پروفیسر محمود شہابی .... (ایران)
ڈاکٹر شفیق غربال (مصر) — ڈاکٹر اسحاق موسیٰ حسینی .... (مصر)
پروفیسر محمود شلتوت (مصر) — استاذ حسن بصری قسطائی .... (ترکیہ)
استاذ اے۔ ای عفیفی (مصر) — مولانا مظہر الدین صدیقی .... [illegible]ن)
استاذ داؤد سی۔ ایم ٹنگ (چین) — حسین جاما دمنگ[illegible] .... (انڈونیشیا)
محمد راشدی (انڈونیشیا)

ناشرین

شیخ غلام علی اینڈ سنز پرنٹرز، پبلشرز اینڈ بک سیلرز
لاہور — کراچی — پشاور — حیدرآباد